یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
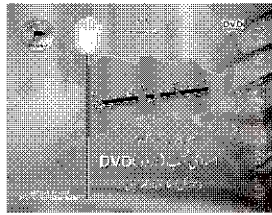
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

آیت اللہ العظمیٰ محمد حسین طباطبائی
ترجمہ
المیزان
فی
تفسیر القرآن
آیت اللہ حسن رضا غدیری
۴
الغدیر
اکیڈمی

1000

تالیف:

علامہ السید محمد حسین الطباطبائی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

المیزان

فی تفسیر القرآن

(علمی، فنی، فلسفی، ادبی، تاریخی اور حدیثی معارف سے مزین)

جلد ۴

از قلم

آیت اللہ حسن رضا غدیری

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبرنگ ایجنسی، حکومت پاکستان، اسلام آباد سے رجسٹرڈ

ISBN No.

978-969-8947-13-2

شناس نامۂ کتاب

نام کتاب .... المیزان فی تفسیر القرآن

جلد .... چہارم

تالیف .... آیت اللہ علامہ محمد حسین طباطبائی طاب ثراہ

ترجمہ .... آیت اللہ حسن رضا غدیری مدظلہ العالی

اہتمام وترتیب .... سید دولت علی زیدی

ناشر .... الغدیر فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) پاکستان

تدوین وتزئین .... آغا ابوطالب غدیری

تاریخ اشاعت باراوّل .... نومبر 2013ء

پیشکش .... فاطمیہ ٹرسٹ، لندن

مطبع .... مکتبہ جدید پریس، 14۔ایمپرس روڈ، لاہور

شاکسٹ / ملنے کا پتہ ☆ الغدیر فاؤنڈیشن، ہوپ روڈ، لوکوشیڈ، لاہور - 54900 (پاکستان) فون: 36840622(42-92+)

☆ محمد علی بک ڈپو، G-9/2۔امام بارگاہ صادقؑ (اسلام آباد) فون: 0333-5234311

☆ حق برادرز، غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، اردو بازار (لاہور) فون: 0333-4431382

☆ FATIMIYA TRUST
25 PRESTON WAYE
HARROW MIDDX
HA3 0QG (UK)

سورۂ آلِ عمران

۱۲۱ سے ۲۰۰ آیات تک

یہ سورۂ مبارکہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا

سورۂ نساء

۱ سے ۷۶ آیات تک

یہ سورۂ مبارکہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا

فہرست

موضوعی فہرست

جو موضوعات اس جلد میں عنوان قرار پائے وہ درج ذیل ہیں :

- جنگ بدر میں خدائی نصرت
- جنگ احد کا تفصیلی تذکرہ
- قرآنی تعلیمات میں علم وعمل کی پیوستگی کا بیان
- سود کی واضح ممانعت
- خدا کی راہ میں انفاق کرنے والے
- توبہ واستغفار کی اہمیت
- اہل ایمان کی سربلندی
- جنگ میں تکلیفوں سے دوچار ہونا
- زمانہ کی گردش کا خدائی نظام
- گردشِ ایام کا مقصد اور فلسفہ
- امتحان اور اس کی حقیقت کا بیان
- خدائی پیش گوئی اور تاریخی حقیقت
- موت خدا کے ہاتھ میں ہے
- کافروں کی اطاعت کی ممانعت
- اپنے آپ میں گم گشتہ لوگ
- باطن وظاہر میں دورنگی

والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثوابًا و خیر عملاً

انسانی معاشرہ کی بقا ان افراد کے وجود سے وابستہ ہوتی ہے جن کا عقیدہ صحیح اور عمل نیک ہو، وہ دوسروں کو عزت و سعادت کی دولت و نعمت سے بہرہ مندی کی راہ دکھاتے ہی نہیں بلکہ اس پر لا کھڑا کرتے ہیں، ان کے اعمال کو قرآنی زبان میں باقیات صالحات سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ وہ صرف اسی زمانہ اور انہی کی ذات تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کی اثر گزاری کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور دیگر افراد بشر کے لئے شمع راہ ہی نہیں متاع دوام بھی بن جاتے ہیں، انہی خوش قسمت اور بلند پایہ شخصیات میں ایک معتبر نام جناب مولانا سید نور شاہ کاظمی اعلی اللہ مقامہٗ کا ہے جنہوں نے علاقہ رتہ متہ میں علوم و معارف کو دوبالا کیا، موصوف ایک عالم باعمل، مقدس اور عابد و زاہد انسان تھے، انہوں نے اپنی پاکیزہ سیرت و کردار کے ذریعے دین اسلام و مذہب اہل بیت علیہم السلام کی جو عظیم خدمت کی وہ ان کے لئے توشۂ آخرت ہے، اس کا صحیح اجر تو خداوند عالم اور حضرات آئمہ معصومینؑ ہی دیں گے کیونکہ موصوف نے جو کچھ بھی انجام دیا وہ انہی کی رضا و خوشنودی کے حصول کی غرض سے کیا تھا لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی علمی و عملی تبلیغ کا اعزاز خداوند عالم کی طرف سے حاصلہ توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وہ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے اور ہر شخص کو اس کی مقصودہ غرض کے مطابق جزا دیتا ہے، خدا کا فضل و کرم اپنے نیک و صالح بندوں کے لئے مخصوص ہے وہ رحمن ہے یعنی اپنی تمام مخلوق پر عنایت کی بارش برساتا ہے، وہ رحیم ہے یعنی اپنے خاص مخلص اطاعت گزار بندوں کو اپنی رحمت سے نوازنے والا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں خدا کے نیک و صالح بندے موجود نہ ہوں تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے، مولانا سید نور شاہ کاظمی مرحوم نے اپنی نجی زندگی میں بھی سادگی، قناعت اور زاہدانہ روش کو اپنایا جس سے ان کی دینی پہچان کا تشخص قائم ہوا، موصوف کی انہیں انفرادی و اجتماعی صفات کی قدر دانی کے طور پر ان کی روح کو شاد کرنے کے لئے ان کے فرزند ارجمند حجۃ الاسلام مولانا سید کلب عباس کاظمی آف گاہی سیداں تحصیل و ضلع راولپنڈی (حال مقیم لندن) نے جہاں دیگر عبادتی اعمال انجام دیئے وہاں کتاب حاضر تفسیر المیزان جلد ۴ کی اشاعت میں مالی تعاون کیا، ادارہ تمام قارئین کرام سے ملتمس ہے کہ مولانا سید کلب عباس کاظمی کے والدین اور دیگر بزرگانِ خاندان مرحومین و مرحومات کے ایصال ثواب کے لئے سورۂ مبارکہ فاتحہ و سورۂ اخلاص کی تلاوت کے ساتھ ساتھ ان کی بلندئ درجات کے لئے دعا کریں، خداوند عالم مولانا موصوف کی یہ دینی خدمت اور عبادتی عمل کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور ہم سب کو اپنی مقدس کتاب کے فہم المعانی اور اس کی ارفع و اعلیٰ تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

سید دولت علی زیدی

الغدیر فاؤنڈیشن پاکستان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

الحمد للہ رب العالمین الصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا ونبینا محمد وآلہ الطاہرین الذین اذھب اللہ عنھم الرجس وطھر تطھیرا

حرفِ اوّل

قرآن فہمی ہر مسلمان کی دینی ضرورت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس مقدس کتاب کو اپنے دین کا آئین قرار دے کر نازل فرمایا ہے، اس کی پاکیزہ آیات میں بنی نوع انسان کی سعادت کے تابندہ ودرخشندہ اصول ذکر کئے گئے ہیں جن پر عمل کر کے دنیا وآخرت کی کامیابی کا حصول یقینی بنایا جاسکتا ہے، اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ آیات کے معانی اور ظواہر کی بابت مربوط امور سے آگاہی حاصل کی جائے کہ اس مقصد کے لئے تفسیری عمل ناگزیر ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس کا اصول کیا ہے اور اسے کس بناء پر انجام دینا نتیجہ بخش ثابت ہوسکتا ہے اور کونسا طریقہ وروش اپنا کر مقصد ومطلوب تک رسائی ممکن نہیں ہے اس کا جواب یقیناً اس کے علاوہ نہیں کہ وہ ہستی جس کے قلب مقدس پر قرآن نازل ہوا اور وہ شخصیات کہ جن کے گھر میں آیات اتریں وہ آیات کے معانی وحقائق سے آگاہ کرسکتی ہیں، اسی لئے حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں کلام اللہ کی تفسیر وتوضیح فرمائی اور آپؐ کے بعد اہل بیت علیہم السلام نے باب مدینۃ العلم امام علی علیہ السلام نے اس سلسلہ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ مجھے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کے بارے میں جو علم عطا فرمایا اس کی بناء پر بخوبی جانتا ہوں کہ کون سی آیت محکم ہے اور کون سی متشابہ ہے، کون سی عام ہے کون سی خاص ہے؟ کون سی مطلق ہے کون سی مقید ہے؟ کون سی کب کہاں اور کسی کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور اے کاش! کوئی ہوتا جو میرے سینے میں موجود خزانہ ہائے علم وحکمت کو لینے کی اہلیت رکھتا، تاریخ گواہ ہے کہ امام علیؑ کے بعد دیگر آئمہ معصومینؑ نے بھی کلام الٰہی کی تفسیر میں جو حقائق اور معانی ومطالب بیان فرمائے وہ حقیقی تفسیر کہلاتے ہیں، قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ وروش مذموم اور ممنوع ہے وہ اپنی رائے کی بناء پر آیات کے معانی کا یقینی تعین کرنا ہے، اس کی وجہ واضح ہے کہ اللہ کے کلام سے مقصودہ معانی صرف خدا ہی جانتا ہے یا وہ ہستیاں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کا علم عطا فرمایا، ان کے علاوہ ہر طرح کا اظہارِ خیال تب قرین صحت قرار پاسکتا ہے جب اس کی بنیاد حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ طاہرینؑ کے بیانات وارشادات ہوں ورنہ وہ تفسیر بالرائے کے زمرے میں آئے گا جس سے تاکیداً منع کیا گیا ہے۔ تفسیر قرآن کا سلسلہ اس کے نزول ہی کے زمانہ سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے، ہر اہل علم نے ہر دور میں اپنے ذوق ونظریہ کی روشنی میں آیات مبارکہ سے ممکنہ مقصودہ معانی کے بارے میں اظہارات پیش کئے اور اسے تفسیر سے موسوم کیا، اسی جاری علمی وتحقیقی سلسلہ میں ایک نام "المیزان فی تفسیر القرآن" کا ہے جو عصر حاضر میں اپنی نوعیت کا منفرد وممتاز مجموعۂ حقائق ہے، اس میں آیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کو ملحوظ قرار دے کر اہم مطالب ذکر کئے گئے ہیں، اس

عظیم الشان کتاب میں آیات مبارکہ کے ظواہر سے تقریبی معانی سے پردہ اُٹھایا گیا ہے، اپنی مخصوص تحقیقی روش کے ساتھ مؤلف ؒ نے ہر آیت سے مربوط موضوع یا موضوعات کا اشاراتی تذکرہ کر کے تفسیری عمل کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے، المیزان کی دیگر جلدوں کی طرح یہ جلد (۴) بھی انفرادیت کی حامل ہے اور اس میں آیات سے مربوط موضوعات کو نہایت خوش اسلوبی اور محققانہ انداز میں زیر بحث لایا گیا اور ہر موضوع سے تعلق رکھنے والے علمی ظریف نکات آشکار کئے گئے ہیں، علمی حلقوں میں تفسیر المیزان کی اہمیت و مقبولیت کسی وضاحت کی محتاج نہیں، اس نہایت منفرد انداز کی حامل تفسیر میں ادبی، علمی، تحقیقی، تاریخی، فقہی، حدیثی اور فلسفیانہ موضوعات پر جس وقیع صورت میں مربوطہ مطالب ذکر کئے گئے اس کی مثال دیگر تفسیری کتب میں نہیں پائی جاتی، اسی مناسبت سے اس کی امتیازی حیثیت ہر اہل علم و دانش اور صاحب نظر کے نزدیک مسلم الثبوت ہے، اس کے مندرجات کا مطالعہ اربابِ ذوق کو قرآنی علوم و معارف کی بلند پایہ حقیقتوں سے آگاہی دلاتا ہے، حوزہ ہائے علمیہ اور علمی تحقیقی مراکز کے صاحبانِ بصیرت و اہل مہارت حضرات کی طرف سے تفسیر المیزان کی عظمت اور انفرادیت کا اظہار و اعتراف اس حقیقت کا عکاس ہے کہ تفاسیر کی فہرست میں اس کا مقام سب سے اعلیٰ و ارفع ہے، اگرچہ مختلف زبانوں میں تفسیری عمل کے شاہکار موجود ہیں جن سے قرآنی معارف سے آگاہی اور کلام الٰہی کے اسرار و رموز سے آشنائی حاصل ہوتی ہے کہ ان تمام محققین کی کاوشیں لائق تحسین ہیں اور ان تفاسیر کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں بلند پایہ اہل قلم نے اپنی فکری توانائیاں بروئے کار لا کر عاشقانِ حق و حقیقت اور رہروانِ راہ علم و معرفت کو بے مثال جواہر پاروں کی سوغات دی لیکن ''المیزان'' میں گوہر ہائے قیمتی کا مخزن ہے ان کی نظیر بہت کم ملتی ہے، اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے قرآنِ مجید کی صورت میں بنی نوع انسان کو ایک جامع دستور حیات عطا فرمایا اور اس کی آیات بینات میں اپنی مخلوق کی ہدایت و سعادت کا سامان کر دیا کہ ''وکل شیئ احصیناہ فی کتاب مبین'' کہہ کر اس کی جامعیت کا اعلان فرمایا اور ''وکل شیئی احصیانہ فی امام مبین'' کہہ کر اس کے معانی و حقائق سے آگاہی حاصل کرنے کے راستوں کی نشاندہی فرما دی۔ اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلّوا بعدی ابداً و لن یفترقا حتی یردا علی الحوض'' (میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی عترت اہل بیت، اگر تم ان دونوں سے وابستہ رہے تو ہر گز گمراہ نہ ہو گے اور وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر آجائیں گے) فرما کر قرآنِ مجید سے رہنمائی حاصل کرنے کے ذرائع سے باخبر کر دیا، ہم خوش نصیب ہیں کہ ان دونوں سے وابستہ ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مجھے امید ہے تفسیر المیزان جلد ۴ بھی قارئین کرام کی توجہات و رضایت اور علمی حلقوں میں اپنی ماقبل جلدوں کی طرح مقبولیت حاصل کرے گی، خدایا ہماری اس ناچیز کاوش کو شرف قبولیت عطا فرمانا۔

العبد حسن رضا غدیری
لندن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید جیسی عظیم و جامع کتاب نازل فرما کر بنی نوع انسان پر جو احسان کیا ہے اس پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔قرآن مجید وہ جامع دستور العمل ہے جس میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق نہایت عمدہ اور سعادت بخش اصول و احکام ذکر کئے گئے ہیں۔جس طرح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح قرآن مجید خاتم الکتب ہے، آسمانی کتابوں و صحیفوں میں اس کا مقام نہایت بلند ہے، اس کی جامعیت کسی بیان و وضاحت کی محتاج نہیں، اس کے اسرار و رموز سے ان ہستیوں نے آگاہی دلائی ہے جن کے گھر پر قرآن اترا، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں اس مقدس کتاب کی سورتوں و آیتوں کی علمی و عملی تفسیر بیان فرما کر قیامت تک آنے والی نسلوں کو ہدایت و سعادت کا راستہ بتا دیا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مقدس کتاب کی تفسیر جس طرح خود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کی اور پھر اس کے معانی و مفاہیم کی وضاحت آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے فرمائی وہ حقیقی تفسیر تھی اور اس سے قرآنی معارف سے آگاہی کا حصول یقینی ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ صدرِ اسلام ہی سے ایک غلط روش اس سلسلہ میں اپنائی گئی اور وہ اب بھی جاری ہے یعنی تفسیر بالرائے، اس کی جہاں شدید مذمت وارد ہوئی ہے وہاں اس کے علوم و معارف سے دوری بھی عملی صورت میں دیکھنے کو ملتی ہے، ہر شخص اس مقدس کتاب کے معانی کا تعین کرنے اور اس کی مقدس آیات کی تفسیر کرنے میں قلم اٹھانے اور زبان کھولنے لگتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے، اس کی مقدس آیات سے معارف و مفاہیم کسب کرنے کے لغت و عرف اور دیگر علوم سے مدد تو لی جا سکتی ہے لیکن اس کے معانی کا تعین نہیں ہو سکتا، یہ کام صرف اسی طرح ممکن ہے کہ قرآن کی آیات ہی سے ان کے معانی سمجھے جائیں اور پھر ان سے کسب معارف و توضیح کے لیے آئمہ اہل بیتؑ کی طرف رجوع کیا جائے کہ جنہوں نے ہمیشہ اپنے بیانات میں اس مقدس کتاب کے حوالے دیئے اور اللہ کے عطا کردہ علوم کے ذریعے اس کی آیات کی تفسیر بیان کی، تفسیر القرآن بالقرآن و تفسیر القرآن بالحدیث والسنۃ پر عمل کرتے ہوئے المیزان فی تفسیر القرآن لکھی گئی ہے۔اس میں مؤلف نے اپنی تمام تر علمی و فکری کاوشوں کو بروئے کار لا کر اس مقدس عمل کو پایۂ تکمیل پہنچایا ہے، اس وجہ سے تفاسیر کی دنیا میں اسے سب سے بلند مقام حاصل ہے، المیزان فی تفسیر القرآن علوم و معارف کا ایک خزانہ ہے، اس میں مختلف زاویوں سے آیات کے معانی سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور سب سے اہم اور بنیادی زاویہ یہ قرار پایا ہے کہ ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت کے

ذریعے ہوئی ہے یعنی اس کو ہی اصل بنیاد بنایا گیا ہے تاکہ اس کے فہم المعانی میں آسانی ہو، آئمہ اہل بیتؑ نے آیات کی تفسیر میں جو مطالب بیان فرمائے ہیں وہ قرآنی حقائق کے ادراک میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی ہر مسلمان ومؤمن کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر دین فہمی ممکن نہیں اور دین فہمی کے بغیر اس پر عمل کرنے کا دعویٰ قرین صحت قرار نہیں پاسکتا، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ کو اس کی تبلیغ وترویج اور تفسیر وبیان کی ذمہ داری سونپی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے طور پر ادا کیا لہٰذا اب کسی دوسرے وسیلہ وذریعہ کا سہارا لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، قرآن کی تفسیر کے لیے علماء ومجتہدین اور محققین نے اپنی کاوشیں بروئے کار لاکر مقدور بھر کام کیا ہے جسے یقیناً قابل قدر ولائق تحسین قرار دیا جاسکتا ہے، المیزان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع سے مربوط اہم ترین جہات کو ملحوظ ومدنظر قرار دے کر اس سے کسب فیض کی کوشش کی گئی ہے، اگرچہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قرآن مجید کے تمام اسرار ورموز اور معارف وحقائق سے آگاہی کا حصول کسی بھی عام انسان کے لئے ممکن نہیں کیونکہ یہ خالق کا کلام ہے اور مخلوق کی عقول محدود ہیں، لامحدود ہستی کے کلام کی تمام جہات سے آگاہی پانا محدود مخلوق کے بس کا روگ نہیں، اس مقصد کے لئے تعلیم الٰہی ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان جہات سے آگاہی دلائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام علیؑ کو ان علوم سے آگاہ فرمایا، اور پھر امام علیؑ نے اپنے بعد آنے والے آئمہ اہل بیتؑ کو یکے بعد دیگرے یعنی ایک کے ذریعے دوسرے کو ان ہستیوں میں سے ہر ایک نے اپنے بیان کا استناد پہلے معصوم سے کیا اور جو بات پہلے امام نے کہی وہ آخری نے کہی کہ یہ سلسلہ ان کے برحق نائبین تک پہنچا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اپنی کتاب کی تفسیر کی اشاعت کا شرف وتوفیق عطا فرمائی اور اس سے دعا ہے کہ اس پر عمل کرنے کی سعادت بھی عطا فرمائے۔

سیّد دولت علی زیدی

الغدیر فاؤنڈیشن پاکستان (رجسٹرڈ)

آیات ۱۲۱ تا ۱۲۹*

○ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾

○ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

○ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

○ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ؕ﴿۱۲۴﴾

○ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

○ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ﴿۱۲۶﴾

○ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

○ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

○ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ

○ ''اس وقت کو یاد کرو جب آپ صبح سویرے اپنے گھر بار سے نکل کر مؤمنوں کو جنگ کے لئے مورچوں پر متعین کر رہے تھے، اور اللہ خوب سننے والا، خوب آگاہ ہے''۔

(۱۲۱)

○ ''یہ اس وقت کی بات ہے جب تم میں سے دو گروہ پسپائی کا بھر پور فیصلہ کر چکے تھے جبکہ اللہ ان کا ولی و مددگار تھا، اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے''۔

(۱۲۲)

○ ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بدر کے دن تمہاری نصرت کی جبکہ تم کمزور تھے، لہٰذا تم تقوائے الٰہی اختیار کرو تاکہ شکر گزار بن جاؤ''۔

(۱۲۳)

○ ''اس وقت آپ مومنوں سے کہہ رہے تھے کہ آیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے نازل کر کے تمہاری مدد کرے''۔

(۱۲۴)

○ ''ہاں، اگر تم صبر واستقامت سے کام لو اور تقویٰ اپناؤ، تو اگر کفار تیزی سے تم پر حملہ کر بھی دیں تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار بہادر فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا''۔

(۱۲۵)

○ ''اور یہ سب کچھ خدا نے تمہارے لئے خوشخبری قرار دیا اور یہ کہ اس سے تمہارے دل مطمئن رہیں، حقیقت یہ ہے کہ مدد تو صرف اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جو غالب و طاقتور اور دانا ہے''۔

(۱۲۶)

○ ''یہ مدد اس لئے ہے کہ اللہ کافروں کے ایک بڑے گروہ کا قلع قمع کر دے یا انہیں ذلت سے دوچار کر دے کہ وہ خوار ہو کر پلٹ جائیں''۔

(۱۲۷)

○ ''اس سلسلہ میں آپ کا کوئی تعلق نہیں کہ یا تو خدا ان کی توبہ قبول کر لے یا انہیں عذاب میں مبتلا کرے، یہ لوگ تو ظالم ہی ہیں''۔

(۱۲۸)

○ ''اور آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے، وہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب میں مبتلا کرتا ہے، اور اللہ معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے''۔

(۱۲۹)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ کے ذریعے دوبارہ انہی مطالب کی طرف رخ کیا گیا ہے جن سے سورۂ مبارکہ کا آغاز ہوا تھا، یعنی مومنین کو ان کے سخت مؤقف کے حوالہ سے خبردار کرنا، انہیں خدا کی عطا کردہ نعمت ہائے ایمان، نصرت و کفایت کی یاد دلانا، ان اصولوں کی تعلیم دینا جو انہیں ان کے بلند پایہ مقصد کے حصول کو یقینی بنائیں اور انہیں ان راہوں کی ہدایت کرنا جن پر چل کر وہ اپنی دنیاوی زندگی میں اور مرنے کے بعد سعادتمند ہو جائیں،

اس کے ساتھ ساتھ ان آیات مبارکہ جنگ احد کا واقعہ بھی ذکر کیا گیا ہے اور جن آیات میں جنگ بدر کے واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ درحقیقت جنگ بدر کے تذکرہ کا تکمیلی ضمیمہ ہے کہ جو واقعہ کے اشاراتی و استنادی حوالہ کے طور پر ہے ورنہ یہاں جنگ بدر کا اصل تذکرہ مقصود نہیں، اس سلسلہ میں مزید مطالب عنقریب ذکر کئے جائیں گے اور صورتحال کی وضاحت ہوگی۔

جنگ احد کا اشاراتی تذکرہ

○ وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ

(اور جب آپ اپنے گھر بار سے نکل کر مومنوں کے لئے جنگ کے مورچے متعین کر رہے تھے......)

حرف ''اذ'' ظرف ہے جس کا تعلق محذوف جملہ سے ہے مثلاً ''اذکر'' (یاد کرو) یا اس طرح کے دیگر جملے!

فعل ''غدوت'' کا مصدر ''غدو'' ہے کہ جس کا معنی صبح سویرے باہر نکلنا ہے،

فعل ''تبوی'' کا مصدر تبوئہ ہے جس کا معنی کسی کے لئے جگہ بنانا اور مہیا کرنا، یا کسی کو کہیں ٹھہرانا اور اس کا ٹھکانہ بنوانا ہے۔

لفظ ''مقاعد'' جمع کا صیغہ ہے۔ اس کا مفرد ''مقعد'' (بیٹھنے کی جگہ) ہے۔

لفظ ''اھل'' جیسا کہ مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے...... اس شخص اور افراد کے لئے استعمال ہوتا ہے جونسب یا گھر یا ان کے علاوہ مثلاً دین یا ملک یا صنعت وحرفہ کے حوالہ سے ایک کہلائیں جیسا کہ کسی شخص کی بیوی و بچوں اور اس کے گھر میں رہنے والوں مثلاً خادم و ملازم وغیرہ کو اس شخص کے ''اھل'' (اھل الرجل) کہا جاتا ہے، اسی طرح اس کے خاندان اور قبیلہ کے افراد کو بھی اس سے نسبت رکھنے کے حوالہ سے ''اہل الرجل'' سے موسوم کیا جاتا ہے،...... یعنی اس کے اہل خانہ، اہل خاندان...... (اور ''اہل پاکستان'' (اہالیان پاکستان) ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو خطہ ارضی کے اسی مخصوص علاقہ میں بستے ہوں، اور لفظ فلاں دین والے ''اھل دین کذا'' ...... مثلاً اہل اسلام...... ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو دین اسلام کے معتقد و پیروکار ہوں) اور فلاں صنعت والے ''اھل صناعۃ کذا'' ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو خطہ اراضی کے اسی مخصوص پیشہ وحرفہ اور صنعت سے وابستہ ہوں مثلاً درزی، ترکھان وغیرہ کہ اس صنعت وحرفہ کے ماہرین واساتذہ فن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لفظ ''اھل'' کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے استعمالی موارد میں مذکر و مؤنث اور واحد وجمع میں کوئی فرق نہیں بلکہ سب اس میں شامل ہوتے ہیں اور سب پر یہی لفظ بولا جاتا ہے، یعنی ایک شخص پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے اور کثیر تعداد پر بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے استعمال میں متعین خصوصیت یہ ہے کہ اسے صرف ''انسان'' کے لئے بولا جاتا ہے غیر انسان کے لئے ہرگز نہیں۔

اور جہاں تک ''اہلِ رسولؐ'' کا تعلق ہے تو اس سے آنحضرتؐ کے خاص الخاص افراد مراد ہیں اور وہ ایک سے زیادہ ہیں، اور یہاں آیت مبارکہ میں ''اہل'' سے مراد فرد واحد نہیں کیونکہ اس میں ارشاد ہوا ہے: وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ (اور جب تو اپنے اہل سے نکلا) اور یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنے ایک سے زیادہ متعلقین کو چھوڑ کر گھر سے نکلے، چنانچہ اس کی جگہ یہ الفاظ بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں: ''خرجت من خاصتك ومن جماعتك' (تو اپنے خاص الخاص متعلقین اور اپنی جماعت سے نکلا) لیکن اگر صرف اپنی زوجہ یا والدہ کو چھوڑ کر گھر سے نکلا ہو تو وہاں ''خرجت من اھلك'' (تو اپنے اہل کو چھوڑ کر نکلا) نہیں کہا جاتا اور ''خرجت من زوجتك و خرجت من اھلك'' کے الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے، اسی وجہ سے بعض مفسرین نے ''اہل'' سے جمع کی بجائے مفرد مراد لیا ہے اور آیت مبارکہ سے فہم المعنی کے لئے اس میں لفظ ''بیت'' کو شامل کرنے کے مفروضہ کے ساتھ کہا ہے کہ اسے اس طرح تصور کریں تو معنی واضح ہو جائے گا ''خرجت من بیت اھلك'' (تو اپنے اہل کے گھر سے نکلا)، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کلام میں اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا جاتا۔

اور جہاں تک آیات مبارکہ کے سیاق اور بیانی روش کا تعلق ہے تو وہ خطاب الجمع پر مبنی ہے اور اس میں مومنین کو مخاطب قرار دیا گیا ہے چنانچہ ان آیات سے سابقہ ولاحقہ آیات مبارکہ میں اس کا واضح ثبوت موجود ہے، بنابراین جملہ وَاِذۡ

غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ میں عام مومنین کو مخاطب کرنے کے جاری سلسلہ کو چھوڑ کر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دیا گیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آیات میں مومنین کو مورد عتاب قرار دیا گیا ہے اور ان کی طرف سے کافروں سے قتال اور ان کے مقابلے میں میدان جنگ میں جانے سے سستی و بے پرواہی برتنے پر ان کی مذمت کی گئی ہے لہٰذا ان سے خطاب کا رخ موڑ کر آنحضرت ﷺ کو مخاطب قرار دے کر آپ ﷺ سے مربوط مطالب کو بیان کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوا:

- وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ (اور جب تو اپنے اہل سے باہر آیا)۔
- قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (کہہ دو کہ سارا معاملہ (اور فیصلہ وحکم) خدا کے ہاتھ میں ہے)۔
- فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ (پس تو اللہ کی رحمت کے سبب ان پر نرمی کرتا ہے اور اگر تو ترش رو اور سخت دل والا ہوتا تو وہ تیرے پاس سے دور ہو جاتے، پس تو ان سے درگزر کر)۔
- وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ (اور تم ہرگز گمان نہ کرو ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں مارے گئے کہ وہ مردہ ہیں)۔

تو ان موارد میں خطاب الجمع کے جاری سلسلہ کو تبدیل کر کے خطاب المفرد کو اختیار کیا گیا (عام مومنین سے بات کرنے کے جاری سلسلہ کو چھوڑ کر صرف آنحضرتؐ کو مخاطب قرار دے کر بات کی گئی) کیونکہ وہ موارد کہ جن میں خطاب الجمع کو اختیار کیا گیا ان کا تسلسلی تذکرہ عام طور پر متکلم کے غیض و غضب میں آنے کا موجب بنتا ہے..... لہٰذا خطاب الجمع میں تبدیلی لانا ناگزیر تھا......، جبکہ درج ذیل آیات مبارکہ میں صورتحال اس سے مختلف ہے:

- وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ (آیت ۱۴۴)
  (اور محمد نہیں ہیں مگر رسول، ان سے پہلے کئی رسول آچکے ہیں اگر وہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم اپنی پشتوں کی طرف پلٹ جاؤ گے)
- وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ (آیت ۱۵۳)
  (اور رسول تمہارے پیچھے سے پکار رہے تھے)

تو ان دو آیتوں میں عتابی مورد کے لحاظ سے خطاب المفرد کی بجائے خطاب الجمع ہی زیادہ مؤثر ہے۔

- لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آیت ۱۶۴)
  (اللہ نے مؤمنین پر احسان کیا کہ ایک رسول انہی میں سے مبعوث کیا)

تو اس آیت میں آنحضرت ﷺ کی بعثت کو مومنین کے لئے خدائی احسان قرار دینے میں آپ ﷺ کو غائب کے طور پر ذکر کیا گیا (رسولاً) جو کہ مقام بیان کے حوالہ سے مخاطبین کے نفوس میں زیادہ مؤثر اور دلوں میں بیجا خیالات وتوہمات

کے دور کرنے میں مضبوط کردار ادا کر سکتا ہے، بہر حال آپ آیات مبارکہ میں بخوبی غور وفکر اور تدبر کریں تو آپ کو ہمارے ذکر کردہ مطالب کی صحت و درستی معلوم ہو جائے گی۔

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں زیر بحث آیت مبارکہ "وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ" کا معنی یہ ہے: "واذ کر اذ خرجت بالغداة من اهلك تهيى للمؤمنين مقاعد للقتال او تسكنهم و توقفهم فيها والله سميع لما قيل هناك، عليم بما اضمرته قلوبهم" (اور تو یاد کر اس وقت کو جب تو صبح سویرے اپنے اہل سے نکلا تا کہ مومنین کے لئے مورچے بنائے یا انہیں ان مورچوں میں متعین کرے، اور خدا ہر اس بات کو اچھی طرح سننے والا ہے جو وہاں کہی گئی، اور جو کچھ انہوں نے اپنے دلوں میں چھپایا اس سے بخوبی آگاہ ہے)۔

اور جملہ "وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ" سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ میدان جنگ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہائش گاہ سے نزدیک تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آیتیں (۱۲۱، ۱۲۲) جنگ احد کے واقعہ کو بیان کرتی ہیں، بنابرایں ان دو آیتوں کا ربط آئندہ آنے والی ان آیات مبارکہ سے قائم ہوتا ہے جو جنگ احد کے تذکرہ پر مشتمل ہیں کیونکہ ان کے مضامین و مطالب جنگ احد ہی کے واقعہ پر منطبق ہوتے ہیں، اسی سے ان دو آیتوں کے بارے میں بعض مفسرین کے اظہار خیال کا ضعیف و نادرست ہونا ثابت ہو جاتا ہے کہ جنہوں نے کہا کہ یہ دو آیتیں جنگ بدر کے واقعہ کو بیان کرتی ہیں۔ اسی طرح اس قول کا ضعف بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ دو آیتیں جنگ احزاب کے بارے میں نازل ہوئیں، ان دونوں اظہارات کے ضعف وعدم درستی کی وجہ ظاہر و واضح ہے۔

خدا سب کچھ سننے والا، بخوبی آگاہ ہے

○ "وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ"

(اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے)

اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ وہاں کہا اور آپس میں باتیں کیں خدا وہ سب کچھ سننے والا ہے، اور انہوں نے جو راز دلوں میں چھپائے اور اپنے دلوں کی باتیں دلوں ہی میں پوشیدہ رکھیں ان سب سے بخوبی مطلع و آگاہ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کچھ خاص باتیں اور گفتگو ان کے درمیان ہوئی اور کچھ ایسے امور تھے جو انہوں نے اپنے دلوں میں چھپا لئے، اور ظاہر الکلام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جملہ "اِذْ هَمَّتْ" کا تعلق ان دونوں چیزوں (یعنی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو اور دلوں میں چھپائے گئے مطالب) سے ہے۔

دو گروہوں کی بزدلی کا تذکرہ

○ ''اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا''

(جب تم میں سے دو گروہ بھاگ جانے میں کوشاں تھے جبکہ اللہ ان دونوں کا مددگار تھا)

''هَمَّتْ'' فعل ماضی مونث غائب، ''ھم'' سے مشتق ہے کہ جس کا معنی پختہ ارادہ اور دل میں پیدا ہونیوالا عزم ہے۔

''فشل'' کا معنی خوفزدہ ہو کر کمزور ہو جانا ہے۔

''وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا'' جملہ حالیہ ہے اور فعل ''ہمت'' اس کا عامل ہے۔ اور سیاق الکلام عتاب و مذمت کے مورد میں ہے۔

''وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ'' بھی جملہ حالیہ ہے۔

آیت کا معنی یہ ہے: ان دو گروہوں نے جنگ سے منہ موڑنے کی ٹھان لی حالانکہ خدا ان دونوں کا مددگار رہے اور کسی مومن کو زیب نہیں دیتا کہ وہ بزدلی کا مظاہرہ کرے جبکہ اسے معلوم ہے اور وہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ اس کا مددگار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ مومنین کو چاہیے کہ وہ اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں...... اپنے امور میں اللہ پر بھروسہ کریں...... اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو خدا اس کی کفایت کرنے والا ہے۔

اس بیان سے اس قول کا ضعیف ہونا ظاہر ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''ہمت'' میں ''ھم'' خیالی، تصوراتی و احساسی ہے عزم و پختہ ارادہ پر مبنی نہیں کیونکہ خداوند عالم نے اس آیت میں ان دو گروہوں کی مدح و تعریف کی اور انہیں مطلع و آگاہ کیا ہے کہ وہ ان کا ولی و آقا اور مددگار ہے، اگر ''ھم'' و کوشش سے مراد عزم و پختہ ارادہ ہوتا تو ان کی تعریف و مدح کی بجائے ان کی مذمت کرنا زیادہ موزوں ہوتا۔

میں اس قول کے قائل کے بارے میں کیا کہوں کہ اس نے خیالی، احساسی و تصوراتی کوشش سے کیا مراد لیا ہے؟ کیا اس کی مراد شکست و ناکامی کے مفہوم کا تصور اور اس کے بارے میں صرف دل میں سوچنا ہے؟ تو اس کا تصور و خیال وہاں میدان جنگ میں موجود تمام افراد کے دلوں میں پیدا ہوا اور اسے مومنین کے دو گروہوں کے ساتھ مخصوص کرنا درست قرار نہیں پاتا اور نہ ہی اس طرح کا خیال و احساس اس واقعہ کا حصہ شمار ہو سکتا ہے، اسے لغت میں بھی ''ھم'' نہیں کہا جاتا۔ یا اس کی مراد صرف خیالی و تصوری کوشش نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قدرے عملی اقدام بھی شامل ہے یعنی ایسا تصور و خیال کہ جس سے ان کے قلبی ارادہ و قصد کی عکاسی بھی ہوتی ہو؟ تو یہ اس لئے قرین صحت ہو سکتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ اس سے مراد صرف ان کے دلوں میں پیدا ہونے والا خیال و احساس ہوتا تو ان کی یہ حالت ان کے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو پاتی اور نہ ہی کوئی ان کی اس باطنی کیفیت سے مطلع و آگاہ ہوتا، یعنی اگر صرف ان کے دلوں ہی میں اس طرح کا احساس پیدا ہوتا کہ جس کے ساتھ اس کا

عملی اثر ظاہر نہ ہوتا تو یہ نہ کہا جا سکتا کہ ان دونوں نے شکست و ناکامی اور راہ فرار اختیار کرنے کی ٹھان لی، اس کے علاوہ یہ کہ خداوند عالم کا خود کو ان کا ولی و آقا اور مددگار کہنا یعنی ان کے لئے اپنی ولایت کا ذکر کرنا اور ان پر توکل علی اللہ کا واجب و لازم قرار دینا بھی صرف خیال و احساس کی بناء پر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قدرے عملی اقدام کے حوالہ سے موزونیت رکھتا ہے۔ لہٰذا جملہ "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" تعریف و مدح کی غرض سے نہیں بلکہ مذمت و نصیحت کے طور پر ہے چنانچہ سیاق الکلام سے اسی کا ثبوت ملتا ہے اور اس حوالہ سے ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ مذکورہ بالا قول کے قائل کی نظر اس روایت پر ہو جو جناب جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے جس میں انہوں نے کہا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ ایسی نہ ہوتی کیونکہ اس میں خداوند عالم نے فرمایا ہے "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" کہ اللہ ان دونوں گروہوں کا ولی و مددگار ہے۔ (فینا نزلت، وما احب انها لم تکن لقوله: والله ولیهما) ...... (ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان، ج ا ص ۴۹۴)

شاید اس سے اس قول کے قائل نے یہ سمجھا ہے کہ جناب جابر نے آیت سے مدح و تعریف مراد لیا ہے۔ اگر بالفرض یہ روایت صحیح ہو تب بھی جناب جابر کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے آیت میں مدح و تعریف ہی مراد لیا ہے درست نہیں بلکہ جناب جابر نے تو اس سے مراد یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو قبول کیا اور ان کے مومنین ہونے کی تصدیق کی ہے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ان کا ولی و آقا اور مددگار قرار دیا ہے، اور اللہ مومنوں کا ولی ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے اولیاء طاغوت (شیاطین) ہیں، ایسا نہیں کہ یہ جملہ مدح و تعریف کے مقام میں آیا ہے جبکہ اس میں ظاہر السیاق سے ان کی مذمت و عتاب کا مورد ثابت ہوتا ہے۔

جنگ بدر میں خدائی نصرت کا بیان

○ "وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ"

(اور اللہ نے بدر میں تمہاری نصرت کی جبکہ تم کمزور تھے............)

ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مبارکہ مومنوں کو ان کی بزدلانہ روش پر مورد عتاب قرار دینے کے خدائی عمل کی تکمیل و تاکید کے طور پر ہے، اور نتیجتاً جملہ "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" کی طرح یہ بھی جملہ حالیہ کا معنی دے گی اور اس کا معنی یہ ہوگا: "وما کان ینبغی ان یظهر منکم الهم بالفشل وقد نصرکم الله ببدر وانتم اذلة" (اور یہ بات مناسب نہیں کہ تم سے بزدلی و خوفزدہ ہونے کی کمزوری کا اظہار ہو حالانکہ اللہ نے بدر میں تمہاری نصرت کی جبکہ تم کمزور و شکست خوردہ ہو چکے تھے)۔

ایک امکان یہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہ آیت مبارکہ تکمیل وتاکید کے طور پر نہ ہو بلکہ مستقل کلام ہو جو بعثت نبوی ﷺ کے خدائی احسان کے تسلسلی تذکرہ میں خداوند عالم کی طرف سے حاصل ہونے والی غیر معمولی ومنفرد مدد کے بیان پر مشتمل ہو کہ بدر کے دن خداوند عالم نے فرشتوں کو نازل کر کے مسلمانوں کی مدد ونصرت کی،

اور چونکہ خداوند عالم نے بدر کے دن مومنین کی مدد کرنے کا تذکرہ کیا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس دن مومنوں کے حال زار کو تقابلی طور پر ذکر کیا......اور یہ بات واضح ومعلوم ہے کہ جو شخص بھی عزت کا حامل ہوتا ہے وہ خدائی نصرت ومدد کے ساتھ عزت پاتا ہے کیونکہ انسان اپنے تئیں فقر واحتیاج اور کمزوری (ذلت) وناچاری کے سوا کچھ نہیں پاتا......لہٰذا مومنوں کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ'' جبکہ تم ذلیل وکمزور تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ ''وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ'' (جبکہ تم ذلیل وکمزور تھے) درج ذیل آیت مبارکہ کے منافی نہیں:

سورۂ منافقون، آیت ۸:

○ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ

(اور اللہ کے لئے ہے عزت، اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے!)

اس آیت مبارکہ میں مومنین کے لئے عزت کا ذکر اس بناء پر ہے کہ ان کی عزت خدا کی عزت سے وابستہ ہے اور وہ خدا کی عطا کردہ عزت کا پرتو ہے کیونکہ ہر طرح کی عزت خدا سے مخصوص ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

○ ''فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا''

(پس عزت اللہ کے لئے ہے سب کی سب!)

اور خداوند عالم مومنین کو ان کی نصرت ومدد کر کے عزت عطا کرتا ہے چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد ہوا:

سورۂ روم، آیت ۴۷:

○ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(اور ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول ان کی قوموں کی طرف بھیجے، جو ان کے پاس واضح نشانیاں (روشن دلائل) لائے پھر ہم نے جرم کرنے والوں سے انتقام لیا، کیونکہ مومنین کی مدد کرنا ہمارا حق ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے......)

تو اس صورتحال میں اگر خدائی نصرت ومدد کے علاوہ مومنین کی حالت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے طور پر ذلت کے سوا کچھ حاصل نہیں، چنانچہ اس کی تائید میدانی حقائق سے بھی ہوتی ہے کیونکہ جنگ بدر کے دن مومنین کی حالت زار سے ان کا ذلت و بیچارگی سے دوچار ہونا یقینی تھا جبکہ ان کے مقابل میں مشرکین طاقت وشوکت اور ظاہری طمطراق

کے حوالہ سے ان سے کہیں زیادہ تھے۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ عربی زبان میں لفظ ''ذلت'' جہاں کمزوری وخواری اور بیچارگی کے معنی میں آتا ہے وہاں مہربانی ونرمی اور تواضع وانکساری کا معنی بھی دیتا ہے جبکہ اس کے مقابل میں لفظ ''عزت'' بزرگی وقوت اور غلبہ وبرتری کا معنی دیتا ہے۔ لہٰذا کیا حرج ہے کہ اہل عزت کی طرف نسبی ذلت کی اضافت دی جائے جیسا کہ خداوند عالم نے خود ایسا کیا ہے اور نسبی ذلت کی اضافت ان لوگوں کی طرف دی جن کی بھرپور تعریف کی، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ مائدہ، آیت ۵۴:

O فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

(پس بہت جلد خدا ایسے لوگوں کو لے آئے گا جنہیں وہ دوست رکھتا ہے اور وہ اسے دوست رکھتے ہیں کہ جو مومنین کے سامنے ذلیل (متواضع ومہربان) جبکہ کافروں کے مقابلے میں عزت وغلبہ والے ہیں۔

خدائی امداد کا تذکرہ

O ''اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ......''

(جب تو مومنوں سے کہہ رہا تھا کہ آیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ وہ تمہاری مدد کر رہا ہے......)

''امداد'' کا مصدر ''مد'' ہے، اس کا معنی اتصالی صورت میں مدد پہنچانا ہے۔

صبر اور تقویٰ کا نتیجہ

O ''بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا......''

(ہاں، اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ (تمہارے دشمن) جھپٹ کر تم پر حملہ کر دیں تو اس صورت میں......)

لفظ ''بَلٰى'' تصدیق کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لفظ ''فور'' اور ''فوران'' کا معنی جوش وابال کھانا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: ''فار القدر'' (دیگ کو جوش آ گیا، ابال آ گیا) یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کھانا ابل رہا ہو، یہ تو ہے اس کا لفظی واستعمالی معنی، پھر اسے سرعت وعجلت کے موارد میں استعارۃً استعال کیا جانے لگا، اور جس کام میں کوئی وقفہ وٹھہراؤ اور مہلت نہ ہو اسے ''فوری'' کا نام دیا گیا، اس بناء پر یہاں آیت مبارکہ میں ''فَوْرِهِمْ هٰذَا'' کا معنی ''اسی لمحہ'' اور ''ابھی ابھی'' ہوگا۔

بظاہر اس آیت مبارکہ کا مصداق یوم بدر ہے اور اس میں جو وعدہ کیا گیا ہے وہ مشروط ہے لہٰذا ارشاد ہوا:

○ ''اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا''

(کہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ اسی لمحہ تم پر جھپٹ پڑیں......)

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں خداوند عالم نے مومنین سے وعدہ کیا کہ اگر کفار اس لمحہ کے بعد آ گئے تو خدا مومنین کی مدد کے لئے فرشتے نازل کرے گا، یعنی ''مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا'' سے مراد یوم بدر ہے نہ کہ ان کا بدر کے دن آنا! اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں خداوند عالم نے جنگ بدر کے بعد رونما ہونے والی جنگوں مثلاً جنگ احد، حنین اور احزاب وغیرہ میں فرشتے نازل کر کے مومنین کی نصرت کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن آیت مبارکہ کے الفاظ میں ان دونوں اقوال کی صحت کا کوئی اشارہ و دلیل موجود نہیں، کیونکہ جہاں تک جنگ احد کا تعلق ہے تو اس کی بابت قرآن مجید میں کسی مقام پر کوئی آیت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اس دن اسلامی لشکر کی مدد کے لئے فرشتے آ گئے ہوں، یہ تو کھلی حقیقت ہے، اور جہاں تک جنگ احزاب اور جنگ حنین کا تعلق ہے تو اگرچہ ان دونوں کی بابت فرشتوں کے نازل ہونے کے حوالہ سے قرآن مجید میں تذکرہ موجود ہے مثلاً جنگ احزاب کے بارے میں ارشاد ہوا:

سورۂ احزاب، آیت ۹:

○ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا

(جب تم پر لشکر حملہ آور ہوئے تو ہم نے ان پر تیز ہوا اور ایسے لشکر بھیجے کہ جنہیں تم نے نہیں دیکھا)

اور جنگ حنین کے دن آسمانی لشکر بھیجنے کے بارے یوں ارشاد ہوا:

سورۂ توبہ، آیت ۲۶:

○ ''وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ......وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا''

(اور حنین کے دن......اور اس نے ایسے لشکر اتارے کہ جنہیں تم نے نہیں دیکھا)

لیکن اس کے باوجود جہاں تک ہماری زیر بحث آیت مبارکہ کے الفاظ ''بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا'' کا تعلق ہے تو اس سے خدا کی طرف سے ہر جنگ میں فرشتوں کے ذریعے نصرت و مدد کرنے کے عمومی وعدہ کا ثبوت نہیں ملتا۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ جنگ بدر کے دن تین ہزار فرشتوں کے نازل ہونے کی بات سورۂ انفال کی آیت ۹ کے منافی نہیں کہ جس میں ارشاد خداوندی ہوا:

○ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝

(پھر اس نے تمہاری دعا مستجاب کی کہ میں تمہاری مدد کرتا ہوں ایک ہزار فرشتوں کو یکے بعد دیگر بھیج کر!)

اس میں لفظ ''مُرْدِفِيْنَ'' کا معنی ''یکے بعد دیگرے'' یا ''ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے'' ہے، تو اس طرح مراد وہ دو ہزار فرشتے ہیں جن سے تین ہزار کی وہ تعداد پوری ہوئی جس کا ذکر سورۂ انفال کی آیات میں ہوا ہے۔

خدائی بشارت کا حوالہ

○ ''وَمَا جَعَلَهُ اللهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ''

(اور اسے خدا نے نہیں بنایا مگر تمہارے لیے بشارت وخوشخبری!)

اس آیت میں ''جَعَلَهُ'' کی ضمیر ''ہ'' کی بازگشت ''یمدد کم'' میں امداد کی طرف ہوئی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ خدا نے تمہاری مدد کرنے کو تمہارے لئے بشارت وخوشخبری قرار دیا ہے۔

اور جملہ ''مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ'' میں حرف ''عِنْدِ'' ظرف ہے جو حضور اور موجودگی کا معنی دیتا ہے، یہ حرف ''عِنْدِ'' پہلے مکانی قرب وموجودگی کے لئے استعمال ہوتا تھا کہ جس کا تعلق صرف اجسام سے ہوتا ہے پھر اس میں وسعت پیدا ہوئی اور اسے زمانی قرب کے لئے استعمال کیا جانے لگا، پھر اس کا استعمال اس قدر وسیع ہوا کہ اسے زمانی، مکانی اور معنوی و روحانی تمام اقسام قرب وحضور کے لئے استعمال کیا گیا یعنی مطلق قرب ونزدیکی اور مطلق حضور وموجودگی! اور قرآن مجید میں اسے مختلف فنون وموضوعات اور موارد ومصادیق میں استعمال کیا گیا ہے۔

اور جہاں تک یہاں اس حرف کے استعمال کا تعلق ہے تو جملہ ''وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ'' میں اسے ماقبل جملہ ''وَمَا جَعَلَهُ اللهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ'' کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس سے مراد خداوند عالم کا مقام ربوبیت ہے کہ ہر چیز اور ہر حکم کی بازگشت اسی کی طرف ہوئی ہے اور کوئی چیز نہ تو اس سے بے نیاز ہے اور نہ ہی اس سے ہٹ کر اپنی کوئی مستقل حیثیت رکھتی ہے بلکہ عالم اسباب میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس سے بے نیاز ہو یا بے نیاز کر سکتی ہو یا اس کے علاوہ استقلال کی حامل ہو، بنابرایں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ مدد کرنے والے فرشتے مدد کرنے کے عمل میں اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ صرف ظاہری اسباب ہیں جو تمہارے لئے بشارت وخوشخبری اور اطمینانِ قلب کا سامان فراہم کرتے ہیں اور حقیقی نصرت ومدد صرف اللہ کی طرف سے ہے کہ کوئی چیز اس سے بے نیاز نہیں کر سکتی، اور وہ برحق معبود ہے کہ ہر چیز کی بازگشت اسی کی طرف ہے، وہ ہر شے کا منتہا ہے، وہ ایسا غالب وتوانا ہے جو کسی سے مغلوب نہیں ہوتا، کسی کو اس پر غلبہ پانے کی توان ہی نہیں، وہ دانا ہے کہ جہل ونادانی اس کے نزدیک ہی نہیں آتی۔

کفار کی بیخ کنی و بیچارگی کا ہدف

○ ''لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَوْ يَكْبِتَهُمْ......''

(تاکہ وہ کافروں کے ایک بڑے گروہ کا قلع قمع کردے یا انہیں ذلیل و خوار کرے)

اس آیت میں جملہ ''لِيَقْطَعَ'' (تاکہ قطع کرے) میں حرف لام کا تعلق جملہ ''وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ'' سے ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ خدا نے تمہاری مدد کی تاکہ قطع کرے۔

یہاں ''قطع الطرف'' (لِيَقْطَعَ طَرَفًا) کو ان کے قتل کئے جانے یا اسیر ہونے کے ذریعے ان کی تعداد کو کم کرنے اور انہیں کمزور کرنے سے کنایۃً ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ جنگ بدر کے دن ایسا ہوا کہ مشرکوں کے ستر آدمی قتل ہوئے اور ستر افراد اسیر ہوئے،

اور جملہ ''يَكْبِتَهُمْ'' میں ''کبت'' کا معنی ذلیل و خوار کرنا اور غیظ و غصہ پر برانگیختہ کرنا ہے (اس حالت و کیفیت کا شکار شخص اپنے اندر کھولتا اور مضطرب رہتا ہے)۔

جملہ ''لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ'' ادبی اصطلاح میں جملہ معترضہ کہلاتا ہے اور یہاں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے اس امر کا بیان مقصود ہے کہ کفار کا قلع قمع کرنا (قطع الطرف) اور انہیں ذلیل و خوار کرنا (کبت) خدا کے ہاتھ میں ہے، اس میں حضرت پیغمبر اسلام کا استقلالی کوئی عمل دخل نہیں کہ جس کی بناء پر کفار پر فتح پانے اور ان پر قابو پانے کی صورت میں آنحضرتؐ کی تعریف اور ان کے حسن تدبیر پر ان کی ستائش کی جائے اور اگر کفار کو غلبہ حاصل ہو اور اہل اسلام صورتحال کی سختی و شدت میں اپنی کمزوری و ناتوانی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا بھلا کہنے لگیں جیسا کہ جنگ احد کے دن کی صورتحال کا تذکرہ خداوند عالم نے فرمایا ہے...... کہ اس دن مسلمانوں نے اپنی کمزوری پر آنحضرتؐ کے بارے میں بیجا و غلط باتیں کرنا شروع کردی تھیں، گویا وہ اپنی شکست و کمزوری کا ذمہ دار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلط تدبیر کرنے کو قرار دے رہے تھے۔

جملہ ''أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ'' میں حرف عطف ''أَوْ'' کی بازگشت جملہ ''لِيَقْطَعَ'' کی طرف ہے یعنی جملہ ''أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ''، فعل ''لِيَقْطَعَ'' پر عطف ہوا ہے، اس طرح کلام میں تسلسل و اتصال پیدا ہوجاتا ہے۔

جملہ ''وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ'' میں اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ توبہ و مغفرت کے مسئلہ کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اس طرح آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ خداوند عالم کی طرف سے ہونے والی مضبوط و مستحکم تدبیر کی غرض و غایت یہ تھی کہ کفار کا قلع قمع کرنے کے ہدف کو حاصل کرنے کے لئے انہیں قتل کرنے اور انہیں اسیر بنانے کے ذریعے ان کی تعداد میں کمی اور انہیں ناتوان کردیا جائے، یا اس کا مقصد یہ تھا کہ انہیں ذلت و خواری سے دوچار کرکے ان کی کوششوں کو ناکام بنادیا جائے، یا اس سے مقصود یہ تھا کہ انہیں توبہ کرنے کی راہ پر لایا جائے اور یا یہ کہ انہیں ان کے کئے پر عذاب میں مبتلا

کیا جائے، تو جہاں تک انہیں قلع قمع کرنے کا تعلق ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے کیونکہ سب کچھ اسی کے دست قدرت میں ہے نہ کہ آپؐ کے ہاتھ میں ہے کہ اس کی بناء پر آپ کو مدح یا مذمت کا مستحق قرار دیا جائے اور وہ اس طرح سے کہ اگر آپؐ کی تدبیر کا نتیجہ بہتر صورت میں ظاہر ہو تو آپؐ کی تعریف کی جائے ورنہ مذمت کی جائے، اور جہاں تک توبہ قبول کرنے یا عذاب میں مبتلا کرنے کا تعلق ہے تو وہ اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا مالک ہے اور وہ جسے چاہے مغفرت و بخشش سے نوازے اور جسے چاہے عذاب میں مبتلا کرے، لیکن اس کے باوجود اس کی بخشش و مغفرت اور رحمت اس کے عذاب و غضب پر سبقت رکھتی ہیں کہ وہ معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا مطالب میں ہم نے جملہ "وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ" کی علت و وجہ کے مقام میں اس لئے قرار دیا کہ اس کا ذیلی جملہ یعنی "يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ" انہی دو کے بیان پر مشتمل بلکہ انہی سے مختص تھا،...... اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا کہ خدا جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے عذاب دے کیونکہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اسی کی ملکیت ہے۔

مفسرین کرام نے جملہ "لیقطع طرفاً من المشرکین" کے اتصال و ربط اور جملہ "اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ" میں عطف کے معنی کی بابت دیگر وجوہ و احتمالی آراء ذکر کی ہیں، اسی طرح جملہ "لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ" اور جملہ "وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ" کے بارے میں کہ یہ دو جملے کن امور کی علت و وجہ پر مشتمل ہیں دیگر نظریات پیش کئے ہیں لیکن ہم نے یہاں ان کو ذکر کرنے اور ان کی بابت بحث و اظہار خیال سے پرہیز کیا ہے کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں اور دوسری بات یہ کہ وہ آیات مبارکہ کے ظواہر اور ان کے حوالہ سے ہماری بحث کے جاری سلسلہ میں اختیار کئے گئے اسلوب سے سراسر مختلف و منافی ہیں، بنابرایں اگر قارئین کرام ان آراء و نظریات کے بارے میں آگاہ ہونا چاہیں تو وہ ان تفاسیر کا مطالعہ کریں، جن میں طولانی بحثیں کی گئی ہیں۔

روایات پر ایک نظر

جنگ احد کا تفصیلی تذکرہ

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: جنگ احد کے برپا ہونے کا سبب یہ تھا کہ جب قریش جنگ بدر سے مکہ واپس آئے ...... اور انہیں اس جنگ میں قتل و اسارت جیسی سخت

ترین مصیبتوں کو جھیلنا پڑا، کیونکہ ان کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر قید کر لئے گئے...... تو ابوسفیان نے ان سے کہا: اے قریشیو! اپنی عورتوں کو اپنے مقتولین پر گریہ کناں مت چھوڑو کیونکہ جب آنسو نکل جائیں تو وہ محمد سے عداوت اور مقتولین کا غم بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے، (آتش حزن وعداوت ڈھنڈی ہو جائے گی) تو انہوں نے جنگ بدر کی شکست کا بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا اور جب اس مقصد کو عملی جامہ پہنانا چاہا تو اپنی عورتوں کو گریہ و نوحہ سرائی کی عام اجازت دے دی بلکہ انہیں اسی کام پر لگا دیا...... تا کہ جذبات واحساسات میں گرمی پیدا ہو...... چنانچہ جب وہ جنگ کرنے کے لئے مکہ سے نکلے تو وہ تین ہزار گھوڑے سوار اور دو ہزار پیادہ افراد کے لشکر پر مشتمل تھے اور انہوں نے اپنی عورتوں کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا، (ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان ج ۱۔ ۲ ص ۵۹۴)

جب قریش کی لشکر کشی کی خبر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور انہیں جہاد کی ترغیب دلائی، صحابہ میں سے عبداللہ بن ابی بن سلول (جو منافقوں کا سردار تھا) کہنے لگا:

یا رسول اللہ ! لا تخرج من المدینة حتی نقاتل فی ازقتها فیقاتل الرجل الضعیف والمرأة والعبد والامة علی افواه السکك و علی السطوح فما ارادنا قوم قط فظفروا بنا و نحن فی حصوننا و دورنا وما خرجنا الی عدولنا قط الا کان الظفر لهم علینا۔

اے رسول خدا! مدینہ سے بارہ نہ نکلیں یہاں تک کہ دشمن مدینہ کے اندر آ جائے اور ہم مدینہ کی گلی کوچوں میں ان سے قتال کریں تا کہ ہمارے کمزور آدمی، عورتیں اور غلام وکنیزیں بھی گلی کوچوں اور گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر ان پر حملہ کرنے میں ہمارے ساتھ ہوں کہ اس طرح ان پر قابو پانا ہمارے لئے آسان ہو جائے گا کیونکہ...... تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ...... جب بھی کسی نے ہم پر حملہ کیا اور ہم اپنے قلعوں اور گھروں میں تھے تو ہمیں دشمن پر غلبہ و کامیابی حاصل ہوئی لیکن جب ہم اپنے دشمن کی طرف گئے تو ہمیشہ دشمنوں ہی کو ہم پر غلبہ و کامیابی حاصل ہوئی،

سعد بن عبادہ اور قبیلہ اوس کے چند افراد کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا:

یا رسول اللہ ! ما طمع فینا احد من العرب و نحن مشرکون نعبد الاصنام فکیف یطمعون فینا وانت فینا؛ لا حتی نخرج الیهم فنقاتل فمن قتل منا کان شهیداً ومن نجا منا کان قد جاهد فی سبیل الله۔

اے رسول خدا! ہم جب مشرک و بت پرست تھے تو کسی کو ہم پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی اور اب جبکہ آپ ہم میں موجود ہیں تو کسی کی کیا مجال کہ ہمیں نشانہ بنائے؟ ہرگز نہیں، ہم ضرور دشمن کی طرف نکلیں گے اور ان سے نبرد آزما ہوں گے، ہم میں سے جو شخص مارا گیا وہ شہید ہوگا اور جو نجات پا گیا تو مجاہد فی سبیل اللہ قرار پائے گا۔

حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کی اس رائے کو پسند اور قبول فرمایا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کے ہمراہ کوچ کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کا مناسب میدان ڈھونڈنے لگے، اسی سلسلہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا: ''وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ '' کہ جب تو صبح سویرے گھر سے نکلا اور مومنوں کو جنگ کے لئے مورچوں پر متعین کر رہا تھا، اور اللہ خوب سننے والا، خوب آگاہ ہے۔

عبداللہ بن ابی بن سلول آنحضرت ﷺ کے ہمراہ نہ آیا اور قبیلہ خزرج کے کچھ لوگ بھی اس کے ساتھ ہو گئے اور وہ سب مدینہ ہی میں رہے۔

ادھر قریش کا لشکر احد کے نزدیک پہنچ گیا، آنحضرت ﷺ نے سپاہ اسلام کی ترتیب دی جو کہ سات سو افراد تھے، چنانچہ عبداللہ بن جبیر کو پچاس تیز اندازوں کے ساتھ درہ کے دروازہ پر متعین کر دیا اور انہیں خبردار و ہوشیار رہنے کا حکم دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کمین گاہوں سے حملہ کر دے، آپؐ نے عبداللہ بن جبیر اور اس کے ساتھیوں سے فرمایا: ''ان رأیتمونا قد هزمناهم حتی ادخلناهم مکة فلا تبرحوا من هذا المکان، وان رأیتموهم قد هزمونا حتی ادخلونا المدينة فلا تبرحوا والزموا مراکزکم، '' اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو پچھاڑ دیا ہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں مکہ سے دھکیل دیا ہے تب بھی تم اس جگہ سے ہٹنے نہ پانا، اور اگر تم دیکھو کہ دشمن نے ہمیں مغلوب کر دیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے ہمیں مدینہ کے اندر دھکیل دیا ہے تب بھی تم اپنی جگہوں پر قائم رہنا، (فتح و شکست دونوں صورتوں میں تم اپنے مورچوں کو ہرگز نہ چھوڑنا)

قریش کے لشکر میں ابوسفیان نے خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے ہمراہ کمین گاہوں میں متعین کر دیا اور ان سے کہا: اذا رأيتمونا قد اختلطنا فاخرجوا عليهم من هذا الشعب حتی تکونوا وراء هم کہ جب تم دیکھو کہ ہم ان پر حملہ کر چکے اور ان سے مڈبھیڑ ہو چکی ہے تو تم اس درہ سے ان پر حملہ کر دینا تاکہ تم ان کے پچھلی طرف قرار پاؤ...... کہ اس طرح وہ بھاگنے نہ پائیں گے......

صورتحال کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے اپنے اصحاب کو جنگ کے لئے پوری طرح تیار کر لیا اور پرچم اسلام حضرت امیر المومنینؑ کے سپرد کیا، انصار نے مشرکین قریش پر حملہ کیا اور انہیں اس طرح پچھاڑا کہ وہ نہایت ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو گئے، صحابہ کرام نے ان کا پیچھا کیا، خالد بن ولید نے دو سو سواروں کے ساتھ عبداللہ بن جبیر پر حملہ کر دیا مگر عبداللہ بن جبیر نے اس کا بھرپور مقابلہ کرتے ہوئے ان پر تیروں کی بارش کر دی جس کے نتیجہ میں خالد پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا، دوسری جانب عبداللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے دیکھا کہ صحابہ کرام دشمن کے اموال پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے عبداللہ بن جبیر سے کہا کہ ہمارے ساتھیوں نے مال غنیمت کو خوب لوٹا مگر ہم ہیں کہ ہمیں کچھ بھی نہیں ملا، عبداللہ نے ان سے کہا: اتقوا الله فان رسول الله قد تقدم الينا ان لا نبرح، فلم يقبلوا منه واقبلوا ينسل رجل فرجل حتی اخلوا

مراکزھم، وبقی عبداللہ بن جبیر فی اثنی عشر رجلاً، خدا سے ڈرو، حضرت رسول خدا ﷺ نے جنگ سے پہلے ہی ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنی جگہ سے بالکل نہ ہٹیں، لیکن صحابہ کرام نے آپ ﷺ کے فرمان پر عمل نہ کیا اور یکے بعد دیگرے سب افراد مورچوں سے کوچ کر گئے اور عبداللہ بارہ آدمیوں کے ساتھ وہاں باقی رہ گئے۔

دوسری جانب قریش کا پرچم طلحہ بن ابی طلحہ عبدی کے پاس تھا جو کہ قبیلہ بنی عبدالدار میں سے تھا اسے حضرت علیؑ نے موت کے گھاٹ اتار دیا، پھر ابوسعد بن ابی طلحہ نے پرچم ہاتھ میں لے لیا تو اسے بھی حضرت علیؑ نے قتل کر دیا، قریش کا پرچم زمین پر گر گیا اور مسافح بن ابی طلحہ نے اٹھالیا، اسے بھی حضرت علیؑ نے موت کے گھاٹ اتار دیا، اسی طرح قبیلہ بنی عبدالدار کے نو آدمی مولا علیؑ کے ہاتھوں فی النار ہوئے، بالآخران کا پرچم ان کے ایک سیاہ فام غلام کے ہاتھ میں آ گیا جس کا نام ''صواب'' تھا، حضرت علیؑ نے اس کے پاس پہنچ کر اس پر حملہ کیا اور اس کا دایاں ہاتھ قطع کر دیا اس نے پرچم اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا، حضرت علیؑ نے اس کا بایاں ہاتھ بھی قطع کر دیا، اس نے اپنے بازوؤں کی مدد سے پرچم کو اپنے سینے سے لگالیا اور اسی حالت میں ابوسفیان کی طرف متوجہ ہو کر اس سے کہنے لگا: کیا میں نے بنی عبدالدار کے ساتھ وفا کرنے میں کوئی کمی کی ہے؟ اس اثناء میں حضرت علیؑ نے اس کے سر پر ایک وار کیا اور اسے واصل جہنم کر دیا، اس طرح قریش کا پرچم سرنگوں ہو کر زمین پر گر پڑا، عمرۃ بنت علقمہ کنانیہ نے اسے اٹھایا اور ہاتھوں پر بلند کیا۔

ادھر خالد بن ولید نے جناب عبداللہ بن جبیر پر کہ جن کے اکثر ساتھی بھاگ گئے تھے اور وہ معدودے چند افراد کے ساتھ وہاں موجود تھے، حملہ کر دیا اور ان سب کو اسی درہ کے دہانے پر ہی شہید کر دیا اور پھر پیچھے سے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا، اس وقت قریش جو کہ بھاگ رہے تھے اپنے پرچم کو پھر ہوا میں لہراتا دیکھ کر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے، یہ صورتحال دیکھ کر صحابہ رسول ﷺ بھاگنے لگے اور اس طرح بھاگے کہ نہایت ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو گئے تھے، کچھ تو پہاڑوں پر چڑھ گئے اور کچھ مختلف پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔

جب آنحضرت ﷺ نے اصحاب کے فرار کی یہ کیفیت دیکھی تو اپنی دستار مبارک سر سے اتار کر بھاگ جانے والے اپنے صحابہ کو آواز دی اور پکار کر فرمایا: الی، انا رسول اللہ، الی این تفرون عن اللہ وعن رسولہ؟ میرے پاس آؤ، میں اللہ کا رسول ہوں، تم اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ کر کہاں بھاگے جا رہے ہو؟

اس دوران ہند بنت عتبہ لشکر کے درمیان کھڑی تھی، اس کے ہاتھ میں سرمہ دانی اور سلائی تھی اور جب بھی کوئی فراری س کے سامنے سے گزرتا تو وہ سرمہ دانی اور سلائی اس کے سامنے کر کے کہتی: انما انت امرأۃ فا کتحل بھذا، تو تو عورت ہے، لے اور یہ سرمہ لگا لے!

ادھر حضرت حمزہ بن عبدالمطلب دشمنوں پر لگاتار تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے، کوئی ان کے سامنے تاب وتوان نہ رکھتا

تھا بلکہ جو بھی سامنے آتا وہ بھاگ جانے پر مجبور ہو جاتا تھا، اور ابوسفیان کی بیٹی ہند نے ایک وحشی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ محمد یا علی یا حمزہ کو قتل کرے تو وہ فلاں انعام دے گی، وحشی جو کہ جبیر بن مطعم کا غلام تھا اور حبش کا رہنے والا تھا اس نے کہا: اما محمد فلم اقدر علیه، واما علی فرائیته حذراً کثیر الالتفات فلا مطمع فیه، فکمنت حمزة فرائته، یهد الناس هدا فمربی فوطئ علی جرف نهر فسقط، واخذت حربتی فهززتها و رمیته بها فوضعت فی خاصرته وخرجت ثنته فسقط فاتیته فشققت بطنه واخذت کبده وجئت به الی هند فقلت هٰذه کبد حمزة فاخذتها فی فمها فلا کتها فجعله الله فی فمها مثل الداعضة ... وهی عظم راس الرکبة... فلفظتها ورمت بها، جہاں تک محمد کا تعلق ہے تو انہیں قتل کرنا میرے بس میں نہیں، اور علی کو میں نے نہایت ہوشیار اور ہر طرف نظر رکھنے والا پایا ہے لہٰذا اسے بھی قتل نہیں کیا جا سکتا، بنابرایں میں نے حمزہ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر کے ان کی گھات میں بیٹھ گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ لوگوں کو میدان سے دور ہٹ جانے کی تاکید کر رہا تھا، جب وہ میرے سامنے سے گزرا تو لب نہر اس کا پاؤں پھسلا اور زمین پر گر گیا، میں نے فوراً اپنا نیزہ اٹھایا اور میں نے اسے اس کی طرف پھینکا، نیزہ اس کے پہلو میں لگا اور اس کے سینہ سے باہر نکل گیا وہ زمین پر گر گیا، میں اس کے پاس آیا اور میں نے اس کا پیٹ چیرا اور اس کا جگر باہر نکالا اور اسے ہندہ کے پاس لے آیا، میں نے ہندہ سے کہا یہ حمزہ کا جگر ہے، اس نے وہ مجھ سے لے کر اسے دانتوں میں چبایا، خداوند عالم نے اسے ہندہ کے منہ میں گھٹنے کی ہڈی کی طرح سخت بنا دیا، ہندہ نے اسے چبانے کی کوشش کی اور پھر اسے منہ سے نکال کر پھینک دیا، حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: فبعث الله ملکا فحمله ورده الی موضعه، خداوند عالم نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اس (جگر) کو اٹھا لیا اور اسے اس کی اصل جگہ پر لوٹا دیا (حضرت حمزہ کے جسم مبارک میں دوبارہ رکھ دیا)۔

وحشی غلام کا کہنا ہے کہ اس کے بعد ہندہ حمزہ کی لاش کے پاس آئی اور اس نے اس کے کان اور اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے۔

اس دوران صحابہ کرام میں سے ابودجانہ سماک بن خرشہ اور علیؑ کے علاوہ کوئی شخص رسول خداؐ کے ساتھ باقی نہ رہا، جب بھی دشمن کی طرف سے حضرت رسول خداؐ پر حملہ ہوتا تو علیؑ آگے بڑھ کر آنحضرتؐ کا دفاع کرتے اور انہیں دشمن کے حملہ سے بچا لیتے، یہاں تک کہ ان کی تلوار ٹوٹ گئی اور حضرت رسول خداؐ نے انہیں اپنی تلوار (ذوالفقار) عطا فرمائی اور خود احد کے اطراف میں مورچہ زن ہوئے، اس دوران حضرت علیؑ مسلسل جنگ کرتے رہے اور دشمن کے مقابلے میں اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت علیؑ کے سر، چہرہ، جسم، شکم اور پاؤں شدید زخمی ہو گئے اور ان کے بدن پر ستر زخم لگے،...... منقول از تفسیر علی بن ابراہیم......، اس وقت حضرت جبرائیلؑ نے کہا: ان هذه لهی المواساة یا محمد، اے حبیب خدا! یہ ہے حقیقی مدد اور سہارا بننا، اس کے جواب میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: انه منی و انا منه، وہ تو مجھ سے ہے اور میں اس

سے ہوں، جبرائیلؑ نے کہا: وانا منکما، اور میں آپ دونوں سے ہوں، (تفسیر قمی ج1 ص110)، امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: اس وقت حضرت رسول خداؐ نے جبرائیل کو دیکھا کہ وہ آسمان اور زمین کے درمیان سونے کے تخت پر بیٹھے ہوئے یہ قصیدہ پڑھ رہے ہیں: لا سیف الا ذوالفقار، لافتی الا علی، نہ تو ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار ہے اور نہ علی کے علاوہ کوئی جوان ہے)۔

تفسیر قمی میں مذکورہ روایت کے مطابق اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نسیبہ بنت کعب مازنیہ بھی تھیں...... جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تمام جنگوں میں موجود ہوتی تھی اور زخمیوں کا علاج معالجہ اور انہیں طبی سہولتیں مہیا کرتی تھی...... اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی موجود تھا' صورتحال کی سنگینی کو دیکھ کر وہ بھی بھاگنے پر تل گیا تھا کہ اس کی ماں اس پر ٹوٹ پڑی اور اس سے کہا: الی این تفر عن اللہ وعن رسولہ' تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے' نسیبہ نے اسے میدان کارزار کی طرف لوٹا دیا' ایک شقی نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا' نسیبہ نے اپنے بیٹے کی تلوار اٹھائی اور اس کے قاتل پر دھاوا بول دیا اور اس کی ران پر ایسا وار کیا کہ اسی لمحہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا' نسیبہ کی جرأت اور ایمان کی پختگی کو دیکھ کر حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: بارك الله فيك يا نسيبه' خدا تیرے وجود میں برکت قرار دے اے نسیبہ! نسیبہ آنحضرتؐ پر ہونے والے حملوں میں اپنے آپ کو آگے کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچاتی رہی اور دشمنوں کے وار اپنے سینہ پر لے کر زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود رسول خداؐ پر ڈھال بنی رہی' (ملاحظہ ہو تفسیر قمی' ج ا ص ۱۱۵)

جنگ احد کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص جس کا نام "ابن قمئہ" تھا اس نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کر دیا اور بلند آواز سے پکار رہا تھا: مجھے بتاؤ محمد کہاں ہے اگر وہ بچ گیا تو میں زندہ نہ بچوں' اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھے پر نیزہ مارا اور پکار کر کہنے لگا: مجھے لات وعزی کی قسم میں نے محمد کو قتل کر دیا ہے۔

مؤلف: جنگ احد کے تذکرہ میں دیگر روایات بھی وارد ہوئی ہیں کہ جن میں مذکورہ بالا روایات سے مختلف مطالب پائے جاتے ہیں مثلاً:

(۱) اس روایت میں مذکور ہے کہ اس دن مشرکین کی تعداد پانچ ہزار تھی جبکہ اکثر روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ ان کی تعداد تین ہزار تھی۔

(۲) اس روایت میں بیان ہوا ہے کہ حضرت علیؑ نے دشمن کے تمام پرچمداروں کو قتل کیا کہ جن کی تعداد نو تھی اور اس کی تائید دیگر روایات میں بھی ہوتی ہے کہ جنہیں ابن اثیر نے تاریخ کامل میں ذکر کیا ہے' البتہ اس کے مقابلے میں دیگر روایات اس کی نفی کرتی ہیں اور ان میں مشرکین کے پرچم داروں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی نسبت حضرت علیؑ کے علاوہ دیگر افراد کی طرف دی گئی ہے' لیکن واقعہ کے جملہ پہلوؤں کا غور سے جائزہ لیا جائے تو حضرت علیؑ کی طرف نسبت والی روایت

قرین صحت معلوم ہوتی ہے۔

(۳) اس روایت میں بیان ہوا ہے کہ ہندہ نے حضرت حمزہ کو قتل کرنے کی بابت وحشی کو انعام واکرام کا وعدہ کیا تھا اہل سنت کی روایات میں مذکور ہے کہ وہ وعدہ ہندہ نے نہیں کیا تھا بلکہ اس وحشی غلام کے آقا جبیر بن مطعم نے کیا تھا اور وہ وعدہ یہ تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کردے تو وہ اسے آزاد کردے گا' لیکن وحشی کا حضرت حمزہ کے جگر کو نکال کر ہندہ کے پاس لانا مذکورہ بالا روایت کی صحت کو یقینی بناتا ہے...... اور اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ وعدہ ہندہ نے کیا تھا نہ کہ جبیر نے!......'

(۴) زیر بحث روایت میں مذکور ہے کہ تمام مسلمان حضرت رسول خداؐ کو چھوڑ کر بھاگ گئے سوائے حضرت علیؑ اور ابودجانہ کے' اس مطلب پر تو تمام روایات متفق ہیں البتہ بعض روایات میں ان دو حضرات کے علاوہ دیگر افراد کے نام بھی ذکر ہوئے ہیں یہاں تک کہ بعض روایتوں میں ان کی تعداد تیس تک ذکر ہوئی ہے لیکن ان روایات میں جو مطالب مذکور ہیں ان سے خود ان روایات میں تعارض وتضاد دکھائی دیتا ہے اور ایک دوسرے کی نفی کے پہلو موجود ہیں لہٰذا قارئین کرام خود اس حوالہ سے کسی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے واقعہ کے اصل حقائق کا بغور جائزہ لے کر مربوطہ قرائن کو ملحوظ رکھتے ہوئے حقیقت حال سے آگاہی حاصل کرسکتے ہیں کیونکہ اس طرح کے واقعات اور ان سے مربوط روایات میں مذکور مطالب کا تاریخی پس منظر نہایت گھمبیر ہے اور اگر اس حوالہ سے باریک بینی سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے بیان اور روایات کی تدوین کے مراحل میں موافق ومخالف افکار کی عملداری رہی اور طویل عرصہ پر محیط یہ سلسلہ کئی تاریک وروشن حالات ومراحل سے گزر کر ہم تک پہنچا____ تو ظاہر ہے کہ اس صورتحال میں گوناگوں آرام وترجیحات بے اثر نہیں ہوئی ہوں گی____'

(۵) اس روایت میں مذکور ہے کہ خداوندعالم نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے حضرت حمزہ کے جگر کو اٹھا کر ان کے جسم مین دوبارہ اصل جگہ پر رکھ دیا' یہ مطلب اکثر روایات میں مذکور نہیں' اس کی بجائے جو بات بعض روایات میں ذکر کی گئی ہے مثلاً تفسیر درمنثور میں ابن ابی شیبہ سے اور احمد وابن منذر کے حوالہ سے ابن مسعود سے منقول روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ ابو سفیان نے کہا کہ مثلہ کرنے کا عمل جو کہ مسلمانوں کے مقتولین کے ساتھ ہوا ہے اگرچہ اسے ہمارے نامور افراد نے انجام نہیں دیا مگر اس سلسلہ میں میں نے کوئی حکم دیا اور نہ ہی ایسا کرنے سے روکا ہے' نہ میں نے اس عمل کو پسند کیا ہے اور نہ ہی ناپسند کیا ہے' اور اس سے نہ تو مجھے خوشی ہوئی اور نہ ہی دکھ پہنچا' (راوی نے کہا) انہوں نے حضرت حمزہ کو دیکھا کہ ان کا پیٹ پھاڑ دیا گیا اور ہند نے ان کا جگر اٹھالیا اور اسے اپنے دانتوں میں چبایا مگر اسے کھا نہ سکی' اس وقت حضرت رسول خداؐ نے دریافت فرمایا کہ آیا اس نے کچھ کھایا ہے؟ تو بتایا گیا کہ نہیں' آپؐ نے ارشاد فرمایا: خداوندعالم حمزہ کے بدن کی کوئی چیز آگ میں ہرگز نہیں نہ جانے دے گا' الخ' (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۸۲)

ہمارے محدثین اور ان کے علاوہ دیگر حضرات کی ذکر کردہ روایات میں بیان ہوا ہے کہ اس دن حضرت پیغمبر اسلامؐ کی پیشانی مبارک زخمی ہوئی اور مغیرہ کا تیر لگنے سے آپؐ کے دندانِ مبارک ٹوٹ گئے اور سامنے کے دانت شہید ہوئے۔

مزید تفصیلات پر مبنی روایت

تفسیر در منثور میں ہے کہ ابن اسحاق' عبد بن حمید' ابن جریر' ابن منذر نے ابن شہاب کے حوالہ سے' اور محمد بن یحییٰ بن حیان' عاصم بن عمرو بن قتادہ' حصین بن عبدالرحمٰن بن عمرو بن سعد بن معاذ اور ان کے علاوہ دیگر راویوں میں سے ہر ایک نے جنگ احد کی بعض تفصیلات بیان کی ہیں کہ ان کے بیان کردہ مطالب کچھ اس طرح ہیں:

جنگ بدر میں قریش یا کفار قریش میں سے متاثرہ افراد مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر مکہ واپس آئے اور ابوسفیان بھی اپنے قافلہ کے ہمراہ مکہ واپس پہنچ گیا تو عبداللہ بن ابی ربیعہ' عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ' قریش کے ان چند افراد کے ہمراہ کہ جن کے باپ دادا' بھائی بیٹے وغیرہ جنگ بدر میں ہلاک ہو گئے تھے ابوسفیان بن حرب اور اس کے قریشی تاجر کے گروہ کے پاس آئے اور ان سے کہا: **یا معشر قریش ان محمداً قد وترکم و قتل خیارکم فأعینونا بھذا المال علی حربہ لعلنا ندرك منه ثاراً بمن أصاب** ' اے اہل قریش! محمد نے تمہارا خون بہایا ہے اور تمہارے نامور افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے' آؤ اور اپنے اس مال سے ہماری مدد کرو تاکہ ہم اس سے جنگ کریں اور اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں' ابوسفیان اور اس کے ساتھی تاجروں نے ان کی معاونت کی اور مسلمانوں سے بدلہ لینے کے منصوبہ میں ان کے ساتھ ہو گئے' قریش نے حضرت رسول خداؐ سے جنگ کرنے کے لئے بھرپور تیاری کر لی اور پورے ساز و سامان کے ساتھ تازہ دم جنگجوؤں کے ہمراہ روانہ ہو گئے' انہوں نے اپنی عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لیا تاکہ لڑنے والوں کو ہمت و حوصلہ ملے اور کوئی میدان جنگ سے بھاگنے نہ پائے' ابوسفیان کی قیادت میں کفار کا لشکر چلتے چلتے مدینہ کے قریب پہاڑ کے دامن میں واقع سنجہ کے نزدیک وادی میں داخل ہو گئے' جب آنحضرتؐ اور مسلمانوں کو مشرکوں کے پہنچ جانے کی خبر ملی تو آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک گائے ذبح کی جا رہی ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ میری تلوار کا سرا دو نیم ہو گیا ہے اور یہ بھی دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں ڈال دیا ہے تو میں نے اس زرہ کو مدینہ سے تعبیر کیا ہے، اگر تم مناسب جانو تو مدینہ میں ہی رکے رہو اور کفار کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ جہاں چاہیں پڑاؤ کر لیں' اگر وہ اسی جگہ قیام پذیر ہو گئے تو وہ ان کے لئے بدترین جگہ ہو گی اور اگر وہ ہمارے شہر میں داخل ہوئے تو اپنے شہر ہی میں ان سے قتال کریں گے۔

ادھر قریش پیش قدمی کرتے ہوئے بدھ کے روز احد کے مقام پر پہنچ گئے اور انہوں نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا' وہ جمعرات اور جمعہ کے دن بھی وہیں رکے رہے' جمعہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر احد کی طرف روانہ ہو گئے' اس طرح پندرہ شوال تین ہجری بروز ہفتہ جنگ کا آغاز ہو گیا' حضرت رسول خداؐ نے مدینہ سے باہر نہ نکلنے کی جو رائے دی اس میں

عبداللہ بن ابی نے آپؐ سے پورا پورا اتفاق کیا تھا اور آنحضرتؐ مدینہ چھوڑنا پسند نہ کرتے تھے لیکن کچھ مسلمانوں نے کہ جن میں اکثر اس جنگ میں شہید ہو گئے اور خدا نے انہیں شہادت کی عزت عطا کی اور ان کے علاوہ کچھ اور حضرات جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے انہوں نے حضرت رسول خداؐ سے عرض کی: یا رسول الله، اخرج بنا الیٰ أعدائنا لا یرون انا جنبنا عنهم و ضعفنا۔ اے پیغمبر خدا! ہمیں ہمارے دشمنوں کی طرف روانہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہ سوچنے لگیں کہ ہم نے ان سے پیٹھ پھیر لی ہے اور ہم کمزور پڑ گئے ہیں، ادھر عبداللہ بن ابی نے آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں عرض کی: یا رسول الله، أقم بالمدینة ولا تخرج الیهم فوالله ما خرجنا منها الیٰ عدولنا قط الا أصاب منا ولا دخلها علینا الا أصبنا منهم فدعهم یا رسول الله فان أقاموا بشر، وان دخلوا قاتلهم النسآء والصبیان والرجال بالحجارة من فوقهم، وان رجعوا خائبین کما جاؤوا۔ اے رسول خدا! آپ مدینہ ہی میں رہیں اور دشمن کی طرف نہ جائیں، خدا کی قسم ہم جب بھی مدینہ سے باہر نکلے اور دشمن سے لڑنے اس کی طرف گئے تو ہم نے شکست کھائی اور جب بھی دشمن ہمارے شہر میں داخل ہوا اور اس نے ہم پر دھاوا بولا تو اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں، اگر وہ وہیں رک گئے تو ان کا انجام برا ہی ہوگا اور اگر ہمارے شہر میں گھس آئے تو عورتیں، بچے اور مرد سب ہی ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور ان کے اوپر سے ان پر پتھروں کی بارش کر دیں گے، اور اگر وہ اپنی اس جگہ سے واپس پلٹ گئے تو اسی طرح ناامید لوٹیں گے جس طرح آئے تھے، تاہم وہ لوگ جو آنحضرتؐ سے درخواست کر رہے تھے کہ دشمن کی طرف جائیں اور اس پر حملہ کر دیں وہ اپنے اصرار پر قائم رہے اور بارگاہِ رسالت میں اپنے رائے پر موافقت کرنے کی استدعا کرتے رہے، بالآخر آنحضرتؐ نے دشمن کی طرف روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور جنگی لباس زیب تن کرنے کے لئے گھر تشریف لے گئے، یہ سب کچھ جمعہ کے دن نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد ہوا، آپؐ تیار ہو کر گھر سے باہر تشریف لائے، جب آنحضرتؐ کے عزم بالجزم کو لوگوں نے دیکھا تو ان کے دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ شاید آپؐ ہمارے اصرار پر مجبور ہوئے ہیں لہٰذا پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے آپؐ کی خدمت اقدس میں عرض کی: أستکرهنا رسول الله (ص) ولم یکن لنا ذلك فان شئت فاقعد۔ شاید ہم نے آپ کو مجبور کیا ہے اے رسولِ خدا (ص)! ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، اگر آپؐ کی مرضی ہو تو رک جائیں، ان کے جواب میں حضرت رسولِ خداؐ نے ارشاد فرمایا: ما ینبغی لنبی اذا لبس لامته ان یضعها حتی یقاتل۔ کسی نبی کے لئے روا نہیں کہ وہ جنگی لباس پہن کر اتار دے جب تک جنگ تمام نہ کر لے۔

بہر حال حضرت رسول خداؐ اپنے ایک ہزار ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے، ابھی مدینہ اور احد کے درمیان شوط کے مقام پر پہنچے تھے کہ عبداللہ بن ابی نے ایک تہائی افراد کو منحرف کر دیا اور وہ واپس چلے گئے مگر آنحضرتؐ نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ بنی حارثہ کے علاقہ میں داخل ہو گئے، وہاں ایک گھوڑا جو کہ اپنی دم سے مکھیاں ہٹا رہا تھا اس کی دم کسی کی

تلوار کی نوک میں پھنس گئی جس نے تلوار کو غلاف سے باہر نکال دیا' اس وقت حضرت رسول خداؐ نے تلوار والے سے ارشاد فرمایا ـــــ آنحضرتؐ فال گیری کو پسند کرتے تھے اور اسے نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے ـــــ اپنی تلوار کو غلاف سے باہر ہی رکھو کیونکہ مجھے لگ رہا ہے کہ آج تلواریں نکالی جائیں گی' آنحضرتؐ نے پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ احد کے ایک درہ تک پہنچ گئے' وہ درہ وادی سے پہاڑ کے دامن میں واقع تھا' آنحضرتؐ نے خود اور اپنی فوج کو اس طرح قرار دیا کہ آپؐ اور آپؐ کے لشکر کی پشت احد کی طرف تھی' اس طرح آپؐ اپنے سات سو افراد کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو گئے'

آنحضرتؐ نے عبداللہ بن جبیر کو تیر اندازوں کا سالار مقرر فرمایا ـــــ تیر اندازوں کی تعداد پچاس تھی ـــــ آپؐ نے اس سے ارشاد فرمایا: انضح عنا الجبل بالنبل لایأتونا من خلفنا ان کان علینا اولنا فأنت مکانك لنؤتین من قبلك، تیروں کی بارش کر کے دشمن کو پہاڑ کی طرف آنے سے روک لو تا کہ وہ ہمارے پیچھے سے ہم پر حملہ نہ کر سکے' خواہ ہم شکست کھائیں یا فتح پائیں تم اپنی جگہ پر ہی ٹھہرے رہنا کیونکہ وہ ہماری طرف آئے تو تمہاری طرف ہی سے آئیں گے۔

اس دن آنحضرتؐ نے دو زرہیں زیب تن کی ہوئی تھیں اور انہی کے ساتھ اپنے لشکر کی نگہبانی و نگرانی کر رہے تھے۔

درمنثور کی ایک روایت

تفسیر درمنثور میں ہے کہ ابن جریر نے سدی کے حوالہ سے روایت بیان کی ہے کہ اس نے ایک حدیث میں کہا: حضرت رسول خداؐ ایک ہزار فوجیوں کے ہمراہ احد کی جانب روانہ ہوئے اور روانہ ہونے سے پہلے آنحضرتؐ نے اپنے سپاہیوں کو فتح کی خوشخبری دی تھی لیکن اس شرط پر کہ وہ صبر سے کام لیں' عبداللہ بن ابی تین سو افراد کو منحرف کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ اس کے ساتھ واپس لوٹ گئے' ابو جعفر سلمی نے ان کا پیچھا کیا اور انہیں واپس آ جانے کے لئے پکارتے رہے مگر انہوں نے ابو جعفر کو تھکا دیا اور ان سے کہنے لگے: ہمیں لڑنا آتا ہی نہیں' اگر ہماری بات مان لے تو تو بھی ہمارے ساتھ واپس لوٹ آ' (تفسیر درمنثور جلد دوم صفحہ ٦٨)

اسی سلسلہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (جب تم میں سے دو گروہ کوشش کرتے رہے کہ بھاگ جائیں) وہ دو گروہ بنی سلمہ اور بنی حارثہ تھے' جب عبداللہ بن ابی تین سو افراد کو لے کر واپس جا رہا تھا تو ان دو گروہوں نے بھی اس کے ساتھ واپس جانے کی کوشش کی مگر خداوند عالم نے انہیں ثابت قدم بنا دیا اور وہ آنحضرتؐ کے ساتھ رہے' اس طرح آنحضرتؐ سات سو ساتھیوں کے ہمراہ باقی رہ گئے۔

یاد رہے کہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ انصار میں سے دو قبیلے تھے کہ بنو سلمہ کا تعلق قبیلہ خزرج سے اور بنو حارثہ کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔

مجمع البیان کی روایت

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ ابن ابی اسحاق، سدی، واقدی اور ابن جریر اور دیگر محدثین سے مروی ہے انہوں نے کہا:

کان المشرکون نزلوا باحد یوم الأربعاء فی شوال سنة ثلاث من الهجرة وخرج رسول الله (ص) الیهم یوم الجمعة، وکان القتال یوم السبت النصف من الشهر، وکسرت رباعیة رسول الله (ص) وشج فی وجهه، ثم رجع المهاجرون والأنصار بعد الهزیمة، وقد قتل من المسلمین سبعون، وشد رسول الله (ص) بمن معه، حتی کشفهم، وکان المشرکون مثلوا بجماعة، وکان الحمزة اعظم مثلة،

مشرکین ۳ ہجری کو ماہ شوال میں بدھ کے روز احد پہنچے اور حضرت رسولِ خداؐ نے جمعہ کے دن ان کے مقابلے میں کوچ کیا۔ اور اس ماہ کے وسط میں ہفتہ کے دن جنگ شروع ہوئی، اس جنگ میں حضرت رسولِ خداؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور آپ کا چہرۂ مبارک زخمی ہوا، مہاجرین وانصار بھاگ جانے کے بعد واپس آئے، اس جنگ میں ستر مسلمان شہید ہوئے، حضرت رسول خداؐ نے اپنے باقیماندہ ساتھیوں کے ساتھ مل کر مشرکوں پر دھاوا بولا اور بالاخر انہیں پچھاڑ ڈالا اور وہ شکست کھا گئے، مشرکوں نے مسلمان شہیدوں کی لاشوں کا مثلہ کیا۔۔۔۔ ان کے اعضاء کاٹ دیئے اور ان کے بدن کے ٹکڑے کر دیئے۔۔۔۔ ' ان میں حضرت حمزہ کو سب سے زیادہ مثلہ کیا گیا۔ (ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان ج ۱۔ ۲ ص ۴۹۷ طبع بیروت)

یاد رہے کہ جنگ احد کی بابت کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں اور ہم نے صرف انہی چند روایات کو ذکر کرنے پر اکتفاء کی ہے جن پر آیات مبارکہ کے فہم المعانی کا دار و مدار تھا،

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ احد کے تذکرہ پر مشتمل آیات مبارکہ کی درج ذیل چند اقسام ہیں:

(۱) بعض آیات وہ ہیں جن میں بعض مسلمانوں کے بھاگ جانے اور شکست کھانے کا تذکرہ ہے، یا ان افراد کا ذکر ہے جنہوں نے بھاگ جانے کی کوشش کی اور میدان چھوڑنے پر تل گئے مگر خدا نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا۔

(۲) بعض آیات میں میدان جنگ سے فرار کرنے والوں اور حضرت رسول خداؐ کو چھوڑ کر جانے والوں کی مذمت کی گئی ہے اور انہیں ایسا کرنے پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا کیونکہ خداوند عالم نے ان کے لئے ایسا کرنا حرام قرار دیا تھا۔

(۳) بعض آیات میں ان لوگوں کی مدح وثناء کی گئی ہے جو شکست سے پہلے درجہ شہادت پر فائز ہوئے اور انہوں نے آخر دم تک استقامت وثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور دشمن سے لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔۔۔۔ انہوں نے شہید ہونے کو حضرت رسول خداؐ کو چھوڑ جانے اور فرار اختیار کرنے پر ترجیح دی)

(۴) بعض آیات میں ان غازیوں کی تعریف کی گئی جو آخری لمحات تک میدان کارزار میں نبرد آزما رہے اور ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرتے رہے مگر قتل نہ ہوئے۔

آیات ۱۳۰ تا ۱۳۸

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾

○ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿١٣١﴾

○ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٣٢﴾

○ وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٣﴾

○ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣٤﴾

○ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٣٥﴾

○ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿١٣٦﴾

○ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾

○ هَٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾

○ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾

ترجمہ

○ اے اہل ایمان! دوگنا چوگنا بڑھا بڑھا کر سود نہ کھایا کرو' اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

(۱۳۰)

○ اور اپنے آپ کو دوزخ کی اس آگ سے بچاؤ جو کافروں کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

(۱۳۱)

○ اور تم اطاعت و فرماں برداری کرو اللہ کی اور اطاعت و فرمان برداری کرو رسولؐ کی' تا کہ تم پر رحم و عنایت کی جا سکے۔

(۱۳۲)

○ اور تم اپنے پروردگار کی مغفرت و بخشش اور اس بہشت کے حصول میں تیزی سے سرگرم عمل ہو جاؤ جس کی وسعت آسمانوں اور زمین ـــــ کی وسعتوں ـــــ کے برابر ہے کہ جو تقویٰ والوں کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

(۱۳۳)

○ (وہ متقین کہ) جو فراخدستی اور تنگدستی دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور وہ غصہ پر قابو پاتے ہیں اور لوگوں کی غلطیوں و زیادتیوں سے درگزر کرتے ہیں' اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

(۱۳۴)

○ وہ جب بھی کوئی برا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنے آپ پر ظلم کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں اور کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے سوائے اللہ کے' اور وہ دانستہ طور پر اپنے کئے ہوئے برے کام کو دوبارہ انجام نہیں دیتے۔

(۱۳۵)

○ انہی کی جزا ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت و بخشش اور وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں' وہ انہی میں ہمیشہ رہیں گے اور کس قدر اچھا اجر و جزا ہے عمل کرنے والوں کے لئے۔

(۱۳۶)

○ تم سے پہلے بہت واقعات گزر چکے ہیں' تم زمین میں گھومو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجامِ کار کیا ہوا؟

(۱۳۷)

○ یہ سب کچھ عام لوگوں کے لئے بیان حق ہے اور تقویٰ والوں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے۔

(۱۳۸)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ خیر و بھلائی کی طرف دعوت دے رہی ہیں اور شر و برائی سے روک رہی ہیں' اس کے باوجود ان کا اپنی ماقبل آیات اور اپنی مابعد آیات سے کہ جن میں جنگ احد کے واقعہ کی تفصیلات مذکور ہیں تعلق برقرار ہے' ان سے ماقبل و مابعد آیات میں جنگ احد کے دن مسلمانوں کی حالت زار اور ان کا ان مذموم خصلتوں کا حامل ہونا بیان کیا گیا ہے جو خداوند عالم کو ہرگز پسند نہیں کیونکہ وہی مذموم خصلتیں مسلمانوں کی کمزوری اور ان کی طرف سے خدا اور رسول خداؐ کی نافرمانی کا سبب بنیں۔

بہرحال یہ آیات جنگ احد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان آیات میں خیر و نیکی اختیار کرنے کی دعوت اور شر و برائی سے نزدیک ہونے کی ممانعت کرنے کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کو ان راہوں کی نشاندہی کروائی گئی ہے جن پر چل کر وہ ہلاکت و تباہی کی وادی میں گرنے سے بچ سکتے ہیں اور احد کے دن جس حالت و کیفیت سے دوچار ہوئے تھے دوبارہ اس جیسی حالت میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہ سکتے ہیں' چنانچہ انہیں تقوائے الٰہی اختیار کرنے' خود اعتمادی اور خدا اور سولؐ کی اطاعت و فرماں برداری کا پورا پورا حق ادا کرنے کی دعوت دی گئی' اس لحاظ سے یہ نو آیات مبارکہ ترغیب و تحذیر پر مشتمل ہیں' ان میں مومنین کو خیر و نیکی اختیار کرنے میں کوشاں ہونے کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ آسانی و تنگی دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں انفاق کریں اور غصہ پر قابو پا کر لوگوں سے عفو و درگزر سے پیش آئیں ان تمام صفات کا جامع عمل معاشرہ میں نیکی و اچھائی اور بھلائی کا عمل کرنا' تکلیفوں اور سختیوں میں صبر و تحمل اختیار کرنا اور کسی کی طرف سے بدرفتاری کے مقابلے میں بدرفتاری سے اجتناب برتنا ہے' یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے معاشرتی زندگی کا تحفظ ممکن ہے اور اس کی قوت و استقلال کو یقینی بنایا جا سکتا ہے' اس انفاق اور احسان و نیکی کرنے کا بنیادی تقاضہ اور لازم الامر یہ ہے کہ سود کو ترک کیا جائے' اسی وجہ سے سب سے پہلے اس کو بیان کیا گیا ہے گویا وہ احسان و انفاق کے حکم کی تمہید ہے۔

سورۂ بقرہ میں انفاق اور سود سے متعلق آیات میں بیان ہو چکا ہے کہ انفاق اپنی تمام صورتوں کے ساتھ معاشرے

کے استحکام کو یقینی بنانے والے اہم ترین اور عظیم ترین عوامل میں سے ایک ہے اور وہی ہے جو انسانی معاشرے میں وحدت کی روح پھونکتا ہے کہ نتیجتاً پراکندہ معاشرتی قوتیں اس کی برکت سے یکجا ہو جاتی ہیں اور اس طرح معاشرہ سعادتمندی سے بہرہ مند ہو جاتا ہے اور اس کی حیات کو خوشحالی کی نعمت مل جاتی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ اس کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ ہر طرح کی مہلک یا موذی آفت سے اپنے دفاع پر قادر ہو جاتا ہے، اور جہاں تک سود کا تعلق ہے تو وہ ان تمام صورتوں کے منافی ہے اور اس میں انفاق کے تمام مثبت آثار کی نفی پائی جاتی ہے یعنی جس طرح انفاق معاشرے میں مثبت آثار کا حامل عمل ہے اس کے بالمقابل سود تمام تر منفی آثار رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم لوگوں کو انفاق کی ترغیب دلاتا ہے اور پھر انہیں اس امر کی ترغیب دلاتا ہے کہ گناہوں اور برائیوں کی وجہ سے اپنے پروردگار سے قطع تعلق نہ کریں اور اگر ان سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو بھی جائے جو ان کے پروردگار کو ناپسند ہو تو اس کی تلافی توبہ کے ذریعے کرلیں اور اس طرح ایک بار پھر اپنے رب کی طرف لوٹ آئیں اور اگر اس کے بعد بھی کسی گناہ میں مبتلا ہو جائیں تو پھر توبہ کرکے کسی طرح کی سستی وکوتاہی کا مظاہرہ نہ کرتے ہوئے اپنے پروردگار کی طرف آ جائیں، انہی دو طریقوں سے ان کی زندگی کا سفر سعادتمندی کی راہ پر چلتے ہوئے طے ہوگا کہ پھر ہر طرح کی ضلالت وگمراہی سے بچ جائیں گے اور ہلاکت وتباہی کے گہرے کھڈ میں گرنے سے محفوظ رہیں گے۔

یہ قرآنی بیان جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں انسان کو نہایت احسن طور پر ہدایت ورہنمائی کرتا ہے کہ وہ گناہ و معصیت کے ارتکاب کے بعد اپنے وجود میں پائے جانے والے نقص وخامی کو کس طرح دور کرسکتا ہے اور کس طرح دوبارہ اپنے اندر کمالی صفات کو جنم دے سکتا ہے؟ اس طرح یہ بیان ان نفسانی رذیلتوں وپستیوں کے علاج کا نہایت بہترین وعمدہ راستہ ہے کہ جو فضیلتوں سے مزین نفوس میں داخل ہو کر ان کی پاکیزگی کے تمام نشانات مٹا دیتی ہیں اور انہیں گندگی وتباہی اور انحطاط وسقوط اور نابودی وہلاکت سے دوچار کردیتی ہے۔

قرآنی تعلیمات میں علم وعمل کی پیوستگی کا بیان

قرآن مجید کا تعلیمات الٰہی کے حوالہ سے ہمیشہ یہ دستور العمل اور طریقہ کار رہا ہے کہ اس نے اپنے پورے زمانہ نزول میں ـــــ جو کہ ۲۳ برس ہے ـــــ اپنی تعلیمات میں ان بنیادی اصولوں کو بیان کیا جن میں سے کسی ایک پر بھی عمل کیا جائے تو اس سے دیگر تعلیمات کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے اور اسی بنیاد پر قرآن مجید لوگوں کو ان کے کئے کی تصحیح کرتے ہوئے اس میں پائے جانے والے مقصد وخامی کی اصلاحی صورت دکھا کر انہیں وہ نقائص وخامیاں دور کرنے کی ترغیب دلاتے ہوئے ان کی رہنمائی کرتا ہے کہ وہ صحیح ودرست کیفیت وجہت کو عملی طور پر محفوظ کریں اور نقص وخامی کو دور کرکے عمل کی درستگی کو یقینی

بنائیں، چنانچہ اس ضمن میں قرآن مجید اس نقص و غلطی کی مذمت اور صحیح و درست عمل کی تعریف کرتے ہوئے اس شخص کی مدح و ثناء کے بعد کہ جس نے اپنے عمل کو نقائص سے پاک کر کے صحیح صورت میں انجام دیا اسے اس کے کئے پر وعدۂ جمیل و شکر جزیل دیتا ہے، لہٰذا کتاب الٰہی علم و عمل کی کتاب ہے نہ کہ مفروضات اور تصورات کی کتاب! اور نہ ہی اندھی تقلید اور خیالی باتوں کا مجموعہ!۔

اس بناء پر قرآن مجید کی مثال اس معلم و استاد جیسی ہے جو نہایت مختصر بیان اور کم الفاظ پر مشتمل جملوں میں علمی کلیات کی تعلیم دیتا ہے اور انہیں ان پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے، پھر ان کی تحریروں کا جائزہ لیتا ہے اور پوری طرح تجزیہ و تحلیل اور چھان بین کر کے ان کی صحت و سقم کو آشکار کرتا ہے اس کے بعد انہیں ان کے کئے میں پائے جانے والے نقص و خامی سے آگاہ کر کے انہیں نصیحت و رہنمائی کرتا ہے کہ ان کے کئے میں خامی و غلطی پر انہیں تنبیہ کرتے ہوئے سزا سے خبردار کرتا ہے اور اس کے مقابلے میں ان کے صحیح و درست عمل پر ان کی تعریف کرتے ہوئے ان سے جزا و انعام کا وعدہ کر کے ان کی سپاس گزاری کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں دوبارہ پوری طرح صحیح عمل کرنے کا دستور دیتا ہے اور وہ اس لئے ایسا کرتا ہے کہ وہ اپنی کاوشوں میں کمالی جہت کے حامل ہوں اور اپنی سعی و کوشش میں اچھی طرح کامیابی حاصل کریں۔

تو یہ وہ درخشندہ قرآنی حقائق ہیں کہ ہر اہل فکر و نظر تفکر و تدبر کے ابتدائی مراحل ہی میں ان کا ادراک کر لیتا ہے چنانچہ اس کی مثال قرآن مجید میں جہاد کے کلیات و بنیادی امور کے بیان پر مشتمل آیات مبارکہ سے دی جا سکتی ہے کہ اس کی بابت فرمان صادر کرنے اور اس کی شرعی قانونی دینی حیثیت کی وضاحت کرنے کے حوالہ سے اس کے بنیادی امور کے تذکرہ میں ارشاد ہوا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ...... (سورۂ بقرہ آیت ۲۱۶) ان آیات مبارکہ میں جہاد کے متعلق مومنین کو حکم صادر فرماتا ہے کہ یہ عمل ان پر فرض و واجب قرار دیا گیا ہے، پھر جنگ بدر کا واقعہ بیان کرتا ہے اور اس میں جو کچھ ہوا اس کے حوالہ سے انہیں احکامات صادر کرتا ہے اور اس میں پائی جانے والی خامیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، پھر جنگ احد کا واقعہ بیان کرتا ہے اور اس میں پائی جانے والی خامیوں و کوتاہیوں اور نقائص کی طرف توجہات کو مبذول کرتا ہے، پھر اس کے بعد رونما ہونے والی جنگوں و واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے اہل ایمان کے تکاملی سفر کے مراحل سے انہیں آگاہی دلاتا ہے، اس کے علاوہ خداوند عالم سابقہ انبیاء کرامؑ اور ان کی امتوں کی داستانیں و واقعات بیان کرتے ہوئے ان کی اصلاح و درستگی کے حوالوں سے اہل ایمان کو حق و حقیقت سے آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ سابقہ امتوں کے حالات و واقعات سے درسِ عبرت حاصل کریں اور اپنی عملی زندگی میں ان کی سرگزشت کو مدنظر رکھیں، زیر بحث آیات مبارکہ میں مذکور مطالب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے مثلاً آیت ۱۳۷ میں ارشاد ہوا: فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ...... (تم زمین میں گھومو پھرو......) ــــــ اس میں سابقہ امتوں کے حالات و واقعات اور سرگذشت و انجام کار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اور آیت ۱۴۶ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ...... میں مطلب کو مزید واضح طور پر بیان کرتے ہوئے مومنین کو قتال و کارزار اور جہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

سود کی واضح ممانعت

○ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰۤوا .... لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ

(اے ایمان والو! تم سود نہ کھاؤ........ تا کہ تم پر فلاح پاؤ)

اس آیت میں سود کھانے سے ممانعت کا حکم ہے، پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کھانے سے مراد لینا ہے ــــ یعنی سود لینے کو سود کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے ــــ

اور اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً اس روش کی طرف اشارہ ہے جو عام طور پر سود لینے والوں کی ہوتی ہے یعنی وہ بڑھا بڑھا کر سود وصول کرتے ہیں کیونکہ بنیادی طور پر سودی معاملہ ہوتا ہی اس لئے ہے کہ سود دینے والے کے مال کو سود لینے والے کی ملکیت بنا کر سودی مال میں اضافہ کیا جاتا ہے اس طرح سود دینے والے کا مال برباد ہو جاتا ہے جبکہ سود لینے والے کی دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ امیر سے امیر تر ہو جاتا ہے۔

اور جملہ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ میں سود خور کے کافر ہونے کا واضح اشارہ پایا جاتا ہے چنانچہ اسکی تائید میں سورۂ بقرہ میں سود سے متعلق آیات سے ہوتی ہے کہ جن میں ارشاد ہوا وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیۡمٍ (سورۂ بقرہ آیت ۲۷۶)

جنت کی طرف قدم بڑھاؤ

○ وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ

(اور تم اپنے رب کی طرف سے مغفرت اور بہشت کی طرف جلدی قدم بڑھاؤ)

مسارعہ کا معنی رفتار میں تیزی لانا ہے اور وہ نیکیوں میں قابل ستائش جبکہ برائیوں میں قابل مذمت ہے۔

قرآن مجید میں اکثر مقامات میں مغفرت اور جنت کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہ صرف اس لئے ہے کہ جنت پاک گھر ہے ــــ پاک لوگوں کا ٹھکانہ ہے ــــ اس میں مصیبتوں و گناہوں کی نجاستیں داخل نہیں ہو سکتیں۔ اور نہ ہی وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو معصیتوں و گناہوں کی گندگی میں آلودہ ہو مگر یہ کہ وہ خدا کی طرف سے مغفرت پانے کے بعد گناہوں کی نجاست سے منزہ و پاک ہو جائے۔

اور مغفرت و جنت کا ذکر اس آیۂ مبارکہ میں درج ذیل دو آیتوں میں مذکور مطالب کے تناظر میں ہوا ہے۔

(۱) "وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً"

(۱) الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ......

اس میں مغفرت کے حوالہ سے وہ عمل مذکور ہے جو اس کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔
یہ آیت جنت کے استحقاق کی راہ ہموار کرنے والے عمل کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔
اور جہاں تک اس جملہ کا تعلق ہے جنة عرضها السموات والارض تو اس میں عرض سے مراد اس کی وسعت ہے اور اس طرح کا استعمال عام ورائج ہے (یعنی یہاں عرض سے مراد طول کے مقابل میں واقع ہونے والا فاصلہ ومقدار نہیں بلکہ اصل وسعت مراد ہے)۔ اور اس کی وسعت کو عرض سے تعبیر کرنے سے مراد کنایۃً اس کے بہت زیادہ وسیع ہونے یا انسانی فکر سے ماوراء حد کا تذکرہ ہے اور اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ بہشت اس قدر وسیع ہے کہ اس کی وسعت کو کوئی شخص سمجھ ہی نہیں سکتا' البتہ وسعت کو عرض سے تعبیر کرنے کا دوسرا معنی بھی ہے کہ جسے ہم روایات پر ایک نظر میں اشارۃً بیان کریں گے۔
اور جملہ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (تقویٰ والوں کے لئے مقرر کی گئی ہے) دراصل متقین کے ان اوصاف کے تذکرہ کے لئے مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کے بعد ذکر کی گئی ہیں ان آیات مبارکہ میں ان اوصاف کا تذکرہ مقصود ہے جو اس مقام پر یعنی ان آیات کے نزول کے وقت مومنین سے ان کی موجودہ حالت کے حوالہ سے تعلق رکھتے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیات مبارکہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئیں کہ جس میں مومنین کو دشوار ترین صورتحال کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے دشمن کی طاقت کے مقابلے میں ضعف و کمزوری' سستی و ناتوانی اور مخالفتوں کا عملی مظاہرہ کیا اور وہ شدید ترین بحرانوں سے دوچار ہوئے جبکہ اس کے بعد انہیں متعدد دیگر جنگیں درپیش تھیں کہ جن میں جنگ احد جیسے حالات کا سامنا کرنا تھا لہذا انہیں پہلے سے کہیں زیادہ باہمی یکجہتی واتحاد اور اتفاق وہم آہنگی کی ضرورت تھی۔

خدا کی راہ میں انفاق کرنے والے

○ "اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ ...."
(وہ آسانی وسختی دونوں حالتوں میں انفاق کرتے ہیں.........)

لفظ سراء سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کو خوش کرے (باعث مسرت)
لفظ ضراء سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کو دکھ ورنج دے (باعث تکلیف)
ان دونوں کو یسر اور عسر یعنی آسانی وتنگی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔
لفظ کظم کا اصل معنی مشکیزہ کو بھر لینے کے بعد اس کے سرے کو مضبوطی سے باندھ دینا ہے' پھر اسے استعارہ کے طور پر اس شخص کے لئے استعمال کیا گیا جو حزن وغم اور غصہ سے بھرا ہوا ہو'

لفظ غیظ کا معنی ناپسندیدہ امور کا پے در پے مشاہدہ کرنے کے بعد انتقام جوئی کے جذبہ کی بناء پر طبیعت میں ہیجانی کیفیت کا پیدا ہونا ہے اور یہ غضب سے مختلف ہے کیونکہ غضب کے معنی میں بدلہ لینے اور سزا دینے کا مصمم ارادہ پایا جاتا ہے اسی لئے خداوند عالم کی نسبت لفظ غیظ کی بجائے لفظ غضب استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ اغتاظ اللہ کی بجائے غضب اللہ کہا جاتا ہے۔

آیت کے آخر میں جملہ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو اوصاف ذکر کئے گئے ہیں وہ متقین کی پہچان کرواتے ہیں' اس جملہ میں ان کے محسنین ہونے کو دو حوالوں سے دیکھا جا سکتا ہے' ایک لوگوں کے حوالہ سے' اور دوسرا خدا کے حوالہ سے' لوگوں کے حوالہ سے اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ان سے نیکی اور نیک سلوک کرتے ہیں' اور خدا کے حوالہ سے اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ خدا کی راہ میں استقامت و پائیداری کا مظاہرہ کرتے ہیں چنانچہ اس حوالہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ احقاف آیت ۱۲ - ۱۳:

○ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

(اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں تو ہم ضرور انہیں اپنے رستوں کی رہنمائی کریں گے اور بے شک اللہ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے)

یہاں جہاد سے مراد جد و جہد اور کوشش کرنا ہے اور وہ صرف انہی چیزوں میں کہ جو نفسانی خواہشوں کے مخالف اور طبع انسانی کے تقاضوں کے منافی ہوں' ظاہر ہے کہ اس طرح کی جد و جہد اور کوشش صرف اسی صورت میں ہوتی ہے جب ایسا کرنے والے افراد اپنی پسندیدہ اور طبع انسانی کی خواہشوں و چاہتوں کے مقابلے میں کچھ ایسے امور پر ایمان رکھتے ہوں جن پر عملی طور پر سختی سے پابند ہوں اور ہر حال میں ان کی بجا آوری پر ثابت قدم ہوں' اور اس کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ وہ اعتقادی و ایمانی اور زبانی اظہار کے حوالہ سے یہ کلمہ اپنی زبانوں پر جاری کریں رَبُّنَا اللّٰهُ (ہمارا پروردگار اللہ ہے)، اس اظہار پر استقامت اختیار کریں یعنی پختہ عزم رکھیں اور ڈٹ جائیں' اور عمل کے حوالہ سے اس زبانی اظہار کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ خدا کی بندگی میں جہاد کریں یعنی اپنے اور خدا کے درمیان بندگی کے تعلق کو مضبوط اور باقی رکھنے کے لئے عملی اقدامات بجا لائیں' صرف اور صرف اس کی بندگی کا دم بھریں اس کی رضا کے حصول کے لئے انفاق کریں اور آپس میں (یعنی نوع انسانی کے افراد باہمی طور پر) حسن سلوک اور معاشرتی اخلاق و آداب کی عملی پاسداری کا ثبوت دیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مذکورہ بالا مطالب سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ محسنین میں احسان سے مراد اعمال کی انجام دہی میں استقامت و پائیداری اور خداوند عالم پر ایمان کی پختگی کو یقینی بناتے ہوئے خوبصورت طرزِ عمل اپنانا ہے۔

گناہ کرنے پر استغفار !

○ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ...... وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ؁

(وہ لوگ جو کوئی برا کام انجام دیتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں...... اور عمل کرنے والوں کا اجر اچھا ہے)

یہاں لفظ فَاحِشَةً ذکر ہوا ہے' اس سے مراد ہر وہ عمل ہے جو برا اور قبیح و قابل مذمت ہو' البتہ اسے عام طور پر زنا کے لئے استعمال کیا جاتا ہے' (اس سے مراد زنا لیا جاتا ہے)'

آیت مبارکہ میں فاحشة اور ظلم کا تقابلی تذکرہ ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں اس (فاحشہ) سے مراد تمام صغیرہ و کبیرہ گناہ ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ فاحشہ سے مراد گناہان کبیرہ ہوں اور ظلم سے مراد گناہان صغیرہ ہوں۔

اور ذَكَرُوا اللّٰهَ .... کے الفاظ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ استغفار یعنی خداوند عالم سے طلب مغفرت کرنے میں اصل و اساس اور معیار یہ ہے کہ خدا کی یاد انہیں اس عمل کی راہ پر لائی ہو نہ یہ کہ صرف زبانی طور پر ذَكَرُوا اللّٰهَ کہا جائے اور عادتاً اسے ورد زبان کرنے کی رسم پوری کی جائے۔

اور جملہ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ میں گناہگاروں کو توبہ کی طرف مائل کرنے اور ان میں ہمیشہ خدا سے وابستگی اور اس کی پناہ میں رہنے کے جذبہ و احساس کو بیدار رکھنے کا ہدف ملحوظ ہے۔

اس آیت میں استغفار کو وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ؁ (اور وہ جان بوجھ کر اپنے کئے پر اصرار نہ کریں) کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ توبہ و استغفار کرنے والوں کو متنبہ و آگاہ کیا جائے کہ طلب مغفرت کرنا اسے ہی فائدہ دے سکتا ہے جو اپنے کئے ہوئے گناہ کو دوبارہ یا بار بار انجام نہ دے کیونکہ بار بار گناہ کا ارتکاب کرنا نفس انسانی میں ایسی حالت و کیفیت کو جنم دیتا ہے کہ جس کے باعث خداوند عالم کی یاد فائدہ مند و مؤثر نہیں ہوتی بلکہ وہ خدا کے احکامات کی عملی توہین کی ایک صورت ہے اور اس سے دین الٰہی کی ہتک حرمت اور خدا کے ساتھ متکبرانہ روش اختیار کرنے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اس حالت سے دوچار ہونے والا شخص خدا کی بندگی کے احساس و اعزاز سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر اسے ذکر الٰہی کے فیوضات حاصل نہیں ہوتے' اسی وجہ سے آیت مبارکہ کے آخر میں وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ؁ کے الفاظ ذکر کئے گئے ہیں' اور یہ بات اپنے مقام پر قرینہ یعنی دلالتی اشارہ ہے کہ ابتداء آیت میں لفظ ظلم سے مراد تمام گناہ ہیں خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ کیونکہ گناہ پر اصرار یعنی اسے بار بار انجام دینا اوامر خداوندی کو ناچیز سمجھنے اور اس کی عظمت و مقام کو حقیر جاننے کا عملی ثبوت ہے لہٰذا اس حوالہ سے گناہ کے چھوٹا اور بڑا ہونے میں کوئی فرق نہیں'۔۔۔۔ دونوں میں خدا کی ذات اور اس کے فرامین کی اہانت کا پہلو پایا جاتا ہے اور خدا کے احکامات سے سرتابی کی جسارت کی عملی صورت پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔' بنابراین جملہ مَا

فَعَلُوْا میں صغیرہ وکبیرہ دونوں قسم کے گناہ شامل ہیں اور اس سے مراد وہی عمل ہے جس کا ذکر ابتداء آیت میں ہوا ہے' البتہ صغیرہ گناہ فواحش کے زمرے میں شامل نہیں لیکن یقینی طور پر وہ ظلم النفس ہے اور اس کا مرتکب اپنے باطن کو گناہ کی نجاست وگندگی سے آلودہ کر دیتا ہے۔

اور جملہ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ دراصل ان کے عظیم اجر کو بیان کرتا ہے اور اللہ نے اس جملہ میں جو کچھ ذکر کیا ہے وہ بعینہ آیت مبارکہ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ میں مذکور مغفرت وجنت کی طرح ہے' اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے مسارعت اور عملی اقدام کرنے کا جو حکم دیا ہے وہ انفاق' کظم غیظ' عفوو درگزر اور استغفار سب کے بارے میں ہے۔

تاریخ سے سبق آموزی

۵ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا ....

(تم سے پہلے طور طریقے گزر چکے ہیں، پس تم چلو............)

سنن جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد سنۃ ہے جس کا معنی وہ طور وطریقہ اور روش ہے جسے معاشرہ میں اپنایا جاتا ہے' اور زمین میں سیر کرنے کا حکم دینے میں سابقہ امتوں کے حالات سے سبق حاصل کرنا مقصود وملحوظ ہے کہ تاریخ کی ناقابل انکار حقیقتوں سے آگاہی حاصل ہو سکے کہ جلالت مآب سلطانوں اور فرعونوں کے انجام پر نظر کریں کہ انہیں ان کے عظیم الشان محلات نے ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور نہ ہی خزانوں کے ذخائر' جواہرات سے لدے ہوئے تخت وتاج اور ہمہ وقت حاضر و موجود لشکر وہوادار ان کے کام آئے بلکہ خداوند عالم نے ان سب کو ملیا میٹ کر دیا یہاں تک کہ اب وہ قصہ پارینہ بن گئے کہ ان کے عبرتناک انجام سے عبرت پانے والوں کو بہت کچھ ملتا ہے اور ان کی داستانوں سے سبق حاصل کرنے والے سبق پاتے ہیں' مگر غفلت کی نیند سے دو چار افراد کا معاملہ ہی کچھ اور ہے! اور جہاں تک ان کے آثار کو محفوظ کرنے اور ان کے مجسموں و مورتوں کی حفاظت کرنے کا تعلق ہے کہ اس حوالہ سے ان کی دنیاوی شان وشوکت اور ظاہری جلال سے آگاہی حاصل کرنا مقصود ہو تو اس طرح کے اعمال کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی قرآن مجید ان کی کسی حیثیت ومنزلت یا ضرورت کو بیان کرتا ہے بلکہ اگر حقیقت بین نظروں سے دیکھا جائے تو یہ بت پرستی کی ایک صورت ہے کہ جو ہر دور میں اپنی نئی و پرکشش شکل میں ظاہر ہوتی ہے' اس موضوع کی بابت عنقریب ہم تفصیلی تذکرہ کریں گے اور مستقل بحث کے تحت بت پرستی کی حقیقت اور اس کی مختلف صورتوں کو واضح طور پر بیان کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

واضح وروشن بیان

○ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ

(یہ لوگوں کے لئے بیان ہے)

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سابقہ آیات عامۃ الناس کے لئے واضح وروشن بیان اور تقویٰ والوں کے لئے سرچشمہ ہدایت ونصیحت ہیں' اور یہ تقسیم دراصل آیات کے مطالب کی اثر گزاری کے حوالہ سے ہے' اور اس سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ قرآنی آیات تمام افراد بشر کے لئے ہدایت ہیں لیکن اہل تقویٰ ہیں کہ جو ان سے استفادہ اور ان کی حقانیت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

روایات پر ایک نظر

بہشت اور دوزخ؟

فی المجمع فی قولہ تعالیٰ: جنۃ عرضھا السموات والارض' عن النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انہ سئل اذا کانت الجنۃ عرضھا السمٰوات والارض فأین تکون النار فقال (ص) سبحان اللہ اذا جاء النھار فاین اللیل؟

(مجمع البیان ج۱۔۲ ص ۵۰۴)

تفسیر مجمع البیان میں آیہ مبارکہ جنۃ عرضھا السمٰوات والارض کی تفسیر میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ سے اس حوالہ سے پوچھا گیا کہ جب بہشت اتنی بڑی ہے کہ اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو دوزخ کہاں پر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا' سبحان اللہ جب دن ہوتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے؟

اس روایت کو سیوطی نے تفسیر درمنثور میں تنوخی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ ہرقل بادشاہ نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جو خط بھیجا تھا اس میں بھی یہی سوال کیا گیا تھا' اس کے جواب میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی جواب مرقوم فرمایا' درمنثور ہی میں اس روایت کو ابوہریرہ کے حوالہ سے بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح کا سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ بالا جواب دیا۔ (ملاحظہ ہو تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۷۲)

اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد گرامی کی تفسیر وتشریح میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ آپ کا مقصد یہ

ہے کہ دوزخ کہاں ہے؛ اس کا علم خداوند عالم کو ہے ___ جیسا کہ دن آ جانے سے رات کہاں جاتی ہے اس کا علم خدا کو ہے۔

یہ جواب اس لئے کافی ووافی نہیں کہ اگر اس سے یہ مراد لیا جائے کہ آنحضرتؐ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ دوزخ کا محل وقوع خدا کے علم سے باہر نہیں، تو اس سے کوئی نئی بات بیان نہیں ہوئی کیونکہ یہ بات تو واضح ہے کہ کوئی چیز بھی خدا کے علم سے باہر نہیں جبکہ سوال اس حوالہ سے نہ تھا کہ خدا جانتا ہے یا نہیں جانتا؛ بلکہ سوال یہ تھا کہ دوزخ کہاں واقع ہے؟ اور اگر اس سے مراد یہ لیا جائے کہ سوال اس حوالہ سے تھا کہ شاید دوزخ آسمانوں اور زمین کے علاوہ کسی اور مقام پر ہے؟ تو یہ بات فی نفسہ ممکن ہے اور خارج از امکان نہیں لیکن آنحضرتؐ نے اپنے بیان میں بہشت اور دوزخ کا تقابلی ذکر دن اور رات سے کیا ہے اور وہ دونوں، آسمانوں اور زمین سے باہر نہیں اور دن کے آ جانے سے رات آسمانوں اور زمین کی وسعتوں سے باہر نہیں جاتی؛

میں سمجھتا ہوں کہ روایت کسی اور مطلب کو بیان کرتی ہے اور اس کی وضاحت یوں ہے کہ آخرت اپنی تمام نعمتوں اور سختیوں کے ساتھ اگرچہ دنیا اور اس کی لذتوں وشدتوں سے مشابہت رکھتی ہے اور اسی طرح انسان جہاں آخرت میں بعینہ اسی حال میں ہوگا جس طرح دنیا میں تھا ___ جیسا کہ ظاہر کتاب وسنت سے ثابت ہے، لیکن اہم ترین فرق یہ ہے کہ آخرت میں جو نظام حکم فرما ہوگا وہ اس نظام سے قطعی مختلف ہوگا جو دنیا میں ہے کیونکہ آخرت کا جہاں ابدی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے جبکہ دنیا فانی وزوال پذیر ہے۔ اسی وجہ سے انسان بہشت میں کھائے گا، پیئے گا، مباشرت ومناکحت کرے گا، نفسانی لذتوں سے لطف اندوز ہوگا لیکن ان تمام اعمال وافعال کے نتیجہ میں اس پر دنیا میں جو کیفیات عارض ہوتی ہیں وہ وہاں اس پر عارض نہیں ہوں گی، اسی طرح دوزخی شخص آخرت میں آگ میں جلے گا، آگ کے شعلوں کی شدت وگرمی کے باعث دردوالم میں مبتلا ہوگا، وہاں کھانے پینے اور رہنے کی سختیوں سے دوچار ہوگا اور دیگر دوزخیوں کے ساتھ آگ کی لپیٹ میں ہوگا لیکن ان تمام صورتوں میں اس کی حالت وہ نہ ہوگی جو اس دنیا میں اس پر طاری ہوتی تھی یعنی نہ تو وہ جل کر راکھ ہو جائے گا اور نہ ہی زخمی ہو کر خون میں نہلائے گا، وہ آخرت میں ابدی عمر پائے گا لیکن اس پر دنیاوی زندگی کی طرح جوانی وبڑھاپا اور سن رسیدہ ہونے کے حالات سے گزرنا نہیں پڑے گا اور اسی طرح دنیاوی زندگی کے دیگر امور کا حامل ہوگا لیکن ان امور کے آثار اس پر نہیں پڑیں گے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کے حالات وکیفیات اور امور کے عوارض وآثار اسی نظام کا حصہ ہیں جو دنیاوی زندگی ہی سے مخصوص ومختص ہے نہ یہ کہ زندگی کے مطلق نظام کا حصہ ہیں کہ جو دنیا وآخرت دونوں جہانوں پر محیط ہے، ایسا ہرگز نہیں، تو معلوم ہوا کہ دنیا تزاحم وتمانع کی آماجگاہ ہے جبکہ آخرت ایسی نہیں، ___ لہٰذا عین ممکن ہے کہ بہشت اور دوزخ دونوں آسمانوں اور زمین کی وسعتوں کو گھیرے ہوئے ہوں جبکہ ان میں کسی طرح کا تصادم ومزاحمت اور ایک دوسرے کی راہ روکنے کی صورت نہ پائی جائے۔

اس حقیقت پر ایک دلیل یہ ہے کہ حوادث وواقعات میں سے جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اس سے ہمارے ذہنوں میں ان

کی صورتیں ثبت ہو جاتی ہیں لیکن جب ہم ان کے علاوہ دوسرے حوادث و واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پہلی صورتیں ہماری نظروں سے دور ہو جاتی ہیں اور ہم ان کا مشاہدہ نہیں کر سکتے جیسا کہ گذشتہ کل اور آج اور رات اور دن میں رونما ہونے والے واقعات کا حال ہے کہ گزرے ہوئے کل میں جن چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ آج مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کی وجہ سے ہماری نگاہِ فکر و چشم ذہن سے اوجھل ہو جاتی ہیں' اسی طرح رات کو دیکھی جانے والی چیزیں دن میں دیکھی جانے والی چیزوں کی وجہ سے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں' یہ سلسلہ ہر روز جاری رہتا ہے اور اسی پر ہماری زندگی کا نظام قائم واستوار ہے لیکن جہاں تک خداوند عالم کا تعلق ہے تو کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہوتی یعنی دن میں دیکھی جانے والی چیزیں اسے رات میں دیکھی جانے والی چیزوں کو بھلوا نہیں دیتیں اور نہ ہی کل اور آج کا زمانی فرق اس کے علم پر اثر انداز ہوتا ہے' اس کی نسبت تمام حالات و اوقات یکساں ہیں' رات اور دن' اسی طرح ماضی و حال اور مستقبل اس کے لئے برابر ہیں' کوئی چیز اس سے مخفی نہیں اور نہ ہی وقت کی تبدیلی سے کوئی چیز اس سے مخفی و پوشیدہ ہوتی ہے' گویا اس کی بابت یہ بات قطعی و یقینی ہے کہ اس کے مشاہدات میں کوئی چیز دوسری چیز سے مزاحمت و تصادم نہیں رکھتی' اس بیان سے واضح ہوا کہ شب و روز اور اسی طرح ان سے مقارن حوادث و واقعات مادہ و حرکت کے نظام کی رو سے باہمی تزاحم و تمانع رکھتے ہیں لیکن اخروی نظام میں ان کے درمیان اس طرح کا تزاحم و تمانع اور تضاد و تصادم ہرگز نہیں پایا جاتا' (کیونکہ تبدیلیوں و تغیرات کا تعلق مادہ و حرکت کے نظام سے ہے اور جو نظام مادہ و حرکت سے خالی ہو اس سے وابستہ امور میں ایک دوسرے سے تزاحم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اس حقیقت کا ثبوت درج ذیل آیت مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

سورۂ فرقان' آیت ۴۵۔۴۶:

○ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾

(کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ تیرے پروردگار نے کس طرح سایہ کو پھیلایا' اگر وہ چاہتا تو اسے ایک جگہ ٹھہرا ہوا بنا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس کا رہنما بنا دیا، پھر ہم نے اسے اپنی طرف نہایت آسانی کے ساتھ روک دیا)۔

لہٰذا جب رات اور دن میں مذکورہ بالا صورت ممکن ہو جبکہ وہ ایک دوسرے سے تزاحم و تصادم رکھتے ہیں تو آسمانوں اور زمین کی بابت ایسا ہونا بھی ممکن ہوگا کہ کوئی چیز ایسی ہو جو ان دونوں کی وسعت کے برابر ہو' اور وہ اس کی وسعت کے برابر ہوں' مثلاً بہشت و دوزخ، لیکن ایسا ہونا دنیا پر حاکم مادی نظام کی بنیاد پر نہیں بلکہ اُخروی نظام کے حوالہ سے ہے! اس کی مثالیں روایات و احادیث میں موجود ہیں مثلاً' ان القبر روضة من رياض الجنة او حضرة من حضر النار (قبر یا بہشت کے باغات میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے) بحار الانوار جلد ۶ ص ۲۱۴' یا ارشاد ہوا: ان المومن يوسع له فى قبره مد بصره (مومن کی قبر اس کی حد نگاہ تک وسعت رکھتی ہے) بحار الانوار ج ۶ ص ۲۶۲۔

بنابراین ضروری ہے کہ آنحضرتؑ کے ارشاد گرامی سبحان اللہ، اذا جاء اللیل فأین النھار (سبحان اللہ! جب رات آتی ہے تو دن کہاں جاتا ہے؟) کو مذکورہ بالا معنی پر محمول کیا جائے نہ یہ کہ ان دونوں کے علم خدا میں ہونے یا نہ ہونے پر! کیونکہ یہ واضح امر ہے کہ اگر آنحضرتؑ کے ارشاد گرامی سے یہ مراد ہو کہ خداوند عالم جب دن کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے تو اسے رات کی جگہ کا علم ہے، تو یہ بات سوال کرنے والے کے سوال سے تعلق ہی نہیں رکھتی، ـــــ جبکہ آنحضرتؑ نے سائل کے جواب میں ایسا فرمایا، اسی طرح اگر یہ مراد لیا جائے کہ جب دن آتا ہے تو رات عالم الخارج میں باقی رہ جاتی ہے تو سائل اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ کرۂ ارضی کے جس خطہ و علاقہ کا تصور کریں وہاں دن کے آجانے سے رات ختم ہو جاتی ہے اور اس کا وجود ہی سرے سے باقی نہیں رہتا، اور اگر ان دونوں کی اصل حقیقت اور وجودی حیثیت کو معیار قرار دیں تو یوں کہیں گے کہ رات حقیقت میں ایک مخروطی سایہ ہے جو سورج کے چمکنے سے پیدا ہوتا ہے یعنی جب سورج زمین کے کسی حصہ میں چمکتا ہے تو اس کے مقابل حصہ میں اندھیرا ہو جاتا ہے، اسی کو رات کہتے ہیں، اور وہ سایہ کرۂ ارضی کے گرد ہمیشہ گھومتا رہتا ہے کہ اس کا گھومنا روزانہ کی بنیاد پر ہوتا ہے، لہٰذا رات اور دن دونوں ہی کرۂ ارضی کے اردگرد ہمیشہ گھومتے اور چلتے رہتے ہیں، بنابراین ایسا نہیں کہ رات کے آنے سے دن اور دن کے آنے سے رات کا وجود سرے ہی سے باقی نہیں رہتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے آنے سے وہ زمین کے دوسرے حصہ میں چلی جاتی ہے اور رات کے آنے سے وہ زمین کے دوسرے حصہ میں چلا جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے درمیان تزاحم و تمانع پایا جاتا ہے اور وہ دونوں باقی ہوتے ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ جہاں دن ہوتا ہے وہاں رات نہیں ہوتی اور جہاں رات ہوتی ہے وہاں دن نہیں ہوتا۔

اسی روایت کی دیگر مثالیں بھی احادیث میں پائی جاتی ہیں مثلاً آیہ مبارکہ لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ (سورۂ انفال آیت ۳۷) کی تفسیر میں مذکور ہے کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا اذا غابت الشمس فأین یصیر ھذا الشعاع المنبسط علی الارض؟ (جب سورج غروب ہوتا ہے تو یہ زمین پر پھیلی ہوئی شعاع کہاں چلی جاتی ہے؟) اس سلسلہ میں بحث عنقریب ہوگی۔

کظمِ غیظ و عفو و درگزر

آیہ مبارکہ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ؕ کی تفسیر میں بیہقی کے حوالہ سے ایک روایت تفسیر درمنثور میں مذکور ہے کہ امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام نماز کی تیاری کر رہے تھے اور آپؑ کی ایک کنیز آپؑ کے ہاتھ دھلوا رہی تھی، اچانک لوٹا اس کے ہاتھ سے گرا اور آپؑ کے چہرۂ مبارک پر لگا جس سے آپؑ کا رخ انور زخمی ہو گیا، آپؑ نے سر اٹھا کر اس کنیز کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً کہہ دیا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ (اور وہ غصہ کو پی جانے والے

ہیں) امام نے ارشاد فرمایا: قد کظمت غیظی میں نے اپنا غصہ پی لیا ہے۔ اس نے پھر یہ جملہ کہا وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط (اور وہ لوگوں سے درگزر کرتے ہیں) امامؑ نے فرمایا: قد عفا اللہ عنك (خدا تجھ سے درگزر کرے) پھر اس نے آیت کا یہ جملہ پڑھ دیا: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔ امامؑ نے فرمایا: اذهبی فأنت حرة (تو چلی جا کہ اب تو آزاد ہے) (تفسیر در منثور جلد ۲ صفحہ ۷۳)

یہ روایت شیعہ محدثین نے بھی ذکر کی ہے' اس روایت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام نے احسان (نیکی کرنے) کو ماقبل مذکورہ صفات یعنی کظم غیظ اور عفو و در گزر کرنے پر اضافی معنی کی حامل صفت کی صورت میں پیش کیا ہے۔ جو کہ حقیقت ہے اور احسان کے مفہوم کے تناظر میں بھی اس کا یہی معنی بنتا ہے' البتہ اس سے پہلے مذکورہ صفات (کظم غیظ و در گزر) احسان کے لازم المعنی ہیں' گویا احسان ایک جامع صفت ہے جس میں وہ صفات خود بخود شامل ہیں لہٰذا ان کے ذریعے احسان کی تعریف و پہچان کروائی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ زیر نظر آیہ مبارکہ کے ضمن میں حضرت پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں جن میں حسن خلق اور دیگر پاکیزہ اخلاقی صفات ذکر کی گئی ہیں مثلاً انفاق (خدا کی راہ و رضا کے لئے خرچ کرنا)' کظم غیظ (غصہ پر قابو پانا)' عفو (درگزر و معاف کر دینا)' ان روایات کو ہم ان کے مناسب ترین مقام میں بیان کریں گے' انشاء اللہ۔

توبہ واستغفار اور دوبارہ گناہ نہ کرنا

کتاب المجالس میں عبدالرحمٰن بن غنم دوسی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً...... الخ آیہ مبارکہ بہلول النباش کے بارے میں نازل ہوئی ہے' وہ نبش قبر کرنے کا عادی مجرم تھا' ایک دفعہ اس نے قبیلہ انصار کی ایک نوجوان لڑکی کی قبر کھودی اور اسے قبر سے باہر نکالا اور اس کا کفن کھولا' وہ سفید چہرہ نہایت خوبصورت لڑکی تھی' اسے دیکھتے ہی اس شخص پر شیطان مسلط ہو گیا اور اس نے اس کے ساتھ برائی کی' پھر اسے اپنے کئے پر سخت ندامت ہوئی اور وہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن آنحضرتؐ نے اسے ٹھکرا دیا' پھر وہ لوگوں سے کنارہ کش ہو گیا اور پورے طور پر لوگوں سے جدا ہو گیا' الگ تھلگ و تنہا رہنے لگا اور مدینہ سے باہر بعض پہاڑوں میں خدا کی عبادت و مناجات اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے زندگی بسر کرنے لگا۔ آخر خداوند کریم و رحیم نے اس کی توبہ قبول کر لی اور اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جب وہ برائی کا ارتکاب کر لیتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کر لیتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں' اور خدا کے علاوہ کون ہے جو گناہوں کو معاف کر دے بشرطیکہ وہ جان بوجھ کر اپنے سابقہ گناہ کا دوبارہ ارتکاب نہ کریں) (ملاحظہ ہو امالی صدوق

صفحہ ۴۵)۔

یاد رہے کہ مذکورہ بالا روایت بہت مفصل ہے اور ہم نے یہاں اس کا خلاصہ ذکر کیا ہے اگر اسے صحیح قرار دیا جائے تو اس میں مذکور واقعہ کو آیت کے اسباب نزول میں سے ایک سبب سمجھا جائے گا البتہ اس کے نزول کے اسباب میں سے ایک وہی ہے جس کا تعلق جنگ احد سے ہے اور عام طور پر اسے ہی اس آیت کا سبب نزول قرار دیا جاتا ہے۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی!

تفسیر عیاشی میں مذکور ہے کہ آیۂ مبارکہ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى مَا فَعَلُوا..... کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: الاصرار ان یذنب المذنب فلا یستغفر اللہ ولا یحدث نفسہ بتوبۃ فذلك الاصرار (اصرار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد نہ تو خدا سے طلب مغفرت کرے اور نہ ہی اپنے آپ کو توبہ کی راہ پر لائے، اسی کو اصرار کہتے ہیں) تفسیر العیاشی، جلد ا صفحہ ۱۹۸)

ارشاد نبویؐ

تفسیر درمنثور میں مذکور ہے کہ احمد نے ابوسعید خدری سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا: قال ابلیس: یارب وعزتك لا ازال اغوی بنی آدم ما کانت ارواحھم فی اجسادھم. فقال اللہ: وعزتی لا ازل اغفر لھم ما استغفرونی' ابلیس نے خداوند عالم سے کہا: اے میرے پروردگار، مجھے تیری عزت کی قسم میں بنی نوع آدم کو اس وقت تک گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کی روحیں ان کے جسموں میں باقی ہوں گی، خداوند عالم نے جواب دیا: مجھے اپنی عزت کی قسم، میں ہمیشہ انہیں معاف کرتا رہوں گا جب تک کہ وہ مجھ سے طلب مغفرت کرتے رہیں گے۔ (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۷۷)

امام صادقؑ کا فرمان

کتاب اصول کافی میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: لا صغیرۃ مع الاصرار ولا کبیرۃ مع الاستغفار گناہ خواہ جس قدر چھوٹا ہو مگر بار بار انجام دینے سے وہ چھوٹا نہیں رہتا اور بڑا گناہ خواہ جس قدر بڑا ہو استغفار کے بعد بڑا نہیں رہتا۔ (اصول کافی ج ۲ ص ۲۸۸)

توبہ واستغفار کی اہمیت

تفسیر عیاشی میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے جس میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

وفی کتاب اللہ نجاۃ من الردی، وبصیرۃ من العمی، وشفاء لما فی الصدور فیما امرکم اللہ بہ من الاستغفار والتوبۃ۔ قال اللہ تعالی: وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ وقال: وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ فھذا ما امر اللہ بہ من الاستغفار واشترط معہ التوبۃ والا قلاع عما حرم اللہ فانہ یقول: إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ وبھذہ الآیۃ یستدل ان الاستغفار لا یرفعہ الی اللہ الا العمل الصالح والتوبۃ

خدا کی کتاب میں ہر پستی سے نجات ہے، اور ہر اندھے پن سے چھٹکارا و بصیرت ہے، اور سینوں میں پائی جانے والی ہر بیماری سے شفا ہے، اس کی بابت خداوند عالم نے تمہیں طلب مغفرت کرنے اور توبہ کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: (اور جو لوگ برائی کا ارتکاب کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں وہ خدا کو یاد کریں اور پھر اس سے اپنے گناہوں کی طلب مغفرت کریں، خدا کے علاوہ کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے، بشرطیکہ وہ جان بوجھ کر اپنے کئے ہوئے کو بار بار انجام نہ دیں) اور خدا نے فرمایا جو شخص برا عمل انجام دے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر خدا سے طلب مغفرت کرے تو وہ خدا کو معاف کر دینے والا نہایت مہربان پائے گا۔ تو اس میں خداوند عالم نے استغفار کا حکم دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ شرط رکھ دی ہے کہ وہ توبہ کریں اور جس کام کو خدا نے حرام قرار دیا ہے اس سے دوری اختیار کریں، چنانچہ اس کا فرمان ہے: اسی کی طرف پاکیزہ کلمات کی پرواز ہے اور عمل صالح اسے بلند تر کر دیتا ہے۔ اس آیت سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ استغفار کو عمل صالح اور توبہ کے علاوہ کوئی چیز خدا کی طرف بلند نہیں کر سکتی۔ (تفسیر عیاشی ج ۱ ص ۱۹۸)

اس روایت میں امام علیہ السلام نے زیر بحث آیہ مبارکہ کے جملہ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا سے یہ مراد لیا ہے کہ وہ قلبی طور پر گناہ کرنے سے دوری اختیار کریں اور توبہ کرنے کے بعد دوبارہ گناہ کے مرتکب نہ ہوں، اور اسی طرح توبہ و استغفار کے بعد عمل صالح کا ناگزیر ہونا جملہ الیہ یصعد الکلم الطیب..... کی عمومیت سے ثابت ہوتا ہے۔

ابلیس کی ہرزہ سرائی

کتاب مجالس میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

لما نزلت ھذہ الآیۃ: وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً الخ صعد ابلیس جبلاً بمکۃ یقال لہ ثور، فصرخ

باعلی صوته بعفاریته فاجتمعوا الیه فقالوالهٔ :یاسیدنا لم تدعونا؟ قال :نزلت هذه الآیة فمن لها؟
فقام عفریت من الشیاطین فقال: انالها بکذا و کذا. فقال :لست لها. فقام اخر فقال مثل ذلک فقال:
لست لها. فقال الوسواس الخناس: انالها. قال: بماذا؟ قال :اعدهم وامنیهم حتی یواقعوا الخطیئة فاذا
واقعوها انسیتهم الاستغفار. فقال:أنت لها. فوکله بها الیٰ یوم القیامة

جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ اِذَافَعَلُوْافَاحِشَةً...... الخ تو ابلیس مکہ کے ایک پہاڑ پر چڑھ گیا کہ جسے
جبل ثور کہا جاتا ہے' اس پر چڑھ کر اس نے بلند آواز سے اپنے عفریتوں کو صدا دی' وہ سب اس کے پاس اکٹھے ہو گئے'
انہوں نے کہا اے ہمارے سردار' آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے؟ ابلیس نے کہا' یہ آیت نازل ہوئی ہے تو کون ہے جو
اس کا مقابلہ کرے؟ شیاطین میں سے ایک عفریت نے کہا: میں اس کا اس اس طرح مقابلہ کروں گا' ابلیس نے کہا:
نہیں' یہ تیرا کام نہیں' پھر دوسرا عفریت کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: میں حاضر ہوں' (اس نے بھی پہلے کی طرح بات کی)
ابلیس نے کہا: نہیں' تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پھر ایک عفریت جس نام وسواس خناس تھا کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا
کہ اس کا مقابلہ میں کروں گا' ابلیس نے پوچھا: تم کس طرح اس کا مقابلہ کرو گے؟ اس نے کہا: میں بنی نوع آدم کو گناہ
کرنے کی راہ پر لاؤں گا اور انہیں گناہ کا پیاسا بنا دوں گا اور جب وہ گناہ کا ارتکاب کر لیں گے تو توبہ و استغفار انہیں بھلوا
دوں گا۔ ابلیس نے کہا: یقیناً تو ہی اس کا مقابلہ کر سکتا ہے' چنانچہ ابلیس نے اسے قیامت تک اس کام پر مامور کر دیا۔
(امالی صدوق" ص ۳۷۶)

یہی روایت اہل سنت کے اسناد سے بھی ذکر کی گئی ہے۔

آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸

○ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

○ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۗءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ۙ

○ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

○ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

○ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ۧ

○ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

○ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْھَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْھَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

○ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

○ وَمَا كَانَ قَوْلَھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

○ فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ۧ

ترجمہ

○ اور تم سستی و کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو اور نہ ہی حزن و غم کا شکار ہو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن رہے۔

(۱۳۹)

○ اگر تمہیں زخم لگا ہے (تکلیف و صدمہ پہنچا ہے) تو ایسا ہی زخم ان لوگوں (تمہارے مدمقابل) کو بھی لگ چکا ہے، اور ہم یہ ایام لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں یہ اس لئے ہے کہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم ہی میں سے گواہ مقرر کرے، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

(۱۴۰)

○ اور یہ اس لئے بھی ہے کہ اللہ مومنوں کی چھان بین کرے اور کافروں کو نیست و نابود کر دے۔

(۱۴۱)

○ کیا تمہارا گمان ہے کہ تم یوں ہی بہشت میں چلے جاؤ گے جبکہ خدا نے بھی تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جانا ہی نہیں؟

(۱۴۲)

○ اور تم موت کے آمنے سامنے آنے سے پہلے تو موت کی تمنائیں کرتے تھے اور پھر جب اسے دیکھا ہے تو اب اسے دیکھ ہی رہے ہو۔

(۱۴۳)

○ اور محمد نہیں ہے مگر رسول، اس سے پہلے رسول گزر چکے ہیں، اگر وہ رحلت کرے یا قتل کر دیا جائے تو تم ضرور اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے، اور جو شخص اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جائے تو وہ خدا کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتا اور خدا بہت جلد شکر گزاروں کو جزا عطا کرے گا۔

(۱۴۴)

○ اور کوئی ذی روح خدا کے اذن و حکم کے بغیر مر نہیں سکتا موت کا وقت مقرر کر کے لکھ دیا گیا ہے اور جو شخص دنیا کا ثواب چاہے تو ہم اسے اس میں سے عطا کریں گے اور جو شخص آخرت کے ثواب کا خواہاں ہو تو ہم اسے اس سے دیں گے اور ہم بہت جلد شکر گزاروں کو جزا عطا کریں گے۔

(۱۴۵)

○ اور کتنے ایسے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر خدا والوں کی کثیر تعداد نے ــــ دشمنان خدا سے ــــ جنگ کی، تو وہ خدا کی راہ میں آنے والی کسی بھی تکلیف و مصیبت میں بزدلی کا شکار نہ ہوئے، وہ نہ ہی کمزور پڑے اور نہ ہی سستی میں مبتلا ہوئے اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۱۴۶)

○ وہ (صبر کرنے والے) اس کے سوا کچھ نہ کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری زیادتیوں سے درگزر فرما اور ہمارے قدموں کو مضبوط فرما اور کافر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما!

(۱۴۷)

○ تو خدا نے انہیں دنیا کا اجر دیا اور آخرت کا بہتر ثواب بھی عطا کیا اور خدا نیک اعمال بجالانے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۱۴۸)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ ـــــ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں ـــــ سابقہ ان آیات کا تتمہ ہیں جن کی ابتداء یَآ اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے ہوئی ہے کہ وہ آیات اوامر و نواہی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہماری یہاں زیر بحث آیات کے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں کہ یہ آیات ان اوامر و نواہی اور تعریف و توبیخ کے اصل مقصود و مطلوب پر مشتمل ہیں۔

اہل ایمان کی سربلندی و غلبہ

○ وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۹﴾

(اور تم سستی اختیار نہ کرو اور محزون و غمگین نہ ہو کہ تم ہی سربلند و غالب ہو گے بشرطیکہ تم مومن رہے)

وَلَا تَهِنُوۡا..... وہن کا معنی ـــ جیسا کہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے ـــ خلقت یا اخلاق میں کمزوری ہے' (الضعف فی خلق وخلق)۔

یہاں وہن سے مراد ان کی طرف سے دین کی حمایت و دفاع اور دشمنان دین سے جنگ کرنے میں عزم و ارادہ اور عملی اقدام میں کوتاہی و سستی کرنا ہے'

وَلَا تَحۡزَنُوۡا..... حزن فرح و خوشی کے مقابلہ میں ایک حالت کا نام ہے جو اس وقت انسان پر طاری ہوتی ہے جب وہ اپنی کوئی ایسی مملوکہ چیز سے محروم ہو جائے جسے وہ پسند کرتا ہو یا اس چیز سے ہاتھ دھو بیٹھے جس پر اپنے مالکانہ حقوق کا قائل ہو یعنی اسے اپنی چیز سمجھتا ہو۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ جملہ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ (کہ تم ہی سربلند و غالب ہو اگر تم مومن رہو‘ اگر تمہیں کوئی جسمانی تکلیف پہنچے تو اس طرح کی تکلیف دوسروں کو بھی پہنچ چکی ہے) میں اس بات کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں کمزوری و سستی اور حزن اس لئے پیدا ہوا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان میں سے کچھ افراد زخمی ہو گئے اور کفار ان پر چھا گئے‘ ان مناظر کے مشاہدہ سے ان کے حوصلے پست ہو گئے‘ اگرچہ اس جنگ (جنگ بدر) میں مشرکوں کو مومنین پر پورا غلبہ اور فتح و کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی اور مسلمانوں کی طرف سے میدان چھوڑ جانے اور فرار کرنے کے نتیجہ میں جنگ اختتام پذیر نہیں ہوئی تھی لیکن مسلمان جس صورتحال سے دوچار ہوئے اور جس ناگوار حالت کا شکار ہوئے وہ نہایت تکلیف دہ اور دشوار تھی اور وہ یہ کہ ان کے بہادر ترین سردارانِ لشکر میں سے ستر افراد شہید ہو گئے اور یہ سب کچھ خود ان کی اپنی ہی سرزمین و علاقہ میں وقوع پذیر ہوا جس کی وجہ سے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور ان کی طاقت میں کمی آ گئی اور وہ کمزور پڑ گئے‘ یہی وجہ ہے کہ جملہ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ ان کی طرف سے کمزور پڑنے اور حزن و غم کا شکار ہونے کی علت و سبب کے مقام پر ذکر ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں وہن وحزن نہ کرنے کی ممانعت ان کے حالیہ و موجودہ حقیقی حزن و وہن سے دوچار ہونے کی بناء پر ہوئی کسی فرضی و خیالی اور تصوراتی بنیاد پر نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی متوقع صورتحال کے حوالہ سے آئی۔

آیت مبارکہ میں لفظ الۡاَعۡلَوۡنَ کو ہر طرح کی قید سے خالی ذکر کرتے ہوئے ایمان کے ساتھ مشروط کر دیا گیا چنانچہ ارشاد ہوا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳۹﴾ (اور تم ہی غالب و برتر رہو گے بشرطیکہ تم مومن رہے)‘ تو اس سے یہ معنی و مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اس جملہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تمہارے اندر ایمان موجود ہے تو تمہیں اپنے عزم و ارادہ میں ہرگز کمزوری و سستی پیدا نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی تم اپنے دشمنوں پر کامیابی نہ پانے اور ان پر فتح نہ حاصل کرنے کی وجہ سے غم و حزن میں مبتلا ہو کیونکہ ایمان تمہاری سربلندی و غلبہ کا ضامن ہے اور اسی میں تمہاری عظمت و رفعت کا راز پوشیدہ ہے اور وہ یوں کہ ایمان تقویٰ اور صبر سے جدا نہیں ہوتا بلکہ ان کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ و تعلق ہے اور تقویٰ و صبر ہی وہ دو پاکیزہ عملی صفات و خصوصیات ہیں جن میں فتح و کامیابی کا حقیقی معیار پایا جاتا ہے اور جہاں تک تمہارے زخمی ہونے اور تکلیف میں مبتلا ہونے کا تعلق ہے تو وہ صرف تم ہی نہیں بلکہ وہ لوگ ــــــ مشرکین ــــــ بھی اس کا شکار ہوئے اور انہیں بھی اس طرح کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا‘ نتیجتاً انہیں کسی بھی حوالہ سے تم پر برتری حاصل نہیں ہوئی جس کی وجہ سے تم سستی و کمزوری اور غم و حزن کا شکار ہو جاؤ۔

ایک اہم نکتہ

یہاں ایک اہم ترین نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ آیت مبارکہ میں کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳۹﴾ (بشرطیکہ تم مومن رہے)

ان لوگوں سے کہا گیا جو اہل ایمان تھے' اس کا سبب اور حقیقی راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اگرچہ ایمان کی دولت سے محروم نہ تھے لیکن اپنے ایمان پر صحیح معنی میں عمل پیرا نہ تھے اور ایمانی تقاضوں کی تکمیل نہ کرتے تھے چنانچہ ایمان جن صفات سے متصف ہونے کا تقاضہ کرتا ہے یعنی صبر و تقویٰ' وہ ان سے متصف نہ تھے ورنہ ان کی عملی زندگی میں ان کے ایمان کی اثر گزاری ظاہر ہوتی' یہ صورتحال ان تمام لوگوں میں پائی جاتی ہے جو ایمان کے حوالہ سے مختلف مراتب و کیفیات رکھتے ہیں کہ کچھ افراد حقیقی معنی میں ایمان والے ہوتے ہیں' کچھ لوگ ایمان میں کمزور ہوتے ہیں اور کچھ منافق دل ہوتے ہیں' بنابر ایں آیہ مبارکہ میں اظہار مطلب کا جو انداز اختیار کیا گیا اس میں تینوں قسموں کے افراد کو ملحوظ رکھا گیا یعنی حقیقی مومنوں کی حوصلہ افزائی کی گئی' کمزور ایمان لوگوں کو نصیحت کی گئی اور منافق و بیمار دل والوں کو انتباہ و عتاب سے باخبر کیا گیا۔

جنگ میں تکلیفوں سے دوچار ہونا

○ اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ

(اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہو تو اسی طرح زخم ان لوگوں کو بھی اس سے پہلے لگ چکا ہے)

لفظ قَرْحٌ (قاف پر زبر کے ساتھ) اس نشان کو کہتے ہیں جو کسی بھی بیرونی چیز کے لگنے سے بدن کو زخمی کرنے سے بنتا ہے اور قُرْح (قاف پر پیش کے ساتھ) جراحت کے اس نشان کو کہتے ہیں جو بدن کے اندر سے پھوٹنے والی بیماری سے لگے مثلاً پھوڑا وغیرہ' (ملاحظہ ہو: المفردات ص ۴۰۰)' آیت مبارکہ میں لفظ قرح کنایہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے' اس سے مراد جنگ احد کے دن مسلمانوں کو لگنے والا زخم ہے' اسے مفرد کی صورت میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو ایک شخص (اکائی) فرض کیا گیا ہے کہ جسے دشمن کی طرف سے زخم لگا ہو' یعنی ان میں سے بعض قتل کئے گئے اور بعض زخمی ہوئے' اور مسلمانوں کو فتح و نصرت اور کامیابی کا مرحلہ بہت ہی نزدیک آ کر دور ہو گیا اور وہ اس سے محروم ہو گئے۔

بہرحال جملہ اِنْ یَّمْسَسْكُمْ..... اور اس کے بعد والے جملے تا وَیَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ سب کے سب جملہ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا..... کی علت و سبب کے بیان پر مشتمل ہیں جیسا کہ اس حوالہ سے سطور بالا میں اشارہ ہو چکا ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے جملہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ علت و سبب کے بیان پر مشتمل دوسرا جملہ ہے۔ البتہ ان دونوں بیانوں میں یہ فرق ہے کہ پہلا تعلیلی بیان یعنی وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ان کے غلط گمان کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ انہوں نے گمان کر لیا تھا کہ مشرکین ان پر غلبہ پا گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ کمزور پڑ گئے اور حزن و غم میں مبتلا ہو گئے تو خداوند عالم نے ان کی سوچ کو غلط و نادرست قرار دیا اور انہیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ غلبہ و سربلندی کا معیار ان کے ساتھ ہے یعنی ایمان' جبکہ مشرکین اس بنیاد ہی سے

محروم ہیں اس لئے ارشاد ہوا: اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴿۱۳۹﴾ اس مطلب کی تائید درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی ہوئی ہے:

سورۂ روم آیت ۴۷:

○ وَكَانَ حَقًّا عَلَيۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴿۴۷﴾

(اور مومنین کی مدد کرنا ہمارا حق (ہماری ذمہ داری) ہے)

اور دوسرے تعلیلی بیان یعنی اِنۡ يَّمۡسَسۡكُمۡ...... تا وَيَمۡحَقَ الۡكٰفِرِيۡنَ﴿۱۴۱﴾ میں فریقین یعنی مومنین ومشرکین دونوں کی حالتوں کو بیان کرکے یا ان حکمتوں ومصلحتوں کو بیان کر کے مطلب کو واضح کیا گیا جن کی بازگشت ایک ہی حقیقت واساس کی طرف ہوتی ہے جو کہ اس خدائی نظام سے عبارت ہے جو صدیوں سے بنی نوع انسان کے درمیان جاری وساری ہے۔

زمانہ کی گردش کا خدائی نظام

○ وَتِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ............

(اور یہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں)

ایام جمع ہے یوم کی یوم وقت کی اس مخصوص ووسیع مقدار کو کہتے ہیں جو گوناگوں واقعات کے رونما ہونے کا زمانی ظرف ہوتا ہے اور پھر انہی مختلف واقعات وحوادث کی بناء پر اس میں بھی مختلف صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اگرچہ لفظ یوم کا عمومی استعمال سورج کے طلوع وغروب کی درمیانی مدت کے لئے ہوتا ہے (دن) لیکن اسے مجازی طور پر حاکمیت وسلطنت اور غلبہ واقتدار وغیرہ کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو کہ ظرف ومظروف کی مناسبت کے پیش نظر ہوتا ہے یعنی یوم کو زمانی ظرف (وہ وقت جس میں سلطنت واقتدار قائم ہوا) قرار دے کر مظروف (وہ کام جو اس میں واقع ہوا مثلاً حکمرانی وغیرہ) کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے یوم یا ایام سے موسوم کر دیا جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: یوم جماعة کذا (فلاں گروہ کا دن) یوم ال فلان (فلاں خاندان کا دن) جبکہ اس سے مراد اس گروہ یا خاندان کا زمانہ اقتدار وحکومت مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اسے خود اسی وقت ودورانیہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس میں وہ اقتدار قائم تھا اور یہاں زیر نظر آیہ مبارکہ میں لفظ ایام سے یہی معنی مراد لیا گیا ہے یعنی وہ دورانیہ اور وقت جس میں کوئی کام سرانجام پائے۔

نداولها مداوله کا معنی پھیرنا گھمانا ایک کے بعد دوسری چیز کو اس کی جگہ پر لانا ہے بنابرایں آیہ مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ سنت الٰہیہ ونظام خداوندی لوگوں کے درمیان گردش ایام پر جاری واستوار ہے اور ایسا نہیں کہ اسے صرف ایک ہی قوم کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو جبکہ دوسروں کو اس سے محروم رکھا گیا ہو اور اس نظام خداوندی وسنت الٰہی کی بنیاد اور اصل واساس

عمومی مصلحتوں وفوائد کے سوا کچھ نہیں البتہ تمہاری قوت فہم وادراک ان تمام مصلحتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے تم صرف ان میں سے بعض کا ادراک کر سکتے ہو سب کا نہیں!

گردشِ ایام کا مقصد وفلسفہ

○ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ......

(اور تا کہ خدا جان لے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور تم میں سے گواہ بنائے ......)

یہاں حرف و عطف کے لئے ہے اور اس کے ذریعے پورا جملہ ایک محذوف جملے کی طرف پلٹتا ہے' اسے حذف کرنا اس مطلب کی طرف اشارہ کی غرض سے ہوا کہ افہام وعقول اس کی بعض جہتوں کے سوا اس کے فہم وادراک سے قاصر ہیں یعنی اس کے چند پہلوؤں ہی کا فہم وادراک ان کے لئے ممکن ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں' اور جو کچھ مومنین کے لئے مفید ہے وہ صرف وہی ہے جس کا ذکر خداوند عالم نے آیت مبارکہ: وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ میں فرمایا ہے۔

جہاں تک آیہ مبارکہ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ '...... کا تعلق ہے تو اس سے مراد مومنین کے ایمان کا اس کے مخفی و پوشیدہ ہونے کے بعد ظاہر ہونا ہے کیونکہ حوادث وموجودات عالم ہستی کے بارے میں علم الٰہی ان حوادث وموجودات کے اصل وجود سے عبارت ہے کیونکہ حوادث وموجودات جہان اپنے اصل وحقیقی وجود کے ساتھ خدا کے علم میں ہیں نہ کہ ان سے حاصل ہونے والی ظاہری صورتوں کے ذریعے' جیسا کہ ہمارے علوم وادراکات میں ہوتا ہے' ___ خدا کے علم اور ہمارے علم میں یہی فرق ہے ___ اور یہ ایک واضح حقیقت ہے' اس سے لازمی نتیجہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ کسی چیز سے آگاہ ہونے کی بابت خدا کے ارادہ سے مراد اس کا اس چیز کو وجود عطا کرنا اور اس چیز کا وجودی لباس میں ظاہر ہو جانا ہے (یعنی خداوند عالم جب کسی چیز کو جاننے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے پیدا کرتا ہے اور اسے وجود عطا کر دیتا ہے) چنانچہ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہوا: وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اور تا کہ جان لے خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے)' تو اس جملے میں خداوند عالم نے مومنین کے وجود کو یقینی طور پر واقع وثابت قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان کے ایمان کے ظہور پذیر ہونے کا ارادہ کیا ہے' اور یہ کام چونکہ خداوند عالم کے مقرر کردہ نظام الاسباب سے وابستہ ہے لہٰذا ان امور کا وقوع پذیر ہونا ناگزیر ہے جو ایمان کے ظاہر ہونے کا موجب ہیں جبکہ ان سے پہلے ایمان پوشیدہ تھا۔

اور جہاں تک آیہ مبارکہ وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ کا تعلق ہے تو اس میں شہداء سے شہداء الاعمال یعنی

اعمال کے گواہ مراد ہیں اور شھداء سے میدان کارزار میں قتل کئے جانے والے مراد لینا قرآنی استعمال سے ثابت نہیں، یعنی قرآن مجید میں کسی مقام پر شہداء سے میدان جنگ میں قتل کئے جانے والے افراد مراد نہیں لئے گئے، ملاحظہ ہو،

سورۂ بقرہ آیت ۱۴۳:

○ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ

(اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت قرار دیا تا کہ تم شہدا (گواہ) بنو)

اس آیت کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

اور زیر بحث آیت مبارکہ میں جملہ وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ میں شُهَدَآءَ سے میدان کارزار میں قتل کئے جانے والے مراد لینا کسی بھی حوالہ سے درست و مناسبت کا حامل نہیں نظر آتا کیونکہ یہ کہنا ہرگز قرین قیاس نہیں کہ خدا نے فلاں شخص کو اپنی راہ میں قتل کیا جانے والا اور شہید قرار دیا ہے۔ (اتخذ الله فلاناً مقتولاً فی سبیله و شهیدا)، جیسا کہ اس سے مشابہ جملوں میں یوں کہا جاتا ہے۔

○ اتخذ الله ابراهیم خلیلاً (خدا نے ابراہیم کو خلیل بنایا)

○ اتخذ الله موسیٰ کلیماً (خدا نے موسیٰ کو کلیم بنایا)

○ اتخذ الله النبی شهیداً لیشهد علی امته یوم القیامة (خدنے نبی کو شہید (گواہ) بنایا کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کے بارے میں گواہی دے گا)۔

ظاہر ہے کہ خلیل (دوست) اور کلیم (ہمکلام) بنانا تو قرین قیاس ہے لیکن مقتول بنانا ہرگز قرین قیاس نہیں،

ایک نہایت اہم علمی نکتہ

زیر بحث آیۂ مبارکہ میں ارشاد ہوا: وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (اور تم میں سے گواہ بنائے)، اس میں غائب کے اندازِ خطاب کو مخاطب کے صیغے میں تبدیل کیا گیا یعنی ویتخذهم شهداء (اور انہیں شہداء بنائے) کی بجائے وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (اور تم میں سے شہداء بنائے) کہا گیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ شہادت (گواہی دینا) اگرچہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت (۱۴۳) وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ میں امت کی طرف منسوب ہے اور اس کی اضافت امت کی طرف دی گئی ہے لیکن یہ اضافت و نسبت بعض کی کل کی طرف نسبت و اضافت کے طور پر ہے کیونکہ شہداء امت کے بعض افراد ہیں کل کے کل نہیں (تمام افراد امت کو گواہ نہیں بنایا گیا بلکہ امت میں سے بعض افراد کو گواہ بنایا گیا ہے)، بہر حال سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے اور ہمارے ذکر کردہ مطالب کی تصدیق زیر نظر آیت

مبارکہ کے آخری جملہ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ سے بھی ہوسکتی ہے۔

اور جہاں تک جملہ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ کا تعلق ہے تو اس میں یمحص جو کہ تمحیص سے مشتق ہے اس کا معنی کسی چیز کو بیرونی آلودگی اور باہر سے آئی ہوئی ناپاکیزگی سے پاک کرنا ہے' اسے اردو زبان میں چھاننا کہتے ہیں کہ اس کے ذریعے خالص و ناخالص کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جاتا ہے (ملاوٹوں سے پاک کرنا)' ___ جب کسی چیز میں خالص و ناخالص مخلوط ہو جائے تو اس سے خالص کو ناخالص سے تمیز دینے کے عمل کو تخلیص کہتے ہیں'

اور یمحق میں محق کا معنی تدریجی طور پر محو کر دینا ہے۔ یعنی کسی چیز کو رفتہ رفتہ ختم کر دینا' اور تمحیص (خالص سازی) کا تعلق مداولہ ایام یعنی دنوں کے پھیرنے اور اس میں پوشیدہ مصلحتوں سے ہے بلکہ اس کی خصوصیات اور حکمتوں میں سے ایک ہے جو کہ مومنین کے ایمان سے آگاہی حاصل کرنے سے مختلف ہے کہ جس کا ذکر ولیعلم اللہ الذین امنوا میں ہوا کیونکہ مومن وغیر مومن کے درمیان تمیز اور ان کا ایک دوسرے سے الگ کرنا ایک چیز ہے جبکہ اس تمیز کے بعد مومنین کے ایمان کا کفر و نفاق و فسوق سے پاک و خالص کرنا دوسری چیز ہے چنانچہ اسی بناء پر اسے کافرین سے محو کئے جانے کے مقابل میں ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ (اور یہ کہ خدا ایمان والوں کو خالص کرے اور کافروں کو محو کر دے)' تو یہ بات واضح ہوئی کہ خداوند عالم کفر و نفاق و فسوق کے اجزاء کو مومن سے تدریجی طور پر ختم کرتا ہے یہاں تک کہ اس کا خالص ایمان باقی رہ جاتا ہے اور وہ صرف خدا کے لئے ہوتا ہے' اور اس کے مقابل میں کفر و شرک و مکاری کے اجزاء کو کافر سے تدریجی محو کرتا ہے یہاں تک کہ پھر وہ کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

تو یہ سب ان حکمتوں کی صورتیں ہیں جو گردش ایام اور دنوں کے لوگوں کے درمیان پھیرنے اور حکمرانی کو کسی قوم کے ساتھ مختص نہ کرنے میں پوشیدہ ہیں' اور حق یہ ہے کہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے اور وہ بہترین و مفید ترین کے علاوہ کچھ انجام نہیں دیتا جیسا کہ اللہ نے درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ رعد' آیت: ۱۷

○ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ

(اسی طرح خدا حق و باطل کی بابت مثال دیتا ہے' تو جہاں تک جھاگ کا تعلق ہے تو وہ خشک ہو کر بالآخر ختم ہو جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لئے مفید ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے)۔

اور زیر نظر آیات مبارکہ سے پہلے خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا:

○ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

(تا کہ وہ کافروں کے ایک گروہ کو ختم کر دے یا انہیں ذلت سے دوچار کر دے کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام واپس پلٹ جائیں، اس سلسلہ میں آپ کا کوئی عمل دخل نہیں، وہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرلے یا انہیں عذاب کرے کہ وہ ہیں ہی ظالم!) (آیات ۱۲۶، ۱۲۷) ان آیتوں میں خداوند عالم نے ان امور میں نبیؐ کے از خود اختیارات کی نفی کی ہے اور تمام امور کی باگ ڈور صرف اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، وہ اپنی مخلوق کے بارے میں جیسا چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔

اور ان بیانات کو کہ جن میں لوگوں کے درمیان ایام کی تقسیم، اس تقسیم کی غرض ان کا امتحان و آزمائش اور مومن و کافر کے درمیان تمیز و جدا سازی اور مومنین کی خالص سازی و کافرین کا تدریجی محو و نابودی کو ذکر کیا گیا ہے ان آیات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے جن میں ان امور کی بابت حضرت پیغمبر اسلامؐ سے تعلق کی نفی کی گئی ہے تو اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس دور کے مومنین کی اکثریت کا یہ گمان تھا کہ ان کا دین حق پر ہونا ہی ان کے فتح پانے کا سبب ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے کافروں پر غلبہ پایا ہے خواہ وہ جیسے بھی ہوں، اور وہ ہر حال میں اور ہمیشہ ہی ان پر غالب ہوں گے اور یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھ میں ہے اور وہ تمام امور کے مالک و صاحب اختیار ہیں۔ ان کے اس گمان کا سبب جنگ بدر میں ان کا کافروں پر معجزاتی صورت میں غلبہ و فتح پانا تھا کہ جس میں خداوند عالم کی طرف سے امدادی فرشتے آئے، جبکہ اس طرح کا گمان فاسد و بے بنیاد اور نادرست ہے کیونکہ اس سے امتحان و آزمائش کے جاری نظام کا بے نتیجہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس سے امر و نہی اور ثواب و عقاب کی مصلحتوں و حکمتوں کی نفی ہوجاتی ہے کہ جس کا نتیجہ دین کی اصل و اساس کا منہدم ہوجانا ہے جبکہ دین فطری آئین ہے کہ جو فطرت سلیمہ کی اعلیٰ ترین قدروں و اصولوں پر قائم و استوار ہے لہٰذا وہ خارق العادت امور پر مبنی نہیں ہوسکتا اور خداوند عالم کے اس مقررہ نظام کے برخلاف نہیں ہوسکتا کہ جو عالم وجود و ہستی میں قائم و جاری ہے کہ جس میں غلبہ و عدم غلبہ اور فتح و شکست کا تعلق عمومی عادی و معمول کے اسباب سے ہے، اسی پر سنت الٰہیہ قائم و استوار ہے۔

اسی وجہ سے خداوند عالم نے یہ بیان کرنے کے بعد کہ دنوں کا لوگوں کے درمیان پھیرنا ان کے امتحان و آزمائش کی غرض سے ہے ان لوگوں کے مورد مذمت قرار دیئے جانے کا اظہار کیا جو مذکورہ بالا باطل خیال و فاسد گمان رکھتے ہیں اور انہیں ان الفاظ میں خبردار کیا: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ .... (کیا تمہارا گمان ہے کہ تم بہشت میں داخل ہو گے جبکہ خدا نے تمہیں ابھی جانا ہی نہیں کہ ......)

باطل خیال و فاسد گمان

○ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ ....

(کیا تمہارا گمان ہے کہ تم بہشت میں داخل ہو گے جبکہ خدا نے تمہیں ابھی جانا ہی نہیں کہ ......)

اس آیت میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کا یہ گمان غلط و باطل ہے کہ وہ امتحان و آزمائش کے بغیر بہشت میں داخل ہوں گے' ان کا یہ گمان دراصل اس سابقہ گمان کا لازمی نتیجہ ہے جس کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ ان کا خیال ہے کہ وہ چونکہ حق پر ہیں اور حق کبھی مغلوب واقع نہیں ہوتا لہٰذا غلبہ و فتح پانا انہی کے ساتھ مختص ہے اور وہ ہرگز مغلوب وشکست سے دوچار نہ ہوں گے۔ جبکہ یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ اس طرح کے گمان وخیال کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص بھی حضرت پیغمبر اسلام پر ایمان لائے اور ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو وہ دنیا میں غلبہ وغنیمت اور آخرت میں مغفرت وجنت کی سعادت سے بہرہ ور ہوگا اور پھر ظاہری ایمان وحقیقی ایمان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور نہ ہی ایمانی درجات کے درمیان کوئی امتیاز قائم ہو سکے گا' اس طرح مجاہد مومن اور مجاہد وصابر مومن دونوں ایک ہی درجہ ومنزلت کے حامل ہوں گے' اسی طرح وہ شخص جو کسی عمل خیر کا ارادہ وتمنا کرے اور وقت آنے پر اسے انجام بھی دے اس شخص کی مانند ہو جائے گا جو کسی کار خیر کی آرزو کرے مگر جب اس کی انجام دہی کا وقت آئے تو اس سے روگردانی کر لے۔

بنابرایں جملہ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ...... سے مذکورہ بالا گمان کے غلط ونادرست ہونے کا مزید ثبوت ملتا ہے کیونکہ وہ لوگ جنگ پیش آنے سے پہلے راہ خدا میں مارے جانے کی آرزوئیں کرتے تھے اور جب جنگ ہوگئی اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیا تو انہوں نے پیش قدمی نہ کی اور اپنی آرزوؤں کو پانے کی جانب نہ بڑھے' بلکہ سست ہو گئے اور لڑائی سے روگردانی اختیار کی' تو کیا یہ بات درست قرار پائے گی کہ وہ صرف اپنی آرزو وتمنا کی بناء پر بہشت میں چلے جائیں گے جبکہ اس کے عملی امتحان میں ناکام ہوئے ہوں اور ان میں سے خالص وناخالص ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے ہوں؟ اور کیا ضروری نہیں کہ ان کا امتحان و آزمائش ہو؟

ان مطالب کے تناظر میں ثابت ہوتا ہے کہ کلام میں کچھ فرض کیا جائے جس سے مقصود واضح ہو اور آیت کا معنی یوں کیا جائے: فقد رأیتموہ وانتم تنظرون فلم یقدموا علیہ (جبکہ تم نے جنگ کو دیکھا اور اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا مگر تم نے اس کی طرف پیش قدمی نہ کی)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ انتم تنظرون (تم خود دیکھتے تھے) اُن کی طرف سے اقدام وپیش قدمی نہ کرنے سے کنایۃً ذکر ہوا ہو' یعنی تم نے صرف دیکھنے پر اکتفاء کر لیا ــــ دیکھتے ہی رہے ــــ اور کوئی عملی اقدام نہ کیا' اس طرح کا بیان ان کی سرزنش ومذمت کی ایک صورت ہے۔

امتحان اور اس کی حقیقت کا بیان

یہ بات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن مجید ہدایت کرنے کے عمل کو خداوند عالم کے ساتھ مخصوص قرار دیتا ہے (ہدایت ورہنمائی ذات احدیت کے ساتھ مختص ہے) لیکن جو اہم مطلب قابل توجہ ہے وہ یہ کہ قرآن مجید میں ہدایت

کو اختیاری ہدایت میں منحصر و محدود قرار نہیں دیا گیا کہ جس کا تعلق اخروی سعادت یا دنیوی خوشبختی سے ہے چنانچہ اس حوالہ سے یوں ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورۂ طٰہٰ آیت ۵۰:

○ الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾

(اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت (خلعت وجود و ہستی) عطا کی اور پھر ہدایت کی)

اس میں ہدایت کو عمومیت دی گئی ہے کہ جس میں شعور و عقل رکھنے والوں اور ان سے محروم مخلوق کی ہدایت شامل ہے‘ (کہ جسے اصطلاح میں تکوینی ہدایت کہا جاتا ہے)

اسی طرح ہدایت کی غرض و غایت کے حوالہ سے بھی عمومیت ملحوظ ہے‘ چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ اعلیٰ آیت ۲‘۳:

○ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ

(اس نے پیدا کیا پھر درست کیا اور اسی نے اندازے و تقدیریں مقرر کیں پھر ہدایت کی)

یہ آیت مبارکہ بھی اطلاق اور عمومیت کے حوالہ سے ماقبل آیت کی مانند ہے۔

اس سے ثابت و ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہدایت اس خاص ہدایت کے علاوہ اور اس سے مختلف ہے جو اضلال یعنی گمراہ کرنے کے مقابل میں آتی ہے چنانچہ خداوند عالم نے بعض گروہوں سے اس کی نفی کی اور اس کی جگہ ضلال و گمراہی کا اثبات کیا جبکہ عمومی ہدایت کی اس کی مخلوق میں سے کسی سے نفی نہیں ہوتی‘ اس حوالہ سے درج ذیل آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں:

سورۂ جمعہ‘ آیت ۵:

○ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵﴾

(اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا)

سورۂ صف‘ آیت ۵:

○ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۵﴾

(اور اللہ فاسق و بدکار لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا)

اس سلسلہ میں کثیر آیات موجود ہیں۔

ان مطالب سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ ہدایت اس ہدایت سے بھی مختلف ہے جس کا معنی عمومی طور پر سب کو راستہ دکھانا کیا جاتا ہے کہ جس میں مومن و کافر سب شامل ہیں‘ (ارائۃ الطریق) جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورہ دہر آیت ۳:

O إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝

(ہم ہی نے اسے راستہ کی ہدایت کردی ہے' خواہ وہ شکر گزار ہو یا کفرانِ نعمت کرے)

سورہ حم سجدہ' آیت ۱۷:

O وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى

(اور ہم نے توثمود کو ہدایت کردی (قوم ثمود کو) مگر انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی)

ان دو آیتوں اور ان کے مانند دیگر آیتوں میں جس ہدایت کا تذکرہ ہوا وہ شعور و عقل والوں کے علاوہ کسی کے لئے نہیں' (اس میں عمومیت نہیں پائی جاتی کہ جس میں شعور و عقل والوں کے علاوہ دوسری مخلوق بھی شامل ہو) اور آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ سورہ طہٰ کی آیت میں جملہ ثم ھدی اور سورہ اعلیٰ کی آیت میں جملہ والذی قدر فھدی میں ہدایت کا معنی مورد اور غایت دونوں حوالوں سے عمومیت رکھتا ہے' (اس میں ارباب شعور و عقل اور ان کے علاوہ دیگر تمام مخلوق شامل ہے) بالخصوص دوسری آیت (سورہ اعلیٰ) میں ہدایت کو تقدیر کی فرع قرار دیا گیا ہے' جبکہ خاص ہدایت تقدیر سے کوئی مناسبت و موزونیت نہیں رکھتی' کیونکہ تقدیر سے مراد کسی چیز کو اس کی خلقت کی غرض وغایت کی طرف لے جانے سے اسباب وعلل کا مہیا کرنا ہے، اگرچہ وہ ہدایت بھی عالم ہستی کے عمومی نظام کے حوالہ سے تقدیر ہی کے دائرہ میں آتی ہے لیکن دونوں حوالوں اور لحاظوں میں فرق ہے۔ عمومی ہدایت اور خاص ہدایت کی تناظری جہتیں مختلف ہیں۔

بہر حال یہ عمومی ہدایت ہی ہے جو خداوند عالم سے مخصوص و مختص ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کے وجودی کمال کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اسے اس کی خلقت کی غرض تک پہنچاتا ہے اور وہی ہدایت ہے کہ جس کے ذریعے ہر چیز اپنی ذات کی بقاء و استحکام کے تقاضوں کی تکمیل کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے کہ جس میں تمام عملی اقدامات اور افعال شامل ہیں۔ اس موضوع سے مربوط مطالب کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہم خداوند عالم کی توفیق کے سہارے اس کی بابت جلد وضاحت وتشریح پیش کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس وقت ہمارے بیانات کی غرض ومقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ کلام الٰہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجوداتِ عالم ہستی کو خدائی عمومی ہدایت کے ذریعے اپنی تخلیق کی اصل غرض ومقصد اور اپنے سفر زندگی کی آخری منزل کی طرف لایا جارہا ہے اور کوئی مخلوق اس عمومی نظام کے دائرہ سے باہر نہیں، اور اس عمومی ہدایت کی ذمہ داری خداوند عالم نے خود اپنے لئے مخصوص حق کی صورت میں قرار دی ہے اور وہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کرتا، اس حوالہ سے اس نے ارشاد فرمایا ہے:

سورہ واللیل، آیت: ۱۲۔ ۱۳

○ ''اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۞ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۞''

(ہدایت کی ذمہ داری ہم ہی پر ہے اور آخرت و دنیا ہمارے ہاتھ میں ہے)

یہ آیت مبارکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں۔ اپنے اطلاق اور ہر طرح کی قید و شرط سے خالی ہونے کے حوالہ سے اجتماعی اور انفرادی دونوں ہدایتوں کی جامع ہے، اس میں معاشرہ کی معاشرہ ہونے کے حوالہ سے ہدایت اور ہر فرد کی فرد ہونے کے حوالہ سے ہدایت شامل ہے اس کی تائید بلکہ ثبوت سابقہ دو آیتوں میں بھی موجود ہے۔

بنابرایں یہ واضح ہوا کہ موجودات عالم ہستی کا خداوند عالم پر یہ حق ثابت ہے کہ وہ انہیں تکوینی ہدایت سے نوازے کہ جو نہیں ان کے مقدر شدہ کمال کی طرف لے جائے اور اسی طرح انہیں تشریعی ہدایت عطا کرے جو نہیں ان کے تشریعی کمال سے بہرہ ور کردے' قارئین کرام! آپ سابقہ بحثوں میں جو نبوت سے مربوط تھیں اس مطلب سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ تشریع کس طرح تکوین میں داخل ہوئی اور اس پر قضاء و قدر کی بالا دستی کی صورت و کیفیت کیا ہے؟ موجودات عالم ہستی میں سے نوع انسانی کو یہ وجودی خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی کمالی جہات ایسے اختیاری ارادی افعال سے وابستہ ہے جو نظری و عملی اعتقادات پر مبنی ہیں یعنی ان اعتقادات کے بغیر وہ افعال صورت پذیر ہو ہی نہیں سکتے' نتیجتاً نوع انسانی کی زندگی کا دارومدار ان قوانین پر ہے جو اس کے وجودی تشخص کو نمایاں کریں' خواہ وہ قوانین حق ہوں یا باطل' اچھے ہوں یا برے' ہر صورت میں انسانی زندگی میں قانون ناگزیر ہے' لہٰذا نظام تکوین و تخلیق کے زمامدار پر لازم ہے کہ نوع انسانی کے لئے اوامر و نواہی کا ایک سلسلہ (شریعت) قائم کرے اور ایسا معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دے جو اجتماعی و انفرادی مسائل و حوادث کی صورتگری کو یقینی بنائے تاکہ انسان ان دونوں سے تعلق کے تناظر میں اپنی وجودی قوتوں کو عملی صورتوں میں ڈھال سکے کہ جس کے نتیجہ میں یا تو سعادتمند ہو جائے یا شقی و بدبخت! گویا جو کچھ اس کے باطن میں ہے وہ ظہور پذیر و جلوہ گر ہو' یہی وہ مقام ہے جہاں امتحان و آزمائش کا مرحلہ سامنے آتا ہے اور مذکورہ بالا اجتماعی و انفرادی حوادث و مسائل اور تشریعی سلسلوں میں ابتلاء و امتحان کی منزل آتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جو شخص خدائی دعوت (سلسلۂ ہدایت) کی پیروی نہ کرے اور خود ہی اپنے لئے شقاوت و بدبختی کے اسباب فراہم کرے اور اسی حال پر باقی بھی رہ جائے تو یقیناً وہ عذاب کا مستحق قرار پائے گا' اسی طرح وہ تمام امور جن کی بابت خدا کی طرف سے احکامات یعنی اوامر و نواہی صادر ہو چکے ہیں اور انسان ان احکامات کی راہیں کھولتا چلا جائے گا خواہ وہ اپنی موجودہ صورتحال پر راضی و خوش اور مغرور کیوں نہ ہو! خداوند عالم انہی چیزوں کے ذریعے شقاوت سے دوچار کرتا ہے جن کو وہ اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے ہیں اور ان کی ان کوششوں کو ناکام کرتا ہے جو وہ اپنے تئیں کامیابی سمجھتے ہیں' اس سلسلہ میں درج ذیل آیات مبارکہ سے موضوع کے دیگر پہلو واضح ہو جاتے ہیں:

سورۂ آل عمران، آیت ۵۴:

○ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۖ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

(اور انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر کیا، اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے)

سورۂ فاطر، آیت ۴۳

○ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ

(اور بری چال اس کے سوا کسی پر نہیں آتی جو اس کا سزاوار ہو)

سورۂ انعام، آیت ۱۲۳:

○ لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(تاکہ وہ اس میں مکر کریں، اور وہ کسی سے مکر نہیں کرتے سوائے اپنے آپ کے، مگر وہ اسے سمجھتے نہیں)

سورۂ اعراف، آیت ۱۸۲، ۱۸۳:

○ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝

(بہت جلد ہم انہیں تباہ کر دیں گے اس طرح سے کہ انہیں خبر ہی نہ ہوگی اور میں انہیں مہلت دیتا ہوں میری چال بہت مضبوط ہے)

بنا برایں مغرور و جاہل شخص اپنے تئیں اس باطل خیال میں اتراتا پھرتا ہے کہ اس نے خدا کے حکم کو پس پشت ڈال دیا ہے اور خدا کی نافرمانی اور اس کے فرمان کی خلاف ورزی کر کے بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا ہے، گویا وہ اپنی اس حرکت پر اپنے اندر بڑائی کا احساس پانے لگتا ہے جبکہ اس بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ عنکبوت، آیت ۴:

○ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

(کیا برے اعمال انجام دینے والے گمان کرتے ہیں کہ وہ ہم پر سبقت لے گئے ہیں، کس قدر برا خیال و فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں)

اس موضوع کی بابت عمدہ ترین آیت یہ ہے

سورۂ رعد، آیت ۴۲:

○ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ

(ہر طرح کا مکر (ترکیب) خدا کے اختیار میں ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی چالیں' احکام خداوندی کی خلاف ورزیاں' مظالم وزیادتیاں کہ وہ دینی فرائض کی بابت جن کے مرتکب ہوتے ہیں' ایسی طرح وہ تمام امور جوان کی زندگی میں رونماوو جود پذیر ہوتے ہیں اوروہ ان امور میں اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں جس سے ان کی باطنی باطل نواز کیفیتیں ظاہر وآشکار ہوتی ہیں وہ سب خدائی ترکیبیں ہیں کہ جو ایک نظام سے وابستہ ہیں جس کے نتیجہ میں خداوند عالم انہیں ان کے انجام کار کی طرف لے جارہا ہے کیونکہ تمام بندوں کا خدا پر یہ حق ہے کہ وہ انہیں ان کے اختیار کردہ انجام کار کی راہ پر لائے ــــ انہیں کسی راہ پر چلنے پر مجبور نہ کرے ــــ 'اور خدا نے ان کا حق ادا کر دیا ہے اور وہ اپنے ہر کام پر قدرت وکامل اختیار رکھتا ہے چنانچہ اس کا ارشاد ہے'

سورۂ یوسف' آیت ۲۱:

O وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ

(اور اللہ اپنے کام پر قدرت وغلبہ رکھتا ہے)

لیکن وہ سب کام جب شیطان کی طرف منسوب ہوں تو ان کو کفر ومعصیت کی اقسام اور شیطان کا بہکاوا کہا جاتا ہے اور ان کاموں کی طرف توجہ ورغبت کرنا شیطانی دعوت گناہ' شیطانی وسوسہ' شیطانی دھوکہ' شیطانی القاء اور شیطان کی طرف سے گمراہی میں مبتلا کرنا کہتے ہیں' اسی طرح وہ امور جو ان شیطانی کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں اور نفسانی خواہشات کے غلبہ کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوتے ہیں وہ سب شیطانی زیب وزینت اور اسی سے تعلق رکھنے والے وسائل وذرائع اور اس کے جال ہیں جن سے وہ بنی نوع آدم کو شکار کرتا ہے' بہرحال اس سلسلہ میں تفصیلی بیان سورۂ اعراف کی تفسیر میں پیش کیا جائے گا۔

اور جہاں تک اس مؤمن کا تعلق ہے جس کے دل میں ایمان راسخ ہو چکا ہو تو اس کی تمام عبادات واطاعتی اعمال اور وہ تمام امور جن کی وجود پذیری اس کے باطنی ایمان کی مظہر ہوتی ہے ان سب کو خدائی توفیق' ولایت وعنایت الٰہی اور خصوصی ہدایت سے تعبیر کیا جاتا ہے' اس سلسلہ کی آیات ملاحظہ ہوں'

سورۂ آل عمران' آیت ۱۳:

O وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ

(اور اللہ اپنی مدد کے ساتھ جسے چاہتا ہے اس کی تائید کرتا ہے)

سورۂ آل عمران' آیت ۶۸:

O وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۸

(اور اللہ مومنوں کا ولی ہے)

سورۂ بقرہ آیت ۲۵۷:

O اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ؕ

(اللہ ولی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے' وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے)

سورۂ یونس' آیت ۹:

O یَہۡدِیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ بِاِیۡمَانِہِمۡ ۚ

(ان کا پروردگار انہیں ان کے ایمان کی ہدایت کرتا ہے)

سورۂ انعام' آیت ۱۲۲:

O اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰہُ وَ جَعَلۡنَا لَہٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ

(آیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے......)

ان تمام امور کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہے' اور اگر یہ سب کچھ فرشتوں کی طرف منسوب ہو تو اسے انہی کی طرف سے مومنین کو حاصل ہونے والی تائید و مدد اور حمایت و عنایت کہا جائے گا' چنانچہ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مجادلہ' آیت ۲۲:

O اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ وَ اَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ؕ

(یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح سے ان کی تائید کی ہے)

اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ جس طرح خدائی عمومی ہدایت ہر چیز کے ہمراہ ہوتی ہے اور ہر شے کے وجود میں آنے سے اس کی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کے ساتھ رہتی ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری و باقی رہتا ہے جب تک وہ اشیاء و موجودات خداوند عالم سے لو لگائے رکھیں اسی طرح اس کے پس منظر میں خدائی تقدیریں کارفرما ہوتی ہیں جو انہیں تخلیق کے اصل مقصد کی طرف لے جانے کا کام کرتی ہیں چنانچہ اس مطلب کا اظہار درج ذیل آیت مبارکہ میں ہوتا ہے'

سورۂ اعلیٰ' آیت ۳:

O وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ

(وہ کہ جس نے تقدیر بنائی پھر ہدایت کی)

کیونکہ وہ تقدیریں جو ہر شے کے وجود کو گھیرے ہوئے علل و اسباب کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں وہی اسے ایک حالت سے دوسری حالت' اور پھر دوسری حالت سے تیسری حالت اور پھر یکے بعد دیگرے مختلف حالتوں میں بدلتی رہتی ہیں۔

اوران کی کارگزاری کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے اور وہ پس منظر میں رہ کر اپنی اثر گزاری کے خدائی نظام سے وابستہ رہتے ہوئے اپنا کام کرتی ہیں۔

اور جس طرح تقدیریں ہر شے کو پیچھے سے اس کی منزل کی طرف دھکیلتی ہیں اسی طرح اجل یعنی موت کہ جو ہر شے کے وجود کی آخری منزل ہے اسے آگے سے کھینچتی ہے' چنانچہ اس مطلب کو درج ذیل آیت مبارکہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے سورۂ احقاف' آیت ۳:

○ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝

(اور ہم نے خلق نہیں کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دو کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور مقررہ مدت تک! مگر جو لوگ کافر ہیں وہ اس چیز سے منہ موڑتے ہیں جس سے انہیں انذار کیا گیا ہے)

اس آیت میں ہر شے کو اس کی انتہاء یعنی اجل (موت) سے وابستہ کئے جانے کو بیان کیا گیا ہے' اور یہ واضح ہے کہ جب دو چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ مرتبط و وابستہ ہوں تو ان میں سے جو چیز دوسری سے قوی ہو وہ کمزور کو اپنی طرف کھینچتی ہے ـــــ جذب کرتی ہے ـــــ' اور اجل (موت) ـــــ مقررہ وقت ـــــ چونکہ ثابت و پائیدار اور ناقابل تبدیلی امور میں سے ہے لہٰذا وہ ہر شے (ذی وجود) کو اس کے سامنے سے اپنی طرف کھینچتی ـــ جذب کرتی ـــــ ہے۔

بنابرایں تمام اشیاء و موجودات ان تین خدائی قوتوں میں گھری ہوئی ہیں' (۱) قوت دافعہ (۲) قوت جاذبہ (۳) قوت مصاحبہ' پہلی قوت پیچھے سے اشیاء کو ان کی منزلِ آخر کی طرف دھکیلتی ہے' دوسری قوت آگے سے انہیں اس منزل کی طرف کھینچتی ہے اور تیسری قوت ان کے ساتھ ساتھ رہ کر ان کی تربیت و رہنمائی کرتی ہے' اور یہی وہ اصل قوتیں ہیں جن کا اثبات قرآن مجید کرتا ہے اور یہ ان قوتوں کے علاوہ ہیں جو حفاظت و نگرانی اور ہمراہ ہونے کا کام انجام دیتی ہیں مثلاً ملائکہ' شیاطین وغیرہ۔

جہاں تک امتحان و آزمائش کا تعلق ہے تو ہم اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ کسی چیز میں بعض تصرفات اس غرض سے کئے جائیں کہ اس چیز کی صلاحیت و عدم صلاحیت معلوم ہو یعنی وہ چیز جس غرض و مقصد کے لئے وجود میں آئی ہے آیا اس کی مطابقت کی حامل ہے یا نہیں؟ اس عمل کو امتحان و آزمائش کہا جاتا ہے' مثلاً آپ کسی چیز کے بارے میں یہ نہ جانتے ہوں کہ آیا وہ فلاں کام کی صلاحیت رکھتی ہے یا نہیں؟ یا آپ اس کی باطنی صلاحیت سے تو آگاہ ہوں مگر اس کا اظہار چاہتے ہوں تو ایسا کام کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ چیز اس مقصد سے موزونیت رکھتی ہے یا نہیں؟ اور آیا وہ اس سے ہمرنگی و ہم آہنگی کو قبول کرتی ہے یا نہیں؟ تو اس طرح کے عمل کو امتحان و آزمائش اور اس کی حالت و صلاحیت وغیرہ سے آگاہی کے حصول کی کوشش کہا جاتا ہے۔

یہی مطلب بعینہٖ خدائی تصرفات واعمال سے مطابقت رکھتا ہے کہ اس نے احکام وشریعتوں وقوانین کی تدوین اور شعور رکھنے والی مخلوق مثلاً انسان کے لئے عملی دستورات صادر کر کے ان کا امتحان لیا ہے کیونکہ انہی امور کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس مقصد کے حصول میں کس قدر کوشاں اور اس کے لئے اپنی قوتیں بروئے کار لانے میں منہمک وسنجیدہ ہے جس کی طرف اسے دینی پیغامات کے ذریعے بلایا گیا ہے' تو یہ سب خدائی امتحان وآزمائشیں ہیں۔ البتہ خدائی امتحان اور ہمارے ہاں رائج امتحان کے درمیان فرق یہ ہے کہ ہم عام طور پر کسی چیز کے باطن سے آگاہی نہ رکھنے کی بناء پر اس سے امتحان لیتے ہیں تا کہ اس کے اندر پوشیدہ حال وکیفیت سے آگاہ ہوسکیں جبکہ یہ بات خداوند عالم کی نسبت قطعی طور پر غلط ونادرست ہے کہ وہ کسی چیز کی باطنی کیفیت وحالت سے ناآگاہ ہو'اس کے پاس تو غیب کی کنجیاں ہیں' لہٰذا اس کا انسان سے امتحان لینا مجہول ونامعلوم امر سے آگاہی حاصل کرنے کی غرض سے ہرگز نہیں بلکہ اس نے اپنے دعوتی وارشادی نظام کے ذریعے انسان کی فکری وعملی تربیت کا جو سامان کیا ہے وہ دراصل اسے سعادت وحسن عاقبت کی طرف لانے کے لئے ہے اور اسی کے ذریعے خدا نے اس کا امتحان لیا ہے کہ آیا وہ اس دعوت نظام خداوندی کی پیروی کرتا ہے یا نہیں؟ یعنی آیا وہ آخرت کے دو ٹھکانوں میں سے کسے انتخاب کر کے استحقاق کو یقینی بناتا ہے کہ وہ جزا وثواب کے ٹھکانہ کا اہل ہے یا سزا وعقاب کے ٹھکانہ کا؟

اسی وجہ سے خداوند عالم نے اپنی طرف سے قائم کردہ تربیتی نظام (شریعتوں ودستورات) اور گوناگوں حوادث و واقعات کے رونما ہونے کو بلاء' ابتلاء' فتنہ (امتحان وآزمائش) سے موسوم کیا ہے چنانچہ اس حوالہ سے عمومی انداز میں اس نے ارشاد فرمایا:

سورۂ کہف' آیت ۷:

- إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝

(ہم نے روئے زمین پر موجود ہر شے کو زمین کے لئے زیب وزینت قرار دیا ہے تا کہ لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے؟

سورۂ دہر' آیت ۲:

- إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝

(ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا کہ اس کا امتحان لیں' تو ہم نے اسے سننے والا' دیکھنے والا بنا دیا)

سورۂ انبیاء' آیت ۳۵:

- وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً

(ہم تمہیں شر اور خیر کے ذریعے آزماتے ہیں)

اس آیت میں مذکور مطلب گویا درج ذیل آیت مبارکہ میں مذکور تفصیلی مطلب کا اجمالی بیان ہے'

سورۂ فجر' آیت ۱۵'۱۶:

○ فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ ؕ‏ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ‌ ﴿۱۶﴾

(مگر انسان کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے تو اسے عزت و آبرو اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی اور آبرومند بنایا' اور جب اسے آزمانے کے لئے اس پر رزق و روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا ہے)

سورۂ تغابن' آیت ۱۵:

○ اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ‌ؕ

(یقیناً تمہارے اموال اور تمہاری اولاد امتحان و آزمائش کے لئے ہیں)

سورۂ محمد' آیت ۴:

○ وَلٰـكِنۡ لِّيَبۡلُوَا۟ بَعۡضَكُمۡ بِبَعۡضٍ‌ ؕ

(لیکن یہ اس لئے ہوا کہ تمہیں ایک دوسرے کے ذریعے آزمائے)

سورۂ اعراف' آیت ۱۶۳:

○ كَذٰلِكَ ‌ۛۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ‏ ﴿۱۶۳﴾

(اسی طرح ہم انہیں ان کی نافرمانیوں کے ذریعے آزماتے ہیں)

سورۂ انفال' آیت ۱۷:

○ وَلِيُبۡلِىَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡهُ بَلَاۤءً حَسَنًا‌ ؕ

(اور تاکہ وہ مومنوں کا امتحان لے' اچھا امتحان و آزمائش)

سورۂ عنکبوت' آیت ۲'۳:

○ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ‏ ﴿۲﴾ وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ فَلَيَـعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡكٰذِبِيۡنَ‏ ﴿۳﴾

(کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ انہیں صرف یہی بات کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ ہو گی' جبکہ ہم نے ان سے پہلے والے لوگوں کی آزمائش کی' یہ اس لئے کہ خدا کو معلوم ہو کہ ان میں سے سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں)۔

امتحان وآزمائش کے حوالہ سے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ بقرہ آیت ۱۲۴:

○ وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ

(اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند کلمات کے ذریعے آزمایا)

حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کے واقعہ میں یوں ارشاد ہوا:

سورہ صافات' آیت ۱۰۶:

○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۰۶﴾

(بے شک یہ وہی کھلی آزمائش ہے)

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں یوں فرمایا:

○ وَفَتَنّٰكَ فُتُوۡنًا

(اور ہم نے تجھے آزمایا جس طرح آزمانے کا حق ہے)

اس موضوع کی بابت دیگر متعدد آیات موجود ہیں۔

ان آیات مبارکہ میں ــــ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے ــــ امتحان وآزمائش کے دائرہ کو وسعت وعمومیت دی گئی ہے کہ جس میں وہ تمام امور داخل ہیں جن کا تعلق انسان کے وجود اور وجود کے اجزاء مثلاً قوت سماعت' قوت بصارت اور اصل زندگی' اور اس کے وجود سے باہر اس سے مربوط چیزیں مثلاً اولاد' ازواج' خاندان وقبیلہ' دوست احباب' مال' جاہ و مقام اور وہ تمام چیزیں جن سے انسان اپنی زندگی میں کسی طرح سے بھی استفادہ کرتا ہے اسی طرح ان چیزوں کے مقابل امور مثلاً اپنوں اور قریبیوں کی اموات اور اس طرح کے دیگر مصائب وآلام وغیرہ' تو مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں عالم ہستی کی ہر وہ چیز جس کا تعلق انسان سے ہے بلکہ ہر شے کی مختلف وگوناگوں صورتیں وحالتیں وغیرہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی آزمائش وامتحان کے لئے ہے۔

اس کے علاوہ آیات مبارکہ میں امتحان وآزمائش کے حوالہ سے افراد کی بابت بھی عمومیت پائی جاتی ہے لہٰذا تمام افراد بشر اس میں شامل ہیں خواہ مومن ہوں یا کافر' نیک ہوں یا برے اور انبیاء ہوں یا ان کے علاوہ! سب کے سب خدائی امتحان وآزمائش کے مقررہ نظام میں شامل ہیں اور کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں۔

تو یہ واضح ہوا کہ امتحان وآزمائش خدائی سنت ونظام ہے جو ہمیشہ سے جاری وساری ہے اور یہ عملی نظام ایک دوسرے نظام سے وابستہ ہے جس کا تعلق تکوین وتخلیق سے ہے کہ جو خدائی عمومی ہدایت کا وہ نظام ہے جس کا تعلق مکلفین یعنی

ان افراد سے ہے جن پر خداوند عالم کی طرف سے عملی فرائض وذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں مثلاً انسان اور اسی میں وہ امور بھی شامل ہیں جو اس تکوینی ہدایت سے مقدم وموخر ہیں یعنی تقدیر اور اجل (مقررہ وقت، موت) کہ اس حوالہ سے مربوطہ مطالب پہلے ذکر ہو چکے ہیں۔

ان مطالب سے یہ حقیقت بھی ظاہر وواضح ہوتی ہے کہ امتحان وآزمائش کا نظام نا قابل تنسیخ ہے کیونکہ اس کا منسوخ ہونا سلسلہ تکوین کی بنیاد ہی کے خاتمہ کا دوسرا نام ہے جو کہ محال ونا ممکن ہے، چنانچہ اس مطلب کا ثبوت ان آیات مبارکہ سے بخوبی ملتا ہے جو خلقت کی بنیاد حق پر اور بعثت کی بنیاد حق پر ہونے کو ثابت کرتی ہیں مثلاً

سورۂ احقاف، آیت ۳:

○ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى

(ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دو کے درمیان ہے ان سب کو نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ اور معین ومقررہ مدت تک کے لئے)

سورۂ مومنون، آیت ۱۱۵:

○ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

(تو کیا تم نے گمان کر لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار وبے مقصد پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے)

سورۂ دخان، آیت ۳۹:

○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

(اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دو کے درمیان ہے کھیل کود کے طور پر پیدا نہیں کیا، ہم نے انہیں پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ لیکن اکثر لوگ آگاہی نہیں رکھتے)

سورۂ عنکبوت، آیت ۵:

○ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ

(جو شخص خدا سے ملاقات کا امیدوار ہو تو اللہ کا مقرر شدہ وقت آنے ہی والا ہے)

مذکورہ بالا آیات مبارکہ اور ان جیسی دیگر متعدد آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات بالخصوص انسان کی تخلیق برحق ہے اور اسے غرض ومقصد کے بغیر ہرگز خلق نہیں کیا گیا، تو جب تمام موجودات کے لئے ان کے سامنے سے ان کے حق، اغراض ومقاصد اور مقررہ حق اوقات (موت) اور ان کے پیچھے سے حق تقدیریں اور ان کے ساتھ ساتھ حق ہدایتیں ہوں تو ان کے درمیان عمومی طور پر تصادم وٹکراؤ ناگزیر ہے اور ان میں سے خاص طور پر مکلف موجودات مثلاً انسان کا ایسے امور کے

ذریعے امتحان وابتلاء یقینی ہے کہ ان امور کی وجہ سے ان کی وجودی قوتیں اپنی کارآرائی کی جانب بڑھتی ہیں خواہ وہ کمال کا مظہر ہو یا نقص کا' سعادت کا مظہر ہو یا شقاوت کا' اسی مطلب کو انسان کے لئے دینی فرائض وذمہ داریوں کا حامل قرار دیئے جانے کے لئے حوالہ سے امتحان وابتلاء کہا جاتا ہے' (اس مطلب کے سمجھنے میں مزید توجہ فرمائیں)

مذکورہ بالا مطالب سے محق اور تمحیص کا معنی بھی واضح ہوجاتا ہے کیونکہ جب کوئی مومن امتحان وابتلاء کا شکار ہوتا ہے تو اس سے اس کے وجود میں پائی جانے والی فضیلتوں اور اچھی صفات کا رزیلتوں اور بری صفات سے الگ ہونا یقینی ہوجاتا ہے' یا جب کوئی قوم وگروہ امتحان سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت ان میں سے مومن ومنافق بیمار دل افراد کی پہچان واضح ہوجاتی ہے' اسی مقام پر لفظ تمحیص صادق آتا ہے کہ جس سے مراد تمیز والگ الگ ہونا اور مشخص صورت میں پہچانا جانا ہے' اور اسی طرح جب کافر ومنافق پر خدائی امتحانات وآزمائشوں کی بارش ہو اور وہ پے درپے ان کا شکار ہو جبکہ ان (کافر ومنافق) میں ظاہری طور پر اچھی وپسندیدہ صفات پائی جاتی ہوں کہ مومنین بھی ان سے رشک کریں تو ان امتحانوں کے نتیجہ میں ان (کافر ومنافق) کے باطن میں پوشیدہ خباثتیں تدریجاً ظاہر ہونا شروع ہوجاتی ہیں ور جونہی ان کی کوئی باطنی خباثت وپلیدی ظاہر ہوتی ہے تو ان کی ظاہری فضیلت وپسندیدہ صفت زائل ہوجاتی ہے اسی کو محق کہتے ہیں یعنی تدریجی طور پر اچھائیوں کا مٹنا وختم ہونا! چنانچہ اس حوالہ سے خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

سورۂ آل عمران' آیت ۱۴۰' ۱۴۱:

○ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۴۱﴾

(اور یہ ایام' ہم انہیں لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں اور یہ اس لئے ہے کہ خدا ایمان لانے والوں کو جان لے اور تم میں سے گواہ بنائے اور اللہ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا' اور یہ کہ اللہ آزمائے ایمان لانے والوں کو اور کافروں کو نیست ونابود کرے)

البتہ کافروں کی نابودی کی دوسری صورت بھی ہے اور وہ یہ کہ تدریجی طور پر ان کی نسل کا خاتمہ ہونا ہے کیونکہ خداوند عالم نے اس حوالہ سے آگاہ کردیا ہے کہ جہان ہستی نوع بشر کی بہتری اور دین کے صرف خدا سے مخصوص ہونے کی طرف رواں دواں ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ طٰہٰ آیت ۱۳۲:

○ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿۱۳۲﴾

(اور انجام کار آخر کار تقویٰ کی برتری ہے)

یعنی آخر کار تقویٰ والے ہی کامیاب ہوں گے۔

سورۂ انبیاء' آیت ۱۰۵

○ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝

(بے شک میرے نیک وصالح بندے ہی زمین کے وارث ہوں گے)

خدائی پیش گوئی اور تاریخی حقیقت

○ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ .....

(اور محمد نہیں مگر رسول' ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں.....)

آیت میں ارشاد ہوا: اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ

موت سے مراد روح کا بدن سے نکلنا اور جسمانی زندگی کا ختم ہو جانا ہے (یعنی موت)۔

اور قتل اس موت کو کہتے ہیں جس کا سبب کوئی عمدی یا مشابہ عمدی عمل وغیرہ ہو۔

ان دو لفظوں یعنی موت اور قتل کے استعمالی موارد کے حوالہ سے ان کے معنوں میں فرق پیدا ہوتا ہے اور وہ یوں کہ جب یہ دو لفظ الگ الگ استعمال ہوں تو لفظ موت دونوں معنوں کا حامل ہوگا یعنی اس میں موت یعنی مرنا اور قتل یعنی مارا جانا' دونوں معنے پائے جائیں گے اور اگر کسی کلام میں دونوں لفظ یکجا استعمال ہوں جیسا کہ ہماری اس زیر نظر آیت مبارکہ میں ہے تو اس وقت لفظ موت کا معنی خدائی مقرر شدہ وقت (اجل) سے مرنا ہوگا اور قتل کا معنی اس کے برعکس ہوگا یعنی مارا جانا!

آیت میں ارشاد ہوا: اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ (تم اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے)

لفظ انقلاب کے بارے میں مشہور لغت دان راغب نے لکھا ہے کہ اس کا معنی الٹے پاؤں پلٹنا ہے اور اِنْقَلَبَ عَلٰی عَقِبَیْه کا معنی یوں کیا جاتا ہے: رَجَعَ عَلٰی عَقِبَیْه' یعنی وہ اپنے الٹے پاؤں پلٹ گیا' اور رَجَعَ عَلٰی عَقِبَیْه اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص واپس پلٹنے کی جانب ہو جائے' اور جملہ اِنْقَلَبَ عَلٰی عَقِبَیْه اسی طرح ہے جیسے جملہ رَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِهٖ جس کا معنی یہ ہے' وہ اپنے پاؤں پر پلٹ گیا' واپس ہو گیا' یا جیسے کہا جاتا ہے اِرْتَدَّا عَلٰی آثَارِهِمَا قَصَصاً اور رجع کا معنی واپس چلے جانا ہے یعنی اپنی پہلی جگہ یا پہلی حالت پر پلٹ جانا کو رجوع کہتے ہیں ـــــ یہاں تک راغب اصفہانی کا بیان تمام ہوا ـــــ'

اور زیر نظر آیت مبارکہ میں چونکہ لوگوں کے واپس پلٹ جانے اور اپنے الٹے پاؤں پھر جانے کو انقلاب علی الاعقاب (پچھلے پاؤں پلٹ جانا) (انقلبتم علی اعقابکم) سے تعبیر کر کے اسے رسولؐ خدا کی موت یا ان کے قتل

سے مربوط اور اس پر موقوف قرار دیا گیا ہے۔ گویا ادبی لحاظ سے آنحضرتؐ کی موت شرط اور لوگوں کا واپس پلٹ جانا اس کی جزا (نتیجہ) کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا واپس پلٹ جانے سے جنگ وقتال سے روگردانی کرنا نہیں بلکہ اصل دین سے منہ موڑنا ہے کیونکہ میدان جنگ سے بھاگنے کا رسول خداؐ کی موت یا قتل سے کوئی ربط ہی نہیں بنتا بلکہ آنحضرتؐ کی موت یا قتل کیا جانا لوگوں کے ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے ہی سے ربط وموزونیت رکھتا ہے' لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے دین سے منہ موڑنا اور اسے چھوڑ کر واپس کفر کی طرف پلٹ جانا مراد ہے۔

چنانچہ اس کا ثبوت بعد والی آیات میں ان الفاظ سے ملتا ہے جن میں خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا: وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ .... (انہوں نے اپنے تئیں کوششیں کیں' وہ خدا کے بارے میں ناحق گمان کرتے ہیں جاہلیت والا گمان!) ــــ یہ ہدایت انہی لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے ماضی میں رسول خداؐ کو چھوڑ کر ان سے روگردانی کی کوشش اور اقدام کیا' خدا نے ان کے بارے میں فرمایا کہ اگر محمدؐ اپنی طبعی موت سے دنیا سے جائیں یا انہیں قتل کر دیا جائے تو یہ لوگ خدا کے دین سے منہ موڑ لیں گے ــــ' اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ جنگ احد میں بھی فرار کر گئے تھے چنانچہ جنگ حنین' جنگ خیبر اور دیگر جنگوں میں بھی انہوں نے اسی طرح کی حرکتیں کیں لیکن اس کے باوجود زیر بحث آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے ان کے بارے میں جو الفاظ استعمال کیے وہ اس سے پہلے کسی موقع پر استعمال نہیں کیے مثلاً:

سورۂ توبہ' آیت ۲۵:

○ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

(اور حنین کے دن' جب تمہیں تمہاری کثرت نے مغرور کر دیا مگر تمہاری کثرت تمہیں خدا سے ہرگز بے نیاز نہ کر سکی' اور زمین اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی' پھر تم پیٹھ کر کے بھاگ گئے)

اس آیت اور دیگر مربوطہ آیات کے تناظر میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہاں زیر نظر آیت مبارکہ میں انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ سے مراد سابق کفر کی طرف پلٹ جانا مراد ہے۔

بہر حال زیر بحث آیت مبارکہ میں عتاب وسرزنش اور مذمت کے سیاق وطرز سخن کے تناظر میں اس کا خلاصہ معنی یہ ہے کہ محمدؐ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے دیگر رسولوں کی طرح ایک رسول ہیں اور ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے پیغامات لوگوں تک پہنچائیں' انہیں اس حوالہ سے خود کوئی اختیار حاصل نہیں بلکہ دینا کا سارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور دین صرف خدا کا ہے اور جب تک خدا ہے اس کا دین بھی باقی ہے اور ایسا نہیں کہ اگر آنحضرتؐ رحلت کریں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم دین ہی چھوڑ دو اور پچھلے پاؤں اپنے پہلے عقیدہ کی طرف پلٹ جاؤ اور ہدایت کے بعد گمراہی کا راستہ اختیار کر لو!

مذکورہ بالا سیاق وطرزِ بیان اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ جنگ اُحد کے دن عین اس وقت جب میدان کارزار

گرم تھا اور لڑائی اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی تو مسلمانوں نے قوی گمان کر لیا کہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیا گیا ہے لہٰذا وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے جنگ سے روگردانی کر لی، چنانچہ اس کا ثبوت مربوطہ روایات اور مصدقہ آیات حقائق سے ملتا ہے جیسا کہ ابن ہشام نے اپنی کتاب سیرت النبی ﷺ میں لکھا ہے کہ انس بن نضر (انس بن مالک کے چچا) نے صحابہ کرام میں عمر بن خطاب، طلحہ بن عبیدہ اور چند مہاجرین وانصار کے پاس آ کر ان سے پوچھا کہ تم کیوں رک گئے ہو اور میدان جنگ سے پیچھے ہٹ گئے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ تو مارے گئے ہیں، ان کا جواب سن کر انس نے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ قتل ہو گئے ہیں تو تم لوگ ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ بہتر ہے کہ جس راہ میں رسول اللہ ﷺ نے جان دی ہے کہ تم بھی اسی راہ میں اپنی جانیں قربان کر دو اور قتل ہو جاؤ، انس یہ کہہ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور تابڑ توڑ حملے کرنے لگے اور بالآخر درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے (ملاحظہ ہو کتاب سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۳۰)

خلاصہ کلام یہ کہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کی بزدلانہ روش سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اس لئے ان کی مذمت کی اور انہیں موردِ عتاب کو سرزنش قرار دیا کہ ان کا ایمان حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی ہی تک محدود تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں وہ مؤمن رہیں گے اور آنحضرت ﷺ کی رحلت کے ساتھ ہی وہ ایمان کو چھوڑ دیں گے اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کا ایمان لانا صرف دنیاوی منافع و مفادات کے لئے تھا تا کہ دنیاوی زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہو سکیں اور انہیں آخرت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسی بناء پر خداوند عالم نے ان کی سرزنش کی اور انہیں مورِ عتاب قرار دیا چنانچہ اس کا تائیدی ثبوت اس جملہ سے ملتا ہے وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ (اور خدا بہت جلد شکر گزاروں کو جزا عطا کرے گا) کیونکہ خداوند عالم نے یہی الفاظ بعد والی آیت (۱۴۵) میں دوبارہ ان لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا جو اخروی زندگی کی نعمتوں کے حصول کے متمنی و اس کے لئے کوشاں ہیں چنانچہ ارشاد ہوا: وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ــــــ اور بہت جلد ہم شکر گزاروں کو جزاء عطا کریں گے ــــــ ' یہ الفاظ جملہ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ' (اور جو شخص دنیا کا ثواب وجزاء چاہے اسے اسی میں سے دیں گے اور جو شخص آخرت کا ثواب و اجر چاہے تو ہم اسے اسی سے دیں گے) کے بعد ارشاد فرمائے۔ (مزید غور کریں)

اور جملہ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ (اور اللہ شکر گزاروں کو بہت جلد جزا دے گا) اپنے ماقبل جملوں اور ان کے سیاق وطرز بیان کے حوالہ سے ایک طرح کی استثنائی صورت کا حامل ہے اور یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان لوگوں میں ایسے افراد بھی تھے جن سے اپنے سابقہ عقیدہ کی طرف واپس چلے جانے کے کوئی آثار و نشانیاں ظاہر نہ ہوئی تھیں یا انہوں نے کوئی ایسا کام نہ کیا تھا جس سے ان کے روگرداں ہونے کا عندیہ و اشارہ مل سکے تو وہی ہیں شکر گزار اور انہی کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ وہ عنقریب انہیں جزا عطا کرے گا۔

جہاں تک شکر کی حقیقت کا تعلق ہے تو وہ عبارت ہے نعمت کے عملی اظہار سے، جس طرح پر کفر جو کہ اس کے مقابل میں ہے اس کا معنی نعمت کو چھپانا اور اس پر پردہ ڈالنا ہے____ اسے کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے____ 'اور نعمت کے اظہار سے مراد اس کا برمحل استعمال کرنا ہے یعنی اسے اسی مقام میں استعمال میں لایا جائے جس کا ارادہ منعم یعنی نعمت عطا کرنے والے نے کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زبان سے منعم کو یاد کرنا اور دل میں اسے یاد رکھنا بھی شامل ہے۔ اس بناء پر خداوند عالم کی عطا کردہ نعمتوں میں سے کسی نعمت کا شکر ادا کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب بھی اس نعمت سے استفادہ کیا جائے تو خداوند عالم کو یاد کیا جائے' قلب وزبان سے اس کا ذکر کیا جائے' اور نعمت کو اسی مقام پر رکھا جائے جس کا ارادہ خدائے قدوس نے فرمایا ہے یعنی اس مقام سے تعدی وتجاوز نہ کیا جائے' ویسے بھی دنیا میں کون سی ایسی نعمت ہے جس کا سرچشمہ ذات پروردگار نہ ہو' ہر شے خدا کی عطا کردہ نعمت ہے جس سے اس نے اپنے بندوں کو نوازا ہے۔ اور اسے اپنی عطا کردہ نعمتوں کی بابت اس کے علاوہ کچھ مقصود نہیں کہ انہیں ان کے صحیح موارد میں استعمال کیا جائے اور ان کے ذریعے اس کی بندگی کا حق ادا کیا جائے' ملاحظہ ہو:

سورۂ ابراہیم' آیت ۳۴:

○ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

(اور اس نے تمہیں وہ سب کچھ عطا کیا جو تم نے اس سے مانگا' اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو تم انہیں شمار نہیں کر سکتے' بے شک انسان بڑا ظالم' ناشکرا ہے)

لہٰذا خدا کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان نعمتوں میں اس کی اطاعت وفرماں برداری کی جائے اور ان سے استفادہ کرتے وقت اس کے مقام ربوبیت کو یاد رکھا جائے۔

بنابریں خداوند عالم کا مطلق اور ہر طرح کی قید وشرط سے خالی شکر ادا کرنا یہی ہے کہ ہمیشہ اسے یاد رکھا جائے اور کسی بھی مرحلہ میں اسے نہ بھلایا جائے اور ہر حال میں اس کی اطاعت وفرماں برداری کا عملی دم بھرا جائے اور اس کی معصیت ہرگز نہ کی جائے' اور درج ذیل آیت مبارکہ کا مطلب بھی یہی ہے'

سورۂ بقرہ' آیت ۱۵۲:

○ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

(اور تم میرا شکر ادا کرو' میری نعمتوں کا کفران نہ کرو)

اس سے مراد یہ ہے کہ تم مجھے ہمیشہ اور ہر حال میں یاد رکھو' مجھے کبھی اور ہرگز نہ بھلاؤ' میرے فرامین کی اطاعت کرو اور کسی بھی حوالہ سے نافرمانی کا ارتکاب نہ کرو'

بہر حال ہرگز وہ خیال دل میں نہ لایا جائے جو بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ اس میں ایسے کام کا حکم دیا گیا ہے جس پر عمل کرنا مقدور نہیں (اسے تکلیف مالا یطاق کہا جاتا ہے جو کہ باطل و نادرست ہے کیونکہ یہ بات خداوند عالم کی نسبت ہرگز قابل تصور نہیں کہ وہ اپنے بندوں کو اس کام کا حکم دے جو وہ انجام دے ہی نہ سکتے ہوں)۔ اس طرح کا خیال و نظریہ دینی و قرآنی حقائق میں غور و فکر کی کمی کا نتیجہ اور خدائے قدوس کی ذات والا صفات کی عظمت و بزرگی سے کوسوں دور ہے۔

قارئین کرام! آپ اسی کتاب میں سابقہ ذکر کئے گئے مطالب کے تناظر میں اس حقیقت سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں کہ علمی اصطلاح میں فعل اور صفت میں فرق ہے، فعل صرف اس کام کو کہتے ہیں جو کسی سے سرزد ہو یعنی اس میں انجام دینے کا حوالہ پایا جانا ضروری ہے جبکہ صفت میں انجام دینے کے حوالہ کے ساتھ ساتھ اس کے اس شخص میں موجود و باقی ہونے کا حوالہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ صفتی معنی اس شخص کی نسبت ایک راسخ صفت کی صورت اختیار کر چکا ہو کہ اس سے جدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ درج ذیل الفاظ میں واضح فرق پایا جاتا ہے:

(۱) الذین اشرکوا (وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا ــــ فعل ــــ

اور

المشرکین (شرک کرنے والے) ــــ صفت ــــ

(۲) الذین صبروا (وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا) ــــ فعل ــــ

اور

الصابرین (صبر کرنے والے) ــــ صفت ــــ

(۳) الذین ظلموا (وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ــــ فعل ــــ

اور

الظالمین (ظلم کرنے والے) ــــ صفت ــــ

(۴) الذین یعتدون (وہ لوگ جو زیادتی کرتے ہیں ــــ فعل ــــ

اور

المعتدون (زیادتی کرنے والے) ــــ صفت ــــ

ان الفاظ میں فعل و صفت کے درمیان فرق واضح ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ شرک کے مرتکب کو اس کا فعل جبکہ بار بار اور ہمیشہ شرک کرنے والے کو مشرک کہا جاتا ہے اسی طرح شکر کرنے والا (شاکر) اسے کہتے ہیں جس کے اندر شکر کرنے کی صفت راسخ ہو جائے اور یہ عمدہ فضیلت اس میں ہمیشہ موجود و باقی ہو اور یہ مطلب واضح ہو چکا ہے کہ مطلق اور ہر طرح کی قید و

شرط سے ماوراء شکر سے مراد یہ ہے کہ بندہ کسی بھی چیز یعنی نعمت کا ذکر و تذکرہ کرے تو اس کے ساتھ خداوند عالم کا ذکر و تذکرہ لازمی کرے' ایسا ممکن نہیں کہ نعمت کو تو یاد کرے مگر نعمت عطا کرنے والے خدائے قدوس کو یاد نہ کرے' اور نعمت سے استفادہ کرے مگر اس کے عطا کرنے والی ذات باری تعالیٰ کی فرمانبرداری کا فریضہ بھول جائے! بلکہ ضروری ہے کہ ہر نعمت سے بہرہ مند ہوتے ہوئے اس کے منعم یعنی خدائے کریم کو یاد کرتے ہوئے اس کی اطاعت کا عملی ثبوت دے۔

ان مطالب سے یہ بھی واضح ہوا کہ ادائے شکر کا فریضہ علمی و عملی طور پر خداوند عالم سے اخلاص قائم کئے بغیر ممکن ہی نہیں' یعنی ہر چیز کو خدا کی عطا کردہ نعمت قرار دیتے ہوئے اس سے استفادہ میں صرف اس کی فرمانبرداری کا عملی دم بھرا جائے' لہٰذا شکر کرنے والے (شاکرون) ہی خدا سے اخلاص رکھنے والے (مخلصون) ہیں' اور وہ ہیں کہ شیطان ان کے بارے میں کوئی طمع نہیں کرتا ___ بلکہ ان پر تسلط و غلبہ پانے سے مایوس ہے ___ 'اس حقیقت کا اظہار درج ذیل آیتوں سے ہوتا ہے جن میں خداوند عالم نے ابلیس کی بات کا حوالہ دیا کہ اس نے یوں کہا:

سورۂ ص' آیت ۸۲' ۸۳:

○ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۸۲﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۸۳﴾

(اس نے کہا کہ مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکاؤں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے!)

سورۂ حجر' آیت ۳۹' ۴۰:

○ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۳۹﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿۴۰﴾

(اس نے کہا کہ جو تو نے مجھے دھوکہ دیا ہے تو میں ان کے سامنے زمین میں موجود ہر شے کو زینت بنا کر پیش کروں گا اور ان سب کو بہکاؤں گا سوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کو!)

شیطان نے اپنی طرف بہکانے و گمراہ کرنے کے عمل سے صرف انہی افراد کو مستثنیٰ کیا جو مخلص ہیں اور خدا نے بھی اس کے بیان کی تصدیق کردی چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ اعراف' آیت ۱۶' ۱۷:

○ قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ﴿۱۷﴾

○ (اس نے کہا کہ جو تو نے مجھے بہکایا ہے تو میں ضرور تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھ جاؤں گا' پھر میں تیرے بندوں کے سامنے' ان کے پیچھے اور ان کے دائیں و بائیں سے ان کے پاس آؤں گا' اور تو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہ پائے گا)

اس آیت میں جملہ لا تجد بمنزلہ استثناء ہے کہ جو سابق الذکر آیت (حجر ۴۰) میں الا عبادك کی مانند ہے' اور

سابقہ آیت میں لفظ مخلصین ذکر ہوا تھا مگر یہاں اس کی جگہ لفظ شاکرین ذکر ہوا ہے اور یہ صرف اس لئے ہے کہ شاکرین ہی مخلصین ہیں کہ جن پر تسلط وغلبہ پانے کے بارے میں شیطان کو کوئی طمع وامید نہیں اور نہ ہی اسے ان سے کوئی کام ہے۔ بلکہ اس کی ان تک رسائی ہی نہیں کیونکہ اس کا کام اور اس کی چالیں صرف اس غرض ومقصد کے حصول کے لئے ہیں کہ وہ لوگوں کے دلوں وذہنوں سے خداوندعالم کے مقام ربوبیت کو بھلا دے اور انہیں خدا کی معصیت ونافرمانی کی دعوت دے ـــــ جبکہ مخلصین وشاکرین کا مقام ومرتبہ اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ انہیں اپنا شکار کرلے ـــــ' چنانچہ اس مطلب کی تائید وتصدیق جنگ احد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات مبارکہ سے بخوبی ہوتی ہے کہ جن میں اس طرح ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورۂ آل عمران' آیت ۱۵۵:

○ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

(بے شک تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے اس دن روگردانی کی جب دونوں گروہ (سپاہ اسلام اور سپاہ کفر) آمنے سامنے آگئے تھے انہیں شیطان نے پھسلایا اور یہ ان کے بعض ان اعمال کی وجہ سے ہوا جن کا انہوں نے ارتکاب کیا تھا' البتہ خدا نے ان سے درگزر کرلیا اور اللہ تو ہے ہی بڑا معاف کرنے والا نہایت بردبار!)

اس آیت کی تفسیر عنقریب بیان ہوگی اور اسے زیر نظر آیت مبارکہ کے جملہ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ اور بعد والی آیت کے جملہ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ کے تناظر میں دیکھیں تو مذکورہ بالا مطلب کی تائید ملتی ہے اور آپ اس سے آگاہ ہوچکے ہیں کہ یہ بمنزلہ استثناء ہے'

قارئین گرامی قدر! آپ ان مطالب میں بخوبی غور کریں اور پھر خود فیصلہ کریں کہ اس آیت مبارکہ کے جملہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ..... کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کس قدر بے بنیاد وبے ربط ہے تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی' اس کی بابت بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ آیت اس واقعہ کی طرف اشارہ کررہی ہے جو جنگ احد کے دن پیش آیا اور وہ یہ کہ عین لڑائی کے دوران شیطان نے آواز دی الا قد قتل محمد (لوگو! محمد کو قتل کردیا گیا) اس آواز نے مومنین کے دلوں میں خوف اور سستی پیدا کردی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپ ملاحظہ کریں کہ کسی کی علمی سطح اس قدر گر جائے کہ کتاب الٰہی کی عظمتوں' بلند حقائق اور عالی ترین معارف کو اس قدر نیچا دکھائے کہ کہاں کی بات کہاں تک لے جائے' اس قائل کے اظہارات کجا اور قرآنی الفاظ کی عظیم حقیقت کجا؟

بہرحال زیر نظر آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ احد کے دن کچھ افراد ایسے بھی تھے جو نہ تو سستی وکمزوری اور بزدلی کا شکار ہوئے اور نہ ہی خدا کی راہ میں پیش قدمی سے روگرداں ہوئے تو اللہ نے انہیں شاکرین سے موسوم فرمایا اور

تصدیق کی کہ ان کے بارے میں شیطان مایوس ہوا اور انہیں راہ حق وحقیقت سے گمراہ نہ کرسکا اور نہ ہی کرسکتا ہے کیونکہ وہ اپنے ایمان میں اس قدر پختہ ہیں کہ ان کے قدم ہرگز ڈگمگا نہیں سکتے۔ اور یہ مطلب بھی قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ لفظ شاکرین قرآن مجید میں کسی کی صفت کے طور پر ان دو آیتوں کے علاوہ کسی مقام پر ذکر نہیں ہوا:

(۱) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْــًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

(۲) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

ان دونوں موارد میں شاکرین کی جزا کے بارے میں کوئی ذکر و اشارہ نہیں ہوا اور وہ صرف اس لئے کہ ان کی جزا کے عظیم ونفیس ہونے کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

○ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ

(کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ مرے مگر اللہ کے اذن کے ساتھ، وقت لکھ دیا گیا ہے)

یہ آیت ان لوگوں کے غلط افکار کی طرف متوجہ کررہی ہے جو اپنے ان مسلمان بھائیوں کے بارے میں جو میدان جنگ میں مارے جاتے تھے اس طرح کہتے تھے کہ اگر وہ میدان کو نہ جاتے تو ہرگز نہ مارے جاتے، ان کی اس بات کا تذکرہ اسی سورہٴ مبارکہ کی آیت ۱۵۶ میں اس طرح ہوا:

○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِى الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ ....

(اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اپنے ان بھائیوں کے بارے میں جو سفر میں یا جنگ کے لئے گئے یوں کہا کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے......)

اسی طرح ان لوگوں کے بیجا و نادرست اظہارات کی طرف اشارہ بھی ہے جن کے بارے میں آیت ۱۵۴ میں یوں تذکرہ ہوا کہ انہوں نے کہا:

○ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَىْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ

(اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے.......)

اس حوالہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

وَمَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡیَا نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا ۚ وَمَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الۡاٰخِرَۃِ نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا ؕ (اور جو شخص دنیا کا اجر چاہے تو ہم اسے اس میں سے عطا کریں گے اور جو شخص آخرت کا اجر چاہے تو ہم اسے اس میں سے دیں گے) اس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا ۚ (اس میں سے دیں گے) یہ نہیں فرمایا: نؤتہا (وہ اسے دیں گے)' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ انسان کا ارادہ ہمیشہ اپنے تمام اسباب سے کامل طور پر مطابقت کا حامل ہو کہ جس کی وجہ سے اس کی چاہت و مراد پورے طور پر اسے حاصل ہو جائے' تو اس کے ارادہ کا تمام اسباب سے مطابقت کا حامل نہ ہونا ہی اس کا باعث ہوا کہ اس کا مطلوب و مراد پورے طور پر اسے نہ مل سکے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر اپنے تمام اسباب کی دستیابی سے بہرہ ورنہ ہو تو بعض اسباب کی دستیابی سے بھی بہرہ ورنہ ہو سکے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر تمام اسباب میسر آجائیں تو اپنا مطلوب پورے طور پر حاصل کرلے گا اور اگر بعض اسباب میسر ہوں تو انہی کے مطابق اپنے مطلوب و مراد سے کچھ حاصل کر پائے گا' جیسا کہ اس حوالہ سے اس نے یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ اسرائیل' آیت ۱۹:

○ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَہَا سَعۡیَہَا وَہُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعۡیُہُمۡ مَّشۡکُوۡرًا ﴿۱۹﴾

(جو شخص اسی زوال پذیر دنیا کا خواہشمند ہو تو ہم اسی دنیا میں جسے چاہیں اور جتنا چاہیں جلد دیتے ہیں اور پھر اس کے لئے دوزخ مقرر کرتے ہیں کہ جس میں ذلت و خواری کا شکار ہو کر جلے گا' اور جو شخص آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے حصول کی بھرپور کوشش بھی کرے اور وہ مومن ہو تو ایسے لوگوں کی کوششیں نتیجہ بخش ثابت ہوں گی)

سورۂ نجم' آیت ۳۹:

○ وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾

(اور انسان کے لئے کچھ نہیں سوائے اس کی کوشش کے)

پھر آیت کے آخر میں خداوند عالم نے شاکرین کو ان دونوں گروہوں سے الگ کر کے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَسَنَجۡزِی الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۵﴾ (اور ہم شاکرین کو جزا عطا کریں گے) اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاکرین خدا کی رضا کے حصول کے سوا کچھ نہیں چاہتے' ان کا مطلوب و مراد صرف اور صرف رضائے الٰہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں' انہیں دنیا و آخرت کی فکر لاحق نہیں یعنی انہوں نے اپنے آپ کو دنیا یا آخرت کے لئے مصروف نہیں کیا یا یہ کہ انہیں دنیا یا آخرت سے کوئی سروکار نہیں' وہ تو صرف اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں' یہی ان کا مطلوب و مراد اور حقیقی ہدف ہے۔ چنانچہ اس حوالہ سے مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

موعظہ وتشویق

○ وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ ....

(اور کتنے نبی گزرے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر کثیر خدا والوں نے قتال کیا)

لفظ کَأَیِّن عددی کثرت کے لئے استعمال ہوتا ہے'

لفظ مِّن یہاں بیان کے لئے ہے'

لفظ ''رِبِّيُّونَ'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ربی ہے' اور ربانی کا ہم معنی ہے یعنی وہ شخص جو اپنے آپ کو رب العالمین سے مختص کرلے کہ غیر اللہ سے کوئی سروکار نہ رکھے بلکہ ہر حال میں قولاً و فعلاً اپنے پروردگار سے وابستہ رہے' بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس لفظ میں کثرت ملحوظ ہے اور ربیون سے مراد ہزاروں اور ربی سے مراد ایک ہزار ہے۔

جملہ استکانوا میں استکانت جو کہ اس کا مصدر ہے اس کا معنی کمزور پڑنا و بزدل ہونا ہے۔

بہر حال اس آیت مبارکہ میں عتاب و سرزنش سے آمیختہ موعظہ و نصیحت اور مومنین کے لئے تشویق و ترغیب ہے کہ وہ ان خدا والوں کی اقتداء کریں تاکہ خدا انہیں دنیا و آخرت میں اجر و ثواب سے نوازے جس طرح اس نے ربیون کو نوازا' اور انہیں بھی دوست رکھے جس طرح اس نے ربیون کو ان کی نیکیوں کی بناء پر دوست رکھا' اسی وجہ سے خداوند عالم نے مومنین کو ان لوگوں کے اقوال و افعال سے آگاہ کیا تاکہ وہ ان سب کو مدنظر و ملحوظِ خاطر قرار دے کر درسِ عبرت حاصل کریں تاکہ ان کے اس انجام کار کی طرح کے انجام کار کا شکار نہ ہوں جس سے وہ احد کے دن اپنے ان افعال و اقوال کے نتیجہ میں مبتلا ہوئے تھے جو خدا کو ناپسند ہیں' اور تاکہ خدا مومنین کو دنیا و آخرت دونوں جہانوں کا اجر و ثواب عطا کرے جس طرح اس نے ان ربیون کے لئے دونوں جہانوں کا اجر و ثواب اکٹھا ہی کر دیا' اور خدا نے آخرت کے ثواب کو حسن سے متصف کیا جبکہ دنیا کے ثواب کو نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُخروی اجر و ثواب کی عظمت و رفعت اور بلندئ مرتبہ کا اشاراتی تذکرہ مقصود تھا۔

آیات ۱۴۹ تا ۱۵۵

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿١٤٩﴾

○ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ﴿١٥٠﴾

○ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ﴿١٥١﴾

○ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥٢﴾

○ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٥٣﴾

○ ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِنْكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٥٤﴾

○ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾

ترجمہ

○ اے ایمان والو! اگر تم کافروں کا کہنا مانو تو وہ تمہیں تمہاری پشتوں پر پلٹا دیں گے پھر تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔

(۱۴۹)

○ بلکہ خدا تمہارا مولا ہے اور وہ بہتر مدد کرنے والا ہے۔

(۱۵۰)

○ ہم بہت جلد کافروں کے دلوں میں رعب و دبدبہ ڈال دیں گے بسبب اس کے کہ جو انہوں نے خدا کے ساتھ شریک قرار دیا جبکہ خدا نے اس کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی، ان لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور ظالموں کا ٹھکانہ بہت برا ہے۔

(۱۵۱)

○ یقیناً اللہ نے تمہارے ساتھ کیا ہوا وعدہ سچا کر دیا جب تم خدا کے اذن سے انہیں پچھاڑ رہے تھے، یہاں تک کہ تم کمزور پڑ گئے اور آپس میں جھگڑ پڑے اور نافرمانی کے مرتکب ہو گئے جب کہ اللہ نے تمہاری پسند کی چیز (فتح و کامیابی) تمہیں دکھا دی تھی، تم میں سے بعض افراد دنیا چاہتے ہیں اور بعض آخرت چاہتے ہیں، پھر اس نے تمہیں ان سے پھیر دیا تا کہ تمہیں آزمائے، تاہم خدا نے تم سے درگزر کیا اور اللہ مؤمنین پر فضل و عنایت کرنے والا ہے

(۱۵۲)

○ جب تم پہاڑ پر بھاگے بھاگے جا رہے تھے اور تم کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے جبکہ رسول ﷺ تمہارے پیچھے پیچھے تمہیں پکار رہے تھے، تو پھر اس نے تمہیں ایک غم کے بعد دوسرے غم میں مبتلا کر دیا تا کہ تم نہ تو اس چیز کی وجہ سے غمگین ہو جو تمہارے ہاتھ سے چلی گئی ہے اور نہ اس مصیبت پر دکھی ہو جو تم پر آن پڑی ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔

(۱۵۳)

○ پھر اللہ نے اس غم کے بعد تم پر آرام کی نیند طاری کر دی جو تم میں سے ایک گروہ پر چھا گئی، اور ایک گروہ ایسا تھا کہ جو اپنی جانوں کے بچانے کی فکر میں لگ گئے، وہ لوگ اللہ کے بارے میں جاہلیت کے گمان والا گمان کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ اس سلسلہ میں ہمیں بھی کچھ حق و اختیار حاصل ہے، کہہ دیجئے کہ سب کا سب اختیار اللہ کے پاس ہے، وہ اپنے دلوں میں جو کچھ چھپاتے ہیں وہ آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کچھ اختیار حاصل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے، کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے گھروں ہی میں ہوتے تب بھی جن کے مقدر میں قتل ہونا ہے وہ اپنی قتل گاہوں کو نکل پڑتے، یہ اس لئے ہے کہ اللہ تمہارے سینوں میں جو کچھ ہے اس کا امتحان لے اور تمہارے دلوں کی چھان بین کرے، اللہ باطن کی ہر بات سے بخوبی آگاہ ہے۔

(۱۵۴)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ جنگ احد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا تتمہ ہے۔ ان میں ایمان والوں کو تشویق و ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے علاوہ کسی کی اطاعت نہ کریں کیونکہ وہی ان کا مولا و مددگار ہے۔ اور اس نے مومنین ہی کو اس بات کا گواہ بنایا ہے کہ اس کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ آج کا دن ان کا میدان جنگ سے بھاگ جانا اور دشمن کے سامنے رسوا ہونا خود ان کی اپنی کارستانی اور اپنے ہی کئے کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے خدا کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی نافرمانی و سرتابی کی لیکن اس کے باوجود خداوند عالم نے ان سے درگزر کیا کیونکہ وہ تو ہے ہی مؤمنین پر کرم کرنے والا۔

کافروں کی اطاعت کی ممانعت

○ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا

(اے ایمان والو! اگر تم کافروں کی اطاعت کرو۔)

یہ ایک آیت اور اس کے بعد والی آیت کے آخری جملوں تک کے الفاظ کے تناظر میں یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ ان آیات کے سیاق کلام سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد اور ان آیات کے نازل ہونے کے دنوں میں کفار مومنین سے بظاہر ناصحابہ انداز میں یہ کہتے ہوں کہ تمہارا قریش کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ غلط تھا اور تم اس طرح کے کاموں سے دور رہو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ اسی طرح ان سے ایسی باتیں کرتے ہوں جو ان کے درمیان نزاع و جھگڑا، تفرقہ و جدائی، باہمی خلفشار اور اختلافات کو جنم دیں۔ اس مطلب کی تصدیق و تائید ان آیتوں کے آخری حصوں سے بھی ہوسکتی ہے جن میں یوں ارشاد ہوا۔

○ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا

بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ: جب انہیں لوگوں نے کہا کہ لوگ تمہارے مقابلے میں اکٹھے ہو گئے ہیں لہٰذا تمہیں ان سے بچ کر رہنا چاہیے تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین سہارا و مددگار ہے (۱۷۳) پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل وعنایت سے بہرہ ور ہوئے کہ انہیں کوئی تکلیف چھو ہی نہیں سکتی اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل وعنایت والا ہے (۱۷۴) یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں و پیروکاروں کو خوف دلاتا رہتا ہے مگر تم ان سے خوف مت کھاؤ بلکہ صرف میرا خوف دل میں رکھو اگر تم ایمان والے ہو (۱۷۵)

اس آیت مبارکہ کے حوالہ سے یہ کہا گیا ہے کہ اس میں جنگ احد کے دن یہودیوں اور منافقوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی اس افواہ کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا: ان محمداً قد قتل'' کہ محمدؐ قتل کر دیئے گئے ہیں لہٰذا تم اپنے اپنے قبیلوں کو پلٹ جاؤ۔

لیکن یہ خیال درست نہیں اور اسے قابلِ اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پھر خداوند عالم نے جب ایمان والوں کو اس مطلب سے آگاہ کر دیا کہ کافروں کی اطاعت کرنا اور ان کی ولایت و حکمرانی کی طرف جھکاؤ پیدا کرنا ان کے لیے خسارہ و نقصان کا باعث ہے جو کہ انہیں دوبارہ کفر کی طرف پلٹا دے گا، تو اس کے بعد مومنین کو اپنی ولایت و مدد کی طرف متوجہ کر کے اس طرح ارشاد فرمایا: **بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ** بلکہ اللہ تمہارا مولا ہے اور وہ بہتر مددگار ہے۔

شرک کا بُرا انجام

○ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ........

(ہم بہت جلد کافروں کے دلوں میں رعب و دبدبہ ڈال دیں گے بسبب اس کے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا)

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم کی طرف سے مومنین سے خوبصورت وعدہ کیا گیا ہے کہ بہت جلد ان کی مدد کرتے ہوئے ان کے دشمنوں کے دلوں میں ان کا خوف ڈال دیں گے اور اس بات کو حضرت پیغمبر اسلامؐ اپنی ان منفرد خصوصیات میں سے گنتے اور اس کا تذکرہ کرتے تھے جو خداوند عالم نے تمام انبیاءؑ کرام میں سے صرف انہیں عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں فریقین سے دوستی کی روایت سے واضح مطالب مذکور ہیں۔

بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ........ کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے ساتھ اسے شریک قرار دیا جس کے بارے میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں، اور قرآن مجید میں جس بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کے خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا قطعی بلا دلیل ہے، اور یہ بات بھی شرک کے اثبات کی ایک صورت ہے کہ خدا کے وجود کا انکار کیا جائے اور اس طرح کی تاثیر و تدبر کو خدا کے علاوہ مثلاً دہر (زمانہ) اور مادہ (Metter) سے منسوب کیا جائے۔

خدا کا سچا وعدہ

○ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ

(اور خدا نے تم سے کیا ہوا اپنا وعدہ سچا کر دیا جب تم انہیں نیست و نابود کر رہے تھے)

''تَحُسُّوْنَهُمْ ''میں ''حس'' ح پر زبر کے ساتھ کا معنیٰ قمع کرنے کی صورت میں قتل کرنا ہے۔

روایات اس پر اتفاق رکھتی ہیں اور تاریخ نے بھی اسے اپنے دامن میں محفوظ کیا ہے کہ جنگ احد میں مومنین کافروں پر غالب آ گئے تھے اور ان پر فتح پا چکے تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی تلواریں نیاموں میں رکھ دی تھیں اور کافروں کے اموال پر ٹوٹ پڑے تھے یہاں تک کہ تیراندازوں نے اپنے مورچے خالی کر دیئے تو اس وقت خالد بن ولید نے اپنے ساتھیوں سمیت عبداللہ بن جبیر اور اس کے باقیماندہ ساتھیوں پر حملہ کر دیا اور ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس کے بعد کافروں نے مومنین پر ان کے پیچھے سے حملہ کر دیا اور مشرکین ایک بار پھر میدان میں پلٹ آئے اور انہوں نے اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پچھاڑ دیا یہاں تک ان کے ستر افراد کو شہید کر دیا اور جو بچ گئے تھے انہیں نہایت بری طرح بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔

بنا برایں جملہ ''وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ'' درحقیقت اس وعدہ کو پورا کر دینے کا تاکیدی بیان ہے جو خدا نے ان سے کیا تھا کہ اگر تم نے تقویٰ و صبر اختیار کیا تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور پھر تم غلبہ پاؤ گے۔

اور جملہ ''اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ '' شاید اس فتح اور غلبہ و کامیابی کی طرف اشارہ ہے جو ایمان والوں کو جنگ کی ابتداء میں کافروں پر عطا فرمائی۔

اور جملہ ''حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ '' تیراندازوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہوں نے درّے خالی چھوڑ دیئے اور آپس میں نزاع و جھگڑا کرنے لگے کہ آیا وہ ان درّوں اور مورچوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کے ساتھ ملحق ہو جائیں جو رسول اللہؐ کے ہمراہ ہیں تا کہ مال غنیمت حاصل کر سکیں۔ اسی حال میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تنازع میں لگ گئے جس کے نتیجہ میں وہ سست پڑ گئے اور شکست سے دوچار ہوئے اور انہوں نے حضرت رسول خداؐ کے

اس فرمان کی نافرمانی کی جس میں آنحضرتؐ نے انہیں اپنے اپنے مورچوں اور دزّوں ہی میں رہنے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ تم ہر حال میں انہی میں رہنا اور انہیں ہرگز خالی نہ چھوڑنا۔ بنابرایں ''فشتلم ''میں لفظ''فشل ''(جس کا لغوی معنی شکست کھانا، ناکام پڑنا، کمزور پڑنا ہے) سے رائے کی کمزوری مراد لینا پڑے گا اور اگر اس سے بزدلی مراد لی جائے تو یہ معنیٰ ان پر اس لیے منطبق نہیں ہوگا کہ وہ بزدل نہ ہوئے تھے بلکہ وہ مالِ غنیمت کے لالچ میں درّوں اور مورچوں کو چھوڑ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ اگر ''فشل'' سے بزدلی و دل کی کمزوری مراد ہو تو جملہ'' فشلتم ''تمام مسلمانوں کے لیے ہوگا اور اس صورت میں (ثم صرفکم) میں حرف ''ثم ''ان کے رتبہ و منزلت میں پیچھے رہ جانے کا معنیٰ دے گا نہ کہ زمانی تاخیر کا کہ جس کا ترجمہ ''پھر'' اور ''اس کے بعد'' کیا جاتا ہے۔

اور جملہ ''تنازعتم ''میں ''تنازع '' کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ سب مسلمان بزدلی و رائے کی کمزوری کا شکار نہ تھے اور نہ ہی سب کے سب نافرمانی پر تلے ہوئے تھے بلکہ اس کے برعکس صورتحال تھی اور وہ یہ کہ ان میں سے بعض فرماں برداری پر ڈٹے ہوئے تھے اور کسی صورت میں فرمان نبویؐ سے سرتابی پر راضی نہ تھے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا، ''منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الاخرۃ '' (تم میں سے بعض دنیا چاہتے ہیں اور تم میں سے بعض آخرت کے خواہشمند ہیں)۔

امتحان کی ایک صورت

O ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ

(پھر اس نے تمہیں ان سے جنگ کرنے سے روک دیا تاکہ تمہیں آزمائے)

اس سے مراد یہ ہے کہ تمہاری طرف سے بزدلی و رائے کی کمزوری کے اظہار اور آپس میں نزاع اور نافرمانی کے ارتکاب کے بعد خدا نے تمہیں مشرکین سے جنگ کرنے سے روک دیا، خلاصہ یہ کہ تمہارے درمیان اختلاف پیدا ہو جانے کے بعد خدا نے تمہیں جنگ سے اس لیے روکا تاکہ تمہارا امتحان لے اور تمہارے ایمان کو پرکھے اور تمہیں دیکھے کہ تم اللہ کی راہ میں کس قدر صبر کرتے ہو کیونکہ دلوں کا اختلاف ہی عمومی و وسیع امتحان و آزمائش کے مضبوط ترین عوامل و اسباب میں سے ہے تاکہ اس طرح مومن و منافق کی تمیز ہو سکے اور پھر راسخ الایمان و ثابت قدم مومن اور آئے دن رنگ و چہرہ بدلنے والے مؤمن کو پہچانا جا سکے، اس کے باوجود خُداوند عالم نے اپنے فضل و کرم اور خاص عنایت سے ان سے درگزر فرمایا چنانچہ ارشاد فرمایا ''وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ '' کہ اس نے تم سے عفو و درگزر کر لیا۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بلانا اور مسلمانوں کا بھاگ جانا

○ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ

(جب تم بھاگے جا رہے تھے اور کسی کو مڑ کر نہ دیکھتے تھے جبکہ رسول تمہیں تمہارے پیچھے سے آوازیں دے رہا تھا)

"تُصْعِدُوْنَ" فعل مضارع، اس کا مصدر باب افعال "اصعاد" ہے جس کا معنیٰ ذہاب یعنی جانا اور زمین میں دور چلے جانا ہے کہ کسی کو دکھائی نہ دیں، جبکہ لفظ "صعود" کا معنیٰ کسی بلند مقام کی طرف چڑھنا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: "اصعد فی جانب البر" یعنی فلاں شخص بیابان کی طرف دور چلا گیا، اور جب یوں کہا جائے: "صعد فی السلّم" تو اس کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ سیڑھی پر چڑھ گیا، اس میں بلندی کی طرف جانے کا معنی پایا جاتا ہے۔ بعض اہل دانش نے یہ بھی کہا ہے کہ "اصعاد" کبھی "صعود" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہاں فعل "تُصْعِدُوْنَ" سے پہلے ظرف زمان فرض کیا جائے گا تاکہ معنیٰ واضح طور پر معلوم ہو اور وہ یہ ہے: "اذکروا" تو جملہ اس طرح بنے گا: "اذکروا اذ تصعدون" (یاد کرو اس وقت کو جب تم بھاگے جا رہے تھے)۔ البتہ اس کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا تعلق آیت کے جملہ "صرفکم" یا "لیبتلیکم" سے ہو اس احتمال کو بعض حضرات نے ذکر کیا ہے۔

جملہ "ولا تلون" کا لفظی اشتقاق "لیّ" (ل ی ی) سے ہے جس کا معنیٰ توجہ والتفات ہے، تفسیر مجمع البیان میں اس سلسلہ میں مذکور ہے کہ یہ لفظ صرف نفی کے موارد میں استعمال ہوتا ہے لہٰذا یوں نہیں کہا جاتا: "لویت علیٰ کذا" (میں فلاں چیز یا فلاں طرف متوجہ وملتفت ہوا) یا (میرا جھکاؤ فلاں جانب ہوا)۔ بلکہ اسے صرف اور صرف کسی چیز یا طرف سے نفی کے موارد میں استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ زیر نظر آیت مبارکہ میں ہوا ہے ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان جلد ۲ ص ۵۲۱)

جملہ "والرسول یدعوکم فی اُخرایکم" میں لفظ "اخریٰ" لفظ "اولیٰ" کے مقابل میں آتا ہے۔ یہاں جملہ "یدعوکم" اس امر کی نشاندھی کرتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسلمانوں کو ان کے پیچھے پیچھے سے بلا رہے تھے اور آوازوں پر آوازیں دے رہے تھے جبکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے حالانکہ وہ کثیر تعدا میں تھے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس حال میں چھوڑ دیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دور رہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم انہیں بلائے جا رہے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف توجہ نہ کرتا تھا، نہ آگے جانے والے اور نہ ہی پیچھے والے، کوئی بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بلاوے پر لبیک نہ کہتا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مشرکوں کے ہجوم میں اکیلا چھوڑ کر قتل ہونے کے ڈر سے بھاگے جا رہے تھے۔

البتہ اس سے ماقبل جملہ ''وسیجزی اللہ الشاکرین'' کہ جس کی تفسیر ذکر ہو چکی ہے سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جن کے ایمان میں تزلزل پیدا نہ ہوا۔ نہ ہی جنگ کی ابتداء میں اور نہ جنگ کے عین شباب پر، اور نہ ہی اس وقت جب یہ افواہ اڑائی گئی کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جملہ ''افان مات او قتل'' اس مطلب کی واضح دلیل ہے۔

اس کے علاوہ جملہ ''ولا تلون علیٰ احدوالرسول یدعو کم فی اخریٰکم'' سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کئے جانے کی خبر مسلمانوں کے شکست کھانے اور میدان جنگ سے بھاگ جانے اور پہاڑ پر چڑھ جانے کے بعد پھیلائی گئی۔

امتحان کے بعد امتحان

○ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ؕ

(پھر اس نے تمہیں غم کے بعد غم میں بتلا کر دیا تا کہ تم اس چیز پر ملال و رنج نہ کرو جو تمہارے ہاتھ سے چلی گئی ہے اور نہ ہی اس چیز سے جس میں تم بتلا ہوئے)

اس سے مراد یہ ہے کہ خدا نے تمہیں ایک غم و افسوس کے بعد دوسرے غم و اندوہ میں بتلا کر دیا تا کہ تمہاری توجہات اس پہلے غم و حسرت سے ہٹ جائیں۔ پہلا غم و افسوس یہ تھا کہ ہم مال غنیمت سے محروم ہوئے اور ہمارے اس قدر افراد مارے گئے اور دوسرا غم و افسوس یہ تھا کہ ہم دنیا کے مال کے لالچ میں مُبتلا ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ دیا، خدا نے دوسرے افسوس میں مُبتلا کر کے پہلے افسوس سے تمہاری توجہات دور کر دیں تا کہ تم جن چیزوں سے محروم ہو گئے ہو ان کے بارے میں غم نہ کرو۔

بہر حال سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرا غم جس میں انہیں بتلا کیا گیا وہ ان پر خدا کی طرف سے نعمت تھا چنانچہ اس کا ثبوت اس جملہ میں ملتا ہے: لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ تا کہ تم غم نہ کھاؤ اس کا جن سے تم محروم ہو گئے ہو اور نہ ہی اس پر جس میں بتلا ہو گئے ہو۔ کیونکہ خُداوند عالم نے اس چیز پر غم کرنے کی مذمت کی ہے جس سے محرومی ہو چنانچہ ارشاد ہوا۔

سورہ حدید۔ آیت ۲۳:

○ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ

(تا کہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جس سے تم محروم ہوئے ہو)

تو یہ غم جو انہیں اس غم سے نجات دیتا ہے یعنی ان کی توجہات کو پھیر دیتا ہے وہ ان پر خدا کی نعمت وعنایت ہے۔ اس طرح وہ غم جو محرومی کے سبب لاحق ہوا وہ ان کی طرف سے سرزد ہونے والے فعل بزدلی اور رسول ﷺ کے فرمان سے سرتابی کی وجہ سے اور اس وجہ سے ہوا کہ وہ جس چیز سے محروم ہوئے وہ مشرکوں پر فتح و کامیابی تھی، بنابرایں آیت میں لفظ "بغم "یعنی دوسرے غم سے مراد مذکورہ حسرت وغم سے جنم لینے والا غم ہے۔ اس میں حرف ب بدل کے معنی میں ہے۔ اس طرح آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ خُداوند عالم نے کامیابی سے محرومی پر ندامت وحسرت کے غم کو فرار کرنے اور رسولؐ کی نافرمانی کے ارتکاب کے غم کا بدل قرار دے دیا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ "فاثابکم "" ابدلکم " کے معنی میں ہو اور آیت کا معنی یوں کیا جائے: خدا نے حزن ورنج کے دکھ کو ندامت وحسرت کے غم کا بدل قرار دیا تا کہ تمہیں اجر وثواب سے نوازے، اس معنی کی روشنی میں دونوں غموں کے معنوں میں برعکس صورت پیدا ہو جائے گی یعنی پہلے غم کا ثواب ونعمت وعنایت سے اور دوسرے غم کا تعلق حزن سے ہوگا۔

بہر حال ان دونوں معنوں کی بناء پر جملہ "فاثابکم "جملہ "ولقد عفا عنکم " کی فرع اور اس سے مربوط قرار پائے گا، اس کا تعلق بعد والے جملہ "ثم انزل علیکم "نہایت عمدہ صورت کے ساتھ ہو جائے گا اور آیت کی ترتیب اس طرح ہو جائے گی: "انه عفا عنکم فاثابکم غماً بغم لیصونکم عن الحزن الذی لایر تضیه لکم ثم انزل علیکم من بعد الغم امنة نعاساً"۔ اس نے تم سے درگزر کیا، پھر ایک غم کے بدلے میں تمہیں دوسرا غم دے دیا تا کہ تمہیں اس دکھ سے بچائے جو تمہارے لیے پسند نہیں کرتا، پھر اس نے غم کے بعد امن کی نیند تم پر نازل کر دی۔

اس مقام پر ایک صورت یہ بھی بنتی ہے اور سیاق کلام کے ظاہر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ چونکہ جملہ "فاثابکم "جملہ "لقد عفا عنکم " کی فرع اور اس سے مربوط ہے لہٰذا پہلے غم سے مراد وہ غم ہے جس کا تعلق جملہ "اذتصعدون "(جب تم پہاڑ پر چڑھے جا رہے تھے) سے ہے اور جملہ "بغم" میں مذکور غم کا تعلق اس سے ہے جس کا سبب باہمی نزاع ومعصیت اور پھر مشرکوں کے پیچھے سے ان پر غلبہ وتسلط حاصل کرنا ہے۔ اور "بغم" میں حرف ب سبب کا معنی دیتا ہے اور یہی معنی بہتر ہے، اس بناء پر جملہ "لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا" سے مراد یہ ہوگا کہ ہم نے اس لیے ایسا کیا کہ تمہارے لیے حقیقت الامر کو واضح کریں تا کہ تم حزن ودکھ میں مبتلا نہ رہو، اور یہ بعینہ اسی طرح سے جیسے درج ذیل آیات مبارکہ میں مذکور ہے:

سورۂ حدید، آیت ۲۲ تا ۲۳:

○ مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۚ﴿۲۲﴾ لِّـكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ

(تمہیں روئے زمین پر اور خود تمہارے اندر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ اس سے پہلے کتاب تقدیر میں ہم نے لکھ دی

ہے، یہ کام خدا پر آسان ہے اور اس لیے ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے چلا جائے تم اس پر افسوس نہ کرو اور جو کچھ تمہیں ملے اس پر شادمانیاں نہ کرو)

اس معنی کی روشنی میں آیت کے جملوں کی ترتیب اور یکے بعد دیگرے جملوں کی پیوستگی کا سلسلہ درست ہو جاتا ہے۔ البتہ مفسرین کرام نے آیت کے حوالہ سے بہت زیادہ احتمالات ذکر کئے ہیں کہ جن تعلق ''فاثابکم '' سے ہے کہ اس کا عطف واشارہ کس طرف ہے اور یہ کہ پہلے غم اور دوسرے غم سے مراد کیا ہے؟ اور یہ کہ ''لکیلا '' کا معنیٰ کیا ہے اور اس کا ماقبل سے کیا تعلق وربط بنتا ہے ان تمام موارد میں مفسرین نے مختلف اظہارات کئے ہیں اور کسی نے کوئی واضح ویقینی رائے نہیں دی لہٰذا ان سب بیانات کے ذکر کرنے کا یہاں کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی ان کی بابت بحث واظہار خیال سے کچھ حاصل ہوگا، بنابرایں ہم نے جن دو معنوں کا احتمال دیا ہے وہی مراد ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ جملہ ''لکیلا تحزنوا علیٰ مافاتکم '' سے مراد غلبہ و مال غنیمت اور جملہ ''ما اصابکم '' سے مراد ان پر آنے والی مصیبت یعنی افراد کا قتل کیا جانا اور زخمی ہونا ہے۔

غم کے بعد امن

○ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ

(پھر اس نے تم پر غم کے بعد امن کی نیند طاری کر دی جو تم میں سے ایک گروہ پر چھا گئی)

لفظ ''اَمَنَۃ '' (الف، م اور نون پر زبر کے ساتھ) کا معنیٰ امن وسکون ہے۔ لفظ ''نعاس '' کا معنیٰ ہلکی نیند یعنی اونگھ ہے۔ اس کا لغوی معنیٰ نیند سے پہلے والی خماری حالت ہے، اسے ابتدائی نیند بھی کہا جاتا ہے)۔ یہ لفظ یہاں لفظ ''آمنۃ '' سے بدل کے طور پر ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان عموماً ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہونے جیسا ربط وتعلق پایا جاتا ہے۔ اس کی بابت یہ احتمال (ممکنہ صورت) بھی موجود ہے کہ لفظ ''امنۃ '' جمع کا صیغہ ہے اور اس کا مفرد ''آمن '' ہے جیسے ''طالب '' سے ''طلبہ '' آتا ہے۔ اگر یہ احتمال درست ہو تو اسے ضمیر جمع مخاطب ''علیکم '' سے حال ماننا پڑے گا، اور ''نعاساً '' جملہ ''انزل '' کا مفعول قرار پائے، اور ''یغشی '' میں ''غشیان '' کا معنیٰ گھیر لینا، چھا جانا ہے۔ (ان دونوں صورتوں کی وضاحت یہ ہے کہ اگر لفظ ''آمنۃ '' کا معنیٰ امن کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے تمہارے ایک غم کو دوسرے غم میں بدل کر تم پر امن نازل کیا کہ جس کے بعد تم میں سے ایک گروہ پر اونگھ ڈال دی گئی، اور اگر لفظ ''آمنۃ '' کو ''آمن '' کا صیغۂ جمع اسم فاعل مانا جائے تو آیت کا معنیٰ یوں ہوگا کہ خُداوند عالم نے تمہارے ایک غم کو دوسرے غم میں بدلا جبکہ تم اس وقت امن میں تھے تو تم میں سے ایک گروہ پر اونگھ مسلط کر دی جس نے انہیں گھیر لیا)۔

بہر حال اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو اونگھ ایک گروہ پر ڈالی گئی وہ سب پر نہیں چھائی، چنانچہ ارشاد ہوا: ''طائفتہ منکم'' (تم میں سے ایک گروہ پر) اور یہ وہ لوگ تھے جو فرار کرنے اور حضرت پیغمبر اسلام کو چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جانے کے بعد نادم و پشیمان اور حسرت زدہ ہو کر واپس آئے تھے، اور ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا کہ اس حال میں جبکہ وہ فرار کر رہے ہوں اور میدان جنگ سے روگردانی کے مرتکب ہو رہے ہوں اپنی رحمت کے ساتھ ان سے عفو و درگزر کر لے کیونکہ جنگ سے فرار کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ جو انسان کو خدا کی رحمت سے محروم کر دیتا ہے اور اسی آیت میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ (خدا نے تم سے عفو و درگزر کیا اور اللہ مومنین پر فضل و کرم کرنے والا ہے) اور یہ کیونکر قابل تصور ہے کہ خداوند عالم اپنا فضل و کرم کسی ایسے شخص کو عطا کرے جو کبیرہ گناہ یعنی فحشا و منکر کا مرتکب ہوا ہو اور ابھی توبہ بھی نہ کی ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم نے انہیں اس وقت اپنی عنایت سے نوازا جب انہیں ایک غم کے بدلے میں دوسرے غم میں مبتلا کیا تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ غمگین ہو جائیں اور اُن کے دل اس دکھ سے آلودہ ہوں جو خدا کو پسند نہیں، بہر حال اس حوالہ سے مربوطہ مطالب بیان ہو چکے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ امن اور اونگھ چند لوگوں پر آئی یعنی وہ کہ جو اپنے فرار کرنے کی وجہ سے سخت ندامت و پشیمانی کا شکار ہوئے اور اپنے اس غلط کام کی بناء پر دوبارہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں واپس آ گئے۔ اور گویا یہ اس وقت ہوا جب آنحضرت ﷺ مشرکوں کے ہجوم سے باہر نکل کر محفوظ درّہ میں واپس آ گئے تھے اور ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ آنحضرت ﷺ قتل نہیں ہوئے اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کا ایک گروہ وہ تھا جن کے بارے میں خداوند عالم نے یوں فرمایا: وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ .... (اور ایک گروہ ایسا تھا جو صرف اپنی فکر میں لگے ہوئے تھے)۔

اپنے آپ میں گم گشتہ لوگ

○ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ

(اور ایک گروہ وہ تھا جو اپنے آپ میں گم تھے)

یہ ایمان والوں کا دوسرا گروہ تھا، ان کے مومن ہونے سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ ان منافقین میں سے نہ تھے جن کا تذکرہ خداوند عالم نے ان الفاظ میں کیا: وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ۭ ...... (اور تا کہ وہ جان لے ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت کی، اور ان سے کہا گیا کہ تم آؤ اللہ کی راہ میں

قتال کرو یا دفاع کرو تو وہ کہنے لگے کہ اگر ہم لڑنا جانتے تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہو جاتے ......) تو منافقین وہی تھے جنہوں نے ابتداء ہی سے اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی مؤمنین کو چھوڑ دیا تھا اور ان سے جدا ہو گئے تھے۔ منافقین کے بارے میں خداوند عالم عنقریب وضاحت کے ساتھ مطالب بیان کرے گا۔

تو خداوند عالم نے زیر نظر جملہ میں جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ اپنے آپ میں گم تھے (اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ) اُنہیں اس عزت واعزاز اور فضل وکرم سے نہیں نوازا جن سے پہلے گروہ کو نوازا یعنی ان سے عفو ودرگزر نہیں فرمایا اور ان کے ایک غم کو دوسرے غم میں بدل کر ان پر امن اور اونگھ نہیں ڈالی بلکہ ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ اپنے آپ میں گم ہو گئے اور اُنہوں نے اپنے سوا سب کچھ بھلا دیا۔

تو خداوند عالم نے ان لوگوں کی دو باتیں بیان کیں البتہ ان دونوں کی بازگشت ایک ہی بات کی طرف ہوتی ہے کیونکہ ان میں ایک، دوسری سے لازمی طور پر پیوستہ ہے بلکہ اس کی فرع ہے۔

وہ دو باتیں یہ ہیں:

(۱) "قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ"

(۲) "يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ"

اپنے آپ میں گم ہونے اور اپنے ہی بارے میں کوشش کرنے سے مراد یہ نہیں کہ وہ حقیقی معنی میں سعادت کے حصول کے درپے تھے کیونکہ مؤمنین بھی اپنی حقیقی سعادت کے خواہاں وکوشاں ہیں۔ اور ہر انسان بلکہ ہر ارادہ وہمت والی مخلوق کی نگاہ وکوشش اپنے علاوہ کسی چیز کی طرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی کوشش اپنی دُنیاوی زندگی بچانے کے سوا کچھ نہ تھی اور وہ ہرگز قتل ہونا نہیں چاہتے تھے یعنی اپنے آپ کو قتل کئے جانے کے خطرہ سے دوچار نہیں کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی حقیقی سعادت کے حصول کے خواہاں تھے بلکہ ان کا مقصد اعلیٰ اور کعبۂ مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ اپنی دنیاوی زندگی سے لطف اندوز ہوں اور اگر وہ دین سے منسوب ووابستہ ہیں تو صرف اس بناء پر کہ دین ہی وہ ذریعہ ہے جس پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا اور خدا اپنے دشمنوں کے اپنے اوپر غلبہ پانے پر ہرگز راضی نہیں ہوتا۔ خواہ ظاہری اسباب خدا کے دشمنوں کے پاس کیوں نہ ہوں! تو وہ لوگ خدا کے دین کی نصرت وخدمت کے جذبہ سے سرشار نہ تھے بلکہ دنیا کے ذریعے اپنے مقاصد ومفادات حاصل کرنے کے درپے تھے کہ جب تک دین کے ذریعے اُن کے مقاصد اور دنیاوی مفادات حاصل ہوتے رہیں وہ دین سے وابستہ رہیں اور جوں ہی صورتحال مختلف ہو وہ بھی دین کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جائیں۔

جاہلیت والی بدگمانی

○ يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ

(وہ اللہ کے بارے میں ناحق گمان کرتے ہیں جاہلیت والا گمان حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے)

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُنہوں نے اللہ کے بارے میں ایسا گمان کرلیا جو ہرگز حق نہیں بلکہ وہ جاہلیت والی بدگمانیوں میں سے ہے۔ چنانچہ وہ خدا کی توصیف اس طرح کرتے ہیں جو اس کی بابت قطعی طور پر نادرست و غلط ہے بلکہ وہ ان اوصاف میں سے ہے جس لئے اہل جاہلیت (کفار و مشرکین اور بت پرست لوگ) کرتے تھے۔ اور اسی کی بناء پر انہوں نے کہا "هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ" (کیا ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟) اس کے جواب میں خداوند عالم نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے کہو کہ تمام اختیار خدا کے ساتھ مختص ہے (قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ) اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ بھی بعض کاموں میں اختیار رکھتے ہیں چنانچہ اسی گمان کی بناء پر جب وہ مغلوب واقع ہوئے اور ان کے مقتولین کی تعداد زیادہ ہوگئی تو وہ شک کا شکار ہوگئے اور کہنے لگے: "هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ" کیا ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ ہمیں بھی کچھ قدرت حاصل ہے؟ ہم بھی کچھ کر سکتے ہیں؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں صرف یہی بات تھی کہ وہی ہر حال میں غلبہ و فتح پائیں گے اور یہ انہی کا مخصوص حق ہے کیونکہ وہ اسلام لائے ہیں، اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ دین حق کبھی مغلوب واقع نہیں ہوسکتا، اسی طرح جو شخص اس دین حق کا پیروکار ہو وہ بھی ہر حال میں غالب ہوگا اور کوئی اس پر غلبہ نہیں پاسکتا کیونکہ اس دین اور اس دین کے پیروکاروں کی مدد کرنا خدا پر فرض بنتا ہے اور وہ ہر طرح کی شرط و قید کے بغیر غیر مشروط طور پر دینداروں کی مدد و نصرت کرنے کا وعدہ کرچکا ہے۔

ان کا یہی گمان ناحق اور باطل تھا اور یہی جاہلیت والا غلط گمان ہے چنانچہ زمانہ جاہلیت کے بت پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز مثلاً رزق، زندگی، موت، عشق، جنگ وغیرہ اور اسی طرح کائنات کی ہر شے (تمام موجودات) مثلاً انسان، زمین، دریا وغیرہ میں سے ہر ایک کے لئے ایک رب اور مستقل پروردگار ہے جو اس کے امور کی تدبیر کرتا ہے اور وہ سب رب ایسے ہیں کہ کوئی شخص ان کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتا یعنی وہ جو کچھ چاہیں وہی ہوتا ہے، کوئی انہیں مغلوب نہیں کرسکتا، اور وہ بت پرست انہی پروردگاروں کی پرستش کرتے تھے تاکہ وہ ان کے لئے رزق و روزی کا سامان کریں اور ان کی سعادت و خوشبختی کو یقینی بنائیں اور انہیں ہر طرح کے شر اور تکلیف و مصیبت سے بچائیں اور جہاں تک خداوند عالم کا تعلق ہے تو وہ رب الارباب ہے اور اس کی حیثیت ایک عظیم القدر بادشاہ کی ہے کہ جو اپنی رعایا میں سے ہر طبقہ و

صنف کے لئے اور اپنی ملکیت کے حصہ وعلاقہ کے لئے ایک کامل بااختیار حاکم مقرر کر کے ان کے امور کی تدبیر اس کے سپرد کرتا ہے اور اسے مختار کل بنا دیتا ہے کہ وہ جو چاہے انجام دے اور اپنے دائرہ حکومت میں ہر طرح کے فیصلے کر سکے۔

اور اسی طرح کا گمان کرنے والا شخص جب دین قبول کرنے کے بعد بھی یہ گمان کرے کہ وہ اپنی ظاہری ترقی و پیش رفت کے حوالہ سے ہرگز مغلوب واقع نہیں ہو سکتا اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جو اپنے پروردگار کی طرف سے سب سے پہلے فرد ہیں جنہیں خدائی پیغامات واحکامات پہنچانے اور کائنات کے امور چلانے کا کام سونپا گیا ہے اور وہ ان تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والے ہیں وہ بھی اپنی دعوت ومشن میں بظاہر مغلوب واقع نہ ہوں گے یا یہ کہ کم از کم قتل نہیں ہوں گے یا ان پر موت نہیں آئے گی۔ تو اس طرح کا گمان غلط ونادرست اور خداوند عالم کے بارے میں ناحق و باطل ہے اور یہ جاہلانہ خیال ہے کیونکہ اس طرح اس نے گویا خدا کے ہمتا و ہمسر اور برابر و مدمقابل قرار دے دیئے کہ جن میں سے ایک خود حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ جنہیں اس نے رب کا درجہ دے دیا کہ جسے خداوند عالم نے غلبہ پانے اور مالِ غنیمت پر کامل تسلط تفویض کر دیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، تمام امور کا اختیار خود اسی کے پاس ہے، سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے، مخلوق میں سے کسی کو ہرگز کوئی استقلالی اختیار حاصل نہیں۔ بلکہ ہر چیز کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نے ارشاد فرمایا "لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَائِبِينَ" (تاکہ وہ کافروں کے ایک گروہ کا قلع قمع کر دے یا انہیں ذلیل و رسوا کرے تاکہ وہ ناکام و مایوس ہو کر پلٹ جائیں) ___ آیت ___ ۱۲۲ تو اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (اس سلسلہ میں تجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، (تیرا کوئی عمل دخل نہیں) ___ آیت ___ ۱۲۳، یہ اس لئے ہے کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرنے پائے کہ کافروں کے قلع قلم کرنے یا انہیں ذلیل و رسوا کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل دخل ہے، بلکہ سب کو اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے کہ خداوند عالم ہی ہے جس کے ہاتھ میں ہر طرح کا اختیار ہے اور اس نے ایک نظام الاسباب قائم کیا ہے جس کے تحت تمام امور اپنی اپنی حیثیتوں سے چلتے ہیں لہٰذا ان میں سے جس چیز کا سبب زیادہ قوی ہو وہ غلبہ پا لیتا ہے خواہ اس کا تعلق حق سے ہو یا باطل سے، خیر سے ہو یا شر سے، ہدایت سے ہو یا ضلالت و گمراہی سے، عدل سے ہو یا ظلم سے ہے، اور اس نظام الاسباب میں مؤمن و کافر، محبوب و مبغوض، دوست و دشمن یہاں تک کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سب سے بڑے دشمن خدا ابوسفیان کے درمیان اس حوالہ سے کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ سبھی خدا کی مخلوق ہونے کے حوالہ سے خدائی نظام الاسباب سے وابستہ ہیں، البتہ یہ بات درست ہے کہ خداوند عالم اپنے دین اور اپنے اولیاء پر خصوصی نظر عنایت رکھتا ہے اور وہ تکوین و تشریع اور نظام الاسباب میں اپنی خصوصی عنایت کے ساتھ ایسی صورت پیدا کر دیتا ہے جس کے نتیجہ میں دین حق کو غلبہ حاصل ہو، اولیاء الٰہی کی حاکمیت کی راہ ہموار ہو اور تقویٰ والے ہی بالآخر کامیاب و کامران ہوں۔

اور نبوت و رسالت کے سلسلے بھی اس نظام الاسباب سے مستثنیٰ نہیں، چنانچہ جب بھی دین حق کی ترقی و پیش رفت اور اہل ایمان کے غلبہ و حاکمیت کے ظاہری اور معمول کے اسباب فراہم ہوں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض غزوات اور جنگوں میں ایسا ہوا، تو وہ اسباب مؤثر و نتیجہ بخش ثابت ہوتے ہیں لیکن اگر وہ اسباب وجود میں نہ آئیں مثلاً نفاق یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین سے روگردانی و نافرمانی یا بزدلی و بے ہمتی وغیرہ، تو اس صورت میں مشرکوں ہی کو ایمان والوں پر غلبہ و فتح حاصل ہوگی، جیسا کہ جنگ اُحد میں ایسا ہوا، یہی صورتحال دیگر انبیاءؑ کی لوگوں کے ساتھ ہے اور چونکہ انبیاءؑ کے دشمن جو کہ پورے طور پر دنیا پرست تھے اور دنیاوی زندگی کے سوا کوئی چیز ان کو ملحوظ نہ تھی اور وہ اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لا کر اپنی دنیا آباد کرنے، اپنی طاقت بڑھانے، اپنی قوت و اختیار کا دائرہ وسیع کرنے اور اپنی افرادی قوت کو مضبوط و یکجا کرتے ہوئے اپنی اجتماعی حیثیت کا لوہا منوانے میں منہمک و سرگرم عمل رہتے تھے لہٰذا ظاہری مادی طور پر وہی غالب رہے اور انبیاء مغلوب واقع ہوتے رہے چنانچہ اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کو قتل کر دیا گیا حضرت یحییٰؑ زخمی ہوئے، حضرت عیسیٰؑ کو تنہا چھوڑ دیا گیا اور اسی طرح دیگر انبیاء کے ساتھ بدسلوکیاں ہوئیں۔

ہاں البتہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب عام حالات میں بعض مواقع درپیش ہوں اور رکاوٹیں سامنے آئیں جن کی وجہ سے حق کی حقانیت کے اظہار کا سلسلہ رک جائے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ حق زندگی اور موت کے دوراہے پر پہنچ جائے تو اس وقت خدا ہی کا کام ہے کہ وہ دین کی مدد کرے اور اس کی طاقت بڑھائے اور ہرگز ایسا نہ ہونے دے کہ اس کی دلیل و حجت کمزور پڑے یا باطل و بے اثر ہو جائے۔ اس موضوع کی بابت اس کتاب کی جلد اول میں معجزہ کی بحث میں اور جلد دوم میں اعمال کے احکام کی بحث میں بعض مربوطہ مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں۔

اب پھر اپنی جاری بحث کی طرف لوٹتے ہیں: اپنے آپ میں گم و سرمست لوگوں کا یہ کہنا: هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ (کیا ہمارا ابھی کوئی اختیار رہے؟) درحقیقت ان کی طرف سے دین کی حقیقت و حقانیت میں شک کا شکار ہونے کا ثبوت ہے اور اس مطلب کی دلیل ہے کہ انہوں نے دین کی شکل و صورت کو بگاڑ کر اس میں بُت پرستی کی روح ڈال دی جیسا کہ اس حوالہ سے مربوطہ مطالب بیان ہو چکے ہیں، لہٰذا خداوند عالم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو ان کے سوال کا جواب دیں، چنانچہ ارشاد ہوا: "قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ" کہہ دو کہ سب کا سب اختیار خدا کے پاس ہے، اور اس سے پہلے خداوند عالم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا تھا: "لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ" کہ تجھے کسی چیز کا اختیار حاصل نہیں، تو اس طرح خدا نے واضح کر دیا کہ آئین فطرت اور توحیدی دین یہی ہے کہ جس میں خداوند عالم کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں، سب کچھ خدا کے دست قدرت میں ہے، دیگر موجودات کو کہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل ہیں اپنی کوئی استقلالی حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی وہ عالم ہستی میں کسی طرح کی استقلالی اثرگزاری کی قوت رکھتے ہیں بلکہ سب کے سب نظام الاسباب سے وابستہ ہیں اور خدائی سلسلہ و قانون کے تابع ہیں کہ جس میں ابتلاء و امتحان کی گوناگوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔

باطن وظاہر میں دورنگی

○ ''يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ.........''

(وہ اپنے اندر ہی چھپائے رکھتے ہیں اس چیز کو جو تیرے سامنے ظاہر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ اگر.....)

یہ انہی افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے کہا ''هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ'' (کیا ہمیں بھی کوئی اختیار حاصل ہے؟) اور یہ بات ان کی اپنے بارے میں اختیار کا پوچھنے کی نسبت کہیں زیادہ سخت ہے اور یہ بات ان کی اپنے بارے میں پوچھنا دراصل دین کے بارے میں شک کا شکار ہونے کی ایک صورت تھی، اوران کا یہ کہنا: ''يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا'' اگر ہمارے اختیار میں کچھ ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے، انہوں نے یہ بات اپنے ہی دلوں میں کہی، ان کی یہ بات استدلال کی صورت گری میں ترجیحی پہلو کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی بات یعنی ''هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ'' (کیا ہمیں بھی کچھ اختیار حاصل ہے؟) کو رسول خدا ﷺ کے سامنے ظاہر کیا جبکہ اپنی دوسری بات یعنی ''لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا'' (اگر ہمارے پاس کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے) کو رسول خدا ﷺ سے چھپائے رکھا کیونکہ اس میں کفر کو اسلام پر ترجیح دینے کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اس بناء پر خداوند عالم نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ انہیں جواب دو اور کہو: ''لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ.........'' اگر تم اپنے گھروں ہی میں بیٹھے رہتے تو جن کی لوح تقدیر میں قتل ہونا لکھا جاچکا ہے وہ یقیناً اپنی قبروں کی طرف نکل پڑتے، اور یہ اس لئے ہے کہ خدا آزمائے اس چیز کے بارے میں جو تمہارے سینوں میں ہے اور اس کی چھان بین کرے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔

اس بیان میں دو چیزوں کو واضح کیا گیا ہے:

(۱) میدانِ جنگ میں تم میں سے کسی کا مارا جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ تم حق پر نہیں اور نہ ہی وہ بات درست ہے جو تم نے سوچی ہے کہ فتح وغلبہ پانا تمہارے نصیب میں نہیں، کیونکہ خدائی فیصلہ کا نفاذ اور اس کا پورا ہونا یقینی ہے کہ جس سے فرار ممکن نہیں اور اس میں ان افراد کا اس سرزمین میں مارا جانا یقینی و طے شدہ ہے لہٰذا اگر تم اپنے گھروں سے باہر نہ بھی آتے تب بھی جن لوگوں کا اس سرزمین پر مارا جانا یقینی ہے وہ یہیں مارے ہی جاتے، مقررہ وقت سے بچنا کسی کے بس میں نہیں، تم اس مقررہ لمحہ سے نہ تو ایک پل آگے جاسکتے ہو اور نہ ہی اس سے تاخیر کرسکتے ہو، اس میں تمہارا کوئی اختیار نہیں۔

(۲) سنّت وآئین خداوندی ہی یہ ہے کہ ابتلاء وامتحان اور خالص سازی کا عمل عمومی ہو کہ جس میں تم اور وہ لوگ بھی

لامحالہ شامل ہیں، بنابرایں تم اس جنگ سے دور رہ ہی نہیں سکتے تھے، اس صورتحال کا وجود میں آنا ناگزیر تھا تاکہ تمہارے مقتولین اس جگہ ہی مارے جائیں اور اپنے بلند درجات پر فائز ہوں اور تم میں سے ہر شخص کا مقام وحیثیت واضح و مشخص ہو جائے اور تمہارے باطنی افکار ونظریات کی جانچ پڑتال تمہارے دلوں میں چھپے ہوئے ایمان وشرک کے تمام پہلو واضح ہونے کے بعد سعادت وشقاوت میں سے کسی ایک منزل کا تعین تمہارے لئے ہو جائے۔

ایک نادرست قول

زیر نظر آیت مبارکہ کے بارے میں ایک قول نہایت تعجب آور متعدد مفسرین نے پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں جس گروہ کا تذکرہ ہوا ہے اس سے مراد منافقین ہیں۔ حالانکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ یہ ایمان والوں کے بارے میں ہے جیسا کہ ظاہر السیاق سے بھی معلوم ہوتا ہے، اور جہاں تک منافقین کا تعلق ہے یعنی عبداللہ بن ابی کے ساتھی، تو وہ واقعہ سے پہلے جبکہ ابھی جنگ شروع ہی نہ ہوئی تھی الگ تھلگ ہو گئے تھے، چنانچہ ان کے بارے میں بعد والی آیات مبارکہ میں مطالب ذکر کئے گئے ہیں منافقین سے ان کی مراد ضعیف الایمان افراد ہوں کہ جن کے عقائد ومتناقص افکار اور بے ربط خیالات کی بازگشت ان کے قلبی طور پر حق کے انکار اور زبان سے ظاہری طور پر اظہار کی طرف ہوتی ہے تو شاید بات درست بن جائے کہ یہ وہی افراد ہیں جن کے بارے میں خداوند عالم نے درج ذیل آیات میں انہیں بیمار دل کہہ کر ان کے بیانات ذکر کئے ہیں:

سورۂ انفال، آیت ۴۹:

- ''اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ''

(جب منافقین اور بیمار دل کہیں گے کہ انہیں ان کے دین نے دھوکہ دیا ہے)

اور انہیں جاسوس قرار دیتے ہوئے یوں فرمایا:

سورۂ توبہ، آیت ۴۷:

- ''وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ''

(اور تم میں ان کے جاسوس ہیں)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ منافقین سے ان کی مراد یہ ہو کہ تمام منافقین عبداللہ بن ابی کے ساتھ مدینہ واپس نہ گئے۔

ایک اور عجیب قول

مذکورہ بالا قول سے زیادہ تعجب آور قول یہ ہے کہ جو بعض مفسرین نے پیش کیا ہے کہ وہ لوگ مؤمنین ہی تھے اور وہ یہ سوچتے تھے کہ مدد ونصرت اور غلبہ وفتح کا معاملہ خود انہی کے ہاتھوں میں ہے اور انہی کا حق ہے کیونکہ وہ خدائی دین حق کے پیروکار ہیں۔ یہ سوچ اسی بناء پر ان کے دلوں میں پیدا ہوئی کہ انہوں نے جنگ بدر میں دیکھا کہ فرشتے ان کی مدد کے لئے آئے لہٰذا انہوں نے جنگ اُحد میں کہا: "هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ" (کیا ہمارے لئے کچھ نہیں؟) اور ان کا یہ کہنا "لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ" (اگر ہمارے لئے کچھ ہوتا........) اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے نہ کہ ان کے ہاتھ میں! ورنہ اگر معاملہ ان کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ اس طرح قتل نہ کئے جاتے۔

اس قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہو تو ان کے سوال کا وہ جواب درست نہیں بنتا جو خدا نے اپنے نبی ﷺ کے ذریعے دلوایا یعنی: "قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ" (کہہ دو کہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے) اور نہ ہی یہ بات: "قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ" (کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہی رہ جاتے.....) اسی وجہ سے اس قول کے قائل حضرات میں سے بعض اس مطلب کی طرف ملتفت ہوئے اور انہوں نے اس اعتراض واشکال کا جواب دینے کی کوشش میں جو اظہارات پیش کئے وہ اصل قول سے زیادہ نادرست ہیں، قارئین کرام! آپ اصل معنی جو کہ صحیح ودرست ہے اس سے آگاہ ہو چکے ہیں۔

روگردانی کرنے والوں کا ذکر

○ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ

(جو لوگ اس دن روگردانی کر گئے جس دن دو گروہ آمنے سامنے آ گئے انہیں شیطان نے ورغلایا ان کے بعض اعمال کی وجہ سے)۔

"اسْتَزَلَّهُمْ" میں استزلال کے شیطانی عمل سے مراد یہ ہے کہ اس نے انہیں پھسلانا و ورغلانا چاہا، راہ سے ہٹانے کی کوشش کی اور اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے باطن وظاہر میں کچھ انحرافات پیدا کر لئے تھے، اور گناہوں میں ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف بلاتے ہیں یعنی جب کوئی شخص کسی گناہ کا مرتکب ہو تو وہ گناہ اسے دوسرے گناہ کی راہ پر لے جاتا ہے کیونکہ گناہوں کی اصل بنیاد نفسانی خواہشوں کی پیروی ہے اور جب نفس میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہو جائے تو وہ اسے

اس جیسی دوسری چیز کی طرف بھی لے جاتی ہے اور اس کی خواہش کو جنم دیتی ہے۔

اور جہاں تک اس احتمال وامکانی رائے کا تعلق ہے کہ یہاں ''بِبَعْضِ'' میں حرف ب آلیت کا معنی دیتا ہے اور ''مَا كَسَبُوْا'' سے مراد ان کا میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیرنا ہے تو یہ احتمال بظاہر بعید نظر آتا ہے اور الفاظ کی ترتیب وترکیب سے اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ عبارت ''مَا كَسَبُوْا'' سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا کام تھا جو میدانِ جنگ سے ان کے فرار کرنے اور شیطان کے انہیں بہکانے سے پہلے تھا جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے (ان کے اس کئے کی بنیاد پر شیطان نے انہیں پھسلانا چاہا) کہ جس کی وجہ سے شیطان کو ان کے بہکانے وگمراہ کرنے کی جرأت ہوئی اور ان پر شیطان کا جادو چل گیا اور پھر وہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

بہر حال آیت کے ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض گناہوں کا ارتکاب کیا جس کی وجہ سے شیطان نے انہیں بہکانے وگمراہ کرنے کا موقع پالیا۔

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ احتمال بھی قرین قیاس نہیں جس کا تذکرہ بعض روایات میں ہوا ہے کہ یہ آیت اس شیطانی آوازہ کی طرف اشارہ کررہی ہے جو اُحد کے دن سنائی دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کردیا گیا ہے، کیونکہ اس مطلب پر آیت کے الفاظ سے کوئی اشاراتی ثبوت نہیں ملتا۔

خدا کی طرف سے عفو ودرگزر

○ ''وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ''

(خدا نے ان سے درگزر کرلیا، بے شک خدا معاف کرنے والا نہایت بُردبار ہے)

یہاں عفو ودرگزر کرنے کا تعلق ان لوگوں سے ہے جنہوں نے روگردانی کی (تَوَلَّوْا) ابتدائے آیت میں ان کا ذکر ہوا ہے۔ یہ آیت مطلق ہے۔ اس میں کسی خاص طبقہ کی طرف اشارہ نہیں۔ لہٰذا اس میں روگردانی کرنے والے تمام افراد شامل ہیں کہ جن سے درگزر کیا گیا، یعنی وہ دونوں گروہ کہ جن میں سے ایک کے بارے میں ارشاد ہوا کہ خدا نے ان پر اونگھ ڈال دی اور دوسرے وہ کہ جن کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ اپنے آپ میں گم ہوگئے (اپنی دنیاوی زندگی سے لطف اندوز ہونے میں کوشاں تھے کہ اسے بچاسکیں) جبکہ وہ دونوں گروہ کہ جن سے خدا نے عفو ودرگزر کیا۔ درجات ومراتب کے لحاظ سے فرق رکھتے تھے لہٰذا خداوند عالم نے انہیں معاف کردینے اور ان سے درگزر کرنے کی عنایت کے تذکرہ میں ان کے مرتبہ ومقام اور

درجہ وحیثیت کے حوالہ سے ان پر کرم نوازی کی تفصیل بیان نہیں کی اور پہلے گروہ کی خصوصیت کہ جن کی بناء پر اسے عفو ودرگزر سے نوازا گیا ذکر نہیں کی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں جس عفو کا تذکرہ ہوا ہے وہ اس عفو سے مختلف ہے جس کا ذکر پہلے ان الفاظ میں ہو چکا ہے: "وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ" (اور اس نے تم سے عفو ودرگزر کیا) اس کا ثبوت کہ دونوں عفو ودرگزر میں فرق پایا جاتا یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں انداز وروش اظہار مختلف ہے چنانچہ "وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ" اور "وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ" میں فرق واضح ہے، پہلی آیت میں کلام سے خدا کے فضل وکرم اور لطف وعنایت کا اشاراتی تذکرہ ہے، اور جن پر وہ عنایت نازل ہوئی انہیں "مؤمنین" سے موسوم کیا، پھر انہیں ایک غم کے بعد دوسرے غم میں مبتلا کر کے ان کے دلوں پر چھائے ہوئے حزن ودکھ کو ختم کرنے کو بیان کیا اور پھر ان پر امن کی اونگھ ڈال دی کہ وہ سکون حاصل کر سکیں۔

جبکہ دوسری آیت میں عفو ودرگزر کرنے کو ذکر کرنے کے بعد ان تمام عنایات کے تذکرہ سے خاموشی اختیار کی گئی جو پہلے گروہ کے افراد کو عطا ہوئیں، اور پھر بیان کو اپنے بردبار ہونے کے تذکرہ پر ختم کر دیا کہ جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا اور بردباری کی صفت کے ساتھ عفو ودرگزر کرنے کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اس نے فوراً انہیں سزا دینے کی بجائے اپنی ناراضگی کو اپنے اندر ہی پوشیدہ کر لیا ہے۔

اس مقام پر ممکن ہے کہ آپ پوچھیں کہ خداوند عالم نے دونوں گروہوں میں عفو کے حوالہ سے برابری قرار دی ہے تو کیا اس کا مطلب ان دونوں کا فضیلتوں میں برابر ہونا نہیں؟ میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ دونوں موارد میں مصداق کے لحاظ سے عفو کا معنی مختلف ہے اگرچہ مفہوم کے لحاظ سے سب پر اس کا اطلاق برابر ہوتا ہے اور یہ بات کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ عفو وبخشش اور اس طرح کے امور تمام موارد ومقامات میں ایک ہی جیسے ہیں اور ہر جگہ ان کے معانی یکساں ہوں، چنانچہ ہم اپنے سابقہ بیانات میں معانی کے مختلف ہونے کی وجہ بیان کر چکے ہیں۔

عفو وبخشش کا قرآنی معنیٰ

لفظ "عفو" کا معنی جیسا کہ مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے۔ اس کا استعمالی موارد کے تناظر میں یہ ہے کہ کسی چیز کو پانے اور لے لینے کے لئے اس کا قصد وارادہ کرنا، چنانچہ کہا جاتا ہے: "عفاہ، اعتفاہ" یعنی اس نے اس کا ارادہ کیا اور جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس سے لینے کا قصد کیا۔ اسی طرح جب کہا جاتا ہے: "عفت الریح الدار" یعنی ہوا نے گھر کا ارادہ کیا، تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے گھر کے آثار مٹا دینے کا ارادہ کر لیا، یہ ہے لغوی ماہر راغب کا بیان

(ملاحظہ ہو کتاب المفردات، صفحہ ۳۳۹)

اسی حوالہ سے جب یوں کہا جاتا ہے: ''عفت الدار'' تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ گھر پرانا ہو گیا، اس میں نہایت لطیف نکتہ ملحوظ ہے اور وہ یہ کہ گویا گھر نے اپنا ہی ارادہ کیا اور اپنے آثار اور ظاہری زیب و زینت کا قصد کیا اور اسے لے کر دیکھنے والوں کی آنکھوں سے پوشیدہ کر دیا، اسی لطیف ترین حوالہ کی بناء پر لفظ ''عفو'' کو خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ گویا خداوند عالم اپنے بندے کا ارادہ کرتا ہے (اس پر نظر عنایت کرتا ہے) اور اس سے اس کے گناہ لے لیتا ہے اور اسے گناہوں سے خالی کر دیتا ہے۔

اس بیان سے ظاہر و واضح ہوتا ہے کہ لفظ ''مغفرت'' کہ جس کا معنی چھپا دینا ہے ''عفو'' ہی کی فرع اور اس کا نتیجہ ہے کیونکہ گناہ پہلے لے لیا جاتا ہے پھر اس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے، چھپا دیا جاتا ہے کہ نہ تو گناہ، کرنے والا اسے دیکھ پاتا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس حوالہ سے آیتیں ملاحظہ ہوں:

- سورۂ بقرہ، آیت ''وَاعْفُ عَنَّا ۜ وَاغْفِرْ لَنَا''

(اور تو ہم سے عفو کر اور ہماری مغفرت فرما)۔

- سورۂ نساء آیت ۹۹:

''وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا''

(اور خدا ہے ہی عفو کرنے والا، مغفرت کرنے والا)

ان آیتوں میں پہلے عفو یعنی لے لینا اور پھر مغفرت یعنی چھپا دینا ذکر ہوا ہے۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی و فکری باریک بینی کی بناء پر عفو اور مغفرت اگرچہ دو مختلف امور ہیں بلکہ ان میں سے ایک دوسرے کی فرع و نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مصداقی طور پر دونوں ایک ہیں۔ یعنی وہ دونوں ایک ہی مورد و مقام میں استعمال ہوتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا معنی ایسا نہیں کہ اسے خداوند عالم کے ساتھ مختص و مخصوص قرار دیا جائے بلکہ ان کے معنی کے تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا استعمال غیر خدا کے لئے بھی درست و قرین صحت ہے، اس مطلب کی قرآنی دلیلیں ملاحظہ ہوں:

- سورۂ بقرہ آیت ۲۳۷:

''اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ''

(مگر یہ کہ وہ عفو کر دیں یا وہ شخص عفو کرے جس کے ہاتھ میں نکاح کا اختیار ہو)

اس آیت میں لفظ ''عفو'' مذکور ہے۔

○ سورۂ جاثیہ، آیت ۱۴

''قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ''

(کہہ دو ایمان والوں سے کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے)

اس آیت میں لفظ ''مغفرت'' ملحوظ ہے۔

اسی طرح خداوند کا ارشاد ہے: ''فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر'' (تو ان سے عفو و درگزر کر، اور ان کے لئے استغفار کر اور معاملات میں ان سے مشورہ کر.........) تو خداوند عالم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ لوگوں سے عفو کا کام لو، یعنی ان کی طرف سے نافرمانی پر ان کا مؤاخذہ نہ کرو اور ان پر سختی نہ کرو اور نہ ہی ان سے منہ پھیر لو، اور ان کے لئے استغفار کرو، اللہ سے ان کے ان امور میں مغفرت و بخشش طلب کرو جن میں انہوں نے تیری نافرمانی کے گناہ کا ارتکاب کر کے اپنے لئے عذاب کی راہ ہموار کر لی ہے۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عفو و مغفرت کا معنی صرف تشریعی و اخروی آثار میں محدود و منحصر نہیں۔ یعنی صرف یہ نہیں کہ ان دو لفظوں کا معنی صرف اخروی عذاب سے معافی کے موارد میں استعمال ہوتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں تکوینی، تشریعی، دنیاوی اور اخروی تمام آثار شامل ہیں چنانچہ اس کا ثبوت درج ذیل آیت مبارکہ میں پایا جاتا ہے:

○ سورۂ شوریٰ، آیت ۳۰

''وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ''

(تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ تمہارے کئے کا نتیجہ ہوتی ہے اور خدا تمہارے کثیر گناہوں سے عفو کرتا ہے)

اس آیت میں یقینی طور پر گناہوں کے دنیاوی آثار و نتائج شامل ہیں، اسی کی مانند ایک آیت یہ ہے:

○ سورۂ شوریٰ آیت ۵:

''وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ''

(اور فرشتے اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے ہیں اور روئے زمین پر رہنے والے ہر شخص کے لئے استغفار کرتے ہیں)

اس کے ظاہری معنی کے تناظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ طلب مغفرت گناہوں کے تمام آثار کی بابت ہے۔

اسی طرح حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ کا بیان ملاحظہ ہو جسے قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔

○ سورۂ اعراف، آیت ۲۳:

''رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ''

(اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اگر تو ہمیں مغفرت سے نہ نوازے اور ہم پر رحم نہ کرے تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے)

جبکہ یہ بات واضح ہے کہ حضرت آدمؑ وحواؑ کا اپنے اوپر "ظلم" کرنا خداوند عالم کے ارشادی حکم کی نافرمانی کے حوالہ سے تھا نہ کہ مولا کے طور پر صادر ہونے والے فرمان کی حکم عدولی کی بناء پر!

قرآنِ مجید کی کثیر آیات اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ خداوند عالم کا قرب اور معنوی نزدیکی اور بہشت کی نعمتوں سے لطف اندوز و بہرہ ور ہونا خدا کی طرف سے مغفرت و بخشش اور بندوں کی طرف سے توبہ کرنے کے نتیجہ میں ان کے دامن سے شرک و گناہوں کی غلاظت کے دور کئے جانے پر موقوف ہے، یعنی پہلے مغفرت حاصل ہو اور اگر توبہ کریں تو خدا ان کے گناہوں اور شرک کی گندگی سے انہیں پاک کر دے تو اس کے بعد وہ جنت کے مستحق اور خدا کا قرب پانے کے اہل ہوں گے۔ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

○ سورۂ مطففین، آیت ۱۴:

"کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ"

(ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے کئے کی گندگی آ گئی ہے)

○ سورۂ تغابن: آیت ۱۱:

"وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ"

(اور جو اللہ پر ایمان لائے تو وہ اس کے دل کو ہدایت عطا کرتا ہے)

بہرحال عفو و مغفرت ایک طرح سے رکاوٹیں دور کرنا اور منافی و متضاد چیزوں کو راستہ سے ہٹانا ہے، چنانچہ خداوند عالم نے ایمان اور اخروی ٹھکانہ کو "زندگی" اور ایمان کے آثار، اہل آخرت کے افعال و اعمال اور دنیاوی زندگی میں ان کی عملی کاوش و کردار کو "نور" سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

○ سورۂ انعام، آیت ۱۲۲:

"اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا"

(کیا وہ شخص کہ جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی قرار دی جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس شخص جیسا ہے جو اندھیروں میں گرا پڑا ہے کہ جن سے باہر آنے والا نہیں؟)

○ سورۂ عنکبوت، آیت ۶۴:

"وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ"

(اور بے شک آخرت کا ٹھکانہ ہی زندگی ہے)

بہرحال شرک موت اور گناہ و نافرمانی تاریکیاں ہیں، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

○ سورۂ نور، آیت ۴۰:

''اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُہَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَہٗ لَمْ یَکَدْ یَرٰىہَا ؕ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ''

(یا ایسے ہے جیسے گہرے دریا میں تاریکیاں، کہ جس پر موجوں پر موجیں چھائی ہوں کہ جن پر ایک دوسرے کے اوپر تاروتاریک بادل ہوں، اس حالت میں جب کوئی شخص اپنا ہاتھ باہر نکالے تو وہ اسے دیکھ نہیں سکتا، اور خداوند عالم نے جس کے لئے روشنی قرار نہ دی ہو اسے کوئی روشنی حاصل نہ ہوگی)

بنابراین مغفرت حقیقت میں موت اور تاریکی کو دور کرنا ہے اور موت صرف زندگی جو کہ ایمان ہے کے ذریعے دور ہوتی ہے اور تاریکی، روشنی جو کہ رحمت خداوندی ہے کہ ذریعے دور ہوتی ہے۔

لہٰذا کافر نہ تو حیات رکھتا ہے اور نہ ہی نور، اور جس مومن کو مغفرت حاصل ہو وہ حیات سے بھی بہرہ ور ہے اور نور سے بھی! اور وہ مومن جو ابھی گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے وہ زندہ تو ہے مگر اس کا نور کامل نہیں اور وہ مغفرت ہی کے ذریعے کمال تک پہنچ سکتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:۔

○ سورۂ تحریم، آیت ۸:

نُوْرُہُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَبِاَیْمَانِہِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا

(ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب تیزی سے چلتا ہے، وہ کہتے ہیں: پروردگار! ہمارا نور مکمل کردے اور ہماری مغفرت فرما!)

مذکورہ بالا تمام مطالب سے بظاہر معلوم ہوا کہ عفو و مغفرت کے مصداق کی نسبت جب خداوند عالم کے تکوینی امور کی طرف ہو تو اس سے وجود کا سبب لا کر اس کے مانع و رکاوٹ کو دور کرنا مراد ہے، جبکہ تشریعی امور میں اس سے مراد اس سبب کو دور کرنا ہے جو نرمی و رحم کی راہ میں رکاوٹ ہو اور سعادت و شقاوت کے مقامات میں ان رکاوٹوں و موانع کو دور کرنا مراد ہے جو سعادت کی راہ میں آڑے آئیں۔

آیات ۱۵۶ تا ۱۶۴

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۱۵۶﴾

○ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۱۵۷﴾

○ وَلَئِنْ مُتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿۱۵۸﴾

○ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۱۵۹﴾

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۶۰﴾

○ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۶۱﴾

○ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۶۲﴾

○ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶۳﴾

○ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ

○ ''اے اہل ایمان! تم کافروں جیسے نہ بنو کہ جو اپنے بھائیوں کے بارے میں کہ جو کہیں سفر پر جاتے ہیں یا جنگ و جہاد کے لیے میدان کو جاتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ ہی قتل کئے جاتے، یہ اس لئے ہے کہ خدا ان کے دلوں میں اس بات کو باعث حسرت قرار دے، اور اللہ ہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے، اور اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔''

(۱۵۶)

○ ''اور اگر تم خدا کی راہ میں قتل کر دیئے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی طرف سے مغفرت اور رحمت اس سے بہتر ہے جو وہ اکٹھا کرتے ہیں۔''

(۱۵۷)

○ ''اور اگر تم مر گئے یا قتل کئے گئے تو اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔''

(۱۵۸)

○ ''(اے میرے رسول!) یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان کے ساتھ نرم دلی کے ساتھ پیش آتے ہیں، اور اگر آپ تند خو، سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے اٹھ کر ادھر ادھر چلے جاتے، پس آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لئے استغفار کریں اور عام کاموں میں ان سے مشورہ کرلیا کریں پھر جب پختہ عزم کریں تو اللہ پر توکل کریں، یقیناً اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

(۱۵۹)

- ''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غلبہ نہیں پا سکتا، اور اگر وہ تم سے منہ موڑے تو پھر اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہے، اور اللہ ہی پر بھروسہ کریں مؤمنین!''

(۱۶۰)

- ''کسی نبی کو روا نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو شخص خیانت کرے وہ قیامت کے دن اسی چیز کے ساتھ آئے گا جو اس نے خیانت کی، پھر ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا حساب دیا جائے گا اور ان پر ظلم وزیادتی نہیں ہوگی۔''

(۱۶۱)

- ''کیا وہ شخص جو اللہ کی رضا کا اتباع کرتا ہو اس شخص جیسا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا حقدار ٹھہرا ہو اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے جو کہ نہایت برا ٹھکانہ ہے''

(۱۶۲)

- ''اللہ کے پاس ان کے درجات مختلف ہیں اور اللہ ان کے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔''

(۱۶۳)

- ''حق تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں پر احسان کیا ہے کہ ان میں ایک رسول خود انہی میں سے مبعوث فرمایا جو ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔''

(۱۶۴)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ جنگ احد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا نتیجہ ہے ان آیات میں ایک دوسرے مسئلہ کا تذکرہ ہوا ہے جو مسلمانوں کو درپیش ہوا اور وہ یہ کہ ان کے دلوں میں اپنے ساتھیوں اور بزرگانِ قوم کے قتل کئے جانے کا افسوس وحسرت اور غم واندوہ شدید صورت میں پیدا ہوا اور وہ ان کے مارے جانے پر بے حد غمزدہ ہو گئے، ان کے مارے جانے والوں میں اکثر افراد انصار میں سے تھے جبکہ مہاجرین کے مقتولین کی تعداد جیسا کہ بیان کیا گیا ہے چار سے زیادہ نہ تھی، اسی سے پتہ چلتا ہے کہ انصار کی طرف سے دشمن کا مقابلہ کرنے میں مقاومت و پائیداری کا عمل مہاجرین کی نسبت زیادہ تھا جبکہ مہاجرین زیادہ خوفزدہ ہوئے اور انصار سے پہلے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زیر بحث آیات مبارکہ مسلمانوں کی طرف سے اپنے مقتولین کے بارے میں افسوس واندوہ کے نتیجہ میں غلطی و بدحواسی کا جو مظاہرہ ہوا اسے بیان کرتی ہیں اور اس کے بعد ان کی اس بہت بڑی غلطی کا تذکرہ کرتی ہیں جو اس خوف ودکھ کے بعد ان سے سرزد ہوئی اور وہ یہ کہ انہوں نے حضرت رسول خدا ﷺ کے بارے میں سوء ظن کر لیا اور اپنے دلوں میں سوچنے لگے۔ بلکہ ایک دوسرے سے کہنے بھی لگے کہ رسول خدا ﷺ ہی ان کے اس حال کا سبب بنے ہیں اور انہی کی وجہ سے ہمیں مصیبت کی یہ گھڑیاں دیکھنی پڑی ہیں کہ ان کے افراد قتل کئے گئے اور انہیں شکست ہوئی۔

چنانچہ اس کا ثبوت ان کے یہ الفاظ ہیں: ''لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا'' (اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو قتل نہ کئے جاتے) اور منافقوں نے کہا: ''لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا'' (اگر وہ ہمارا کہنا مانتے تو قتل نہ کئے جاتے) ان کے ان اظہارات کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ رسول خدا ﷺ کی بات ماننے کی بجائے ہماری بات مانتے تو مارے نہ جاتے، یعنی رسول خدا ﷺ نے انہیں موت کے منہ میں ڈالا ہے کہ اگر وہ ان کے کہنے پر میدان میں نہ جاتے تو قتل نہ کئے جاتے۔

ان کے اس غلط و نادرست خیال و اظہار کے جواب میں زیر بحث آیات مبارکہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ خدا کا رسول ﷺ کسی سے خیانت نہیں کرتا کیونکہ یہ اس کی شان و مقام کے سراسر منافی ہے، وہ اللہ کے نمائندہ و

پیامبر ہیں، بزرگی و بزرگواری والے، پاکیزہ اصل و نسل کے حامل اور بلند پایہ اخلاق کے مالک ہیں، خدا کی رحمت سے نرم طبع رکھتے ہیں، خطا کاروں کو معاف کر دینے والے اور گنہگاروں کے لئے پروردگار کے حضور طلب مغفرت کرنے والے ہیں، خدا کے حکم کے مطابق لوگوں سے مشاورت کرتے ہیں اور اس طرح کا عظیم انسان بھیج کر خداوند عالم نے اپنے بندوں پر عنایت و مہربانی فرمائی ہے تاکہ انہیں گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی تک لے آئے اور اس مقصد کا ذریعہ و وسیلہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

اہل ایمان کو ناصحانہ فرمان

○ ''یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا.......''

(اے ایمان والو، کافروں کی طرح نہ ہو جاؤ........)

ایمان والوں کو حکم دیا گیا کہ وہ کافروں جیسے نہ ہو جائیں تو یہاں ''الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' (جنہوں نے کفر اختیار کیا) سے اصل کفار مراد ہیں نہ کہ منافقین، جن حضرات نے کہا ہے کہ ان سے منافقین مراد ہیں ان کی بات درست نہیں کیونکہ نفاق اس طرح کے اظہارات (اگر ہمارے ساتھ ہوتے تو قتل نہ کئے جاتے) کا سبب نہیں بنتا۔ اگرچہ منافقین اس طرح کی باتیں کرتے بھی ہیں لیکن ایسی باتیں کرنا کفر کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس طرح کے اظہارات کی نسبت منافقین کی طرف دینے کی بجائے کفار کی طرف دیجائے۔ جیسا کہ ان آیات میں ایسا ہی ہوا ہے۔

''اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ'' میں لفظ ''ضرب'' سفر کرنے سے کنایہ کے طور پر ہے۔

لفظ ''غُزًّی'' غازی کی جمع کا صیغہ ہے جس کا معنی سپاہی و جنگجو ہے۔ یہ لفظ اسی طرح سے ہے جیسے ''طالب'' سے طلب اور ضارب سے ضرب آتا ہے۔

جملہ ''لِیَجْعَلَ اللّٰہُ ذٰلِکَ حَسْرَۃً'' (تاکہ اللہ اسے حسرت قرار دے) کا معنی یہ ہے کہ خدا ان کے انہی اظہارات کو ان کے لئے باعث حسرت بنادے تاکہ ان پر عذاب نازل کرے، تو اس جملہ میں باعث و سبب اور مقدمہ کو مقصد و اصل غرض کی جگہ ذکر کیا گیا ہے (حسرت کو عذاب کی جگہ ذکر کیا گیا ہے جبکہ اصل غرض و مقصد عذاب کا بیان ہے)۔

جملہ ''وَاللّٰہُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ'' دراصل اس حقیقت الامر کو بیان کرتا ہے جس کی بابت کافروں نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر

کہا کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو قتل نہ کئے جاتے۔

لفظ "یُمِیۡتُ" میں موت طبعی موت اور قتل دونوں شامل ہیں کیونکہ جب یہ لفظ مطلق اور کسی قید و اضافت کے بغیر استعمال ہو تو اس سے دونوں ہی مراد ہوتے ہیں یعنی طبعی موت اور قتل!

جملہ "وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ" (اور اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے) جملہ "لَا تَكُوۡنُوۡا" میں مذکور نہی و ممانعت پر مبنی فرمان کی وجہ وعلت کو بیان کرتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے جو تم سے کہا کہ تم کافروں جیسے نہ بنو، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تمہارے ہر عمل سے آگاہ اور اسے بخوبی دیکھنے والا ہے۔

جملہ "مَا مَاتُوۡا وَ مَا قُتِلُوۡا....." میں موت کو قتل سے پہلے ذکر کیا گیا ہے تا کہ کلام کی ترتیب اور ادبی حوالہ سے اس کی ترکیب درست رہے (اسے لف ونشر مرتب کہا جاتا ہے) یعنی جملوں کی پیوستگی و ربط اور تقدم و تاخر کے حوالہ سے معانی میں ہم آہنگی کا حامل رہے اور مطلوب کی وضاحت بھی ہو جائے، چنانچہ یہاں ایسا ہی ہوا ہے کہ موت کو قتل سے پہلے اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ جملہ "اِذَا ضَرَبُوۡا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ كَانُوۡا غُزًّى" نشر کو لف سے ترتیبی ربط حاصل رہے، کیونکہ اس میں سفر کو پہلے جبکہ جنگ کو اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے اور عموماً سفر میں جو موت آتی ہے وہ طبعی موت ہوتی ہے اور میدانِ جنگ میں جو موت آتی ہے وہ قتل کہلاتی ہے، اور طبعی موت کو معمول کا واقعہ سمجھا جاتا ہے کہ جسے عادتاً غیر معمولی نہیں قرار دیا جاتا جبکہ قتل کو غیر معمولی چیز اور استثنائی عمل سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مالوف اور معمول کے واقعہ کو پہلے اور غیر معمولی چیز کو اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔

آیت مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان والوں کو نہی کی گئی ہے کہ وہ کافروں جیسے نہ بنیں کہ کہیں ان کی طرح اپنے شہر یا قوم سے دور طبعی موت مرنے والوں اور جنگ میں قتل کئے جانے والے اپنے عزیزوں وساتھیوں کے بارے میں کہنے لگیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ ہی قتل کئے جاتے (لَوۡ كَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَ مَا قُتِلُوۡا) کیونکہ اس طرح کی بات کرنا انسان کے دل کو مضطرب وعذاب میں مبتلا کر دیتا ہے اور خدا کی ناراضگی کا باعث بنتا ہے جو کہ ان کے دلوں میں حسرت واندوہ کے جنم لینے سے عبارت ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ کہ وہ جہالت و ناآگاہی کا نتیجہ بھی ہے کیونکہ ان کے ساتھ ہونے یا نہ ہونے کا تعلق زندگی وموت سے نہیں ____ یا زندگی کے عطا کرنے وموت دینے کا ان کے ساتھ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی ربط نہیں ____ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زندہ کرنا اور موت دینا ان امور میں سے ہیں جو خداوند عالم کی ذات سے مختص ومخصوص ہیں کوئی اس کا شریک نہیں، وہ یکتا ہے لہٰذا انہیں چاہیے کہ تقوائے الٰہی اختیار کریں اور کافروں کی طرح نہ بنیں کیونکہ اللہ اُن کے ہر عمل سے بخوبی آگاہ ہے۔

مغفرت رحمت خداوندی

○ ''وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ''

(اور اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو خدا کی طرف سے مغفرت اور رحمت اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں)

''مِّمَّا يَجْمَعُونَ'' (جو کچھ وہ جمع کرتے ہیں) کے الفاظ سے بظاہر مال و دولت اور اس سے مربوط چیزیں ہیں کہ جو دنیاوی زندگی کا بنیادی مقصد و مقصود ہوتی ہیں۔

یہاں اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے کو موت سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی راہ میں مارا جانا طبعی موت کی نسبت مغفرت سے زیادہ نزدیک ہے، اسی اہم نکتہ کی بنیاد پر اسے پہلے اور موت کو بعد میں ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اگلی آیت میں اس ترتیب کو الٹ دیا گیا اور موت کو قتل کئے جانے سے پہلے ذکر کیا گیا چنانچہ ارشاد ہوا: ''وَلَئِنْ مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُونَ'' (اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کئے جاؤ تو تم اللہ کی طرف ضرور اٹھائے جاؤ گے) اس کی وجہ اس اضافی نکتہ کا نہ ہونا ہے۔

خدا کی رحمت کا واضح اثر

○ ''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ............''

(پس اللہ کی رحمت کی وجہ سے تو ان پر نرمی کرتا ہے)

جملہ ''لَوْ كُنْتَ فَظًّا'' میں لفظ ''فظ'' کا معنی سخت دلی، تندروئی و بے رحمی ہے۔

''غَلِيظَ الْقَلْبِ'' دل میں نرمی نہ ہونے سے کنایہ ہے۔

''لَانْفَضُّوا'' سے مراد پراگندہ و بکھر جانا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں خطابی التفات معمول ہوا ہے اور وہ یوں کہ لوگوں سے خطاب کرتے کرتے خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کی طرف رخ موڑ دیا گیا، یعنی عام مسلمانوں سے بات کرنے کے لہجہ کو چھوڑ کر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات کرنے کا لہجہ اختیار کیا گیا۔ ادبی اصطلاح میں اسے ''التفات'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ آیت میں اصل مقصود معنی یہ ہے:

ہمارا رسول ہماری رحمت کی بناء پر تمہارے ساتھ نرمی کرتا ہے، اسی وجہ سے ہم نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ تم سے عفو و درگزر کرے اور تمہارے لئے طلب مغفرت کرے اور امور دنیا میں تم سے مشاورت کرے اور جب عزم و پختہ ارادہ کرلے تو ہم پر توکل و بھروسہ کرے۔

کلام میں ''التفات'' کا راز وہی مطلب ہے جو جنگ سے مربوط آیات میں ذکر ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ کلام میں عتاب و سرزنش کا رنگ دکھائی دیتا ہے لہٰذا جہاں ایسی صورت ہو وہاں محل و موقع کی مناسبت و موزونیت کے مطابق خداوند عالم لوگوں کی نافرمانیوں کے تذکرہ کو چھوڑ کر دوسرا موضوع بیان کرتا ہے۔ یہ مورد بھی انہی میں سے ایک ہے کہ جس میں ان کی ایک ایسی حالت کو بیان کیا جارہا تھا جس کا ربط اُن کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرنے سے تھا کیونکہ عین ممکن ہے کہ اُن کا اپنے ساتھیوں کے قتل کئے جانے پر حزن و ملال میں مُبتلا ہونا ہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل پر اعتراض و نکتہ چینی کا باعث ہوا ہو کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو اپنے ساتھیوں کے قتل کئے جانے اور اپنی بدبختی کا ذمہ دار ٹھہرانے لگے، اسی بناء پر خداوند عالم نے اُن سے بات کرنے سے روگردانی کر کے خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: ''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ'' کہ اللہ کی رحمت کی بناء پر تو اُن پر مہربانی و نرمی کرتا ہے۔

یہاں جملہ کی ابتداء میں حرف ''ف'' اس مطلب کی دلیل ہے کہ یہ کسی اس دوسری بات سے مربوط اور اس کا نتیجہ ہے جو لفظوں میں مذکور نہیں مگر سیاق کلام سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ بنا براین معنی کی وضاحت کے لئے کلام کو اس طرح فرض کرنا پڑے گا (واللہ اعلم): ''واذا كان حالهم ما تريه من الشباهة بالذين كفروا والتحسر على قتلاهم فبرحمة منا لنت لهم والّا لانفضوا من حولك'' (اور جب ان کا حال ایسا ہے کہ جو تو دیکھ رہا ہے کہ وہ کافروں کی باتوں جیسی باتیں کر رہے ہیں اور اپنے مقتولین پر غم و اندوہ کا اظہار کر رہے ہیں، پس یہ ہماری رحمت کا اثر ہے کہ تو ان پر نرمی کرتا ہے کیونکہ اگر تو ایسا نہ کرے تو یہ تیرے پاس سے متفرق و پراگندہ ہو جائیں گے)۔

جملہ ''فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ اور روش و کردار کی خدائی تصدیق کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے یعنی لوگوں کی غلطیوں اور زیادتیوں و نافرمانیوں سے عفو و درگزر کرتے تھے اور ان کے لئے بارگاہ الٰہی میں طلب مغفرت کرتے تھے اور امور دنیا میں ان سے مشاورت کرتے تھے چنانچہ اس دن (جنگ احد میں) بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کے امور میں ان سے مشاورت کی تھی، اس جملہ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر عمل خداوند عالم کے فرمان و دستور کے عین مطابق ہوتا ہے اور خدا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر عمل سے راضی ہے۔

اس جملہ میں خداوند عالم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ اُن سے عفو و درگزر کرے تا کہ ان کے اعمال پر معصیت و

نافرمانی کی مہر نہ لگ جائے اور ان کے لئے خدا سے طلب مغفرت کرے'' اور خدا سے چاہے کہ وہ انہیں معاف کردے کہ لامحالہ یہ کام خدا ہی کا ہے۔ البتہ آیت کے الفاظ ''وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ'' اگرچہ مطلق ہیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کی قیدو شرط نہیں ذکر ہوئی۔ یعنی اس میں یہ مذکور نہیں کہ کن امور میں ان کے لئے طلب مغفرت کرے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس میں شرعی حدود اور اس طرح کے موارد شامل نہیں کیونکہ اگر حدود وغیرہ بھی اسی میں شامل ہوں تو شریعت کے احکام اور ان پر مقرر کی گئی متعین سزائیں بے فائدہ عمل کہلائے گا۔ مثلاً اگر کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو اور اس کی مغفرت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا کردیں اور وہ بخشا جائے کہ جس کے بعد اس پر حد جاری نہ کی جاسکے تو اس سے شریعت کی تدوین اور احکام و دستورات کا نظام اپنی اہمیت ہی نہیں کھوئے گا بلکہ سرے سے اس کا وجود ہی بے مقصد ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عفو و مغفرت طلب کرنے کے خدائی حکم کے بعد جملہ ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' ہے کہ اس حوالہ سے اس کا عطف عفو و مغفرت کی طرف ہوتا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ یہ دونوں کام یعنی عفو و مغفرت کا تعلق انہی عمومی چیزوں سے ہے جن میں حاکمیت و تدبیر امور کے حوالہ سے افرادِ معاشرہ سے مشاورت کی گنجائش ہوتی ہے۔ ورنہ شرعی احکام و خدائی دستورات میں مشاورت معنی ہی نہیں رکھتی۔

خدا پر توکل کا حکم

○ ''فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ''
(پس جب تو عزم کرلے تو خدا پر بھروسہ کر، بے شک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

اس سے مراد یہ ہے کہ جب تو خدا پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے خدا کا محبوب بن جائے گا تو اس کے نتیجہ میں خدا تیرا حامی و مددگار ہوگا اور تجھے کسی سلسلہ میں شرمندگی و پریشانی اور رسوائی و ذلت سے دوچار نہ ہونے دے گا۔ اسی بناء پر اس کے بعد فوراً ارشاد فرمایا: ''إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ'' (اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غلبہ نہ پاسکے گا اور اگر وہ تمہیں رسوا کرے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرسکے!) پھر لوگوں کو خدا پر بھروسہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے اس کی جگہ اس کے سبب کو ذکر کردیا اور ارشاد ہوا: ''وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ'' (اور اللہ ہی پر توکل کریں ایمان والے) اس سے مراد یہ ہے کہ اہل ایمان چونکہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں لہٰذا اپنے اسی ایمان کی بناء پر کہ اس کے سوا کوئی اُن کا ناصر و مددگار نہیں اسی پر توکل و بھروسہ کریں۔

نبی کی ذات، گناہوں سے پاک!

○ ''وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ''
(نبی خیانت نہیں کرسکتا______نہیں کرتا)

''يَغُلَّ'' کا مصدر ''غل'' ہے جس کا معنی خیانت ہے، اسی سورۂ مبارکہ آل عمران کی آیت ۷۹ ''مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ'' کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ اس طرح کے طرز بیان سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نبی کی ذات کا ہر طرح کی برائی و غلطی اور گناہ سے پاک و منزہ ہونا بیان کیا جائے۔ بنا برایں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ نبی کی ذات و مقام اس سے بالاتر ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے خیانت و دھوکہ کا مرتکب ہو یا لوگوں سے خیانت کرے (کیونکہ نبی کا لوگوں سے خیانت کرنا بھی خدا ہی سے خیانت کرنے کے برابر ہے) اور یہ واضح ہے کہ خیانت کار شخص اپنی خیانت ہی کے ساتھ اپنے رب کے حضور پیش ہوگا پھر اس سے اس کے کئے کا پورا پورا حساب ہوگا اور اپنے کئے کی سزا پائے گا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ رسول خدا ﷺ کے بارے میں خیانت کی نسبت دینا نہایت ظالمانہ قیاس ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس طرح کا قیاس کسی بھی حوالہ سے قرین صحت نہیں ہوسکتا کیونکہ آنحضرت ﷺ اور عام بندوں کے درمیان واضح و بڑا فرق پایا جاتا ہے اور نبی ﷺ کا مقام و منزلت خدائی نسبت کا حامل ہے اور وہ سراپا اطاعت گزار اور خداوند عالم کی رضا و خوشنودی کے عین مطابق عمل کرنے والا ہے، وہ خدا کی رضا کے دائرہ سے باہر قدم ہی نہیں رکھتا جبکہ خیانت کار خدا کی ناراضگی میں گھرا ہوا ہوتا ہے اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے جو کہ نہایت بُرا ٹھکانہ ہے، یہی بات اس جملہ میں مقصود ہے: ''اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ'' (کیا وہ شخص جو رضائے الٰہی کی پیروی کرے اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کی ناراضگی میں گھرا ہوا ہے)

یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں مؤمنین کو متنبہ و خبردار اور آگاہ کرنا مقصود ہو کہ اس طرح کے حالات خدا کی ناراضگی کا باعث ہیں اور اللہ ان نصیحتوں کے ذریعے تمہیں اپنی رضا و خوشنودی کی طرف دعوت دیتا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ خدا کی رضا و خوشنودی اور اس کی ناراضگی دونوں برابر نہیں۔

پھر اس بات کو بیان کیا کہ خدا کی رضا کی پیروی کرنے والوں اور اس کی ناراضگی میں گھرے ہوئے لوگوں کے بھی مختلف درجات ہیں۔ یعنی خود ان میں بھی مختلف درجات کے حامل افراد پائے جاتے ہیں سب کے سب برابر نہیں۔ خدا تمام اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔ لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ تم گمان کرنے لگو کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا نیک کام یا برا عمل اس کی نگاہ سے

ہٹ جائے اور وہ اس سے غفلت کا شکار ہو جائے اور اس خیال سے تم اس کی رضا کی پیروی یا ناراضگی کا باعث بننے والے اعمال کی بابت بے پرواہی سے کام لو!

مؤمنین پر خدا کا احسان

○ ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ''

(خدا نے ایمان والوں پر احسان کیا ہے ....)

اس آیت مبارکہ میں بھی التفاتی اندازِ سخن اختیار کیا گیا ہے اور وہ یوں کہ مؤمنین سے مخاطب کے لہجہ میں بات کرنے کے جاری سلسلہ کو چھوڑ کر ایک بار پھر غائب سے خطاب کا انداز اختیار کیا گیا ہے اس طرح کے موارد کی عمومی وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے اور یہاں بالخصوص ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں خداوند عالم مؤمنین پر اپنے احسان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی توجہات اس امر کی طرف مبذول کروا رہا ہے کہ یہ احسان ان کی صفت، ایمان کی بناء پر ہے، اسی لئے لفظ ''مؤمنین'' جو کہ صفت ہے کے ذریعے اپنے احسان کا تذکرہ کرتے ہوئے خدا نے ارشاد فرمایا: ''عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ''(مؤمنین پر) کیونکہ یہاں صفت کے علاوہ کسی دوسرے صیغہ و انداز میں احسان کی بات درست نہ بنتی تھی بلکہ اگر ''مؤمنین'' کی بجائے ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' بھی کہا جاتا تب بھی مقصود حاصل نہ ہوتا کیونکہ علماء ادب نے بھی کہا ہے کہ صفت ہی سے علت اور اصل وجہ و سبب سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے یا یہ کہ وہ اس طرح کے بیانی اظہار کا کامل ذریعہ ہے۔ بہر حال آیت کا معنی و مقصود واضح و روشن ہے۔

اس آیت کے حوالہ سے متعدد دیگر بحثیں بھی موجود ہیں کہ ان میں سے بعض کا تذکرہ عنقریب موزوں و مناسب موارد و مقامات میں کیا جائے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

آیات ۱۶۵ تا ۱۷۱

○ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾

○ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٦٦﴾ ۙ

○ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿١٦٧﴾ ج

○ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٦٨﴾

○ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿١٦٩﴾ ۙ

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١٧٠﴾ ۘ

○ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٧١﴾ ج

ترجمہ

○ ''اور کیا جب تم پر مصیبت (شکست) آپڑی جبکہ تم اس سے دگنی مصیبت (دوبار شکست) مدمقابل (کافروں) پر ڈال چکے تھے تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آئی ہے، کہہ دو وہ خود تمہاری اپنی طرف سے آئی ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

(۱۶۵)

○ ''اور جو مصیبت تم پر اس دن آئی جب دونوں لشکر آمنے سامنے آگئے تھے (اُحد کے دن) تو اذنِ الٰہی سے تھی اور اس لئے کہ اللہ مؤمنین کو جان لے (پرکھ لے)۔''

(۱۶۶)

○ ''اور ان لوگوں کو جان لے کہ جنہوں نے نفاق سے کام لیا کہ جب ان سے کہا گیا کہ آؤ، اللہ کی راہ میں قتال کرو یا دشمن کو پچھاڑ دو، تو وہ کہنے لگے کہ اگر ہم قتال کرنا جانتے تو ضرور تمہارے ساتھ چل پڑتے، وہ اس دن ایمان کی بجائے کافروں سے زیادہ نزدیک تھے، وہ اپنی زبانوں سے جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کے دلوں میں نہیں ہوتا، اور اللہ اس سے بخوبی آگاہ ہے جو وہ چھپاتے ہیں۔''

(۱۶۷)

○ ''وہ اپنے بھائیوں کے بارے میں خود گھر بیٹھے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو وہ نہ مارے جاتے، ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو دور ہٹا کر دکھاؤ۔''

(۱۶۸)

○ ''اور ان لوگوں کے بارے میں کہ جو اللہ کی راہ میں قتل کیئے جائیں یہ گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس انہیں رزق دیا جاتا ہے۔۔''

(۱۶۹)

○ ''وہ اللہ کے دیئے گئے فضل وعنایت سے بہت خوش ہیں اور جو لوگ ابھی ان سے ملحق نہیں ہوئے ان کے بارے میں بھی خوش ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی خوف لاحق نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔''

(۱۷۰)

○ ''وہ اللہ کی نعمت اور فضل وکرم سے خوش ہوتے ہیں اور یہ کہ اللہ مؤمنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

(۱۷۱)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ جنگ احد کے بارے میں نازل ہونے والی مخصوص آیات کا تتمہ ہے، ان میں ان چند منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جنہوں نے مدینہ سے احد کی طرف روانہ ہوتے وقت مؤمنین کو تنہا چھوڑ دیا تھا، ان آیات میں منافقوں کی اس بات کا جواب بھی مذکور ہے جو انہوں نے اپنے مقتولین کے بارے میں کہی تھی، اوران آیات میں ان شہداء کا تذکرہ بھی ہے جنہوں نے حق کی راہ میں اپنی جانیں قربان کیں کہ وہ شہادت پانے کے بعد خداوند عالم کے قرب وتقرب کی نعمت سے بہرہ ور ہیں اور اپنے پیچھے رہنے والوں کو خوشخبری دیتے ہیں کہ اسی طرح کا مقام ومنزلت ان کے لئے بھی ہے۔

مصیبت کا اصل سبب

○ ''اَوَلَمَّآ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا.........''

(کیا جب بھی تمہیں مصیبت لاحق ہوئی تو اس سے دگنی تم وارد کر چکے ہو..........)

جب مؤمنین کو نہی کر دی کہ وہ کافروں کی طرح بن کر اپنے مقتولین کے بارے میں غمگین وافسردہ ہوں کیونکہ زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے نہ کہ ان کے ہاتھ میں ہے کہ جس کی بناء پر وہ یہ کہیں کہ اگر ہمارے پاس ہوتے تو مارے جانے سے بچ جاتے یا یہ کہ جنگ ہی کو نہ جاتے تو بچ جاتے، تو اس نہی کے بعد ایک مرتبہ پھر ان کے کئے کے نزدیک ترین سبب کو بیان کیا تا کہ اس مطلب کی طرف توجہ دلائی جا سکے کہ دنیا میں سب کچھ نظام الاسباب سے وابستہ ہے لہٰذا ارشاد ہوا کہ ان پر جو مصیبت آئی اس کا سبب سپاہیوں کی نافرمانی تھی جس کا ارتکاب انہوں نے جنگ احد کے دن کیا کہ وہ اپنے ٹھکانوں و مورچوں کو خالی چھوڑ کر باہر نکل گئے اور ایک سبب یہ ہے کہ وہ اپنے مورچوں اور ٹھکانوں سے نکل کر میدانِ جنگ ہی سے بھاگ گئے اور روگردانی کر لی، خلاصہ یہ ہے کہ ان پر جو مصیبت آئی اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ ان

کے قائد ورہبر تھے کے حکم کی نافرمانی کی جس کے نتیجہ میں انہیں شکست سے دو چار ہونا پڑا اور وہ دشمنوں کے سامنے ذلیل وخوار ہوئے، تو یہ سب کچھ عالم ہستی میں جاری نظام الاسباب کی بناء پر ہوا،

بنا برایں آیت مبارکہ کا معنی ومفہوم یوں ہوگا کہ آیا تمہیں معلوم ہے کہ جو مصیبت تم پر آئی ہے اس سے دگنی مصیبت (جنگ بدر میں) تم ان پر ڈال چکے ہو؟ (اس جنگ میں تمہارے ستر آدمی مارے گئے ہیں جبکہ اس سے پہلے جنگ بدر میں تم نے ان کے ستر افراد مارے اور ستر افراد کو قیدی بنایا) تم پر جو مصیبت آئی اس کا سبب تم خود تھے اور وہ اس طرح کہ تم نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی فتح وکامیابی کا راستہ بند کر دیا کیونکہ تم نے اپنے قائد و پیشوا کی نافرمانی کی اور بزدلی و باہمی نزاع واختلاف کا شکار ہو گئے)

آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے مصیبت کا تذکرہ اس انداز میں کیا کہ فریقین پر آنے والی مصیبت کے تقابلی جائزہ میں صورتحال ''اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْہَا'' (تم پر مصیبت آئی جبکہ تم نے اس سے دگنی مصیبت ڈالی) اس میں اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ کفار نے تم پر اُحد کے دن جو مصیبت ڈالی یعنی تمہارے ستر (۷۰) آدمی قتل کئے اس سے پہلے تم ان پر اس سے دگنی مصیبت ڈال چکے ہو اور وہ یہ کہ تم نے جنگ بدر میں ان کے ستر افراد کو موت کے گھاٹ اتارا اور یہ ان ستر آدمیوں کی تعداد کے برابر تھا اور ستر افراد کو قید کیا جو کہ اضافی مصیبت تھی۔

اس طرح تقابلی بیان میں مؤمنین کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچانا اور ان پر جو مصیبت آئی ہے اس کی شدت کو کم کرنا مقصود ومطلوب ہے کیونکہ انہیں دشمنوں کی طرف سے جو تکلیف پہنچی وہ اس تکلیف سے آدھی تھی۔ جو انہوں نے بدر کے دن انہیں پہنچائی یعنی ستر افراد کو قتل اور اتنی ہی تعداد میں قید کئے لہٰذا اب انہیں اس مصیبت پر زیادہ غمگین و پریشان نہیں ہونا چاہیے جو ان پر آئی ہے اور نہ ہی جزع فزع اور فریادیں کرنی چاہئیں۔

آیت مبارکہ کے معنی کی بابت ایک قول یہ ہے کہ ''اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ'' سے مراد یہ ہے کہ تم نے خود ہی اسے اختیار کیا ہے اور وہ اس طرح کہ جنگ بدر میں تمہیں اختیار حاصل تھا کہ تم یا تو قیدیوں کو قتل کر دو یا فدیہ لے لو۔ جبکہ ان کے بارے میں خدا کا حکم یہ تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے اور فدیہ کی بابت یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ اگر تم فدیہ لے لو تو آئندہ جنگ میں اسی تعداد کے برابر تمہارے آدمیوں کو قتل کر دیا جائے گا، تو تم نے اس شرط کو قبول کرتے ہوئے فدیہ وصول کرنے کو اختیار کیا اور کہا کہ اب ہم ان سے فدیہ لے لیتے ہیں اور اس سے خوب مزے اڑاتے ہیں اور بعد میں جب ہمارے آدمی مارے گئے تو وہ درجۂ شہادت پر فائز ہو جائیں گے۔

اس قول کی تائید بلکہ ثبوت آیت کا ذیلی جملہ ہے جس میں ارشاد ہوا: ''اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' (یقیناً خدا ہر چیز پر قادر ہے) یہ جملہ سابقہ ذکر شدہ مطالب سے زیادہ موزونیت نہیں رکھتا البتہ مؤخر الذکر قول سے ہم آہنگی کا حامل ضرور ہے، اس طرح اس کا معنی یہ ہوگا کہ یہ مصیبت جو ہم پر آئی ہے اس کی وجہ وہ بات ہے جس کا تم نے جنگِ بدر میں ان سے معاہدہ کیا تھا ورنہ خدا اس مصیبت کو تم سے دور کر سکتا تھا کیونکہ وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔

جنگ اُحد کا اشاراتی تذکرہ

○ ''وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ......''

(اورتم پر جو مصیبت اس دن آئی جب فریقین ایک دوسرے سے آمنے سامنے تھے)

پہلی آیت سے جملہ ''اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' کی مانند مذکورہ بالا قول کی تائید ہوتی ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ جملہ ''قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ تم نے اس مصیبت کو خود ہی اختیار کیا ہے اور وہ اس طرح کہ تم نے جنگ بدر میں فدیہ وصول کیا اور جس شرط کو قبول کیا وہ بھی تم جانتے ہو کہ خدا کے لئے تم نے کون سی شرط مان لی تھی، تو اب جو مصیبت تم پر آئی ہے وہ اذنِ خدا کے ساتھ (خدا کے مقررہ نظام الاسباب کی بنیاد پر) ہے اور جہاں تک پہلے بیان و سبب کا تعلق ہے کہ اس مصیبت کی وجہ سپاہیوں کا اپنے ٹھکانے خالی چھوڑنا اور قائد و پیشوا کی حکم عدولی ہے تو یہ اس لئے قرین صحت نہیں لگتی کہ اس میں اور مصیبت کے اللہ کے اذن کے ساتھ آنے میں ربط نظر نہیں آتا۔ اور یہ ایک واضح حقیقت ہے۔

بنابرایں جو مطالب ہم ذکر کر چکے ہیں اس کی بنیاد پر مصیبت کے آنے کو اذنِ خداوندی سے مربوط و منسوب قرار دینا جملہ ''هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ'' کے وضاحتی بیان کی طرح ہو جائے گا اور جملہ ''وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا'' کو اس کے ساتھ ملانے میں مقدمہ کی حیثیت کا حامل ہوگا کیونکہ اس جملہ کو ساتھ ملانے سے منافقوں کی حالت بیان کرنے اور ان کے اظہارات اور ان کے جواب میں موت و زندگی کے خدا کے ہاتھ میں ہونے کی بابت تمام صورتحال واضح ہو جانے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

جملہ ''اَوِادْفَعُوْا......'' کا معنی یہ ہے کہ اگر تم اللہ کی راہ میں قتال نہیں کرتے تو کم از کم اپنی عزت و ناموس اور اپنی جانوں کا دفاع کرو۔

جملہ ''هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ'' (آج وہ ایمان سے زیادہ کفر سے نزدیک تر ہیں) میں حرف لامؔ حرف ''الیٰ'' کے معنی میں ہے، تو یہ ہے کہ ان کا حال کفر کے حوالہ سے، اور جہاں تک ان کے نفاق کا تعلق ہے تو وہ اپنے عمل ہی کے حوالہ سے اس میں مبتلا ہو گئے۔

جملہ ''يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ'' (اور وہ اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتا) یہاں لفظ ''افواہ'' سے جو کہ ''فوہ'' سے جمع کا صیغہ ہے۔ تاکید کے لئے ذکر ہوا ہے۔ یعنی اس مطلب کے تاکیدی بیان کیلئے ذکر ہوا ہے کہ انہوں نے جو کہا وہ ان کی زبانی کلامی بات ہے جس کا ان کے دلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اس کے یہاں ذکر کرنے سے منہ اور دل کے درمیان تقابل کا تذکرہ بھی مقصود ہے۔ اور یہ مطلب بیان ہو کہ زبان اور دل دو متقابل چیزیں ہیں۔

منافقین کے اظہارات کا حوالہ

○ ''اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا''

(جنہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا اور خود بیٹھے رہے کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو مارے نہ جاتے)

یہاں ''بھائیوں'' سے مراد ان کے نسبی یعنی رشتہ کے بھائی ہیں کہ جو جنگ میں قتل کئے گئے، ''بھائیوں'' کا لفظ استعمال کرنے میں یہاں ان کی سرزنش اور مذمت میں شدت کا اظہار مقصود ہے کہ انہوں نے اپنے ہی بھائیوں کی مدد کرنے اور ان کا ساتھ دینے میں کوتاہی سے کام لیا اور اپنے گھروں میں بیٹھے رہے جس کی وجہ سے ان کے بھائی اس صورتحال سے دوچار ہوئے چنانچہ جملہ ''وَقَعَدُوْا'' اسی غرض کے لئے ہے، جملہ ''قُلْ فَادْرَءُوْا'' ان کی اسی بات کا جواب ہے جس میں انہوں نے کہا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے لفظ ''درء'' کہ جو فعل ''ادرؤا'' کا مصدر کا ہے معنی روکنا، دور کرنا ہے۔

خدا کی راہ میں مارے جانے والے

○ ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا''

(اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کے بارے میں گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں......)

اس آیت مبارکہ میں مؤمنین سے جاری سلسلۂ گفتگو کو چھوڑ کر حضرت رسول خدا ﷺ سے خطاب کا انداز اختیار کیا گیا کہ جسے ادبی اصطلاح میں ''التفات'' کہتے ہیں اور اس کی بابت ہم سابقہ موضوعات میں اشارہ کر چکے ہیں اور اس کے اسباب وعوامل پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہاں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس آیت میں جو خطاب ہوا ہے وہ جملہ ''فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ'' (پس تم اپنے آپ سے موت کو دور کرو اگر تم سچے ہو) کا تتمہ ہو۔

موت سے مراد شعور وفعل یعنی قوت فکر وعمل کا ختم ہوجانا ہے۔ اسی بناء پر ان دونوں یعنی شعور وعمل کے اشاراتی تذکرہ میں ارشاد ہوا: ''بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ'' (بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس رزق پاتے ہیں) رزق پانا عمل جبکہ فرح وسرور کا احساس شعور سے تعلق رکھتا ہے اور ان دونوں کا سرچشمہ شعوری قوت ہے۔

خدا کی عنایتوں پر شادمانی

○ ''فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ........''

(وہ اس پر خوش ہیں جو خدا نے انہیں عطا کیا..........)

''فرح''(خوشی) بمقابل ''حزن''(غم) ہے۔

''بشارت اور بشریٰ'' سے مراد ہے ہر وہ خبر ہے جو خوشی لائے۔

''استبشار'' کا معنی خوشی و بشارت طلب کرنا ہے۔یعنی خوشخبری کے ذریعے مسرت پانا۔

آیت مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے پاس موجود خدائی فضل وعنایت کی وجہ سے بہت خوش ہیں اور وہ اس خبر کے ملنے کے آرزومند ہیں کہ جو ان کے پیچھے رہ گئے ہیں کہ انہیں کوئی خوف وغم لاحق نہیں۔

اس سے دو اہم نکتے واضح ہوتے ہیں: (۱) خدا کی راہ میں مارے جانے والے، ان نیک وصالح مؤمنین کے بارے میں مطلع و باخبر ہوتے ہیں جو ان کے پیچھے دنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔(۲) یہ خوشخبری و بشارت مؤمنین کے اعمال کی جزا وثواب ہے اور وہ یہ کہ انہیں کوئی خوف لاحق نہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہیں۔اور یہ بشارت انہیں اسی مقام پر دکھائی دیتی ہے جس میں وہ قیام پذیر ہیں کیونکہ وہاں ان کا کام مشاہدہ ہے استدلال نہیں، یعنی وہ اپنے پروردگار کے حضور اپنی جزاء واجر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔نہ یہ کہ شہادت پانے کے بعد اس کے بارے میں دلیلیں پیش کرتے ہوں۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا سے جانے یعنی مرنے کے بعد قیامت تک باقی و زندہ ہے۔اس موضوع یعنی برزخ کی زندگی کے بارے میں ہم سورۂ بقرہ آیت ۱۵۴ (وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ) کی تفسیر میں تفصیلی طور پر مطالب بیان کر چکے ہیں۔

خدا کی نعمتوں پر خوشی

○ ''یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ........''

(وہ اللہ کی نعمتوں اور فضل سے خوش ہوتے ہیں........)

اس آیت مبارکہ میں ''استبشار''(طلب بشارت کرنا) کا معنی وسیع ہے اور اس میں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے (دونوں) استبشار شامل ہیں یعنی ایسا نہیں کہ صرف اپنے بازماندگان کے لئے خوشی و بشارت کے خواہاں ہوں بلکہ ان کے

ساتھ ساتھ خود اپنے لئے بھی استبشار کرتے ہیں چنانچہ اس کا ثبوت جملہ "وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ" (اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا) ہے کیونکہ اس میں اطلاق پایا جاتا ہے جس کی بناء پر اسے تمام اہل ایمان کے لئے قرار دیا جا سکتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ "استبشار" اور "فضل" کے الفاظ مکرر ذکر کئے گئے ہیں آیت ۱۷۰ میں ارشاد ہوا: "فَرِحِيۡنَ بِمَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۙ وَيَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ......" (وہ خوش ہیں، اس سے جو خدا نے انہیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے اور وہ بشارت طلب کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو ابھی ان سے ملحق نہیں ہوئے)۔

اور آیت ۱۷۱ میں دوبارہ انہی مطالب کو ان الفاظ میں ذکر کیا: "يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ......" (وہ اللہ کی نعمت اور فضل کی بشارت طلب کرتے ہیں......) تو یکے بعد دیگرے ان آیات میں استبشار اور فضل دونوں کو ذکر کیا گیا ہے۔

بہر حال آیت کے مضمون اور معنی و مفہوم کے بارے میں مزید غور کریں۔ اس آیت میں نعمت اور فضل کو نکرہ کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے جبکہ پہلی آیات میں "رزق" کو مبہم وغیر واضح صورت میں ذکر کیا گیا تھا، اس کا مقصد یہ ہے کہ سامع کے ذہن کو ان سب کے بارے میں ان کی انتہائی ممکنہ حد تک متوجہ کیا جائے یعنی وہ نعمت، فضل اور رزق کی بابت ان کے وسیع و کمالی درجہ تک کا تصور کرے، اسی وجہ سے خوف و حزن کو بھی مبہم صورت میں ذکر کیا (اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ) یعنی اس کی کیفیت و نوعیت اور شدت وغیرہ کا حوالہ نہیں دیا تاکہ جاری سلسلۂ کلام کے سیاق و انداز کے تناظر میں اس سے عمومیت کے مقصود ہونے کا ثبوت مل سکے۔

مذکورہ بالا آیات میں بخوبی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چار چیزوں کا بیان مقصود ہے:

(۱) مؤمنین کا اجر و ثواب۔

(۲) وہ اجر اللہ کے پاس ان کا رزق ہے۔

(۳) وہ رزق اللہ کی طرف سے نعمت اور فضل ہے۔

(۴) اس نعمت و فضل کی پہچان یہ ہے کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

یہ جملہ یعنی "اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ" نہایت عجیب و شگفت انگیز ہے، اس میں جس قدر غور و فکر کریں اس کے معنی کی عظمت و لطافت اور مقصود و مفہوم کے بیان و اظہار کی شستگی و شایستگی سے آگاہی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو اس کے معنی کے حوالہ سے ذہن میں آتی ہے وہ ہر طرح کے خوف و حزن کا مؤمنین سے دور کر دیا جانا ہے اور خوف کا سبب وہ چیز یا کام ہوتا ہے جس کا وجود میں آنا دائرہ امکان میں ہو اور اس کا احتمال بھی ہو کہ وہ وجود پذیر ہو جائے گا کہ اس کے وجود میں آنے سے انسان اس سعادت و خوشبختی سے محروم ہوگا جس سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت و اہلیت اس میں پائی جاتی ہے۔ یہی حال "حزن" کا ہے کہ وہ بھی اسی واقعہ کے نتیجہ میں ہوتا ہے جو ناپسندیدہ صورتحال کے باعث مطلوبہ و متوقع سعادت سے محرومی لاتا ہے۔ بنابرایں کوئی بھی مصیبت یا مشکل ہو اس سے خوف کا لاحق ہونا اس کے آنے سے پہلے تک قابل تصور ہے لیکن جب وہ آپڑے تو پھر خوف بے معنی ہو جاتا ہے اور اس کے آنے سے پہلے حزن و غم بھی نہیں ہوتا۔ بنابرایں مطلق

خوف کا انسان سے دور ہوجانا اسی صورت میں تصور میں آتا ہے جب موجودہ نعمتوں میں سے کسی کے زوال پذیر ہونے کا خطرہ لاحق نہ ہو، اسی طرح مطلق حزن کا دور ہونا بھی اسی صورت میں قابل تصور ہے جب کسی بھی سعادت آفرین نعمت سے محرومی نہ ہو، نہ حاصل ہونے سے پہلے اور نہ ہی حاصل ہونے کے بعد! تو خدا کی طرف سے مطلق خوف اور مطلق حزن کے دور کئے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ انسان کو وہ سب کچھ عطا کردے جس سے وہ بہرہ ور اور لطف اندوز ہو اور اس سے استفادہ کرسکے اور ان خدادادنعمتوں میں سے کوئی بھی زوال پذیری کے خطرہ سے دوچار نہ ہو۔ اسی کو سعادت کا انسان کے لئے ہمیشہ ودائمی ہونا اور انسان کا ہمیشہ ودائمی طور پر اس سعادت سے بہرہ ور ہونا کہتے ہیں۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ خوف اور حزن کا نہ ہونا بعینہٖ انسان کا اللہ کے پاس رزق کھانا ہے اور اسی کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ" (اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے) سورۂ آل عمران، آیت ۱۹۸، "وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ" (اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے) سورۂ نحل، آیت ۹۶۔ ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والی نعمت ہے کہ نہ تو کوئی نعمت اس پر وارد ہوسکتی ہے اور نہ ہی فناء ونابودی اسے لاحق ہوسکتی ہے۔

اسی طرح یہ مطلب بھی واضح وآشکار ہوجاتا ہے کہ خوف اور حزن کی نفی درحقیقت نعمت وفضل کا اثبات ہے جو کہ عطیۂ خداوندی ہے لیکن ابتدائے کتاب میں بیان ہوچکا ہے اور سورۂ نساء کی آیت ۶۹ (مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ) کی تفسیر میں بیان ہوگا کہ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ نعمت استعمال ہوا اس کا معنی ومراد ولایت الٰہیہ ہے، اس بناء پر آیت مبارکہ کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے امور کا سرپرست ہے اور انہیں اپنی طرف سے عطیہ وعنایت سے خصوصیت کے ساتھ نوازتا ہے۔

اس مقام پر ایک احتمال یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ آیت میں لفظ "فضل" سے مراد وہ عنایت ہے جو عمل پر حاصل ہونے والے استحقاق پر اضافی صورت میں ہو (جسے اردو زبان میں "انعام" کہا جاتا ہے) اور "نعمت" سے مراد عمل پر دیا جانے والا اجر ہے لیکن یہ احتمال آیت کے جملہ "وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ" (اور اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا) سے ہم آہنگی وہم رنگی نہیں رکھتا کیونکہ اجر استحقاق ہی پر لیا جاتا ہے، اور آپ قارئین کرام اس مطلب سے بخوبی آگاہ ہوچکے ہیں کہ یہ جملے یعنی "عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" (وہ اپنے پروردگار کے پاس روزی پاتے ہیں) اور "فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ" (وہ اس سے خوش ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کیا) اور "يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" (وہ اللہ کی نعمت پر شاداں ہیں) ایک ہی حقیقت کے ترجمان ہیں اور ان سب کی بازگشت ایک ہی مطلب کی طرف ہوتی ہے۔

اس لئے ان موارد میں فضل اور نعمت کے درمیان فرق کا نظریہ صحیح نہیں۔

بہرحال ان آیات میں دیگر بحثوں کی گنجائش بھی موجود ہے اور ان سے دیگر موضوعات بھی زیر بحث لائے جاسکتے ہیں کہ جن میں سے بعض بحثیں آیۂ مبارکہ "وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ" (اور تم ان لوگوں کو مردہ نہ کہو جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں) سورۂ بقرہ آیت ۱۵۴، کی تفسیر میں پیش کی جاچکی ہیں اور شاید اللہ توفیق دے تو ہم ان کی بابت مزید مطالب آگے آنے والے موارد میں تفصیل کے ساتھ پیش کرسکیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ

آیات ۱۷۲ تا ۱۷۵

○ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾

○ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

○ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

○ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

ترجمہ

○ انہوں نے خدا اور رسول کی دعوت پر لبیک کہا جبکہ وہ رنج ودکھ سے دوچار ہو چکے تھے، ان میں سے جن افراد نے نیک عمل کیا اور تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے اجرِ عظیم ہے

(۱۷۲)

○ انہیں جب بعض لوگوں نے کہا کہ سب لوگ تمہارے مقابلے میں اکٹھے ہو گئے ہیں لہٰذا تمہیں ان سے بچ کر رہنا چاہیے، تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین سہارا و مددگار ہے۔

(۱۷۳)

○ پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل وعنایت سے بہرہ ور ہوئے کہ انہیں کوئی تکلیف چھو ہی نہیں سکی، اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل وعنایت والا ہے۔

(۱۷۴)

○ یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں و پیروکاروں کو خوف دلاتا رہتا ہے مگر تم ان سے خوف مت کھاؤ بلکہ صرف میرا خوف دل میں رکھو اگر تم ایمان والے ہو۔

(۱۷۵)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ بھی جنگ احد سے تعلق رکھتی ہیں چنانچہ اس کا اشاراتی ثبوت جملہ "مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ....." سے ملتا ہے کیونکہ جنگ احد سے تعلق رکھنے والی آیتوں میں بھی اسی طرح کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں "اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ......." (اگر تمہیں تکلیف ہوئی تو ان لوگوں کو اس سے پہلے اسی جیسی تکلیف پہنچ چکی ہے......)

اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے والے!

O "اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ"
(وہ کہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہا.........)

اہل لغت کا کہنا ہے کہ لفظ "استجابت" (طلبِ جواب) اور "اجابت" (جواب دینا) کا معنی ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آپ کسی سے کوئی چیز مانگیں اور وہ دے دے، کچھ چاہیں تو وہ آپ کو ہاں میں جواب دے۔

یہاں ایک قابل توجہ مطلب یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کا تذکرہ ہوا ہے جبکہ ان میں سے کسی ایک کا ذکر ہی کافی تھا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے واقعۂ احد میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کی نافرمانی کا ارتکاب کیا، انہوں نے اللہ کی نافرمانی اس طرح کی کہ اللہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ جہاد کریں اور جنگ سے منہ نہ موڑیں مگر وہ میدانِ جنگ سے بھاگ گئے اور جہاد سے روگردانی کی، اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی یوں کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے مقررہ ٹھکانوں ہی پر رہیں اور تیر اندازوں پر ذمہ داری عائد فرمائی کہ وہ اپنے ٹھکانوں کو چھوڑ کر نہ جائیں مگر انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور اپنے ٹھکانوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں بلاتے رہے مگر انہوں نے پروا نہ کی اور بھاگتے ہی چلے گئے، لیکن جب اس واقعہ میں انہوں نے فرماں برداری کا ثبوت دیا تو اس کے حوالہ سے یہاں ان کی فرماں برداری کو اللہ اور رسول دونوں سے نسبت دی گئی۔

نیک اور متقی لوگوں کا اجر

○ ''لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ''

(ان میں سے جنہوں نے نیک عمل کیا اور تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے اجرِ عظیم ہے)

اس جملے میں اجر عظیم کے وعدہ کو اللہ اور رسول ﷺ کی فرماں برداری کرنے والوں میں سے چند افراد ہی کے ساتھ مخصوص کیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ استجابت یعنی حکم پر عمل کرنا ایک ظاہری فعل ہے کہ جس میں یہ امکان پایا جاتا ہے کہ حقیقت اور باطن سے مطابقت رکھتا ہو یا مطابقت نہ رکھتا ہو اور اس مطابقت کی نشانی اس کا نیکی و تقویٰ سے ہم آہنگ ہونا ہے کیونکہ اجر عظیم انہی دو چیزوں یعنی نیکی واحسان اور تقوی پر موقوف ہوتا ہے اس سے قرآنِ مجید کے بیان و اظہار کی شائستگی اور حقائق سے پیوستگی کا واضح ثبوت ملتا ہے اور اس مطلب سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ کلام الٰہی اپنے معارف کے بیان میں نہایت عمدہ اسلوب کا حامل ہے اور کوئی موضوع اسے کسی موضوع کے اظہار میں مانع نہیں ہوتا۔

اس بیان سے ظاہر وواضح ہوتا ہے کہ وہ سب لوگ اللہ کے نافرمان کی اطاعت میں مخلص نہ تھے بلکہ ان میں سے چند افراد ہی ایسے تھے جنہوں نے صمیم قلب سے فرماں برداری کا عملی ثبوت دیا اور نیکی و پاکدلی اور تقویٰ اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہرے۔

بعض اہل ادب حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں ''مِنْهُمْ'' حرف ''مِنْ'' بیانیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہی لوگوں کو بیان کیا جا رہا ہے جو اجر عظیم کا استحقاق رکھتے ہیں یعنی اللہ و رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنے والے وہی لوگ کہ جنہوں نے نیک عمل کیا اور تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے عظیم اجر مقرر ہے، اس کی مثال درج ذیل آیت مبارکہ میں ملتی ہے کہ جس میں حرف ''مِنْ'' کے بجائے حرف ''مع'' ذکر کیا گیا ہے۔

○ سورۂ فتح آیت ۲۹:

''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ .... وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا''

(محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحم دل ہیں...... اللہ نے وعدہ کیا ہے ان میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے مغفرت و بخشش کا اور عظیم اجر کا)

تو اس میں حرف "من" "(مِنْهُمْ) بیانیہ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہی لوگ جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہیں کہ جو کفار پر سخت اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحمدل ہیں ان کے لئے خدا کی طرف سے مغفرت و اجر عظیم کا وعدہ ہے۔

لیکن یہ رائے درست نہیں کیونکہ سیاق کلام اس کی نفی کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس جملہ میں جن افراد کی تعریف کی گئی اور کہا گیا کہ "اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ" (کہ وہ جن سے لوگوں نے کہا) تا آخر آیات، وہ اس طرح سے ہے جیسے بعض افراد کی صفت کو الفاظ کی مخصوص ترتیب و ترکیب کے ساتھ کل افراد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

دھمکیاں، ایمان میں اضافہ کا سبب

○ "اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا........"

(کہ وہ جنہیں لوگوں نے کہا کہ لوگ تمہارے مقابلے میں اکٹھے ہو گئے ہیں.........)

لفظ "ناس" کا معنی افرادِ انسان ہے اس میں ان سب کی بابت ایک ہی حوالہ ملحوظ ہوتا ہے یعنی انسان ہونا، اس میں کسی دوسری حیثیت اور امتیازی جہت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اس آیت مبارکہ میں لفظ "ناس" دوبار ذکر ہوا ہے اور ان دونوں میں مصداق کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے، وسرے لفظ "ناس" سے مراد وہ دشمنانِ اسلام ہیں جو لوگوں کو اہل اسلام کے خلاف اکٹھا کر رہے تھے اور پہلے لفظ "ناس" سے مراد وہ افراد ہیں جو مسلمانوں کے دلوں میں خوف، رعب اور شکست کے خدشات پیدا کرنے کی غرض سے طرح طرح کی باتیں کرتے اور دھمکیاں دیتے تھے تاکہ وہ مشرکین کے مقابلے میں میدانِ جنگ کو نہ جائیں، اس بنیاد پر دوسرے لفظ "ناس" سے مراد مشرکین اور پہلے لفظ "ناس" سے مؤمنین پر مشرکین کے جاسوس اور مخبریاں کرنے والے مراد ہیں۔

آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرد نہیں تھا بلکہ کافی تعداد میں تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیات جنگ بدر صغریٰ سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئیں جو جنگ اُحد ختم ہونے کے بعد پیش آیا کہ جس میں حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے باقیماندہ ساتھوں کے ہمراہ مشرکوں کا پیچھا کیا، ان دونوں واقعات کا تذکرہ عنقریب روایات پر ایک نظر کے ضمن میں ہوگا۔

جملہ "قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ" سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے تم سے دوبارہ جنگ کرنے کیلئے افراد کو اکٹھا کر لیا ہے (واللہ اعلم)

جملہ "فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا" (اور ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا) سے ایک ایسی حقیقت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے

جس کا تعلق انسان کی فطری صفات سے ہے اور وہ یہ کہ جب کسی انسان کو کسی اس کام سے روکا جائے جس کا اس نے پختہ ارادہ کرلیا ہو اور روکنے والا وہ شخص ہو جس کے بارے میں حُسنِ ظن بھی نہ پایا جاتا ہو بلکہ اس کے برعکس صورت ہو یعنی بدگمانی کے حالات ہوں۔ تو اس کام کو انجام دینے کی طرف رغبت و رجحان میں شدت آجاتی ہے اور ہر حال میں اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے تمام تر وجودی قوتیں حرکت میں آجاتی ہیں اور پھر صورتحال یہ ہو جاتی ہے کہ منع کرنے میں جتنی شدت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اتنا ہی اس کی انجام دہی کی طرف توجہات مرکوز ہوتی جاتی ہیں اور اپنے مقصود و مراد کو پانے کے لئے عملی اقدامات اٹھانے میں آخری حد تک جایا جاتا ہے اور اس کی انجام دہی کے سوا کوئی چارۂ کار ان کے سامنے نہ ہو۔

یہی حال مؤمنین کا تھا کہ جس قدر انہیں خدا کے فرمان کی اطاعت سے روکا جاتا ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا اور ان کے ارادہ و عزم میں پختگی پیدا ہوتی چلی جاتی تھی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ایمان میں اضافہ کی وجہ یہ ہو کہ منافقوں کی باتوں کو صحیح سمجھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے بیانات کی صداقت پر ان کے ایمان میں اضافہ ہو کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ سے سن چکے تھے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ انہیں اللہ کی راہ میں سخت اذیت و تکلیف سے دوچار ہونا پڑے گا اور پھر اسی حالت میں ان کا کام تمام ہوگا اور خدا نے ان کی مدد و نصرت کا وعدہ کیا ہے اور یہ واضح ہے کہ مدد و نصرت جنگ و قتال ہی میں مقصود ہے اس کے علاوہ کسی چیز میں نہیں۔

جملہ ''وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے کہا خدا ہمارے لئے کافی ہے۔

''حَسْبُنَا'' میں لفظ ''حسب'' حساب سے لیا گیا ہے کیونکہ کافی ہونا ضرورت کے حساب سے ہوتا ہے۔ یہاں اللہ کا کافی ہونا، ایمان کی بنیاد اور حوالہ سے ہے بیرونی اسباب و عوامل کی بناء پر نہیں ہے کہ جو خدائی قائم کردہ نظام الاسباب میں ہوتا ہے۔ یعنی خداوند عالم مؤمنین کی کفایت کرتا ہے ان کے ایمان کی وجہ سے نہ یہ کہ اسباب کی اثر گزاری کی بناء پر۔

''وکیل'' اسے کہتے ہیں جو کسی شخص کی نیابت میں اس کے امور کو انجام دے اور ان کی تدبیر کرے۔ یعنی اس کی طرف سے اس کے امور کی انجام دہی کا ذمہ دار ہو۔

بنابرایں آیۂ مبارکہ کے مطالب کی بازگشت درج ذیل آیۂ شریفہ کی طرف ہوتی ہے:

○ سورۂ طلاق، آیت ۳:

''وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ''

(اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اس کے لئے کافی ہے، یقیناً خدا اپنا کام کر ہی لیتا ہے)

اسی وجہ سے جملہ ''وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' کے فوراً بعد ارشاد ہوا: ''فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ....'' (پھر وہ اللہ کی طرف سے نعمت و خاص عنایت سے بہرہ ور ہو گئے، انہیں کوئی تکلیف چھو نہ سکی ....) یہ اس لئے فرمایا تا کہ وعدۂ خداوندی کی تصدیق ہو جائے، اس کے بعد ان کی تعریف میں یوں ارشاد فرمایا: ''وَاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ'' (اور انہوں نے رضائے الٰہی کی پیروی کی اور اللہ عظیم فضل و کرم اور عنایت والا ہے)۔

توکل کے بارے میں ایک بحث

توکل کے موضوع کی بابت حقیقت الامر یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں کسی چاہت وارادہ کا پورا ہونا اور مقصد ومراد کو پانا طبیعی اور روحانی دونوں قسم کے اسباب سے وابستہ ہے، صرف طبیعی اسباب کافی نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ انسان جب کسی ایسے کام کی انجام دہی کا ارادہ کرے جو اس کے لئے اہمیت رکھتا ہو یا وہ اس کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہو اور اس کے ضروری طبیعی و مادی اسباب بھی مہیا کرے لیکن اس کے باوجود اس کا اپنے مقصود کو نہ پانا روحانی اسباب کی عدم فراہمی کے سوا کسی دوسری وجہ سے نہیں ہوسکتا۔ یعنی روحانی اسباب کے فراہم نہ ہونے کے نتیجہ میں وہ اپنے مقصود ومطلوب کو نہیں حاصل کرسکتا مثلاً ارادہ کا کمزور ہونا، خوفزدہ ہونا، غمگین ہونا، غضبناک ہونا، حریص ولالچی ہونا، بیوقوف وناسمجھ ہونا، سوءِ ظن کا شکار ہونا اور اس طرح کے دیگر امور، تو یہ سب نہایت مؤثر اور عمومی عوامل ہیں جو مقصد ومقصود کے حصول کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، لیکن اگر انسان اپنے ارادہ وچاہت اور مقصود کے حصول کی کوشش میں خداوند عالم پر توکل کرے تو وہ اس طرح سے ہے کہ اس نے ایک یقینی سبب سے وابستگی اختیار کی جو کبھی مغلوب واقع نہیں ہوسکتا اور وہ ہر سبب پر فوقیت رکھتا ہے، کوئی سبب اس سے بالاتر نہیں لہٰذا اس کا ارادہ قوی ہوجائے گا اور پھر کوئی ایسا روحی ونفسیاتی سبب وعامل اس پر اثر انداز وغالب نہیں ہوگا جو اس کے مقصود سے متصادم ومنافی ہو، اسی کو کامیابی وکامرانی اور سعادت وخوشبختی کہتے ہیں۔

خدا پر توکل وبھروسہ کرنے میں ایک حوالہ یہ بھی ملحوظ ہے کہ اس کی اثر گزاری معجزات وخارق العادت امور سے وابستہ ہوتی ہے چنانچہ اس معنی ومطلب کا ثبوت جملہ ''وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ.....'' سے بھی ملتا ہے یاد رہے کہ ہم معجزہ کی بحث میں کچھ مطالب ذکر کرچکے ہیں جن کا تعلق ہمارے زیر نظر موضوع یعنی توکل علی اللہ سے ہے۔

شیطان کی دھمکیاں

○ ''ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ............''

(یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں کو خوفزدہ کرتا رہتا ہے........)

آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ذٰلِكُمْ'' سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں منافقوں نے خوفزدہ کرنے کے لئے کہا کہ ''اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ'' (لوگ تمہارے مقابلے میں اکٹھے ہوگئے ہیں)۔ نتیجتاً یہ جملہ (ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ

يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ) ان موارد میں سے ایک ہے جن میں قرآن مجید نے لفظ ''شیطان'' کو انسان کے لئے استعمال کیا ہے جیسا کہ درج ذیل آیات سے اسی مطلب کی طرف اشارہ بلکہ ثبوت ملتا ہے:

○ ''مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ''

(خناس کے وسواس کے شر سے، کہ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، جنوں اور انسانوں میں سے)

اس مطلب کی تائید جملہ ''فَلَا تَخَافُوْهُمْ'' سے ہوتی ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ان شیطانوں سے کہ جنہوں نے اس طرح کی باتیں کیں خوف نہ کھاؤ کیونکہ وہ تمہارے لئے شیطان ہیں۔ اس موضوع کی بابت عنقریب تفصیلی وتوضیحی بحث ہوگی جس میں اس حوالہ سے حقیقت الامر سے پردہ اُٹھایا جائے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

روایات پر ایک نظر

جنگ اُحد کے بارے میں نہایت کثرت کے ساتھ روایات وارد ہوئی ہیں اور ان میں گونا گوں حوالوں سے اختلاف پایا جاتا ہے اور اصل واقعہ کی بابت اس قدر مختلف مطالب ذکر ہوئے ہیں کہ اصل موضوع کے بارے میں سوء ظن پیدا کر دیتے ہیں، زیادہ تر اختلاف ان روایات میں پایا جاتا ہے جو اس واقعہ کے شان نزول کی بابت نازل ہونے والی آیات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان آیات کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ روایات نہایت عجیب ہیں اور ان کے مندرجات حیرت انگیز ہیں اور جو شخص بھی ان میں غور وفکر کرے اور ان میں مذکور مطالب کے بارے میں گہرائی میں جائے تو وہ یقینی طور پر یہ نظریہ قائم کرے گا کہ ان میں گونا گوں افکار ونظریات کارفرما ہوئے اور ان مخصوص آراء واعتقادی رجحانات نے اپنی روحیں ان میں پھونک دیں تاکہ ان کے عقائد روایت کے زاویہ میں ڈھل کر لوگوں کے سامنے آئیں، گویا ان روایات سے سیاسی فوائد ومقاصد حاصل کئے جائیں۔'' یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہاں روایات کی بحث میں ان کو ذکر نہیں کیا، جو شخص ان روایات کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہے وہ حدیث کی جامع کتب اور وسیع تفسیری مجموعوں کی طرف رجوع کرے۔

''درمنثور'' کی ایک روایت

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن ابی حاتم نے ابوالضحیٰ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب آیت مبارکہ ''وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ'' نازل ہوئی اسی دن ستر مسلمان شہید ہوئے کہ جن میں چار افراد مہاجرین تھے جن میں حمزہ بن عبدالمطلب،

معصب بن عمیر (بنی عبدالدار سے رشتۂ اخوت کے حامل)، شماس بن عثمان مخزومی اور عبداللہ بن جحش اسدی شامل تھے، ان کے علاوہ باقی تمام افراد انصار میں سے تھے (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۷۹)

اس روایت کے ظاہری الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے راوی یعنی ابوالضحیٰ نے آیت میں مذکور لفظ ''شُھَدَآءَ'' سے میدانِ جنگ میں مارے جانے والے افراد مراد لئے ہیں اور اسی بنیاد پر متعدد مفسرین کرام نے یہی مراد لیا اور اپنی کتب میں ذکر کیا ہے، لیکن ہم اپنے سابقہ ذکر کئے گئے مطالب میں بیان کر چکے ہیں کہ ظاہر الکتاب سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ آیات کے ظاہری الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''شُھَدَآءَ'' اعمال پر گواہ مراد ہیں۔

علم خدا کی وسعت

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ ''اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ'' کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا گیا ہے جس میں امامؑ نے فرمایا:

''ان اللہ علم بما ھو مکونہٗ قبل ان یکونہٗ وھم ذرو علم من یجاھد ممن لایجاھد کما علم انہٗ یمیت خلقہٗ قبل ان یمیتھم ولم یرموتھم وھم احیاء''

خداوند عالم کائنات کو وجود عطا کرنے سے پہلے ہی اس کے بارے میں آگاہ ہے جبکہ تمام لوگ ابھی عالم ذر میں تھے، اور وہ اس سے بھی آگاہ تھا کہ کون جہاد کرے گا اور کون جہاد سے روگردانی کرے گا اور یہ اسی طرح سے ہے کہ جیسے وہ اپنی مخلوق کو موت دینے سے پہلے اس بارے میں آگاہ ہے کہ وہ انہیں موت دے گا حالانکہ اس نے انہیں ان کی زندگی میں موت کا مشاہدہ نہیں کروایا)۔ (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۱۹۹ حدیث ۱۴۷)

موت کی تمنا کا حوالہ

تفسیر قمی میں آیت مبارکہ ''وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ........'' کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

''ان المؤمنین لما اخبرھم اللہ تعالیٰ بالذی فعل بشھدائھم یوم بدر فی منازلھم فی الجنة رغبوا فی ذالك فقالوا: اللھم ارنا قتالاً نستشھد فیہ فاراھم اللہ یوم احد ایّاہ فلم یثبتوا الا

من شاء الله منهم فذلك قوله ''وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ''

جب خداوند عالم نے مؤمنین کو آگاہ کیا کہ اس نے جنگ بدر میں شہید ہونے والوں کو کتنا درجہ عطا فرمایا اور بہشت میں انہیں کیا مقام دیا تو مؤمنین اس مقام و مرتبہ کے مشتاق ہو گئے اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کرنے لگے کہ پروردگار! ہمیں بھی جنگ کا دیدار کروا تا کہ ہم بھی شہادت کا درجہ پائیں، خداوند عالم نے انہیں جنگ اُحد دکھا دی مگر ان میں سے چند افراد کہ جو خدا کی مشیت سے بہرہ ور ہوئے کے سوا کوئی ثابت قدم نہ رہا، اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ......... ''تم تو موت کی تمنا کرتے تھے!) (تفسیر القمی، جلد اول صفحہ ۱۱۹)

یہی مطلب تفسیر ''درمنثور'' میں ابن عباس اور مجاہد، قتادہ، حسن اور سدی کے حوالہ سے ذکر ہوا ہے، ملاحظہ ہو تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۸۰۔

جنگ احد میں غلط افواہ کا حوالہ

تفسیر القمی میں منقول ہے امامؑ نے ارشاد فرمایا:

''ان رسول الله (ص) خرج يوم احد وعهد العاهد به على تلك الحال فجعل الرجل يقول لمن لقيه: ان رسول الله (ص) قد قتل النجا. فلما رجعوا الى المدينة انزل الله: ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا''

''حضرت پیغمبر اسلام ﷺ احد کے دن میدانِ جنگ کو نکلے اور گھمسان کی لڑائی میں جس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا اس سے فائدہ اٹھا کر آپ ﷺ ہی کے لشکر میں سے ایک سپاہی جس سے ملتا اُس سے کہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ مارے گئے اپنی جان بچالو، لیکن جب مدینہ واپس آ گئے تو خداوند عالم نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: ''اور محمد نہیں ہیں مگر رسول، ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں، اگر وہ مر جائیں یا مارے جائیں تو تم اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے (یعنی کافر ہو جاؤ گے) اور جو شخص اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جائے وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا''

(تفسیر قمی، جلد اول صفحہ ۱۱۹)

جنگ اُحد کا تذکرہ

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ربیع کے حوالہ سے بیان کیا کہ:۔

"ذلك يوم احد حين اصابهم ما اصابهم من القتل والقرح وتداعوا نبي الله قالوا: قد قتل محمد، وقال اناس منهم: لو كان نبيا ماقتل، وقال اناس، من علية اصحاب النبي(ص): قاتلوا علیٰ ما قاتل عليه نبيكم حتیٰ يفتح الله عليكم اوتلحقوا به، وذكر لنا ان رجلاً من المهاجرين مر علیٰ رجل من الانصار وهو يتشحط في دمه فقال: يا فلان، اشعرت ان محمدًا قد قتل؟ فقال انصاری: ان كان محمد قد قتل فقد بلغ، فقاتلوا عن دينكم، فانزل الله: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا"

یہ آیت جنگ اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جس میں مسلمانوں کو سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا اور اس میں ان کے کئی افراد مارے گئے اور متعدد زخمی ہوئے، اس شدید حالت و کیفیت میں صحابۂ کرام ایک دوسرے سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں دریافت کرنے لگے، بعض نے کہا کہ محمد مارے گئے، بعض نے کہا کہ اگر وہ نبی ہوتے تو ہرگز نہ مارے جاتے، بعض عالی رتبہ حضرات نے کہا کہ اگر یہ خبر درست ہے تو تم اسی طرح قتال کرتے رہو جس طرح تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا اور اسی راہ پر گامزن رہ کر دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں ڈٹے رہو تا کہ خداوند عالم یا تو فتح و کامیابی تمہارا مقدر کر دے یا تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ملحق ہو جاؤ، ہمیں بتایا گیا ہے کہ مہاجرین میں سے ایک شخص انصار کے ایک شخص کے قریب سے گزرا جو کہ خون میں غلطاں تھا تو اس سے کہنے لگا کہ اے فلاں! کیا تجھے معلوم ہوا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مارے گئے ہیں، اس زخمی انصاری شخص نے جواب میں کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مارے گئے تو انہوں نے اپنا فریضہ پورا کیا اور ذمہ داری ادا کر دی اور تم بھی اپنے دین کے دفاع میں قتال کرتے رہو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا" (اور محمد نہیں مگر رسول، ان سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں، اگر وہ مر جائیں یا قتل کئے جائیں تو تم اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے) یعنی تم ایمان لانے کے بعد مرتد ہو جاؤ گے (تفسیر در منثور ج ۲ صفحہ ۸۰)

انس بن نضر کا مثالی کردار

تفسیر درمنثور میں ابن جریر کے حوالہ سے سدی کی روایت ذکر کی گئی ہے جس میں انہوں نے کہا:

"فشا في الناس يوم احد ان رسول الله(ص) قد قتل فقال بعض اصحاب الصخرة: ليت لنا

رسولاً الیٰ عبداللہ بن ابی فیاخذ لنا اماناً من ابی سفیان، یاقوم، ان محمدًا قتل فارجعوا الیٰ قومکم قبل ان یاتو کم فیقتلونکم، قال انس بن نضر: یاقوم، ان کان محمد قد قتل فان رب محمد لم یقتل فقاتلوا علی ما قاتل علیه محمد، اللھم انی اعتذر الیك مما یقول ھؤلاء، وابرء الیك مما جاء به ھؤلاء فشد بسیفه فقاتل حتی قتل، فانزل الله: "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ.........."

جنگ اُحد کے دن افواہ پھیلی کہ رسول خدا ﷺ مارے گئے ہیں، پہاڑی کے دامن میں چھپے ہوئے ایک مسلمان سپاہی نے کہا کہ اے کاش! اس وقت کوئی ہوتا جسے ہم عبداللہ بن ابی کے پاس بھیجتے اور وہ ابوسفیان سے ہمارے لئے امان و پناہ حاصل کرتا، پھر اس نے بلند آواز سے کہا، اے لوگو! کیا دیکھ رہے ہو، محمد تو مارے گئے، اس سے پہلے کہ دشمن کی فوج تم پر حملہ کردے اور تمہیں موت کے گھاٹ اتار دے، تم اپنی قوم کی طرف پلٹ جاؤ، اس دوران انس بن نضر بول اٹھا اور کہنے لگا: اے لوگو! اگر محمد ﷺ مارے گئے تو محمد ﷺ کا پروردگار تو مارا نہیں گیا، تم اسی دین و آئین کے دفاع میں جنگ کرتے رہو جس طرح محمد ﷺ لڑتے رہے ہیں، اے اللہ میں تجھ سے ان لوگوں کی باتوں پر معذرت خواہ ہوں اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس سے برائت کا اظہار کرتا ہوں، اس کے بعد اس نے اپنی تلوار نیام سے باہر نکالی اور میدان میں کود پڑا یہاں تک کہ درجۂ شہادت پر فائز ہوگیا، اس وقت خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ.........." (تفسیر "درمنثور" جلد دوم صفحہ ۸۰)

یہی مطالب دیگر کثیر اسناد کے ساتھ روایات میں ذکر کئے گئے ہیں

شفائے علیؑ بدستِ نبی ﷺ

کتابِ کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"انه اصاب علیًا یوم احد ستون جراحةً وان النبی (ص) امر ام سلیم وام عطیه ان تداویاه فقالتا: انا لا نعالج منه مکانًا الا انفتق مکان وقد خفنا علیه، ودخل رسول الله (ص) والمسلمون یعودونهٗ وھو قرحة واحدة، وجعل یمسحه بیده ویقول: ان رجلا لقی ھذا فی الله فقد ابلی واعذر، فکان القرح الذی یمسحه رسول الله (ص) یلتئم فقال علی: الحمد لله اذ لم افرولم اول الدبر فشکر الله لهٗ ذلك فی موضعین من القرآن وھو قولهٗ: وسیجزی الله الشاکرین، وسنجزی الشاکرین"

جنگ اُحد میں حضرت علی علیہ السلام کو ساٹھ زخم لگے اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام سلیم اور ام عطیہ کو حکم دیا کہ ان کی مرہم پٹی کریں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ ہم ان کے جسم میں لگے ہوئے زخموں میں سے ایک کی مرہم پٹی کرتے ہیں تو دوسری جگہ زخم منہ کھولتا ہے ہمیں تو ان کی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے ہمراہ حضرت علیؑ کی عیادت کے لئے تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ زخموں میں لت پت ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے جسم مبارک پر لگے ہوئے ہر زخم پر اپنا دست مبارک پھیرتے گئے اور فرماتے گئے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں اس قدر تکلیف برداشت کرے تو اس نے اپنی آزمائش میں کامیابی حاصل کر لی اور اپنا فریضہ ادا کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس زخم پر ہاتھ پھیرتے وہ مندمل ہو جاتا تھا، اس وقت حضرت علیؑ نے یہ الفاظ ادا کئے: اللہ کی حمد ہے کہ نہ تو میں میدان سے بھاگا ہوں اور نہ ہی ایک قدم پیچھے ہٹا ہوں، خداوند عالم نے ان کے لئے ادائے شکر کو قرآن مجید میں دو جگہ ذکر فرمایا ہے: زیر نظر آیت مبارکہ میں: ''وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ'' (اور اللہ بہت جلد شکر گزاروں کو جزا عطا کرے گا)۔(۲) سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۵: ''وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ'' (اور ہم بہت جلد شکر گزاروں کو جزا عطا کریں گے)

اس روایت میں خداوند عالم کی طرف سے امام علیؑ کے ثبات قدم پر ان کی شکر گزاری ہوئی ہے نہ یہ کہ ان کے ''الحمدللہ'' کہنے پر!

آیت کے الفاظ کے حوالہ سے!

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے آیت کو اس طرح پڑھا: ''وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ'' تو فرمایا ''الوف والوف'' (وہ ہزار ہزار تھے) یعنی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اس کے بعد امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''ای واللہ یقتلون'' ہاں، قسم بخدا، وہ قتل کئے جائیں گے۔

(تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۰۱ حدیث ۱۵۴)

اس روایت میں ''قاتل معه'' کی جگہ ''قتل معهٗ'' ذکر ہوا ہے اور اسی قرأت کے مطابق ہی معنی کیا گیا ہے، اسی قرائت اور اسی کی بناء پر معنی کو تفسیر ''در منثور'' میں جناب ابن مسعود کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے اور جناب ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ ایک شخص نے ان سے لفظ ''ربیّون'' کا معنی پوچھا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ اس سے مراد کئی گروہ ہیں۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر ''در منثور'' جلد دوم صفحہ ۸۲)

''درمنثور'' کی تین روایتیں

(۱) تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم نے مجاہد کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے جملہ ''مِنۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىكُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ'' میں ''تُحِبُّوۡنَ'' (جو تم پسند کرتے ہو) کے بارے میں بیان کیا کہ اس سے مراد وہ نصرت و مدد ہے جو خداوند عالم نے کافروں کے مقابلے میں مؤمنین کو عطا فرمائی، یہاں تک کہ مشرکوں کی عورتیں بھاگنے پر مجبور ہو گئیں اور جو سواری جس کے ہاتھ لگی وہ اس پر سوار ہو کر فرار کر گئی، مگر مؤمنوں کی طرف سے حضرت رسول خدا ﷺ کی نافرمانی کے ارتکاب کے بعد دوبارہ مشرکین جوق در جوق مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۸۶)

(۲) تفسیر درمنثور ہی میں ابن اسحاق، ابن راھویہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے اور بیہقی نے کتاب دلائل میں زبیر کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: مجھے وہ وقت یاد ہے جب ہم حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کے ہمراہ تھے اور ہم پر شدید خوف طاری تھا تو اس وقت خداوند عالم نے ہم پر نیند طاری کر دی، ہم میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کی ٹھوڑی اس کے سینہ سے پیوست نہ ہو چکی ہو۔ خدا کی قسم! ابھی تک معتب بن قشیر کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ وہ کہہ رہا تھا: ''لَوۡ كَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا هٰهُنَا'' (اگر ہم ذرہ بھر اختیار رکھتے تو یہاں اس طرح نہ مارے جاتے) میں نے اس کی آواز ایسے سنی جیسے خواب ہو۔ میں نے اس کے الفاظ یاد کر لئے، اسی کی بابت یہ آیت نازل ہوئی: ''ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا'' (معتب بن قشیر کے ان الفاظ تک) ''مَّا قُتِلۡنَا هٰهُنَا'' (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۸۸)

مذکورہ بالا مطلب زبیر بن عوام کے حوالہ سے مختلف اسناد سے ذکر ہوا ہے۔

(۳) تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن منذر نے کتاب معرفۃ الصحابہ میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اُنہوں نے آیت مبارکہ ''اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ ....'' کے شانِ نزول کے بارے میں بیان کیا ہے کہ یہ عثمان، رافع بن معلّٰی اور حارثہ بن زید کے بارے میں نازل ہوئی ہے (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۸۸)

تقریباً یہی مطلب متعدد حوالوں سے عبد الرحمان بن عوف، عکرمہ اور ابن اسحاق سے مروی ہے، ان میں سے بعض روایات میں عثمان، رافع اور حارثہ کے علاوہ ابو حذیفہ بن عقبہ، ولید بن عقبہ، سعد بن عثمان اور عقبہ بن عثمان کے نام بھی ذکر کئے گئے ہیں (ملاحظہ ہو، تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۸۸، ۸۹)

بہر حال ان روایات میں عثمان اور دیگر افراد کے نام مصداق کی صورت میں بطور مثال ذکر کئے گئے ہیں ورنہ آیت

مبارکہ ان تمام صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے میدان جنگ سے منہ موڑا اور حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا اور خاص طور پر عثمان اور دیگر افراد کہ جن کے نام ذکر کئے گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھاگنے والوں میں سب سے تیز تھے اور انہوں نے اس طرح فرار کیا کہ دوڑتے دوڑتے "جلعب" پہاڑ تک پہنچ گئے جو کہ مدینہ کے اطراف میں اغوص کی جانب ہے۔ وہ لوگ تین دن تک وہاں چھپے رہے، پھر حضرت رسول خدا ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: تم لوگ تو خوب بھاگے ہو، اور جہاں تک دیگر عام صحابہ کا تعلق ہے تو روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب فرار کر گئے یہاں تک کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مہاجرین میں سے دو آدمی اور انصار میں سے سات آدمی باقی رہ گئے، ادھر مشرکین نے آنحضرت ﷺ پر دھاوا بول دیا اور انصار کے وہ تمام افراد یکے بعد دیگرے آنحضرت ﷺ کو بچاتے بچاتے شہید ہو گئے اور پھر انصار میں سے کوئی ایک شخص بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ باقی نہ بچا۔

یہ مطلب اکثر روایات میں مذکور ہے البتہ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ جو حضرات آخری دم تک رہے ان کی تعداد گیارہ تھی، بعض روایات میں سترہ اور بعض میں تیس تک تعداد ذکر کی گئی ہے جو کہ نہایت ضعیف روایت ہے۔ اس اختلاف کی وجہ شاید یہ ہو کہ راویوں کو حاصل ہونے والی معلومات ناقص تھیں، البتہ نسیبہ مازنیہ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے دفاع کی بابت وارد ہونے والی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کے پاس ایک شخص بھی نہ تھا، اور اگر کوئی شخص باقی بچا بھی تھا اور وہ دوسرے صحابہ کی طرح میدان جنگ سے نہ بھاگا نہ تھا بلکہ آخر دم تک ثابت قدم رہا وہ آنحضرت ﷺ کے پاس نہ تھا بلکہ وہ جنگ کرنے میں مصروف تھا، روایات میں صحابہ میں سے کسی کے بارے میں ثابت قدم رہنے پر متفقہ رائے نہیں پائی جاتی سوائے حضرت علی علیہ السلام کے، اور ان کے علاوہ شاید ابو دجانہ انصاری سماک بن خرشہ کے ثابت قدم رہنے کے بارے میں بھی روایات موجود ہیں لیکن وہ بھی آنحضرت ﷺ کے پاس نہ تھے بلکہ انہوں نے ابتداء میں حضرت رسول خدا ﷺ کی تلوار لے کر جس قدر ممکن تھا دشمن کا مقابلہ کیا اور خوب لڑے مگر جب تمام صحابہ بھاگ گئے اور آنحضرت ﷺ اکیلے رہ گئے تو ابو دجانہ نے اپنے آپ کو آنحضرت ﷺ کی ڈھال بنا لیا، جتنے تیر آنحضرت ﷺ کی طرف آتے وہ ان سب کو اپنے اوپر لے لیتے اور اپنی ڈھال یا اپنی پیٹھ پر تیروں کو روک کر حضرت رسول خدا ﷺ کی جان بچاتے رہے اور بالآخر تیروں سے چھلنی بدن کے ساتھ درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔ رضی اللہ عنہ، خدا ان سے راضی ہوا۔

اور جہاں تک ان کے علاوہ دیگر صحابہ کا تعلق ہے تو ان میں سے کچھ وہ تھے جو آنحضرت ﷺ کو پہچاننے اور آپ ﷺ کے قتل نہ کئے جانے کے بارے میں آگاہ ہونے کے بعد فوراً آپ ﷺ سے ملحق ہو گئے جبکہ کچھ وہ تھے جو تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ سے ملحق ہوئے، انہی دو طرح کے افراد پر خداوند عالم نے اونگھ ڈال دی، لیکن خدا نے ان سب سے درگزر فرمایا، "عفو" کے معنی کی بابت ہمارے مذکورہ سابقہ بیان میں آپ آگاہ ہو چکے ہیں، البتہ بعض مفسرین کرام نے "عفو" کے

بارے میں لکھا ہے کہ اس آیت میں اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے مشرکوں کو مسلمانوں کے مزید قتل عام سے روک دیا اور وہ مسلمانوں کا صفایا نہ کر سکے۔

مشاورت کی اہمیت

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن عدی نے اور بیہقی نے سند حسن (مقبول سلسلۂ روایت) کے ساتھ جناب عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جب آیت مبارکہ ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' نازل ہوئی تو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اما ان الله ورسوله لغنيان عنها ولكن جعلها الله رحمة لامتی فمن استشار منهم لم يعدم رشداً، ولمن تركها لم يعدم غيًا'' خدا اور رسول خدا کو تو مشاورت کی ہرگز ضرورت نہیں ہے وہ اس سے بے نیاز ہیں لیکن خدا نے اسے میری امت کے لئے رحمت قرار دیا ہے۔ لہٰذا جو شخص مشاورت کا طرز عمل اختیار کرے وہ منزل مقصود کے حصول اور مطلوب تک رسائی میں ہدایت پانے سے محروم نہ ہوگا اور جو اسے ترک کرے اس کا گمراہی سے محفوظ ہونا یقینی نہیں (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۹۰)

استخارہ و استشارہ

تفسیر ''درمنثور'' ہی میں طبرانی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے کتاب ''الاوسط'' میں انس سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: ''قال رسول الله (ص) ماخاب من استخار، ولا ندم من استشار'' حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص استخارہ کرے وہ اپنے مطلوب میں ناامید نہ ہوگا اور جو شخص استشارہ (دوسروں سے مشاورت) کرے وہ کبھی پشیمان نہ ہوگا (مذکورہ بالا حوالہ)

امام علیؑ کے ارشادات

نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''من استبد برأيه هلك، ومن شاور الرجال شاركها في عقولها'' جو اپنی رائے پر ڈٹا رہا وہ تباہ ہوا اور جس نے لوگوں سے مشاورت کی وہ ان کی عقلوں

میں شریک ہو گیا (نہج البلاغہ، ارشاد:۱۶۱)

ایک مقام پر امامؑ نے یوں ارشاد فرمایا:

''الاستشارة عين الهداية، وقد خاطر من استبد برأيه''

(مشاورت میں عین ہدایت ہے اور جو شخص اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھے اس نے اپنے لئے خطرہ مول لیا)

(نہج البلاغہ، ارشاد:۲۱۱)

ایک ارشاد نبویؐ

تفسیر صافی میں حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''لا وحدة اوحش من العجب، ولا مظاهرة اوثق من المشاورة''

خود پسندی سے زیادہ خوفناک تنہائی کوئی نہیں ہے اور مشاورت سے مضبوط و قابل وثوق عمل نہیں۔

(تفسیر صافی، جلد اول صفحہ ۳۱۰)

مشاورت کے بارے میں نہایت کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں اور وہ انہی امور میں ہو سکتی ہے جو مشورہ لینے والے کو عمل کرنے یا نہ کرنے میں ترجیحی پہلوؤں کی بنیاد پر اختیار حاصل ہو کہ ان میں سے کسی ایک جانب کا فیصلہ کرے، یعنی وہ امور ایسے ہوں جن میں مشورہ لینے والے کے لئے یہ بات جائز و روا ہو کہ مشورہ لینے کے بعد مرجحات و مقتضیات کی روشنی میں اس پر عمل کرے یا نہ کرے، لیکن جہاں تک احکامِ الٰہیہ اور فرامینِ خداوندی کا تعلق ہے تو ان میں مشورہ لینے کی گنجائش ہی نہیں پائی جاتی اور نہ ہی کسی کو ان میں کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی اختیار حاصل ہے کیونکہ اگر مشورہ لینے اور تبدیلی کی گنجائش موجود ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ حالات و واقعات کا مختلف ہونا کلام خداوندی کے بے اثر و منسوخ ہونے کا باعث بنے گا...... جو کہ کسی صورت میں درست نہیں۔

رسول اللہؐ کی عصمت کا اظہار

کتاب المجالس میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے ارشاد فرمایا:

ان رضى الناس لا يملك والسنتهم لا تضبط، الم ينسبوه يوم بدر انه، اخذ لنفسه من

المغنم قطیفة حمراء؟ حتی اظهره الله علی القطیفة و بر أنبیه من الخیانة وانزل فی کتابه: ”وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ..........“

سب لوگوں کو راضی نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی سب کی زبانوں پر قابو پایا جا سکتا ہے، کیا جنگ بدر کے دن لوگوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ تہمت نہیں لگائی تھی کہ انہوں نے مال غنیمت میں سے ایک سرخ چادر خود رکھ لی ہے؟ بالآخر خداوند عالم نے اس گمشدہ چادر کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہی دلائی...... کہ وہ کہاں پڑی ہوئی ہے...... اور اس طرح اپنے نبی کو خیانت سے بری قرار دیا (کہ اس کا پیغمبر کوئی خائنانہ عمل انجام نہیں دیتا) اور اس سلسلہ میں یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: ”وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ.......... “نبی دھوکہ بازی نہیں کر سکتا۔ (آل عمران، آیت ۱۵۶)

اس روایت کو تفسیر قمیؒ میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور اسی میں مذکور ہے (فجاء رجل الی رسول الله(ص) فقال: ان فلاناً غل قطیفة حمراء فاحفرها هنالك فامر رسول الله(ص) بحفر ذلك الموضع فاخرج القطیفة) کہ ایک شخص حضرت پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ فلاں شخص نے سرخ رنگ کی چادر چرائی ہے اور اسے فلاں جگہ چھپا دیا ہے، تو آنحضرتؐ نے اس جگہ کو کھودنے کا حکم دیا اور وہاں سے چادر نکلوالی۔ (تفسیر قمیؒ، جلد اول صفحہ ۱۲۶)

یہی مطلب اور اس سے قریب المعنی روایت تفسیر ”در منثور“ میں متعدد راویوں کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے، اور شاید اس میں مذکور مطلب کہ آیت ”وَمَنْ یَّغْلُلْ......“ سرخ رنگ کی چادر سے مربوط واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، سے مراد یہ ہو کہ اس آیت میں اس وقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، ورنہ آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نزول جنگ احد کے بعد ہوا، چنانچہ اس حوالہ سے مربوطہ مطالب بیان ہو چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر ”در منثور“ جلد ۲ صفحہ ۹۱)

قیامت کے دن چور کی سزا

تفسیر قمیؒ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

”من غل شیئاً رآه یوم القیامة فی النار ثم یکلف ان یدخل الیه فیخرجه من النار“

(جو شخص کوئی چیز چرائے تو اسے قیامت کے دن دوزخ کی آگ میں دیکھے گا، پھر اسے وہاں بھیجا جائے گا اور وہ اسے آگ سے باہر نکال لائے گا) (تفسیر قمیؒ، جلد ۱ صفحہ ۱۲۲)

اس روایت میں مذکور مطلب درحقیقت آیت مبارکہ ”وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ“ سے ایک طرح کا لطیف استفادہ ہے۔

اہل بیتؑ سے محبت وعداوت کے نتائج

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ "ھم درجات عنداللہ" کے ضمن میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:

"الذین اتبعوا رضوان اللہ ھم الأئمة، وھم واللہ درجات عنداللہ للمؤمنین، وبولایتھم و مودتھم ایانا یضاعف اللہ لھم اعمالھم، و یرفع اللہ لھم الدرجات العلیٰ، والذین باؤوا بسخط من اللہ ھم الذین جحدوا حق علی وحق الأئمة منا اھل البیت فباؤوا الذلك بسخط من اللہ"

(وہ لوگ کہ جنہوں نے رضائے الٰہی کی پیروی کی وہ آئمہ ہی ہیں، اور خدا کی قسم وہی مومنین کے لئے اللہ کے پاس درجات ہیں، (یعنی آیت میں "الذین اتبعوا رضوان اللہ" سے مراد آئمہؑ ہیں اور "ھم درجات عنداللہ" سے مراد بھی وہی حضرات ہیں کہ جو مومنین کے لئے ہیں) ہماری ولایت ومحبت ہی کہ وجہ سے خداوند عالم ان کے اعمال کی جزاء کو دگنا کردے گا اور جو لوگ خدا کی ناراضگی کا شکار ہوئے وہ علیؑ اور ہم آئمہ اہل بیتؑ کے حق کے منکرین ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ اللہ کی ناراضگی کا شکار ہوئے) (تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۰۵ حدیث ۱۴۹)

یہ روایت دراصل آیت مبارکہ کے تطبیقی مصداق کے بیان پر مشتمل ہے، یعنی اس کے ایک مصداق کی نشاندہی کرتی ہے، اس طرح کے تطبیقی بیان کو "الجری والتطبیق" کہا جاتا ہے۔

اسی کتاب (تفسیر العیاشی) میں مذکور ہے کہ "ھم درجات عنداللہ" میں درجہ (مقام ومرتبت) کی عظمت و رفعت آسمان وزمین کی وسعت کے برابر ہے، (تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۰۵ حدیث ۱۵۰)

آزمائشوں کا تقابل

تفسیر العیاشی میں آیت مبارکہ "اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا" کے ذیل مین حضرت امام صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر مذکور ہے جس میں آپؑ نے فرمایا "کان المسلمون قد اصابوا ببدر مأة واربعین رجلاً: قتلوا سبعین رجلاً واسروا سبعین، فلما کان یوم احد اصیب من المسلمین سبعون رجاً فاغتموا بذلك فنزلت" جنگ بدر میں مسلمانوں نے دشمن کے ایک سو چالیس افراد کو قتل کیا اور ستر افراد کو قید کیا، پھر جب جنگ احد ہوئی تو کفار کے ہاتھوں مسلمانوں کے ستر افراد مارے گئے، تو اس پر وہ سخت غمگین ہوئے، اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی

......جس میں کہا گیا کہ اگر تم پر یہ مصیبت آئی ہے تو تم اس سے دگنی مصیبت ان پر ڈال چکے ہو۔)

(تفسیر العیاشیؒ، جلد اول، صفحہ ۲۰۵ حدیث ۱۵۱)

مسلمانوں کا فدیہ کو اختیار کرنا

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن ابی شبیہ، ترمذی (انہوں نے اس حدیث کو ''حسن'' قرار دیا ہے)، ابن جریر اور ابن مردویہ نے حضرت امام علی علیہ السلام سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

جاء جبرئیل الی النبی (ص) فقال: یا محمد، ان الله قد کرہ ما صنع قومك فی اخذهم الاساریٰ وقد امرك ان تخیرهم بین امرین: اما ان یقدموا فتضرب اعناقهم و بین ان یأخذوا الفداء علی ان یقتل منهم عدتهم، فدعا رسول الله (ص) الناس فذکر ذلك لهم فقالوا: یا رسول الله، عشائرنا واقوامنا نأخذ فدائهم فنقوی به علی قتال عدونا، و یستشهد منا بعدتهم فلیس فی ذلك ما نکرہ، فقتل منهم یوم احد سبعون رجلاً عدة اساریٰ بدر

حضرت جبرئیلؑ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کی قوم نے مشرکین کو قیدی بنایا ہے یہ بات خداوند عالم نے ناپسند کی ہے، لہٰذا اس نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ان لوگوں کو دو چیزوں میں سے ایک اختیار کرنے کا کہیں یا ان قیدیوں کو لائیں اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں، یا ان سے فدیہ لے کر ان کی تعداد کے مطابق اپنے افراد کو قربان کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو بلایا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے آگاہ کیا، لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! وہ (مشرکین) ہمارے ہی قوم وقبیلہ کے افراد ہیں، ہم ان سے فدیہ لینے کو اختیار کرتے ہیں تا کہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں طاقتور ہو جائیں اگر آئندہ جنگ میں اسی مقدار میں ہمارے افراد شہید ہو جائیں تو اس میں ہمیں کیا اعتراض یا ناپسندیدگی ہو سکتی ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جنگ احد میں مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے جو کہ جنگ بدر میں مشرکوں کے قید کئے گئے افراد کی تعداد کے برابر تھے

(تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۹۳)

اسی روایت کو تفسیر مجمع البیان میں بھی حضرت علی علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، (ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۵۳۳) اور تفسیر قمی میں بھی یہی روایت مذکور ہے۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر مجمع البیان میں "وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا......" کے ذیل میں حضرت امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "نزلت فی شھداء بدر واحد معاً" یہ آیات جنگ بدر اور جنگ احد دونوں کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ (مجمع البیان، جلد ۲ صفحہ ۵۳۵)

اس مطلب پر مشتمل کثیر روایات تفسیر در منثور اور دیگر کتب میں مذکور ہیں اور آپ اس سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیات مبارکہ میں شہداء کے بارے میں جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ عمومیت رکھتا ہے یعنی اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو خدا کی راہ میں مارا جائے، خواہ وہ حقیقتاً میدانِ جنگ میں قتل کیا جائے یا اس پر شہید کا حکم لاگو ہوتا ہو، (جسے بھی اللہ کی راہ میں مارا جانے والا کہا جائے گا وہ اس آیت میں مذکور لفظ "شہداء" کا مصداق ہوگا)، ان آیات کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس جنگ میں مارے جانے والے افراد (شہیدوں) کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو "بئر معونہ" میں ہوئی۔ (بئر معونہ اس علاقہ کا نام ہے جہاں مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی اور وہاں مسلمانوں کے کچھ افراد شہید ہوئے) (ملاحظہ ہو، تفسیر مجمع البیان، جلد ۲ صفحہ ۵۳۵)۔ اس واقعہ میں شہید ہونے والے صحابہ کرام کی تعداد کے بارے میں بعض مورخین نے ستر اور بعض نے چالیس ذکر کیا ہے کہ جنہیں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بھیجا تھا کہ عامر بن طفیل اور اس کی قوم کو اسلام کی دعوت دیں، عامر اور اس کی قوم اس کنویں کے گرد رہتے تھے جو معونہ کے علاقہ میں تھا (بئر معونہ)، اصحاب النبیؐ نے سب سے پہلے ابوملحان انصاری کو اپنا نمائندہ بنا کر ان کی طرف بھیجا، انہوں نے اسے قتل کر دیا، پھر وہ دیگر صحابہ کرام پر ٹوٹ پڑے اور ان کے درمیان سخت لڑائی ہوئی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجے ہوئے تمام افراد کو شہید کر دیا گیا۔ (رضی اللہ عنہم)

شیعوں کے بارے میں امام صادقؑ کا فرمان

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

هم والله شیعتنا حین صارت ارواحهم فی الجنة واستقبلوا الکرامة من الله عزوجل وعلموا انهم کانوا علی الحق و علی دین الله عزوجل فاستبشروا بمن لم یلحقوا بهم من اخوانهم من خلفهم من المومنین

کہ اللہ کی قسم وہ ہمارے شیعہ ہی ہیں کہ جب ان کی روحیں بہشت پہنچیں اور انہوں نے اپنے لئے خدائی اعزازات کا مشاہدہ کیا تو انہیں معلوم ہو گیا اور یقین حاصل ہو گیا کہ وہ حق پر تھے اور خدا کے دین پر تھے، تو وہ ایک

دوسرے کو اپنے ان مومن بھائیوں کے بارے میں بھی خوشخبری دینے لگے جو ابھی ان سے ملحق نہیں ہوئے۔

(تفسیر العیاشی جلد اول، تفسیر قمی جلد اول صفحہ ۱۲۷)

یہ روایت بھی آیت کے ایک مصداق کے بیان پر مشتمل ہے، اور اس میں ان کے آگاہ ہونے اور یقین حاصل کرنے کا جو تذکرہ ہوا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت انہیں عین الیقین حاصل ہو گا جبکہ وہ دنیا میں علم الیقین حاصل کر چکے تھے، نہ یہ کہ وہ دنیا میں شک وشبہ کا شکار تھے اور بہشت پہنچ کر انہیں اپنے بارے میں حق پر ہونے اور خدائی دین پر ہونے کا یقین حاصل ہو گیا۔

بہشت میں شہداء کی عظمت

تفسیر ''درمنثور'' میں احمد، ہناد، عبد بن حمید، ابوداؤد، ابن جریر، ابن منظر، حاکم (انہوں نے حدیث کو صحیح قرار دیا) کے حوالہ سے اور بیہقی نے کتاب الدلائل میں ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے حدیث کو صحیح قرار دیا) اور بیہقی نے کتاب الدلائل میں ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لما اصیب اخوانکم باحد جعل الله ارواحهم فی اجواف طیر خضر تردد انهار الجنة و تأکل من اثمارها و تأوی الی قنادیل من ذهب معلقة فی ظل العرش. فلما وجدوا طیب مأکلهم و مشربهم و حسن مقیلهم قالوا: انا احیاء فی الجنة نرزق لئلا یزهدوا فی الجهاد ولا ینکلوا عن الحرب. فقال الله: انا ابلغکم عنکم فانزل الله هٰؤلاء الآیات: "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا... الآیة وما بعدها

جب تمہارے بھائی جنگ احد میں مارے گئے تو خداوند عالم نے ان کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے شکموں میں رکھ دیں، اور وہ بہشت کی نہروں پر پہنچے اور انہوں نے بہشت کے پھل کھائے اور عرش کے سایہ میں لٹکتی ہوئی سونے کی قندیلوں میں قیام پذیر ہو گئے اور جونہی انہوں نے اپنی کھائی اور پی ہوئی چیزوں کی لذتوں کو محسوس کیا اور اپنی قیامگاہوں کی خوبصورتی کا مشاہدہ کیا تو کہنے لگے کہ اے کاش! ہمارے بھائی بھی آگاہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا مقام عطا کیا ہے، (بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا:) ہم بہشت میں زندہ ہیں اور خدائی رزق سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، اگر انہیں معلوم ہو تو وہ جہاد سے ہرگز منہ نہ موڑیں اور نہ ہی جنگ سے روگردانی کریں، اس وقت خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: میں تمہاری طرف سے انہیں آگاہ کرتا ہوں، چنانچہ یہ آیات نازل

ہوئیں: ''اور تم خدا کی راہ میں مارے جانے والوں کے بارے میں گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں...... الخ''

(تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۹۵)

اس مطلب پر مشتمل متعدد روایات موجود ہیں جو ابوسعید خدری، عبداللہ بن مسعود، ابوالعالیہ، ابن عباس اور ان کے علاوہ دیگر محدثین سے منقول ہیں اور ان میں سے بعض روایات میں وارد ہوا ہے: ''فی صور طیور خضر'' کہ خداوند عالم نے ان روحوں کو سبز رنگ کے پرندوں کی شکلوں میں قرار دیا، چنانچہ ابوالعالیہ کی روایت میں اسی طرح ذکر ہوا ہے، اور ابوسعید کی روایت میں ''فی طیر خضر'' (سبز پرندے میں) کے الفاظ مذکور ہیں، اور ابن مسعود کی روایت میں ''کطیر خضر'' (سبز پرندے کی طرح) کے الفاظ مذکور ہیں، بہر حال یہ تمام الفاظ ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور قریب المعنی ہیں۔

آئمہ اہل بیتؑ کے اسناد سے منقول ہے کہ یہ روایت ان کی خدمت میں پیش کی گئی تو انہوں نے اس کا حضرت پیغمبر اسلام ﷺ سے وارد ہونا درست قرار نہیں دیا، بعض روایات میں ہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس روایت کی تاویل و توجیہ فرمائی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم الثبوت قواعد الحدیث کی بناء پر کسی بھی روایت کی بابت ضروری ہے کہ اسے رد کرنے سے بچنے کے لئے اس کی تاویل و توجیہ کی جائے۔

اس کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ یہ روایات اخروی بہشت میں شہداء کا حال بیان کرنے کے مقام میں نہیں بلکہ ان میں بہشت سے مراد برزخی بہشت ہے، اس کا ثبوت ابن جریر کی روایت میں موجود ہے جو مجاہد کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے کہ جس میں انہوں نے کہا: ''یرزقون من ثمر الجنة، و یجدون ریحها ولیسوا فیها'' (وہ بہشت کے پھل کھاتے ہیں اور ان کی خوشبو سونگھتے ہیں، جبکہ وہ بہشت میں نہیں ہیں) اسی طرح ابن جریر نے سدی کے حوالہ سے جو روایت ذکر کی ہے اس میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ اس میں یوں مذکور ہے: ''ان ارواح الشهداء فی اجواف طیر خضر فی قنادیل من ذهب معلقة بالعرش فهی ترعٰی بکرة وعشیة فی الجنة و تبیت فی القنادیل'' (شہداء کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے شکموں میں ہیں جو سونے کی ان قندیلوں میں ہیں جو عرش سے آویزاں ہیں، وہ صبح و شام بہشت میں چارہ کھاتے ہیں اور قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں)۔

سابق الذکر مطالب میں برزخ کی بحث کے حوالہ سے یہ بات آپ کو معلوم ہو چکی ہے کہ ان دو روایتوں کے مضمون سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس سے دنیا کی جنت مراد لینا ہی درست ہے جو کہ برزخ ہے نہ کہ آخرت کی جنت۔

حمراء الاسد کا واقعہ

تفسیر ''درمنثور'' میں آیہ مبارکہ ''اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ......'' کے ذیل میں مذکور ہے کہ ابن اسحاق، ابن جریر اور بیہقی

نے (اپنی کتاب الدلائل میں) عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا:

خرج رسول اللہ (ص) لحمراء الاسد وقد اجمع ابوسفیان بالرجعة الی رسول اللہ (ص) و اصحابہ، وقالوا: رجعنا قبل ان نستأصلهم لنكرن علی بقیتهم. فبلغه. ان النبی(ص) خرج فی اصحابه یطلبهم فثنی ذلك اباسفیان و اصحابه و مرركب من عبدالقیس، فقال لهم ابوسفیان: بلغوا محمداً انا قد اجمعنا الرجعة الی اصحابه لنستأصلهم، فلما مرالركب برسول اللہ(ص) بحمراء الاسد اخبروه بالذی قال ابوسفیان، فقال رسول اللہ(ص) والمؤمنون معه: حسبنا اللہ و نعم الوكیل، فانزل اللہ فی ذلك: "اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ..."

حضرت پیغمبر اسلامؐ دشمن کے مقابلے میں حمراء الاسد کی طرف روانہ ہوئے چونکہ ابوسفیان نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ دوبارہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر حملہ کردے اور ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم اس لئے واپس آئے ہیں تاکہ ان کے ہم تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم ان کے باقی ماندہ افراد کا صفایا کردیں، ابوسفیان کو خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ ان کی تلاش میں نکل پڑے ہیں، یہ بات ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو سخت ناگوار گزری، اس اثناء میں وہاں سے قبیلہ عبدالقیس کا قافلہ گزر رہا تھا، ابوسفیان نے ان سے کہا کہ محمد کو اطلاع دے دو کہ ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ واپس آئیں اور ان کے اصحاب کا صفایا کردیں، جب وہ قافلہ حمراء الاسد کے مقام پر پہنچا تو انہوں نے ابوسفیان کی بات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچادی، اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں نے یہ الفاظ کہے: "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہتر نگہبان ہے)۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ............" (وہ لوگ کہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہا......) (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۰۱)

اس روایت کو مرحوم قمیؒ نے اپنی تفسیر میں تفصیلاً ذکر کیا ہے اور اس میں بیان ہوا ہے کہ حضرت رسول خداؐ ان لوگوں کو بھی اپنے ہمراہ حمراء الاسد لے گئے جو جنگ احد میں زخمی ہوگئے تھے، بعض روایات میں ہے کہ آنحضرتؐ جنگ احد کے تمام ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لے گئے، بہرحال دونوں کی برگشت ایک ہی مطلب کی طرف ہے۔

(تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر قمی، جلد اول، صفحہ ۱۲۴)

غزوۂ جیش السویق

تفسیر "درمنثور" میں مذکور ہے کہ موسیٰ بن عقبہ نے اپنی کتاب "المغازی" میں اور بیہقی نے اپنی کتاب الدلائل میں

ابن شہاب سے روایت کی ہے انہوں نے کہا:

ان رسول الله(ص) استنفر المسلمین لموعد ابی سفیان بدراً فاحتمل الشیطان اولیائه، من الناس فمشوا فی الناس یخوفهم، وقالوا: قد اخبرنا ان قد جمعوا لکم من الناس مثل اللیل یرجون ان یوا قعوکم فینتهبوکم فالحذر الحذر، فعصم الله المسلمین من تخویف الشیطان فاستجابوا الله ورسوله، وخرجوا ببضائع لهم، وقالوا: ان لقینا ابا سفیان فهو الذی خرجناله وان لم نلقه اتبعنا بضائنا، وکان بدر متجراً یوافی کل عام فانطلقوا حتی اتوا موسم بدر فقضوا منهم حاجتهم، واخلف ابوسفیان الموعد فلم یخرج هو ولا اصحابه، و مر علیهم ابن حمام فقال: من هؤلاء؟ قالوا: رسول الله (ص) و اصحابه ینتظرون ابا سفیان و من معه، من قریش، فقدم علی قریش فاخبرهم، فارعب ابوسفیان ورجع الی مکة، وانصرف رسول الله (ص) الی المدینة بنعمة من الله و فضل، فکانت تلك الغزوة تعد "غزوة جیش السویق" و کانت فی شعبان سنة ثلاث۔

"حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ابوسفیان نے مقابلے میں بدر کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا، مگر شیطان نے اپنے انسانی دوستوں کے ذریعے لوگوں کو ابوسفیان سے خوفزدہ کرنے کا اقدام کیا چنانچہ انہوں نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ابوسفیان نے تمہارے ساتھ جنگ کرنے کے لئے بہت بڑا لشکر تیار کرلیا ہے اور وہ شب کی مانند حملہ آور ہو کر فضا کو تاریک کر دیتے ہیں، وہ تم پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تا کہ تمہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیں، لہٰذا ان سے بچو اور اپنے تحفظ کی تدبیریں کرو"۔

خداوند عالم نے مسلمانوں کو ان شیطانی دھمکیوں سے محفوظ رکھا اور انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کا عملی دم بھرا، چنانچہ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اسے اپنے ساتھ لے کر نکل پڑے اور اس عزم کے ساتھ چلے کہ اگر بدر میں ابوسفیان سے ٹکراؤ ہو گیا تو اس سے نمٹ لیں گے کیونکہ اس سفر میں ہمارا بنیادی مقصد ہی اس کا مقابلہ کرنا ہے اور اگر اس سے آمنا سامنا نہ ہوا تو ہم اپنے سرمایہ سے بدر کے بازار میں خریداری کر لیں گے، کیونکہ انہی دنوں ہر سال بدر میں ایک بڑی منڈی لگتی تھی جس میں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے، بہر حال مسلمان اسی عزم و ارادہ کے ساتھ چل پڑے اور بدر میں قائم سالانہ منڈی میں پہنچ گئے اور اپنی ضروریات کی چیزیں خریدیں، ابوسفیان نے مقررہ وقت کی خلاف ورزی کی اور نہ وہ آیا اور نہ ہی اس کا کوئی ساتھی آیا، اس دوران ابن حمام کا وہاں سے گزر ہوا اور اس نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اس سے کہا گیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھی ہیں جو ابوسفیان اور اس کے ساتھ اس کے قریشی ساتھیوں کا انتظار کر رہے ہیں، وہ قریش

کے پاس آیا اور انہیں صورتحال سے باخبر کیا، ابوسفیان خوفزدہ ہوگیا اور مکہ کو واپس چلا گیا، ادھر حضرت رسول خداؐ اس خدائی فضل وکرم اور غلبہ کی نعمت کے ساتھ مدینہ منورہ واپس چلے گئے، اس غزوہ کو ''غزوہ جیش سویق'' سے موسوم کیا جاتا ہے جو کہ ماہِ شعبان ۳ ہجری کو رونما ہوا۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۱۰۱)

اس روایت کو تفسیر درمنثور میں مذکورہ بالا اسناد کے علاوہ دیگر راویوں کے حوالہ سے بھی ذکر کیا گیا ہے، اور تفسیر مجمع البیان میں تفصیلی طور پر اس کا تذکرہ ہوا ہے اور اس میں اس کی بابت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے یوں مذکور ہے:

ان الآیات نزلت فی غزوۃ بدر الصغریٰ، والمراد بجیش السویق جیش ابی سفیان فانہ خرج من مکۃ فی جیش من قریش وقد حملوا معھم احمالاً من سویق، فنزلوا خارج مکۃ فاقتاتوا بالسویق، ثم رجعوا الی مکۃ لما اخذھم الرعب من لقاء المسلمین ببدر، فسماھم الناس جیش السویق تھکمًا واستھزاءاً

یہ آیات جنگ بدرِ صغریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور ''جیش السویق'' سے مراد ابوسفیان کا لشکر ہے کیونکہ وہ مکہ سے قریش کا ایک لشکر اپنے ہمراہ لے کر نکلا اور انہوں نے ''سویق'' کے گٹھے اپنے ساتھ لئے یہاں تک کہ مکہ سے باہر پہنچ کر اپنی سواریوں سے اتر گئے اور وہاں پڑاؤ کیا، پھر اسی سویق ہی کو انہوں نے اپنی غذا قرار دے کر اس سے استفادہ کرتے رہے، اور جب وہ بدر میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے سے ناتوانی کا احساس کرنے لگے اور ان سے مرعوب ہوگئے تو مکہ واپس چلے گئے، اسی نسبت سے لوگوں نے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے انہیں ''سویق کا لشکر'' کے نام سے موسوم کردیا۔ (ملاحظہ ہو، تفسیر مجمع البیان جلد ۲، صفحہ ۵۴۰)

اسی کتاب تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ نسائی، ابن ابی حاتم اور طبرانی نے عکرمہ کے صحیح اسناد سے جناب ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ جب مشرکین جنگ اِحد سے واپس آئے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''لا محمداً قتلتم ولا الکواعب اردفتم، بئس ما صنعتم، ارجعوا''، نہ تم نے محمد کو قتل کیا اور نہ ہی ان کی بیٹیوں پر قابو پایا، کس قدر برا کام تم نے انجام دیا، واپس جاؤ...... اور کچھ کرکے آؤ......، ان کی یہ باتیں حضرت رسول خداؐ کو معلوم ہوئیں تو آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو ندا دی، مسلمان آپؐ کے بلاوے پر روانہ ہوگئے، یہاں تک کہ ''حمراء الاسد'' یا ''بئر ابی عتبہ'' پر پہنچ گئے، مشرکوں کو معلوم ہوا تو وہ گھبرا گئے اور فیصلہ کرلیا کہ اب واپس چلے جائیں اور پھر آئندہ سال آکر مقابلہ کریں گے، چنانچہ حضرت رسول خداؐ بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس مدینہ چلے گئے، اسی کو ''غزوہ'' قرار دیا گیا اور اس کی نسبت سے خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: ''اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ...... الخ'' (وہ لوگ کہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہا......) ابوسفیان نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے کہہ دیا تھا کہ اب آپ کا اور ہمارا

مقابلہ بدر کے وقت میں ہوگا کیونکہ تم لوگوں نے وہاں ہی ہمارے دوستوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، چنانچہ جب بدر کا وقت آ گیا تو جو بزدل تھے وہ واپس لوٹ گئے اور جو بہادر تھے وہ مقابلے کے لئے تیار ہو گئے کہ اگر لڑائی ہوگئی تو اپنی قوت کا مظاہرہ کریں گے ورنہ تجارت کر کے واپس آ جائیں گے۔ اسی ارادہ کے ساتھ آ گئے یعنی مسلمان بدر کے مقام پر پہنچ گئے مگر مشرکین میں سے کوئی بھی نہ آیا، لہٰذا وہ خرید وفروخت کر کے واپس چلے گئے، اسی سلسلہ میں خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: ”فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ......“ (تو وہ اللہ کی نعمت وفضل سے پلٹ گئے......) (تفسیر ”درمنثور“ جلد ۲ صفحہ ۱۰۱)

اس روایت کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں (جبکہ یہ طویل روایت ہماری اختصار گوئی کی روش کے منافی ہے) کیونکہ سابقہ روایات کی مباحث میں ہم نے نمونہ کے طور پر ہر باب سے چند جامع روایات کے ذکر پر اکتفاء کی کہ اس سے اہل بحث وتحقیق کو اس نکتہ پر غور وفکر کرنے کا موقع مل سکے کہ اسباب نزول کی بابت بیان کی جانے والی ان روایات میں مذکور مطالب دراصل راویوں کی ذاتی آراء ونظریات ہیں اور ان کی روش یہی ہے کہ وہ عموماً تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہیں اور پھر آیات مبارکہ میں سے جس آیت میں ان واقعات سے مطابقت کا پہلو نظر آتا ہے اسے اس کے ساتھ ذکر کر دیتے ہیں جس سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید یہی واقعات ان آیات کے نزول کے اسباب ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات اس طرح کے طرز تفکر کا نتیجہ ایک ہی آیت یا ایک سیاق واسلوب کی حامل متعدد آیات کے حصے بخرے ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ہر حصہ کا مستقل سبب نزول متعین کیا جاتا ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ آیت کا پہلا حصہ فلاں واقعہ سے تعلق رکھتا ہے، اس طرح کے عمل سے آیات کا نظم وترتیب اور سیاق واسلوب درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہ بات ان روایات کے ضعیف وبے اعتبار ہونے کے عوامل واسباب میں سے ایک ہے کہ جو اسبابِ نزول کی بابت وارد ہوئی ہیں۔

مزید برآں یہ کہ ہم نے ابتدائے بحث میں اس مطلب کی طرف اشارہ کر کے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دینی اختلاف بھی ان روایات کے اندازِ بیان میں مؤثر واقع ہوا ہے اور ہر شخص نے ان کی بابت اپنے مذہبی مخصوص رجحانات کے مطابق اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی توجیہ وتاویل کی اور ان میں مذکور مطالب کو اپنے عقائد ونظریات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

ان کے علاوہ سیاسی ومعاشرتی عوامل بھی ہر دور میں حقائق کی پردہ پوشی اور ان کی صورتیں بگاڑنے میں کارفرما رہے ہیں اور تمام تر وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے حقائق ومعارف کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے لہٰذا ہر اہلِ بحث وتحقیق پر لازم ہے کہ حقائق کے فہم وادراک کی بابت ان اسباب وعوامل کی کارگزاری کو نظرانداز نہ کرے اور نہ ہی ان کو معمولی نظر سے دیکھے، (اللہ تعالیٰ ہی حق وحقیقت کی راہ دکھانے والا ہے)۔

ایک تاریخی بحث

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ احد میں مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ حمزہ بن عبدالمطلب بن ہاشم
۲۔ عبداللہ بن جحش
۳۔ مصعب بن عمیر
۴۔ شماس بن عثمان

ان چار حضرات کا تعلق شہدائے مہاجرین سے ہے۔

۵۔ عمرو بن معاذ بن نعمان
۶۔ حارث بن انس بن رافع
۷۔ عمارہ بن زیاد بن سکن
۸۔ سلمہ بن ثابت بن وقش
۹۔ عمرو بن ثابت بن وقش
۱۰۔ ثابت بن وقش
۱۱۔ رفاعہ بن وقش
۱۲۔ حسیل بن جابر ابو حذیفہ الیمان
۱۳۔ صیفی بن قیظی
۱۴۔ حباب بن قیظی
۱۵۔ عباد بن سہل
۱۶۔ حارث بن اوس بن معاذ
۱۷۔ ایاس بن اوس
۱۸۔ عبید بن تیہان
۱۹۔ حبیب بن یزید بن تیم
۲۰۔ یزید بن حاطب بن امیہ بن رافع
۲۱۔ ابوسفیان بن حارث بن قیس بن زید

۲۲۔ حنظلہ بن ابی عامر (غسیل الملائکہ)

۲۳۔ انیس بن قتادہ

۲۴۔ ابوحبہ بن عمر بن ثابت

۲۵۔ عبداللہ بن جبیر بن نعمان (تیراندازوں کا سردار)

۲۶۔ ابوسعد خیثمہ بن خیثمہ

۲۷۔ عبداللہ بن سلمہ

۲۸۔ سبیع بن حاطب بن حارث

۲۹۔ عمرو بن قیس

۳۰۔ قیس بن عمرو بن قیس

۳۱۔ ثابت بن عمرو بن زید

۳۲۔ عامر بن مخلد

۳۳۔ ابوہبیرہ بن حارث بن علقمہ بن عمرو

۳۴۔ عمرو بن مطرف بن علقمہ بن عمرو

۳۵۔ اوس بن ثابت بن منذر (برادر حسان بن ثابت)

۳۶۔ انس بن نضر (انس بن مالک خادم النبیؐ کے چچا)

۳۷۔ قیس بن مخلد

۳۸۔ کیسان (بنی نجار کا غلام)

۳۹۔ سلیم بن حارث

۴۰۔ نعمان بن عبد عمرو

۴۱۔ خارجہ بن زید بن ابی زہیر

۴۲۔ سعد بن ربیع بن عمرو بن ابی زہیر

۴۳۔ ابوس بن ارقم

۴۴۔ مالک بن سنان (والد ابوسعد خدری) از قبیلہ خدرہ

۴۵۔ سعید بن سوید

۴۶۔ عتبہ بن ربیع

۴۷۔ ثعلقبہ بن سعد بن مالک

۴۸۔ سقف بن فروہ بن بدوی

۴۹۔ عبداللہ بن عمرو بن وہب
۵۰۔ ضمرہ (حلیف بن طریف)
۵۱۔ نوفل بن عبداللہ
۵۲۔ عباس بن عبادہ
۵۳۔ نعمان بن مالک بن ثعلبہ
۵۴۔ مجدد بن زیاد
۵۵۔ عبادہ بن حسحاس

(نعمان، مجدد اور عبادہ تینوں ایک ہی قبر میں مدفون ہیں)

۵۶۔ رفاعہ بن عمرو
۵۷۔ عبداللہ بن عمرو (از قبیلہ بنی الحزام)
۵۸۔ عمرو بن جموح (از قبیلہ بنی حزام)

(عبداللہ اور عمرو دونوں ایک ہی قبر میں دفن ہوئے)

۵۹۔ خلاد بن عمرو بن جموح
۶۰۔ ابوایمن (غلام مغرو بن جموح)
۶۱۔ سلیم بن عمرو بن حدیدہ
۶۲۔ عنترہ (غلام سلیم)
۶۳۔ سہل بن قیس بن ابی کعب
۶۴۔ ذکوان بن عبدقیس
۶۵۔ عبید بن معلیٰ
۶۶۔ مالک بن تمیلہ
۶۷۔ حارث بن عدی بن خرشہ
۶۸۔ مالک بن ایاس
۶۹۔ ایاس بن عدی
۷۰۔ عمرو بن ایاس

یہ وہ ستر افراد ہیں جن کے اسماء ابن ہشام نے اپنی مشہور کتاب سیرۃ النبیؐ میں لکھے ہیں۔

(ملاحظہ ہو سیرت النبیؐ، مولفہ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۵۹)

آیات ۱۷۶ تا ۱۸۰

○ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

○ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

○ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۗ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

○ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

○ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۗ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

ترجمہ

○ ''اور جو لوگ کفر کی جانب تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں وہ آپ کے پریشان ہونے کا سبب نہ بنیں، وہ خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے، خدا چاہتا ہے کہ وہ آخرت میں کوئی حصہ نہ پائیں (اخروی نعمتوں سے محروم ہوں) اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب مقرر ہے''

(۱۷۶)

○ ''جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر خرید کر لیا ہے وہ خدا کا ہرگز کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اور ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے''

(۱۷۷)

○ ''کفر اختیار کرنے والے یہ گمان نہ کریں کہ ہم انہیں جو مہلت دے رہے ہیں اس میں ان کے لئے بہتری ہے، ہم نے انہیں جو چھوٹ دے رکھی ہے وہ اس لئے ہے کہ جتنا زیادہ گناہ کرنا چاہیں بے شک کر لیں کہ بالآخر ان کے لئے ذلیل و رسوا اور بے بس کر دینے والا عذاب مقرر ہے''

(۱۷۸)

○ ''خدا مؤمنوں کو تمہاری موجودہ حالت پر چھوڑ نہیں سکتا جب تک کہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے، اور خدا تمہیں غیبی رازوں سے آگاہ نہیں کرے گا، البتہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اس مقصد کے لئے چن لیتا ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ، اور اگر تم ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے بہت بڑا اجر ہوگا''

(۱۷۹)

○ ''اور جو لوگ خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں وہ ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ ایسا کرنا ان کے لئے بہتر ہے بلکہ یہ ان کے لئے برا ہے، جو کچھ وہ بخل کر کے بچاتے ہیں وہ قیامت کے دن ان کے لئے گلے کا طوق قرار دیا جائے گا، اور آسمان اور زمین میں جو کچھ موجود ہے وہ صرف خدا کا ہے اور خدا تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے''۔

(۱۸۰)

تفسیر و بیان

ان آیات کا تعلق سابق الذکر ان آیات مبارکہ سے ہے جو جنگ احد کے تذکرہ پر مشتمل تھیں، گویا یہ سب اور بالخصوص ان میں سے پہلی چار آیتیں ان آیات کا تتمہ ہے کیونکہ ان آیات میں جو اہم ترین موضوع ذکر ہوا ہے وہ خدا کی طرف سے اپنے بندوں کی آزمائش وامتحان ہے، بنابرایں یہ آیات دراصل جنگ احد سے تعلق رکھنے والی آیات کے مطالب کا نچوڑ اور ان سے حاصلہ نتائج کو بیان کرتی ہیں، ان میں خداوند عالم اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کر رہا ہے کہ آزمائش و امتحان کا سلسلہ حتمی و ناگزیر ہے، کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں خواہ وہ کافر ہو یا مؤمن،، خداوند عالم دونوں طرح کے لوگوں کی آزمائش وامتحان کرتا ہے تا کہ جو کچھ بھی کسی کے باطن میں پوشیدہ ہے اسے ظاہر کرے، پھر کافر ہی کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنائے اور مومنوں میں سے اچھے اور برے کو الگ الگ کر دے۔

کافروں کی حرکتیں بے نتیجہ ہیں

○ ''وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ......''

(اور آپ کو پریشان نہ کریں وہ لوگ جو کفر میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں......)

اس آیت مبارکہ میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کو کافروں کی حرکتوں سے پریشان نہ ہونے کا کہا گیا ہے اور اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حقیقت الامر سے آگاہ کرتے ہوئے تسلی واطمینان دلایا گیا ہے کیونکہ لوگوں کا کفر کی بابت غیر معمولی طور پر کوشاں ہونا اور نور خداوندی کو بجھانے کی کوششوں میں ظاہری طور پر غلبہ حاصل کر لینا اس بات کا سبب بن سکتا تھا کہ اہل ایمان پریشان ہو کر کہیں یہ نہ سوچنے لگیں کہ کافر تو اللہ کے اس ارادہ پر غالب آ گئے ہیں جو اس نے اعلائے کلمہ حق کی بابت کیا ہے، لیکن جب وہ آزمائش وامتحان کے عمومی سلسلہ میں غور وفکر کریں تو انہیں یقین حاصل ہو جائے گا کہ حقیقت میں خدا ہی غالب

ہے اور سب لوگ اپنے مقصد تخلیق کی جانب رواں دواں ہیں اور اپنے اعمال کے ذریعے اپنے حقیقی ہدف و منزل مقصود تک پہنچنے کے درپے ہیں تا کہ خداوند عالم ان کے لئے تکوینی وتشریعی ہدایت کے قائم کردہ سلسلوں کو ان کے مقاصد سے ہمکنار کر دے، اس بناء پر کافر کو ہر طرح کی عافیت ونعمت اور طاقت سے بھرپور نوازتے ہوئے...... جو کہ حقیقت میں خدائی طرزِ عمل ہی کی صورت ہے...... اسے مہلت دیتا ہے کہ وہ طغیان وسرکشی کی آخری ممکنہ حد تک پہنچ جائے اور جتنا بھی معصیت کرنا چاہتا ہے کرلے، جبکہ مومن ہمیشہ آزمائش وامتحان کی کسوٹی پر رہتا ہے تا کہ اس کا باطن ہر طرح سے صاف وخالص ہو جائے اور اس کے ایمان میں کسی طرح کی ملاوٹ باقی نہ رہے، اور پھر نتیجتاً یا اللہ کے لئے خالص ومخلص ہو جائے یا شرک ہی شرک کی راہ پر گامزن ہو کہ جس سے ہلاکت وتباہی کے گہرے کھڈ میں اسی طرح گرے جس طرح اس کے علاوہ دیگر شیطانی گروہ کے افراد اور کفر کے پیشوا گرے ہیں۔

بنابراین، آیت مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے پریشان نہ ہوں اور جو روز بروز کفر میں سرگرم عمل ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لائے ہوئے ہیں، کیونکہ اگر آپ ان کی حرکتوں اور وسیع تر اقدامات کی وجہ سے پریشان ومغموم ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ گمان کرنے لگے ہیں کہ وہ اسی طرح سے خدا کو نقصان پہنچا سکیں گے جبکہ ایسی بات نہیں، وہ خدا کو ہرگز ضرر و نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ دست قدرت الٰہی نے ان پر قابو پایا ہوا ہے اور انہیں ان کی زندگی کے سفر میں اس راہ پر لگائے ہوئے ہے کہ وہ اس راہ پر چل کر آخرت کی نعمتوں سے یکسر محروم ہوں گے (اور وہی ان کے کفر کی آخری حد ہے) اور ان کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے، لہٰذا جملہ "وَلَا يَحْزُنْكَ" دراصل ارشادی امر ہے، اور جملہ "اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا......" نہی کی علت وسبب کے بیان پر مشتمل ہے اور جملہ: "يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ" ان کی طرف سے خدا کو ضرر و نقصان نہ پہنچا سکنے کی علت وسبب اور موضوع کی وضاحت کے لئے ہے۔

اس کے بعد خداوند عالم نے تمام کفار کے بارے میں بیان فرمایا کہ وہ خدا کو ضرر و نقصان نہیں پہنچا سکتے خواہ کفر میں تیزی سے آگے بڑھنے والے ہوں یا ان کے علاوہ دیگر کفار ہوں، لہٰذا جملہ "اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا......" جزئی کے بیان کے بعد کلی کے بیان کی طرح سے ہے یعنی پہلے ایک مورد کو بیان کیا گیا کہ جو لوگ کفر میں تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ خدا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اس کے بعد ارشاد ہوا کہ جو لوگ ایمان کے بدلے کفر خرید چکے ہیں وہ خدا کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے، تو اس میں عمومی طور پر اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ کفار خواہ کوئی بھی ہوں وہ خدا کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے، تو اس طرح "لَا يَحْزُنْكَ" کے ذریعے آنحضرتؐ کو پریشان ہونے سے روکنا بھی درست قرار پائے اور اس کی علت بھی بیان ہو جائے کہ وہ خدا کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے (اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ......) کیونکہ یہ جملہ عمومیت رکھتا ہے اور اس میں کلی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ کفار خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کہ جن میں وہ کفار بھی شامل ہیں

جو کفر میں تیزی سے کوشاں ہیں، اس بناء پر آیت کا عمومی معنی یہ ہوگا کہ ہم نے کہا ہے کہ کفر میں تیزی سے کوشاں افراد اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام کے تمام کفار خدا کا ذرہ بھر کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

کافروں کی غلط فہمی کا ازالہ

○ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

(اور گمان نہ کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا......)

خداوند عالم نے کفار کی حرکتوں کے بارے میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کو تسلی دینے اور اس مطلب کو بیان کرنے کے بعد کہ کفار خواہ کچھ بھی کرلیں لیکن وہ خدا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ دست قدرت خداوندی میں مسخر ہیں اور اس نے اس لئے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہوا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کے نتیجہ میں اخروی نعمتوں میں سے کچھ نہ پائیں، کلام کا رخ خود انہی (کفار) کی طرف موڑ دیا اور انہیں واضح طور پر آگاہ کیا کہ وہ خدا کی دی ہوئی مہلت اور ڈھیل سے کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہوں کیونکہ یہ تو انہیں تباہی اور گناہوں کے ارتکاب میں اضافہ کرنے کی راہ پر لا رہی ہے کہ جس کے پیچھے ذلت آمیز و رسوا کن عذاب ہے اور اس عذاب میں ان کی رسوائی و بے بسی کے سوا کچھ بھی نہیں، اور یہ سب کچھ آزمائش و امتحان کے سلسلہ کی تکمیل سے تعلق رکھتا ہے کہ سب کو ان کے مطلوبہ کمال سے ہمکنار کیا جائے۔

اہل ایمان کے امتحان کی غرض

○ مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ

(اور خدا مومنوں کو اس حال پر نہیں چھوڑے گا......)

اس آیت میں ایک بار پھر اہل ایمان کے بارے میں ارشاد ہوا کہ آزمائش و امتحان کا سلسلہ ان کی بابت بھی جاری ہے تاکہ انہیں بھی کمال سے ہمکنار کرنے کا ہدف حاصل ہو سکے اور خالص مومن کا غیر خالص مومن سے، اور پاک مومن کا ناپاک مومن سے امتیاز ہو سکے۔

سلسلہ آزمائش و امتحان کے حوالہ سے چونکہ یہ ممکن تھا کہ کوئی شخص گمان کرے کہ پاک و ناپاک اور مخلص و غیر مخلص

کے درمیان تمیز کرنے میں ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خداوند عالم مومنین کو آگاہ کردے کہ ناپاک وغیر مخلص افراد کونسے ہیں، اور پھر ان کی تمیز و پہچان کے لئے کسی آزمائش وامتحان کی ضرورت ہی باقی نہ رہے اور مومنین ان منافق و بیمار دل افراد کے ساتھ میل جول رکھنے اور پھر ان کی وجہ سے امتحان وآزمائش کا شکار ہونے سے بچ جائیں، تو اس طرح کے گمان کی نفی کرتے ہوئے خداوند عالم نے اپنے ساتھ مختص ومخصوص علم الغیب کے بارے میں واضح طور پر بیان کردیا کہ وہ اپنے رسولوں میں سے صرف اسے اس علم سے نوازتا ہے جسے چن لے، ان کے علاوہ کسی کو وہ علم عطا نہیں کرتا، اور اپنے رسولوں میں سے جسے بھی عطا کرے تو ممکن ہے وحی کے ذریعے ہی عطا کردے، اسی حوالہ سے ارشاد ہوا: "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ" (اور خدا تمہیں غیب سے آگاہ ہی نہیں دلاتا لیکن اس کام کے لئے اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کرلیتا ہے)۔

اس کے بعد اس مطلب کو بیان کیا کہ آزمائش وامتحان سے کوئی مستثنیٰ نہیں اور اس سے بچنے کا کوئی چارہ موجود نہیں لہٰذا ضروری ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ تاکہ تم پاکوں کے راستہ پر چل سکو اور ناپاک لوگوں کے راستہ سے بچ جاؤ، اور یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ صرف ایمان لانا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عمل صالح انجام دینا ضروری ہے کیونکہ عمل صالح ہی ہے جو ایمان وعقیدہ کو خدا تک پہنچا دیتا ہے اور ایمان کی پاکیزگی کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے پہلے یوں ارشاد فرمایا: "فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ" (پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر) اور اس کے تتمہ وتکمیل کے لئے یوں ارشاد فرمایا: "وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ" (اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہارے لئے بہت بڑا اجر وجزا ہے)

تین اہم نکات

زیر نظر آیت مبارکہ کے حوالہ سے جو مطالب ذکر کئے جاچکے ہیں ان سے درج ذیل تین اہم اور بنیادی نکات معلوم ہوتے ہیں:

(۱) نفوس کو کمال سے ہمکنار کرنا اور انہیں ان کی مطلوبہ اغراض ومقاصد اور اہداف (خواہ سعادت ہو یا شقاوت) تک پہنچانا جس سلسلہ ونظام کا متقاضی ہے اس سے دور بھاگنا ممکن نہیں بلکہ اس میں رہ کر اپنی منزل مقصود کی راہ پر چلنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

(۲) پاکیزگی وناپاکی اگرچہ خود افراد سے منسوب ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود ان کا دارومدار ایمان اور کفر پر ہے

جو کہ دونوں لوگوں کے اختیاری امور میں سے ہیں، یہ بات قرآن مجید کی ان لطیف حقیقتوں میں سے ہے جن سے متعدد اسرار توحید کی راہیں کھلتی ہیں اور ان کی بابت درج ذیل آیتوں میں اثباتی اشارے پائے جاتے ہیں:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۴۸

○ ''وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ''

(سب کے لئے ایک راہ وسمت ہے اور ہر شخص اس کی طرف رخ کئے ہوئے اور رواں دواں ہے، پس تم نیکیوں کی طرف پیش قدمی کرو)

اس آیت کو درج ذیل آیت کے تناظر میں دیکھیں تو مطلب واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے:

سورۂ مائدہ، آیت: ۴۸

○ ''وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ''

(لیکن وہ تمہیں آزماتا ہے ان چیزوں کی بابت جو اس نے تمہیں عطا کی ہیں، پس تم نیکیوں میں سبقت لو اور پیش قدمی کرو)

اس موضوع کی بابت تفصیلی و تکمیلی مطالب درج ذیل آیت مبارکہ کی تفسیر میں بیان کئے جائیں گے:

سورۂ انفال، آیت: ۳۷

○ ''لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ''

(تا کہ خدا ناپاک کو پاک سے جدا کرے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر قرار دے)

(۳) خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا زندگی کی پاکیزگی کی بنیاد ہے جو کہ کسی شخص کے پاک ہونے سے عبارت ہے، البتہ اجر کا حصول تقویٰ اور عمل صالح انجام دینے پر موقوف ہے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے پہلے پاک اور ناپاک کے درمیان تمیز کرنے کی بات کی، اس کے بعد ارشاد فرمایا: ''فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ'' (پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر) اس کے بعد اجر وجزا کے تذکرہ میں تقویٰ کو ایمان کے بعد اضافہ کر کے یوں ارشاد فرمایا: ''وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ'' (اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہارے لئے بہت بڑا اجر ہوگا)۔

اسی بیان سے درج ذیل آیت مبارکہ کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے:

سورۂ نحل، آیت: ۹۷

○ ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ''

(جو شخص نیک عمل انجام دے خواہ وہ مرد ہو یا عورت جبکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزگی کی حامل زندگی عطا کریں

گے اورانہیں ان کے کئے سے کہیں زیادہ اچھا اجر عطا کریں گے)۔

اس آیت میں "احیاء" یعنی زندگی عطا کرنا ایمان کا نتیجہ اور اس پر متفرع ہے، اور جزا و اجر عمل صالح کا نتیجہ اور اس کی فرع ہے، بنابرایں ایمان پاکیزہ زندگی کی روح ہے اور جہاں تک اس زندگی کی بقاء کا تعلق ہے کہ جس پر اس کے آثار مرتب ہوں تو وہ عمل صالح پر موقوف ہے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے طبیعی و مادی زندگی اپنے وجود میں آنے اور تحقق پذیر ہونے میں حیوانی روح کی محتاج ہوتی ہے اور اس کی بقاء وجودی قوتوں اور اعضاء و جوارح سے بھرپور استفادہ کرنے کی محتاج ہوتی ہے، کہ اگر وجودی قوتیں اور جسمانی اعضاء و جوارح کام کرنا چھوڑ دیں تو وہ خود بھی ختم ہو جائیں گی اور زندگی کو بھی ختم کر دیں گی۔

خدائی نعمتوں میں کنجوسی کی ممانعت

○ "وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ......"

(اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں بخل کرنے والے یہ گمان نہ کریں......)

اس آیت مبارکہ سے پہلے دو آیتوں میں کفار کو ڈھیل دینے کا تذکرہ کیا گیا اور چونکہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں اور مال میں بخل و کنجوسی سے کام لینے والوں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنے والوں کا حال بھی انہی کفار جیسا ہے کیونکہ بخیل بھی کفار کی طرح اموال کو جمع کرنے پر خوشی اور فخر و مباہات کرتا ہے لہٰذا خداوند عالم نے کلام کا رخ ان کی طرف موڑا اور واضح طور پر بیان کیا کہ جس طرح کفار کو جو ڈھیل دی گئی ہے وہ ان کے لئے بری ہے اسی طرح خدا کے عطا کردہ مال میں بخل کرنا بھی برا ہے۔

اور مال و دولت کو "بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ" سے تعبیر کیا گیا تو اس میں بخل کرنے والوں کی مذمت و ملامت کی طرف اشارہ مقصود ہے، یعنی اس مطلب کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بخل کرنے والے کس قدر برے ہیں کہ جو مال خدا نے عطا کیا ہے اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

اور جملہ "سَيُطَوَّقُونَ......" بخل و کنجوسی کے برا ہونے کی علت کو بیان کرتا ہے کہ یہ کام اس لئے برا ہے کہ قیامت کے دن ان کے گلے میں طوق بنے گا۔

اور جملہ "وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" اور اسی طرح جملہ "وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ" "يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کے الفاظ سے جملہ حالیہ کے طور پر ہے۔

البتہ ایک احتمال یہ بھی دیا گیا ہے جو کہ بعید نظر آتا ہے کہ جملہ "وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" جملہ "يَبْخَلُونَ" کے فاعل کا جملہ حالیہ ہے، اور جملہ "وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ" بھی اسی سے جملہ حالیہ ہے یا پھر نیا مستقل جملہ ہے۔

روایات پر ایک نظر

کافر کی موت اور زندگی؟

تفسیر العیاشی میں مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کافر کے لئے موت بہتر ہے یا زندگی؟ (الموت خیر له ام الحیاة؟) تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: الموت خیر للمؤمنین والکافر لان الله یقول: ''وما عندالله خیر للابرار'' ویقول: ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لهم خیر..... '' کہ موت مومن و کافر دونوں کے لئے بہتر ہے کیونکہ خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لئے بہتر ہے اور خدا فرماتا ہے کہ کفار گمان نہ کریں کہ ہم نے انہیں جو ڈھیل دی ہے وہ ان کے لئے بہتر ہے، (پہلی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نیک لوگوں کے جو بھی مقدر و مقرر کرے وہ ان کے لئے بہتر ہے خواہ موت ہو یا زندگی، اور دوسری آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیاوی زندگی کافر کے لئے بہتر نہیں تو نتیجتاً موت اس کے لئے بہتر ہے)۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۰۶ حدیث ۱۵۵)

اس روایت میں جو استدلال مذکور ہے وہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے افکار سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ ان ہستیوں کے فرمودات میں ''ابرار'' یعنی نیک لوگوں سے مراد مومنین کا خاص گروہ ہے نہ کہ تمام مومنین، لیکن اگر یہ کہیں کہ امام محمد باقرؑ کے ارشاد گرامی میں ''ابرار'' سے تمام مومنین مراد ہیں کیونکہ ہر مومن میں ''بر'' یعنی نیکی پائی جاتی ہے تو مطلب درست ہوگا، یہی مطلب تفسیر ''درمنثور'' میں ابن عباس کے حوالہ سے مذکور ہے۔

آیات ۱۸۱ تا ۱۸۹

○ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾

○ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ ۚ

○ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

○ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

○ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

○ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

○ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

○ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

○ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ

○ ''اللہ نے ان کی بات سن لی ہے جنہوں نے کہا اللہ فقیر و نادار ہے جبکہ ہم غنی و بے نیاز ہیں، عنقریب ہم ان کی بات لکھ لیں گے اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی لکھیں گے اور کہیں گے کہ شعلہ اور آگ کا عذاب چکھو۔''

(۱۸۱)

○ ''یہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے کئے کی سزا ہے اور یقیناً اللہ بندوں پر ظلم وزیادتی کرنیوالا نہیں۔''

(۱۸۲)

○ ''انہی لوگوں نے کہا کہ اللہ نے ہم سے عہد کیا کہ جب تک کوئی رسول کوئی ایسی قربانی نہ لائے کہ جسے آگ کھا جائے تم اس پر ایمان نہ لانا، کہہ دیجئے کہ تمہارے پاس مجھ سے پہلے جو رسول آئے وہ واضح دلائل اور جو کچھ تم نے کہا ہے وہ لے آئے تھے تو پھر تم نے اُنہیں کیوں قتل کر دیا گیا اگر تم سچ کہتے ہو۔''

(۱۸۳)

○ ''پس اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ سے پہلے رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے جو کہ واضح نشانیاں و معجزات اور صحیفے و روشن کتاب لے کر آئے تھے۔''

(۱۸۴)

○ ''ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہی ہے اور تمہیں قیامت کے دن تمہارے پورے پورے اجر دیئے جائیں گے، پس جو شخص دوزخ کی آگ سے بچالیا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا تو وہ کامیاب ہوا، اور دنیاوی زندگی تو دھوکہ کے سوا کچھ نہیں۔''

(۱۸۵)

○ ''اور تمہیں تمہارے اموال اور تمہاری جانوں میں آزمایا جائے گا اور تم ان لوگوں سے کہ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور جن لوگوں نے شرک کیا سخت تکلیف دہ باتیں سنو گے، اگر تم نے صبر اختیار کیا اور تقویٰ اپنایا تو ایسا کرنا ہی پختہ ارادہ کا ثبوت ہے۔''

(۱۸۶)

○ ''اور جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد و پیمان لیا کہ جنہیں کتاب دی گئی کہ وہ اسے لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کریں گے اور اسے نہیں چھپائیں گے تو انہوں نے اسے (اپنے عہد و پیمان کو) پس پُشت ڈال دیا اور اسے نہایت تھوڑی قیمت پر بیچ دیا، تو نہایت برا ہے وہ کہ جو انہوں نے لین دین کیا۔''

(۱۸۷)

○ ''ان لوگوں کے بارے میں کہ جو اپنے کئے پر خوشی سے پھوٹے نہیں سماتے اور چاہتے ہیں کہ جو کام انہوں نے کیا ہی نہیں اس پر ان کی تعریف کی جائے آپ یہ گمان ہی نہ کریں کہ انہیں عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا، بلکہ اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

(۱۸۸)

○ ''اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمانوں اور زمین کی ملکیت و حاکمیت، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

(۱۸۹)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ اپنی ماقبل آیات سے ارتباط رکھتی ہے کیونکہ ماقبل آیات عمومی صورت میں لوگوں کو اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی ترغیب وتشویق دلاتی تھیں اور انہیں سستی وکوتاہی، کمزوری و ناکامی اور بخل و کنجوسی سے دور رہنے کی تاکید کرتی تھیں، تو یہ سب کچھ یہودیوں کی ان باتوں کے حوالہ سے ہے جن میں وہ کہتے تھے: خدا فقیر ونادار ہے جبکہ ہم غنی و مالدار ہیں (اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ)، اور وہ ہر چیز کو مسلمانوں کے خلاف الٹ پلٹ کر پیش کرتے تھے اور رسالت کی آیات کی تکذیب کرتے تھے اور ان سے جس چیز کو بیان کرنے کا عہد ومعاہدہ کیا گیا تھا اسے چھپاتے تھے۔ زیر نظر آیات مبارکہ میں انہی موضوعات کا تذکرہ ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مومنین کے دلوں کی تقویت کے لئے ان کی استقامت وثابت قدمی اور صبر کی تعریف کے ساتھ انہیں اللہ کی راہ میں انفاق کی تشویق وتاکید کی گئی ہے۔

یہودیوں کے غلط اظہارات

○ ''لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ''

(خدا نے ان لوگوں کی بات سن لی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ونادار ہے جبکہ ہم مالدار و بے نیاز ہیں)

اس آیت مبارکہ میں جن لوگوں کے اظہارات کا حوالہ دیا گیا ہے ان سے مراد یہودی ہیں، چنانچہ اس کا اشاراتی ثبوت آیت کے ذیلی جملوں میں مذکور مطالب سے ملتا ہے کہ جن میں انبیاء کے ناحق قتل اور دیگر اعمال کا تذکرہ ہے اور وہ سب یہودیوں کی کارستانیاں ہیں۔

یہودیوں نے خدا کے فقیر ونادار ہونے اور اپنے غنی و مالدار ہونے کی بات اس وقت کی جب انہوں نے درج ذیل

آیت جیسی آیات کوسنا:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۴۵

○ ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا......''

(کون ہے جوخدا کوقرض دے، اچھا قرض......)

اس سلسلہ میں سابقہ آیت کے الفاظ ''وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ......'' (اور بخل کرنے والے گمان نہ کریں کہ......) سے مذکورہ بالا اظہارات کے یہودیوں سے ارتباط کا ثبوتی اشارہ ملتا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے یہ باتیں اس وجہ سے کیں کہ انہوں نے مومنوں کی اکثریت کوفقرونا داری کا شکار دیکھا تو ان پر طعنہ زنی کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اگر ان کا رب مالدار ہوتا توغیرتمندی دکھاتے ہوئے اپنے پیروکاروں کو مالدار کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ فقیرونادار ہے جبکہ ہم غنی و مالدار ہیں۔

اقوال واعمال کا محفوظ کیا جانا

○ ''سَنَکْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَھُمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ......''

(ہم ان کی باتوں اور ان کا انبیاء کوناحق قتل کرنا لکھ لیں گے......)

یہاں کتابت یعنی لکھنے سے محفوظ کرنا اورمحو ہونے سے بچانا مراد ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ ہم ان کے اقوال واعمال کو ان کے نامۂ اعمال میں لکھ دیں گے، بہرحال مقصد ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان کے اقوال واعمال کو محفوظ کریں گے۔

اور ''انبیاء کوناحق قتل کرنے'' سے مراد یہ ہے کہ وہ انہیں بھول کر یا غلطی ونادانی کی وجہ سے نہیں بلکہ جاننے اور پہچاننے کے بعد عمداً قتل کرتے تھے، اور خداوند عالم نے ان کے اظہارات ـــــ کہ خدا فقیر جبکہ ہم غنی ہیں ـــــ کے ساتھ ہی انبیاء کے ناحق قتل کا ذکر اس لئے کیا کہ یہ اظہارات کوئی چھوٹی بات نہیں بلکہ بہت بڑی بات ہے۔ اس میں خداوند عالم کی توہین ہوئی ہے۔

یہاں جملہ ''نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ'' (ہم کہیں گے کہ عذاب الحریق کو چکھو) میں حریق سے مراد آگ یا اس کا شعلہ ہے ''حریق'' کا معنٰی ''محرق'' یعنی جلانے والی بھی کیا گیا ہے، یعنی عذاب الحریق سے مراد جلانے والی آگ ہے۔

برے اعمال کا برا انجام

○ ''ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ............''

(یہ تمہارے کئے کا نتیجہ ہے..........)

یعنی یہ عذاب الحریق تمہارے ان اعمال کا نتیجہ ہے جو تم پہلے انجام دے چکے ہو، اعمال کو ہاتھوں (ایدیکم) کے ساتھ اس لئے نسبت دی گئی ہے کہ عام طور پر ہاتھ ہی کام کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں،

اور جملہ ''وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ'' جملہ ''بِمَا قَدَّمَتْ'' پر عطف ہے اور اعمال کے محفوظ کرنے اور عذاب الحریق کی سزا دینے کی علت بھی ہے۔ کیونکہ اگر اعمال کا محفوظ کیا جانا اور ان پر سزا نہ ہوتی تو اعمال کا نظام ہی بے معنی و بے مقصد ہو جاتا جو کہ بہت زیادہ ظلم ہے اور لوگوں کے کثیر اعمال کے ساتھ زیادتی و ناروا برتاؤ سے عبارت ہے، تو اس طرح خداوند عالم اپنے بندوں پر ظلام یعنی سخت ظلم کرنے والا اقرار پاتا جبکہ اس کی ذات اس سے پاک و منزہ ہے۔

خدا کی طرف غلط عہد کی نسبت

○ ''اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ......''

(وہ لوگ کہ جنہوں نے کہا: خدا نے ہم سے عہد کیا ہے......)

یہ آیت مبارکہ انہی لوگوں کے بارے میں ہے جن کا تذکرہ ماقبل آیت میں ہو چکا ہے، لفظ ''عہد'' فرمان کے معنی میں ہے، اور ''حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ'' میں لفظ ''قربان'' سے مراد ہر وہ نعمت اور وہ چیز ہے جسے خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ہدیہ دیا جائے، اور ''تَاْكُلُهُ النَّارُ'' میں ''اکل النار'' یعنی آگ کے کھا جانے کے الفاظ کنایۃً ذکر ہوئے ہیں اور ان سے مراد جلا دینا ہے، اور جملہ ''قد جاء کم رسل من قبلی'' میں ''رُسُلٌ'' یعنی پیغمبروں سے مراد حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور ان جیسے دیگر بنی اسرائیل کے وہ انبیاء مراد ہیں جو یہودیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

رسولوں کی تکذیب کا مذموم عمل

○ ''فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ''
(پس اگر انہوں نے آپ کی تکذیب کی ہے تو آپ سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہوئی......)

اس آیت میں حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے تو آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے......اور یہ مذموم عمل ہمیشہ ہوتا رہا ہے......

جملہ ''وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ'' میں لفظ ''زبر''، ''زبور'' کی جمع کا صیغہ ہے کہ جس کا معنی حکمتوں و نصیحتوں کی حامل کتاب ہے، اور ''زبر'' اور ''کتاب منیر'' سے یہاں نوحؑ کی کتاب، ابراہیمؑ کے صحیفے، موسیٰؑ کی تورات اور عیسیٰؑ کی انجیل مراد ہے۔

موت کے یقینی سلسلہ کا بیان

○ ''كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ''
(ہر نفس نے موت کو چکھنا ہے)

یہ آیت مبارکہ تصدیق کرنے والوں کو اجر و جزا کے وعدہ اور تکذیب کرنے والوں کے لئے سزا و عذاب کی وعید کے بیان پر مشتمل ہے۔ اور اس کی ابتداء ایک عمومی سلسلہ و نظام کے تذکرہ سے ہوئی کہ جو ہر ذی روح کے لئے یقینی و حتمی اور طے شدہ ہے (یعنی موت)

جملہ ''تُوَفَّوْنَ'' میں توفیہ (مصدر) کا معنی پورا پورا عطا کر دینا ہے۔ اسی آیت سے بعض مفسرین نے عالم برزخ کے وجود پر استدلال کیا ہے کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن تمہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا (تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد اور قیامت کے دن سے پہلے جو اجر و جزا ملے گی وہ پوری نہ ہوگی بلکہ تھوڑی سی ہوگی......اور وہی عالم برزخ میں ملنے والا اجر و جزا ہے......یہ استدلال بہت خوب ہے،

جملہ ''فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ'' میں ''زُحْزِحَ'' سے مراد دور کرنا ہے، اس کا اصل معنی کسی چیز کو جلدی جلدی اپنی طرف کھینچنا ہے،

لفظ ''فوز'' کا معنی مطلوب کو پا لینا اور مقصود کو حاصل کر لینا ہے،

لفظ ''غرور'' یا تو مصدر ہے جس سے فعل ماضی ''غر'' اور فعل مضارع ''یغر'' بنتا ہے یا اسم فاعل ''غار'' کی جمع کا صیغہ ہے۔

آزمائش وامتحان کی ایک صورت

○ ''لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ.....''
(تم ضرور آزمائے جاؤ گے اپنے اموال اور اپنی جانوں میں......)

صیغہ ''تبلون'' کا مصدر ''ابلاء'' ہے جس کا معنی آزمائش وامتحان ہے، خداوند عالم نے مومنین کی آزمائش و امتحان کا تذکرہ کرنے اور پھر یہودیوں کی ان باتوں کو بیان کرنے کے بعد کہ جن سے مومنین کے عزم وارادہ میں سستی و کمزوری پیدا ہونے کی راہ نکل سکتی تھی، مومنین کو آگاہ کیا کہ یہ خدائی آزمائش وامتحان بار بار آتا رہے گا اور اہل کتاب و مشرکین کی جھوٹی باتیں مومنین کو بار بار ستاتی رہیں گی اور ان کی سماعتوں پر وار کرتی رہیں گی لہٰذا انہیں اس حوالہ سے آمادہ وتیار رہنا چاہیے اور صبر وتقویٰ اختیار کرنا چاہیے تاکہ ان کا پروردگار انہیں بھٹکنے وپھسلنے اور شکست وناکامی سے دوچار ہونے سے بچا لے اور وہ اپنے پختہ عزم وارادہ پر باقی وقائم رہیں، اس طرح سے آگاہی دلانا واقعہ سے پہلے باخبر کرنے ومتنبہ کرنے کے طور پر ہے تاکہ وہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہیں اور اپنے اندر ان سے بچنے کی قوت پیدا کریں،

اہل کتاب سے میثاق

○ ''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ.....''
(اور یاد کرو اس وقت کو، جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جنہیں کتاب دی گئی ....)

اس آیت میں ''فَنَبَذُوْهُ'' کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں ان میں ''نبذ'' کا معنی دور پھینکنا ہے، عربوں میں اسے مثال کے طور پر یوں کہا جاتا ہے ''نبذہ وراء ظھرہ'' (اس نے اسے اپنی پشت کے پیچھے ڈال دیا) اس سے چھوڑ دینا اور اس کی بابت بے اعتنائی برتنا مراد لیا جاتا ہے، چنانچہ اس سے مقابل مثال میں یوں کہا جاتا ہے: ''جعله نصب عینیه'' (اس نے اسے اپنی آنکھوں کے بالکل سامنے قرار دیا۔ اپنا نصب العین بنالیا، اس سے لے لینا اور چمٹے رہنا مراد لیا جاتا ہے۔

اپنے کئے پر شاداں لوگ

○ "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا......"

(آپ ان لوگوں کو خاطر میں نہ لائیں جو اپنے کئے پر شاداں ہو رہے ہیں......)

اس سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کو خداوند عالم نے مال و دولت سے نوازا ہے وہ شاداں نہ ہوں کیونکہ اس سے مال و دولت کی محبت دل میں جاگزین ہو جاتی ہے اور پھر اس کی بابت بخل و کنجوسی سے کام لینا معمول کا حصہ بن جاتا ہے......تو یہ مال و دولت درحقیقت آزمائش و امتحان کے لئے ہے لہٰذا اس پر اتنا نہ اترائیں......

اور جملہ "فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ" (اور ان کے بارے میں آپ گمان نہ کریں کہ وہ عذاب سے نجات پا لیں گے) میں "مفازۃ" کا معنی نجات پانا ہے، اس بناء پر ان لوگوں کی ہلاکت اور تباہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں حق کی محبت پائی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد خداوند عالم نے آسمانوں اور زمین کی مالکیت و اقتدار اور ہر چیز پر اپنی قدرت کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا: "وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" (اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی مالکیت و اقتدار، اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے)، تو یہ دو صفات ایسی ہیں جن سے سابقہ آیات مبارکہ میں مذکور مطالب کے پس منظر و اسباب سے آگاہی کا حصول ممکن ہوتا ہے۔

روایات پر ایک نظر

حی بن اخطب کا واقعہ

تفسیر "درمنثور" میں ابن جریر اور ابن منذر کے حوالہ سے قتادہ کا بیان مذکور ہے کہ انہوں نے آیت مبارکہ "لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ......" کی بابت کہا کہ ہمیں بتایا گیا کہ یہ آیت حی بن اخطب کے بارے میں نازل ہوئی اور وہ اس طرح کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: "مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" (کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، پھر وہ اسے کئی گناہ زیادہ بڑھا کردے گا) تو حیّ بن اخطب نے کہا کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ ہمارا پروردگار ہم سے قرض طلب کر رہا ہے جس طرح سے کوئی فقیر و نادار کسی غنی و مالدار سے قرض مانگتا ہے۔(یستقرض ربنا انما یستقرض الفقیر الغنی) (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۰۶)

امام صادقؑ کا فرمان

تفسیر العیاشی میں ہے کہ آیت مبارکہ "مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا......" کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

واللہ ما رأوا اللہ حتی یعلموا انہ، فقیر، ولکنھم رأوا اولیاء اللہ فقراء فقالوا: لو کان غنیاً لا غنی اولیائہ، ففخروا علی اللہ بالغنی

خدا کی قسم، انہوں نے خدا کو دیکھا ہی نہیں کہ اس کے فقیر ہونے سے آگاہ ہوئے ہوں بلکہ انہوں نے اولیائے الٰہی کے فقیر ہونے کو دیکھ کر کہا کہ اگر خدا غنی و مالدار ہوتا تو اپنے اولیاء کو مالدار کر دیتا، اس وجہ سے انہوں نے خدا پر برتری اور فخر و مباہات کرتے ہوئے اپنے غنی و مالدار ہونے کا اظہار کیا (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی و تفسیر القمی جلد اول ص ۱۲۷)

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی

کتاب المناقب میں حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ اس آیت (مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا......) کا مصداق وہ لوگ ہیں جن کا گمان ہے کہ وہ جو کچھ امام کے پاس لے جاتے ہیں امام کو اس کی احتیاج ہے۔

آیت مبارکہ کی تفسیر میں مذکورہ بالا تین روایتوں میں سے پہلی دو روایتیں آیت کے مضمون پر منطبق ہوتی ہیں ......جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں...... جبکہ تیسری روایت صرف اس کے ایک مصداق کی نشاندہی کرتی ہے اور وہ "جری" (بیانِ مصداق) کے طور پر ہے۔

ایک تاریخی حوالہ

کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

کان بین القائلین والقاتلین خمسمائۃ عام فالزمھم اللہ القتل برضاھم بما فعلوا

جن یہودیوں نے کہا تھا کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی و مالدار ہیں اور ان یہودیوں کے درمیان جو پیغمبروں کو قتل کرتے تھے پانچ سو سال کا فاصلہ تھا مگر خدا نے انبیاءؑ کے قتل کی نسبت موجودہ یہودیوں کی طرف دی، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آباء واجداد کے عمل پر راضی وخوش تھے۔ (ملاحظہ ہو: کتاب اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۰۹)

اس روایت میں جو مدت ذکر کی گئی ہے (پانچ سو سال) وہ موجودہ عیسوی تاریخ سے مطابقت نہیں کرتی، آپ ہماری سابق الذکر تاریخی بحث کی طرف رجوع کریں۔

موت کا حتمی و یقینی ہونا

تفسیر ''درمنثور'' میں آیہ مبارکہ ''كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ'' کے ضمن میں ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حضرت امام علی بن ابی طالب کا ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لما توفی النبی (ص) وجاءت التعزیة جائهم آت یسمعون حسه، ولا یرون شخصه، فقال: السلام علیکم یا اهل البیت و رحمة الله و برکاته، کل نفس ذائقة الموت و انما توفون اجورکم یوم القیامة ان فی الله عزاء من کل مصیبة و خلفاً من کل هالك و درکاً من کل مافات، فالله فثقوا، وایاه فارجعوا فان المصاب من حرم الثواب: فقال علی: هذا الخضر

جب حضرت پیغمبر اسلامؐ کی رحلت ہوئی اور عزاداری وگریہ بپا ہوا تو ایک شخص ہمارے پاس آیا کہ جس کی آواز تو سنائی دے رہی تھی مگر وہ خود دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس نے ہم اہل بیت سے کہا: اے اہل بیت! تم پر سلام اور اللہ کی رحمت و برکت ہو، ہر شخص نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور قیامت کے دن تمہیں اجر دیا جائے گا۔ خداوند کے پاس ہر مصیبت کا اجر و جزا موجود ہے اور ہر جانے والے کے پیچھے آثار موجود ہوتے ہیں اور ہر نقصان کی تلافی و تدارک ہوتا ہے۔ آپ لوگ خدا پر بھروسہ رکھیں اور صرف اسی سے امید وابستہ کریں کہ حقیقی معنی میں مصیبت زدہ وہ ہوتا ہے جو ثواب سے محروم ہو، (یہ سن کر حضرت علیؑ نے فرمایا) یہ جناب خضرؑ تھے۔

• اسی کتاب میں ابن مردویہ کے حوالہ سے سہل بن سعد کی روایت منقول ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لموضع سوط احدکم فی الجنة خیر من الدنیا وما فیها

تمہارے تازیانہ لگنے کی جگہ کے برابر بھی بہشت میں جگہ ملے تو وہ دنیا اور اس میں موجود ہر چیز سے بہتر ہے۔

اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ

جو شخص دوزخ سے دور کیا جائے اور بہشت میں داخل کیا جائے وہ کامیاب ہو گیا۔ (تفسیر ''درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۰۷)

اس روایت کو اسی تفسیر میں مؤلف نے سہل بن سعد کے علاوہ دیگر راویوں کے حوالہ سے بھی ذکر کیا ہے، البتہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان آیات کے شان نزول میں کثرت کے ساتھ روایات وارد ہوئی ہیں اور ہم نے یہاں ان کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ سب راویوں کے ذاتی نظریات کی ترجمانی کرتی ہیں اور ان کے شخصی نقطہ نظر کی عکاس ہیں۔

آیات ۱۹۰ تا ۱۹۹

○ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾

○ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

○ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

○ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا ٭ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ کَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۳﴾ۚ

○ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۱۹۴﴾

○ فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

○ لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِی الۡبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ؕ

○ مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ ۟ ثُمَّ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾

○ لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَیۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۸﴾

○ وَ اِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ لَمَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِمۡ خٰشِعِیۡنَ لِلّٰهِ ۙ لَا یَشۡتَرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

ترجمہ

○ ''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور شب و روز کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں (دلیلیں) ہیں۔''

(۱۹۰)

○ ''وہ جو کہ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے اور آسمانوں و زمین کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار، تو نے اسے بے مقصد پیدا نہیں کیا، تیری ذات پاک ہے، پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔''

(۱۹۱)

○ ''اے ہمارے پروردگار! تو نے جسے جہنم میں ڈالا اسے یقیناً ذلیل و خوار کر دیا، اور ظالموں کا مددگار کوئی بھی نہیں۔''

(۱۹۲)

○ ''اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سن لی ہے کہ وہ ایمان کی صدا بلند کر رہا تھا اور (کہہ رہا تھا) کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، اے ہمارے پروردگار! پس تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ قرار دے۔''

(۱۹۳)

○ ''اے ہمارے پروردگار! اور ہمیں وہ کچھ عطا فرما جو تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ہم سے وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا، یقیناً تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔''

(۱۹۴)

○ ''تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی کہ میں تم میں سے کسی بھی شخص کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، تم آپس میں ایک دوسرے ہی سے ہو، تو جن لوگوں نے ہجرت کی اور انہیں ان کے خانہ وکاشانہ سے نکال باہر کیا گیا اور انہیں میری راہ میں ستایا گیا اور انہوں نے قتال کیا اور قتل کر دیئے گئے تو میں یقیناً ان کی خطاؤں سے درگزر کروں گا اور ضرور اُنہیں ان باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، یہ اللہ کی طرف سے اجر وثواب ہے، اور اللہ کے پاس بہت اچھا اجر وثواب ہے۔''
(۱۹۵)

○ ''کافروں کا شہروں میں گھومنا پھرنا آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔''
(۱۹۶)

○ ''نہایت تھوڑی سی متاع وساز وسامان ہے، پھر انکا ٹھکانہ دوزخ ہے جو کہ نہایت بُرا ٹھکانہ ہے۔''
(۱۹۷)

○ ''لیکن جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے یہ اللہ کی طرف سے اُن کی مہمانی ہوگی، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک وصالح بندوں کے لئے بہتر ہے۔''
(۱۹۸)

○ ''اور اہل کتاب میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم لوگوں پر نازل کیا گیا ہے (قرآن) اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ ان پر نازل کیا گیا ہے (اس پر ایمان رکھتے ہیں) وہ اللہ کی خشیت دلوں میں رکھتے ہیں، وہ اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت لے کر بیچ نہیں دیتے، ایسے لوگوں کا اجر اُنکے پروردگار کے پاس محفوظ ہے، یقیناً اللہ جلد حساب کرنیوالا ہے۔''
(۱۹۹)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ اس سورہ میں مومنین، مشرکین اور اہل کتاب کے بارے میں بیان کئے گئے مطالب کی تلخیص کے طور پر ہیں...... گویا ان میں سابق الذکر مطالب کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے...... اور وہ اس طرح کہ نیک و صالح مومنین کی صفت یہ ہے کہ وہ خداوند عالم کے ذکر، اس کی آیات میں غور و فکر اور دوزخ کے عذاب سے خدا کی پناہ طلب کرنے اور خدا سے مغفرت و بہشت عطا کرنے کی دعا میں مشغول رہتے ہیں، اور خدا نے ان کی دعا و درخواست قبول کر لی ہے اور بہت جلد انہیں ان کا مطلوب عطا فرمائے گا (یہ ان کی عمومی حالت ہے) اور جو لوگ کافر ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ دنیا کے نہایت تھوڑے مال سے اپنے دلوں کو بہلائے ہوئے ہیں اور پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، لہٰذا ان کا قیاس و موازنہ مومنین کے حال و صفت سے ہرگز نہیں کیا جا سکتا، پھر ان کافروں میں سے ان اہل کتاب کو مستثنیٰ کر دیا گیا جنہوں نے حق کی پیروی کی تو وہ مومنین کے ساتھ ہیں۔

آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا حوالہ

○ ''اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ''

(بے شک، آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں......)

اس آیت میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا حوالہ مذکور ہے، تو اس میں تخلیق سے ان کا پیدا کرنا مراد نہیں بلکہ اس سے مراد ان کی وجودی کیفیت و حالت اور وجودی آثار و افعال یعنی حرکت، سکون اور تغیر و تبدل ہے۔ نتیجتاً معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور شب و روز کی گردش خدا کے وجود کی بڑی بڑی نشانیوں پر مشتمل ہیں...... ان سے خدا کے وجود اور قدرت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے......، اس حوالہ سے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴ اور اسی سورۂ مبارکہ آل عمران کی آیت ۷ کی تفسیر میں ''لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ'' کے معنی کی وضاحت میں مربوطہ مطالب بیان ہو چکے ہیں۔

ہر حال میں خدا کا ذکر کرنے والے

○ ''اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا......''

(وہ کہ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے......)

یہاں ان لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ہر حال میں یاد کرتے ہیں خواہ قیام وقعود میں ہوں یا خواہ لیٹے ہوں، اپنے تمام احوال واوقات میں خدا کی یاد میں رہتے ہیں، ذکر اور غور وفکر کے معانی سابقہ مباحث میں بیان کئے جا چکے ہیں۔

مذکورہ بالا دو آیتوں کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں پائی جانے والی نشانیوں اور شب و روز کی گردش کی بابت غور وفکر کرنے کا اثر ونتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان میں خدا کو ہمیشہ یاد کرنے...... یا یاد رکھنے...... کی ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بھی حال میں اسے نہیں بھلاتے، اور اس کو یاد کرنے کے ضمن میں آسمانوں اور زمین کے بارے میں غور وفکر کرنے کے رسیا ہو جاتے ہیں اور پھر اس طرح سے اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت جلد انہیں جزا اور حساب وکتاب کے لئے اٹھائے گا لہٰذا وہ اس سے اس کی رحمت کی استدعا کرتے ہیں اور اسے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

تخلیق جہاں بے مقصد نہیں

○ ''رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا......''

(اے ہمارے پروردگار، تو نے اسے ناحق و بے مقصد پیدا نہیں کیا......)

یہاں لفظ ''ھٰذَا'' (مفرد مذکر) استعمال ہوا ہے جبکہ اس کا اشارہ آسمانوں اور زمین کی طرف ہے (اَلسَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ) جو کہ جمع مونث ہیں، تو یہ اس لئے ہے کہ یہاں آسمانوں اور زمین کے فرد فرد اور طبقہ طبقہ کا حوالہ ملحوظ نہیں بلکہ ان سب کے مخلوق ہونے کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اس حوالہ سے وہ سب ایک قدر مشترک رکھتے ہیں (سب خدا کی مخلوق ہیں) اور یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کے بیان کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ جب انہوں نے سورج کو چمکتا دمکتا دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے یہ بہت بڑا ہے (فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَآ اَکْبَرُ) (سورۂ انعام، آیت ۷۸) تو

اس میں سورج کے سورج ہونے کی حیثیت میں ملحوظ ہونے کا بیان مقصود نہیں تھا کیونکہ وہ اس کی حقیقت اور نام سے آگاہ ہی نہ تھے سوائے اس کے کہ وہ اشیاء میں سے ایک شے ہے (مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے)۔

لفظ "باطل" سے مراد وہ چیز جس کی کوئی غرض وغایت اور مقصد نہ ہو، چنانچہ اس کی بابت خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ رعد، آیت: ۱۷

○ "فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ"

(جہاں تک جھاگ کا تعلق ہے تو وہ خشک ہو کر ختم ہو جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لئے نفع بخش ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے)

بنابرایں جب لوگ عالم خلقت سے باطل کی نفی کریں تو انہیں اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جائے گی کہ خداوند عالم بہت جلد انہیں حساب وکتاب کے لئے اکٹھا کرے گا اور وہاں ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچا کر سخت رسوائی سے دوچار کرے گا جو کہ دوزخ کی آگ سے عبارت ہے کہ کوئی اسے روک نہیں سکتا اور نہ ہی اس کی حکمت ومصلحت کی نفی کر سکتا ہے کیونکہ حساب وکتاب اور جزاوسزا کے بغیر تخلیق بے مقصد ہو جائے گی، تو ان کی اس بات کا مطلب ومعنی بھی یہی ہے جس میں انہوں نے بارگاہِ رب العزت میں یوں کہا: "فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ" تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے نجات عطا کر، اے ہمارے پروردگار، تو جسے دوزخ میں ڈالے تو گویا تو نے اسے رسوا کر دیا اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں)۔

صدائے حق پر لبیک کہنا

○ "رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ......"

(اے ہمارے پروردگار، ہم نے سنا اس ندا دینے والے کو جو ایمان کی ندا دے رہا تھا......)

یہاں ندا دینے والے سے حضرت رسول خدا ﷺ مراد ہیں، اور جملہ "اَنْ اٰمِنُوْا" اصل ندا ہے (یعنی ندا دینے والا یہ ندا دیتا ہے کہ تم ایمان لے آؤ) اس میں حرف "ان" تفسیر وتوضیح کے لئے ہے۔ اور جب انہوں نے ندا دینے والے یعنی رسول اللہؐ پر ایمان لانے اور اس کی صدائے حق پر لبیک کہنے کا اظہار وتذکرہ کیا اور کہا "فَاٰمَنَّا" (تو ہم ایمان لائے) اور رسولؐ وہ ہے جو انہیں خداوند عالم کی طرف سے احکام پہنچاتا ہے اور انہیں جزاوسزا کے امور سے مطلع وآگاہ کرتے ہوئے انہیں گناہوں اور برائیوں سے بچ کر رہنے اور کفر ومعصیت کی حالت میں مرنے سے بچنے کی تاکید کرتا ہے اور دوسری جانب انہیں

بخشش ورحمت کی ترغیب وتشویق دلاتے ہوئے اس بہشت کی تفصیلات سے آگاہ کرتا ہے جس کا وعدہ خداوند عالم نے نیک و صالح مومنین سے فرمایا ہے، تو اس کے بعد وہ خداوند عالم کے حضور عرض گزار ہوئے اور اس سے استدعا کرنے لگے کہ وہ انہیں مغفرت سے نوازے اور ان کے گناہوں وخطاؤں سے درگزر فرمائے اور ان کا خاتمہ نیک وصالح افراد کے ساتھ فرمائے، اور تو نے بہشت اور رحمت عطا کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اور تیرے پیغمبروں نے تیرے ہی اذن واجازت کے ساتھ اس کی ضمانت دی ہے اس وعدہ کو ہمارے لئے پورا فرما، چنانچہ ان چیزوں کے بارے میں یہ الفاظ کہے: ''فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ'' اس میں جملہ ''عَلَىٰ رُسُلِكَ'' (اپنے رسولوں پر) سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کو تو نے اپنے پیغمبروں پر ڈال دیا ہے یعنی انہیں اس کی ذمہ داری دی ہے اور انہوں نے تیری طرف سے اس کی ضمانت دی ہے، اور جملہ ''وَلَا تُخْزِنَا'' (ہمیں رسوا نہ کر) سے مراد یہ ہے کہ وعدہ خلافی نہ کر، ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے، لہٰذا اس کے فوراً بعد یہ الفاظ کہے: ''إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ'' (کہ یقیناً تو وعدہ خلافی نہیں کرتا)۔

مذکورہ بالا آیات مبارکہ سے یہ حقیقت واضح وعیاں ہوجاتی ہے کہ جن لوگوں نے خداوند عالم کی بارگاہ میں اس طرح دعا واستدعا کی وہ خدا اور قیامت کے دن پر عقیدہ رکھتے تھے اور اس کے بھی معتقد تھے کہ اللہ نے کچھ ہستیوں کو رسول و پیامبر بنایا ہے، اور یہ عقیدے آیات الٰہی کہ جو آسمانوں اور زمین میں پائی جاتی ہیں ان میں غور وفکر کرنے سے حاصل ہوئے اور جہاں تک ان امور واحکام کی تفصیلات پر ایمان لانے کا تعلق ہے تو وہ آنحضرتؐ کی رسالت پر ایمان لانے کے ذریعے حاصل ہوا، تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ فطرت کی راہ پر گامزن ہیں اور ہر فطری اصول و دستور کو تسلیم کرنے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری پر قائم ہیں۔

دعا واستدعا کی قبولیت

○ ''فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ ....''

(تو ان کے رب نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت عطا کیا)

اس میں لفظ ''رب'' کا استعمال اور اسے ضمیر ''ہم'' کے ساتھ اضافت دینا، رحمت خداوندی کے جوش میں آنے کی دلیل ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ رحمت خداوندی عمومیت رکھتی ہے اور اس کا دائرہ وسیع ہے لہٰذا اس نے ارشاد فرمایا: ''أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم .....'' (میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع

نہیں کرتا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے نزدیک کسی عمل اور عمل کرنے والے کے درمیان فرق نہیں، وہ ہر شخص کے ساتھ اس کے عمل کے مطابق سلوک کرتا ہے اور اسے اس کے کئے کی جزا دیتا ہے، وہ کسی کا کوئی عمل ضائع نہیں کرتا۔

بنابرایں جملہ ''فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا......'' سابقہ بیان کی فرع اور اس میں ''عمل'' کے حوالہ سے نیک وصالح اعمال کی تفصیل اور ان کے ثواب وجزا پر مشتمل ہے اور اس میں حرف ''وَاؤ'' (اور) جمع کے لئے نہیں بلکہ تفصیل کے لئے ہے، کیونکہ اگر جمع کے لئے ہوتا تو آیت کا معنی یہ ہو جاتا کہ اس میں صرف مہاجرین میں سے شہیدوں کے اجر وثواب کا ذکر ہوا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں تفصیل کی غرض سے حرف ''وَاؤ'' مذکور ہے۔

اس طرح سے آیت مبارکہ صرف انہی اعمال کے تفصیلی تذکرہ پر مشتمل ہے جن کی انجام دہی کی دعوت وترغیب اس سورۂ مبارکہ میں دلائی گئی ہے اور ان کے بارے میں لوگوں کو نہایت تاکید وتشویق کی گئی ہے اور وہ عبارت ہے وطن پر دین کو ترجیح دینے اور اس پر اپنے آپ کو فدا کرنے اور خدا کی راہ میں اذیت وتکلیف اور سختی جھیلنے اور جہاد کرنے سے!

آیت میں لفظ ''فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا'' (ہجرت کرنے والوں) سے اس کا عام ووسیع معنی مراد ہے جس میں شرک کو چھوڑنا، گھر والوں اور خاندان کو چھوڑنا اور وطن کو چھوڑنا سب شامل ہے (ہجرت ومہاجرت کا عمومی معنی مراد ہے) کیونکہ جملہ ''هَاجَرُوْا'' مطلق ذکر کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کسی طرح کی قید وشرط بیان نہیں کی گئی اور اس کے تقابل میں جملہ ''وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ'' ذکر کیا گیا ہے جس میں خاص ہجرت مقصود ہے، اور ہجرت کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ الفاظ بیان ہوئے ہیں: ''لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ'' (میں ضرور ان کی خطاؤں کو معاف کردوں گا) اور قرآن مجید میں ''سیئات'' کا لفظ صغیرہ گناہوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کی اور توبہ کرلی اور خدا نے ان کے صغیرہ گناہوں سے درگزر فرمائے گا، لہٰذا یہاں ہجرت ومہاجرت سے اس کا وسیع معنی مراد ہے، (مزید غور کریں)

دھوکہ میں نہ آئیں

○ ''لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ......''

(اور آپ کو دھوکہ نہ دے ان لوگوں کا......)

یہ آیت دراصل ایک طرح سے ایک ممکنہ اعتراض کے رد وجواب پر مشتمل ہے اور وہ یہ کہ: مومنین اور نیک وصالح افراد کی حالت اور ان کا اخروی اجر وثواب بیان ہو چکا ہے مگر آپ کفار کی مرفہ حالت اور دنیاوی زندگی کی عیش وعشرت اور ٹھاٹھ باٹھ سے دھوکہ میں نہ آئیں اور پریشان نہ ہوں کیونکہ وہ نہایت قلیل ساز وسامان ہے اور اسے دوام حاصل نہیں (اس

آیت میں حضرت پیغمبر اسلامؐ سے خطاب ہے جبکہ عام لوگ مراد ہیں، یعنی عامتہ الناس سے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں کی رنگا رنگ زندگی سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں اور یہ نہ سمجھیں کہ خدا نے انہیں تو سب کچھ عطا کر دیا ہے جبکہ مومنین سختی و تکلیف اور مصیبتوں سے دوچار ہیں، کافروں کا زرق و برق چند روزہ اور بے مایہ و ناچیز اور فنا پذیر ہے)۔

تقوائے الٰہی اختیار کرنے والوں کا ذکر

○ ''لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّہُمۡ......''
(لیکن جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کیا......)

اس آیت میں لفظ ''نُزُلًا'' ذکر ہوا ہے (نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ) اس سے مسافر کے لئے کھانے پینے اور ہر طرح کی ضروری اشیاء مراد لی جاتی ہیں، اور یہاں ان لوگوں سے مراد نیک و صالح افراد ہیں چنانچہ اس کا ثبوت آیت کے آخری جملہ میں موجود ہے جس میں ارشاد ہوا: ''وَمَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ'' (اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ابرار اور نیک و صالح افراد کے لئے بہتر ہے)۔ اس سے ہمارے مذکورہ بالا نظریہ کی تائید و تصدیق ہوتی ہے کہ سابقہ آیت ایک ممکنہ اعتراض کے جواب کے طور پر ہے۔

اہل کتاب میں سے صالح افراد کا ذکر

○ ''وَاِنَّ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ......''
(اور اہل کتاب میں سے کچھ وہ ہیں......)

اس میں ان اہل کتاب کا تذکرہ ہے جو نیک و صالح ہیں کہ وہ اچھے اجر و ثواب میں مومنین کے ساتھ شریک ہیں، اس سے مقصود یہ ہے کہ اخروی سعادت کسی ایک طبقہ کے ساتھ مختص نہیں کہ اہل کتاب اس سے محروم ہوں خواہ وہ ایمان ہی کیوں نہ لائے ہوں، ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا دارومدار اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لانے پر ہے، اگر وہ ایمان لائے تو وہ مومنین میں شمار ہوں گے اور وہ سب برابر و یکساں حقیقت کے حامل ہوں گے۔

اس آیت میں اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کی تعریف کرتے ہوئے ان سے ان اعمال کی نفی کی گئی ہے جن کا تذکرہ سابقہ آیات میں اہل کتاب کے اعمال کے حوالہ سے کیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے پیغمبروں کے درمیان تفریق کرتے ہیں اور اللہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو چھپاتے ہیں اور ایسا کرنے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ آیات الٰہی کو نہایت تھوڑی قیمت پر بیچ دیں۔

ایک فلسفیانہ بحث اور علمی موازنہ

مشاہدات وتجربات سے یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ مرد اور عورت ایک ہی جوہری نوع کی دو فرد یں ہیں کہ جسے انسان کہا جاتا ہے کیونکہ انسانیت کے وہ تمام آثار جو مرد میں دیکھے جاتے ہیں وہ کسی فرق کے بغیر عورت میں بھی دیکھے جاتے ہیں اور کسی نوع کے آثار کا ظہور پذیر ہونا یقینی طور پر خود اس نوع کے وجود پذیر و موجود ہونے کا موجب ہوتا ہے البتہ اس نوع کی صنفوں میں بعض مشترکہ آثار کے حوالہ سے شدت وضعف پایا جاتا ہے لیکن شدت وضعف اور کمی وزیادتی کے فرق سے اس فرد میں اصل نوع کی نفی نہیں ہوتی،...... مرد اور عورت کے درمیان بعض صنفی امور کا مختلف ہونا ان کے درمیان انسانیت میں مشترک ہونے کی نفی نہیں کرتا، ایسا نہیں کہ بعض وجودی وجسمانی امور کے حوالہ سے ان میں پایا جانے والا فرق ان میں سے کسی ایک کو انسانیت کے دائرہ سے باہر کر دیتا ہے......، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں صنفوں میں سے کسی ایک میں پائی جانی والی وجودی صلاحیتیں اور نوعی کمال سے بہرہ ور ہونے کی قوتیں دوسری صنف میں بھی پائی جاتی ہیں اور اس حوالہ سے ان میں یکسانیت ہوتی ہے، نوعی کمالات میں سے بعض معنوی کمالات ہیں جو ایمان واطاعت اور اعمال صالحہ بجالانے سے حاصل ہوتے ہیں، اگر آپ غور کریں تو آپ آگاہ ہو جائیں گے کہ ان امور کے حوالہ سے نہایت خوبصورت اور جامع ترین جملہ یہ آیت مبارکہ ہے: "اَنِّىْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ" (میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے ہی سے ہو) اگر آپ اس جملہ کو تورات میں مذکور بیان سے موازنہ کریں تو آپ بخوبی مطلع ہو سکتے ہیں کہ ان دونوں کتابوں کے مقام ومنزلت میں کس قدر فرق پایا جاتا ہے، چنانچہ تورات کے سفر الجامعہ میں یوں مذکور ہے:

درت انا و قلبی لا علم ولا بحث حکمة و عقلاً ولا عرف الشر انه. جهالة و الحماقة انه جنون فوجدت امر من الموت المرأة التی هی شباك و قلبها اشراك. ویدها قیود... رجلاً واحداً بین الف وجدت اما امرأة فبین کل اولئك لم اجد

(میں نے اور میرے دل نے بہت تلاش اور کوشش کی کہ حکمت ودانائی اور عقل کی رو سے اس امر سے مطلع وآگاہ ہوں کہ کیا جہالت ہی شرک ہے اور حماقت ہی جنون ودیوانگی ہے؟ تو میں نے دیکھا اور آگاہ ہوا کہ موت سے بدتر اور تلخ تر چیز عورت ہے جو کہ سراپا جال اور اس کا دل اس جال کی طنابیں ہیں اور اس کے ہاتھ زنجیریں ہیں...... مجھے

ہزار مردوں میں سے ایک انسان تو ملا ہزار عورتوں میں سے ایک انسان بھی نہ ملا)۔

تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ زمانہ قدیم میں اکثر قومیں یہ نظریہ رکھتی تھیں کہ عورت کا کوئی نیک عمل خدا کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل نہیں کرتا، قدیم یونان میں عورت کو "نجس ورجس اور شیطانی عمل" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا (رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ) اہل روم اور بعض اہل یونان کا عقیدہ تھا کہ عورت نفس مجرد انسانی سے محروم ہے جبکہ مرد اس کا حامل ہے، ۵۸۶ء میں فرانس میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں اس پر بحث ہوئی کہ آیا عورت انسان ہے یا نہیں؟ تو طویل بحث وگفتگو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہاں عورت انسان تو ہے مگر اسے مرد کی خدمت گزاری کے لئے خلق کیا گیا ہے، انگلینڈ میں بھی ایک صدی پہلے تک عورت کو انسانی معاشرہ کا فرد نہیں سمجھا جاتا تھا، اس موضوع کی مزید تحقیق وتفصیلات کے لئے ان کتابوں کا مطالعہ کریں جو قوموں کے عقائد وآداب کے تذکرے پر مشتمل ہیں تو آپ کو اس سلسلہ میں عجیب وغریب مطالب اور ان کی آراء ونظریات کے حیران کن حوالے ملیں گے۔

روایات پر ایک نظر

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ ابونعیم نے اپنی کتاب حلیہ میں ابن عباس کے حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروا فی اللہ"

اللہ کی مخلوق کے بارے میں غور وفکر کرو اللہ کی ذات کے بارے میں غور وفکر نہ کرو۔

(تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۱۰)

تفسیر "درمنثور" میں یہی مطلب دیگر اسناد سے متعدد صحابہ مثلاً عبداللہ بن سلام اور ابن عمر کے حوالہ سے آنحضرتؐ سے منقول ہے، یہی روایت شیعہ اسناد سے بھی پیش کی گئی ہے، اور اس میں اللہ کی بابت یا اللہ کی ذات کی بابت غور وفکر کرنے سے اس کی کنہ وحقیقت ذات کے بارے میں غور وفکر کرنا مراد ہے چنانچہ اسی حوالہ سے درج ذیل آیہ مبارکہ میں ارشاد خداوندی ہوا:

سورۂ طٰہٰ، آیت: ۱۱۰

O "وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا"

(اور وہ اس کی بابت کامل آگاہی حاصل نہیں کر سکتے)

اور جہاں تک صفات خداوندی کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے قرآن مجید سب سے بہترین گواہ ہے کہ صفات کے ذریعے خدا کی پہچان ممکن ہے اور نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ کثیر آیات میں اس سلسلہ میں تاکید وارد ہوئی ہے کہ اس کی صفات کے ذریعے اس کی معرفت حاصل کی جائے۔

لمحہ بھر کا غور وفکر

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں ابوہریرہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: "تفکر ساعة خير من عبادة ستين سنة" لمحہ بھر غور وفکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ("درمنثور" جلد دوم صفحہ ۱۱۱)

بعض روایات میں ساٹھ سال کی بجائے رات بھر کی عبادت (من عبادة ليلة) اور بعض روایات میں "من عبادة سنة" "ایک سال کی عبادت" کے الفاظ ذکر کئے گئے ہیں، یہ روایت شیعہ اسناد سے بھی منقول ہے،

ام سلمہ کے جواب میں!

اہل سنت کے اسناد سے مروی ہے کہ آیت مبارکہ "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ" (ان کے رب نے انہیں جواب دیا) حضرت ام سلمہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جب انہوں نے حضرت پیغمبر اسلامؐ سے کہا:

يا رسول الله! لا اسمع الله ذكر النساء في الهجرة بشيئ

اے رسولِ خداؐ! ہجرت میں کہیں بھی خدا نے عورتوں کا تذکرہ نہیں کیا۔

تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

O "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ......"

ان کے پروردگار نے ان کا جواب دیا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت

(کتاب کافی، جلد ۲ باب التفکر)

ہجرت کرنے والوں کا تذکرہ

شیعہ اسناد سے منقول ہے کہ آیہ مبارکہ: ''فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ......'' حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ اس وقت ہوا جب آپؑ نے فواطم یعنی حضرت فاطمہ بنت اسد، حضرت فاطمہؑ بنت محمدؐ اور فاطمہ بنت زبیر کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی اور راستہ میں ''ضجنان'' کے مقام پر حضرت ام ایمن اور چند ضعیف و کمزور مومنین بھی ان کے ہمراہ ہو گئے اور پھر سب کے سب اکٹھے سفر کرنے لگے جبکہ وہ ہر مرحلہ پر اور ہر حال میں ذکر خدا میں مصروف رہے یہاں تک کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ سے ملحق ہو گئے، یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔

(تفسیر ''صافی'' جلد اول صفحہ ۳۲۲)

اہل سنت کے اسناد سے مروی ہے کہ یہ آیت (فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا......) تمام مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور یہ بھی منقول ہے کہ آیت ''لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... تا آیت ۱۹۹ کا شان نزول یہ ہے کہ بعض مومنین نے اپنے دلوں میں کفار کی عیش و عشرت بھری زندگی دیکھ کر اسی طرح کی زندگی کی اپنے لئے آرزو کی تو یہ آیات نازل ہوئیں۔

(تفسیر صافی، جلد ۲ ص ۳۲۳)

اور یہ بھی مروی ہے کہ آیت ''وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'' بادشاہ حبشہ ''نجاشی'' اور اس کے چند ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی، یہ وہی نجاشی ہے کہ جس کی وفات کی خبر سن کر مدینہ منورہ میں حضرت رسول خدا ﷺ نے اس کے لئے دعائے مغفرت کی تو بعض منافقوں نے آنحضرت ﷺ پر اعتراض کیا کہ آپ ﷺ نے اس کے لئے دعائے مغفرت کی ہے جو آپ ﷺ کے دین پر نہ تھا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ......'' (ملاحظہ ہو تفسیر ابوالفتوح جلد ۳ صفحہ ۲۹۹)

یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ مذکور بالا تمام روایات، آیات مبارکہ کو بعض واقعات پر منطبق کرنے کے باب سے ہیں جبکہ ان واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی ان آیات کے نزول کے حقیقی اسباب میں سے نہیں۔

آیت ۲۰۰

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۲۰۰﴾

ترجمہ

○ اے ایمان والو! صبر کرو، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، باہم رابطہ میں ہو (ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ رہو) اور تقوائے الٰہی اختیار کرو تاکہ تم فلاح و کامیابی حاصل کرسکو) (۲۰۰)

تفسیر و بیان

یہ آیت اس سورۂ مبارکہ میں بیان شدہ تفصیلی مطالب کے خلاصہ کے طور پر ہے اور اس میں تمام موضوعات کا نتیجہ ہمارے لئے پیش کر دیا گیا ہے۔

صبر و ربط و تقویٰ کا حکم

○ ''یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا......''
(اے ایمان والو، صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو......)

اس آیت میں جو چار اوامر و قوانین ذکر کئے گئے ہیں: (۱) اصۡبِرُوۡا (۲) صَابِرُوۡا (۳) رَابِطُوۡا (۴) اتَّقُوا، وہ سب مطلق اور ہر طرح کی قید و شرط سے خالی ہیں۔

''اصۡبِرُوۡا'' میں صبر کی تمام قسمیں شامل ہیں یعنی سختیوں و تکلیفوں میں صبر، اطاعت الٰہی میں صبر، خدا کی معصیت سے صبر، بہر حال اس میں صبر سے مراد اس کی تمام اقسام ہیں کیونکہ اس کے بعد اسی کو متقابل صورت میں اپنانے کا حکم دیا گیا اور فرمایا: ''صَابِرُوۡا''۔

''صَابِرُوۡا'' باب مفاعلہ سے ہے اور مصابرہ کا معنی اجتماعی صورت میں صبر اختیار کرنا ہے اور وہ یوں کہ ہر فرد صبر و تحمل اور تکلیفیں برداشت کرنے میں ایک دوسرے کا سہارا لے جس کے نتیجہ میں صبر کی صفت تمام افراد کے دلوں میں تقویت پا لے گی اور اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اس کی اثر انگیزی زیادہ سے زیادہ ہو جائے گی چنانچہ یہ بات ہر فرد میں اس کی انفرادی حیثیت کے حوالہ سے اور معاشرہ میں تمام افراد کا ایک دوسرے کی قوتوں و صلاحیتوں کو یکجا کرنے کے حوالہ سے واضح و آشکار ہے۔

صبر کی انفرادی واجتماعی اثر انگیزی کے حوالہ سے تفصیلی بحث ہم عنقریب اس کے موزوں مقام پر کریں گے۔

''رَابِطُوْا'' میں مصابرہ (صَابِرُوْا) کی نسبت عام و وسیع معنی پایا جاتا ہے کیونکہ مصابرہ کا معنی تمام افراد کا اجتماعی طور پر ایک دوسرے کی قوتوں کو یکجا کرتے ہوئے مصائب و شدائد میں صبر وتحمل اختیار کرنا ہے اور مرابطہ (رَابِطُوْا) سے مراد تمام افراد کا اجتماعی صورت میں اپنی قوتیں یکجا کرنا ہے خواہ سختیوں و شدائد میں ہو یا راحت و آرام اور آسائش میں ہو، ہر حال میں اپنے اقوال و افعال کو زندگی کے تمام شعبوں میں یکجا کرنا مرابطہ کہلاتا ہے، اور چونکہ دنیا و آخرت کی حقیقی سعادت و خوش بختی کا حصول اسی سے یقینی ہوتا ہے...... ورنہ اس کے بغیر صرف بعض دنیاوی فوائد و سعادتوں سے بہرہ مندی ممکن ہوتی ہے جو کہ حقیقی سعادت نہیں...... لہٰذا ان اوامر و فرامین (اصْبِرُوْا صَابِرُوْا رَابِطُوْا) کے فوراً بعد ارشاد ہوا: ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو تا کہ تم فلاح پاؤ)، اس میں کامل حقیقی سعادت مراد ہے۔

اسلامی معاشرہ میں مرابطہ کی اہمیت

اس موضوع کے حوالہ سے ۱۵ عناوین کے تحت بحث ہو گی:

۱۔ انسان اور معاشرہ
۲۔ معاشرہ میں انسان کی نشوونما
۳۔ اسلام اور معاشرہ کے بارے میں اس کی خاص توجہ
۴۔ اسلام میں فرد اور معاشرہ کے درمیان رابطہ کی اہمیت
۵۔ آیا اسلامی معاشرتی اقدار قابل بقاء و اجراء ہیں؟
۶۔ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور تسلسل کی بنیادیں؟
۷۔ دو فکری زاویے: تعقل و احساس
۸۔ خدا سے اجر طلب کرنا اور غیر خدا سے روگردانی
۹۔ اسلام میں آزادی کا معنی و مفہوم
۱۰۔ اسلامی معاشرہ میں حصول کمال کی راہیں
۱۱۔ اسلامی احکامات و دستورات کا عصر حاضر میں سعادت بخش ہونا

۱۲۔ اسلامی معاشرہ کا سربراہ اور اس کا طرز عمل

۱۳۔ اسلامی مملکت کی نظریاتی حدود اور اعتقادی سرحدیں

۱۴۔ اسلام: سراسر معاشرتی جہات کا حامل دین

۱۵۔ اسلام کا پوری دنیا پر یقینی غلبہ

ان موضوعات کے ضمن میں اسلامی معاشرہ میں مرابط اور اس کی اہمیت و آثار پر تفصیلی بحث ملاحظہ ہو،

۱۔ انسان اور معاشرہ

یہ بات کسی وضاحت اور تفصیلی بحث و استدلال کی محتاج نہیں کہ نوع انسانی فطری طور پر معاشرتی اصولوں پر استوار و قائم ہے، کوئی فرد اس فطری حوالہ سے مستثنیٰ نہیں بلکہ نوع انسانی کا ہر فرد اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے اور تاریخ بھی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ہر دور میں افراد بشر اجتماعی زندگی بسر کرتے رہے اور قدیم زمانہ کے آثار سے بھی اسی مطلب کا ثبوت ملتا ہے جس میں اس نوع کے افراد باہمی معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور روئے زمین پر ان کے اجتماعی میل جول کے آثار اب بھی تاریخ کے ناقابل انکار حقائق ہیں کہ ان کی بابت قرآن مجید کی متعدد آیات میں نہایت خوبصورت انداز میں بیانات مذکور ہیں مثلاً

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

- ''یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا......''

(اے لوگو، ہم نے تمہیں مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا کیا اور تمہیں شعبے اور قبیلے قرار دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو......)

سورۂ زخرف، آیت: ۳۲

- ''نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا''

(ہم ہی نے ان کے درمیان ان کی روزی کو دنیاوی زندگی میں تقسیم کیا اور ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر برتری عطا کی تا کہ وہ ایک دوسرے سے باہم طور پر استفادہ کر سکیں)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۵

- ''بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ''

(تم ایک دوسرے سے ہو)

سورۂ فرقان، آیت: ۵۴

○ ''وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَّصِهْرًا''

وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا، پھر اسے رشتہ دار اور داماد بنایا)

ان کے علاوہ بھی متعدد آیات موجود ہیں جو اس موضوع کے حوالہ سے مربوط مطالب پر مشتمل ہیں، ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ کرنے سے موضوع کی تمام جہات اور مقصودہ معانی واضح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں،

۲۔ معاشرہ میں انسان کی نشوونما

انسانی معاشرہ بھی انسان کی دیگر روحانی صفات اور ان سے مربوط امور کی مانند ہے کہ جو اس کی تخلیق کی ابتدائی گھڑیوں ہی میں کمال کی آخری منزل تک نہ پہنچے تھے کہ اب ان میں نمو اور اضافہ کی گنجائش یا ضرورت نہ پائی جاتی ہو، بلکہ وہ (انسانی معاشرہ) انسان کی دیگر روحانی صفات اور ان سے مربوط امور کی طرح تدریجی طور پر اور رفتہ رفتہ کمال کی جانب رواں دواں رہتا ہے اور یہ سلسلہ انسان کے مادی و معنوی کمالات سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ جاری و ساری رہتا ہے، اس بناء پر یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام انسانی صفات میں سے صرف یہی ایک صفت یعنی اس کا معاشرت پسند ہونا تکامل اور تدریجی طور پر کمال سے بہرہ مند ہونے کے عمومی نظام سے مستثنیٰ ہو اور اپنے ابتدائے ظہور ہی میں کامل و مکمل ہو، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ بھی انسان کی ان دیگر صفات کی طرح ہے کہ جن کا تعلق علم و ارادہ سے ہے اور وہ تدریجی طور پر حصول کمال کا سفر طے کرتی ہیں۔

نوع انسانی کے بارے میں اس کے مختلف احوال کے تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سب سے پہلی اجتماعیت جو انسان کی زندگی میں وجود میں آئی وہ ازدواجی بندھن سے حاصل ہونے والی گھریلو معاشرت پر مبنی اجتماعیت تھی کیونکہ اس کا سبب و عامل ایک ایسا امر تھا جس کا تعلق اس کی طبع وجودی سے ہے کہ جو تناسل و توالد کے اعضاء کے تقاضوں سے عبارت ہے اور وہ نہایت مضبوط عامل ہے جو اجتماعیت کو عملی صورت میں لاتا ہے کہ اس کا تحقق پذیر ہونا دونوں کے یکجا ہونے سے ممکن و یقینی ہوتا ہے اور ان میں سے کوئی ایک، دوسرے کے بغیر اسے وجود میں نہیں لا سکتا یعنی گھریلو اجتماعیت مرد اور عورت دونوں کے باہم طور پر اکٹھا ہونے سے وجود میں آتی ہے جبکہ اس کے برعکس دیگر امور مثلاً کھانا پینا وغیرہ میں دونوں کا باہم ہونا ضروری نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنے طور پر غذا کھاتا ہے اور وہ نظام ہاضمہ کے سپرد ہو جاتی ہے اور نظام ہاضمہ اپنا کام کرتا ہے، لیکن تولید نسل کسی ایک فرد کے بس میں نہیں بلکہ دونوں کے ملاپ سے ممکن ہوتی ہے، اور اس گھریلو معاشرہ کی تشکیل کے

بعد جو چیز اس کے تسلسل کی ضمانت بنتی ہے وہ مخصوص صفت وعمل ہے جسے ہم نے سابقہ بحثوں میں ''استخدام'' سے موسوم کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی تمام تر وجودی توانائیوں کو بروئے کار لانے اور قوی ارادہ سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنی ضرورتوں کی تکمیل میں مددگار بنائے، اس کے بعد رفتہ رفتہ دیگر افراد سے کام لیتے ہوئے ایسی صورت حال پیدا کر لیتا ہے کہ خود دوسروں پر حکومت کرنے لگتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے وہ انجام دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کے درمیان رئیس ورعایا کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور افراد کی نسبت سے ریاست اور حاکمیت (سرداری) وجود میں آجاتی ہے مثلاً گھر کا حاکم، قبیلہ کا سردار، خاندان کا سربراہ، امت وملت اور قوم کا سربراہ وغیرہ، تو یہ سب عہدے افراد کے حوالہ سے ہوتے ہیں اور ان میں سے جو تعداد کے لحاظ سے مقدم ہوتا ہے اس کا طاقتور اور بہادر ہونا ملحوظ ہوتا ہے پھر مال واولاد کی کثرت کے حوالہ سے مقدم شخص کو سربراہ قرار دیا جاتا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ انہی معیاروں پر قائم ہوتا ہوا حکومت داری وحکمرانی کے فنی امور کے سب سے زیادہ ماہر شخص تک جا پہنچتا ہے کہ اسے پورے ملک کی سربراہی مل جاتی ہے اور یہ منصب اس کی ماہرانہ صلاحیت کی بناء پر ہوتا ہے کہ پھر وہ تمام رعایا پر حکومت کرتا ہے اور جو کچھ جس سے چاہتا ہے وہ انجام دیتا ہے، اس منصب وعہدہ اور مقام ومنزلت کے دائرہ کی وسعت ہی نے وثنیت وبت پرستی کی راہیں ہموار کیں اور پھر وہ ایک مستقل دین ومذہب کی صورت اختیار کر گئی کہ جواب تک موجود ہے، اس سلسلہ میں تفصیلی بحث آئندہ سطور وصفحات میں کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

اور معاشرت واجتماعیت اپنی تمام تر اقسام وانواع کے ساتھ خواہ گھریلو ہو یا دیگر، اگرچہ کسی بھی دور میں نوع انسانی اس سے الگ نہیں رہی بلکہ ہر زمانہ میں یہ سلسلہ قائم رہا لیکن انسان اس کی طرف شعوری توجہ نہ کر سکا اور اس کی تفصیلی جہتوں کی جانب ملتفت نہیں ہوا بلکہ عملی طور پر دیگر امور مثلاً استخدام اور خدمت گیری ودفاع وغیرہ کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت واستحکام میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ ''معاشرہ'' کے وجود کا شعوری وطبعی احساس پیدا ہو گیا۔

قرآن مجید نے بتایا کہ سب سے پہلے اس وقت انسان ''معاشرہ'' کی اہمیت وحیثیت اور اس کے فوائد وآثار سے مطلع وآگاہ ہوا اور اس کی مستقل حیثیت میں حفاظت وپاسداری پر عملی توجہ دینے لگا جب نبوت نے اسے اس حوالہ سے آگاہی دلائی اور معاشرت واجتماعیت کی افادیت سے باخبر کیا، چنانچہ اس سلسلہ میں درج ذیل قرآنی آیات بطور مثال پیش کی جاتی ہیں جن میں معاشرت کی بابت خداوند عالم نے سلسلہ نبوت کی اثر گزاری وعملداری کا تذکرہ کیا ہے۔

سورۂ یونس، آیت: ۱۹

○ ''وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا''

(لوگ امت واحدہ تھے، پھر آپس میں اختلاف کرنے لگے)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۳

○ ''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ''

(لوگ ایک ہی امت تھے، پھر خدا نے انبیاءؑ کو خوشخبری دینے والے اور انذار کرنے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ حق والی کتاب بھیجی تاکہ لوگوں کے درمیان اس چیز کے بارے میں فیصلہ کرے جس میں وہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں)

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے باخبر کیا ہے کہ انسان اپنے قدیم ترین ابتدائی ایام میں ایک سادہ امت واحدہ کی صورت میں زندگی بسر کرتا تھا کہ جس کے افراد کے درمیان کوئی اختلاف نہ پایا جاتا تھا اور پھر ان میں اختلافات و نزاعات پھوٹ پڑے تو خداوند عالم نے انبیاءؑ کو بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ اس طرح ان میں پائے جانے والے اختلاف کو ختم کرے اور انہیں اپنی طرف سے مقرر کردہ قوانین و دستورات کے ذریعے ایک اجتماعی وحدت و معاشرتی یکتائی کی جانب واپس لے آئے۔ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا:

سورۂ شوریٰ، آیت: ۱۳

○ ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ''

(اس نے تمہارے لئے وہی دینی احکام مقرر کئے جن کی تاکید نوحؑ کو کی اور تیری طرف اس کی وحی کی اور اس کا حکم ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ دین پر قائم رہو (دین قائم کرو) اور اس میں تفرقہ و اختلاف پیدا نہ کرو)

اس آیت میں خداوند عالم نے اس حقیقت سے آگاہی دلائی کہ لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو دور کرنے اور ان کے درمیان وحدت و اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کا واحد ذریعہ و وسیلہ ان کے درمیان دین کا قیام اور دین کی بابت عدم تفرقہ ہے، لہٰذا دین ہی ہے جو انسانی معاشرہ کی بہتری و بھلائی کا ضامن ہے۔

اور یہ آیت مبارکہ...... جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں...... سب سے پہلے اس دعوت یعنی اجتماعیت و معاشرت اور اتحاد کی دعوت کے حوالہ سے حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کر رہی ہے کہ جو قدیمی ترین انبیاءؑ میں سے تھے اور صاحب شریعت اور صاحب کتاب تھے (انہیں شریعت اور کتاب عطا کی گئی تھی) پھر حضرت ابراہیمؑ، پھر حضرت موسیٰؑ اور آخر میں حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ کر رہی ہے جبکہ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی شریعتیں معدودے چند احکام پر مشتمل تھیں اور مذکورہ بالا چار انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت موسیٰؑ کی شریعت سب سے وسیع تھی اور حضرت عیسیٰؑ کی شریعت بھی انہی (حضرت

موسیٰ ؑ) کے تابع تھی جیسا کہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں آگاہ کیا ہے، اور موجودہ انجیلوں میں بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اور جب حضرت موسیٰ ؑ کی شریعت کے بارے میں بھی یہی کہا گیا کہ اس میں تقریباً چھ سو احکام کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

بنابرایں واضح ہوا کہ اجتماعیت و معاشرتی زندگی کی دعوت مستقل صورت میں صرف نبوت کے ذریعے انجام پائی اور انبیاء علیہم السلام نے اسے دین کے قالب میں پیش کیا چنانچہ قرآنی آیات میں اس کا صریح بیان موجود ہے اور تاریخ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، کہ اس سلسلہ میں عنقریب مزید مطالب تاریخی بحث میں پیش ہوں گے۔

۳۔ اسلام کی معاشرتی امور پر خصوصی توجہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے اپنی تعلیمات کی اساس و بنیاد صریح طور پر معاشرہ و معاشرتی زندگی پر قائم کی ہے۔ اور اس نے کسی بھی حوالہ سے معاشرتی امور کو بے اہمیت و نظر انداز نہیں کیا، اگر آپ اس سلسلہ میں مزید آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہوں تو سب سے پہلے انسانی اعمال کے وسیع دائرہ پر نگاہ کریں اور ان کی یہ گوناگوں قسموں، شعبوں اور انواع و اصناف کو دیکھیں کہ جس کو شمار کرنا انسانی قوت فکر کے بس کا روگ نہیں، پھر آپ شریعت اسلامیہ میں ان اعمال کے شمار کئے جانے اور پوری طرح ان کو ملحوظ و مدنظر قرار دے کر ان سب کی بابت احکام و دستورات وضع و معین کرنے پر توجہ کریں اور پھر ان تمام احکام کو معاشرہ کے قالب میں ڈھالنے کے نہایت ظریفانہ عمل پر نظر کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نے معاشرت کی روح کو اپنے احکام میں ممکنہ حدود تک نافذ کیا ہے یعنی جہاں تک ممکن تھا اسلام نے اپنی تعلیمات میں معاشرت کی روح پھونکی اور ان کی عملی تطبیق کی ہر ممکن صورت پیش کر دی۔

اس کے بعد آپ ان احکام کا دیگر ان آسمانی شریعتوں سے موازنہ کریں جن کے بارے میں قرآن مجید نے خصوصی طور پر اہمیت کے ساتھ آگاہ کیا ہے یعنی حضرت نوح ؑ، حضرت ابراہیم ؑ، حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰ ؑ کی شریعتیں، تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ان کے درمیان کیا نسبت پائی جاتی ہے اور اس نسبت کے تناظر میں شریعت اسلامیہ کا مقام و منزلت کیا ہے!

جب شریعت اسلامیہ اور ان شریعتوں کے درمیان نسبت و مقام کی صورت یہ ہے تو ان شریعتوں کے حوالہ سے اس کا مقام و امتیازی بلند مرتبہ کس قدر ہو گا جن کی بابت قرآن مجید نے خاص توجہ و عنایت کی ہی نہیں مثلاً بت پرستوں، صابئوں، مانویوں اور مجوسیوں وغیرہ کی شریعتیں! ان کی بابت صورتحال واضح و روشن تر اور آشکار ہے۔

اور جہاں تک متمدن قوموں اور غیر متمدن قوموں کا تعلق ہے تو تاریخ نے ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ

نہیں بتایا کہ وہ صرف انہی چیزوں کی عملی پیروی کرتے تھے جو انہیں عہد قدیم سے وراثت میں ملیں یعنی دوسروں کی توانائیوں سے استفادہ کرتے ہوئے معاشرتی امور کی انجام دہی کو یقینی بنانا اور استبدادی حکومت و بادشاہت کی بنیاد پر قائم آمریت کے تحت اجتماعی و معاشرتی زندگی بسر کرنا، تو ان دو عوامل کی بنیاد پر ان کا معاشرہ قوم، وطن اور علاقہ کے حوالہ سے پہچانا جانے لگا یعنی اس میں حاکمیت و آمریت اور ریاست و بادشاہت ہی اصل و اساس تھی اور اس کے طور و اطوار اور طرزِ عمل موروثی اقدار و اصول اور علاقائی رسم و رواج ہی سے وابستہ تھے۔ اسی وجہ سے ان امتوں میں سے کوئی امت اپنے استقلال کو درخورِ اعتناء قرار نہ دیتی تھی اور نہ ہی اسے بحث و عمل کا موضوع قرار دیتی تھی، یہاں تک کہ ان امتوں کی روش بھی یہی تھی جو نامور اور دنیاوی حکمرانی کے حوالہ سے بڑی طاقتیں (سپر پاورز) کہلاتی تھیں کہ انہوں نے بھی دین کی روشنی کے پھیل جانے اور اس کے روم و فارس کی سلطنتوں کی سرحدیں عبور کر جانے کے باوجود اپنی معاشرتی حیثیت کے بارے میں غور و فکر نہ کیا بلکہ انہی قیصری و کسروی آمریتوں کے نظام سے وابستہ رہ کر معاشرتی زندگی بسر کرتے رہے اور ان کی ترقی و پستی انہی آمرانہ نظاموں سے وابستہ رہی کہ جب وہ امپراطوری و سلطنتی نظام مضبوط ہوتا تو معاشرہ بھی مضبوط ہو جاتا اور جب اس میں کمزوری آتی تو معاشرہ بھی کمزور پڑ جاتا،...... گویا معاشرہ کی حیثیت و وقار آمریت کی قوت پر موقوف تھا نہ کہ افراد کی انسانی عظمت و عقلی و فطری معیاروں پر!...... البتہ ان کی موروثی تحریروں میں ان کے حکماء و فلاسفہ مثلاً سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے نوشتہ جات اجتماعی و معاشرتی امور کی بابت علمی بحثوں کے حامل نظر آتے ہیں لیکن وہ سب کاغذی مجموعوں سے زیادہ کوئی عملی حیثیت نہیں رکھتے اور کسی دور میں ان کی عملی صورتیں مشاہدہ میں نہیں آئیں بلکہ وہ فکر و ذہن کی حدود سے نکل کر حقیقی صورتوں اور عملی قالب میں ڈھلی ہی نہیں چنانچہ ان کی موروثی تاریخ اس سلسلہ میں ہمارے موقف اور بیان کردہ مطالب پر نہایت واضح اور عادل ترین گواہ ہے۔

بنابرایں سب سے پہلی ندا جو نوع انسانی کو سنائی دی اور اس نے افراد بشر کو معاشرتی زندگی کے امور کو اہمیت کی نظر سے دیکھنے اور اسے ہر طرح کے اہمال و بے توجہی اور اندھی تقلید سے پاک معاشرہ کی تشکیل کو مستقل موضوع قرار دینے کی ضرورت پر زور دیا وہ پیامبر بزرگوارِ اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صدائے حق تھی کہ جس میں آنحضرتؐ نے لوگوں کو ان آیات الٰہی کی پیروی کی دعوت دی جن میں ان کی دنیاوی زندگی کی سعادت مندی اور معاشرتی زندگی کی پاکیزگی سے بہرہ مند ہونے کے زریں اصول پائے جاتے ہیں ان آیات میں سے چند درج ذیل ہیں:

سورۂ انعام، آیت: ۱۵۳

○ ''وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ''

(اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس تم اسی کی پیروی کرو اور دیگر راستوں کا اتباع نہ کرو ورنہ وہ تمہیں پراگندہ کر دیں گے)

سورۂ آل عمران، آیات: ۱۰۳ تا ۱۰۵

○ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ۠ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۗ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾

(اورتم اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو اور آپس میں فرقہ بندی نہ کرو، اور تم اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم باہمی دشمنی کا شکار تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی کہ پھر تم اس کی نعمت کے طفیل آپس میں بھائی بھائی بن گئے، اور تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے کہ اس نے تمہیں اس سے نکال کر بچا لیا، اس طرح اللہ تمہیں اپنی آیات کی عملی وضاحت کرتا رہتا ہے تا کہ تم ہدایت یافتہ رہو، اور ضروری ہے کہ تم میں سے ایک گروہ ایسا ہو جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں (اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں)......اس میں معاشرہ کو تفرقہ و گروہ بندی سے بچانے کا اشارہ ہے......، اور وہی کامیاب ہیں، اور تم ان لوگوں جیسے نہ بنو جنہوں نے تفرقہ اندازی کی اور واضح نشانیاں و دلائل آ جانے کے باوجود اختلاف کیا کہ وہی ہیں جن کے لئے بہت بڑا عذاب مقرر ہے)

سورۂ انعام، آیت: ۱۵۹

○ ''اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ''

(جن لوگوں نے اپنے دین میں گروہ بندیاں کیں اور فرقوں میں بٹ گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں)

ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں اجتماعی و معاشرتی زندگی اور باہمی اتفاق و اتحاد کی دعوت دی گئی ہے مثلاً

سورۂ حجرات، آیت: ۱۰

○ ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ''

(یقیناً! اہل ایمان آپس میں بھائی ہیں، پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاحی عمل انجام دو)

سورۂ انفال، آیت: ۴۶

○ ''وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ''

(اور تم آپس میں نزاع نہ کرو ورنہ بکھر جاؤ گے اور تمہاری عزت برباد ہو جائے گی)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۴

○ ''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ''

(اور ضروری ہے کہ تم میں سے ایک قوم ایسی ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کام سے روکیں)

ان آیات کے علاوہ دیگر متعدد آیات ایسی ہیں جن میں ایسے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا صریح حکم دیا گیا ہے جس کی بنیاد اتفاق و اتحاد پر قائم ہو اور اس میں افراد کے معنوی و مادی فوائد کی بھرپور ضمانت پائی جاتی ہو اور اس سے دفاع کی تمام تر تدبیریں موجود ہوں تا کہ اس کے ذریعے ہر فرد اپنی سعادتمند زندگی سے بہرہ ور ہو سکے۔ ہم اس سلسلہ میں عنقریب وضاحت کے ساتھ بعض مربوط مطالب پیش کریں گے۔

۴۔ فرد اور معاشرہ کے درمیان روابط کا اسلامی امتیازی نقطۂ نظر

کارخانہ تخلیق کی یہ روش عام طور پر مشاہدہ میں آتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اجزاء کو وجود عطا کرتا ہے کہ ان میں سے ہر جزء مخصوص آثار و خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، پھر ان میں سے چند اجزاء کو ان کے درمیان مختلف و متعدد حوالوں سے فرق و تفاوت پائے جانے کے باوجود باہم اکٹھا کر کے انہیں ایک مجموعہ مرکب کی صورت میں لاتا ہے، پھر ان میں سے ہر ایک میں پائے جانے والے فوائد کے ساتھ ساتھ دیگر نئے فوائد سے استفادہ کرتا ہے۔ مثلاً انسان کہ جو متعدد اجزاء و اعضاء رکھتا ہے اور گوناگوں قوتوں کا حامل ہے کہ جن میں مادی و روحانی فوائد کا ایک خزانہ پایا جاتا ہے کہ اگر وہ یکجا ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک قوی تر اور عظیم تر ہو جاتا ہے اور وہ سب بھاری بھرکم مجموعہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان میں سے ہر جزء جس طرح انفرادی حیثیت میں اپنی مخصوص قوتوں کا حامل تھا اسی طرح مجموعی حیثیت میں بھی نہایت طاقتور ہو جاتا ہے کہ پھر ہر طرح کی حرکت و تحرک اور عملداری کی تمام جہتیں اجتماعی قوت پیدا کر لیتی ہیں، لیکن اگر وہ یکجا نہ ہوں اور ایک مجموعہ مرکب کی صورت اختیار نہ کریں بلکہ ہر قوت اپنی انفرادی و متفرق حالت پر باقی رہ جائے مثلاً سننے کی طاقت، دیکھنے کی طاقت، چکھنے کی طاقت، چاہنے کی طاقت اور کچھ کرنے کی طاقت، (کان، آنکھ، ذائقہ، ارادہ، حرکت) تو یہ طاقتیں اپنی اپنی حیثیت میں اپنا کام کرتی ہیں مگر ان سب کا انسانی وجود میں ایک ترکیبی اکائی کی صورت میں قرار پانا انہیں ایک حاکم یعنی انسان کے تسلط کے وجودی نظام سے منسلک کر دیتا ہے تو اس صورت میں جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ترکیبی اکائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے، یعنی ان میں سے ہر قوت اپنی انفرادی صورت میں جن فوائد کی حامل ہے وہ اسی دائرہ میں محدود رہتی ہے لیکن ترکیبی اکائی پانے کی

صورت میں ان میں سے ہر جز کی طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے، اور ترکیبی اکائی کے فوائد بہت زیادہ ہیں مثلاً فعل، انفعال، روحانی فوائد، مادی فوائد، اور ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ ترکیبی اکائی کے نتیجہ میں ایک فائدہ، متعدد فوائد کی صورت میں ڈھل جاتا ہے یعنی اپنی وحدت میں کثرت کا حامل ہو جاتا ہے کیونکہ انسانی مادہ مثلاً نطفہ جب اپنی نشوونما کے مراحل مکمل کر لیتا ہے اور مکمل انسان بن جاتا ہے تو اس بات پر قادر ہو جاتا ہے کہ خود اپنے ہی مادہ میں سے کچھ الگ کر کے اس کی تربیت کرے اور اسے ایک مکمل انسان کی صورت میں لے آئے کہ جو اسی طرح کے افعال انجام دے جس طرح کے افعال وہ خود انجام دیتا تھا اور تمام مادی و روحانی افعال میں اس جیسا ہو جائے، بنابرایں تمام افراد بشر اپنی کثرت کے باوجود وحدت رکھتے ہیں یعنی کثیر افراد در حقیقت ایک ہی انسان ہے اور اس کے افعال تعداد کے لحاظ سے ''کثیر'' مگر نوع کے اعتبار سے ''واحد'' ہیں اور وہ سب پانی کی طرح یکجا و مرکب ہوتے ہیں کہ جس طرح پانی ایک حقیقت واحدہ رکھتا ہے مگر جب اسے برتنوں میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ ایک سے زیادہ ہو جاتا ہے اور اس کی کثرت کا سرچشمہ ایک ہی نوع ہوتی ہے، یعنی وہ سب پانی اگرچہ مختلف و متعدد برتنوں میں آنے کے حوالہ سے کثیر ہیں مگر نوعی حقیقت کی بنیاد پر واحد ہیں اور اپنی نوعی وحدت کے باوجود ان کے آثار و خواص میں کثرت پائی جاتی ہے لیکن جب وہ سب پانی یکجا ہو جائیں تو ان میں قوت و عظمت پیدا ہو جاتی ہے، اسی مطلب کو اسلام نے اس نوع کے افراد کی تربیت اور انہیں حقیقی سعادت کی طرف ہدایت و رہنمائی کرنے میں ملحوظ قرار دیا ہے اور اسے بنیادی اہمیت کا حامل بنایا ہے اور اسی حقیقت کو اصل و اساس قرار دیا ہے کیونکہ اس کو بنیادی حیثیت دینا ناگزیر ہے، اسی سلسلہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ فرقان، آیت: ۵۴

- ''وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا''

(وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا اور اسے نسب و خاندان اور سسرالی نظام کا محور قرار دیا)

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

- ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ''

(اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۵

- ''بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ''

(تمہارے بعض، بعض سے ہیں، (تم ایک دوسرے سے ہو)

اور فرد اور معاشرہ کے درمیان پایا جانے والا یہ حقیقی رابطہ لامحالہ ایک ایسی معاشرتی صورت اختیار کر لیتا ہے جو افراد

کے وجود، ان کی قوتوں، ان کی خصوصیات اور ان کے عملی آثار کی بناء پر مخصوص کیفیت کی حامل ہوتی ہے اور پھر "معاشرہ" کے نام سے ایک ایسی اکائی وجود میں آ جاتی ہے جو ہر فرد کی خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس میں اجتماعی قوت جلوہ گر ہوتی ہے، اسی بناء پر قرآن مجید نے امت کے لئے وجود، اجل، کتاب، شعور، فہم، عمل اور اطاعت و معصیت کے حوالے قرار دیئے اور انہیں کے تناظر میں اس کا تذکرہ کیا، چند آیات بطور مثال ملاحظہ ہوں:

سورۂ اعراف، آیت: ۳۴

- "وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝"

(اور ہر امت کے لئے ایک اجل (مقررہ وقت) ہے کہ جسے وہ نہ تو مؤخر کر سکتے ہیں اور نہ ہی مقدم کر سکتے ہیں)

اس آیت میں ہر امت کے مقررہ وقت کا حوالہ ملحوظ ہے۔

سورۂ جاثیہ، آیت: ۲۸

- "كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا"

(ہر امت کو اس کی کتاب کی طرف بلایا جائے گا)

یہ آیت ہر امت کی مخصوص کتاب کے حوالہ کی طرف توجہ دلا رہی ہے،

سورۂ انعام، آیت: ۱۰۸

- "زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ....."

(ہم نے ہر امت کے لئے ان کے اعمال کو زینت قرار دیا......)

اس آیت میں امت کے اعمال کا حوالہ ملحوظ قرار دیا گیا ہے۔

سورۂ مائدہ، آیت: ٦٦

- "مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ"

(ان میں سے بعض امتیں درست راستہ پر ہیں)

سورۂ ال عمران، آیت: ۱۱۳

- "أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ"

(امت قائم و ثابت قدم، وہ اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔)

سورۂ غافر، آیت: ۵

- "وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ"

(ہر امت نے اپنے رسول کو اپنے زیر تسلط کرنے کی کوشش کی اور باطل کے ذریعے مجادلہ و جھگڑا کرنے لگے تا کہ

اس طرح حق کا نام مٹا دیں، تو ہم نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر کس قدر سخت عذاب میں مبتلا کر دیا)

سورۂ یونس، آیت: ۴۷

○ ''وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ''

(اور ہر امت کے لئے ایک رسول آیا، تو جب بھی ان کا رسول آیا تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کیا گیا)

ان آیات کی روشنی میں یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید افراد کے حالات و واقعات کو ان کی انفرادی زندگی کے حوالہ سے جس طرح اہمیت کی نظر سے دیکھتا ہے اسی طرح امتوں کی تواریخ کو بھرپور بلکہ اس سے زیادہ اہمیت دیتا ہے کیونکہ عام طور پر مشاہدہ میں آیا ہے کہ تواریخ کا محور بادشاہوں اور بڑے لوگوں کے حالات کے تذکروں کے سوا کچھ نہ تھا اور مؤرخین، نزول قرآن کے بعد امتوں اور معاشروں کے حالات و واقعات قلمبند کرنے کی طرف راغب ہوئے اور پھر اس سلسلہ میں ان میں سے بعض حضرات نے کچھ عملی اقدامات بھی کئے جن میں مسعودی اور ابن خلدون شامل ہیں، اور پھر تاریخ نویسی کا یہ سلسلہ افراد کے حالات قلمبند کرنے کے مراحل سے گزرتا ہوا امتوں کی تواریخ رقم کرنے تک پہنچ گیا اور یہ بات اس حوالہ سے ایک بڑی تبدیلی قرار پائی، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس نے قدم بڑھایا وہ فرانسیسی مؤرخ (انحوست کنت) متوفی ۱۸۵۷ء ہے۔

خلاصہ مطلب یہ کہ جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جب فردی قوتوں و خصوصیات کا اجتماعی قوتوں وخصوصیات سے تقابل وتعارض اور تضاد ہو تو اجتماعی قوتیں وخصوصیات ہی غالب و مافوق ہوں گی اور ایسا ہونا دو متضاد چیزوں کے درمیان لازمی امر ہے، اس کے ساتھ ساتھ مشاہدہ وتجربہ سے بھی اس حقیقت کی گواہی ملتی ہے کہ اجتماعی قوتیں وخصوصیات فعل وانفعال یعنی اثر گزاری واثر پذیری دونوں صورتوں میں فردی قوتوں وخصوصیات پر غالب آتی ہیں چنانچہ ہر کام میں یہ بات دیکھنے کو ملتی ہے کہ اجتماعی کوشش وارادہ کے سامنے فردی کوشش وارادہ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی، اس کا ثبوت جنگوں اور اجتماعی حملوں میں بخوبی نظر آتا ہے کہ ایک فرد خواہ جس قدر قوی وطاقتور ہو اجتماعی حملوں کا مقابلہ اس کے بس کا روگ نہیں ہوتا، بلکہ ''جزء'' کے لئے ''کُل'' کے ساتھ ساتھ چلنے اور اس کی راہ اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ''کُل'' یعنی معاشرہ اس قدر طاقتور ہو جاتا ہے کہ اپنے ہر ''جزء'' یعنی ہر فرد کی شعوری وفکری قوتوں کو سلب کر دیتا ہے کہ پھر ہر فرد کی انفرادی حیثیت باقی ہی نہیں رہتی بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ معاشرہ ہوتا ہے، اسی طرح کی صورت حال عمومی خوف وہراس اور دہشت ووحشت گری میں ہوتی ہے جیسا کہ جنگ میں شکست، عمومی بدامنی، زلزلہ، قحط و وبا یا علاقائی رسم ورواج اور قومی اطوار وعادات وغیرہ فرد کو معاشرہ کی پیروی کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور اس سے فکر وادراک

کی قوتیں سلب کرلیتی ہیں۔

اسی بناء پر اسلام نے اجتماع و معاشرہ کو اہمیت کی نظر سے دیکھا ہے اور اس طرح اہمیت عطا کی ہے کہ نہ تو اس قدر اہمیت اس سے پہلے اسے حاصل ہوئی اور نہ آئندہ اس کی مثال کسی بھی دین و آئین، اور مذہب وملت میں اسے حاصل ہوسکتی ہے (عین ممکن ہے کہ قارئین کرام ہمارے اس ادعا کو تسلیم نہ کریں) یہ حقیقت واضح و مسلم الثبوت ہے کہ اسلام کا معاشرہ اور معاشرتی اقدار کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھنا اس حوالہ سے اپنی مثال آپ ہے کہ کسی فرد میں اخلاقی تربیت وصفاتی کمالات کا پایا جانا جو کہ معاشرہ کی تشکیل میں اصل واساس کی حیثیت رکھتا ہے اپنی تمام تر خصوصیات کے باوجود معاشرہ میں پہلے سے موجود ان اخلاقی وصفاتی اقدار کا مقابلہ نہایت معمولی اور نا قابل قیاس حد سے زیادہ نہیں کرسکتا جو اعلیٰ و بلند پایہ مقامات سے متصادم ہوتی ہیں اور ان میں معاشرتی قوت کی بناء پر اثر آفرینی کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہے، یعنی معاشرہ میں پائی جانے والی منفی صفات اور اخلاقی جہات اس قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ فردی صفات کا ان سے تقابل نا قابل قیاس اور نہایت معمولی ہوتا ہے، اسی حوالہ سے اسلام نے اپنی اہم ترین تعلیمات اور احکام و دستورات مثلاً حج، نماز، جہاد و انفاق اور دینی تقویٰ کو معاشرہ کی بنیاد پر استوار کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت کی تمام قوتوں کو دینی احکام و دستورات اور ان کی حدود کے تحفظ کا ذمہ دار قرار دے کر اور تمام افراد امت پر دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عمومی فریضہ عائد کر کے اسلامی معاشرہ کی اصل غرض و مقصد حقیقی سعادت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرب و منزلت کو قرار دیا، اور صرف اسلامی معاشرہ ہی نہیں بلکہ ہر معاشرہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی مشترکہ غرض و مقصد سے بے نیاز نہیں ہوتا لہٰذا ہر معاشرہ میں اصل غرض حقیقی سعادت ہی ملحوظ قرار پاتی ہے، اور یہی چیز بنیادی طور پر ہر فرد کے باطن میں ایک نگران کی حیثیت رکھتی ہے کہ جس سے انسان کے باطنی اسرار پوشیدہ نہیں رہ سکتے، اور جب باطنی اسرار مخفی نہیں رہ سکتے تو ظاہری اعمال تو ویسے بھی ظاہر و آشکار ہوتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ حکومتی ادارے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے حضرات پر کسی کے باطنی اسرار آشکار نہیں ہوتے اور وہ ان سے آگاہی حاصل کرنے سے قاصر ہوتے ہیں بہرحال یہی عمومی معاشرتی بنیاد پر قائم ہونے والا دینی تقویٰ، اسلام کو دیگر ادیان و مذاہب اور ہر معاشرتی نظام سے ممتاز و مافوق کرتا ہے کہ اس طرح سے معاشرہ کی اصلاح و بہتری اور پاکیزگی کا نظام و اہتمام کسی دوسرے دین و آئین میں دکھائی نہیں دیتا۔

۵۔ آیا اسلامی معاشرتی اقدار قابلِ بقاء و اجراء ہیں؟

قارئین کرام، ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ اگر اسلام کے پیش کردہ معاشرتی اقدار حقیقی معنی میں دیگر تمام ادیان و

مذاہب اور متمدن ترین اقوام کے معاشرتی اصولوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ اور مضبوط ہوتے تو معاشرے میں ان کی بقاء و اجراء کی مدت زیادہ ہوتی جبکہ صورت حال اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے تو ایسا کیوں ہوا؟ اور اسلامی معاشرتی اصولوں کو زیادہ پذیرائی حاصل کیوں نہیں ہوئی؟ بلکہ نہایت قلیل عرصہ ہی ان کے اجراء کو حاصل ہوسکا اور پھر اسی قیصریت وکسریت ہی کو حاکمیت حاصل ہوئی جو پہلے تھی، بلکہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ مخدوش اور ناگفتہ بہ ہوگئی اور امپراطوری و بادشاہت کے شاخسانے پیدا ہوگئے اور ایسے حالات سامنے آئے کہ سابقہ امپراطوری نظاموں میں بھی نہ دیکھے گئے تھے جبکہ اس کے مقابلے میں مغربی معاشرتی نظاموں کو بقاء واستحکام حاصل ہوا اور ان کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں، اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ مغربی معاشرتی اصولوں کو زیادہ ارتقاء واستحکام حاصل ہے اور معاشرے میں ان کی عملداری و اجراء کی بنیادیں مضبوط وقوی تر ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اہل مغرب نے اپنے معاشرتی اصولوں کو عوام الناس کے ارادہ و خواہش اور ان کی چاہتوں وطبعی تقاضوں کی بنیادوں پر استوار کیا اور پھر ان میں اکثریت کی خواہشوں اور آراء وتجاویز کو معیار قرار دے دیا کیونکہ معاشرے کے تمام کے تمام افراد کا یکجا ہونا اور ایک ہی رائے ونظریہ پر متفق ہو جانا عام طور پر محال وناممکن ہے جبکہ اکثریت ہی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اسی پر معاشرے کے عمومی نظام کا دارومدار قرار پاتا ہے چنانچہ ہم مادی وطبعی علل واسباب میں سے ہر ایک کو اکثر وبیشتر مؤثر پاتے ہیں البتہ ہمیشہ اور دائمی طور پر نہیں (یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سب کے سب ہر صورت میں اور ہمیشہ ہی مؤثر واقع ہوں) یہی حال ان عوامل کا ہے جو ایک دوسرے سے مختلف و متصادم ہوتے ہیں کہ وہ بھی اکثر ہی مؤثر واقع ہوتے ہیں یعنی نہ تو سب کے سب اور نہ ہی قلیل ترین! اسی وجہ سے موزوں یہ ہے کہ معاشرتی نظام کی تشکیل، اصل غرض ومقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور معاشرے میں رائج ونافذ العمل قوانین کے حوالہ سے اکثریت کی آراء پر استوار ہو، اور جہاں تک نظریہ دینی نظام معاشرت کا تعلق ہے تو اسے ایک خالی وخیالات آرزو سے زیادہ کوئی حیثیت حاصل نہیں کہ جو موجودہ دور میں عملی صورت میں ڈھل نہیں سکتی بلکہ ایک ایسا خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا اور اس کا دائرہ ذہن کی دنیا سے باہر نہیں، جبکہ اس کے برعکس عصر حاضر کے تمدنی نظام نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں معاشرہ کی طاقت وسعادت کے ساتھ ساتھ افراد کی پاکیزگی اور ان کا رزیلتوں اور ناپاک صفات واعمال سے پاک ہونا یقینی بنا دیا ہے کیونکہ رزیلتیں اور ناپاک صفات واعمال ایسے امور ہیں جن کو معاشرہ ہرگز پسند نہیں کرتا مثلاً جھوٹ، خیانت، ظلم، چوری، بے وفائی وغیرہ۔

یہ مطالب ان خیالات وافکار کا خلاصہ ہے جو ہمارے مشرقی محققین بالخصوص ہمارے ان فاضل دانشوروں کے اذہان میں پیدا ہوئے ہیں جو معاشرتی ونفسیاتی مسائل میں بحث وتحقیق میں سرگرم عمل رہتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان حضرات نے مطالب کو بیجا مقامات میں پیش کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ حقیقت الامر کے سمجھنے میں خلط ملط کا شکار ہو گئے اس کی وضاحت ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ اسلامی نظام معاشرت موجودہ زمانہ میں رائج تمدن کے مقابلے میں ناقابل عمل ہے کیونکہ دنیا کے موجودہ حالات اسلامی قوانین سے ہمرنگ نہیں، تو یہ درست ہے لیکن اس سے ان کا مطلوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ انسانی معاشرے میں رائج ہر نظام واصول ہی ایسا ہے جو نو پیدا اور جدید الحدوث ہے یعنی پہلے موجود نہ تھا اور پھر وجود میں آیا، اور جب وجود پذیر ہونے لگا تو معاشرہ کے عمومی حالات اس سے ہمرنگ و ہم آہنگ نہ تھے بلکہ اس سے متصادم اور اسے مسترد کر رہے تھے، مگر اس کے باوجود جدید الحدوث نظام نے حالات کا بھرپور مقابلہ کیا اور کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی سے دوچار ہونے کے ساتھ ساتھ بالآخر کامیابی حاصل کر کے معاشرے میں رائج قدیم تمدن پر غلبہ پا گیا کہ جس کے نتیجہ میں قدیم تمدن کو جڑ سے اکھاڑ دیا، البتہ ایسا بھی ہوتا رہا کہ معاشرہ میں رائج قدیم تمدن اس قدر مضبوط تھا کہ اس نے جدید نظام کو نہ پنپنے دیا اور اس کا راستہ روک دیا، لیکن اس طرح کی سرد اور گرم جنگ کے بعد بالآخر معاشرے میں اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ اس کا تسلط پورے معاشرہ پر یقینی ہو گیا، چنانچہ اس کی مثالیں دینی و دنیوی تمام نظاموں کے حوالہ سے تاریخ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں مثلاً پہلی عالمی جنگ کے بعد ڈیموکریٹک نظام (کہ جو عصر حاضر میں سب سے زیادہ پسندیدہ نظام قرار دیا گیا ہے) روس میں اپنی شکل کھو بیٹھا اور ایک اشتراکی وکمیونیسٹی نظام میں تبدیل ہو گیا، اور دوسری عالمی جنگ کے بعد مشرقی یورپ کے ممالک اور مملکت چین نے بھی روس کے ساتھ الحاق کر لیا جس سے دنیا کی نصف آبادی میں ڈیموکریسی نظام بے وقعت ہو گیا چنانچہ ایک سال پہلے کی بات ہے (تالیف کتاب کے حساب سے) کہ کمیونسٹ ممالک نے اعلان کیا کہ ان کے قائد آنجہانی اسٹالین نے اپنی حکومت کے دوران یعنی لینن کی حکومت کے تیس سال بعد اشتراکی نظام کو شخصی واستبدادی نظام میں بدل دیا اور آج تک صورتحال یہ ہے کہ کچھ لوگ اس کے شیفتہ ہوتے ہیں اور پھر اس سے روگردانی کر لیتے ہیں اور کچھ لوگ اس سے روگردانی کے بعد اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں بہرحال تاریخ میں اس طرح کے شواہد کثرت سے موجود ہیں اور اس طرح کے نظریاتی نشیب وفراز کی داستانوں کے حوالہ سے قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا: ''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ '' (تم سے پہلے بھی بہت سے نظام گزر چکے ہیں، تم زمین میں گھومو پھرو، اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟......سورۂ آل عمران ۷ ۱۳......، اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نظام جو آیات الٰہی کی تکذیب پر قائم ہو وہ کسی اچھے انجام کو نہیں پہنچتا۔

ان مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ کسی نظام کا معاشرے کے موجودہ ومعروضی حالات سے مطابقت کا حامل نہ ہونا اس بات کا ثبوت نہیں بنتا کہ وہ نظام ہی نادرست ہے بلکہ اس کا حال معاشرے میں جاری ورائج دیگر تمدنی اصولوں اور اجتماعی نظاموں جیسا ہوتا ہے کہ جو مختلف ومتعدد مراحل اور نشیب وفراز سے گزر کر بلکہ گوں ناگوں عوامل سے تصادم وٹکراؤ کے بعد معاشرے میں اپنی جگہ بناتا ہے، اسلام بھی طبیعی ومعاشرتی نظام کے حوالہ سے دیگر نظاموں کی طرح اس

قسم کے حالات کا شکار ہوا کیونکہ نظاموں اور معاشرتی تمدنوں کے حوالہ سے وہ بھی اس قاعدۂ کلیہ میں شامل ہے اس سے مستثنیٰ نہیں، اور اس کا حال بھی تقدم و تاخر اور عوامل و حالات اور اسباب کے ذریعے پیشرفت کرنے کے حوالہ سے دیگر نظاموں سے یکساں ہے اور موجودہ دور میں اس کی حالت (جبکہ اس کی حقانیت پر ایمان لانے والے چار سو ملین افراد دنیا کے گوشہ گوشہ میں آباد ہیں اور اسلام ان کے دلوں میں گھر کر چکا ہے...... یہ تعداد المیزان کے زمانہ تالیف کی ہے جبکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہے...... اس حالت سے زیادہ کمزور نہیں جو حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کے عہد مبارک میں تھی، ان ہستیوں کے عہد ہائے مبارکہ میں دعوت دین کا کام صرف ایک ہی شخص کے ہاتھوں انجام پا رہا تھا اور وہ بھی ایسے ماحول میں کہ پوری دنیا فسق و فساد میں گھری ہوئی تھی، پھر رفتہ رفتہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور لوگوں کے دلوں میں اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوگئیں، یہاں تک کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں بسنے والوں کے باہمی رابطوں اور میل جول کے نتیجہ میں اس کی پیشرفت کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے جب دعوت حق کے مشن کا آغاز فرمایا تو اس وقت آپؐ کے ساتھ ایک مرد اور ایک خاتون کے علاوہ کوئی مددگار و حامی نہ تھا پھر یکے بعد دیگرے لوگ ان کے ساتھ ملحق ہوتے رہے جبکہ وہ ایام نہایت سختی اور تنگی و شدت کے تھے، ان کی استقامت اور صدق دلی کا اثر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی مدد و نصرت سے نوازا اور وہ نیک و صالح اور متقی افراد پر مشتمل ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہوگئے اور جب تک آنحضرتؐ ظاہری زندگی کے ساتھ ان میں موجود تھے وہ معاشرہ نیکی و سعادت کی راہ پر گامزن ہوتا رہا مگر جب آنحضرتؐ کا وصال ہوا اور آپؐ رحلت فرما گئے تو فتنوں کا ایک طوفان امڈ آیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ امت اسلامیہ کے لئے وبال بن گیا، مگر حق کی آواز کب تک دبی رہتی اور اسلام اپنی قلیل سی عمر اور نہایت سخت حالات سے گزرنے کے بعد اس طرح دنیائے بشریت میں پھیلتا گیا کہ نصف صدی سے کم عرصہ میں دنیا کے مشرق و مغرب تک اس کی آواز گونجنے لگی اور تاریخ میں ایک بنیادی تبدیلی اور ٹھوس انقلاب آ گیا کہ جس کے آثار آج تک دیکھے جا رہے ہیں اور یہ سلسلہ مزید وسعت پا رہا ہے اور اسے دوام حاصل ہو رہا ہے اور یوں ہی بڑھتا رہے گا۔

علم الاجتماع اور علم النفس کے ماہرین اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دنیا میں اس وقت جو عظیم تبدیلی رونما ہو چکی ہے اس کا اصل سبب اور حقیقی عامل عالم انسانیت کے افق پر خورشید اسلام کا طلوع ہونا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اکثر یورپی محققین اور دانشوروں نے بھرپور بحث کرتے ہوئے واضح طور پر اظہار و اعتراف کیا ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن مغربی تہذیب و تمدن پر غالب آ گیا اور اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں، البتہ بعض یورپی دانشوروں نے تعصب یا سیاسی عوامل اور اسباب و وجوہات کی بناء پر اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کی راہ اپنائی ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی منصف مزاج محقق و دانشور اس سلسلہ میں بھرپور نظر کرنے کے باوجود عصر حاضر کے تہذیبی ارتقاء کا

اصل سبب دین مسیحیت کو قرار دے اور حضرت عیسی مسیح علیہ السلام کو اس کا رہبر و علمبردار سمجھے؟ جبکہ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بیانات وارشادات میں واضح وصریح الفاظ میں فرمایا ہے کہ بشری زندگی کے مادی امور اور جسمانی مسائل سے انہیں ہرگز سروکار نہیں اور نہ ہی وہ معاشرہ کے حکومتی وسیاسی کاموں میں کسی طرح کی دخل اندازی کرتے ہیں، یہ تو اسلام ہے جو معاشرہ کی تشکیل اور باہمی میل جول کی دعوت دیتا ہے اور انسانی معاشرہ کے تمام امور میں بھرپور طور پر دخیل ہوتے ہوئے تمام افراد معاشرہ کے ساتھ یکساں صورت میں ...... یعنی کسی بھی استثناء کے بغیر ...... مربوط ہوتا ہے، اس صورت میں علم الاجتماع وعلم النفس کے یورپی ماہرین کی طرف سے اسلام کی پھیلتی ہوئی روشنی کو نظرانداز کرنے میں کیا اس کے علاوہ کوئی وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ شمع اسلام کو بجھانے کے درپے ہیں (ویأبی الله ان یتم نوره) جبکہ اللہ کو اپنے نور کے قائم رکھنے کے سوا کوئی بات گوارا نہیں، کیا وہ اپنی روش میں اسلام دشمنی کے سوا کوئی ہدف رکھتے ہیں جس کی بناء پر وہ دین حق کی محبت دلوں سے محو کرنے کے لئے کوشاں ہیں کہ اس کے نتیجہ میں قومیت وقوم پرستی کے مذموم عنوان سے اسلام کو آنے والی نسلوں میں مشکوک کردیں؟

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام نے اپنے معاشرتی نظام میں لوگوں کی ہدایت ورہنمائی اور انہیں سعادت وخوش بختی کی راہ پر لانے کی بھرپور صلاحیت کا واضح وٹھوس ثبوت پیش کردیا ہے، تو اس کے باوجود یہ کیونکر ممکن ہے کہ اسے ایک ایسے مفروضہ کا نام دیا جائے جو انسانی زندگی میں عملی صورت اختیار نہ کرسکتا ہو، اور اس کے بارے میں یہ امید بھی نہ کی جاسکتی ہو کہ وہ دنیا میں کسی دن حکومت وحاکمیت کا حامل بن جائے (جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مقصد انسان کی حقیقی سعادت کے سوا کچھ نہیں)۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت: ۲۱۳ ''كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً'' کی تفسیر میں تفصیلی طور پر بیان ہوچکا ہے کہ موجودات عالم ہستی کے حالات پر نظر کرنے سے یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہوجاتی ہے کہ نوع انسانی بہت جلد اپنے اصل ہدف ومقصود کو پالے گی یعنی اسلام کا ظہور اور حقیقی غلبہ یقینی ہوجائے گا اور پورے انسانی معاشرے پر اسلام ہی کی مکمل حکمرانی ہوگی، چنانچہ اسی حوالہ سے خداوند عالم نے قرآن مجید میں واضح الفاظ مین وعدہ فرمایا ہے (ملاحظہ ہو):

سورۂ مائدہ آیت: ۵۴

○ ''فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ''

(عنقریب اللہ ان لوگوں کو لے آئے گا جنہیں وہ دوست رکھتا ہو اور وہ اسے دوست رکھتے ہوں گے، وہ مومنین کے ساتھ نرم خو اور کافروں پر سخت دل ہوں گے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوں گے اور اللہ کی بابت کسی سرزنش کرنے والے کی سرزنش سے خوفزدہ نہ ہوں گے۔)

سورۂ نور، آیت: ۵۵

○ ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا''

(اللہ نے تم میں سے ایمان والوں اور اعمال صالح بجالانے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے والے لوگوں کو خلافت سے نوازا، اور ان کے لئے اس دین کو پائدار و نافذ کردے گا جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور انہیں ان کے خوف کے بعد امن کی نعمت عطا کرے گا وہ میری ہی عبادت بجالائیں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہ دیں گے)۔

سورۂ انبیاء آیت: ۱۰۵

○ ''اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ''

(بے شک زمین کے وارث میرے نیک وصالح بندے ہی ہوں گے)

ایک اہم نکتہ

زیر نظر موضوع کے حوالہ سے ایک نہایت اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ جسے ان حضرات نے درخور اعتناء قرار نہیں دیا بلکہ اس کی بابت غفلت برتی، اور وہ یہ کہ اسلامی معاشرہ کا شعار اور شناختی اصول صرف اور صرف فکر وعمل میں حق کی پیروی کرنا ہے، جبکہ موجودہ سماجی معاشرہ (سول سوسائٹی) کا شعار اور شناختی اصول اکثریت کی آراء وخواہشیں ہے، ظاہر ہے کہ ان دونوں اصولوں کے حوالہ سے معاشرتی اہداف واغراض بھی مختلف ہوجاتی ہیں،

اب جہاں تک اسلامی معاشرہ کا تعلق ہے تو اس کی تشکیل کی غرض وغایت حقیقی عقلی سعادت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی وجودی قوتوں کے تقاضوں کی تکمیل میں حد اعتدال میں رہے یعنی اپنی جسمانی خواہشات کو پورا کرنے میں اس حد تک عملی اقدام کرے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہ ہونے پائے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ جسمانی تقاضے اسے خدا کی بندگی سے باز نہ کردیں بلکہ اس کے برعکس صورت حال ہو اور وہ یہ کہ جسمانی تقاضوں وخواہشوں کی تکمیل اللہ کی معرفت کے ساتھ اس کی بندگی کے حق کی ادائیگی کا سبب ووسیلہ بن جائے کہ اسی میں انسان کی سعادت کا راز پوشیدہ ہے اور اس کی تمام قوتوں کی سعادت اس پر موقوف ہے اور حقیقی راحت وسکون بھی یہی ہے (اگرچہ موجودہ زمانہ میں ہم اس حقیقی راحت وسکون کا صحیح معنی میں ادراک نہیں کر پاتے کیونکہ ہم میں اسلامی تربیت کا فقدان ہے) اسی لئے جو حق کی پیروی کے

حقیقی اصول پر قائم ہے یعنی عقل کہ جو فطرتِ سلیمہ کی ترجمان ہے اس کے تقاضوں کی تکمیل ہی اسلامی قوانین واحکام کی اصل و اساس ہے اور وہ حق کی پیروی کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا اسلام نے عقل سلیم سے متصادم ہر کام کی سختی سے ممانعت کی ہے اور ہر اس کام کو ممنوع قرار دیا ہے جس سے عقل سلیم کی کارگزاری متاثر ہوتی ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل سلیم حق کی پیروی کے علاوہ کسی کام کا نہ تو حکم دیتی ہے اور نہ ہی اس کی حمایت کرتی ہے، اسلام نے اپنے قوانین واحکام کے نفاذ وعملداری کی ذمہ داری معاشرہ پر چھوڑ دی ہے اور اسے ہی اس حوالہ سے ضامن قرار دیا ہے کہ وہ تمام اعمال واخلاق اور حقیقی معارف کے عملی تقاضوں کو پورا کرے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام حکومت وحاکمیت اپنے مخصوص سیاسی اصولوں اور قواعد وضوابط کے اجراء کے ساتھ عقل سلیم کی اصل واساس یعنی حق کی پیروی کو یقینی بنانے میں اپنا کردار کرتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ عامتہ الناس کے ذوقِ طبع سے ہرگز ہم آہنگ نہیں اور اسے ان کا نفسانی خواہشات کے دلدل میں گھرا ہونا اس سے روکتا ہے کہ وہ ان عقلی اصولوں کی عملی پاسداری کریں، کیونکہ اس وقت عالمی معاشرتی صورتحال کا مشاہدہ ایک نہایت خوفناک منظر پیش کر رہا ہے کہ اس میں افرادِ بشر، مادی خواہشوں کے اسیر ہو چکے ہیں اور ثروتمندوں و نادار دونوں طبقوں کے افراد نے ہوس پرستی کا ایک بازار گرم کر رکھا ہے جس میں ان کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی ہے اور انہیں مخصوص لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے سوا کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا، اس نہایت سنگین صورت حال سے نکلنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ وطریقہ ہے کہ تمام تر قوتوں و وسائل کو بروئے کار لایا جائے اور اسلامی مشن کی تبلیغ وسیع پیمانہ پر کی جائے اور صحیح تربیت کا دائرہ اس قدر پھیلایا جائے کہ اس سے مطلوبہ نتائج کا حصول یقینی ہو جائے۔ اور اسے اسی طرح اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جائے جس طرح زندگی کے دیگر امور میں اپنی تمام تر کاوشیں بروئے کار لائی جاتی ہیں اور مطلوبہ مقاصد کے حصول تک ہر ممکن راستہ اختیار کیا جاتا ہے،

یہ تو ہے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے اہداف اور اغراض ومقاصد کے حوالہ سے اصل بنیادوں کا بیان، اور جہاں تک موجودہ سماجی معاشرہ کا تعلق ہے تو اس کی تشکیل میں صرف ایک ہی مقصد ملحوظ ہے اور وہ مادی لذتوں سے بہرہ ور ہونا اور مادی امور سے لطف اندوز ہونا، اس مقصد کا حصول زندگی کو مادی تقاضوں سے ہم رنگ وہم آہنگ کرنے کے بغیر ممکن نہیں یعنی اگر اس مقصد تک پہنچنا چاہیں تو زندگی کو سراپا مادی احساسات سے لیس کریں اور جو کچھ طبیعت چاہے اسی کو اپنائیں خواہ وہ عقلی طور پر حق کے مطابق وموافق ہو یا موافق ومطابق نہ ہو اور صرف انہی امور میں عقل کی پیروی کریں جن میں ان کی مادی اغراض و اہداف متاثر نہ ہوتے ہوں، اسی وجہ سے سماجی معاشرہ کے قوانین کی تدوین واجراء میں اکثریت کی خواہشات اور طبعی رجحانات ہی ملحوظ قرار پاتے ہیں، اس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی قوانین کے اجراء کی ضمانت صرف انہی قانونی مشقوں میں پائی جاتی ہے جن کا تعلق افراد کے اعمال سے ہوتا ہے اس کے علاوہ دیگر امور کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہوتی یعنی اخلاق وعقائد اور اس طرح کے حقیقی امور کو کسی طرح قانونی تحفظ حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ کام لوگوں کی خود تشخیصی بنیاد پر چھوڑ دیا

جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کا اپنا فیصلہ ہی اصل ہے، اور اس میں انہیں کسی قانون یا ضابطہ سے کوئی ربط نہیں، (گویا پرسنل لاء اور پبلک لاء کی اصطلاحات کا سہارا لے کر اس سلسلہ میں معاشرتی ضوابط وضع کئے جاتے ہیں، م) لیکن اگر افراد کے خود تشخیصی حوالہ سے اخلاقی او اعتقادی اصولوں میں سے کوئی چیز سماجی قوانین سے متصادم ہو تو اسے برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ اس وقت اس کی ممانعت کا دستور آ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح کی صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ میں صرف وہی چیزیں رائج ہو جائیں جو لوگوں کی پست نفسانی خواہشات سے مطابقت رکھتی ہوں اور پورا معاشرہ انہی چیزوں کا رسیا ہو جائے تو اس میں وہی چیزیں محبوب و مستحسن قرار پائیں گی جنہیں دین برا اور قبیح قرار دیتا ہے اور پھر اخلاقی فضائل و اعتقادی اصول، قانونی آزادی کی آڑ میں بازیچۂ افراد بن جائیں گے کہ پھر ہر کہ و مہ ان کا مذاق اڑاتا ہوا دکھائی دے گا۔

اس تمام صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا اندازِ فکر ہی بدل جائے گا اور طرز تفکر کی یہ تبدیلی انہیں عقل کی دنیا سے نکال کر احساسات و جذبات اور طبعی رجحانات کا رسیا بنا دے گی، اس طرح فضائل و کمالات کے معیار ہی بدل جائیں گے اور جس کام کو عقل فسق و فجور قرار دے گی اسے خواہشات و جذبات اور احساسات کی دنیا میں تقوی سمجھا جائے گا اس کی مثال یورپی معاشرہ کی موجودہ صورت حال ہے کہ اس میں نوجوانوں، مردوں، عورتوں، لڑکیوں اور بچوں کے باہمی روابط و تعلقات کے معیار نہایت پست اور غیر عقلی ہیں مثلاً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان آزادانہ روابط و تعلقات، مردوں کے مردوں کے ساتھ اور عورتوں کے عورتوں کے ساتھ جنسی روابط، شادی شدہ عورت کے ساتھ نامحرم مردوں کے تعلقات، غیر شادی شدہ لڑکیوں کے ساتھ جنسی تعلقات، عورتوں اور کتوں کے درمیان جنسی روابط، اولاد اور محرموں کے ساتھ جنسی تعلقات، اسی طرح رقص و سرور کی مشترکہ محفلوں اور ایسے مخلوط اجتماعات کہ جن کا تذکرہ دینی ادب کے حامل افراد کو زبان پر لاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے، ایسے امور کی بنیادیں اور معیاروں کا عقلی اصولوں سے کسی طرح ربط نہیں بنتا بلکہ ان میں مادی و نفسانی خواہشات کے علاوہ کچھ بھی ملحوظ نہیں ہوتا، اور پھر اس کے نتیجہ میں دینی معمولات کو حیرت و تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بلکہ ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس سماجی معاشرتی رسم و رواج اور معمولات کو احترام اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، یہ سب کچھ درحقیقت طرزِ تفکر اور فہم و ادراک کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے کہ دینی طرزِ تفکر کچھ اور ہے اور مادی اندازِ فہم و ادراک کچھ اور!

حقیقت یہ ہے کہ سماجی معاشرتی اصولوں میں تعقل نام کی چیز پائی ہی نہیں جاتی...... جیسا کہ سابقہ بیانات سے واضح ہو چکا ہے...... اور اگر عقلیات میں سے کچھ پایا بھی جاتا ہے تو وہ صرف اسی حد و مقدار تک کہ نفسانی و مادی خواہشوں سے لطف اندوز ہو سکیں اور مخصوص لذائذ سے بہرہ ور ہو سکیں، یہی واحد وہ شے ہے جس کا مقابلہ کسی دوسری چیز سے نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی چیز اس کی راہ میں حائل و مانع ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ اس جیسی دوسری چیز مل جائے، یعنی کوئی دوسری لذت حاصل

ہو، یہاں تک کہ موجودہ مادی معاشروں کے ہاں رائج و نافذ قوانین کی رو سے ہر وہ کام جسے انسان پسند کرے اسے قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ آزادی کا قانون ہر کام پر حاوی ہے لہٰذا خودکشی جیسے اعمال کو بھی قانونی تحفظ حاصل ہو گا، البتہ اس میں صرف ایک استثنائی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ کسی کی انفرادی خواہش، معاشرتی خواہش سے متصادم ہو، تو اس صورت میں معاشرتی خواہش ملحوظ ہو گی اور انفرادی خواہش کو قانونی حیثیت یا تحفظ حاصل نہ ہو گا۔

مذکورہ بالا مطالب پر غور کریں اور دونوں معاشروں یعنی دینی معاشرہ اور مادی معاشرہ کے معیار و طرزِ تفکر کے مختلف ہونے کے بارے میں سوچیں تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ مغربی معاشرہ کے قوانین بنی نوع بشر کے ذوق طبع سے ہم رنگ و ہم آہنگ کیوں ہیں اور دینی معاشرتی قوانین کے مقابلے میں ان کی محبوبیت و پسندیدگی کا راز کیا ہے؟ البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ استثنائی صورت مغربی معاشرتی قوانین کو حاصل نہیں بلکہ دنیا بھر میں قدیم و جدید تمام غیر دینی اور خالص مادی معاشروں کے قوانین کا یہی حال ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ تاریخ میں ان دیہاتی معاشروں کا جو حال بیان کیا گیا ہے، جو تمدن کی دنیا سے بہت پہلے تھے اس میں بھی صورتحال اسی طرح کی ہے کہ عامتہ الناس دینی اصولوں پر کہ جن میں سراسر حق کی طرف دعوت پائی جاتی ہے اپنی مخصوص مادی لذتوں کو ترجیح دیتے تھے اور بت پرستی کی ایسی لت انہیں لگی ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ مادی لذتوں کے علاوہ کچھ سننے اور کرنے کو تیار نہ تھے۔

اگر آپ موجودہ ترقی یافتہ تمدن کے بارے میں بخوبی غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی اصل بنیاد بت پرستی کے حامل تمدن کی وہ قدیم روش ہے جو انفرادیت سے اجتماعیت میں تبدیل ہو چکی ہے، گویا قدیم الایام میں اسے شخصی و فردی حیثیت حاصل تھی جبکہ موجودہ دور میں اسے معاشرتی و اجتماعی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، یا یوں کہیں کہ سادگی کے مرحلہ سے تکنیکی و فنی پیچ و خم کے حامل مرحلہ تک پہنچ گئی ہے،

اسلامی معاشرتی اصولوں کے حوالہ سے، ہم نے جو بیان کیا ہے کہ ان کی اصل و اساس حق کی پیروی ہے نہ کہ ذوقِ طبع و خواہشاتِ نفس سے، ہم رنگی و ہم آہنگی، تو اس سلسلہ میں واضح قرآنی بیانات موجود ہیں مثلاً:

سورۂ توبہ، آیت: ۳۳

○ ''هُوَ الَّذِىٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ''

(وہ اللہ کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا)

سورۂ مومن، آیت: ۲۰

○ ''وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ''

(اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے)

اہل ایمان کی توصیف میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ عصر، آیت: ۳

○ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ"

(اور وہ ایک دوسرے کو حق کی وصیت وتاکید کرتے ہیں)

سورۂ زخرف، آیت: ۷۸

○ "لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ"

(بے شک ہم تمہیں حق کے ساتھ لائے ہیں لیکن تمہاری اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے)

اس آیت میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ حق، اکثر لوگوں کی طبیعتوں اور مزاجوں وخواہشوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اس کے بعد دوسرے مقام پر اکثریت کی پیروی کی رد میں اور یہ کہ وہ موجب فساد ہے یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مومنون، آیت: ۷۱

○ "بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۗ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ"

(بلکہ ان کے پاس حق آ گیا اور ان کی اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے، اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان اور زمین تباہ وبرباد ہو جائیں گے اور جو ان میں رہتا ہے وہ بھی تباہ ہو جائے گا، بلکہ ہم نے ان کو ان کا سرمایہ ہدایت دے دیا ہے مگر وہ اپنے سرمایہ ہدایت سے روگردانی کرتے ہیں)

اس آیت میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا اس کی تصدیق وتائید روز بروز وقوع پذیر ہونے والے حالات وواقعات نے کر دی ہے اور حوادث وفسادات کی ہلاکت خیز طوفانی موجوں نے قرآنی بیانات کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

سورۂ یونس، آیت: ۳۲

○ "فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ"

(تو حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کیا ہے؟ تم کہاں بھٹکے جا رہے ہو؟)

بہر حال اس مضمون کی حامل آیات کثرت کے ساتھ موجود ہیں، اگر اس حوالہ سے مزید جاننا چاہیں تو سورۂ یونس کا مطالعہ کریں کہ اس میں بیس سے زائد مرتبہ حق کا تذکرہ ہوا ہے۔

ایک سوال اور اس کا تفصیلی جواب

یہاں اکثریت کے حوالہ سے ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اکثریت کو اس قدر موردِ تنقید کیوں بنایا گیا ہے جبکہ اکثریت کا اتباع ایک معاشرتی حقیقت ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا اور عالمِ طبیعت میں اس کی اہمیت کسی بھی شک وگمان سے بالاتر ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اکثریت کی معاشرتی حیثیت کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور عالم طبیعت میں اتباعِ اکثر کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسے اتباع حق کے بطلان کا موجب مانا جائے یا کہ اسے اتباع حق کے لازمی وضروری ہونے سے متصادم قرار دیا جائے کیونکہ طبیعت خود ہی ''حق'' کے مصادیق میں سے ایک ہے، تو وہ کس طرح خود اپنے ہی بطلان کا سبب بن سکتی ہے۔

مزید وضاحت: اس کی وضاحت کے لئے چند امور کا بیان ضروری ہے۔

(۱) انسان کے علمی وعملی عقائد کے بنیادی اصول وہ امور خارجیہ اور وجودی حقائق ہیں جو اپنی وجودی حیثیت اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی اقسام میں نظام علت ومعلول کے محتاج ہیں اور وہ ایسا مضبوط نظام ہے جسے دوام وثبات حاصل ہے اور اس میں کسی استثنائی صورت کی بھی گنجائش نہیں، اس کی تصدیق میں اہل علم ونظر نے اجتماعی طور پر ایک ہی رائے کا اظہار کیا ہے اور قرآن مجید نے بھی اسی کی صحت پر گواہی دی ہے (اعجازِ قرآن کی بحث میں اس حوالہ سے تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے، ملاحظہ ہو جلد اول بحث اعجاز قرآن) لہٰذا عالم الخارج میں پایا جانے والا سلسلہ دوام وثبات کی صفتوں سے جدا نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ وہ حوادث جو اکثر وقوع پذیر ہوتے ہیں اگر چہ وہ اپنے حوالہ ونسبت سے قیاسی ہیں یعنی اصول وضوابط پر مبنی ہیں لیکن ان کا ''اکثر'' ہونا دائمی وہمیشگی ہے مثلاً آگ، وہ تمام موارد میں حرارت دیتی ہے اور اس کے گرمی وحرارت دینے کو ''اکثر'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ عموماً حرارت دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اس کا یہ اثر دائمی وہمیشگی ہے، یہی بات ہر اس چیز کے بارے میں کی جا سکتی ہے جو اسی طرح کا اثر رکھتی ہو، اس کے ''حق'' کہتے ہیں۔

(۲) انسان فطرتاً ہر اس چیز کا اتباع کرتا ہے جسے کسی بھی حوالہ سے ایک حقیقی اور عالم الخارج میں وجود کا حامل پائے، اس طرح وہ اتباع حق کرتا ہے اور یہ اتباع حق اس کی فطرت میں داخل ہے، یہاں تک کہ جو شخص یقینی و پختہ علم کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتا وہ بھی جب کسی ایسے شخص کی بات سنتا ہے جس کے بیان کے بارے میں اپنے تئیں کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار

نہیں ہوتا تو اسے فوراً قبول کر لیتا ہے، تو گویا عملی طور پر وہ بھی قطعی علم کو تسلیم کرتا ہے۔

(۳) ''حق'' جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں وہ عالم الخارج میں پائی جانے والی ایسی وجودی حقیقت ہے جس کے سامنے انسان اپنے اعتقادات واعمال میں سر تسلیم خم کر دیتا ہے، اور جہاں تک انسان کی فکر ونظر اور فہم وادراک کا تعلق ہے تو وہ ایک وسیلہ وذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے حق تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے، گویا وہ ایک آئینہ کی مانند ہے جو اشیاء کو دکھاتا ہے، یعنی جو نسبت آئینہ اور آئینہ کے ذریعے دیکھی جانے والی چیز کے درمیان پائی جاتی ہے وہی نسبت فکر ونظر اور حق کے درمیان پائی جاتی ہے۔

جب آپ ان امور سے آگاہ ہو چکے تو آپ پر واضح ہو گیا کہ ''حق ہونا'' جو کہ ہمیشہ وقوع پذیر ہونے یا بیشتر واکثر وقوع پذیر ہونے کا نام ہے اور کسی چیز میں اس صفت کا پایا جانا اس کے دوام وثبات کا پتہ دیتا ہے تو وہ عالم الخارج میں پائے جانے والے امور کی دائمی الوقوع یا اکثر الوقوع ہونے کی صفت ہے، اس میں اس کے بارے میں علم وادراک کا ہونا ہرگز دخیل نہیں یعنی ایسا نہیں کہ اگر اسے جانتے یا پہچانتے ہوں تب وہ حق ہے ورنہ نہیں، ایسا ہرگز نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ایک معلوم امر کی صفت ہے نہ کہ علم کی صفت! یعنی کسی چیز کا حق ہونا اس چیز کی صفت ہے جس سے ہم آگاہ ہوں نہ کہ اس ہمارے علم کی صفت! بنا برایں دائمی الوقوع ہونا اور اکثر الوقوع ہونا بھی ایک حوالہ سے حق کہلاتا ہے لیکن اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ اقلیت کے مقابلے میں اکثریت کی آراء وافکار اور ان کے اعتقادات کو دائمی الوقوع حق قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ جس پر اکثر افراد کا اتفاق ہو وہ حق ہے یا جو عقیدہ اکثریت کا ہے وہ حق ہے، ایسا ہرگز درست نہیں، بلکہ حق کے حق ہونے کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ چیز حقیقت کے عین مطابق ہو ورنہ اسے ''حق'' قرار نہیں دیا جائے گا۔ لہٰذا جو چیز حقیقت سے مطابقت کی حامل ہو اسے حق سے موسوم کرنا درست ہوگا خواہ اکثریت اس کے خلاف وبرعکس کیوں نہ ہو، اس معیار کی روشنی میں جو چیز حقیقت سے مطابقت نہ رکھتی ہو نہ تو وہ ''حق'' قرار پائے گی اور نہ ہی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا صحیح ہوگا، اور اگر ''حق سمجھ کر اس کا اتباع کیا گیا ہو اور پھر اس کا حق نہ ہونا معلوم وثابت ہو جائے تو اس سے دور ہو جانا ضروری ہوگا، مثلاً اگر کوئی شخص کسی عقیدہ ونظریہ کو حق سمجھ کر اس کا اتباع کرتا رہا ہو اور پھر اسے معلوم ہو جائے کہ وہ حق نہیں تو فوراً اس سے اجتناب کرے اور جو حق ہو اس کا اتباع کرے، اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ اگر آپ کو کسی چیز کے بارے میں یقین حاصل ہو جائے (وہ چیز آپ کے نزدیک یقینی ہو جائے) پھر تمام لوگ اس کی بابت آپ سے اختلاف کریں تو آپ طبعاً ان کے ساتھ ہاں نہیں ملاتے اگرچہ ظاہری طور پر ان کا ساتھ دیتے ہیں کہ جو ان سے ڈر، شرم یا کسی دوسری وجہ سے ہوتا ہے نہ یہ کہ ان کا ساتھ دینا حق اور فی نفسہ واجب الاتباع ہے۔

اکثریت کی رائے ونظریہ کے واجب الاتباع حق نہ ہونے کے حوالہ سے بہترین بیان وہ ہے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ مومنون، آیت: ۷۰

○ ''بَلۡ جَآءَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَ اَکۡثَرُهُمۡ لِلۡحَقِّ کٰرِهُوۡنَ''

(بلکہ ان کے پاس حق آ گیا جبکہ ان کی اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے)

اگر اکثریت کی رائے ''حق'' ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اکثریت اسے ناپسند کرتی اور اس کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے۔

مذکورہ بالا بیان سے اس نظریہ کا بطلان بھی ثابت ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ معاشرتی نظام میں اکثریت کا اتباع طبعی بنیادوں پر ہے اور طبع معاشرت اس بات کی متقاضی ہے کہ اکثریت کا اتباع کیا جائے اور اکثریت جس چیز کو درست قرار دے اسے معاشرتی تائید حاصل ہوتی ہے، یہ نظریہ اس لئے درست نہیں کہ جن طبعی بنیادوں واصولوں اور روش کو اتباع اکثریت کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے ان کا تعلق عالم الخارج میں وجود پذیر ہونے والے امور سے ہے کہ جن سے علم وآگاہی تعلق پکڑتی ہے جبکہ نظریہ ورائے کا تعلق عالم الخارج سے نہیں بلکہ عالم ذہن سے ہوتا ہے اور جہاں تک انسان کا اس سنت وروش سے اپنے ارادہ واعمال میں استفادہ کرنے کا تعلق ہے اور اسے اپنے اعمال وافعال میں بنیادی حیثیت دینے کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے صرف انہی امور کو اساس وبنیاد بنایا جاتا ہے جو عالم الخارج میں اکثر وقوع پذیر ہوتے ہوں نہ کہ وہ امور کہ جن کے بارے میں اکثریت عقیدہ رکھتی ہو، یعنی وہ اس لئے انہیں بنیادی حیثیت نہیں دیتا کہ افرادی اکثریت اسے حق اور صحیح سمجھتی ہے بلکہ اس لئے انہیں بنیادی حیثیت دیتا ہے کہ وہ عالم الخارج میں اکثر وجود پذیر ہوتے ہیں، گویا وہ اپنے اعمال وافعال کی انجام دہی میں اس طرح کوشاں ہوتا ہے کہ وہ بیشتر بہتر وصحیح اور درست قرار پائیں نہ یہ کہ اکثر لوگ انہیں بہتر وصحیح سمجھیں، اس مطلب کی تائید قرآنی بیانات میں بھی ملتی ہے کہ قرآنی احکام میں اکثر الوقوع امور کو بنیادی حیثیت واہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے، مثلاً:

سورۂ مائدہ، آیت: ۶

○ ''مَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیَجۡعَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّ لٰکِنۡ یُّرِیۡدُ لِیُطَهِّرَکُمۡ وَ لِیُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَیۡکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ''

(خدا یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی طرح کی دشواری ڈال دے بلکہ وہ چاہتا ہے تم پاک وپاکیزہ رہو اور اس کے نتیجہ میں تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کرے)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۳

○ ''کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ''

(تم پر روزے واجب کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والے لوگوں پر واجب کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ)

یہ اور ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات موجود ہیں جن میں خدائی دستورات اکثر وقوع پذیر ہونے اور وجود میں آنے کو بنیادی حیثیت قرار دیئے جانے کا حوالہ مذکور ہے۔

ایک اظہاریہ اور اس کا جواب

اکثریت کی آراء کی اعتباری حیثیت کے حوالہ سے ایک اظہاریہ یوں ہے کہ عصر حاضر کا مروجہ تمدن ہی ہے جس نے ممالک و معاشروں کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہوئے انہیں سعادت سے ہمکنار کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ افراد کے تذکیۂ نفس کا بھی اہتمام کیا اور انہیں ان رزائل سے پاک کر دیا ہے، جنہیں معاشرہ ناپسندیدہ سمجھتا ہے،

یہ اظہاریہ غلط و نادرست اور خلطِ مبحث کا حامل ہے، اس میں جس ''سعادت'' کو بیان کیا گیا ہے وہ حقیقی معنی میں سعادت نہیں، کیونکہ انہوں نے معاشرتی سعادت سے مادی وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے دوسرے معاشروں پر تفوق و برتری پانا اور اپنے معاشرہ کو مادی حوالہ سے طاقتور اور بلند پایہ قرار دینا مراد لیا ہے، اور قارئین کرام اس حقیقت سے متعدد بار آگاہ ہو چکے ہیں کہ اسلام اس طرح کی ترقی و پیش رفت کو ''سعادت'' قرار نہیں دیتا اور عقلی دلائل سے بھی اس اسلامی نقطہ نگاہ کی تصدیق و تائید ہوئی ہے کیونکہ حقیقی معنی میں انسانی سعادت روح و بدن دونوں کی سعادت کے مجموعہ مرکب کا نام ہے کہ جس میں انسانی مادی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ روحانی نعمتوں ولذتوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہوئے اخلاقی فضیلتوں اور خدائی معارف وحقائق کے زیوروں سے آراستہ ہونے کی عزت پائی جاتی ہے، اور اسی میں دنیاوی زندگی اور اخروی حیات دونوں کی سعادت کی ضمانت پائی جاتی ہے اور جہاں تک روحانی سعادت کو پس پشت ڈال کر صرف مادی لذتوں میں اپنے آپ کو آلودہ کرنے کا تعلق ہے تو اسلام اسے نہ صرف یہ کہ سعادت نہیں سمجھتا بلکہ شقاوت و بدبختی سے موسوم کرتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ عصر جدید کے مروجہ مغربی تمدن کے رسیا دانشوروں کا اپنے معاشروں میں صدق و صفا، امانتداری وخوش اخلاقی اور دیگر اعلیٰ صفات پر اظہارِ فخر ومباہات کرنا تو اس حوالہ سے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں اور ان کے اس طرح غلط فہمی کا شکار ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے اکثر مشرقی اہل بحث ونظر اور دانشوروں کا حال یہ ہے کہ وہ اجتماعی ومعاشرتی طرزِ تفکر سے آگاہ ہی نہیں اور نہ ہی اس کی توان رکھتے ہیں، ان کے فکری زاویہ کی حدود ان کی ذات سے باہر نہیں، وہ جو کچھ سوچتے ہیں خود اپنے بارے میں سوچتے ہیں اور اس فردی وشخصی طرزِ تفکر کے نتیجہ میں وہ اپنے آپ کو ایک مستقل انسان سمجھتے ہیں کہ جس کا دیگر موجودات سے کوئی تعلق و وابستگی نہیں اور اپنے تئیں یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ ہر اس ربط وتعلق اور دوسروں سے وابستگی سے مبرا ہیں جو ان کے فردی تشخص اور شخصی استقلال کو ٹھیس پہنچائے (جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے) اسی غلط طرزِ تفکر کی بناء پر وہ اپنی زندگی میں صرف اپنے ہی مفاد کی فکر کرتے رہتے ہیں اور صرف اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کے بارے میں سوچتے ہیں، گویا اپنے سوا کسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے، اسے ہی شخصی سوچ کہتے ہیں، اسی کے

نتیجہ میں وہ دوسروں سے موازنہ کے عمل میں غلطی سے دوچار ہو جاتے ہیں اور مغربی معاشروں کے باسیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمتر سمجھتے ہوئے انہیں ترقی یافتہ وسعادت مند قرار دے دیتے ہیں جو کہ سراسر نادرست ہے لیکن شخصی سوچ کے اسیر افراد سے اس کے علاوہ کوئی توقع بھی نہیں ہو سکتی اور ان کا ایسا سوچنا انہی کے طرزِ تفکر کے دائرہ سے مختص ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس جو شخص اجتماعی و معاشرتی سوچ رکھتا ہو اور اس کے طرز تفکر کا دائرہ وسیع ہو اس کی نظروں میں اپنی ذات ہی نہیں بلکہ پورا معاشرہ ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا لازمی حصہ اور جزو لاینفک سمجھتا ہے، اپنے فوائد و مفادات کو معاشرہ کے فوائد و مفادات کا حصہ قرار دیتا ہے اور معاشرہ کی خیر و سعادت کو اپنی خیر و سعادت اور معاشرہ کے نقصان و تکلیف کو اپنا نقصان و تکلیف سمجھتا ہے، یعنی اپنے آپ کو معاشرہ سے جدا نہیں سمجھتا اور معاشرہ کی ہر صورت حال کو اپنی شخصی صورت حال قرار دیتا ہے، اس اجتماعی و معاشرتی طرز تفکر کا حامل انسان، شخصی سوچ کے حامل انسان سے مختلف ہوتا ہے، وہ دوسروں سے تعلق کے حوالہ سے ایک وسیع سوچ کے ساتھ دوسرے معاشروں کے افراد ہی کے بارے میں اپنی فکری و عملی توانائیاں بروئے کار لاتا ہے، اور اس حوالہ سے اپنے معاشرہ کے افراد کو درخور اعتناء قرار نہیں دیتا اور نہ ہی ان کے لئے عملی تجاویز کے بارے میں کسی فیصلہ پر غور کرتا ہے۔

مذکورہ بالا مطلب کی وضاحت ایک مثال کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ انسان وجودی طور پر مختلف و متعدد اعضاء و جوارح اور قوتوں سے لیس ہے اور گوناگوں صلاحیتوں کا مجموعہ مرکب ہے کہ ان قوتوں کا یکجا ہونا ایک ایسی وحدت کو وجود میں لاتا ہے جسے ہم ''انسانیت'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ حقیقی وحدت ان تمام قوتوں کو ایک مجموعی استقلال کے قالب میں ڈھال کر اس طرح فعال بنا دیتی ہے کہ ان میں سے کسی ایک قوت کو اپنی انفرادی کارگزاری سے عملی طور پر دستبردار ہو کر اجتماعی کارگزاری کی راہ پر آنا پڑتا ہے اور پھر ان ہی سے ہر ایک اپنی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو اختیار کرتی ہے مثلاً آنکھ، کان، ہاتھ اور پیر اپنی عملی کارگزاری میں اجتماعی حوالہ سے سامنے آتے ہیں، آنکھ دیکھتی ہیں، کان سنتے ہیں، ہاتھ کام کرتے ہیں، پاؤں حرکت کرتے ہیں لیکن یہ سب کچھ ''انسانیت'' اور ''انسان'' کے عنوان اور قالب میں انجام پذیر ہوتا ہے اور یہ تمام قوتیں انسانیت کی بنیاد پر عملداری سے لطف اندوز ہوتی ہیں، ان میں سے ہر ایک قوت کا وجودی علمداری میں یہی ہدف مقصود ہوتا ہے کہ ان کی پہچان ''انسان'' کے حوالہ سے ہو اور ان کی کارگزاری کو ''انسان'' کی کارگزاری کہا جائے مثلاً اگر ہاتھ کسی پر احسان کرتا ہے اور اسے صدقہ دیتا ہے تو اس کی بنیاد انسان کی چاہت ہوتی ہے کہ احسان ہو اور صدقہ دیا جائے اسی طرح اگر کسی کو اذیت و آزار دینا ہو تو ہاتھوں کے ذریعے ہی اس ہدف کو حاصل کیا جاتا ہے لیکن ان قوتوں کی باہمی عملداری اور ایک دوسرے کے ساتھ عملی ارتباط میں بہت کم ایسے مواقع سامنے آتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے تصادم میں ہوں اور ایک دوسرے کو اذیت و ضرر پہنچائیں۔

تو یہ صورتحال انسانی وجودی قوتوں واجزاء کی ہے کہ سب کے سب ایک ہی اجتماعی حیثیت کے حامل ہیں اور اجتماعی وحدت کے ساتھ اپنی عملداری کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں، یہی حال معاشرہ کے افراد کا ہے کہ اگر وہ سب اجتماعی سوچ کے ساتھ کام کریں اور اجتماعی طور پر غور وفکر کریں تو ان کی صلاح وبھتری اور تقویٰ یا دوسری جانب فساد وگناہ، اور اسی طرح نیکی واحسان کرنا یا برائی وغلطی کرنا سب کے سب ان کے معاشرہ سے منسوب ہوں گے اور پھر اس اجتماعی طرزِ تفکر اور طرزِ عمل کے نتیجہ میں پورا معاشرہ ایک ہی وحدت کا حامل ہوگا اور ایک ہی اکائی میں پرویا جائے گا۔

قرآن مجید نے بھی مذہبی واعتقادی یا قومی وملی تعصبات کا شکار قوموں اور ملتوں کے بارے میں جو روش اختیار کی ہے وہ بھی اسی اجتماعی حوالہ کی بنیاد پر ہے مثلاً یہودیوں، عربوں اور متعدد سابقہ امتوں کے بارے میں قرآنی انداز کچھ اس طرح پر ہے کہ وہ ان کے موجودہ افراد کا ان کے پہلے افراد کے جرائم کی بنیاد پر مواخذہ کرتا ہے اور انہیں موردِ عتاب وسرزنش قرار دیتا ہے کہ ان کے سابقہ افراد نے اس طرح کے افعال قبیحہ کا ارتکاب کیا جبکہ ان جرائم کے مرتکب افراد کا تعلق قدیم زمانہ سے ہے اور ان سے تعلق رکھنے والے موجودہ افراد ان اعمال وافعال سے قطعی طور پر لاتعلق ہیں تو اصل میں اس طرح کا طرزِ تفکر ان کی اجتماعیت ومعاشرتی حیثیت کے حوالہ سے ہے اور یہ اجتماعیت کے تناظر میں بالکل صحیح ودرست مؤقف ہے کیونکہ جو شخص بھی اجتماعی فکر ونظر رکھتا ہو وہ اسی مؤقف کو اختیار کرتا ہے اور قرآن مجید میں اس حوالہ سے کثرت کے ساتھ آیات مبارکہ پائی جاتی ہیں کہ ان سب کا ذکر یہاں ضروری نہیں، ہاں البتہ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ جو اقوام ان جرائم کی مرتکب ہوئیں اور اس حوالہ سے موردِ سرزنش قرار پائیں ان میں سے ان افراد کو مستثنیٰ کیا جائے جو نیک وصالح تھے تاکہ ان کا حق پامال نہ ہونے پائے کیونکہ وہ لوگ اگرچہ انہی فاسد افراد کے ساتھ معاشرے میں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے لیکن ان کے دل غلط سوچ میں آلودہ نہیں ہوئے اور نہ ہی وہ اس مہلک بیماری میں مبتلا تھے جس کے سبب ان کا معاشرہ تباہ ہوا وراس معاشرہ کے افراد پر عتاب وعقاب نازل ہوا، اس کے باوجود قرآن مجید میں جب اس معاشرے کا تذکرہ ہوا تو اس کے صالح ونیک افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ معاشروں کے بارے میں مؤقف اختیار کرنے میں افراد کی انفرادی حیثیتوں کو معیار قرار نہیں دینا چاہئے اور نہ ہی کسی معاشرہ کے افراد کا دوسرے معاشرہ کے افراد سے انفرادیت کی بنیاد پر موازنہ کرنا چاہیے یعنی افراد کا کسی معاشرہ میں زندگی بسر کرنا اور اندرونی اجتماعی طرزِ عمل میں مخصوص صفات کو اپنانا اس بات کا سبب نہیں بن سکتا کہ کلی طور پر اس معاشرہ کو دیگر معاشروں پر مقدم وافضل قرار دیا جائے مثلاً اگر کسی مغربی معاشرہ میں اس کے افراد کا باہمی طرزِ عمل ایسا ہو کہ اس کی تعریف کی جائے بلکہ وہ لائق تعریف ہو کیونکہ اس کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولتے ہوں اور نہ ہی ایک دوسرے کو اذیت وآزار پہنچاتے ہوں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھے انسانی تعلقات

رکھتے ہوں اور اچھی انسانی اعلیٰ صفات کے حامل ہوں تو اس سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ وہ معاشرہ اس معاشرہ سے کلی طور پر اور تمام حوالوں سے افضل و بہتر قرار پائے کہ جس میں اس طرح کی صورتحال نہ پائی جاتی ہو یا اس کے برعکس صورت حال ہو، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ معاشرہ دوسرے معاشرے کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتا ہے اور معاشرتی و اجتماعی حوالہ سے اس کا برتاؤ دوسرے معاشروں سے کس طرح کا ہے؟ گویا افراد کی انفرادیت یا اجتماعیت کے باہمی ربط و تعلق کی بجائے معاشرہ کی دوسرے معاشرہ سے تعلق داری کو معیار قرار دیا جانا چاہیے، اسی معیار پر کسی معاشرہ کے صالح یا فاسد ہونے کا تعین ہونا چاہیے اور اس کے سعادت مند یا شقی ہونے کے بارے میں رائے قائم کی جائے، ہمارے دانشوروں کو بھی اسی معیار پر اپنے اظہارات کرنے چاہئیں لیکن افسوس کہ بعض حضرات اس معیار کو پس پشت ڈال کر مؤقف اختیار کرتے ہیں، انہیں چاہیے کہ اس معیار کے مطابق اپنے نظریات قائم کریں۔

میں اپنی زندگی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہمارے دانشور حضرات مغرب والوں کی اجتماعی و معاشرتی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے اور جدید یورپی تہذیب و تمدن کو نہایت عمیق نگاہ سے دیکھتے اور اس بات کا بخوبی جائزہ لیتے کہ انہوں نے دیگر غریب و نادار اور کمزور اقوام کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا ہے تو انہیں اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ یہ معاشرے کہ جو افرادِ بشر کے ساتھ محبت و خیر خواہی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں اور اموال کے ذریعے نوعِ انسانی کی خدمت اور انہیں حریت و آزادی دلانے کے لئے کسی بھی قربانی و ایثار سے دریغ نہیں کرتے اور وہ مظلوم کی دادرسی و دستگیری کر کے انہیں ان کے پامال شدہ حقوق دلانا چاہتے ہیں اور انہیں غلامی کی قید سے آزاد کرنا چاہتے ہیں، تو واضح ہو جاتا کہ ان کے یہ دعوے بے بنیاد اور سراسر غلط ہیں اور وہ اس طرح دیگر اقوام کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں، ان کا مطمع نظر اس کے سوا کچھ نہیں کہ کمزور و محروم قوموں کو جس طرح بھی ممکن ہو اپنے دست نگر بنائیں اور ان پر تسلط جمائیں چنانچہ کبھی فوجی طاقت و آمریت کے ذریعے کبھی استعماری ہتھکنڈے استعمال کر کے، کبھی ان کی سرزمین پر غاصبانہ قبضہ کر کے، کبھی ان کے حقوق کے ذمہ دار کہلا کر، کبھی مشترکہ مفادات کے تحفظ کے نام پر، کبھی ان کے استقلال کی پاسداری کے عنوان پر، کبھی صلح و امن کے قیام کے حوالہ سے، کبھی انہیں اغیار کے تسلط سے نجات عطا کرنے کے نام پر، کبھی ان کے حقوق اور ستمدیدہ افراد کی عظمت رفتہ کی بحالی کے نام پر، اور کبھی کسی دوسرے عنوان سے اپنے مخصوص اہداف تک رسائی کو ممکن بنانے کے درپے ہوتے ہیں۔ تو اس طرح کی سوچ اور طرزِ عمل کے حامل معاشروں کو کس طرح صالح معاشرے کہا جا سکتا ہے جبکہ ان کے اعمال کو انسانی فطرتِ سلیمہ ہرگز پسند نہیں کرتی، اور کوئی صالح و سالم انسان ایسے معاشروں کو صالح معاشرے نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی ان کے بارے میں سعادت مندی کا تصور کر سکتا ہے خواہ وہ دین و مذہب اور وحی و نبوت پر عقیدہ نہ بھی رکھتے ہوں اور جس چیز کو ادیان الٰہی سعادت سے تعبیر کرتے ہوں وہ اس پر یقین ہی نہ رکھتے ہوں، لیکن انسانی اصول و اقدار کی بنیاد پر سوچیں تو ہرگز

ایسے معاشروں کو صالح معاشرے نہیں کہا جاسکتا، اور طبع انسانی کس طرح اس بات پر راضی ہوسکتی ہے کہ تمام افرادِ بشر انسانی حیثیت میں برابری کے حامل ہونے کے باوجود اپنی انسانی قدروں میں اس طرح اختلافات پیدا کریں کہ ان میں سے بعض افراد دوسرے افراد کی جان و مال کے مالک بن جائیں اور ان کی عزت و ناموس اور اموال پر ڈاکہ ڈالیں اور ان کے وجود و حیات کے تمام امور کو تہہ و بالا کر دیں یہاں تک کہ انہیں اس طرح کے سنگین حالت سے دو چار کر دیں کہ جس کی مثال سابقہ اقوام میں بھی نہ ملتی ہو اور نہ ہی گزرے ہوئے ادوار کا انسان اس طرح کی سختیوں میں گھرا ہو، ایسے معاشروں کو کس طرح صالح معاشرے کہا جاسکتا ہے، ہمارے ان بیانات پر ہمارے پاس ان کی تاریخ حیات ہی سب سے بہترین سند ہے کہ جس میں ان کے طرزِ عمل اور دوسرے معاشروں اور اقوام کے ساتھ ان کے برتاؤں بلکہ وحشیانہ سلوک کی کہانیاں درج ہیں کہ موجودہ نسل اب تک ان کے غیر انسانی اعمال کی زد میں ہے اس کے باوجود اگر ان معاشروں کو صالح و سعادت مند معاشرے کہا جائے تو یہ ڈھٹائی اور ڈھکوسلہ سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

(۶) اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تسلسل کی بنیادیں؟

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ کسی بھی معاشرہ کی تشکیل اس یکتا غرض اور ہدف کی بنیاد پر ہوتی ہے جو اس معاشرہ کے گوناگوں افراد کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس واحد غرض و ہدف کی حیثیت درحقیقت اس روح جیسی ہے جو معاشرہ کے تمام پہلوؤں میں اس طرح موجود ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے اس معاشرہ میں ایک خاص نوعیت کی وحدت و اتحاد وجود میں آجاتا ہے۔ البتہ اس طرح کا مشترک ہدف و مقصد عام طور پر ان غیر دینی بنیادوں پر تشکیل پانے والے معاشروں میں ملحوظ ہوتا ہے جن کا کعبۂ نگاہ صرف اور صرف انسان کی دنیاوی زندگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور وہ ہدف و مقصد مشترک اور اجتماعی صورت میں ہوتا ہے انفرادی صورت میں نہیں ہوتا اور وہ ہدف اجتماعی طور پر مادی زندگی کی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کا دوسرا نام ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادی زندگی کی لذتوں سے اجتماعی اور انفرادی دونوں صورتوں میں بہرہ ور اور لطف اندوز ہونے میں کیا فرق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں میں خاصیت کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ اگر انسان تنہا زندگی بسر کرسکتا تو اپنی لذت اندوزیوں میں مطلق العنان ہوتا کیونکہ اس صورت میں کوئی اس کا مدمقابل اور رقیب ہی نہ ہوتا سوائے اس کی بعض ان جسمانی قوتوں کے کہ جو اس کی دیگر جسمانی قوتوں کی عملداری میں رکاوٹ بنتی ہیں مثلاً اس کا نظامِ

تنفس، تو اس کا پھیپھڑا ہر ہوا کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ خاص طرح کی ہوا چاہتا ہے، یہی حال معدہ کا ہے کہ انسان حد سے زیادہ غذا نہیں کھا سکتا کیونکہ اس کا نظام ہاضمہ اسے برداشت نہیں کرتا، اسی طرح دیگر جسمانی قوتیں اپنی عملداری میں مخصوص کیفیات رکھتی ہیں اور ان کا دائرہ محدود ہوتا ہے، تو یہ صورت حال اس کے اپنے جسمانی نظام میں پائی جانے والی قوتوں کی ہے، جب اس کے وجود کی قوتوں کا یہ حال ہے تو پھر اس کا دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق اگر اس کی انفرادی حیثیت میں دیکھیں کہ کوئی دوسرا شخص اس کی مادی زندگی میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو تو اس کی راہ میں کوئی مانع و حائل بھی قابل تصور نہ ہوگا اور نہ ہی اس کے کسی فعل و عمل میں محدودیت پیدا ہوگی، لیکن اس کے برعکس اگر اس کی اجتماعی حیثیت کے حوالہ سے دیکھیں تو اس کی زندگی کا دائرۂ عمل اس قدر وسعت کا حامل نہیں ہوتا جیسا کہ انفرادی حیثیت میں ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے ارادہ و عمل میں مطلق العنان نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی آزادی دوسروں کی آزادی سے متصادم ہو جائے گی جس سے پورا معاشرہ تباہی سے دوچار ہو جائے گا۔ ہر فرد مطلق العنان بن کر اپنی لامحدود آزادی کا استعمال کرے تو اس کا نتیجہ پورے معاشرہ کی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس موضوع کی بابت ہم نبوت کی بحثوں یا دیگر اظہارات و بیانات میں وضاحت کے ساتھ مربوطہ مطالب ذکر کر چکے ہیں، اور یہ وہ اصل وجہ ہے جو معاشرے میں نظام حکومت کے ضروری ہونے کو یقینی بناتی ہے کہ اگر ہر شخص اپنی مطلق العنان حیثیت کے ساتھ ارادہ و عمل کرے تو معاشرہ تصادم کی ایسی خوفناک صورت حال کا شکار ہوگا کہ اس کی سلامتی کی ضمانت مشکل ہو جائے گی، البتہ غیر متمدن معاشروں میں ایسا نہ تھا کہ ان کے دانشور اور عقلمند افراد غور و فکر کر کے اپنی معاشرتی حیثیت کا لائحہ عمل طے کریں بلکہ ان کے افراد کے درمیان لڑائی جھگڑے اور تنازعات اس قدر زیادہ ہوئے کہ وہ بالآخر کسی ضابطہ پر اتفاق کرنے پر مجبور ہو گئے، تاہم ان کا اس طرح کے کسی ضابطہ پر متفق ہونا چونکہ کسی مضبوط و مستحکم بنیاد پر نہ تھا اس لئے اس میں نقض و ترمیم کا وسیع سلسلہ قائم ہو گیا، اور عملی صورت میں ایسا ہوتا تھا کہ لوگ کسی بات کو اپناتے اور پھر جب اس کی اثر گزاری کا دائرہ تنگ ہوتا دیکھتے تو کسی دوسرے طریقہ کو اپنا لیتے جس کے نتیجہ میں معاشرہ لحہ بہ لحہ تبدیلیوں کی زد میں رہتا تھا، لیکن اس کے برعکس متمدن معاشروں میں جو اصول و ضوابط متعین ہوتے تھے وہ ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوتے تھے البتہ یہ سب کچھ ہر معاشرہ میں پائے جانے والے تمدن کے درجات و مراتب پر موقوف ہوتا تھا یعنی معاشرہ میں جس قدر تمدن پایا جاتا تھا اس کے مطابق ایسے قوانین وضع کئے جاتے تھے جن کی عملداری سے لوگوں کے ارادہ و عمل میں ممکنہ تضاد کا راستہ روکا جا سکے اور ہر فرد کے لئے مخصوص شرائط مقرر کی جائیں جن پر عمل کر کے معاشرے کی سلامتی کو یقینی بنایا جا سکے اور پھر ان قوانین پر عملدرآمد کو یقینی بنانے اور بھرپور بنیادوں کے ساتھ ان کے نفاذ و اجراء سے مربوط امور کی انجام پذیری کے لئے ایک مرکز قائم کیا جاتا تھا تا کہ اس میں متعلقہ ضروری اقدامات اٹھائے جا سکیں، اور قانون کی صحیح سمت میں حکمرانی قائم ہو،

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ:

(۱) قانون ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جو لوگوں کے ارادوں اور اعمال کی یکسوئی کو یقینی بنا کر ان میں پیدا ہونے والے ممکنہ اختلاف و دوگانگی اور تزاحم و تصادم کو ختم کر سکے۔

(۲) معاشرے کے افراد کہ جن پر قانون کی حکمرانی ہوتی ہے وہ قانون کے دائرہ سے باہر، آزاد ہیں کیونکہ شعور و ارادہ کے حامل انسان کی طبع وجودی ہی اس بات کی متقاضی ہے کہ قانون کی عادلانہ پاسداری کے سایہ میں فطری آزادی سے بہرہ ور ہو اور اس طرح ارادہ و عمل کے درمیان پائے جانے والے قوانین میں دینی معارف و اخلاقی مسائل کو درخور توجہ قرار نہیں دیا جاتا اور ان دو نہایت اہم امور کو قانون کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں تدریجی طور پر اور قانون کی حاکمیت کے سایے میں عقائد و اخلاق پر بھی قانون ہی کا رنگ چھا جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ معنویات کی نورانیت چھٹ جاتی ہے اور وہ صرف ظاہری و خشک صورت میں باقی رہ جاتی ہے، اسی وجہ سے دین کے ساتھ سیاست بازی کے مظاہر ہر روز دیکھنے میں آتے ہیں کہ کبھی تو دینی اقدار و اصولوں کی پامالی مقصود قرار پاتی ہے اور کبھی اس کا سہارا لینے کے لئے اعلاءِ کلمہ حق کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے اور کبھی اسے نظر انداز کرتے ہوئے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(۳) معاشرہ میں قانون کی حکمرانی کے مذکورہ بالا طریقہ میں بھی خامی پائی جاتی ہے کیونکہ اس میں اگرچہ قانون کے اجراء و نفاذ کی ضمانت بظاہر اس مرکزی طاقت کے پاس ہوتی ہے جس پر کسی ایک فرد یا افراد کا قبضہ ہوتا ہے لیکن نتیجتاً اس کی عملداری و نفاذ کی حقیقی ضمانت نہیں پائی جاتی اور وہ اس طرح کہ اگر وہ مرکزی طاقت و سرچشمہ سلطنت و اقتدار حق سے روگرداں ہو جائے اور عوامی اقتدار کو شخصی حکومت میں بدل دے تو کوئی طاقت اسے اس کام سے باز نہیں رکھ سکتی، اور اسے عدل و انصاف کی حکمرانی کو یقینی بنانے کی راہ پر نہیں لا سکتی، اس تلخ حقیقت کے شواہد کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہم نے اپنے ہی زمانہ میں اس کی مثالیں دیکھی ہیں جبکہ یہ زمانہ ثقافت و ترقی اور تمدن کا زمانہ کہلاتا ہے، اور اس کی مثالیں تاریخ کے اوراق میں بھری ہوئی ہیں کہ جن کا شمار ہی نہیں ہو سکتا، اس خامی کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خامی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ قانون شکنی کے موارد کبھی تو خود ارباب اقتدار ہی سے پوشیدہ ہوتے ہیں اور کبھی ان تک رسائی ہی ارباب اقتدار کے بس میں نہیں ہوتی،

بہر حال اب ہم پہلی بات کی طرف لوٹتے ہیں اور خلاصہ کلام کے طور پر کہتے ہیں کہ جدید تمدن کے رسیا معاشروں میں صرف ایک ہی غرض و غایت ملحوظ ہے اور وہ ہے دنیاوی زندگی کی لذتوں سے بہرہ مند و لطف اندوز ہونا، کہ جسے وہ اپنے تئیں ''سعادت'' قرار دیتے ہیں، لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو وہ دنیاوی زندگی ہی کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کو ''سعادت'' قرار نہیں دیتا بلکہ اس کی نظر میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے کہ جس کی کڑیاں مادی دنیا کی زوال پذیر زندگی سے باہر اخروی زندگی تک جاتی ہیں جو کہ اصل زندگی ہے یعنی اس کا ایک پہلو اسی دنیاوی زندگی کی لذتوں سے لطف اندوزی ہے کہ حقیقی معنی میں وہی ''زندگی'' ہے، اور اسلام اس حقیقی زندگی کی سعادت کا حصول صرف انہی معارف الٰہیہ سے وابستگی و پیوستگی

سے ممکن قرار دیتا ہے جس کی اصل و اساس توحید و یکتا پرستی ہے، اسلام کی نگاہ میں ان معارفِ الٰہیہ سے وابستگی و پیوستگی کا راز پاکیزہ اخلاق و کردار اور نفس کے ہر طرح کی گندگی و برائی سے پاک ہونے میں مضمر ہے، اور پھر ان اخلاق و اعلیٰ سیرت کا کامل و مکمل ہونا اس صالح اجتماعی زندگی پر موقوف ہے جس کی بنیاد خداوند عالم کی خالصانہ عبادت اور اس کی ربوبیت کے تقاضوں کی عملی تکمیل اور لوگوں کے ساتھ معاشرتی عدل کے ساتھ برتاؤ کرنا ہے، اسی بنیاد پر اسلام نے انسان کی دنیوی و اخروی سعادت کو یقینی بنانے کے لئے اپنے اصلاحی دستورات کا سرنامہ دعوتِ توحیدی کو قرار دیا تاکہ تمام افرادِ بشر ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہوئے وحدت کی لڑی میں پروجائیں چنانچہ اسلام نے اسی توحیدی بنیاد پر اپنے قوانین کی صورت گری کی اور اس سلسلہ میں ارادوں کی یکسوئی و ہم رنگی پر اکتفا کرنے کی بجائے عبادتی احکام کے ذریعے ان کی تکمیل کرنے کے ساتھ ساتھ معارف حقہ اور پاکیزہ اخلاق کا اضافہ کردیا...... کہ اس میں علمی و عملی دونوں حوالوں سے انسان کی عظمت و سعادت کی ضمانت پائی جاتی ہے......، اس تدوینی مرحلہ کے بعد اسلام نے ان قوانین کے اجراء و نفاذ کی ذمہ داری سب سے پہلے اسلامی حکومت پر ڈالی کہ وہ اس سلسلہ میں متعلقہ امور کی درست انجام دہی کو یقینی بنائے، اس کے بعد اسلام نے معاشرہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیا کہ وہ صالحانہ علمی و عملی تربیت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے ان قوانین و دستورات کی پاسداری کو یقینی بنائے، دین اسلام کے اہم ترین امتیازات اور خصوصیات میں جو چیز عام مشاہدہ میں آتی ہے وہ افرادِ معاشرہ کے درمیان کامل وحدت و ہم رنگی کے قیام کے لئے باہمی تعلق و ارتباط کو مستحکم کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ مقدس دین جن پاکیزہ اخلاق کی طرف بلاتا ہے ان سب میں توحیدی روح موجود ہے اور جن اعمال کی انجام دہی افرادِ معاشرہ پر لازم قرار دیتا ہے ان میں اخلاقی روح پھونکی گئی ہے، بنابرایں دین اسلام کے تمام اجزاء و احکامات کے کامل تجزیہ و تحلیل سے ثابت ہوتا ہے کہ ان سب کی بازگشت توحید کی طرف ہوتی ہے کہ جو اخلاق و اعمال کے مجموعہ مرکب سے عبارت ہے اور ان دونوں کے درمیان نزولی و صعودی تعلق اس طرح پر ہے کہ نزولی حوالہ سے وہ اعمال و اخلاق ہی ہیں اور صعودی حوالہ سے وہ توحید بنتی ہے چنانچہ اسی مطلب کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں ہوا ''اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ'' (خدا کی طرف پاکیزہ کلام صعود کرتا ہے اور عمل صالح اسے بلند تر کردیتا ہے......) (سورۂ فاطر آیت: ۱۰)

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: عام معاشرتی قوانین کے بارے میں جو اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کے اجراء و نفاذ کی ذمہ دار قوتیں ان کی عملداری کو یقینی بنانے میں ناکام ہوئی ہیں یا یہ کہ ان قوانین کی مخفی خلاف ورزی کے ارتکاب سے ناآگاہ ہوتی ہیں یہی اعتراض بعینہٖ اسلامی

قوانین کے اجراء ونفاذ کی ذمہ دار قوتوں پر آتا ہے چنانچہ اس مطلب کی واضح وروشن ترین دلیل یہ ہے کہ ہم خود دین کی کمزوری اور اسلامی معاشرے میں اس کی بالادستی کا زوال اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرر ہے ہیں اور اس صورتحال کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے پاس کوئی ایسی قوت موجود نہیں جو اس کے قوانین واقدار کو ایک دن کے لئے سہی لوگوں پر نافذ کر سکے۔

جواب: عمومی قوانین خواہ خدائی ہوں یا انسانی ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لوگوں کے اذہان میں ثبت کی گئی صورتیں ہیں اور ایسے علوم ہیں جو سینوں میں محفوظ ہوتے ہیں یعنی لوگوں کے اذہان اور دل ان قوانین اور صورتوں کی آماجگاہیں ہیں اور ان صورتوں کو عملی قالب میں ڈھالنا لوگوں کے ارادوں پر موقوف ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو قوانین کی عملداری کا کوئی نشان معاشرے میں دکھائی نہ دے گا، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل واساس اور حقیقی بنیاد لوگوں کے ارادے ہیں کہ جو قوانین کو عملی صورتوں میں بدلتے ہیں کہ ان کے بغیر کسی بھی قانون کو عملی صورت حاصل نہیں ہوسکتی، لہٰذا کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے ارادے ان قوانین کو عملی صورت میں ڈھالنے کی راہ پر آئیں اور وہ قوانین کی اصل حقیقت کو عملی وجود دیں، اور جہاں تک عام رائج قوانین کا تعلق ہے تو ان میں اس سے زیادہ کسی چیز کو اہمیت نہیں دی گئی کہ لوگوں کے افعال کی بنیاد اکثریت کا فیصلہ وارادہ ہو یعنی جس چیز کا ارادہ وفیصلہ اکثریت کرے تمام افراد اسی کو اپنائیں، لیکن اکثریت کے ارادے کی بقا وتسلسل کے حوالہ سے کوئی ٹھوس اقدامات بجا نہیں لائے گئے، بنا برایں جب تک ارادے زندہ ومتحرک ہوں تو ان کی بنیاد پر قانون کی عملداری یقینی ہوتی ہے اور اگر معاشرتی انحطاط واخلاقی بحرانوں کے باعث ارادوں میں جان ہی باقی نہ رہے اور اگر ان میں جان موجود بھی ہو لیکن ان میں شعور وادراک کا فقدان ہو اور معاشرے میں عیاشیوں واوباشیوں کے امڈے ہوئے طوفان کے باعث ارادوں میں قوانین پر عمل کرنے کے جذبے مردہ ہوجائیں یا اگر جذبے مردہ نہ بھی ہوں لیکن اکثریت کے ارادوں پر غالب استبدادی حاکموں کے جابرانہ تسلط کے نتیجہ میں اپنی اثر گزاری سے محروم ہوجائیں، اور اسی طرح ان حوادث میں جن کی روک تھام کے لئے حکومت بے بس ہو جیسے چھپ کر انجام دیئے جانے والے جرائم وغیرہ یا وہ واقعات کہ جن پر قابو پانا حکومت کی دسترس سے باہر ہو تو ان تمام موارد میں امت، قانون کی عملداری اور معاشرے کو تباہی وبربادی سے بچانے کی اپنی تمنا کو پورا نہیں کرسکتی، چنانچہ اس کی واضح وروشن ترین مثال پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے بعد یورپی اقوام کی ٹوٹ پھوٹ ہے کہ جو انسانی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے، اور ان تمام حالات یعنی قوانین کی خلاف ورزیوں اور معاشرے کی تباہی و بربادی کا اصل سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاشرے میں اس بنیادی عامل پر کوئی توجہ نہیں دی گئی جو لوگوں کے ارادوں کی طاقت اور ان کی اثر گزاری کی اہمیت کو تحفظ فراہم کرتی ہے یعنی اعلیٰ وپاکیزہ اخلاق! کیونکہ اعلیٰ اخلاق کے بغیر ارادوں کی بقاء اور ان میں جذبوں کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا اور کوئی ارادہ اپنے موزوں اخلاق کے بغیر اپنی عملی صورتگری سے ہمکنار نہیں ہوسکتا جیسا کہ علم النفس میں اس حوالہ سے واضح کر دیا گیا ہے، لہٰذا اگر معاشرے میں رائج طور طریقے اور قانون کی

حکمرانی وعملداری اعلیٰ و پاکیزہ اخلاق کی مضبوط بنیاد پر قائم واستوار نہ ہوتو ان کی مثال اس درخت جیسی ہوگی جوزمین سے ازخودنکلا کہ جسے قرار حاصل نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا تلخ حقائق کا ایک واضح ثبوت کمیونزم کا دنیا میں ظہور پذیر ہونا ہے کہ جوڈیموکریسی ہی کی پیداوار ہے اور اسے معاشرے میں مرفہ و مالدار طبقہ کی عیاشیوں اور دیگر افراد کی محرومیوں نے جنم دیا ہے جورفتہ رفتہ دونوں طبقوں کے درمیان وجود میں آنے والی دوریوں اور وسیع فاصلوں کا باعث ہوا کیونکہ مرفہ و مالدار طبقہ کی طرف سے قساوت وسنگدلی اور محروم طبقہ کے بارے میں ناانصافی کے پے درپے عملی مظاہروں نے معاشرے میں ناراضگی ونارضایتی اور غصہ ودشمنی کی آگ کے شعلے بھڑکا دیئے، اسی طرح عالمی جنگوں کا یکے بعد دیگرے دومرتبہ وقوع پذیر ہونا جبکہ تیسری مرتبہ اس کے بادلوں کا گرجنا روئے زمین پر تباہی اور املاک ونسلوں کی بربادی کا سبب بن چکا ہے کہ جس کے پیچھے استکباری سوچ اور طمع ولالچ جیسے عوامل کارفرما ہیں، اور یہ سب کچھ موجودہ قوانین کی کمزور بنیادوں کے ناقابل انکار آثار ہیں جبکہ اسلام نے اپنے تمام دستورات و احکام اور قوانین وضوابط کو اعلیٰ ترین اخلاق و پاکیزہ ترین صفات پر قائم واستوار کیا اور انہی پر لوگوں کی تربیت کا وسیع نظام تشکیل دیا ہے البتہ جہاں تک ان قوانین کی عملداری کا تعلق ہے تو اس کا فیصلہ اور بنیادی ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں ان قوانین پر عمل کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوسکتا ہے اور اپنی خلوت وجلوت اور ظاہر وباطن میں ان احکامات ودستورات کی عملی پاسداری کا فریضہ کسی دوسرے کی نگرانی کے بغیر نہایت احسن انداز میں ادا کرسکتا ہے۔

اس مقام پر یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ مغربی ممالک میں بھی لوگوں کو پاکیزہ اخلاق واعلیٰ کردار اپنانے کی ضرورت پر بھرپور انداز میں تاکید کی جاتی ہے اور اس مقصد کے لئے ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان صفات کو اپنا کر معاشرے کو عزت ووقار سے مالا مال کرسکیں لیکن ان کی کوششیں نتیجہ بخش ثابت نہیں ہوتیں اور اس کی دووجوہات ہیں:

(۱) اخلاقی برائیوں کا واحد سبب و عامل ایک طرف مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے میں اسراف وزیادہ روی اور افراط ہے جبکہ دوسری طرف اس سے محرومیت ہے، یعنی ایک گروہ کا اس حوالہ سے بھرپور آزادی کے ساتھ استفادہ کرنا اور دوسروں کا اس سے پورے طور پر محروم ہونا ہے، اس افراط ومحرومیت نے معاشرے میں اخلاقی برائیوں کو جنم دیا ہے چنانچہ مغربی قوانین نے لوگوں کو اس سلسلہ میں مکمل آزادی دی جس نے کچھ لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا اور کچھ کو محرومی سے دوچار کردیا، تو کیا اس صورت حال میں پاکیزہ اخلاق اپنانے کی دعوت وترغیب دلانے کی بات کرنا دومتضاد چیزوں کی طرف بلانا نہیں کہلائے گا اور دوایسے امور کو طلب کرنا نہیں کہلائے گا جو باہم یکجا نہیں ہوسکتے؟

اس کے علاوہ آپ آگاہ ہوچکے ہیں کہ اہل مغرب اجتماعی سوچ کے حامل کہلاتے ہیں اور ان کے معاشروں میں ہمیشہ کمزور معاشروں کو مزید کمزور کرنے اور ان کے حقوق کو پامال کرنیکی بابت کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی جاتی اور ان کی تمام تر

توانائیاں لوگوں کے وسائل کو اپنے مفادات وعیاشیوں میں استعمال کرنے، انہیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے اور ممکن حد تک ان پر اپنی بالادستی کا دائرہ وسیع تر کرنے ہی میں صرف ہوتی ہیں تو اس طرح کے حالات میں نیکی وتقویٰ اور اچھی صفات اپنانے کی دعوت دینا متناقص اور متضاد دعوت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا جو کہ یقیناً ہمیشہ بے نتیجہ ہوتی ہے۔

(۲) پاکیزہ اخلاق کا نفوس بشری میں ثبات واستقرار کسی ایسے مضبوط سہارے وضامن کے بغیر ممکن نہیں جو اس کے تحفظ وتسلسل کو یقنی بنائے اور وہ توحید کے سوا کچھ نہیں، یعنی توحید ہی ہے جو پاکیزہ اخلاق وثبات واستقرار عطا کرسکتی ہے اور توحید سے مراد یہ عقیدہ ونظریہ ہے کہ کائنات کا ایک ہی معبود ہے جس کے پاکیزہ اسماء (الاسماء الحسنیٰ) ہیں اور اس نے مخلوق کو اس لئے خلق فرمایا کہ اسے مال وسعادت سے مالا مال کرے، وہ خیر وبہتری کو پسند کرتا ہے اور شر وبرائی کو ناپسند کرتا ہے، وہ خدائے واحد و یکتا بہت جلد تمام مخلوق کو ایک جگہ (قیامت کے دن) اکٹھا کرے گا اور ان کے درمیان حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا، نیک وصالح شخص کو جزا اور برے وبدکار کو سزا دے گا، اور یہ ایک واضح ومسلم امر اور حقیقت ہے کہ اگر معاد و قیامت کا عقیدہ نہ ہو تو حقیقی معنی میں کوئی ایسا ٹھوس عامل نہیں جو انسان کو نفسانی خواہشات کی پیروی اور مادی لذتوں کی آلودگی سے روکے اور بچائے کیونکہ طبع انسانی صرف اسی چیز کو پسند کرتی ہے جس سے وہ خود لطف اندوز ہو، اس کے علاوہ اسے کسی دوسرے کی پرواہ نہیں ہوتی اور اگر وہ کسی دوسرے انسان کی طبع وجودی کو کسی حوالہ سے اہمیت بھی دیتی ہے تو وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کی بازگشت خود اس کی طرف ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ اسے ہی حاصل ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ہرگز اسے درخور اعتناء قرار نہیں دیتی، (اس موضوع پر اچھی طرح غور کریں)، بنابرایں جن چیزوں میں انسان کے لئے لطف اندوزی و لذت پانے کا سامان موجود ہو مثلاً دوسروں کے حقوق میں سے کسی حق کو پامال کرنا کہ جس سے روکنے والا کوئی بھی نہ ہو اور نہ ہی کوئی سزا دینے والا یا ملامت کرنے والا ہو تو اس صورت میں خطا کی وادی میں گرنے اور بڑے سے بڑے گناہ ومعصیت کے ارتکاب سے کون روک سکتا ہے؟ اور اس حوالہ سے ایک توہم وغلط فہمی عوام وخواص...... کہ جن میں اکثر اہل دانش بھی ہیں...... میں پائی جاتی ہے کہ وطن دوستی، ہمنوع دوستی اور اچھی تعریفیں وغیرہ برائی کے ارتکاب کی راہ میں رکاوٹیں بن سکتی ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ امور قلبی عواطف واحساسات اور باطنی جذبات ہیں کہ جن کا تحفظ تعلیم وتربیت کے سوا کسی دوسرے سبب سے ممکن نہیں اور ان کی اثر آفرینی کسی معین ومتعین عامل سے وابستہ نہیں ہوتی لہٰذا ان کی حیثیت اتفاقیہ اوصاف اور معمولی امور سے زیادہ نہیں کہ جن کی زوال پذیری میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی، تو اس صورت حال میں کیا ضرورت ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس لئے قربان کردے کہ اس کے مرنے کے بعد دوسرے لوگ لذتیں اٹھائیں اور دنیا کی عیش وعشرت سے مزے لوٹیں جبکہ وہ خود اس حقیقت سے آگاہی رکھتا ہو کہ موت فناء ونابودی ہے؟ یہ کونسی عقلمندی ہے کہ انسان اس لئے اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیل دے کہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کی تعریف کریں؟ وہ اپنے مرنے کے بعد لوگوں کی طرف سے اپنی

تعریف سن کر اس سے لطف اندوز کیونکر ہوسکتا ہے؟

خلاصہ کلام یہ کہ کوئی دانشمند و مفکر اس حقیقت کے بارے میں کسی طرح کے شک وشبہ کا شکار نہیں ہوسکتا کہ کوئی انسان ایسی چیز سے محرومی کا اقدام نہیں کرسکتا جس سے محرومی اسے کوئی فائدہ نہ دے سکے خواہ اس محرومی پر اس کی تعریف ہی کیوں نہ ہو اور اس کے بارے میں اس سے وعدے بھی کئے جائیں...... یعنی اس سے کہا جائے کہ تمہارے مرنے کے بعد تمہارا تذکرۂ جمیل عام ہوگا اور تمہیں یہ فائدہ ہوگا اور وہ فائدہ ہوگا...... اور اس سے کہا جائے کہ تمہارا نام سربلند ہوگا، تم تاریخ میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہو گے، ہر شخص کی زبان پر تمہارا ہی نام ہوگا وغیرہ وغیرہ، تو اس طرح کے ہوائی وعدے دراصل فریب و دھوکہ کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور کسی کے جذبات و احساسات سے کھیلنے سے زیادہ ان کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ ان دلفریب وعدوں کی بنیاد پر وہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ مرنے اور اپنی جان فدا کرنے کے بعد بھی اسی طرح ہوگا جیسے زندگی میں ہے کہ اپنے تذکرۂ جمیل سے لطف اندوز ہوگا اور اپنی نیک نامی سے سربلند ہوگا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ غلط و توہم پر مبنی ہے اور بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے نشہ میں سرمست انسان غیر متوازن حرکتیں کرتا ہے اور احساسات کی برانگیختی کا شکار ہو کر اپنی عزت و ناموس اور مال و دولت بلکہ ہر طرح کے شرف و اعزاز کو پامال کردیتا ہے کہ اگر عقلمند ہوتا اور فکری صحت مندی کا حامل ہوتا تو کبھی غیر متوازی کام انجام نہ دیتا لیکن وہ نشہ کی حالت میں بے شعوری و ناسمجھی کے ساتھ بیوقوفانہ حرکتیں کرتا ہے جس سے اس کے جنون و دیوانہ پن کا ثبوت ملتا ہے، تو اس طرح کی لغزشوں اور فکری و عملی ٹھوکروں سے بچنے کا صرف اور صرف ایک ہی سہارا ہے یعنی توحید، کہ جس کا تذکرہ ہم کرچکے ہیں اور بیان کرچکے ہیں کہ توحید ہی وہ مضبوط قلعہ ہے جو انسان کو غیر معقول حرکتوں سے بچا سکتا ہے، چنانچہ اسی مقصد کے لئے اسلام نے پاکیزہ اخلاق کا ایک نہایت اہم اور ٹھوس نظام مقرر کیا ہے اور اسے اپنی توحیدی بنیادوں پر استوار کرتے ہوئے اپنے آئین کا لازمی جزء بنایا ہے کہ جس کے بنیادی تقاضوں میں سے معاد و عقیدۂ قیامت ہے اور اس کی لازمی خصوصیت یہ ہے کہ انسان نیکی و احسان کا رسیا ہوجائے اور برائی و بدی سے اجتناب برتنے کا پابند ہو خواہ جہاں بھی ہو اور جب اور جن حالات میں بھی ہو، جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، کوئی اس کے اچھے کام پر اس کی تعریف کرنے والا اس کے ساتھ ہو یا نہ ہو، کوئی اس کے برے کام سے روکنے والا اس کے پاس ہو یا نہ ہو، اسے ان چیزوں کی ہرگز پرواہ نہیں ہوتی اور وہ ان امور کو خاطر میں لاتا ہی نہیں کیونکہ وہ ہر حال میں خداوند عالم کو اپنے پاس سمجھتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کا معبود اس کے ہر کام کو جانتا اور اس کی حفاظت کرنے والا بلکہ ہر شخص کے عمل کا ناظر ہے اور یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ اس عالم کے بعد ایک دن ایسا بھی آئے گا جس میں ہر شخص اپنے کئے کا مشاہدہ کرے گا اور اپنے ہر عمل خواہ اچھا یا برا کی جزا پائے گا،...... تو ظاہر ہے کہ توحید اور معاد کے عقیدے کے بعد کوئی شخص برائی و بدی کا مرتکب نہیں ہوسکتا اور نہ ہی دنیا کی چمک دمک اس پر اثر انداز ہوسکتی ہے بلکہ وہ توحید و یکتا پرستی کے عقیدے کی روشنی میں اپنی زندگی کا سفر نہایت پاکیزگی اور عزت و وقار کے ساتھ طے کرسکتا ہے۔

۷۔دوفکری زاویے: تعقل واحساس

انسان کی زندگی میں دوفکری زاویے پائے جاتے ہیں جواس کے سفر حیات کی جہتوں کو متعین و مشخص کرتے ہیں:

(۱) زاویہ تعقل (۲) زاویہ احساس، جہاں تک زاویہ احساس کا تعلق ہے تو اس کا دائرہ مادی فوائد سے باہر نہیں ہوتا بلکہ وہ مادی فوائد کے حصول کی طرف جذب کرتا ہے اور اگر اس کا مقصد پورا ہو جائے اور انسان اس کے مطابق عمل کرنے لگے تو اس کی طرف مزید بڑھتا چلا جاتا ہے اور انسان اس کے نشہ میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ پھر اسے دنیا میں مادی فوائد کے حصول کے علاوہ کوئی چیز اچھی نہیں لگتی لیکن اگر اس کی اثر گزاری انسان کو متاثر نہ کر سکے اور وہ ان مادی فوائد سے دل نہ لگائے تو یا ان کی لطف ولذت آفرینی اسے اپنا اسیر نہ کر سکے تو وہ ٹھنڈا ہو کر بیٹھ جاتا ہے جبکہ اس کے مقابل زاویہ تعقل انسان کو حق کے اتباع و پیروی کی طرف کھینچتا ہے اور پھر انسان وہی کچھ انجام دیتا ہے جو حق ہوتا ہے اور حق جس کا تقاضا کرتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ انسان ہر اس عمل کو انجام دینے کو اختیار کرتا ہے جو اس کے لئے مفید ہو خواہ وہ کام مادی فائدہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو وہ اس بات کو خاطر میں ہی نہیں لاتا، اس کی نظریں حق وحقیقت پر جمی ہوتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی خیر و بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

ان دوفکری زاویوں کے تناظر میں عرب کے مشہور شاعر "عنترہ" کا ایک شعر ملاحظہ کریں جو زاویہ احساس کی ترجمانی کرتا ہے اور آیاتِ قرآنیہ کا مطالعہ کریں جو زاویہ تعقل کی عکاسی کرتی ہیں:

شاعر عنترہ کا شعر یوں ہے:

وقولی کلما جشأت و جاشت مکانك تحمدی اور تستریحی

اس شعر میں وہ کہنا چاہتا ہے کہ جب آتش جنگ شعلہ ور ہوتی ہے اور میدان کارزار گرم ہوتا ہے تو میں اپنا دل بہلانے کے لئے اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ ثابت قدم رہو کہ اگر مارے جاؤ تو لوگ تمہارے ثابت قدم رہنے اور میدان سے فرار نہ کرنے پر تمہاری تعریف کریں گے اور اگر تم نے دشمن کو پچھاڑ دیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تو تم سکون قلب پاؤ گے، لہٰذا ثابت قدم رہنا ہی تمہارا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیے کیونکہ فتح وشکست دونوں صورتوں میں تمہارا فائدہ ہے۔

اور زاویہ تعقل کے حوالہ سے یہ آیات ملاحظہ ہوں،

سورۂ توبہ آیت: ۵۲

○ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَیَیْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ یُّصِیْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَیْدِیْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ

(کہہ دیجئے کہ ہمارے ساتھ صرف وہی ہوگا جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے کہ وہی ہمارا مولا و آقا ہے اور

ایمان والے اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ کیا تم دو نیکیوں میں سے ایک ہی کا ہمارے لئے انتظار کرتے ہو جبکہ ہم تو صرف یہ انتظار کرتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے یا تمہارے ہاتھوں تم پر عذاب نازل ہو، پس تم اپنا انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ اپنا انتظار کرتے ہیں)

سورۂ توبہ آیت: ۱۲۰-۱۲۱

○ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۱﴾

(یہ اس لئے ہے کہ انہیں اللہ کی راہ میں جس پیاس، تھکن اور بھوک کا سامنا ہوا اور ان کی رفتار سے کافر غیظ و غصہ میں آئے اور دشمنوں سے جو پالا پڑا ان سب کے عوض ان کے نامہ اعمال میں ایک ایک نیک عمل لکھ دیا گیا ہے کہ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا○ اور جو چھوٹا بڑا خرچ کرتے ہیں اور رضائے الٰہی کے لئے جس قدر سفر کرتے ہیں وہ ان کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے تا کہ اللہ انہیں ان کے نیک اعمال کی بہتر جزاء عطا کرے)

اس بناء پر وہ کہتے ہیں کہ اگر تم ہمیں قتل کر دو یا تمہاری طرف سے ہم پر کوئی مصیبت آئے تو اس سے ہمارے پروردگار کے پاس ہمارے لئے عظیم اجر اور نیک انجام ہے، اور اگر ہم نے تمہیں قتل کر دیا یا تم پر کسی طرح قابو پا لیا تب بھی ہمیں عظیم ثواب اور نیک انجام کے ساتھ ساتھ دنیا میں اپنے دشمنوں پر فتح پانے کا اعزاز حاصل ہو جائے گا، لہٰذا ہم ہر حال میں سعادت مند ہیں اور لوگ ہم پر رشک کریں گے اور ہمارے ساتھ جنگ کرنے میں تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا، گویا ہمارے حوالہ سے تم دو نیکیوں میں سے کسی ایک کے حصول کے منتظر ہو، اس بناء پر ہم ہر حال میں نیکی و سعادت کے حامل ہیں جبکہ تم ہمیں ظاہری طور پر شکست دینے کے بعد اپنے خیال میں اپنے آپ کو سعادتمند سمجھتے ہو اور اپنے تئیں یہ نظریہ رکھتے ہو کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہو، اس تمام صورت حال میں ہم تمہارے لئے برے انجام اور سخت عذاب میں مبتلا ہونے کی امید رکھتے ہیں جبکہ تم ہمارے لئے خوشی و سعادت کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچ سکتے۔

تو یہ دو زاویہ ہائے فکر و عمل ہیں کہ جن میں سے ایک جنگ میں ثابت قدمی اور اپنے نظریہ پر قائم رہنا اور ہرگز پیچھے نہ ہٹنا ہے جو کہ نظریہ احساس پر مبنی ہے کہ جس میں دو نتائج ملحوظ ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ تعریف کریں گے اور دوسرا دشمن سے چھٹکارا مل جائے گا۔ البتہ یہ اس صورت میں امکان پذیر ہے جب جنگ کرنے والے شخص کو اپنی جان جوکوں میں ڈالنے اور موت سے ٹکر لینے میں کوئی فائدہ حاصل ہو لیکن اگر اسے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو مثلاً لوگ اس کی تعریف نہ کریں کیونکہ وہ جہاد کی قدر و قیمت سے آگاہی نہیں رکھتے اور ان کے نزدیک خدمت و خیانت دونوں برابر ہیں یا جسے وہ خدمت سمجھتا ہے لوگ اس کی اہمیت کا ادراک ہی نہیں رکھتے اور نہ ہی اسے خدمت و خیانت کے تقابلی باب میں شمار کرتے ہیں یا وہ خود دشمن

کو ہلاک کرنے سے کسی طرح کی خوشی محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ صرف حق کے لئے موجب مسرت ہو، تو ان تمام صورتوں میں زاویہ احساس کی بناء پر کسی عمل کا نتیجہ اپنی توانائیوں سے محرومی کے سوا کچھ نہیں۔

مذکورہ بالا موارد ہی ہیں جو ہر بغاوت وخیانت اور جرم وجنایت کے عمومی اسباب قرار پاتے ہیں اور ان کی بناء پر قانون کو پامال کرنے والا خائن شخص کہتا ہے کہ اس کی خدمت لوگوں کے نزدیک خاطر خواہ مقام نہیں رکھتی اور وہ اسے احترام کی نظر سے نہیں دیکھتے اور ان کی نگاہ میں خادم وخائن دونوں یکساں ہیں بلکہ خائن کو خادم سے زیادہ عیش وعشرت حاصل ہے، اور ہر باغی ومجرم اپنے تئیں یہ تصور کرتا ہے کہ قانون اسے اپنی گرفت میں نہیں لاسکتا اور نہ ہی قانون نافذ کرنے والے ادارے اس پر قابو پاسکتے ہیں چنانچہ اسی بناء پر وہ اپنے امور پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنا معاملہ لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتا، اسی طرح ہر وہ شخص جو قیامِ حق اور دشمنانِ حق کے مقابلے میں آنے کے لئے بہانے تراشتا ہے وہ اپنے مؤقف کی صحت کے اثبات میں یہ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ حق کا ساتھ دینا میرے لئے لوگوں میں باعث ذلت ہے اور موجودہ دور میں لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے قدیم زمانے اور قرونِ وسطیٰ کی یادگار قرار دیں گے، اور اگر میں شرافت نفس وطہارت باطن کی بات کروں تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس شرافت نفس سے کیا ملے گا جب اس کے نتیجہ میں ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

تو یہ سب کچھ زاویہ احساس کی پیروی کے مظاہر ہیں، لیکن دوسری جانب زاویہ تعقل جو کہ اسلامی منطق ومؤقف ہے وہ اس سے قطعی مختلف ہے کیونکہ اسلام نے اپنی منطق ومؤقف کو اتباع حق اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر وجزاء کی تمنا پر مبنی قرار دیا ہے اور دنیاوی اغراض ومقاصد کے حصول کو قانونی حیثیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اور یہ بات واضح ومعلوم ہے کہ یہ غرض وغایت ہر مورد میں پائی جاتی ہے اور کوئی مورد اس کے دائرہ سے باہر نہیں، اس کی انجام پذیری صرف رضائے الٰہی پر مبنی ہوتی ہے اور حق کے معاملے میں سرِ تسلیم خم کرنے اور حق کی پیروی ہی اس کی اصل واساس قرار پاتی ہے کہ جو خداوند عالم وعلیم اور حافظ وحفیظ نے اپنی مخلوق سے طلب کی، وہ خدا کہ جسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اور نہ ہی کوئی طاقت اس کے عذاب سے بچا سکتی ہے، اور نہ ہی زمین وآسمان میں کوئی چیز ایسی ہے جو اس سے پوشیدہ ہو، چنانچہ اس کا ارشاد ہے: "وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ" (اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر وآگاہ ہے) لہٰذا ہر شخص پر ایک نگران وگواہ مقرر کر دیا گیا ہے جو اس کے ہر کام کو دیکھتا ہے خواہ وہ خود اس کام کو انجام دے یا کوئی دوسرا اس کے ساتھ سلوک کرے، خواہ لوگ اس کا مشاہدہ کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں، خواہ لوگ اس کے اچھے کام پر اس کی تعریف کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، خواہ اس کے برے کام پر اس کی مذمت وسرزنش کریں یا نہ کریں اور خواہ کسی برے کام سے اسے روکیں یا نہ روکیں، وہ نگران ومحافظ ان تمام امور کا گواہ ہے، چنانچہ اس زاویہ فکر کی صحت ودرستی کی گواہی اس اسلامی تربیت کے خوبصورت آثار کی شکل میں ہمارے سامنے ہے کہ عہدِ نبویؐ میں لوگ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اپنے گناہوں وغلطیوں کا برملا اعتراف کرکے توبہ کرتے تھے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اپنے جرائم کی سزا پانے اور حد جاری کئے جانے کو (خواہ قتل کی صورت میں کیوں نہ ہو) اپنے لئے باعث خیر قرار دیتے تھے کیونکہ وہ چاہتے

تھے کہ ان کا پروردگار ان سے راضی وخوش رہے اور وہ گناہوں کی اس گندگی اور برائیوں کی اس پلیدی سے پاک ہو جائیں جس نے ان کے نفوس کو آلودہ کر دیا ہے، ان نادر موارد میں غور وفکر کرنے اور ان کا بخوبی جائزہ لینے کے بعد ہر دانشمند ومحقق کے لئے اس حقیقت سے آگاہی کا حصول ممکن ہو جاتا ہے کہ دینی تعلیمات لوگوں کے نفوس میں کس قدر اثر کرتی ہیں اور انہیں رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اپنی پسندیدہ ترین لذتوں سے محروم ہونے پر راضی و عادی بنا دیتی ہیں، اگر تفسیری سلسلہ بحث ہمارا موضوع نہ ہوتا تو ہم یہاں تاریخی مثالیں وشواہد ذکر کرتے جن سے ہمارا مقصود ومطلوب مزید واضح وآشکار ہو جاتا۔

۸۔ خدا سے اجر طلب کرنا اور غیر خدا سے روگردانی

بعض سادہ لوح افراد یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اخروی اجر وجزا کو انسان کی معاشرتی زندگی کی غرض وغایت اور مقصدِ اعلیٰ قرار دیا جائے تو اس سے ان تمام مقاصد سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے جو انسانی زندگی کی طبعی ضرورتوں کے بنیادی تقاضے ہیں اور ان مقاصد سے محرومی اجتماعی زندگی کی تباہی اور دنیا سے کنارہ کشی (رہبانیت) کا سبب بنتی ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک مقصد کو ملحوظ وہدف قرار دینے کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم مقاصد کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے؟ یعنی ایک ہی عمل میں دونوں مقاصد کا حصول ہدف ومقصد اعلیٰ قرار پائے؟ کیا یہ متضاد امور کے یکجا ہونے کی صورت نہیں؟ کیا اس طرح دو متناقض چیزوں کا اکٹھا ہونا لازم نہیں آتا کہ جسے علمی زبان میں اجتماع متناقضین کہتے ہیں جو کہ محال ہے؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا توہم اور بے بنیاد تصور وخیال تعلیماتِ الٰہیہ کی اعلیٰ ترین حکمتوں اور معارفِ قرآنیہ کے اسرار ورموز سے جہالت وناآگاہی کا نتیجہ ہے کیونکہ اسلام کے تمام احکام وتعلیمات اور فرامین و دستورات (شریعت اسلامیہ) کی اصل واساس تکوینیات وفطریات پر استوار ہے اور انسانی وجود کے طبعی تقاضوں کی تکمیل اس کا ہدف و مقصد اعلیٰ ہے جیسا کہ اس حوالہ سے ہم بارہا اپنی اس کتاب کے مختلف موضوعات کی بحثوں کے ذیل میں واضح طور پر بیان کر چکے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے واضح وصریح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ روم آیت: ۳۰

○ ''فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ''

(خلوص وحسن نیت کے ساتھ دین کو اپنا لو کہ وہی حقیقی معنی میں فطرت الٰہی ہے کہ جس کی بنیاد پر اس نے لوگوں کو خلق فرمایا ہے، خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی اور یہی مضبوط دین وآئین حیات ہے)

ان مطالب سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ حقیقی تکوینی اسباب نوع انسانی کو وجود عطا کرنے کے لئے باہمی تعاون و مدد کے ساتھ اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور ان اسباب کی اثر گزاری کا سلسلہ ہی ایسا ہے کہ جو انسان کو اس کے اس وجودی مقصد

کی طرف لے جاتا ہے تو اب خود انسان پر واجب و لازم ہے کہ ان اسباب کی اثر گزاری کو نتیجہ بخش بنانے کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے ایسی راہ وروش اور طرز عمل اختیار کرے جس سے ان اسباب سے مکمل ہم آہنگی پیدا ہو اور ان کی اثر گزاری بے نتیجہ ثابت نہ ہو اور نہ ہی اس کے طرزِ عمل اور ان اسباب کے درمیان تناقض و تضاد لازم آئے کیونکہ اگر ایسا ہوا یعنی اس کے طرزِ عمل اور اسباب کے درمیان تضاد و تناقض اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوئی تو اس کا نتیجہ خود اس کی تباہی و ہلاکت اور شقاوت و بدبختی کے سوا کچھ نہ ہوگا تو یہ بات (اگر مذکورہ بالا تصورات و خیالات کا حامل شخص فکر و فہم سے کام لے) بعینہٖ دین اسلام ہے (اسلامی تعلیمات کا محور و اساس اور حقیقی روح یہی ہے)، اور چونکہ ان اسباب سے بالاتر اور مافوق ایک ایسا سبب موجود ہے جو ان اسباب کو وجود میں لانے والا ہے اور اسی نے ان اسباب کو اسباب ہونے کی حیثیت عطا کی ہے لہٰذا انسان پر لازم و ضروری ہے کہ اس مسبب الاسباب (اسباب کو اسباب بنانے والے) کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور حقیقی معنی میں اس کی اطاعت کا عملی دم بھرے، توحید کو دین اسلام کی اصل و اساس قرار دیئے جانے کا مطلب بھی یہی ہے، انہی مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلمہ توحید سے عملی وابستگی اور خدائے یکتا کی کامل بندگی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے زندگی کے سفر میں صرف اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کی خالصانہ کوشش ہی حقیقت میں اسباب سے پورے طور پر ہم آہنگ ہونے کا دوسرا نام ہے اور ان اسباب میں سے ہر سبب کا پورا پورا حق ادا کرنا کہ جس میں کسی قسم کا شرک و غفلت نہ پائی جائے وہی اصل اسلام و روح توحید ہے، اس بناء پر ہر مسلمان کی زندگی میں دو اغراض ملحوظ و متعین ہوتی ہیں۔ ایک دنیاوی اور دوسری اخروی۔ اسی طرح دو مقاصد پائے جاتے ہیں۔ ایک مادی اور دوسرا معنوی و روحانی، لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کی بابت ضرورت سے زیادہ توجہ و اہتمام نہیں کرتا یعنی جس قدر ان دونوں کے تقاضے پورے کرنے چاہییں وہ ان سے تجاوز نہیں کرتا بلکہ ان میں سے ہر ایک کا اس کی حدود میں رہتے ہوئے خیال و اہتمام کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اللہ کی وحدانیت کی عملی پاسداری کی دعوت دیتے ہوئے صرف اسی سے وابستہ رہنے اور اس کے ساتھ خالص پیوستگی کو یقینی بنانے کا حکم دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے علاوہ ہر سبب سے روگردانی کرنے کی تاکید کرتے ہوئے غیر اللہ کو مقصد و مقصود قرار دینے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے البتہ اس سب کے باوجود لوگوں کو زندگی کے ظاہری اسباب سے بھرپور استفادہ کرنے اور روزمرہ کے معمولات میں طبیعی وسائل و نظام کے مطابق راہ و روش اپنانے کا حکم دیتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جو کہ مسبب الاسباب اور ہر سبب سے مافوق ہے اس سے وابستہ و پیوستہ رہتے ہوئے دیگر ظاہری اسباب سے بھرپور استفادہ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ اس کا نتیجہ اس طرح سامنے آتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کے افراد ہی حقیقی معنی میں دنیا و آخرت کی سعادت سے بہرہ ور ہیں اور ان کے تمام اعمال میں ان کا مقصدِ اعلیٰ خدائے واحد کی رضا و خوشنودی کا حصول ہے جو کہ زندگی کی دیگر اغراض سے ہرگز متصادم نہیں ہوتا خواہ وہ اغراض جس قدر بھی ہوں اور ان کی اثر گزاری کا دائرہ جس قدر وسیع کیوں نہ ہو۔

اس بیان سے ایک اور غلط فہمی اور توہم کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ علم الاجتماع کے کچھ ماہرین جس کا شکار ہوئے اور کہتے

ہیں کہ دین کی حقیقت اور اصل غرض وغایت معاشرتی عدل کا قیام ہے اور عبادات اس کی فرع ہیں اور جو شخص ان فروعات پر عمل پیرا ہو وہی دیندار کہلائے گا خواہ اس پر اعتقاد رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور خواہ خدا کی بندگی کا عقیدہ دل میں ہو یا نہ ہو، (یعنی ظاہری طور پر نماز وروزہ وغیرہ کا پابند ہو لیکن دل میں ان کی حقیقت اور حقانیت اور ادائے بندگی، خدا کا عقیدہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا)۔ اس تصور وتوہم اور واضح غلط فہمی وغلطی کے بارے میں کسی بحث کا بغور مطالعہ وتحقیق کرنے والا کوئی بھی شخص اس نظریہ کے بطلان ونادرستی کی بابت کسی اضافی بحث واستدلال سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس نظریہ کے غلط ہونے کا اعتراف واقرار کئے بغیر رہ نہیں سکتا، اس کے علاوہ اس نظریہ میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں عقیدۂ توحید سے دستبرداری اور پاکیزہ اخلاقی کمالات وفضائل کو دینی اقدار واصولوں کی فہرست سے خارج کر دینا شامل ہے کہ جس کے نتیجہ میں دین کی اصل غرض وغایت جو کہ کلمۂ توحید ہے اسے دنیا کی مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے میں تبدیل کر دینا لازم آتا ہے جبکہ یہ دو اغراض ایک دوسری سے قطعی طور پر مختلف ہیں اور ان میں کوئی ایک، دوسری سے کسی بھی حوالہ وجہت میں یک رنگ ویکجا نہیں ہو سکتیں نہ اپنے اصولوں میں اور نہ اپنے فروعات ونتائج وآثار میں، کسی بھی نسبت سے اُن کے درمیان مقصدی ربط نہیں پایا جاتا، مقصدیت کے تناظر میں نہ تو کلمۂ توحید کی بازگشت، معاشرتی تمدن کی طرف ہوتی ہے اور نہ ہی معاشرتی تمدن کی بازگشت کلمۂ توحید کی طرف ہوتی ہے (گویا دونوں کی سمت مختلف ہے)۔

۹۔ اسلام میں آزادی کا معنی ومفہوم؟

''آزادی'' کا جو معنی لوگوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے اس کی تاریخ چند صدیوں سے زیادہ نہیں اور اس کے زبان زدِ عام ہونے کی عمر غیر معمولی مدت کی حامل نہیں، شاید اس کا اصل سبب اور اس کے موجودہ صورت میں سامنے آنے کی بنیادی وجہ یورپ کی تمدنی تحریک ہے جو چند صدیاں پہلے شروع ہوئی لیکن اس کا معنی قدیم زبانوں ہی سے ذہنوں میں راسخ اور دلوں کی تمناؤں میں سے ایک تھا۔

جہاں تک ''آزادی'' کی اصل حقیقت کا تعلق ہے تو اس کی کڑیاں ولڑیاں طبع الوجود اور تکوین وتخلیق سے ملتی ہیں اور اس کا رشتہ ناطہ انسانی وجود میں پائی جانے والی اس قوت سے ملتا ہے جو اسے عمل کی راہ پر لانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی وجود میں جو قوت ودیعت فرمائی ہے کہ جسے ''ارادہ'' سے موسوم کیا جاتا ہے وہ آزادی کا سرچشمہ ہے اور اسی سے اس کی اصل واساس اور معنی ومفہوم کی مظہریت وابستہ ہے اور وہ ایسی باطنی حالت ہے کہ اس پر انسانیت کی بقاء موقوف ہے اور اس کے بے اثر ہونے سے احساس وشعور کی وہ قوتیں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں جن کے بے اثر وبیکار ہو جانے سے اصل انسانیت بے اثر وبے نتیجہ اور بیکار ہو سکتی ہے اور چونکہ انسان فطرتاً اجتماعیت پسند ہے کہ اس کی طبع

وجودی اجتماعی زندگی کی متقاضی ہوتی ہے اور اسے دیگر ہمنوع افراد کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے کی راہ پر لاتی ہے لہٰذا اس کا ارادہ دیگر افراد بشر کے ارادوں اور اس کا کام دیگر ہمنوع افراد کے کاموں میں پیوست ہو جاتا ہے اور پھر اسے اس قانون کی عملی پاسداری کا ثبوت دینا پڑتا ہے جو ارادوں اور اعمال کو مقررہ حدوں میں رکھتے ہوئے اعتدال کی راہ پر لاتا ہے، بنابرایں وہ طبع وجودی جو انسان کو ارادہ وعمل میں آزادی عطا کرتی ہے بعینہٖ وہی ارادہ وعمل کی حدود متعین کرتی ہے اور پہلے دی ہوئی آزادی کو مقید کر دیتی ہے۔

اور جہاں تک عصر حاضر کے مروجہ قوانین (جو کہ اہل یورپ کے وضع کردہ ہیں) کا تعلق ہے تو چونکہ ان کی تدوین ہی مادی استفادہ کی بنیاد پر ہوئی جیسا کہ آپ آگاہ ہیں لہٰذا ان میں اصل دینی امور کی بابت کھلی آزادی دی گئی کہ ان کے بارے میں ہر شخص آزاد ہے خواہ انہیں اپنائے اور ان کے تقاضوں کو پورا کرے یا نہ اپنائے اور انہیں ترک کرے، یہی حالت اخلاقیات کے بارے میں ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان قوانین سے ماوراء جو کچھ بھی انسان چاہے اور عمل کرے اس میں اسے پوری آزادی حاصل ہے، تو یہ ہے ان کے نزدیک آزادی کا معنی!

لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس نے اپنے قوانین سب سے پہلے توحید کی بنیاد پر وضع کئے جیسا کہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں، گویا توحید اسلامی قوانین کی پہلی بنیاد ہے، پھر اس کے بعد پاکیزہ اخلاق کو دوسری بنیاد قرار دیا گیا ...... گویا پاکیزہ اخلاق توحید کی بنیاد پر استوار ہیں...... پھر ہر چھوٹے بڑے عمل...... خواہ فردی وشخصی ہو یا اجتماعی وعمومی...... اور جس کا تعلق کسی بھی حوالہ سے انسان کی زندگی سے ہو اس کے بارے میں شریعت اسلامیہ میں ٹھوس احکام موجود ہیں اور ان کی بابت مذکورہ بالا معنی کی حامل آزادی ہرگز تصور نہیں ہو سکتی، البتہ اس میں انسان کو غیر اللہ کی بندگی کے بندھن سے آزادی دلائی گئی ہے اور وہ ایک ہی لفظ ہے یعنی آزادی لیکن اس کا معنی بہت وسیع ہے اور اس کی وسعت سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو اسلامی آداب زندگی اور اس عملی سیرت کے اصولوں کی چھان بین کر کے ان کی باریکیوں سے مطلع ہو کہ جن آداب وسیرت کے اپنانے کی دعوت اسلام نے لوگوں کو دی اور معاشرے میں ان کی عملی پاسداری کو یقینی بنانے کی تاکید کی اور پھر ان آداب واسلامی سیرت کا عصر حاضر کے ان آداب وسیرت سے موازنہ کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو اہل مغرب کے وضع کردہ قوانین میں ملحوظ ہیں اور وہ ہر معاشرے کے قوی وضعیف شخص پر زبردستی لاگو کرنے کے درپے رہتے ہیں، جو شخص یہ موازنہ کر سکتا ہو وہ بخوبی آگاہ ہو جائے گا کہ اسلامی اصولوں اور مغربی قوانین کے درمیان آزادی کے حوالہ سے کیا فرق پایا جاتا ہے؟ اور اسلام نے جو احکامات صادر فرمائے ہیں ان میں پاکیزہ رزق سے پوری طرح استفادہ کرنے کی بھرپور آزادی کے ساتھ ساتھ افراط وتفریط سے پاک معتدل زندگی بسر کرنے کی تاکید کی گئی، چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ اعراف، آیت: ۳۲

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ......" ○

(کہہ دیجئے کہ کس نے اس خدائی زینت کو حرام کیا جو خدا نے اپنے بندوں کے لئے قرار دی، اور پاکیزہ رزق کو)

سورۂ بقرہ، آیت:۲۹

○ "خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا"

(اس نے روئے زمین پر موجود سب کچھ تمہارے لئے پیدا کیا)

سورۂ جاثیہ، آیت:۱۳

○ "وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ"

(اور اس نے آسمانوں اور زمین میں موجود سب کچھ تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

آزادی کی بحث میں بعض محققین و مفسرین نے اسلام میں عقیدہ کی آزادی کے اثبات میں اپنے آپ کو زحمت میں ڈالتے ہوئے بعض قرآنی آیات سے دلیل پیش کرنے کی بیجا کوشش کی، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت مبارکہ ۲۵۶ "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" (دین میں جبر نہیں) اور اس سے مشابہ دیگر آیات سے استدلال کرتے ہوئے آزادئ عقیدہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، جبکہ سابقہ تفسیری بحث میں اس آیت مبارکہ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے اور یہاں اضافہ کے ساتھ ہم بیان کرتے ہیں کہ آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ تمام اسلامی احکامات کی اصل و اساس توحید ہے تو اس کے باوجود یہ کیونکر قابل تصور ہے کہ عقیدہ میں آزادی دی جائے؟ تو کیا اس سے واضح تناقض اور صریح تضاد لازم نہیں آتا؟ یعنی جب تمام احکام خدا کی وحدانیت اور یکتائی کے عقیدہ پر استوار ہیں تو پھر عقیدہ میں آزادی کا کیا معنی؟ عقیدۂ توحید کے ساتھ ساتھ عقیدہ میں آزادی اس طرح ہو جائے گی جیسے یوں کہا جائے کہ اہل مغرب کے مقررہ قوانین میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ ان پر عمل کرے یا نہ کرے، یہ بات صریح تضاد ہے کیونکہ اس طرح قوانین کی تدوین و تشکیل کی غرض و مقصود حاصل ہی نہیں ہوگا اور قانون سازی بے نتیجہ ہو جائے گی اور اس سے قانون کی حاکمیت باقی نہ رہے گی،

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ عقیدہ سے مراد کسی امر پر قلبی یقین ہے جو انسان کی لوحِ ذہن پر ثبت و نقش ہو جاتا ہے اور وہ انسان کا ایسا عمل نہیں جس میں کرنا و نہ کرنا یا آزادی و پابندی کی گنجائش پائی جائے، بلکہ کرنے یا نہ کرنے کی بات تو اس کے لوازم و بنیادی تقاضوں سے تعلق رکھتی ہے یعنی اعمال کی انجام دہی یا ترک عقیدہ کی بنیاد پر ہوتا ہے اور عقیدہ جس کام کے کرنے کا متقاضی ہو وہ کیا جاتا ہے اور جسے ترک کرنے کا متقاضی ہو اسے ترک کیا جاتا ہے، گویا انجام یا ترک کا لازمی ہونا عقیدہ نہیں بلکہ عقیدہ کے تقاضوں میں شامل ہے مثلاً دوسروں کو اس عقیدہ کے اپنانے کی دعوت دینا اور اس کے بارے میں انہیں بھرپور دلائل کے ساتھ قائل کرنا اور تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی تبلیغ کرنا اور اس

کے ساتھ ساتھ ان عقائد واعمال کے غلط و نادرست ہونے کو ثابت کرنا جو اس سے منافی ہوں اور لوگوں میں رائج و عام ہوں وغیرہ سب کچھ عقیدہ کے لازمی تقاضوں میں سے ہے۔ تو ایسے امور میں منع و جواز کی گنجائش پائی جاتی ہے، بنابرایں یہ واضح ہے کہ اگر معاشرے میں مروجہ قوانین یا جس چیز پر وہ قوانین مبنی ہوں اس کے منافی ہوں تو قانون اس کی ممانعت کرے گا اور ان تقاضوں پر عمل نہیں کرنے دے گا جبکہ اسلام نے اپنے قوانین کی بنیاد صرف توحید (توحید، نبوت، قیامت) کو قرار دیا ہے اور اسی پر اپنے تمام احکامات وضع کئے اور اسی پر تمام اہل اسلام اور دیگر اہل کتاب یعنی یہود، نصاریٰ اور مجوس سب متفق و مجتمع ہیں، ان تین اصولوں ہی میں حریت و آزادی پائی جاتی ہے ان کے علاوہ کسی بھی نظام و آئین میں حقیقی آزادی نہیں ملتی بلکہ دین کی اصل و اساس ہی منہدم ہو جاتی ہے اور ایسے اصول وضع کئے گئے ہیں جن میں دین کا نام ونشان ہی باقی نہیں رہتا، البتہ اس موضوع میں آزادی کی ایک قسم ''اظہارِ عقیدہ'' بھی ملحوظ ہے تو اس کی بابت فصل ۱۴ میں عنقریب تذکرہ کیا جائے گا۔

(۱۰) اسلامی معاشرہ میں تحول و تکامل کے طریقے؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اسلامی نظام و آئین، زندگی کا جامع دستور العمل ہے کہ جس میں زندگی کو سعادتمندی سے ہمکنار کرنے کے تمام اصول موجود ہیں اور اسلامی معاشرہ حقیقی معنی میں سعادتمند معاشرہ ہے کہ جس پر دیگر معاشرے رشک کرتے ہیں لیکن اس کے جامع دستور العمل ہونے کے باوجود اس میں آزادیٔ عقیدہ کے فقدان کی وجہ سے اس کی ترقی کے راستے بند ہیں اور اس کا سفر کمال آگے نہیں بڑھتا اور یہ بات کسی کامل معاشرہ کے لئے بہت بڑا نقص و عیب اور خامی شمار ہوتی ہے کیونکہ کسی چیز کا ترقی وکمال کی جانب بڑھنا اس کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے متضاد قوتیں پائی جائیں اور وہ سب فعال بھی ہوں تا کہ ان کی ٹوٹ پھوٹ سے ایک ایسا مولود وجود میں آئے جو ان تمام خامیوں سے مبرا ہو جو متضاد قوتوں کی عملداری سے پیدا ہونے والی صورتحال کے نتیجہ میں وجود میں آئیں اور پھر زوال پذیر ہو گئیں، بنابرایں بالفرض اسلام کے بارے میں یہ نظریہ رکھیں کہ وہ اضداد و نواقص اور بالخصوص متضاد عقائد کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے تو اس سے یہ بات ماننی پڑے گی کہ وہ معاشرہ جسے خود اسلام نے تشکیل دیا وہ ترقی و تکامل سے محرومی کی راہ پر چل پڑے اور اس کی پیشرفت کا سلسلہ رک جائے۔

اس سوال یا اعتراض کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں اس مادی نظریہ والوں کی ہیں جو مادہ (Matter) کے تحول و تکامل کے قائل ہیں یعنی میٹریالیسزم ڈایالیکٹک، کہ جن میں عجیب و غریب خلط ملط پایا جاتا ہے۔ کیونکہ انسانی عقائد و معارف کی دو قسمیں ہیں:

(۱) جو تحول و تکامل کو قبول کرتی ہے، اس میں وہ علوم وفنون شامل ہیں جو مادی زندگی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور طبع انسانی میں پائی جانے والی عصیان پسند قوت کو مات دینے کے لئے بنائے گئے ہیں مثلاً علم ریاضیات و علم طبیعیات وغیرہ، تو

اس طرح کے علوم وفنون سب ہی ایسے ہیں کہ وہ جوں ہی نقص سے کمال کی طرف بڑھتے ہیں تو اجتماعی ومعاشرتی زندگی کی تبدیلی اور ترقی وتکامل کی راہیں کھل جاتی ہیں اور پھر زندگی ایک نیا رخ اختیار کر لیتی ہے۔

(۲) تبدیلی وتکامل کی کسی بھی صورت کو قبول نہیں کرتی البتہ دوسرے معنی میں تبدیلی وتکامل کو قبول کرتی ہے، اس میں وہ عمومی علوم ومعارف الٰہیہ شامل ہیں جن میں مبداء ومعاد اور سعادت وشقاوت وغیرہ کی بابت حتمی ویقینی اور ناقابل تغیر و تبدل اصول پائے جاتے ہیں اگرچہ ان کے بارے میں باریک بینی سے کام لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ترقی وتکامل کی گنجائش موجود ہے، یہ علوم ومعارف معاشرتی زندگی میں کلی وجامع صورت میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں لہٰذا ان معارف وآراء کا ایک ہی حالت وکیفیت میں باقی رہنا معاشروں کی ترقی کے سفر کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا چنانچہ اس کا واضح ثبوت ہم اپنی عملی زندگی میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ہم اپنے اندر ایسے کثیر نظریات وآراء رکھتے ہیں جو ایک ہی حالت میں باقی ہیں اور ان میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے کی ترقی کا سفر ہرگز نہیں رکتا مثلاً ہم قائل ہیں کہ انسان پر لازم وضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے کام کرے اور وہ کام ایسا ہو جس کا فائدہ انسان کو حاصل ہو، اور ضروری ہے کہ انسان معاشرتی زندگی کو اپنائے، اور ہم قائل ہیں کہ یہ کائنات حقیقی وجود رکھتی ہے نہ کہ وہمی وخیالی! اور یہ کہ انسان اسی عالم کا حصہ ہے اور انسان عالم ارضی کا حصہ اور انسان کے وجود میں اعضاء وجوارح اور گوں ناگوں قوتیں پائی جاتی ہیں، تو یہ وہ آراء ونظریات ہیں جو قائم وثابت اور ناقابل تبدیلی ہیں اور ان کا ناقابل تبدیلی ہونا معاشروں کی ترقی وتکامل کے سفر کے رک جانے کا سبب ہرگز نہیں ہوسکتا، انہی نظریات وعقائد اور آراء میں سے ایک یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا ہے جس نے لوگوں کی سعادتمند زندگی کے لئے جامع دستور العمل وضع کیا ہے اور سلسلہ نبوت قائم کر کے اپنے بندوں کو سعادتمندی کے حصول کی راہ دکھائی ہے، اور ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ خدائے یکتا تمام لوگوں کو ایک دن اکٹھا کرے گا جس میں انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ وجزاء دے گا، تو اسی بات پر اسلام نے اپنے معاشرتی نظام کو قائم و استوار کیا ہے اور اسی میں معاشرہ کی بقاء وتحفظ کا راز پوشیدہ ہے، اور یہ واضح ومعلوم ہے کہ اگر اس نظریہ وعقیدہ میں کسی قسم کی لچک اور ثبوت ونفی اور نئی رائے پیدا ہونے کی گنجائش موجود ہو تو اس سے معاشرہ کی تباہی کے سوا کچھ نتیجہ حاصل نہ ہوگا چنانچہ یہ مطلب کئی بار ذکر ہو چکا ہے اور یہ حال تمام برحق مطالب ومعارف اور حقائق کا ہے جن کا تعلق ماوراء الطبیعہ سے ہے لہٰذا ان کا انکار خواہ کسی بھی وجہ وبنیاد پر ہو اس سے معاشرہ کو زوال وپستی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہو سکے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ انسانی معاشرہ کو اپنے ارتقائی سفر میں روز بہ روز تبدیلی وتکامل کی ضرورت ہے جس میں عالم طبیعت اور جہان مادہ کے وسائل واسباب سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے ترقی کی منزل پائی جا سکے اور ایسا ہونا مسلسل کاوش وجدوجہد اور تحقیق وبحث کے ذریعے علم کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے ہی پر موقوف ہے اور اسلام اس سے ہرگز منع نہیں کرتا۔

اور جہاں تک معاشروں کے نظام ہائے امور میں تبدیلی کا مسئلہ ہے کہ ان میں آئے دن نئے نظام ہائے حکومت سامنے آتے ہیں مثلاً کبھی بادشاہت کا استبدادی نظام تو کبھی جمہوریت اور کبھی کمیونزم اور کبھی کچھ اور، تو یہ سب تبدیلیاں ان نظاموں میں پائی جانے والی خامیوں اور نواقص کے حوالہ سے ہوتی ہیں اور افرادِ بشر عملی طور پر آگاہ ہو جاتے ہیں کہ ان نظاموں میں انسانی معاشرہ کو مطلوبہ کمال تک پہنچانے اور اس کی حقیقی و بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی لہٰذا ان میں تبدیلی کا جذبہ انگڑائیاں لیتا ہے اور پھر ایک نظام کو چھوڑ کر دوسرے نظام کو اپنایا جاتا ہے لیکن یہ تبدیلی ان نظاموں کے ناقص و کامل ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ صحیح و غلط ہونے کی بناء پر ہوتی ہے (جبکہ عین ممکن ہے کہ وہ سب ہی غلط ہوں)۔ بنابریں اگر معاشرتی راہ وروش اور طرز زندگی، فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق استوار ہو یعنی معاشرتی عدل و انصاف، اور افرادِ معاشرہ اچھی تربیت کے سایہ میں مفید علم اور نیک عمل سے آراستہ ہو جائیں اور پھر خوش وخرم زندگی بسر کرتے ہوئے علم و عمل میں ترقی کے مراحل طے کر کے اپنی سعادت کی راہ پالیں اور روز بروز ترقی و تکامل میں اضافہ و وسعت سے مالا مال ہو رہے ہوں تو اس سے بڑھ کر انہیں معاشرتی طرزِ زندگی و نظام حیات کیا چاہیے ہوگا اور وہ کسی تبدیلی و انقلاب کے درپے کیوں ہوں گے؟ اس بناء پر یہ حقیقت واضح و آشکار ہوتی ہے کہ کوئی عاقل و دانشمند ہرگز یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا کہ انسان کے لئے ہر صورت اور ہر حال میں تبدیلی ضروری ہے خواہ وہ اس تبدیلی کی احتیاج نہ بھی رکھتا ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ مذکورہ بالا تمام امور میں تغیر و تبدل ممکن ہے اور یہ درست نہیں کہ ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مثلاً اعتقادات، اصول اخلاقیات وغیرہ، جبکہ ان سب میں تبدیلی معاشرتی حالات اور علاقائی تقاضوں کے باعث وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناگزیر ہو جاتی ہے لہٰذا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جدید دور کے انسان کا طرزِ تفکر، قدیم دور کے انسان کے طرزِ تفکر سے مختلف ہے، اسی طرح علاقائی طرزِ زندگی کے فرق کی وجہ سے افراد کے افکار و آراء اور نظریات میں فرق پایا جاتا ہے مثلاً خطہ ارضی کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں کے طرز تفکر اور راہ و روش یکساں نہیں، اسی طرح خادم و مخدوم، دیہاتی و شہری، مالدار و نادار، فقیر و غنی، اور اس طرح کے دیگر معاشرتی طبقات کے طرز زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، تو عوامل و اسباب کے مختلف ہونے سے افکار و آراء میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور زمانوں کی تبدیلی سے ان میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور نظریات و عقائد خواہ جس قدر پختہ ہوں وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی آنا ممکن بلکہ ناگزیر ہوتا ہے۔

اس سوال یا اعتراض کے جواب میں، ہم عرض کرتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں کرنا ایک صریح غلط فہمی کی بناء پر ہے اور

وہ یہ کہ انسانی علوم وآراء اوران کے لوازم ومتعلقات کا صحیح وغلط اور خیر وشر ہونا کسی قاعدہ کلیہ پر مبنی نہیں بلکہ نسبت واضافت کی بنیاد پر ہے، بنابرایں مبداء ومعاد سے تعلق رکھنے والے کلی معارف ونظریات اوراسی طرح کے عملی کلی نظریات مثلاً یہ کہ معاشرتی زندگی انسان کے لئے خیر وبہتر ہے اور یہ کہ عدل خیر ہے (یہ کلی احکام ہیں اس میں ان کے کسی مورد پر منطبق ہونے کا حوالہ ملحوظ نہیں) تو یہ احکام نسبت کے حوالہ سے بدلتے رہتے ہیں اور زمانوں، حالات وواقعات کی بناء پر ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

اس نظریہ کے غلط ہونے کو ہم اس کی متعلقہ بحث میں واضح طور پر بیان کر چکے ہیں اور اس کی کلیت کے نادرست ہونے کو ثابت کر چکے ہیں اور اس حقیقت کو آشکار کر چکے ہیں کہ اس طرح کا عقیدہ ونظریہ قطعی طور پر غلط ہے، وہاں بیان کردہ مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر میں تمام کلی نظری امور اور بعض کلی عملی آراء شامل نہیں یعنی اس کا دائرہ اس قدر وسیع نہیں کہ تمام نظری امور اور عملی آراء پر بھی اس کا اطلاق ہو سکے، اور اس کے کلی ہونے کی نفی کے لئے اس قدر کافی ہے کہ اگر اس نظریہ کے کلی وعام اور جامع ہونے کو درست مان لیا جائے تو اس سے خود اسی کے مطلق ہونے کا اثبات ہوگا جو کہ ہمارا مطلوب ہے (یعنی نسبت سے خالی ہونا)۔ اور اگر اسے مطلق کلیت کا حامل نہ مانا جائے بلکہ قضیہ جزئیہ تسلیم کیا جائے تو اس سے ایک قاعدہ کلیہ...... قضیۂ کلیۂ مطلق...... کا اثبات ہوگا، لہٰذا ہر صورت میں اس نظریہ کی کلیت باطل ہو جاتی ہے، اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ بات درست ہو کہ ''ہر رائے ونظریہ کا کسی نہ کسی دن تبدیل ہونا ضروری ہے'' تو خود اس نظریہ کا کسی دن تبدیل ہونا بھی ضروری ہوگا اور اس میں تبدیلی لا کر یوں کہنا پڑے گا کہ ''بعض آراء ونظریات میں ہرگز تبدیلی نہیں آنی چاہیے''، تو اس سے ثابت ہوا کہ مذکورہ نظریہ کلیت نہیں رکھتا، (غور کریں)

(۱۱) آیا اسلامی احکامات انسان کو سعادت مند بنا سکتے ہیں؟

ممکن ہے کہا جائے کہ اسلامی احکام نزول قرآن کے زمانے میں موجود تمام افرادِ بشر کے لئے جامع ومکمل ضابطۂ حیات کی صورت میں تھے کہ جن سے اس دور کے انسانی معاشرہ کو اس کی سعادت سے ہمکنار کرنا اور تمام افراد کی آرزوہائے زندگی کی تکمیل ممکن تھی اور وہ اس مقصد کے لئے کافی ووافی تھا، لیکن رفتارِ زمانہ اور گردشِ روزگار نے انسانی زندگی کے طور طریقوں کو یکسر بدل دیا لہٰذا تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت موجودہ دور میں جس صورت میں ہے اس کی نظیر چودہ سو سال پہلے کی سادہ زندگی سے کوئی مشابہت ومماثلت نہیں رکھتی کیونکہ اس دور کی زندگی نہایت معمولی ابتدائی طبیعی وسائل سے استفادہ کرنے تک محدود تھی جبکہ انسان نہایت وسیع جدوجہد اور دشوار ترین مراحل طے کرنے کے بعد ترقی وتکامل اور معاشرتی ارتقاء کے اس بلند درجہ تک پہنچ چکا ہے کہ اگر اس کا موازنہ صدیوں پہلے انسان کی زندگی وحالات سے کیا جائے تو ایسا لگے گا جیسے دو متضاد قسم کی مخلوق کے درمیان موازنہ کیا جا رہا ہے، تو اس صورتحال میں کس طرح ممکن ہے کہ جو قوانین اس دور کے

لوگوں کی زندگی کے لئے وضع کئے گئے اور اس دور کے تقاضوں کے مطابق ان کی تدوین و تشکیل عمل میں لائی گئی وہ موجودہ دور کے افرادِ بشر کی نہایت اعلیٰ زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں؟ اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان دو مختلف طرز کی حامل زندگیوں میں سے ہر ایک، دوسری کا بوجھ اٹھا سکے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں زمانوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے اس کا تعلق طرزِ زندگی سے ہے نہ کہ بنیادی امور سے! گویا وہ مصداق اور مورد کا فرق ہے اصل و اساس کا نہیں، اس مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں غذا کا محتاج ہے کہ جس سے اپنا پیٹ بھر سکے، لباس کا محتاج ہے جس سے اپنا بدن ڈھانپ سکے، مکان کا محتاج ہے جس میں سکونت پذیر ہو سکے، وسائل و اسباب کا محتاج ہے جن سے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو یقینی بنا سکے، معاشرہ کا محتاج ہے کہ جس میں اپنے ہمنوع افراد کے ساتھ مل کر زندگی بسر کر سکے، زندگی کے ازدواجی، تجارتی، صنعتی، عملی اور دیگر امور کی تکمیل کے لئے متعلقہ و مربوطہ وسائل و روابط کا محتاج ہے، تو یہ تمام ضروریات و حاجات ایسی بنیادی چیزیں ہیں جو ہمیشہ ایک ہی صورت کی حامل ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی اور جب تک انسان انسانیت کی صفت سے متصف ہوتا ہے اس میں اس فطرت اور تخلیق کے بنیادی تقاضے یکساں باقی ہوتے ہیں کیونکہ ان سب کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، لہٰذا اس حوالہ سے پہلے دور کا انسان اور موجودہ دور کا انسان برابر ہیں دونوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، اگر ان دونوں انسانوں میں کوئی فرق و اختلاف پایا جاتا ہے تو وہ ان وسائل و اسباب کے حوالہ سے ہے جن سے استفادہ کرتے ہوئے انسان اپنی مادی زندگی کے امور کی تکمیل اور حالات کی پیداوار ضرورتوں و تقاضوں کو پورا کرتا ہے، مثلاً پہلے دور کا انسان اپنی غذا میں میوے و پھل، سبزی جات اور شکار کیا ہوا گوشت نہایت سادہ طریقہ سے استعمال کر کے زندگی گزارتا تھا جبکہ آج اس کی گوں ناگوں کھانے پینے کی مختلف ذائقوں کی حامل اشیاء موجود ہیں جن کے استعمال سے اس کی طبع وجودی لذت اٹھاتی ہے، اور اس طرح مختلف رنگ ہیں جن کے مشاہدہ سے اس کی قوتِ بصارت لطف اندوز ہوتی ہے، اور خوش ذائقہ چیزیں ہیں جن سے وہ مزے لیتا ہے اور ایسی عمدہ کیفیات ہیں جن سے اس کی زندگی نہایت دلچسپ ہو چکی ہے، اسی طرح لاتعداد ایسے امور و احوال ہیں جو موجودہ دور کے انسان کی زندگی میں یکسر تبدیلی کا سبب بنے ہیں، لیکن اس تمام واضح اختلاف و فرق کے باوجود دوسرا انسان پہلے انسان سے اس بات میں یکساں ہے کہ یہ سب کچھ ایسی بنیادی ضرورتوں سے عبارت ہو جو انسان کو انسان ہونے کی حیثیت میں ناگزیر ہیں اور ایسی غذا ہو جو انسان کو بھوک پیاس اور دیگر شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ضروری و لازمی ہے، اس بناء پر جو کلی اعتقادات پہلے دور کے انسان کے تھے وہ زمانہ کی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوئے اور ایک دور سے دوسرے دور کے انسان کی فطری ضرورتوں میں فرق نہیں آیا بلکہ بعینہٖ یکساں رہے اور پہلے اور دوسرے دور کے انسان کی بنیادی زندگی کے تقاضوں میں کوئی فرق نہیں آیا، اسی طرح وہ کلی و جامع قوانین و احکام جو اسلام میں وضع و مقرر کئے گئے ہیں وہ انسانی فطرت کے عین مطابق اور اس کی سعادت کے تمام تقاضوں کی تکمیل کے

ضامن ہیں ان میں وسائل کی تبدیلی اصل فطرت میں تبدیلی وانحراف نہ آنے کی شرط کے ساتھ ان احکام وقوانین کو تبدیل نہیں کر سکتی لیکن اگر اصل فطرت ہی بدل جائے تو پھر اسلامی اقدار واحکام اس سے ہرگز ہم رنگ نہیں ہو سکتے اور اس میں قدیم و جدید دونوں زمانے برابر ہیں۔

اور وہ جزئی احکام جو حالات کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت جلد تغیر وتبدل کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً مالیات، دفاع، باہمی رابطوں کی آسانی، ذرائع ابلاغ وارتباط اور شہری زندگی کے امور سے تعلق رکھنے والے احکامات وغیرہ تو وہ سب حاکم اور سربراہِ مملکت کے فیصلوں اور تشخیص پر موقوف ہوتے ہیں، وہی ان کی بابت موزوں ومناسب اقدامات کرتا ہے کیونکہ حاکم وسربراہِ مملکت کا مقام ومرتبہ اپنے دائرہ اقتدار میں اسی طرح ہوتا ہے جیسے کسی گھر میں گھر والے شخص کا! حاکم وسربراہِ مملکت کو اسی طرح اختیار حاصل ہوتا ہے جیسے گھر والے کو اپنے گھر کے بارے میں فیصلے واقدامات کرنے کا اختیار حاصل ہے کہ جو فیصلہ کرے اور حکم جاری کرے اور گھر میں جس طرح کا نظم ونظام مقرر کرے اور جس طرح کی ترتیب امور دے یہ سب اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اسی طرح حاکم وسربراہ مملکت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ معاشرہ کے داخلی وخارجی امور کی بابت اقدام کرے اور جنگ وصلح اور مالی وغیر مالی تمام امور میں بنیادی فیصلے کرے کہ جن میں معاشرہ کی بہتری کی ضمانت پائی جاتی ہو البتہ یہ سب کچھ اہل اسلام سے مشورہ ومشاورت کے بعد ہو جیسا کہ اس سلسلہ میں واضح ارشادِ الٰہی ہے:

○ ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ''

(اور لوگوں سے مشورہ کرو، پس جب فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو)......سورۂ آل عمران آیت:۱۵۹

اس حکم کا تعلق زندگی کے عمومی مسائل سے ہے۔ یہ احکام اور جزئی اقدامات وفیصلے معاشرہ کی مصلحتوں اور اسباب کی تبدیلی کے باعث تبدیل ہوتے رہتے ہیں کیونکہ اسباب اور معاشرتی مصلحتوں میں ہمیشہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جبکہ وہ احکام خداوندی جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں ان میں اس طرح کی تبدیلیاں نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کے منسوخ ہونے کی ضرورت پڑتی ہے، احکامِ خداوندی میں نسخ کی تفصیلی بحث دوسرے مقام پر ہو گی۔

(۱۲) اسلامی معاشرہ میں حاکم کا معیار اور سیرت؟

صدرِ اسلام میں معاشرہ کی باگ ڈور اور حاکمیت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے، خداوند عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت وپیروی تمام لوگوں پر واجب ولازم قرار دی اور آنحضرتؐ کے اتباع کو فریضہ بنایا جس کا ذکر قرآن مجید میں واضح وصریح الفاظ میں یوں فرمایا:

سورۂ تغابن آیت: ۱۲

○ ''وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ''

(اور تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی)

سورۂ نساء آیت: ۱۰۵

○ ''لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ''

(تا کہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اس چیز کے ذریعے جو اللہ نے آپ کو دکھائی ہے)

سورۂ احزاب آیت: ۶

○ ''اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ''

(نبی مومنوں پر ان کی اپنی نسبت زیادہ حق رکھتے ہیں)

سورۂ آل عمران آیت: ۳۱

○ ''قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ''

(کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا)

یہ اور ان کے علاوہ متعدد دیگر آیات ایسی ہیں جن میں اسلامی معاشرہ آنحضرت ﷺ کی عمومی اور مطلق و جامع حاکمیت وولایت کے بعض یا تمام امور وخصوصیات مذکور ہیں،

اس موضوع کے بارے میں بحث وتحقیق کرنے والے ارباب دانش کو اپنے مقصود ومطلوب کے حصول کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کا بغور مطالعہ کرے اور ہر گوشہ سے اس پر نگاہ کرے، اس کے بعد ان تمام آیات مبارکہ پر غور کرے جن میں اخلاقیات، عبادات، معاملات، سیاسیات، معاشرت وباہمی روابط سے تعلق رکھنے والے احکام ودستورات بیان کئے گئے ہیں تو اسے اپنے مقصود کی حقانیت کے واضح ومحکم دلائل تک رسائی پانا یقینی ہو جائے گا کہ جس کے بعد اسے کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہ رہے گی کیونکہ ان آیات مقدسہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اسلوب سخن اپنایا گیا ہے وہ بیان ومقصود میں کافی ووافی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسرے کلام وبیان میں نہیں مل سکتی۔

یہاں ایک نکتہ یہ بھی توجہ طلب ہے اور ارباب تحقیق کے لئے اسے اہمیت کی نگاہ سے دیکھنا لازم وضروری ہے کہ وہ آیات مبارکہ جن میں عمومی طور پر عبادات، جہاد، حدود وقصاص اور دیگر امور کی بابت احکام مذکور ہیں ان کا روئے سخن عام اہل ایمان کی طرف ہے نہ کہ صرف آنحضرتؐ کی طرف! آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ نساء، آیت: ۷۷

○ ''وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ''

(اور نماز قائم کرو)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۵

○ ''وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ''

(اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۳

○ ''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ''

(تم پر روزے واجب کر دیئے گئے ہیں)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۴

○ ''وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ''

(اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو نیکی کی دعوت دیں اور امر بالمعروف کریں اور نہی ن المنکر کریں)

سورۂ مائدہ، آیت: ۳۵

○ ''وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ''

(اور اس کی راہ میں جہاد کرو)

سورۂ حج، آیت: ۷۸

○ ''وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ''

(اور اللہ کے لئے جہاد کرو جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے)

سورۂ نور، آیت: ۲

○ ''الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ''

(اور زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو)

سورۂ مائدہ آیت: ۳۸

○ ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا''

(اور چور مرد اور چور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۷۹

○ ''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ''

(اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے)

سورۂ طلاق، آیت: ۲

○ ''وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ''

(اور تم اللہ کے لئے گواہی دو)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۳

○ ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا''

(اور تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور اپنی صفوں میں جدائی نہ آنے دو)

سورۂ شوریٰ، آیت: ۱۳

○ ''اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ''

(یہ کہ دین پر قائم رہو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۴۴

○ ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝''

(اور محمد نہیں ہیں مگر رسول، ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں، پس اگر وہ مر جائیں یا قتل کئے جائیں تو تم اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے اور جو شخص اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جائے وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور بہت جلد اللہ شکر کرنے والوں کو جزاء عطا کرے گا)

یہ اور اس طرح کی دیگر کثیر آیات مبارکہ ایسی ہیں جن سب میں دین کی اجتماعی روش واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس پر ایمان لانے کا حکم دیا اور اپنے بندوں کے لئے اس کے انکار کو پسند نہیں کیا، اور تمام افرادِ بشر سے دین پر عمل کرنے کی تاکید کی، لہٰذا اس روش پر مبنی جو معاشرہ وجود میں آئے گا اس میں تمام افراد دین واحکام خداوندی پر عمل کرنے میں یکساں ہوں گے اور معاشرتی امور میں وہی بااختیار ہوں گے اس میں کسی کو کسی پر اختصاص حاصل نہ ہوگا اور معاشرتی امور میں آنحضرت ﷺ سمیت ہر شخص ذمہ داری کا حامل ہوگا چنانچہ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۵

○ ''اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ''

(میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کہ تم ایک دوسرے ہی سے ہو)

اس آیت مبارکہ کے اطلاق اور عمومیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کے افراد جس طرح اپنے وجود میں آنے اور تکوینی وتخلیقی حوالوں سے اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے وابستہ اور اس کے مرہونِ منت ہیں اسی طرح احکام ودستورات کے

حوالہ سے بھی اسی سے مرتبط و مربوط ہیں اور خداوند عالم کسی بھی فرد کے کسی بھی عمل کو ضائع نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سورۂ اعراف، آیت: ۱۲۸

○ ''اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ''

(بے شک زمین کا مالک اللہ ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور نیک انجام تقویٰ والوں کے لئے ہے)

ہاں، حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی امتیازی خصوصیات لوگوں کو دین الٰہی کی طرف بلانا، انہیں حق کا سیدھا راستہ دکھانا اور ان کی درست تربیت کرنا ہے، اس حوالہ سے خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورۂ جمعہ آیت: ۱۲

○ ''یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ''

(ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تذکیہ نفس کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کے امور کی بابت اقدام کرنے، دنیا وآخرت میں ان کی ولایت وسرپرستی کرنے اور زندگی بھر ان کی امامت وسربراہی کرنے کے لئے متعین کیا گیا ہے۔

لیکن کسی بھی اہل بحث وتحقیق کو اس بات سے غافل نہیں ہونا چاہیے کہ اس طرح کی ولایت وامامت کا نظام اس سلطنت وبادشاہت کے نظام سے قطعی مختلف ہے جس میں مسندِ اقتدار پر براجمان شخص خدا کے مال کو اپنے تخت وتاج کی حفاظت کے لئے غنیمت کا مال قرار دیتا ہے اور خدا کے بندوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے اور ان کے ساتھ جس طرح اس کی مرضی ہو اس کے مطابق سلوک کرتا ہے اور جو چاہتا ہے ان پر حکم نافذ کردیتا ہے حالانکہ یہ طرز عمل ان اصولوں کے بھی منافی ہے جو صرف اور صرف مادی استفادہ کی بنیاد پر استوار ہیں اور ان میں مادی فوائد کے علاوہ کوئی چیز ملحوظ ومقصود نہیں مثلاً ڈیموکریسی وغیرہ، کیونکہ اس طرح کے طرز عمل اور نظام میں اسلامی نظام وآئین زندگی سے کسی بھی حوالہ سے مماثلت ومشابہت نہیں پائی جاتی، بلکہ اس طرح کے نظامہائے معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی وخامی یہ ہے ...... جس سے وہ اسلامی نظامِ حیات سے قطعی مختلف ہیں ...... کہ ان میں چونکہ صرف مادی استفادہ ہی ملحوظ ومقصود بلکہ اصل واساس قرار پایا ہے لہٰذا ان کے قالب ہی میں بندگانِ خدا کو بندگی کے بندھنوں میں جکڑنے اور ان کا استحصال کرتے ہوئے ان سے غلاموں جیسا سلوک کرنے کو بنیادی حیثیت دی گئی اور استثمار کی روح پھونکی گئی جو کہ انسانی استکبار وآمریت کے سوا کچھ نہیں کہ جس میں ہر چیز پر انسانی ارادہ کا تسلط ہوتا ہے اور انسان کا عمل بلکہ خود انسان ہی انسان کا اسیر ہوجاتا ہے اور ایسی روش اپناتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس پر اپنے اقتدار وتسلط کو یقینی بناتے ہوئے اسے اپنی مرضی وخواہش کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور کرے اور اپنی ذات کے دائرہ میں اسے پابند کر کے اس پر حکمرانی کرے، اور یہ بعینہٖ وہی سلطنتی استبداد ہے جو سابقہ زمانوں میں

معاشروں پر حاکم تھا اور اب وہی سلطنتی استبداد ہمارے زمانہ میں جدید تہذیب و تمدن پر مبنی معاشرہ کے روپ میں سامنے آیا ہے کہ جس میں طاقتور طبقات کی طرف سے کمزور اقوام پر مظالم ڈھانا اور ان پر جبر و جور اور آمرانہ تسلط قائم کرنا معمول کی باتیں ہیں اور یہی وہ حالات ہیں جو سابقہ ادوار کی تاریخ میں محفوظ ہیں کہ جن کا مطالعہ ہمیں ان حالات کے پس منظر و حقائق سے آگاہی دلاتا ہے، تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ مصر کے فرعونوں اور روم و فارس کے قیصری و کسروی سلطنتوں کے فرمانرواؤں میں سے جس کا دور بھی دیکھیں اس میں وہ اپنے کمزور عوام کو اپنی آمریت کا نشانہ بناتا تھا اور ہر ممکن طریقے سے رعایا کو اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرتا تھا اور اگر کبھی اس پر اعتراض ہوتا تو وہ اس کے جواب میں...... اگر اس کا جواب دیتا...... یوں کہتا تھا کہ اس طرح ہی سلطنت کے امور اور مملکت کی اصلاح کا نظام قائم رہ سکتا ہے اور حکومت کی بنیادیں مضبوط ہوسکتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آمرانہ اقدامات کا جواز یہ پیش کرتا تھا کہ ایسا کرنا اس کے اقتدار کا حق اور تقاضا و ضرورت ہے، وہ اپنی بات منوانے کے لئے تلوار اور طاقت کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا بلکہ طاقت کے استعمال ہی سے اپنی حاکمیت کو ثابت کرنے میں کوشاں رہتا تھا، ان حالات کے تناظر میں اگر آپ عصر حاضر میں رائج سیاسی نظاموں کو حکام و رعایا کے درمیان پائے جانے والے روابط و تعلقات پر غور سے نگاہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ طاقتور طبقے، کمزور طبقوں کو کس طرح اپنے مظالم کا نشانہ بناتے ہیں اور اپنی غلط چاہتوں کا اسیر کرتے ہیں، اسی سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ تاریخ اپنے واقعات کے ساتھ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور ہمیں اپنی فکر و تصویریں دکھا کر ہمارے دور کا مذاق اڑا رہی ہے اور اس کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے البتہ شخصی استبداد کی صورت بدل کر اب موجودہ اجتماعی شکل میں اپنے آپ کو دہراتی ہے جبکہ اس میں اصل و اساس وہی اصل و اساس ہے، وہی روح اور وہی نفسانی خواہشیں ہیں لیکن اسلام کا نظام حیات اس سے قطعی مختلف اور شخصی آمریتوں کی وحشت ناک صورتوں سے مبرا ہے اور اس حقیقت کا واضح ثبوت سیرت نبوی ﷺ اور عہد رسالت کی فتوحات اور معاہدوں سے ملتا ہے کہ جن میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے انسانیت نواز اسلامی و فطری اصولوں کی پاسداری کو مقدم اور یقینی بنایا۔

موجودہ نظامہائے معاشرت اور اسلامی نظام معاشرت کے درمیان ایک فرق یہ ہے کہ موجودہ نظاموں میں افرادِ معاشرہ کے درمیان طبقاتی گروہ بندیاں پائی جاتی ہیں جو کہ معاشرہ کی تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہیں کیونکہ مال و دولت اور جاہ و منزلت...... اقتدار و منصب...... وغیرہ جیسے امور کو طبقہ بندیوں کی بنیاد قرار دیا جائے تو معاشرے میں فتنہ و فساد کا طوفان امڈ آئے گا اور انہی حوالوں سے مختلف طبقات کا جنم لینا بالآخر معاشرہ میں انسانی معیار ہائے فضیلت پر پانی پھیر دینے کا باعث بنتا ہے لیکن جہاں تک اسلامی معاشرہ کا تعلق ہے تو اس میں افراد کی ہم رنگی اس حد تک وسعت رکھتی ہے کہ کسی کو کسی پر تقدم و برتری اور فخر و بزرگی کا حق حاصل نہیں البتہ افراد کے درمیان طبع انسانی کی بنیاد پر جو فرق ممکن ہے اور اس سے ہرگز انکار نہیں ہوسکتا وہ صرف اور صرف تقویٰ کے حوالہ سے ہے کہ جس کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے مربوط ہے لوگوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

○ ''یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ''

(اے لوگو، ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شعبے اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، یقیناً تم میں سے زیادہ عزت و بزرگی والا شخص اللہ کے نزدیک وہی ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہو)

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا،

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۴۸

○ ''فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ''

(تم نیکیوں میں سبقت لو)

بنا برایں اسلامی معاشرہ میں حاکم و عوام، فرمانروا اور عایا، امیر و مامور، رئیس و مرؤوس، آزاد و غلام، مرد و عورت، مالدار و نادار اور چھوٹا و بڑا سب ہی قانون کی پاسداری کے حوالہ سے یکساں و مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور معاشرتی امور و روابط میں ان کے درمیان کسی قسم کا طبقاتی فرق نہیں پایا جاتا بلکہ آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے معاشرتی نظام میں تمام افراد کو برابر حیثیت دی اور کسی کو کسی پر قانون کی پاسداری و عملداری کے حوالہ سے امتیاز نہیں دیا۔

اسلامی نظام معاشرت کی دیگر نظاموں سے ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حکمران طبقہ معاشرتی امور میں کسی طرح سے دوسرے افراد سے مختلف و ممتاز نہیں بلکہ سب کی حیثیت برابر ہے، قانون کی پاسداری و عملداری میں سب یکساں ہیں اور ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو خیر کی دعوت دے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔

بہر حال اسلامی نظام اور دیگر معاشرتی نظاموں میں مختلف حوالوں سے فرق پایا جاتا ہے کہ ہر اہل فکر و نظر اس سے بخوبی آگاہ و مطلع ہے اور وہ کسی محقق سے پوشیدہ نہیں۔

البتہ یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں بخوبی آشکار تھا اور آپ ﷺ نے معاشرہ میں قانون کی حکمرانی کو یقینی بنایا لیکن آپ ﷺ کی رحلت کے بعد اہل اسلام دو حصوں میں بٹ گئے، اکثر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں خلیفہ و حکمران کا انتخاب عام مسلمان کریں گے جبکہ شیعہ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے حاکم و فرمانروا کا انتخاب عام لوگ نہیں بلکہ وہ خود اللہ و رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منصوص و متعین ہو گیا ہے جو کہ بارہ امام ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ علم الکلام کی کتب میں موجود ہے، یعنی عام مسلمانوں کا نظریہ انتخاب کی بنیاد پر خلیفہ و حکام کا تعین ہے اور شیعوں کا نظریہ انتصاب اور خدائی فیصلہ پر مبنی ہے کہ اس تعین کا حق اللہ اور رسول ﷺ ہی کو حاصل ہے۔

بہر حال اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد اور امام کے زمانہ غیبت میں...... جیسا

کہ ہمارے اس دور میں ہے...... معاشرتی امور کے ذمہ دار افراد کا انتخاب عام اہل اسلام کرتے ہیں لیکن دنیوی امور میں معاشرتی حکمرانی کا جو معیار قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ معاشرہ کے حاکم کا تعین سیرت نبوی ﷺ کی بنیاد پر ہو جو کہ نظام امامت سے عبارت ہے نہ کہ ملوکیت و بادشاہت اور امیر اطوری وغیرہ! اور اس میں قوانین کی پاسداری کا عمل کسی طرح کی تبدیلی کے بغیر ہو اور یہ کہ حالات و تقاضائے روزگار کے مطابق احکام و دستورات شرعیہ کے علاوہ دیگر امور میں مشاورت کے ساتھ اقدام کیا جائے، ان حقائق کا ثبوت ان تمام مذکورہ آیات مبارکہ سے ملتا ہے جن میں آنحضرتؐ کی ولایت وحاکمیت کا تذکرہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ درج ذیل آیت سے مزید تاکید ہوتی ہے:

سورۂ احزاب، آیت: ۲۱

○ ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ''

(بے شک تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے)

(۱۳) اسلامی مملکت کی سرحدیں اعتقادی ہیں جغرافیائی نہیں

اسلام نے معاشرہ کی تشکیل میں قومیت کی بنیاد پر گروہ بندیوں کی سختی سے ممانعت کی ہے اور معاشرے میں اس کی اثر گزاری کے اسباب پر قدغن لگاتے ہوئے افراد کی اجتماعی حیثیت کے تحفظ کو یقینی بنانے پر زور دیا ہے کیونکہ قومیت کی اصل و اساس بدوی طرزِ فکر اور صحرائی سوچ ہے کہ جس میں زندگی گزارنے کے طور واطوار قبیلوں اور علاقوں سے وابستگی کے مظاہر ہوتے ہیں اور یہی دو عوامل یعنی بدوی وصحرائی زندگی اور علاقائی وجغرافیائی فرق ہی آب و ہوا، سردی و گرمی اور سرسبز وشادات اور بنجر وغیر آباد زمینی حوالوں کے نتیجہ میں نوع انسانی کے شعبوں، قبیلوں اور رنگ و زبان کی بنیاد پر وجود میں آنے والے گروہوں کی تشکیل وصورت بندی کا سبب ہوا...... اس سلسلہ میں مربوطہ مقام پر تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے......، پھر یہی دو عوامل اس بات کا سبب ہوئے کہ ہر قوم نے کرۂ ارضی کے کسی حصہ کو آباد کر کے اس میں اپنی کوششوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے اپنے مخصوص طور طریقے اپنا کر اس حصہ کو اپنے ''وطن'' سے موسوم کر دیا کہ جس سے محبت والفت کا رشتہ قائم کرنے لگے اور اس کے دفاع میں اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لانے لگے، یہی بات انہیں اپنی ان طبعی ضرورتوں کو پورا کرنے کی راہ پر لائی جن کا پورا کرنا فطرت کے بنیادی تقاضوں میں شامل ہے لیکن اس میں اصل انسانی فطرت کے منافی بات یہ شامل ہوگئی کہ نوع انسانی کی اجتماعی زندگی کو وحدت کی لڑی میں پرونے سے دوری اختیار ہوئی جبکہ انسانی فطرت کا بنیادی تقاضہ ہی یہ ہے کہ نوع بشر معاشرتی اکائی کی حامل ہو کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ طبیعۃ الوجود تمام مختلف قوتوں کے یکجا ہونے اور ان کی باہمی ترتیب وترکیب کے ساتھ ایک ہی اکائی میں پرو دیئے جانے کی خواہاں ہوتی ہے تاکہ اس طرح صحیح ودرست طریقہ سے اپنی

اعلیٰ اغراض واہداف کو حاصل کر سکے اور یہ بات اصل مادہ کے کسی بھی وجودی عنصر کے قالب میں ڈھلنے کی کیفیات سے بخوبی معلوم ہوتی ہے اور اس کا مشاہدہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ ان تدریجی مراحل میں نبات، حیوان اور پھر انسان کی وجودی صورتگری کے تقاضے اپنی تکمیل کی جانب بڑھتے ہیں۔ (ممکن ہے مؤلف کے اس بیان سے انسانی وجود کے ارتقائی مراحل کا اشارہ سمجھا جائے اور اس کے وجودی تشخص کی نوعی حیثیت کے حوالہ سے غلط فہمی پیدا ہو جبکہ اصل حقیقت اس سے مختلف ہے اور انسان کی وجودی شناخت اپنی اصل ذاتی ونوعی حقیقت وحیثیت کی بناء پر ہے مادہ کی ارتقائی صورت پر نہیں کہ جسے جماد پھر نبات پھر حیوان اور پھر انسان تک لے جایا جائے مؤلف نے مادہ کے ارتقائی سفر کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ نوعی تشخص کی بحث میں شامل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مستقل مخلوق پیدا کیا ہے اور اس میں مادہ کے ارتقائی مراحل کا ذکر نوعی فرق سے قطعی مختلف ہے، مترجم) جہاں تک ''وطن'' کے حوالہ سے قوموں کی شعبہ بندی کا تعلق ہے تو اس سے جہاں ایک ''اہل وطن'' گروہ کے افراد ایک معاشرہ میں اکٹھے ہوتے ہیں اور ان میں اجتماعی اکائی پیدا ہوتی ہے وہاں وہ دیگر ''اہل وطن'' گروہوں کے معاشروں سے جدا ہو جاتے ہیں اور ان کی حیثیت اس اکائی کی ہو جاتی ہے جو ایک وجود کے باوجود روح اور جسم میں جدائی کے حامل ہیں کہ ایک ''وطن'' کی وحدت دیگر وطنی وحدتوں کے تناظر میں تفرقہ کا سبب بنتی ہے جس کے نتیجہ میں اصل انسانیت، وحدت واجتماعیت سے کوسوں دور ہو کر تفرقہ و پراگندگی کے دلدل میں پھنس جاتی ہے جبکہ وہ اس سے دوری اختیار کرتی تھی، اور اب نئی وجود میں آنے والی اکائی دیگر نئی وجود میں آنے والی اکائیوں (یعنی معاشرتی اکائیوں) سے اسی طرح برتاؤ کرتی ہے جس طرح انسان کائنات کی دیگر اشیاء سے سلوک کرتا ہے اور انہیں اپنے استعمال میں لانے کے ہر ممکن طریقے اختیار کرتا ہے مثلاً ان کی وجودی توانائیوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے مفادات کے حصول وتحفظ کو یقینی بناتا ہے کہ جسے آج کی اصطلاح میں استعمار واستحصال کہا جاتا ہے چنانچہ اس دنیا کے آغاز سے اب تک مسلسل تجربات نے اس تلخ حقیقت کو ثابت کر دیا ہے اور ہم نے سابقہ بحثوں میں جن آیات مبارکہ کو ذکر کیا ہے ان سے بھی اس کا واضح اور کافی ووافی ثبوت فراہم ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسلام نے گروہ بندیوں، خودساختہ امتیازات اور تفرقہ بازیوں کی نفی کرتے ہوئے ان پر سرخ لکیر پھیر دی ہے اور معاشرہ کی اصل واساس قومیت، نسل، وطن وغیرہ کی بجائے عقیدہ ونظریہ کو قرار دیا ہے یہاں تک کہ زوجیت و قرابتداری جیسے امور میں بھی ایک دوسرے کے وجود سے استفادہ وبہرہ مندی اور میراث میں بھی مکان وطن وغیرہ کی بجائے عقیدۂ توحید میں اشتراک کو اصل معیار مقرر کیا ہے، چنانچہ اس کی بہترین مثال بلکہ عمدہ شواہد میں سے ایک یہ ہے کہ ہم اس مقدس دین کے احکام ودستورات پر جب نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے کسی بھی موضوع ومسئلہ میں عدم توجہ کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی سلسلہ کو مہمل چھوڑا ہے لہٰذا اسلامی معاشرہ کا فرض ہے کہ دین کی عظمت وغلبہ اور پرچم اسلام کی سربلندی کے زمانہ میں اقامہ دین کا بھرپور اہتمام کریں اور اس کی بابت تفرقہ کا شکار نہ ہوں اور اگر کبھی ایسا دور آئے کہ دشمنانِ دین غلبہ پالیں اور اہل دین کو مغلوب وکمزور کر دیں تو اسلامی معاشرہ کے افراد احیاء دین اور اعلاء کلمہ حق کے لئے

مقدور بھر اقدامات بجالائیں یہاں تک کہ اگر ایک مسلمان بھی باقی رہے تو اس پر لازم وضروری ہے کہ وہ دینی تعلیمات کو اپنی زندگی کی اصل واساس قرار دے کر ان پر عمل پیرا ہو اور جس قدر ممکن ہو دین پر عمل کرے اور اس سے وابستہ ہو خواہ دل میں مضبوط عقیدہ رکھنے اور اپنے واجبات وفرائض ادا کرنے میں اشاراتی روش اختیار کرنے کی صورت میں کیوں نہ ہو۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اس طرح ہوئی ہے کہ اس کی بقاء ہر حال اور ہر کیفیت میں ممکن ہے خواہ حاکمیت کی صورت میں یا محکومیت کی صورت میں! غالبیت کی صورت میں یا مغلوبیت کی صورت میں! ترقی کی صورت میں یا تنزلی کی صورت میں! ظاہر بظاہر یا مخفی و پوشیدہ! طاقت کے ساتھ یا کمزوری کے ساتھ! ہر حالت میں اس کا وجود امکان پذیر ہے چنانچہ اس سلسلہ میں وہ قرآنی آیات مبارکہ جن میں تقیہ کا حکم مذکور ہے بہترین ثبوت فراہم کرتی ہیں مثلاً:

سورۂ نحل، آیت: ۱۰۶

○ ''مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ''

(جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس سے انکار کرے، مگر وہ کہ جسے مجبور کیا گیا ہو جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو)

سورۂ آل عمران، آیت: ۲۸

○ ''اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً''

(مگر یہ کہ تم ان سے جس طرح بھی ڈرتے ہو)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۲

○ ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ''

(اے ایمان والو! تقوائے الٰہی اختیار کرو جس طرح اس کے تقویٰ کا حق ہے، اور تم نہ مرنا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں!)

سورۂ تغابن، آیت: ۱۶

○ ''فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ''

(پس تم جس قدر کرسکو تقوائے الٰہی اختیار کرو)

(۱۴) اسلام تمام امور میں اجتماعی دین ہے

اسلام کے اجتماعی دین وآئین ہونے کا ثبوت قرآنِ مجید کی آیت مبارکہ ''وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (اور تم باہمی صبر اور ربط اختیار کرو اور تقوائے الٰہی اپناؤ تا کہ تم فلاح وکامیابی سے ہمکنار ہوسکو) کہ جس کی تفسیر پہلے

ذکر ہو چکی ہے اور دیگر کثیر آیات میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی صفت ہونا اس کے تمام احکام و دستورات اور تعلیمات سے بخوبی ثابت ہوتا ہے البتہ ہر موضوع اور مورد میں اجتماعیت کا معنی و مفہوم اس موضوع و مورد سے مناسبت و موزونیت کا حامل ہوتا ہے اور اسی حد تک ہی تصور کیا جا سکتا ہے کہ جس میں اس کا عملی صورت میں ڈھلنا امکان پذیر ہو اور اس سے مطلوبہ ہدف تک رسائی و عملی آمادگی خارج از امکان نہ ہو، بنا برایں اس سلسلہ میں بحث و تحقیق کرنے والے اہل دانش ارباب فکر و نظر پر لازم و ضروری ہے کہ وہ اپنے تحقیقی عمل میں دونوں ہی پہلوؤں کو ملحوظ رکھیں:

(۱) مختلف موارد میں احکام کا اجتماعی صفت ہونا مختلف صورتوں کا حامل ہے۔

(۲) اجماعی احکام میں واجب وغیر واجب کا فرق:۔

ان دونوں پہلوؤں کے تناظر میں ہر محقق مطلوبہ نتیجہ حاصل کر سکتا ہے چنانچہ پہلے حوالہ سے بحث کرتے ہوئے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خداوند عالم نے معاشرہ کی تشکیل میں جو اجتماعی احکام و دستورات صادر فرمائے ہیں ان میں سے ایک جہاد ہے کہ جو براہِ راست فرمان ہے اور اس کا دائرہ دفاع کی کامیابی تک وسعت رکھتا ہے، یہ اجتماعی صفت ہونے کی ایک صورت ہے، دوسرے حوالہ سے روزہ اور حج کے احکام ہیں کہ جو استطاعت والے شخص پر لاگو ہوتے ہیں یعنی وہ شخص جو ان واجبات کی ادائیگی کر سکتا ہو کہ ان اعمال کی لازمی صورت لوگوں کا روزوں اور حج میں اکٹھا ہونا ہے اور اس کی تکمیل عیدین (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) کی ادائیگی کی شکل میں ہے کہ جس میں نماز کی ادائیگی کا حکم ہے، اور یومیہ نمازوں کو واجب عینی قرار دیا کہ ہر مکلف پر ان کا بجالانا لازمی ہے لیکن ان میں باجماعت ادائیگی لازمی نہیں اور اس کی تلافی و تدارک ہر ہفتہ نماز جمعہ کی باجماعت ادائیگی کے ضروری ہونے کی صورت میں ہے کہ ہر جمعہ کو اسے ادا کیا جائے اور اس میں چار فرسخ کا فاصلہ شرط ہے یعنی چار فرسخ کے فاصلے پر رہنے والے پر نماز جمعہ واجب ہے جو کہ باجماعت (اجتماعی صورت میں) ہے، تو یہ ہے احکام کے اجتماعی صفت ہونے کی دوسری صورت!

اور جہاں تک دوسرے حوالہ کا تعلق ہے تو اس کے تناظر میں احکام کی صورت یہ ہے کہ خداوند عالم نے بعض چیزوں میں اجتماع کو بلاواسطہ واجب ولازم قرار دیا ہے جیسا کہ آپ مذکورہ بالا بیانات میں اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ اور بعض چیزوں میں براہ راست اجتماعیت کو پسند کیا ہے لیکن واجب قرار نہیں دیا جیسا کہ فریضہ نمازوں میں ہے کہ ان کی ادائیگی واجب مگر ان کا باجماعت ادا کرنا واجب نہیں بلکہ سنت و مستحب ہے البتہ سنت ان کے باجماعت ادا کرنے پر قائم ہو چکی ہے یعنی انہیں باجماعت ہی ادا کیا جاتا ہے تو لوگوں پر اس سنت کا قائم رکھنا ہی ضروری بنتا ہے چنانچہ اس کا ثبوت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے ملتا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان مسلمانوں کے بارے میں جنہوں نے باجماعت ادائیگی کو ترک کیا یوں فرمایا: "جو لوگ مسجد میں نماز ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں ان کے بارے میں اب ایسا لگتا ہے کہ ہم حکم دیں کہ

ان کے گھروں کے دروازوں پر لکڑیاں لے جا کر آگ بھڑکا دی جائے جوان کے گھروں کو جلا کر خاکستر بنادے"۔اس طرح آنحضرت ﷺ نے اجتماعیت کے قیام کے لئے سنت وطریقہ قائم کر دیا کہ اب اہل اسلام پر اس سنت وطریقہ کا تحفظ ہر ممکن صورت میں اور ہر قیمت پر لازم وضروری ہے۔

تو یہ وہ امور ہیں جن کی بابت بحث و تحقیق کتاب وسنت کے ذریعے فقہی استنباط پر مبنی ہے اور اسلامی فقہ ہی اس حوالہ سے واضح بیان کی حامل ہے۔لیکن اس مقام پر جو بات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ جس کے بارے میں بحث وتحقیق ہو وہ ہے اسلام جبکہ یہ حقیقت کسی بیان وو ضاحت کی محتاج نہیں کہ اسلام نے اپنے تمام دستورات وقوانین خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات وسیاسیات سے ہو اور خواہ اخلاق و پاکیزہ صفات سے ہو سب میں اجتماعیت کو بنیادی حیثیت دی ہے اور ان سب میں اجتماعیت کو ملحوظ رکھا ہے۔

ہم اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اسلام لوگوں کو دین فطرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ وہی حق ہے کہ جس کی بابت کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور کثیر قرآنی آیات مبارکہ ایسی ہیں جن میں اسی مطلب کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ان کے بارے میں کسی اعتراض کی گنجائش بھی نہیں پائی جاتی اور یہ بات دین اسلام کی فطرت پسندی کی پہلی کڑی ہے جس میں لوگوں کے طرز فکر کے مختلف ہونے اور اخلاق وعادات کے فرق کے باوجود کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور تمام افراد بشر اس پر کامل اتفاق رکھتے ہیں کہ حق کی پیروی واجب ولازم ہے۔(الحق یجب اتباعه)

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام ان لوگوں کو بے قصور اور قابل معافی قرار دیتا ہے جن پر حق واضح نہیں ہوا اور دلائل روشن نہیں ہوئے اگر چہ حقائق ودلائل ان کے گوش گزار ہو چکے ہیں، چنانچہ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا:

سورۂ انفال: آیت ۴۲:

○ "لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ"

(تا کہ جو شخص ہلاک ہو وہ حق واضح ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ حق واضح ہونے کے بعد زندہ ہو)

سورۂ نساء، آیت ۹۸۔۹۹:

○ "اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾"

(سوائے ان لوگوں کے کہ جنہیں کمزور کر دیا گیا مردوں میں سے،عورتوں میں سے اور بچوں میں سے جو کہ کوئی راہ چارہ نہیں رکھتے اور نہ ہی حق کا راستہ ڈھونڈ پاتے ہیں امید ہے کہ انہی لوگوں کو خدا بہت جلد معاف کر دے گا اور خدا تو ہے ہی درگزر کرنے والا ،معاف کرنے والا)

اس آیت کے اطلاق اور معنوی وسعت کو دیکھیں کہ اس میں جملہ "لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا" کے

الفاظ ہر اہل فکر ونظر اور اپنے تئیں بحث و تحقیق کے لئے آمادگی کا حامل سمجھنے والے کو دعوتِ عام دیتے ہیں کہ وہ دین سے تعلق رکھنے والے معارف کے بارے میں نہایت باریک بینی کے ساتھ غور وفکر کرے اور ان سے مربوط امور میں اپنی فکری توانائیاں بروئے کار لائے کیونکہ قرآنی آیات مبارکہ تفکر، تعقل وتذکر کی ترغیب دلانے میں بھری ہوئی ہیں، اور یہ حقیقت معلوم وآشکار ہے کہ ذہنی و بیرونی عوامل کا مختلف ہونا افکار وافہام کے مختلف ہونے میں اثر انداز ہوتا ہے کہ ان کے تصور و تصدیق اور حقائق ومفاہیم تک رسائی کے مراحل میں اس کی اثر گزاری ظاہر ہوتی ہے۔ اور اسی سے ان اصولوں میں فرق پیدا ہوجاتا ہے جو اسلامی معاشرہ کی اصل واساس قرار پاتے ہیں جیسا کہ اس حوالہ سے مربوط مطالب ذکر ہو چکے ہیں البتہ دو اشخاص کے فہم وفکر کا مختلف ہونا چونکہ علم معرفت نفس، علم الاخلاق اور علم الاجتماع کا مسلمہ اصول ہے لہٰذا جب اُس کے اصل سبب کے بارے میں غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بازگشت درج ذیل تین امور میں سے کسی ایک کی طرف ہوتی ہے:

(۱) نفسانی اخلاق و باطنی صفات کا مختلف ہونا، اچھی وبری دونوں صفتوں سے مربوط قوتوں سے تعلق کے حوالہ سے! کیونکہ انسانی علوم ومعارف میں اُن مختلف صلاحیتوں کے تناظر میں ان قوتوں کی اثر گزاری بہت وسیع ہوتی ہے جو لوح ذہن میں ان صفات کی صورت گری کرتی ہیں، بنا بر ایں کسی منصف مزاج شخص کا ادراک اور ذہنی فیصلہ جھگڑالو وسرکش شخص کے ادراک اور ذہنی فیصلہ جیسا نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی اعتدال پسند شخصیت کے حامل انسان کی فکری رسائی کسی جلد باز ومتعصب اور نفسانی خواہشوں کے اسیر ایسے شخص کی فکری رسائی جیسی ہوتی ہے جو ہر کس وناکس کے پیچھے چل پڑتا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جس کے پیچھے جاتا ہے وہ اسے کہاں لے جائے گا اور اس سے کیا مطلوب رکھتا ہے؟ جبکہ دینی تربیت اس طرح کے اختلاف کو بخوبی دور کرسکتی ہے کیونکہ اس کی بنیاد ایسی ہے کہ اس میں دینی اصولوں اور معارف وعلوم سے ہمرنگی وہم آہنگی کے تمام تقاضے پورے ہوئے ہیں اور اس کی اخلاقیات کا سرچشمہ دینی اصول ہیں جو کہ مکارم الاخلاق ہی سے عبارت ہیں، اس حوالہ سے قرآنی آیات یوں گویا ہیں:

سورۂ احقاف، آیت ۳۰:

○ ''كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ''

(وہ کتاب ہے جو موسیٰ کے بعد اُتاری گئی کہ وہ اپنے ماقبل کی تصدیق کرتی ہے، وہ حق کی طرف اور سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے)

سورۂ مائدہ: آیت ۱۶:

○ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(اس کے ذریعے اللہ اس کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی رضا ومرضی کی پیروی کرے کہ اسے سلامتی کے راستے دکھاتا ہے انہیں اپنے اذن کے ساتھ، اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف ہدایت کرتا ہے اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے)۔

سورۂ عنکبوت: آیت ۶۹:

○ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ"

(اور جن لوگوں نے ہم میں جہاد کیا تو ضرور ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔

ان آیات مبارکہ کا زیر نظر موضوع پر منطبق ہونا ظاہر و واضح ہے۔

(۲) افعال کا مختلف ہونا، جو عمل حق کے منافی ہو مثلاً گناہ و معصیت اور انسانی ہوسرانیاں یعنی دھوکہ بازی وسوسہ اندازی وغیرہ اس سے ہر انسان بالخصوص سادہ لوح افراد کی لوح ذہن پر غلط و فاسد افکار ثبت ہو جاتے ہیں اور پھر شبہات و باطل آراء و نظریات کا ایک تلاطم ذہنوں پر چھا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں سوچیں مختلف ہو جاتی ہیں اور حق کی پیروی سے منہ موڑنے کے جذبات ابھر آتے ہیں، یہ وہ مرحلہ ہے جہاں اسلام اس طرح کے اختلاف کو دور کرنے میں اہم و بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کے سدّباب کو یقینی بنا سکتا ہے چنانچہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے تین راہیں اپناتا ہے:

(۱) معاشرہ کو ہمیشہ دینی دعوت عام کرنے کا حکم دیتا ہے۔

(۲) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کو ہر فرد کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔

(۳) کینہ پرور اور شبہات کا شکار افراد کو معاشرہ سے دور چلے جانے کا حکم دیتا ہے۔

ان امور کی بابت قرآنی آیات مبارکہ یوں گویا ہیں:

سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۴:

○ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ"

(تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی دعوت دے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے)

اس آیت مبارکہ میں تین چیزیں مذکور ہیں، ایک دعوت الی الخیر یعنی نیکی کی طرف بلانا، دوسری امر بالمعروف اور تیسری نہی عن المنکر، نیکی کی طرف بلانا صحیح و حق عقیدہ کی مضبوطی اور دلوں میں اس کے جگہ کر جانے کو یقینی بنانے میں مدد دیتا ہے کیونکہ جب بار بار نیکی کی طرف بلایا جائے اور اس کی اہمیت و آثار کو یاد دلایا جائے تو اس کے نتیجہ میں دلوں کی توجہات نیکی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہیں اور پھر ان کی عملی صورت کی یقینی راہ کھل جاتی ہے، اور جہاں تک امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تعلق ہے تو ان کی اثر گزاری سے دلوں میں صحیح عقائد کے راسخ ہونے کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں، ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ انعام، آیت ۶۷:

○ "وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰي يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَا عَلَي الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰي لَعَلَّهُمْ

يَتَّقُونَ ﴿۶۹﴾ وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ''

(اور جب آپ دیکھیں کہ کچھ لوگ ہماری آیات کے بارے میں لب کشائی کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو آپ ان سے روگردانی کرلیں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی بات میں مصروف ہو جائیں، اور اگر شیطان آپ کو یہ بات بھلوانا چاہے تو آپ واضح بیان کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہی چھوڑ دیں، اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں ان کا معاملہ دوسرا ہے لیکن یہ سب کچھ یاددہانی پر مشتمل ناصحانہ بیان ہے تاکہ وہ تقویٰ کی راہ اپنائیں، اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل کود اور مذاق بنالیا ہے اور دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکہ میں ڈال دیا ہے، تاہم آپ یاددہانی کرواتے رہیں کہ ممکن ہے ان کے دلوں پر اثر کرے اور وہ اپنے کئے پر غور کریں)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے معارفِ الٰہیہ اور دینی حقائق میں شبہات، اعتراضات، استہزاء و مذاق اُڑانے کی غرض سے بات چیت کرنے کی سخت ممانعت کی ہے خواہ جزئی صورت میں ہو یا کنایہ و اشارہ کے انداز میں ہو، اس کے ساتھ ساتھ ان آیات میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس طرح کرنے سے دینی امور و معارف میں حقیقت پسندی کا رجحان ختم ہو جاتا ہے اور ان کی بابت مذاق اور بے مقصد و بے معنی بحثوں کی راہ کھل جاتی ہے جو کہ کسی بھی صورت میں درست قرار نہیں دی جاسکتی، اور اس نکتہ کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اس طرح کے اعمال کا اصل سبب دنیاوی زندگی کی چمک دمک کے دھوکہ میں آجانا ہے کہ اگر اس سے چھٹکارا مقصود ہو تو نیک تربیت اور خداوند عالم کی یاد میں رہنا ہی واحد حل ہے۔

(۳) بیرونی عوامل کا اثر انداز ہونا، اس حوالہ سے گھر سے دوری اور دینی معارف تک عدم رسائی سوائے معدودے چند امور یا تحریف شدہ حقائق کے یا افراد کے خاص مزاج کی وجہ سے پیدا ہونے والی فکری ناتوانی کے نتیجہ میں دینی حقائق سے آگاہی و آشنائی سے محرومی، اختلافات کا سبب بنتی ہے کہ جس کا واحد حل تبلیغ دین کے سلسلوں کو وسعت دینا اور حق کی طرف دعوت دینا اور دینی تربیت کا حلقہ وسیع کرنا ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو اسلام کے تبلیغی نظام کے امتیازات میں سے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ارشادِ خداوندی ہے:

سورۂ یوسف، آیت ۱۰۸:

○ ''قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ''

(کہہ دیجئے کہ یہی میرا راستہ ہے، میں بصیرت و آگاہی کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور ہر وہ جو میری پیروی کرتا ہے)۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو کسی چیز سے بخوبی آگاہی و بصیرت رکھتا ہو وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے کہ اس کی بات لوگوں کے دلوں میں کس قدر جگہ پاتی ہے اور افراد کے مختلف مزاجوں اور سننے والوں کے مختلف طرزِ تفکر کی بناء پر کس قدر اثر گزاری ہوتی ہے لہٰذا وہ ہر شخص کی قوتِ فہم و ادراک کے عین مطابق اپنی توانائی بروئے کار لا کر اسے اپنی بات سناتا

اور اپنا پیغام بھیجتا ہے، اس حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد گرامی فریقین کی کتب میں مذکور ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''انا معاشر الانبیاء نکلم الناس علی قدر عقولھم ''ہم گروہ انبیاء لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کرتے ہیں، اور خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ توبہ، آیت ۱۲۲:

○ ''فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ''

(پس ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر قوم سے ایک گروہ جائے تا کہ دین فہمی کے زیور سے آراستہ ہو اور واپس آ کر اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کرے تا کہ وہ خدا کے عذاب سے ڈریں)

یہ ہیں وہ تین اسباب وعوامل جو معاشرہ میں عقائد وفہم حقائق کے حوالہ سے افراد کے درمیان اختلاف کو جنم دیتے ہیں، اسلام ان میں سے بعض کی روک تھام اور سدباب ان کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی کرتا ہے اور بعض سے نمٹنے کے لئے ان کے رونما ہونے کے بعد اقدامات کرتا ہے۔

ان سے قطع نظر اور ان سے بالاتر یہ کہ اسلام نے جو معاشرتی دستورات مقرر فرمائے ہیں وہ معاشرہ میں رونما ہونے والے شدید ترین اختلافات کی روک تھام میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، ان کی بابت پہلی بات یہ ہے کہ ہر حال میں سیدھی راہ اپنائی جائے یعنی صراط مستقیم کو اختیار کیا جائے جو کہ مقصد تک پہنچنے کی آسان ترین راہ ہے اور اختلافی راہوں کی طرف جانے سے سختی کے ساتھ اجتناب برتا جائے، ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ انعام: آیت ۱۵۳:

○ ''وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ''

(اور یہ ہے میرا سیدھا راستہ، پس تم اس پر چلو اور دیگر راستوں پر نہ چلو ورنہ وہ تمہیں خدا کے راستہ سے دور اور متفرق کر دیں گے، اس بات کی تاکید خدا نے تمہیں کی ہے تا کہ تم تقویٰ اختیار کر سکو)۔

سورۂ آل عمران: آیت ۱۰۲۔۱۰۳

○ ''يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا.....''

(اے ایمان والو! تقوائے الٰہی اختیار کرو جس طرح تقوائے الٰہی کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں! اور تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو.......)

اس آیت کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ یہاں اللہ کی رسی سے مراد قرآن مجید ہے جس میں دینی حقائق و معارف بیان کئے گئے ہیں یا جیسا کہ پہلی دو آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی قدر ہے کیونکہ ان میں یوں ذکر ہوا ہے۔

سورۂ آل عمران: آیات ۱۰۰۔۱۰۱

○ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَکَیْفَ تَکْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْکُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾

(اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں میں سے کسی گروہ کی پیروی کرو جنہیں کتاب دی گئی تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد کافروں میں پلٹا دیں گے، اور تم اللہ کا انکار کیونکر کر سکتے ہو جبکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا پیغمبر بھی موجود ہے، اور جو شخص اللہ سے وابستہ ہو جائے تو وہ سیدھی راہ کی ہدایت پا گیا)

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں پر واجب ولازم ہے کہ دینی معارف پر متفق ہو جائیں، اپنے افکار کو ایک دوسرے سے مرتبط و پیوستہ کریں اور تعلیم و تعلم سے لولگائیں، اس طرح ہر فکری حادثہ سے بچ جائیں گے اور جو آیات ان کے سامنے پڑھی جائیں ان کی بابت ہر طرح کے شبہ و غلط فہمی سے محفوظ رہیں گے اور ان آیات میں غور و فکر اور تدبر کے نتیجہ میں باہمی اختلاف کی بیخ کنی میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

سورۂ نساء: ۸۲

○ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا

(کیا وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)۔

سورۂ عنکبوت: آیت ۴۳

○ وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾

(اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور انہیں عمل کرنے والوں کے علاوہ کوئی سمجھ نہیں سکتا)

سورۂ نحل: آیت ۴۳

○ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

(پس تم اہل ذکر سے پوچھو اگر تم خود علم نہیں رکھتے ہو)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں تدبر کرنا یا تدبر کرنے والے کی طرف رجوع کرنے کا حکم دینا جو کہ دین کی بھاری بھر کم حقیقتوں کا علم رکھتے ہیں، لوگوں کے درمیان اختلاف کو دور کر کے ان کے سامنے اس حق و حقیقت کو واضح و آشکار کرنے کا ذریعہ ہے جس کی پیروی کرنا لوگوں پر واجب ولازم ہے۔ چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ نحل، آیت: ۴۴

○ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

(اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو واضح طور پر بیان کریں کہ اُن کے لئے کیا

نازل کیا گیا ہے اور تا کہ وہ غور وفکر کریں)

اس آیت سے قریب المعنٰی آیت یہ ہے:

سورۂ نساء، آیت: ۸۳

○ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ

(اور اگر وہ رسول اور اولی الامر کی طرف جو انہی میں سے ہے رجوع کریں تو تحقیق واستنباط کرنے والے لوگ اس سے آگاہ ہوجائیں گے)

سورۂ نساء، آیت: ۵۹

○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٥٩﴾

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول اور اپنے میں سے اولوا الامر کی اطاعت کرو، پس اگر تم کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر اور نہایت اچھی تاویل (نیک انجام) ہے)

ان آیات سے اسلام کے معاشرتی طرز تفکر کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اسے کس بنیاد پر استوار کیا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دین جس طرح اپنی اصل واساس میں اپنے مخصوص معارف الٰہیہ کے تحفظ پر مبنی ہے اسی طرح لوگوں کو طرز تفکر میں مکمل آزادی دیتا ہے، تو اس کا نتیجہ وما حصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر واجب و لازم ہے کہ وہ دینی حقائق میں غور وفکر کریں اور باہمی میل جول اور معاشرتی روابط کے ذریعے تحقیق واجتہاد کر کے دینی معارف سے آگاہی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کریں اور اپنی تمام تر فکری توانائیاں بروئے کار لائیں، اور اگر اس سلسلہ میں انہیں کسی شبہ وغلط فہمی یا غیر واضح صورتحال کا سامنا ہو کہ دینی حقائق ومعارف ان پر آشکار نہ ہوسکیں یا کوئی ایسی چیز سامنے آجائے جو ان معارف وحقائق کے منافی ومتصادم ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اس صورتحال میں وہ کتاب خدا کی طرف رجوع کر کے اپنے معروضی نظریات کی بابت معاشرتی مباحث میں تدبر کے ساتھ کسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، اگر اس طرح بھی اس کی بیماری کا علاج نہ ہو سکے اور وہ اپنی مشکل کا حل نہ ڈھونڈ سکے تو پھر اپنا مسئلہ رسول اللہ ﷺ یا ان کے مقرر کردہ قائم مقام وجانشین کی طرف رجوع کرے تا کہ اس کا شبہ دور ہو جائے یا جو چیز اس کے سامنے آئی ہے اگر وہ غلط وباطل ہو تو اس کا غلط وباطل ہونا ظاہر وواضح ہو جائے، اس حوالہ سے خداوند عالم کا ارشاد گرامی قدر ہے:

سورۂ زمر، آیت: ۱۸

○ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿١٨﴾

(وہ لوگ ہر بات سنتے ہیں پھر اس میں سے جو اچھی ہو اس کا اتباع کرتے ہیں، وہی ہیں جو خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور وہی عقل و سمجھ والے ہیں)

اور جہاں تک عقیدہ اور فکر و نظر کی آزادی کا تعلق ہے کہ جس کے بارے میں مربوطہ مطالب واضح طور پر بیان کر چکے ہیں تو اس آزادی سے مراد یہ نہیں کہ جن امور کی بابت شبہ وغیرواضح صورت پیدا ہوا نہیں کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ اور ان کے مقرر کردہ جانشینوں رہبروں کی طرف رجوع کئے بغیر لوگوں میں عام کر دیں کیونکہ ایسا کرنا باطل کی طرف دعوت دینے کے برابر ہے اور اس سے معاشرتی تباہی کے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں جبکہ کتاب اللہ اور رسول ﷺ اور ان کے مقرر کردہ رہبروں کی طرف رجوع کرنا ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے معاشرتی امور کی اصلاح اور فکری ارتقاء کے دروازے کھل سکتے ہیں بلکہ اس سے اس شخص کی نجی زندگی کی آسودگی کا تحفظ بھی یقینی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے مقابل یہ کہ لوگوں پر کسی عقیدہ و نظریہ کو مسلط کرنا، دلوں پر پہرے لگانا اور انسانی طبع تفکر کو موت کی نیند سلا دینا ہرگز اور ہرگز دین وحق سے مطابقت نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنے والے مادی وسائل کے استعمال اور طاقت کے ذریعے اور کوڑے شمشیر یا کفر کا بازار گرم کرنے اور جلاوطن کر کے اور معاشرتی قطع تعلقی کے ذریعے اپنے عزائم کی تکمیل کو یقینی بناتے ہیں کہ دین اسلام اس طرح کے امور کی ہرگز اجازت نہیں دیتا بلکہ اس پر راضی بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی اس طرح کے افعال کی کسی بھی حوالہ سے حمایت و تائید کرتا ہے ایسا کرنا تو نصرانیوں کی خصلت ہے کہ جن کے اعمال سے چرچ کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور ان کی ڈھٹائی و ہٹ دھرمی کی داستانیں بالخصوص پندرھویں و سولھویں صدی عیسوی میں ہونے والے بدترین حالات و واقعات سے ان کے طاغوت صفت حکمرانوں اور جابر و آمر اور سنگدل اربابِ اقتدار کی بدباطنی کا ثبوت ملتا ہے کہ جس کی مثال کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔

اس کے ساتھ ساتھ نہایت افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم اہل اسلام نے آزادی کی عظیم نعمت کی قدردانی نہیں کی اور فکری یکجہتی و آزادیٔ عقیدہ کی خدائی عطا کردہ نعمت سے محرومی کا شکار ہو گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اپنے آپ کو ان کثیر نعمتوں سے بھی محروم کر چکے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نوازا اور ہم اپنے فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی و بے توجہی کر کے خداداد نعمتوں سے فیض یاب ہونے سے محرومی کا طوق گلے میں ڈال چکے ہیں۔ اس صورتحال کے ذمہ دار ہم خود ہی ہیں، خداوند عالم نے اس حوالہ سے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ رعد، آیت: ۱۱

○ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

(خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے)

ہمارے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسائی کردار ہم پر حاکم ہو گیا اور ہم اس کے اصولوں کو اپنانے لگے جس سے ہمارے دل ایک دوسرے سے جدا ہو گئے (دلوں میں تفرقہ کی آگ شعلہ ور ہو گئی) اور ہم معاشرتی طور پر کمزور پڑ گئے اور گوں

ناگوں مسالک ومذاہب کی منڈیاں سج گئیں، خداوند عالم ہمیں معاف کرے اور غلطیوں وکوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور ہمیں اپنی رضا وخوشنودی کے حصول کی توفیق سے نوازتے ہوئے اپنے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت ورہنمائی فرمائے۔

(۱۵) بالآخر دین حق ہی غالب ہوگا

نوع انسانی میں جو فطرت ودیعت کی گئی ہے وہ اسے اس کی حقیقی سعادت کی طرف دعوت دیتی ہے اور حقیقی سعادت انسان کی روحانی وجسمانی زندگی کی باہم پیوستگی ہی کا نام ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں دینی واُخروی دونوں تقاضوں کو پورا کرے اور دونوں حوالوں سے اپنی حقیقی سعادت کے حصول کو یقینی بنائے، چنانچہ آپ اس امر سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں کہ اسلام اور دین توحید یہی ہے، اور جہاں تک ان انحرافات کا تعلق ہے جو انسان کی زندگی میں رونما ہوتے ہیں اور اسے اس کے مقصد تخلیق اور منازلِ کمال تک نہیں پہنچنے دیتے تو اس کی اصل وجہ دین خداوندی کی پاکیزہ تعلیمات کو صحیح صورت میں منطبق نہ کرنا ہے نہ یہ کہ فطرت کے اصولوں میں کسی خامی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے، اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ کارخانۂ تخلیق میں جو ہدف ومقصد متعین ہوا ہے وہ جلدی یا دیر سے بالآخر حاصل ہو کر رہے گا چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

سورۂ روم، آیات: ۳۰ تا ۴۱

○ ''فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝'' (آپ اپنا رخ خالص دین کی طرف رکھیں جو کہ فطرت الٰہی ہے کہ جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں یہی پختہ دلیل ہے لیکن اکثر لوگ آگاہی نہیں رکھتے) اس آیت میں لوگوں کے نہ جاننے اور عدم آگاہی سے مراد یہ ہے کہ وہ تفصیلی علم نہیں رکھتے اگرچہ ان کی فطرت اجمالی علم کی حامل ہے ''لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ'' (تاکہ وہ اس کا انکار کریں جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے تم مزے لے لو کہ بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا) ''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝'' (لوگوں کے اعمال کے نتیجہ میں بحر وبر فساد کی لپیٹ میں آ گئے ہیں تاکہ وہ اپنے بعض اعمال کی سزا چکھیں شاید کہ لوٹ آئیں)۔

سورۂ مائدہ، آیت: ۵۴

○ ''فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ''

(بہت جلد اللہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں، جو مؤمنین پر نرم و

مہربان اور کافروں سے سخت سلوک کرتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے)

سورۂ انبیاء، آیت ۱۰۵:

○ "وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿۱۰۵﴾"

(اور ہم نے سب کچھ بیان کرنے کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے کہ میرے نیک وصالح بندے ہی زمین کے وارث ہوں گے)۔

سورۂ طٰہٰ، آیت: ۱۳۲

○ "وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿۱۳۲﴾"

(اور نیک انجام تقویٰ ہی کے لئے ہے)

یہ اور ان جیسی دیگر آیات مبارکہ ہمیں باخبر کرتی ہیں کہ اسلام اپنی مکمل صورت کے ساتھ بہت جلد ظہور پذیر اور پوری دنیا پر چھا جائے گا اور کائنات کے گوشہ گوشہ میں اس کا پرچم لہرائے گا۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آپ ان لوگوں کی اس بات پر ہرگز کان نہ دھریں جو کہتے ہیں کہ اسلام نے اپنی صورت لوگوں کو دکھا دی ہے اور اس کا دورانیہ تاریخ کے معدودے چند ایام سے زیادہ نہ تھا اور اسے استحکام و تسلسل حاصل نہ ہوسکا بلکہ موجودہ تمدن اس پر غالب آ گیا ہے خواہ یہ سب کچھ شعوری طور پر ہوا یا غیر شعوری طور پر! لیکن اس کے کامل ظہور پذیر ہونے اور اپنے تمام تر اصولوں و معارف و مقاصد کے ساتھ انسانی معاشرہ پر حکم فرما ہونے کا خواب ہرگز شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا کیونکہ طبع انسانی اسے قبول نہیں کرتی اور نہ ہی کبھی قبول کرے گی اور نہ ہی کبھی اس کا عملی تجربہ و مثال سامنے آئی کہ جس کی بنیاد پر اس کی کامل حاکمیت کے بارے میں وثوق کے ساتھ توقعات وابستہ کی جائیں۔

اس طرح کے نظریات واقوال اس لئے قابل توجہ نہیں کہ اسلام اس معنی میں کہ ہم اس کی بابت بحث و گفتگو کر رہے ہیں وہ نوع انسانی کا مقصد اعلیٰ ہے اور اس میں ہی انسانیت کے کمال کی اصل حقیقت پوشیدہ ہے کہ طبع انسانی فطرتاً اس سے مانوس ہے خواہ تفصیلی طور پر اس کی طرف متوجہ ہو یا نہ ہو اس سے اصل حقیقت میں فرق پیدا نہیں ہوتا، اس کے ساتھ ساتھ زمینی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام خلقت کائنات کی تمام موجودات کو ان کے مقاصد تخلیق کی طرف کھینچے جا رہا ہے اور نہایت تیزی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے اور انسان اس سے مستثنیٰ نہیں۔

باقی رہی انسانی معاشروں میں گوناگوں طرز ہائے زندگی کی مختلف صورتوں کی بات، تو وہ کسی سابقہ یقینی تجربہ پر مبنی نہ تھیں اور نہ ہی ان کا وجود میں آنا اور معاشروں میں جگہ پانا کسی عملی تجربہ کی بنیاد پر تھا چنانچہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ،

حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی شریعتوں کی تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ وہ ظہور پذیر ہوئیں اور لوگوں میں ان کا سکہ جما، بلکہ برہما و بوذا اور مانی وغیرہ کا بھی یہی حال رہا، اور یہ مادی تمدن و نظام ہائے معاشرت مثلاً ڈیموکریسی، کمیونزم وغیرہ بھی اسی طرح کسی سابقہ تجربہ پر مبنی نہ تھے بلکہ جدید صورت میں سامنے آئے اور مختلف انسانی معاشروں میں جگہ پاتے رہے۔ اصل بات یہ ہے معاشرتی راہ و رسم خواہ اس کا تعلق جس سے بھی ہو اس کے ظہور پذیر ہونے اور معاشرہ میں جگہ پانے کا راز مضبوط ارادوں کے حامل افراد کی بلند ہمتوں اور پختہ عزائم میں مضمر ہوتا ہے کہ ان کے مقاصد و اہداف کے حصول میں وہ کسی بھی کمزوری و تھکن سے دوچار نہیں ہوتے اور زمانہ کو مقاصد و مرادوں تک رسائی میں حائل و مانع سمجھنا ہرگز درست نہیں اور اسے کاوشوں کے نتیجہ بخش نہ ہونے کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا، اس سلسلہ میں مقاصد و اہداف میں ان کے رحمانی یا شیطانی ہونے کے حوالوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ سب کچھ ارادوں پر منحصر ہوتا ہے۔

روایات پر ایک نظر

صبر و ربط کا مفہوم

کتاب معانی الاخبار میں آیت مبارکہ "یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا" کی تفسیر میں منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم مصائب پر صبر کرو، آزمائش پر ایک دوسرے کو حوصلہ دلاؤ اور جس کی پیروی کرتے ہو اس سے وابستگی کو مضبوط کرو) (اصبروا علی المصائب. وصابروهم علی الفتنة ورابطوا علی من تقتدون به) (معانی الاخبار صفحہ ۳۶۹)

اسی آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ ہی سے مروی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا اس سے مراد یہ ہے:

"اصبروا علی دینکم. وصابروا عدوکم ورابطوا امامکم"

(تم اپنے دین پر قائم رہو، اپنے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو اور اپنے امام سے وابستہ رہو)

(تفسیر العیاشی جلد اوّل صفحہ ۲۱۲)

اسی طرح کی روایات کتب اہل سنت میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہیں (ملاحظہ ہو، تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۱۴)۔

امام صادقؑ کا فرمان

کتاب کافی میں امام صادقؑ سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''اصبروا علی الفرائض وصابروا علی المصائب ورابطوا علی الآئمہ''

(فرائض وواجبات پر صبر واستقامت کرو، مصائب پر حوصلہ وہمت سے کام لو اور آئمہؑ سے وابستہ رہو)

(اصول کافی، جلد دوم، صفحہ ۸۱)

امام علیؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر مجمع البیان میں امام علیؑ کا ارشاد گرامی ہے: ''رابطوا الصلوات'' یعنی آیت میں ''ورابطوا'' سے مراد یہ ہے کہ نمازوں میں مرابطہ کرو، یعنی نمازوں کے منتظر رہو اور ان کی پابندی کرو۔ (مجمع البیان ج ۱۔۲، ص ۵۶۲)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی

تفسیر ''درمنثور'' میں ابن جریر اور ابن حیان کے حوالوں سے منقول ہے کہ جناب جابر بن عبداللہ نے بیان کیا کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''الا ادلکم علی مایمحو اللہ بہ الخطایا ویکفر بہ الذنوب''

(کیا میں تمہیں اس چیز سے آگاہ کروں جس کے ذریعے خداوند عالم خطاؤں کو محو کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کرتا ہے)

قلنا: بلیٰ یارسول اللہ!

ہم نے کہا: ہاں اے اللہ کے رسول!

قال: اسباغ الوضوء علی المکارہ، و کثرۃ الخطا الی المساجد وانتظار الصلاۃ بعد الصلاۃ فذلکم الرباط

بھرپور طریقہ سے وضو کرنا جبکہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو، بار بار مسجدوں کو جانا، نماز کے بعد نماز کا انتظار کرنا، کہ یہی مرابطہ ہے۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۱۴)

اسی تفسیر میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے یہ روایت دیگر اسناد سے بھی ذکر ہوئی ہے، مرابطہ کی فضیلت میں اس قدر کثیر روایات وارد ہوئی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔

سورۂ مبارکہ نساء

یہ سورت مدنی سورتوں میں سے ہے اور اس کی آیات ۱۷۶ ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

○ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِیۡرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیۡكُمۡ رَقِیۡبًا ①

ترجمہ

ابتداء اللہ کے نام سے، جو بہت رحمت عطا کرنے والا، ہمیشہ مہربان ہے

○ اے لوگو! اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کرو، وہ کہ جس نے تمہیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اس سے اس کے جوڑے خلق کئے اور اس سے کثیر مرد اور عورتوں کو وجود بخشا، اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو، وہ کہ جس کے ذریعے تم ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہو، اور ارحام کا خیال رکھو، بے شک اللہ تم پر نظر رکھتا ہے۔

تفسیر و بیان

اس سورۂ مبارکہ کی غرض وغایت جیسا کہ اس کی ابتدائی آیات سے اس کا اشارہ ملتا ہے، نکاح و بیاہ کے احکام، تعددِ ازواج و نکاح کے محرمات وغیرہ کا بیان ہے، اسی طرح میراث کے احکام اور اس کے ساتھ نماز، جہاد، شہادات (گواہیاں) تجارت وغیرہ کے احکام کا تذکرہ مقصود ہے، اس ضمن میں اہل کتاب سے متعلقہ امور کو ذکر کیا گیا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آیات کے مضامین سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا نزول مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد ہوا۔

اس سورۂ مبارکہ کی آیات سے بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول دفعہ واحدہ یعنی ایک ہی دفعہ نہیں ہوا بلکہ تدریجی ہوا ہے اگرچہ اس کی اکثر آیات کے درمیان موضوعی ربط بھی موجود نہیں، لیکن جہاں تک مذکورہ آیات مبارکہ ''یَاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ ......'' اور دیگر ان آیات کا تعلق ہے جو یتیموں اور خواتین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں تو وہ مقدمہ و تمہیدی بیان کی حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ ہم میراث اور محارم کی بحث و تفسیر میں اس مطلب کو مزید واضح طور پر بیان کریں گے، اور تیسری آیت میں ازواج کی تعداد کا جو تذکرہ ہوا ہے تو اگرچہ وہ اس سورۂ مبارکہ کے اہم موضوعات میں سے ہے لیکن یہاں اسے ضمنی طور پر ذکر کر دیا گیا ہے۔

تقویٰ کا عمومی فرمان

آیت مبارکہ ''یَاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ..... تا ''نساء'' میں لوگوں کو اپنے پروردگار کا تقویٰ اپنانے کا عمومی حکم مذکور ہے کہ اپنے نفسوں میں اس پاکیزہ صفت کو جگہ دیں کیونکہ وہ سب انسانی حقیقت کے حوالہ سے یکساں ہیں یعنی ایک ہی انسانی حقیقت رکھتے ہیں اور ''انسان'' ہیں خواہ مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا، کمزور و ناتواں ہو یا قوی و طاقتور، ان میں انسان ہونے کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ اس لئے ہے کہ کوئی مرد عورت پر زیادتی و ناانصافی نہ کرے اور نہ ہی کوئی بڑا چھوٹے کو

ظلم کا نشانہ بنائے بلکہ تمام افراد یکجا ہو کر اپنے اس معاشرہ میں زندگی بسر کریں جس کی رہنمائی انہیں خُداوند عالم نے فرمائی ہے تا کہ اپنی سعادتمندی کو یقینی بنا کر اس کے تکمیلی تقاضوں کو پورا کریں اور ان احکام وقوانین اور دستورات پر عمل پیرا ہوں جو اللہ تعالٰی نے ان کے درمیان مقرر فرمائے ہیں تا کہ ان کی زندگی کا سفر آسان اور ان کی وجودی حیثیت کو انفرادی و اجتماعی دونوں حوالوں سے بقاء حاصل ہو، اسی سے آیت مبارکہ میں خاص طور پر مؤمنین کی بجائے ''النَّاسُ'' (لوگوں) کو مخاطب قرار دیئے جانے کا راز بھی معلوم ہو جاتا ہے اور تقویٰ کو ''اللہ'' (اتَّقُوا اللهَ) کی بجائے ''رب'' (اتَّقُوا رَبَّكُمُ) کے الفاظ کے ساتھ ذکر کرنے کی حکمت بھی واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں جس صفت کا تذکرہ ہوا ہے یعنی ''الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' (وہ کہ جس نے تمہیں ایک ہی اصل سے پیدا کیا) وہ مؤمنین سے مخصوص نہیں بلکہ اس میں تمام افراد بشر شامل ہیں اور اس کا تعلق الوہیت سے نہیں بلکہ ربوبیت سے ہے کہ جس سے لوگوں کے امور حیات کی تدبیر و تکمیل کا سلسلہ وابستہ ہے۔

نفس واحدہ سے کیا مراد ہے؟

آیت مبارکہ میں ''نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ''الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' تو لغت میں ''نفس'' کا معنی کسی چیز کی اصل وحقیقت ہے چنانچہ کہا جاتا ہے ''جاءنی فلان نفسهٗ وعینهٗ'' (میرے پاس فلاں شخص خود اور خود ہی آیا) اگرچہ ان دو الفاظ یعنی ''نفس'' اور ''عین'' کے تعین کا سرچشمہ یہی معنی ہے یعنی ''ما به الشیئ شیئ'' (جس سے کوئی چیز، چیز بنتی ہے) یعنی کسی چیز کے وجودی تشخص کی اصل و اساس، تو اس حوالہ سے نفس الانسان سے مراد وہ اصل حقیقت ہے جس سے انسان کی وجودی شناخت وابستہ ہوتی ہے اور وہ عبارت ہے اس حیات دنیا میں روح اور جسم کے مجموعہ سے! اور برزخی زندگی میں جیسا کہ اس حوالہ سے تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ نفس صرف روح کو کہتے ہیں جیسا کہ آیت مبارکہ: ''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتٌ'' (سورۂ بقرہ، آیت: ۱۵۴) (اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں اُنہیں مُردہ نہ کہو) کے ضمن میں مربوطہ مطالب بیان کئے جا چکے ہیں)۔

زیر نظر آیت مبارکہ کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ ''نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' سے مراد آدم علیہ السلام اور ''زَوْجَهَا'' سے مراد ان کی زوجہ (حوا) ہیں اور وہ دونوں اس موجودہ نسل انسانی کہ جس میں ہم ہیں اور انہی دونوں کی طرف سب کی نسبت منتہی ہوتی ہے کے ماں باپ ہیں جیسا کہ قرآن مجید اس حوالہ سے یوں گویا ہے:

سورۂ زمر، آیت ۶:

○ ''خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا''

(اس نے تمہیں نفس واحدہ سے خلق کیا پھر اس سے اس کا جوڑ قرار دیا)

سورۂ اعراف، آیت ۲۷:

○ ''یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ''

(اے بنی آدم! کہیں شیطان تمہیں دھوکہ نہ دے دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو بہشت سے نکلوا دیا تھا)

اور شیطان کی بات بیان کرتے ہوئے یوں مذکور ہے کہ اس نے کہا:

سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۶۲

○ ''لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۶۲﴾''

(اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی نسل کو گھیرے میں لے لوں گا سوائے معدودے چند افراد کے)

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

غلط فہمی

بعض مفسرین کرام نے آیت میں مذکور ''نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' اور ''زَوْجَهَا'' سے ہر مرد و عورت مراد لیا ہے کہ جن دو پر نسل انسانی کا دارومدار ہے لہٰذا آیت کا معنی کچھ اس طرح ہوگا: ''خلق کل واحد منکم من اب وام بشرین من غیر فرق فی ذلك بینکم'' (اس نے تم میں سے ہر ایک کو دو بشر والدین سے پیدا کیا کہ اس حوالہ سے تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں ہے) تو اس کا ثبوت سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ میں موجود ہے جس میں ارشاد ہوا: ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ'' (اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہ و قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہو) تو اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم میں سے ہر شخص کی ولادت اپنی ہی نوع کے دو افراد یعنی مرد اور عورت کے ذریعے ہوئی ہے اور اس حوالہ سے تم میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

ازالہ

اس رائے میں واضح بطلان پایا جاتا ہے اور وہ یوں کہ دونوں آیتوں میں یعنی سورۂ نساء کی آیت اور سورۂ حجرات کی آیت میں واضح فرق پایا جاتا ہے کیونکہ سورۂ حجرات کی آیت میں افراد بشر کے درمیان انسانی حقیقت کے حوالہ سے وحدت و

یگانگت کا بیان مقصود ہے اور یہ کہ ان کے درمیان اس حوالہ سے کوئی فرق نہیں پایا جاتا کہ ان میں سے ہر ایک کی بازگشت و منتہاء دو انسانوں ماں باپ کی طرف ہوتی ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک، دوسرے پر اپنی بڑائی کا اظہار کرے اور کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے! جبکہ سورۂ نساء کی آیت میں افرادِ بشر کے وجودی سرچشمہ کی نسبت سے وحدت کا بیان مقصود ہے یعنی وہ مردوں و عورتوں کی عددی کثرت کے باوجود ایک ہی اصل و حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی کثرت ان دو کے ملاپ سے وجود میں آئی ہے جیسا کہ جملہ ''وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً'' سے واضح ہے۔ بنا بر ایں یہ معنی جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں مذکورہ رائے سے موزونیت نہیں رکھتا کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ''نفس واحدۃ وزوجھا'' سے مراد نسل انسانی سے تعلق رکھنے والا ہر مرد و عورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات سورۂ مبارکہ کی غرض و غایت سے بھی ہم رنگی نہیں رکھتی، جیسا کہ اس حوالہ سے بیان ہو چکا ہے۔

''زوج'' کے معنی کی وضاحت

آیت مبارکہ ''وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا'' میں لفظ زوج ذکر ہوا ہے، راغب اصفہانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب المفردات میں لکھا ہے: ''یقال لکل واحد من القرینین من الذکر والانثی فی الحیوانات المتزاوجہ: زوج ولکل قرینین فیھا وفی غیرھا: زوج کالخف والنعل، ولکل ما یقترن بآخر مماثلا لہ اومضادًا: زوج.........وزوجۃ لغۃ ردیئۃ'' ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم کرنے والے حیوانات میں سے دو نر اور مادہ جوڑے میں سے ہر ایک کو زوج کہا جاتا ہے، اور انہی میں اور ان کے علاوہ دیگر حیوانات میں ہر جوڑے کو زوج سے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً: سینگ، ناخن اور ہر اس چیز کو زوج کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کے ساتھ پیوستہ ہو خواہ اس جیسی ہو یا اس کی ضد یعنی مدمقابل ہو اور جہاں تک لفظ ''زوجہ'' کا تعلق ہے تو وہ فضول و غلط لغت ہے۔

جملہ ''وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا'' (اور اس نے اس سے اس کا زوج پیدا کیا) سے بظاہر اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ زوج سے اس کی مثل ہمنوع مراد ہے، اور یہ کہ جو افراد اس دائرے میں آتے ہیں ان سب کی بازگشت انہی دو کی طرف ہوتی ہے جو ہم مثل و ہم شباہت ہیں، اور آیت میں حرف ''من'' نشوئیہ (بمعنی مصدر و سرچشمہ) ہے، بنا بر ایں آیت مبارکہ درج ذیل آیت شریفہ کے طرز پر ہے:

○ سورۂ روم، آیت ۲۱:

''وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً''

(اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے خود تم ہی سے جوڑے پیدا کئے تا کہ تم ان سے تسکین پاؤ اور

اس نے تمہارے درمیان مودت ورحمت کا رشتہ قائم کر دیا)

سورۂ نحل، آیت ۷۲:

○ ''وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا وَّجَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ بَنِیۡنَ وَحَفَدَۃً''

(اور اللہ نے تمہارے لئے خود تم ہی سے جوڑے پیدا کئے اور تمہارے لئے جوڑوں سے بیٹے و نواسے بنائے)

سورۂ شوریٰ، آیت ۱۱:

○ ''فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا وَّمِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡہِ''

(وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے تمہارے لئے خود تم ہی سے جوڑے قرار دیئے اور چوپایوں سے جوڑے بنائے اس صورت میں تمہاری افزائش نسل کرتا ہے)

سورۂ ذاریات، آیت ۴۹:

○ ''وَمِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ''

(اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کئے)

بعض تفاسیر میں ''زوج'' کی بحث میں مذکور ہے کہ آیت میں اسی نفس سے زوج بنائے جانے سے مراد یہ ہے کہ اسے اسی سے مشتق کیا گیا ہے اور اسے اس کے جزء وحصہ سے خلق کیا گیا ہے، یہ بات ان روایات سے مطابقت کی حامل ہے جن میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء زوجۂ آدمؑ کو ان کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے خلق فرمایا ہے ''ان اللہ خلق زوجۃ ادم من ضلع من اضلاعہ'' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

افزائش نسل انسانی

نسل انسانی کی افزائش کے حوالہ سے آیت مبارکہ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ''وَبَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّنِسَآءً''

(اور اس نے ان دو سے کثیر مرد اور عورتیں پھیلا دیں)

لفظ ''بَثَّ'' کا معنی پھیلانا، متفرق کرنا اور اشارہ وغیرہ کے ذریعے پراکندہ کر دینا ہے، چنانچہ اسی حوالہ سے ارشاد ہوا:

سورۂ واقعہ، آیت ۶:

''فَکَانَتۡ ہَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۙ''

(پھر وہ ہوا میں اڑتے ہوئے ذرّے بن جائیں گے)

اسی سے ''بث الغم'' یعنی غم بکھیرنا استعمال ہوتا ہے، اور اسی مناسبت سے لفظ ''بَثّ'' سے خود غم بھی مراد لیا جاتا ہے کیونکہ غم ایسی چیز ہے جسے طبع انسانی اپنے سے دور کرتی ہے، چنانچہ درج ذیل آیت میں یوں مذکور ہے:

سورۂ یوسف، آیت ۸۶:

○ ''قَالَ اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّیۡ وَحُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ''

(اس نے کہا میں اپنے غم ودکھ کا شکوہ اللہ سے کرتا ہوں)

آیت مبارکہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نسل انسانی کا سلسلہ حضرت آدمؑ اوران کی زوجہ تک منتہی ہوتا ہے اور اس میں ان کے علاوہ کوئی ان کے ساتھ شریک نہیں چنانچہ اس مطلب کا ثبوت ان الفاظ سے ملتا ہے: ''وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً'' اوراس نے ان دو سے کثیر مردوں وعورتوں کو پھیلایا، یہاں یوں نہیں فرمایا: ''منهما ومن غيرهما'' یعنی ان دو اوران کے علاوہ دیگر سے، اس سے دو مطلب مزید سامنے آتے ہیں:

(۱) الفاظ ''رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً'' (کثیر مردوں اور عورتیں) سے ان دو کی نسل وذریت سے افرادِ بشر مراد ہیں خواہ بلاواسطہ اولاد ہو یا بالواسطہ، گویا یوں کہا گیا ہے: ''وبثكم منهما ايها الناس'' اوراس نے تمہیں ان دو سے پھیلا دیا ہے اے لوگو!

(۲) حضرت آدمؑ اوران کی زوجہ کے بعد پہلے طبقہ میں رشتۂ ازواج ان کی اولاد میں بلاواسطہ قائم ہوا یعنی بھائیوں اور بہنوں سے یہ سلسلہ چلا کیونکہ مرد اور عورتیں اس وقت انہی میں منحصر تھیں، ان کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا، اس میں اس لئے بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ دستوری وقانونی مسئلہ ہے جس کا تعلق خود اللہ تعالیٰ سے ہے کہ اس کا حق ہے کہ جب چاہے کسی چیز کو حلال وجائز قرار دے اور جب چاہے اسے حرام وناجائز کردے چنانچہ اس حوالہ سے اس نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ رعد، آیت: ۴۱

○ ''وَاللّٰهُ يَحۡكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكۡمِهٖ''

(اور یہ اللہ ہی حکم دیتا ہے اس کے فرمان کو روکنے والا کوئی نہیں)

سورۂ یوسف، آیت: ۴۰

○ ''اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ''

(حکم وفرمان صرف خدا کا حق ہے)

سورۂ کہف، آیت: ۲۶

○ ''وَّلَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا''

(اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا)

سورۂ قصص، آیت:۷۰

○ ’’وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ‘‘

(اور وہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود اس کے سوا، اسی کے لئے دنیا و آخرت میں حمد ہے اور اسی کیلئے ہے حکم دینا، اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)

جملہ ’’وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ‘‘ میں تساؤل سے لوگوں کا ایک دوسرے سے اللہ کے نام پر سوال کرنا، پوچھنا و مانگنا اور دریافت کرنا مراد ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے اس طرح سوال کرتے ہیں: ’’اسألك بالله ان تفعل كذا و كذا‘‘ (میں تجھ سے اللہ کے نام پر سوال کرتا ہوں کہ تم یہ کام انجام دو) دراصل ایسا کرنا اللہ کی قسم دینا ہے، اور اللہ کے نام پر ایک دوسرے سے سوال کرنا اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ہاں عظمت و بزرگی رکھتا ہے اور وہ اسے دوست رکھتے ہیں کیونکہ انسان اسی چیز کی قسم کھاتا ہے جو اس کے نزدیک حرمت و عظمت رکھتی ہو اور وہ اس سے محبت کرتا ہو۔

اور لفظ ’’الْاَرْحَامَ‘‘ بظاہر لفظ جلالہ ’’اللّٰهَ‘‘ پر عطف ہے یعنی ’’وَاتَّقُوا الْاَرْحَامَ‘‘ (تم ارحام کا تقویٰ اختیار کرو) اس کی بابت یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی برگشت ضمیر ’’بِهٖ‘‘ کی طرف ہے اور وہ اعراب کے لحاظ سے منصوب ہے یعنی زبر کے معنی میں ہے جیسا کہ یوں کہا جاتا ہے: ’’مررت بزيد و عمراً‘‘ میں زید اور عمر کے ساتھ گزرا، اس کی تائید حمزہ کی قرأت سے بھی ہوگئی ہے کہ وہ اس طرح پڑھا کرتے تھے: ’’وَالْاَرْحَامِ‘‘ ’م کے نیچے زیر کے ساتھ! اور وہ اسے ضمیر متصل مجرور پر عطف قرار دیتے تھے، لیکن نحویوں نے ان کی رائے کو ضعیف قرار دیا ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا: تم تقوائے الٰہی اختیار کرو وہ کہ تم جس کے نام پر اور ارحام کے ناموں پر ایک دوسرے سے سوال کرتے رہتے ہو اور یوں کہتے ہو: ’’اسألك بالله واسألك بالرحم‘‘ (میں تجھ سے اللہ کے نام پر سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے رحم کے نام پر سوال کرتا ہوں) اس رائے کی تائید کلام کے اسلوب بیان اور قرآن کے طرزِ سخن سے موزونیت نہیں رکھتی کیونکہ اگر لفظ ’’وَالْاَرْحَامَ‘‘ کو اسم موصول ’’الَّذِيْ‘‘ کا مستقل صلہ قرار دیں اور کلام کی ترتیب یوں مانیں: ’’واتقوا الله الذی تساءلون بالارحام‘‘ تو اس صورت میں کلام ضمیر سے خالی ہو جائے گا جو کہ درست نہیں اور اگر اسے اور اس سے ماقبل کو مجموعی صورت میں اسم موصول ’’الَّذِيْ‘‘ کا صلہ قرار دیں تو اس سے اللہ تعالیٰ اور ارحام یکساں ہو جائیں گے اور عظمت و عزت میں برابر قرار پائیں گے جبکہ ایسا ہونا ادبِ قرآن کے سراسر منافی ہے۔

اور جہاں تک تقویٰ کی ارحام کی طرف نسبت کا تعلق ہے کہ وہ بھی اسی طرح سے ہے جیسے اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہے تو اس میں اس لحاظ سے کوئی حرج نہیں کہ ارحام بھی خداوند عالم کے کارخانہ صنعت و خلقت کا شاہکار ہے، ویسے بھی کلام الٰہی میں تقویٰ کی نسبت غیر خدا کی طرف بھی مذکور ہے ملاحظہ ہو:

سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۱:

○ ''وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ''

(اور تم اس دن سے ڈرو جس میں اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے)

سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۱:

○ ''وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ''

(اور تم اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے مقرر کی گئی ہے)

سورۂ انفال، آیت: ۲۵

○ ''وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً''

(اور تم اس فتنہ سے ڈرو کہ جو تم میں سے صرف ظالموں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے گا)

ان آیات میں ''تقویٰ'' کی نسبت قیامت کے دن، قیامت کے دن کی آگ اور فتنہ کے ساتھ اپنے معنی کی ترجمانی کرتی ہے۔

بہرحال کلام الٰہی کا یہ حصہ، پہلے حصہ کی نسبت سے اطلاق کے بعد تقیید اور وسعت کے بعد تضییق کی صورت میں ہے۔ یعنی پہلے حصہ میں عمومیت جبکہ اس حصہ میں محدودیت ہے اور پہلے حصہ میں معنی کا دائرہ وسیع جبکہ اس حصہ میں تنگ ہے اور وہ اس طرح کہ پہلے حصہ میں یوں ارشاد ہوا: ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً'' (اے لوگو! تم اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کرو، وہ کہ جس نے تمہیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا خلق کیا اور ان دونوں سے کثیر مردوں اور عورتوں کا جال بچھا دیا) تو اس میں یہ کہا گیا ہے کہ تم اللہ سے اس کی ربوبیت کے حوالہ سے تقویٰ اختیار کرو، اور یہ کہ اس نے تمہیں پیدا کیا اور اس نے تمہیں ـــــ اے بنی نوع انسان ـــــ ایک ہی سنخ سے قرار دیا جو کہ اصل حقیقت کے ساتھ تمہارے اندر موجود ہے اور تمہاری کثرت کے ساتھ اپنی مادی حقیقت میں بڑھتی رہتی ہے اور یہی انسانی نوع کی اصل جوہری حقیقت ہے، اس حصہ میں ربوبیت، تخلیق اور افزائش نسل کے اسباب فراہم کرنے کے حوالہ سے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو کہ مطلق و عام حکم ہے جبکہ دوسرے حصہ میں یوں ارشاد ہے ''وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا'' (اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو، وہ کہ تم جس کی قسمیں کھا کر ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہو) یعنی تقوائے الٰہی اختیار کرنے کے حکم میں عظمت خداوندی کا حوالہ دیا گیا ہے کہ وہ ذات کہ تم جس کی قسمیں کھا کر ایک دوسرے سے باتیں پوچھتے ہو اور اپنے ہاں اسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہو، اس کا تقویٰ اختیار کرو (اور یہی بات ربوبیت کی خصوصیات و لوازم میں سے ہے اور اس کے متعلقہ امور میں شامل ہے)

اور جملہ ''وَالْاَرْحَامَ'' میں اس رحمی وحدت کا حوالہ دیا گیا ہے جو تخلیق بشر کا محور ہے یعنی تم اس رحمی وحدت کا لحاظ رکھو اور اس کے احترام کے تقاضے پورے کرو کہ جسے اللہ تعالیٰ نے تمہاری وجودی نسلوں کی بنیاد بنایا ہے (رحم، افراد بشر کے درمیان پائی جانے والی اس سنخی وحدت کا حصہ ہے جو ہر انسان میں برابر پائی جاتی ہے)

اس بیان سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ آیت میں جملہ ''وَاتَّقُوا'' دوبار کیوں ذکر ہوا؟ یعنی پہلے حصہ میں ''اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ.........'' کہا گیا اور پھر دوسرے حصہ میں ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ.........'' کہا گیا تو دوسرا جملہ درحقیقت پہلے جملہ ہی کا تکرار ہے البتہ ایک اضافہ کے ساتھ، اور وہ ارحام کے ذریعے وجودی سلسلہ کے کامل اہتمام کی طرف توجہ دلانا ہے۔

''رحم'' اصل میں عورت کے جسم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں بچہ کی نشوونما اور وجودی مراحل کا آغاز ہوتا ہے اور نطفہ ٹھہرنے کے بعد بچہ بننے کے سلسلہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ یہ تو ہے اس کا اصل معنی، لیکن بعد میں اسے ظرف و مظروف کے حوالہ سے ''قرابتداری'' کے معنی میں استعارۃً استعمال کیا گیا کیونکہ تمام قرابتدار ایک ہی رحم سے پیدا ہونے کی وجہ سے قدر مشترک رکھتے ہیں، بنابرایں ''رحم'' سے مراد قریبی اور ''ارحام'' سے مراد اقرباء ہیں، قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ میں ''رحم'' کو اسی طرح اہمیت دی گئی ہے جس طرح ''قوم'' اور ''امت'' کو نہایت اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ ''رحم'' ایک چھوٹے معاشرہ کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ ''قوم'' بڑا معاشرہ ہوتا ہے، قرآن مجید نے ''معاشرہ'' کو نہایت اہمیت دیتے ہوئے اسے خصوصیات اور آثار کی حامل حقیقت قرار دیا ہے اور یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جس طرح اس نے ایک انسان کو انفرادی حیثیت کے ساتھ اہمیت دی اور اسے ان خصوصیات و آثار کی حامل حقیقت قرار دیا جن کا سرچشمہ ''وجود'' ہے۔ چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ فرقان، آیت: ۵۳۔۵۴

○ ''وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾''

(اور وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو ایک ساتھ ملایا، ایک کا پانی میٹھا اور ایک کا پانی کڑوا ہے، اور اس نے دونوں کے درمیان حد فاصل قرار دی اور مضبوط رکاوٹ بنادی، اور وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا، پھر اسے خاندان اور سسرالی رشتہ کی صورت دے دی اور تیرا پروردگار، بہت طاقتور ہے)

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

○ ''وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا''

(اور ہم نے تمہیں شعبے اور قبیلے بنادیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو)

سورۂ احزاب، آیت ۶:

○ ''وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ''
(اور قرابتدار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں)

سورۂ محمد، آیت: ۲۲

○ ''فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ''
(تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر تم روگردانی کرلو تو زمین میں فتنہ وفساد برپا کردو گے اور آپس میں قرابتداروں کو ختم کردو گے)

سورۂ نساء، آیت: ۹

○ ''وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ''
(اور وہ لوگ ڈریں جو اپنے پیچھے کمزور اولادیں چھوڑ کر جائیں، ان کے بارے میں فکرمند رہیں)

اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی یہ موضوع ذکر ہوا ہے۔

سب پر خدا کی نگرانی ونگہبانی

○ ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا''
(بے شک اللہ تم پر نگران ونگہبان ہے)

اس آیت مبارکہ میں لفظ ''رقیب'' استعمال ہوا ہے جس کا معنی ''حفیظ'' یعنی حفاظت کرنے والا، نگران ونگہبان ہے، ''مراقبت'' کا معنی محافظت ہے، گویا یہ لفظ ''رقبۃ'' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی گردن ہے، اس مناسبت سے غلام کو بھی ''رقبۃ'' کہا جاتا ہے اور عربوں میں عام دستور تھا کہ وہ اپنے غلاموں کی گردنوں کی حفاظت کرتے تھے، اس مناسبت سے غلاموں کو ''رقاب'' سے تعبیر کیا جاتا تھا، یا اس مناسبت سے ''رقیب'' کہا جاتا تھا کہ رقیب یعنی حفاظت کرنے والا جس کی حفاظت کرتا تھا اس پر گردن اٹھا کر نگران کی طرح رہتا تھا، اور ''رقوب'' کا معنی ہر طرح کی حفاظت کرنا نہیں بلکہ نگرانی کئے جانے والے شخص کے اعمال اور حرکات وسکنات پر اس لئے نگاہ رکھنے کے معنی میں آیا ہے کہ اس کی خامیوں، غلطیوں کی اصلاح کر کے اس کی درستگی ودرستی کو یقینی بنایا جائے، گویا اس سے مراد کسی چیز کی علم ومشاہدہ کے ذریعے دیکھ بھال اور نگرانی و نگہبانی کرنے کو ''رقوب'' کہا جاتا ہے، اسی مناسبت سے اس کا استعمال نگہبانی، نگرانی، دیکھ بھال اور بھرپور کنٹرول کرنے کے معانی میں ہوتا ہے، اس حوالہ سے خداوند عالم کا حفیظ ورقیب ہونا یوں ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کا نگران ہے تاکہ انہیں ان کے اعمال کی جزا دے، اس سلسلہ سے مربوط قرآنی آیات مبارکہ اس طرح گویا ہیں:

سورۂ سبا، آیت:۲۱

○ ''وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ''

(اور تیرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ومحافظ ہے)

سورۂ شوریٰ، آیت:۶

○ ''اللّٰهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ ۫ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ''

اللہ ان پر نگران ونگہبان ہے اور آپ ان پر نگران نہیں

سورۂ فجر، آیت:۱۳۔۱۴

○ ''فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۞ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۞''

(تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا اتا نا بے شک تیرا پروردگار گھات میں ہے)

اگر خداوند عالم کے رقیب وحفیظ یعنی نگران ونگہبان ہونے کے تناظر میں انسانی وحدت اور افراد بشر کے درمیان یکجہتی اور اس کے آثار ولوازم کے تحفظ میں تقویٰ اختیار کرنے کے حکم کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اوامر الٰہی کی کامل پیروی واطاعت کے ساتھ اس کی حکم عدولی ومخالفت سے سخت ڈرایا گیا ہے اور لوگوں کو خدا کی نافرمانی سے دوری اختیار کرنے کی بھرپور تاکید کی گئی ہے، اس سے یہ بات بھی واضح وروشن ہوجاتی ہے کہ آیت مبارکہ میں تقوائے الٰہی اختیار کرنے کے حکم کو خدا کے نگہبان ونگران ہونے سے مربوط کر کے ذکر کرنے میں اصل مقصود یہ ہے کہ لوگ خدائی فرامین کی مخالفت نہ کریں اور اس کی نافرمانی کے سخت نتائج ہمیشہ مدنظر قرار دیں چنانچہ اس حوالہ سے ان آیات کا اس موضوع یعنی ''انسانی وحدت کو فتنہ وفساد اور نابودی سے بچانے'' سے ربط بھی واضح ہوجاتا ہے جن میں بغاوت، ظلم، زمین میں فتنہ وفساد اور طغیان برپا کرنے کا تذکرہ کر کے ان کے نہایت سنگین نتائج وانجام سے باخبر کیا گیا ہے۔

نوع انسان کی عمر اور پہلا انسان

یہودیوں کی تاریخ میں نوع انسانی کی عمر کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اس کی عمر سات ہزار سال کے لگ بھگ ہے اس سے زیادہ نہیں، یہ اندازہ کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم نوع انسانی میں سے ایک مرد اور ایک عورت کے زوج اور زوجہ کے حوالہ سے تصور کریں اور انہیں عمر کے ایک متوسط دورانیہ میں دیکھیں کہ وہ اس میں صحت وسلامتی کی متوسط حالت

کے ساتھ امن وسکون کی متوسط حالت میں زندگی بسر کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون زندگی گزارنے کے تمام اسباب بھی فراہم تھے اور انہوں نے ان حالات میں باہم ازدواجی رشتہ قائم کر کے افزائش نسل کا سلسلہ بھی متوسط وموزوں حالات میں قائم کیا (بچے پیدا کئے) پھر اسی تصور کو بعینہٖ ان کی اولادوں میں لائیں کہ اُنہوں نے بھی تمام امور متوسط حالات میں انجام دیئے (شادیاں کیں اور بچے پیدا کئے) تو اس کے نتیجہ میں ہم جس تعداد کو پہنچیں گے وہ یہ کہ پہلے وہ صرف دو (۲) تھے اور ایک صدی (سوسال) میں ایک ہزار (۱۰۰۰) ہو گئے یعنی ہر شخص سوسال میں پانچ سو افراد کو جنم دیتا ہے، پھر ہم ان حالات کے تناظر میں بحث کریں جو نوع انسانی پر طاری ہوتے رہتے ہیں اور اس کی ہستی کو نابود کر دیتے ہیں مثلاً گرمی، سردی، طوفان، زلزلہ، قحطی، وباء، طاعون کی بیماری، زمین کا دھنس جانا، چاند وسورج کا گھن لگنا، تباہ کن جنگیں اور دیگر تمام مصائب و تکالیف، ان تمام عوامل واسباب کے نتیجہ میں نوع انسانی کی تباہی سے پیدا ہونے والی صورتحال میں مذکورہ بالا تعداد کی زیادہ سے زیادہ نسبت فرض کریں یعنی ایک ہزار (۱۰۰۰) میں سے نوسوننانوے (۹۹۹) افراد کا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا فرض کریں گویا یہ کہ ہر سوسال میں ایک ہزار افراد میں سے صرف ایک کا زندہ رہنا بھی فرض کریں (اور وہ اس طرح کہ ہر صدی میں دو افراد سے صرف ایک فرد کا اضافہ ہوتا ہے پھر اس عدد (سات ہزار سال) (۷۰ صدیوں) میں پھیلائیں تو اس سے مجموعی طور پر ڈھائی ملین سے زیادہ افراد ہوتے ہیں جو کہ عصر حاضر کے عالمی رائے شماری کرنے والے اداروں کے اعلان کے مطابق افراد بشر کی مجموعی تعداد بھی یہی ہے۔

مذکورہ بالا حساب نوع انسانی کی عمر کے تعین کی بابت ذکر کیا گیا ہے لیکن علم جیولوجی (طبقات الارض کا علم) کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اس نوع کی عمر کئی ملین سالوں سے زیادہ ہے چنانچہ اُنہوں نے اس حوالہ سے اپنی تحقیق میں آثار قدیمہ پر بحث کی اور انسانی ڈھانچے وجسمانی اعضاء کی بوسیدگی کی جانچ پڑتال کے بعد اپنے مقررہ معیاروں واصولوں کے مطابق اس نتیجہ تک پہنچے کہ اس کی عمر پانچ سو ہزار سال ہے۔

یہ علم طبقات الارض کے ماہرین کی رائے ہے مگر اُن کی پیش کردہ دلیلیں بظاہر درست نظر نہیں آتیں اور اطمینان بخش نہیں قرار دی جاسکتیں، کیونکہ جب گذشتہ ادوار کی نسلوں کے متصل ومربوط سلسلے پر نظر کریں تو قدیم انسانی ڈھانچوں پر تحقیق کرنے کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ موجودہ دور کے انسانوں ہی کے اسلاف ہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ کوئی دور ایسا بھی گزرا ہو جس میں بنی نوع انسان کے کچھ افراد زندگی بسر کرتے ہوں یعنی اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ نوع انسانی اسی زمین میں وجود میں آئی ہو پھر اس کی مقدار میں اضافہ ہوا ہو اور وہ بڑھتی رہی ہو، یہاں تک کہ طویل عرصہ زندہ رہی ہو اور پھر ختم ہو گئی ہو، اور وجود میں آنے اور ختم ہو جانے کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا ہو اور بار بار وجود میں آ کر اور ظہور پذیر ہونے کے بعد ختم ہو گئی ہو یہاں تک کہ یہ سلسلہ کئی ادوار پر محیط ہو اور پھر ہماری نسل تک پہنچا ہو جو کہ ان ادوار کی آخری کڑی ہو، اس امکان کو کسی مضبوط

دلیل کے ساتھ رد نہیں کیا گیا۔

لیکن اس حوالہ سے قرآن مجید میں کوئی صراحت اور واضح بیان موجود نہیں جس سے یہ بات ثابت ہو سکے کہ نوع انسانی اسی دورانیہ میں ظہور پذیر ہوئی جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں یا اس سے پہلے متعدد ادوار گزر چکے ہیں اور ہم اس کے آخری دور میں ہیں! البتہ سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰ (وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ....) (اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا کیا تو اسے بنا رہا ہے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا ......) سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دور سے پہلے بھی ایک دور گزرا ہے جس میں نوع انسانی موجود تھی اس آیت کی تفسیر میں اس موضوع کو اشارۃً بیان کیا جا چکا ہے۔

ہاں، آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی بعض روایات میں اس دور سے پہلے متعدد ادوار کا ثبوت ملتا ہے جن میں نوع انسانی موجود تھی، روایات پر ایک نظر کے عنوان سے کی جانے والی بحث میں اس حوالہ سے مزید مطالب پیش کئے جائیں گے۔

کیا موجودہ نسل کا سلسلہ آدمؑ اور ان کی زوجہ سے ملتا ہے؟

نوع انسانی کا وجودی سلسلہ حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ پر منتہی ہوتا ہے یا نہیں؟ اس موضوع کی بابت مختلف آراء و اقوال اور نظریات پائے جاتے ہیں جن میں سے اہم ترین دو ہیں:

پہلا نظریہ: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بنی نوع انسان کے افراد میں رنگوں کا مختلف ہونا ان سب کے ایک ہی سلسلہ سے تعلق نہ رکھنے کا ثبوت دیتا ہے، عام طور پر افرادِ بشر چار رنگوں کے ہیں: سفید، کالا، زرد اور سرخ ان میں سے زیادہ تر سفید رنگ والے ہیں جو معتدل موسم والے علاقوں مثلاً ایشیا اور یورپ میں رہنے والے ہیں، دوسرا رنگ کالا ہے جو جنوبی افریقہ کے باسیوں کا ہے، تیسرا زرد رنگ ہے جو چین اور جاپان والوں کا ہے اور چوتھا سرخ رنگ ہے جو انڈین امریکیوں (سرخ انڈین) کا ہے تو ان میں سے ہر ایک کا وجودی سلسلہ مستقل ہے، کوئی بھی ایک دوسرے کے وجودی سلسلہ سے تعلق نہیں رکھتا یعنی سفید رنگ والے شخص کا وجودی سلسلہ (نسل) اس نسل پر منتہی نہیں ہوتا جس پر سیاہ یا دوسرے رنگ والے شخص کی نسل منتہی ہوتی ہے کیونکہ رنگوں کا مختلف ہونا خون کی خصوصیات وطبعی آثار کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے، بنا برایں تمام افراد بشر اصولی بنیادوں اور بنیادی اصولوں کے حوالہ سے مجموعی طور پر چار جوڑوں سے کم نہیں کیونکہ ان کے چار ہی رنگ ہیں، اور اس نظریہ کی صحت پر یہ دلیل بھی قائم کی جاتی ہے کہ جب قارۂ امریکہ کا انکشاف ہوا یعنی اس خطہ میں انسانی آبادی کے قابل زمین ڈھونڈی

گئی کہ جس میں کچھ سرخ پوست لوگ آباد تھے اور وہ نصف کرۂ شرقی میں بسنے والے بنی نوع انسان سے نہایت دور فاصلہ پر رہتے تھے اور ان کے درمیان جغرافیائی دوری اس قدر تھی کہ ان دونسلوں کے ایک دوسرے سے ربط و وصل کی امید ہی نہیں کی جاسکتی تھی جو ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا ہوئے ہوں۔

مذکورہ بالا دونوں دلیلیں نا قابل قبول ہیں اور وہ یوں کہ:۔

(۱) جہاں تک خون کی خصوصیات و طبیعی اثرات کی وجہ سے رنگوں کے مختلف ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں عصر حاضر میں ہونے والی طبیعیات کی بحثیں، نوعوں کے تطوّر و تبدیلی اور ترقی کے فرضیہ پر مبنی ہیں، تو اس کے باوجود رنگوں کے مختلف ہونے سے خون کے مختلف ہونے کو اس تطور و تبدیلی اور ترقی کا نتیجہ کیوں قرار نہیں دیا جاسکتا؟ جبکہ اس نظریہ کے قائل دانشور حضرات قطعی و یقینی طور پر حیوانات مثلاً گھوڑا، بھیڑ بکری اور ہاتھی وغیرہ میں نوعی تبدیلی کے قائل ہیں، اور جیولوجی کی بحثوں سے آثار قدیمہ اور زمین کے نیچے پائی جانے والی موجودات کی بابت تطور و تحول اور تبدیلی کے ثبوت بھی مل چکے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عصر حاضر کے دانشور رنگوں کے مختلف ہونے کو اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہی نہیں (چنانچہ موجودہ دور کے جرائد میں شائع ہوا ہے کہ اطباء و سائنسدانوں کے ایک گروہ نے ایک فارمولہ تلاش کیا ہے جس سے انسانی جلد کا رنگ تبدیل کیا جاسکتا ہے مثلاً سیاہ کو سفید بنایا جاسکتا ہے)۔

(۲) جہاں دریاؤں کے اس پار ایسے افراد بشر کی موجودگی کے انکشاف کا تعلق ہے جو سرخ رنگ والے تھے، تو علم الطبیعہ کے ماہرین کے بیانات کے مطابق نوع انسانی کئی ملین سالوں سے زیادہ پر محیط ہے، البتہ منقولی تاریخ اسے چھ ہزار سال سے زیادہ قرار نہیں دیتی، تو اس صورتحال کے مطابق تاریخ نویسی سے قبل کے دورانیہ میں کسی ایسے واقعہ کا رونما ہونا خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا کہ جب قارۂ امریکہ دوسرے قاروں سے جدا ہو چنانچہ اس کی تائید و تصدیق ان کثیر زمینی آثار سے ہوتی ہے جو روئے زمین پر مختلف تبدیلیوں کا پتہ دیتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس قدر تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ دریا، صحرا بن گئے اور میدان سمندروں میں تبدیل ہو گئے، پہاڑ نرم زمین اور نرم زمین پہاڑ میں بدل گئی، بلکہ اس سے بڑی تبدیلی اور کیا ہوسکتی ہے کہ دو قطب اور خطے کے خطے اپنی اصل حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو گئے جیسا کہ اس سلسلہ میں جیولوجی، علم طبقات الارض، علم ہیئت اور علم جغرافیا کے ماہرین نے وضاحت کے ساتھ ان تبدیلیوں کی تصدیق کی ہے، بنا برایں اس دلیل پیش کرنے والوں کے پاس ایک مفروضہ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے تو اس کی آیات مبارکہ کے ظواہر سے تقریباً یہ مطلب یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے اور اسے ''نص'' کی حد تک قرار دیا جاسکتا ہے کہ موجودہ انسان کا ارتقائی سلسلہ ایک مرد اور ایک عورت تک جا پہنچتا ہے جو کہ تمام افراد بشر کے ماں باپ ہیں اور باپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں آدم کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن ان کی زوجہ

کا نام ذکر نہیں کیا لیکن روایات میں ان کا نام ''حوا'' ذکر ہوا ہے جیسا کہ موجودہ تورات میں بھی مذکور ہے، اور قرآن مجید میں یوں بیان ہوا:

سورۂ الم سجدہ، آیت: ۷۔۸

○ ''وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۞ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۞''

(اور اس نے انسان کی تخلیق کا آغاز مٹی سے کیا، پھر اس کی نسل کو پست پانی سے قرار دیا)

سورۂ آلِ عمران، آیت: ۵۹

○ ''اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞''

(بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا، ہو جا، تو وہ ہو گیا)

سورۂ بقرہ، آیت: ۳۰۔۳۱

○ ''وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا''

(اور اس وقت کو یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا: کیا تو اسے بنا رہا ہے جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس بجالاتے ہیں خدا نے کہا، جو کچھ میں بہتر جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے، اور اس نے آدم کو سب نام پڑھائے ....)

سورۂ ص، آیت ۷۲:

○ ''اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۞ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۞''

(جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر خلق کر رہا ہوں تو جب میں اسے مکمل کروں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریزہ ہو جانا)

مذکورہ آیات جیسا کہ آپ نے دیکھا اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ نوع انسانی کی بقاء میں اللہ تعالیٰ کا نظام و طرز عمل یہ ہے کہ اسے نطفہ سے وابستہ کرے لیکن اس کا وجودی اظہار اسے مٹی سے خلق کر کے کرے، اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے اور دیگر سب لوگ ان کی اولاد و نسل ہے۔ لہٰذا ان آیات مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نسل کی انتہاء یعنی بازگشت حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ کی طرف ہوتی ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس میں کوئی شک نہیں پایا جاتا، اگرچہ اس میں تاویل کی راہیں بند نہیں۔

دوسرا نظریہ:۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ خلقت انسان اور اسے سجدہ کرنے کے حوالہ سے جو آیات مبارکہ قرآن مجید میں مذکور ہیں ان میں آدم سے، نوع آدم مراد ہے ایک شخص مراد نہیں، گویا انسان بحیثیت انسان کی خلقت زمین پر منتہی ہوتی ہے (یعنی اس کا وجود زمین سے وابستہ ہے کیونکہ اس کے وجود کے مادّی اجزاء کا تعلق زمین سے ہے) اور وہ افزائش نسل کے لئے عملی اقدام کرتا ہے لہٰذا اسے آدم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ اس کا ثبوت قرآن مجید میں بھی موجود ہے، ارشاد الٰہی ہے۔

سورۂ اعراف، آیت:۱۱

○ ''وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ....''

(اور ہم نے تمہیں خلق کیا، پھر تمہاری صورتگری کی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو اس مخلوق کے سامنے سربسجدہ ہونے کا حکم دیا گیا جسے اللہ نے خلقت اور صورتگری کے مراحل کی تکمیل کے بعد سجدہ کے لئے تیار کر لیا تھا اور تخلیق وصورتگری کے حوالہ سے کسی ایک شخص کا تذکرہ نہیں ہوا بلکہ تمام افراد بشر کا ذکر ہوا اور یوں ارشاد ہوا: ''وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ'' (ہم نے تمہیں خلق کیا پھر تمہاری صورتگری کی)

اور درج ذیل آیت میں بھی اسی موضوع کو بیان کیا گیا:

سورۂ ص، آیت ۷۵:

○ ''قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ....''

(خدا نے کہا: اے ابلیس! جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا تجھے اس کے سامنے سربہ سجدہ ہونے سے کسی نے منع کیا......) ''وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝'' (ابلیس نے کہا) مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور گمراہ کردوں گا سوائے ان میں ان لوگوں کے جو مخلص ہوں)

اس آیت میں پہلے مفرد اور پھر جمع کے صیغہ سے خلقت اور سجدہ کے حکم کا تذکرہ ہوا ہے۔

لیکن یہ نظریہ درست نہیں کیونکہ ہم نے جو آیات پہلے ذکر کی ہیں یہ ان سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ ان سے متضاد و منافی ہے، اس کے ساتھ ساتھ درج ذیل آیات مبارکہ سے بھی اس کی نفی ہوتی ہے:

سورۂ اعراف، آیت ۲۷:

○ ''يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا''

(اے اولاد آدم، کہیں شیطان تمہیں دھوکہ نہ دے، جیسا کہ اس نے تمہارے والدین کو بہشت سے نکال باہر کیا اور ان کا لباس تن سے جدا کر دیا تاکہ انہیں ان کی شرمگاہیں دکھائے)

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آدم سے مراد، نوع نہیں بلکہ فرد وشخص مراد ہے۔

سورۂ اسریٰ، آیت ۶۲:

○ ''وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝''

(اور ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو، پس انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے کہا: کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے، اس نے یہ بھی کہا کہ کیا تو نے اسے مجھ پر برتری دی ہے، اگر تو مجھے قیامت تک مہلت دے تو میں اس کی نسل کو اپنے گھیرے میں لے لوں گا سوائے چند لوگوں کے!)

اس طرح یہ نظریہ زیر نظر آیت مبارکہ سے بھی متضاد ہے جس کی تفصیل ذکر ہو چکی ہے کہ جس میں ارشاد الٰہی ہوا:

○ ''يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً''

(اے لوگو!) تم اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو، وہ کہ جس نے تمہیں نفس واحدہ سے پیدا کیا، اور اس سے اس کا جوڑا خلق کیا اور ان دونوں سے کثیر مردوں اور عورتوں کو روئے زمین میں پھیلا دیا)

مذکورہ بالا آیات سے جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں۔ اس امر کی نفی ہوتی ہے کہ انسان کو ایک لحاظ سے آدم کے نام سے موسوم کیا جائے اور فرزند آدم کو دوسرے لحاظ سے! اور اس بات کی بھی نفی ہوتی ہے کہ تخلیق کے عمل کو ایک لحاظ سے مٹی کے ساتھ منسوب کیا جائے اور دوسرے لحاظ سے نطفہ کے ساتھ! بالخصوص سورۂ آل عمران کی آیت ۵۹ کے تناظر میں اس نظریہ کی عدم صحت کھل کر سامنے آتی ہے جس میں یوں ارشاد ہوا:

○ ''اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝''

(بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ جسے اس نے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا: ہو جا تو وہ ہو گیا)

اس سے ظاہر و ثابت ہوتا ہے کہ آدم کی تخلیق، عیسیٰ کی طرح اور عیسیٰؑ کی تخلیق آدم جیسی ہے اور دونوں کی تخلیق استثنائی ہے کیونکہ اگر دونوں کی تخلیقی مماثلت تسلیم نہ کی جائے تو عیسیٰؑ کی تخلیق کو استثنائی قرار نہیں دیا جا سکتا جبکہ اس کا استثنائی ہونا اور تولید نسل کے عام سلسلہ سے قطعی طور پر مختلف ہونا یقینی اور ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، بنا برایں نوع آدم مراد لینا تفریط کے باب سے ہے کہ جس کے مقابلے میں افراط پر مبنی رائے پیش کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ آدم کی تخلیق کا نظریہ کفر ہے، یہ رائے اہل سنت کے ایک عالم زین العرب نے پیش کی ہے۔

انسان کی مستقل نوعی حیثیت کا بیان

(انسان کسی دوسری نوع سے تبدیل نہیں ہوا)

سابق الذکر آیات میں زیر نظر موضوع کی بابت کافی ووافی دلائل موجود ومذکور ہیں اوران سب میں موجودہ نسل انسانی کہ جونطفہ سے پیدا ہوئی ہے، اس کا سلسلہ آدم اوران کی زوجہ حوا تک پہنچتا ہے، اوران آیات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کومٹی سے پیدا کیا گیا، اور پوری نوع انسانی کی بازگشت انہی دو کی طرف ہوتی ہے اوران دونوں کا وجودی سلسلہ کسی ایسے سے نہیں ملتا جو ان کے مثل یا ان کی جنس سے ہو بلکہ وہ دونوں جدید الحدوث ہیں یعنی نیا وجود رکھتے ہیں، نیا وجود رکھنے والی مخلوق ہے۔

عصر حاضر میں علم الطبیعہ وانسان شناسی کے ماہرین کے ہاں یہ بات عام مشہور ہے کہ سب سے پہلا انسان تکامل کے بعد کامل انسان ہونے تک پہنچا، اس نظریہ کو اگرچہ متفقہ تائید حاصل نہیں اور دانشوروں نے اس پر اعتراضات کی بارش کردی ہے جس سے کتابوں کے صفحات بھرے ہوئے ہیں لیکن اس نظریہ ومفروضہ کی اصل بنیاد پر سب ہی اتفاق کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان حیوان ہے اور ترقی وتکامل کے بعد انسان بنا، چنانچہ ان مفکرین نے اسی اصل ہی پر انسانی طبع الوجود کے بارے میں بحثیں کی ہیں، اور وہ اس طرح سے کہ انہوں نے سب سے پہلے زمین کے بارے میں یہ فرضیہ قائم کیا کہ وہ ایک سیارہ ہے جو کہ سورج کا ایک ٹکڑا ہے جو اس سے جدا ہوا ہے اور وہ پوری شدت کے ساتھ شعلہ ور تھا اور اپنی روشنی بکھیر رہا تھا پھر ٹھنڈک کے عوامل اس پر مسلط ہو گئے تو وہ ٹھنڈا پڑنے لگا اور اس پر تیز بارشیں برسنے لگیں اور سیلابوں نے اُس پر دھاوا بول دیا تو سمندروں نے اس میں جگہ پالی، پھر آبی وزمینی ترکیبات نے اپنا کام شروع کردیا جس کے نتیجہ میں آبی نباتات نے جنم لیا، پھر ان نباتات کے تکامل پانے اور حیاتی جرثوموں کے حامل ہونے کی وجہ سے مچھلی اور دیگر آبی حیوانات وجود پذیر ہو گئے، پھر زمینی وآبی ''زندگیوں والی اڑان مچھلیاں'' پیدا ہوئیں، پھر بری حیوان اور پھر انسان بن گیا، یہ سب کچھ اس تکاملی سلسلہ کے نتیجہ میں ہوا جو زمینی ترکیب پر چھایا جس سے وجودی ترکیبوں میں مرحلہ بہ مرحلہ تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ہر سابق مرحلہ سے لاحق مرحلہ میں وجودی صورتگری ہوتی رہی جس سے بالترتیب پہلے نباتات، پھر آبی حیوان، پھر دو زندگیوں والا حیوان، پھر بری حیوان اور پھر انسان بنا، یہ سب کچھ موجوداتِ عالم میں پائے جانے والے اس منظم کمال سے واضح وثابت ہو جاتا ہے جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ نقص سے کمال کی طرف رواں دواں رہتے ہیں چنانچہ موجودات کے تکاملی سلسلہ کے جزئی موارد میں تجربات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اور اس فرضیہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ موجودات کی

انواع میں پیدا ہونے والی خصوصیات و آثار کی وجوہات و اسباب کو سمجھا جائے اور ان کے عوامل سے آگاہی حاصل کی جائے لیکن انہوں نے ان امور کی صحت پر کوئی ٹھوس دلیل پیش نہیں کی اور نہ ہی ان کے علاوہ دیگر خصوصیات و آثار کی نفی کا کوئی ثبوت دیا جبکہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ ان انواع کا ایک دوسرے سے کوئی وجودی ربط نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے قطعی مختلف حیثیتیں رکھتی ہیں اور ان کے تکاملی سلسلہ کو ایک دوسرے سے مربوط کئے بغیر بھی وجودی حقیقت میں دیکھا جا سکتا ہے اور اس میں کسی طرح سے کوئی حرج لازم نہیں آتا، بنابراین نوع انسانی کو ایک مستقل مخلوق تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جو دیگر مخلوقات سے قطعی طور پر کوئی ربط نہیں رکھتی اور اس کا وجود خود اس کا اپنا ہے کسی دوسری مخلوق سے تکامل یافتہ نہیں اور اس کی وجودی ترقی اس کے حالات سے تعلق رکھتی ہے اس کی ذات سے نہیں، اس حوالہ سے اس فرضیہ کی صحت اس سے حاصل ہونے والے تجربات سے بھی ممکن دکھائی دیتی ہے کیونکہ ابھی تک ان انواع میں سے کسی ایک کا دوسری نوع میں تبدیل ہونا ثابت نہیں ہو سکتا مثلاً آج تک کوئی تجربہ اس بات کی دلیل نہیں بن سکا کہ کوئی بندر انسان ہو، یعنی بندر سے انسان میں تبدیل ہونے کا کوئی عملی ثبوت سامنے نہیں آیا البتہ ان انواع میں سے بعض میں جو بھی تبدیلی رونما ہوئی وہ اس کی خصوصیات اور لوازم و عوارض میں ہوئی اصل ذات میں نہیں ہوئی۔

بہرحال اس موضوع کے بارے میں تفصیلی بحث کے لئے کسی اور مقام کی ضرورت ہے اور یہاں اس حوالہ سے تذکرہ کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس فرضیہ کی اصل بنیاد کو واضح کیا جائے کہ اس سے بعض مربوطہ مسائل اور متعلقہ امور کی تاویل مقصود ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں، تاہم ان کے بیان کردہ مطالب کی صحت پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جا سکی، لہٰذا قرآن مجید میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نوع انسانی دیگر انواع موجودات سے جدا اور مستقل مخلوق ہے اس کی صحت یقینی ہے اور اس کی نفی پر کوئی علمی دلیل موجود نہیں۔

نوع انسانی کے دوسرے طبقہ کی افزائش نسل کا مسئلہ

نوع انسانی کے پہلے طبقہ یعنی آدمؑ اور ان کی زوجہ کی افزائش نسل ان کے درمیان قائم ہونے والے ازدواجی تعلق کے ذریعہ سے ہوئی اور اس سے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں (بھائی اور بہنیں)، تو ان کے بارے میں بحث یہ ہے کہ ان کی نسل کس طرح آگے چلی یعنی، بہن بھائیوں کے درمیان ازدواجی رشتہ کے ذریعے اُن کی نسل آگے بڑھی یا کسی دوسرے طریقہ سے؟ گویا نوعِ انسانی کے دوسرے طبقہ کی افزائش نسل کیونکر ہوئی؟ اس سلسلہ میں علما و دانشوروں کے ہاں وسیع بحثوں کا سلسلہ موجود ہے جہاں تک قرآنی بیانات کا تعلق ہے تو زیر نظر آیت مبارکہ کے ظاہری الفاظ ''وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً...''

(اور اس نے ان دونوں سے کثیر مردوں اور عورتوں کا سلسلہ قائم کر دیا) سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ سابقہ بیان کردہ مطالب میں اس حوالہ سے اشارہ ہو چکا ہے کہ موجودہ انسان کا وجودی سلسلہ حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ تک پہنچتا ہے کہ اس میں کوئی مرد یا عورت دخیل وشریک نہیں اور ان دو کے علاوہ کسی کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں ہے کیونکہ اگر ان کے علاوہ کوئی شریک ہوتا (یعنی نسل انسانی کی افزائش ان کے علاوہ بھی کسی سے ہوتی) تو خداوند عالم یوں فرماتا: ''وبث منهما ومن غيرهما'' (اور اس نے ان دو اور ان کے علاوہ دیگر سے) یا اس سے مناسب وموزوں الفاظ استعمال کئے جاتے، اور یہ بات معلوم وواضح ہے کہ نسل انسانی کا آغاز آدم اور ان کی زوجہ سے ہوا اور پھر وہ ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کے ذریعے نسل انسانی کو فروغ ملا۔

اس موضوع کی بابت جہاں تک شریعت اسلامیہ اور اسی طرح سابقہ شریعتوں کے حکم کا تعلق ہے تو وہ تشریعی احکام میں سے ہے جو مصالح ومفاسد کی بنیاد پر صادر ہوتے ہیں ان کا تعلق تکوینی احکام سے نہیں کہ جو قابل تبدیلی نہیں ہوتے، تشریعی احکام کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے وہ فیصلہ کرتا ہے اور حکم دیتا ہے، اس لحاظ سے اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ کسی ضرورت ومصلحت کے تحت کسی چیز کو جائز ومباح قرار دے اور پھر ضرورت پوری ہونے اور اس کے معاشرہ میں اسی حالت میں رہنے سے برائی کے عام ہونے کا باعث بننے کی وجہ سے اسے حرام وناجائز قرار دے۔

اور یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ ایسا ہونا غیر فطری عمل ہے یعنی فطرت کے اصولوں کے منافی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو جو احکام دیئے وہ فطرت کے عین مطابق ہیں کہ جسے فطری دین قرار دیا گیا ہے جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ روم، آیت: ۳۰

○ ''فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۗ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۗ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ''

(اپنا رخ خالص دین کی طرف کر لو جو کہ فطرت الٰہیہ ہے کہ جس پر اس نے لوگوں کو خلق کیا، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی، وہی مضبوط دین ہے)۔

اصل فطرت انسانی اس طرح کے عمل کی نفی نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے خلاف اس لئے بلاتی ہے کہ اس نوع کی باہمی مباشرت اسے پسند نہیں بلکہ اس کی ناپسندیدگی اور عمل (بہن بھائیوں کے درمیان ازدواجی رشتہ) کی سخت مخالفت کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں فحشاء ومنکر واخلاقی برائیوں کے پھیلنے اور انسانی معاشرہ میں عفت و پاکدامنی کی بیخ کنی کا باعث بنتا ہے اور یہ واضح ہے کہ اس طرح کا عمل موجودہ دور کے عالمی معاشرہ میں فسق وفجور اور گناہ و برائی میں شمار ہوتا ہے جبکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب معاشرہ ایسا تھا کہ اس میں سوائے بہن بھائیوں کے خدا نے کوئی انسان پیدا ہی نہیں کیا تھا اور خدا کی مشیت ان کی کثرت اور معاشرہ میں ان کے پھیلاؤ اور افزائش کی خواہاں تھی۔ لہٰذا اس وقت اس پر برائی کا عنوان صادق نہیں آتا تھا۔

اور یہ کہ اصل فطرت اس کی نفی نہیں کرتی اس کا ثبوت طویل زمانوں تک مجوس کے درمیان اس کا رائج ہونا ہے (جیسا کہ اس سلسلہ میں تاریخ سے ثابت ہے) اور روس میں یہ عمل قانونی حیثیت کا حامل رہا (جیسا کہ ان کی تاریخ میں اس کے حوالے موجود ہیں) اور اسی طرح یورپ میں اسے قانونی ازدواجی رشتہ قرار دے کر زنا کی صورت میں اس کا کام تمام ہوتا ہے (موجودہ ادوار میں یہ عمل امریکہ اور یورپ میں عام رائج عادات میں شمار کیا جاتا ہے کہ کنواری لڑکیاں قانونی شادی اور بالغ ہونے سے پہلے جنسی تعلق قائم کر کے اپنی ناموس لٹوا دیتی ہیں یہاں تک کہ اس حوالہ سے حاصل ہونے والی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں لڑکیوں کے باپ دادا اور بھائی بھی اس کے مرتکب ہوئے)

اس عمل کے حوالہ سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے قانون طبیعت کی نفی ہوتی ہے یعنی یہ عمل ان قوانین طبیعت سے متصادم ہے جو انسان کو نیکی وسعادت سے دوچار کرنے والے معاشرہ کی تشکیل سے پہلے بنی نوع انسان میں رائج تھے۔ کیونکہ گھریلو ماحول بہن بھائیوں کے درمیان عاشقانہ راہ و رسم اور جنسی تعلق جیسے امور و اعمال ہرگز درست قرار نہیں دیتا بلکہ اس کی سختی سے نفی کرتا ہے ان کے درمیان اس طرح کے روابط وتعلقات وجود میں آتے ہی نہیں)۔ جیسا کہ مشہور قانون دان اور حقوق کے ماہر مونٹسکیو نے اپنی کتاب روح القوانین میں لکھا ہے۔

لیکن ان کا نظریہ واضح طور پر معاشرتی عدم ضرورت پر مبنی ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ یہ بات تب درست ہوگی جب مروّجہ غیر طبیعی قوانین معاشرہ میں فلاح و بہبود کی ضمانت دے سکتے ہوں اور افرادِ معاشرہ کی سعادت کو یقینی بنانے میں مؤثر واقع ہوں ورنہ موجودہ زمانہ میں مروجہ قوانین اور رائج اصولوں میں سے اکثر غیر طبیعی قرار پائیں گے، یعنی اگر فرض کریں کہ طبیعی قوانین کے علاوہ کوئی قانون قابل قبول نہ ہو تو عصر حاضر میں مروجہ قوانین میں سے اکثر ناقابل عمل قرار پائیں گے اور انہیں لغو قرار دینا پڑے گا۔ (اس بحث میں مزید کسی رائے کی صحت وعدم صحت پر اظہار خیال کرنے کی بجائے مذکورہ مطالب پر اکتفاء کرنا ہی موزوں ہے)۔

روایات پر ایک نظر

امام صادقؑ کا فرمان

کتاب التوحید میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت مذکور ہے جس میں امامؑ نے ارشاد فرمایا:

"لعلّك ترىٰ ان الله لم يخلق بشراً غيركم ؟ بلىٰ والله لقد خلق الف الف آدم انتم فى آخر اولئك الآدميين"

(شاید تیرا خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے علاوہ کسی بشر کو پیدا نہیں کیا؟ ہاں، خدا کی قسم! خداوند عالم نے ہزار ہزار آدم پیدا کئے کہ تم ان آدمیوں میں سے سب سے آخری ہو) (التوحید، جلد دوم صفحہ ۲۷۷)

اسی طرح ایک حدیث ابن میثم نے شرح نہج البلاغہ جلد اول صفحہ ۱۷۳ پر امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے ذکر کی ہے اور شیخ صدوق مرحوم نے بھی اسے کتاب الخصال میں ذکر کیا ہے (خصال جلد ۲ ص ۲۵۲)

امام جعفر صادقؑ کا دوسرا فرمان

کتاب الخصال میں شیخ صدوقؒ نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امامؑ نے ارشاد فرمایا:

''ان اللہ تعالیٰ خلق اثنی عشر الف عالم کل عالم منھم اکبر من سبع سماوات و سبع ارضین مایری عالم منھم ان للہ عزوجل عالما غیرھم''

(اللہ تعالیٰ نے بارہ ہزار عالم پیدا کئے، ان میں سے ہر عالم سات آسمانوں اور سات زمینوں سے بڑا ہے اور ان میں سے کسی بھی عالم میں رہنے والے کسی بھی شخص کے دل میں یہ بات نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے عالم کے علاوہ بھی کوئی عالم پیدا کیا ہوگا) (الخصال، جلد ۲ ص ۶۳۹)

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی

حضرت امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''لقد خلق اللہ عزوجل فی الارض منذ خلقھا سبعة عالمین لیس ھم من ولد آدم خلقھم من ادیم الارض فاسکنھم فیھا واحداً بعد واحد مع عالمہ ثم خلق اللہ عزوجل آدم ابا البشر و خلق ذریتہ''

(خداوند عالم نے جب زمین کو پیدا کیا تو اس میں سات عالم خلق کئے، ان میں بنی نوع آدم میں سے کوئی بھی نہ تھا، تو اللہ نے انہیں زمین کی خمیر سے خلق فرمایا، پھر انہیں ان عوالم میں یکے بعد دیگرے قیام پذیر کیا، پھر خداوند عالم نے آدم ابو البشر کو پیدا کیا اور ان کی ذریت و نسل کو خلق فرمایا) (کتاب الخصال، جلد ۲ صفحہ ۳۵۸)

حضرت حوا کی تخلیق

کتاب نہج البیان میں عمرو بن ابی مقدام سے مروی ہے انہوں نے اپنے والد کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابوجعفر امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا: من ای شیئ خلق الله حوا؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا کو کس چیز سے پیدا کیا؟ فقال علیہ السلام ای شیئ یقولون هٰذا الخلق؟ اس سلسلہ میں لوگ کیا کہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا: یقولون ان الله خلقها من ضلع من اضلاع آدم، وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اسے آدمؑ کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے پیدا کیا، امامؑ نے فرمایا: کذبوا کان الله یعجزه ان یخلقها من غیر ضلعه؟ وہ جھوٹ بولتے ہیں، کیا اللہ تعالیٰ اسے آدمؑ کی پسلی کے علاوہ کسی دوسری چیز سے پیدا نہ کرسکتا تھا؟ میں نے پوچھا: جعلت فداك من ای شیئ خلقها؟ میں آپ پر قربان جاؤں، اللہ تعالیٰ نے انہیں کس چیز سے پیدا فرمایا؟ تو امام نے ارشاد فرمایا: اخبرنی ابی عن آبائه قال: قال رسول الله (ص) ان الله تبارك و تعالیٰ قبض قبضة من طین فخلطها بیمنه. وکل یدیه یمین فخلق منها آدم و فضلت فضلة من الطین فخلق منها حوا، مجھے میرے پدر بزرگوار نے اپنے آباء کے حوالہ سے ارشاد فرمایا: حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹھی بھر زمین اٹھائی اور اسے اپنے دائیں ہاتھ سے گوندھا جبکہ خدا کے دونوں ہاتھ "دایاں" ہیں پھر اس سے آدم کو پیدا کیا اور اس مٹی سے کچھ بچ گیا تو اس سے خدا نے حوا کو خلق فرمایا۔

(منقول از تفسیر برہان، جلد ۱ صفحہ ۲۳۶)

اس سے مشابہ روایت شیخ صدوق مرحوم نے بھی عمرو بن ابی المقدام کے حوالہ سے ذکر کی ہے، یہاں کچھ دیگر روایات بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت حواؑ کو حضرت آدمؑ کی بائیں جانب کی پسلیوں میں سے سب سے چھوٹی پسلی سے پیدا کیا گیا اور تورات کی فصل ۲ سفر تکوین میں بھی اسی طرح کے مطالب مذکور ہیں، لیکن یہ بات اگرچہ عقلی طور پر کسی محال و ناممکن چیز کا باعث نہیں مگر قرآنی آیات مبارکہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا جیسا کہ ہم اس حوالہ سے وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

امام سجادؑ کا توضیحی ارشاد گرامی

کتاب الاحتجاج میں حضرت امام علی بن الحسین السجاد علیہ السلام اور ایک قرشی شخص کی گفتگو مذکور ہے جس میں اس قرشی نے امام علیہ السلام سے ہابیل کی قابیل کی بہن "لوزا" سے اور قابیل کی ہابیل کی بہن "اقلیما" سے شادی کا تذکرہ کیا اور پوچھا کہ کیا ان دونوں نے اپنی بہنوں سے جنسی تعلق قائم کر کے بچے پیدا کئے؟ امامؑ نے جواب دیا: ہاں، تو قرشی نے کہا کہ یہی

کام آج مجوسی (آتش پرست) کرتے ہیں، امامؑ نے فرمایا: مجوسیوں نے یہ اس وقت شروع کیا جب خدا نے اسے حرام قرار دیا، پھر امامؑ نے فرمایا کہ اسے برامت کہو اور اس کا انکار نہ کرو یہ خدا کے قوانین ہیں جو ایسے ہی چلتے ہیں، کیا ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی زوجہ کو خود اُن ہی سے پیدا کیا پھر اسے ان پر حلال قرار دیا؟ یہ اس دور میں اولاد آدم کے لئے مقررہ قوانین تھے اور بعد میں خداوند عالم نے اس کی حرمت کا حکم صادر فرمایا (احتجاج طبرسی جلد ۲ صفحہ ۴۴)

اس حدیث میں مذکور مطالب ظاہر القرآن اور عقل کے مطابق ہے، لیکن کچھ روایات ایسی بھی ہیں جو ان روایات سے متصادم ہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اولادِ آدم کے لئے جن اور حوریں آئیں جن سے انہوں نے شادیاں کیں، بہرحال اس سلسلہ میں جو کچھ قرین صحت ہے وہ ہم بیان کر چکے ہیں اور قارئین کرام اس سے آگاہ ہو چکے ہیں۔

مترجم: اس روایت کے متن ہی سے اس کی عدم صحت کا ثبوت ملتا ہے اور مؤلف کا بیان خالی از اشکال نہیں، ان کا مؤقف جن روایات پر مبنی ہے، ان میں تاویل کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

قطع رحمی کی ممانعت

تفسیر "مجمع البیان" میں آیت مبارکہ "وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ" کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ کا فرمان مذکور ہے جس میں آپؑ نے ارشاد فرمایا: تقوائے ارحام سے مراد یہ ہے کہ قطع رحمی نہ کرو۔ (مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۳)

یہ بات یاد رہے کہ یہ فرمان کہ آیت میں لفظ "الْاَرْحَامَ" کو حرف میمؔ پر زبر کے ساتھ پڑھا جانے پر مبنی ہے۔

کتاب اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۱۵۰ اور تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۱۷ میں مذکور ہے کہ "ارحام" سے مراد لوگوں کے قرابتدار ہیں کہ خداوند عالم نے حکم دیا کہ صلہ رحمی کرو اور قرابتداری کا احترام کرو، کیا آپ دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے اسے اپنے ساتھ ذکر کیا ہے؟ (هی ارحام الناس ان الله عزوجل امر بصلتها وعظمها، الا تریٰ انه جعلها معه)

اس روایت میں جملہ "الا تریٰ" (کیا آپ دیکھ نہیں رہے؟) میں تعظیم واحترام کا بیان مقصود ہے، اور اپنے ساتھ قرار دینے (انه جعلها معه) کے الفاظ سے آیت مبارکہ میں مذکورہ جملہ "وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ" کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

صلہ رحمی کے بارے میں فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تفسیر "درمنثور" میں عبد بن حمید کے حوالہ سے عکرمہ کی روایت مذکور ہے کہ آیت مبارکہ "الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ

الاَرۡحَامَ ‘‘ کی تفسیر میں ابن عباس نے کہا کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ خدا نے تمہیں صلہ رحمی کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ وہ تمہارے لئے دنیوی زندگی میں بقاء اور آخرت میں تمہارے لئے خیر و صلاح کا باعث ہے۔

(تفسیر ’’درمنثور‘‘ جلد ۲ صفحہ ۱۱۷)

اس روایت میں آنحضرت ﷺ کا فرمان کہ صلہ رحمی تمہارے لئے باعث بقاء و خیر ہے اس میں ان کثیر روایات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جن میں بیان ہوا ہے کہ صلہ رحمی سے عمر میں اضافہ اور قطع رحمی سے اس میں کمی ہوتی ہے، ان مطالب کی تصدیق اسی سورۂ مبارکہ ’’نساء‘‘ کی آیت ۹ کی تفسیر میں مذکور بیان سے ہوتی ہے جس میں ارشادِ حق تعالیٰ ہے: ’’وَلۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوۡا عَلَيۡهِمۡ ‘‘۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی (فانہ ابقیٰ لکم .... وہ تمہاری بقا و طولِ عمر کا باعث ہے) سے مراد ممکن ہے یہ ہو کہ صلہ رحمی زندگی کے آثار کو طولانی اور اس کے دائرہ کے وسیع ہونے کا باعث ہے کیونکہ اس سے قرابتداروں کے درمیان وحدت و یکجہتی کو فروغ ملتا ہے اور اس کے نتیجہ میں باہمی تعلقات مضبوط ہوتے ہیں جس سے انسان زندگی کی تلخیوں اور ناسازگاریوں کا بھرپور طریقہ سے مقابلہ کرنے اور سختیوں و دشواریوں میں استقامت و پائداری سے کام لینے کے قابل ہوجاتا ہے۔

صلہ رحمی کی تاکید، امیر المومنینؑ کی زبانی

تفسیر العیاشی میں اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امیر المومنینؑ سے سنا آپؑ نے ارشاد فرمایا:

’’ان احدکم لیغضب فیما یرضی حتی یدخل النار. فایما رجل منکم غضب علی ذی رحمہ فلیدن منہ فان الرحم اذا مستھا الرحم استقرت وانھا متعلقۃ بالعرش تنقضہ انتقضاض الحدید فتنادی: اللھم صل من وصلنی واقطع من قطعنی وذلک قول اللہ فی کتابہ: ’’وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا‘‘ وایما رجل غضب وھو قائم فلیلزم الارض من فورہ فانہ یذھب رجز الشیطان‘‘

(تم میں سے کوئی کسی پر غضب ناک ہوتا ہے جبکہ اسے اس میں خوش ہونا چاہئے تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانا بنتا ہے، تو تم میں سے جو شخص اپنے قرابتدار پر غضب ناک ہو تو اسے چاہیے کہ اس سے قربت اختیار کرے، دوستی کا ہاتھ بڑھائے کیونکہ جب رحم سے رحم ملے تو اس میں استقرار پیدا ہوجاتا ہے۔ قرابتداری ایک دوسرے سے قربت

اختیار کرنے اور نزدیک ہونے سے بڑھتی ہے۔اور رحم (قرابتداری) عرش سے پیوستہ ہے کہ اس سے اس طرح کی آواز نکلتی ہے جس طرح لوہے سے آواز نکلتی ہے اور وہ یوں گویا ہوتا ہے: اے میرے پروردگار! جو میرے ساتھ جڑا ہو مجھے اس کے ساتھ جڑا رکھ اور جو میرے ساتھ قطع کرے اس سے قطع کر، چنانچہ اس کی اصل وہ فرمانِ الٰہی ہے جو اس نے اپنی کتاب میں اس طرح فرمایا: اور تم تقوائے الٰہی اختیار کرو وہ اللہ کہ جس کے حوالہ سے تم ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہو (قسمیں کھاتے ہو) اور ارحام کا تقویٰ اختیار کرو، بے شک اللہ تم پر نگہبان ونگران ہے، اور جو شخص غضب ناک ہو اگر وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ فوراً زمین پر بیٹھ جائے کہ اس طرح کرنے سے شیطان کی گندگی اس سے دور ہو جائے گی) (تفسیر عیاشی، جلد اول صفحہ ۲۱۷)

''رحم'' کا معنی جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں وہ وحدانی جہت ہے جو افرادِ بشر کے درمیان موجود ہوتی ہے جس کے ذریعے ان کے وجودی مادّہ کا اتصال برقرار ہوتا ہے جو ماں باپ یا ان میں سے ایک سے پیدا ہونے کو یقینی بناتا ہے اور وہی حقیقی وجودی بنیاد ہے جو قرابتداروں یعنی ارحام والوں کے درمیان موجود رہتی ہے کہ نا قابل انکار حقیقی آثار کی حامل ہوتی ہے جن میں وجودی صفات، اخلاقی، روحانی وجسمانی تمام آثار شامل ہیں، اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ وہ مخالف عوامل بھی اپنا اثر دکھاتے ہیں جو ان آثار کو کمزور کرنے یا ان کا سدّ باب کرنے اور رفتہ رفتہ انہیں سرے سے ختم کر دینے کے اسباب فراہم کرتے ہیں جبکہ وہ ہرگز معدوم نہیں ہوتے۔

بہرحال ''رحم'' ایک خاندان کے افراد کے درمیان باہمی طبیعی پیوستگی کے نہایت طاقتور اسباب میں سے ایک ہے اور اس میں اثر گزاری کی شدید ترین صلاحیت پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے ارحام اور قرابتداروں کے درمیان عمل خیر کے نتائج غیروں کے درمیان ہونے والے عمل خیر کے نتائج سے کہیں زیادہ اچھے اور پائیدار ہوتے ہیں، یہی نسبت عمل شر کے حوالہ سے پائی جاتی ہے کہ اپنوں کے درمیان اس کے آثار غیروں کی نسبت زیادہ شدید ہوتے ہیں۔

اس بیان سے امامؑ کے ارشاد گرامی قدر ''فایما رجل غضب علی ذی رحمه فلیدن منه'' کہ ''جو شخص تم میں سے اپنے کسی قرابتدار پر غضب ناک ہو تو اسے چاہیے کہ اس سے نزدیک ہو ......'' اس سے مراد یہ ہے کہ قرابتدار سے قربت ونزدیک ہونا اور دوستی بڑھانا اصل قرابتداری کے رشتہ وتعلق میں استحکام لانے اور اسے مضبوط وطاقتور بنانے کا باعث بنتا ہے جس سے قربت میں قوت اور وسعت کے ساتھ ساتھ باہمی الفت ومحبت کے آثار ظاہر ہونے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

اسی طرح امامؑ کا ارشاد گرامی: ''وایما رجل غضب وهو قائم فلیلزم الارض'' ''جو شخص غصہ میں ہو اگر وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ فوراً بیٹھ جائے ......، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر غصہ نفسانی جذبات ابھرنے اور ذاتی تلملاہٹ وغیرہ کا نتیجہ ہو تو اس کا جنم لینا اور شدت پکڑنا نفس کے بے قابو ہونے اور شیطان کے زیر اثر آ کر خیالی جذبات کا اسیر ہونے کا باعث

ہوتا ہے لہٰذا اس صورت میں اگر جسمانی حالت کو بدل دیا جائے مثلاً کھڑے ہوں تو بیٹھ جائیں تو اس سے ذہن کے اُتار چڑھاؤ میں تبدیلی اور غضب وغصہ کی حالت کے نرمی ومحبت کی حالت میں قرار پانے کے اسباب فراہم ہوتے ہیں اور اس بات کا امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ اس تبدیلی سے غصہ سرے ہی سے ختم ہوجائے اور اس کی جگہ باہمی محبت لے لے کیونکہ نفس انسانی فطرتاً نرمی ورحمت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے اور غضب وغصہ کو پسند نہیں کرتا، چنانچہ اس سلسلہ میں بعض روایات میں مذکور ہے کہ غصہ کی حالت میں اپنی کیفیت بدل لی جائے یعنی جس حالت میں ہوں اسے بدل کر دوسری حالت اختیار کرلی جائے، کتاب المجالس میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے اپنے پدر بزرگوار کے حوالہ سے بیان کیا کہ ان کے سامنے غضب وغصہ کا تذکرہ ہوا تو امامؑ نے ارشاد فرمایا:۔

''ان الرجل لیغضب حتی ما یرضی ابداً ویدخل بذلك النار. فایما رجل غضب وھو قائم فلیجلس فانہ سیذھب عنہ رجز الشیطان. وان کان جالسًا فلیقم. وایما رجل غضب علیٰ ذی رحم فلیقم الیہ ولیدن منہ ولیمسہ فان الرحم اذا مست الرحم سکنت''

جب کوئی شخص غصہ میں اس حد تک پہنچ جائے کہ پھر رضایت کا کوئی راستہ باقی نہ رہے کہ اسی غصہ کی حالت میں جہنم چلا جائے، یعنی غصہ کی حالت میں ایسا کام کرے جو اسے جہنم میں لے جائے، لہٰذا جو شخص غصہ میں ہو اگر وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے کیونکہ اس طرح اس سے شیطان کی پلیدگی دور ہوجائے گی، اور اگر بیٹھا ہوا ہو تو کھڑا ہو جائے، اور جو شخص اپنے کسی قرابتدار پر غضب ناک ہو تو اسے چاہیے کہ اس سے قریب ہو اور اس سے پیوستگی اختیار کرے کیونکہ ارحام ایک دوسرے سے نزدیک وقریب ہونے سے سکون پاتے ہیں۔

امامؑ کے ارشاد گرامی قدر کے عملی شواہد ہماری معاشرتی زندگی میں عام ہیں۔

امامؑ کا ارشاد گرامی: ''وانھا متعلقة بالعرش تنقصہ انتقاض الحدید........'' (وہ عرش سے پیوستہ ہے اس سے اس طرح کی آواز نکلتی ہے جس طرح لوہے کی آواز ہوتی ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایک آواز پیدا ہوتی ہے جو اس آواز جیسی ہوتی ہے جو لوہے پر کچھ مارنے سے پیدا ہوتی ہے، لغت کی مشہور کتاب صحاح میں انتقاض کا معنی یہ لکھا ہوا ہے: صویت مثل النقر، چٹکی جیسی آواز، عرش کے حوالہ سے آیت الکرسی کی تفسیر میں ''کرسی'' کے مرادی معنی کا ذکر کرتے ہوئے اجمالی اشارہ ہوچکا ہے اور اس کی تفصیل عنقریب بیان ہوگی کہ عرش سے مُراد اس اجمالی علم کا مقام ہے جو حوادث کے وقوع پذیر ہونے کی حالت سے وابستہ ہے اور وہ وجود وہستی کا وہ مرحلہ ہے جس میں مختلف وگوناگوں حوادث یکجا ہوتے ہیں اور طرح طرح کے عوامل اور آفاقی علل واسباب اکٹھے ہوتے ہیں، وہ مختلف ومتفرق علل واسباب کی زنجیروں کو ہلا دیتا ہے یعنی اس کی روح ان سب میں آجاتی ہے اور ان کو حرکت میں لاتی ہے، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے کسی مملکت کے امور اپنی مختلف

صورتوں اور جہتوں و کیفیتوں کے باوجود سلطنتی مرکز میں یکجا ہوتے ہیں کہ اس مرکز سے صادر ہونے والا ایک لفظ مملکت کی تمام قوتوں اور ریاستی اداروں میں حرکت پیدا کر دیتا ہے جس سے ہر مورد میں اس کے موزوں آثار ظہور پذیر ہو جاتے ہیں، اور رحم کے بارے میں آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ وہ حقیقت میں اس روح کی طرح ہے جو ان افراد کے وجودی قالب میں رچی بسی ہوتی ہے جو قرابتداری کی قدر مشترک رکھتے ہیں، تو اس حوالہ سے اسے عرش کے متعلقات میں سے ہونے کا نام دیا جا سکتا ہے یعنی جس طرح عرش مختلف موجودات کی وحدت کا جامع مقام ہے اسی طرح رحم بھی ان مختلف افراد بشر کی وحدت کا مقام ہے جو قرابت میں قدر مشترک رکھتے ہیں، بنا بر ایں جب رحم ظلم کا شکار ہو اور اس کے حق پر ڈاکہ زنی کی جائے تو وہ عرش کی پناہ میں آجاتا ہے اور اس سے مدد مانگتا ہے، تو امامؑ کے ارشاد گرامی "تنقضہ انتقاض الحدید" (وہ لوہے جیسی آواز دیتا ہے) کا یہی معنی ہے، اور یہ بیان تمثیل کی نہایت عمدہ صورت ہے کہ جس میں تمثیل وتشبیہ کے تمام تر تقاضے نہایت خوبصورتی کے ساتھ پورے ہوئے ہیں اور وہ اس طرح سے کہ اس حال میں (قطع رحمی) میں واقع ہونے والے امور کو اس آواز سے تشبیہ دی گئی ہے جو لوہے پر کچھ مارنے سے نکلتی ہے، اس آواز سے اس میں جو کھٹک پیدا ہوتی ہے جس کی لرزش سے پورے لوہے سے ایک خاص طرح کی جھنک دار آواز نکلتی ہے جو گھنٹیوں سے نکلنے والی آواز کے مشابہ ہوتی ہے۔

امامؑ کے ارشاد گرامی: "فتنادی اللھم صل من وصلنی واقطع من قطعنی" وہ آواز دیتا ہے، اے اللہ جو مجھ سے ملے اسے مجھ سے ملا اور جو مجھ سے قطع تعلق کرے اس سے مجھے دور رکھ، دراصل اس کی زبان حال کی ترجمانی ہے کہ جس میں عرش الٰہی کی پناہ میں آکر مدد طلب کرتا ہے۔ اس حوالہ سے کثیر روایات میں مذکور ہے کہ صلہ رحمی عمر میں اضافہ کا باعث ہے جبکہ قطع رحمی عمر میں کمی کا سبب ہے، چنانچہ زیر نظر موضوع کی بحث میں اعمال اور حوادث کے درمیان پائے جانے والے ربط کو بیان کیا جا چکا ہے اور ہم نے اپنی اسی کتاب کی دوسری جلد میں اعمال کے احکام کی بحث میں ان امور سے مربوط مطالب تفصیل کے ساتھ ذکر کئے ہیں اور اس امر کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ کائنات کے موجودہ نظام کا مدبر اور عملی ذمہ دار اسے اچھی و پاکیزہ اغراض و مقاصد کی طرف لے جا رہا ہے اور وہ اس سلسلہ میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیتا اور نہ ہی اسے اس کے حال پر چھوڑتا ہے، چنانچہ اگر اس کے کسی بھی جزء میں خرابی پیدا ہو جائے تو فوراً اس کے ازالہ کا اقدام کرتا ہے یعنی یا تو اسے درست کر دیتا ہے یا اسے ختم کر دیتا ہے، اور جہاں تک قطع رحمی کرنے والے کا تعلق ہے تو وہ تکوینی امور میں اللہ سے جنگ کرنا ہے، کہ اگر اس کی اصلاح کے راستے مسدود ہو جائیں تو خدا اس کی عمر میں کمی کر دیتا ہے اور پھر اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے، مگر آج کا انسان اس حقیقت کو محسوس ہی نہیں کرتا اور نہ ہی اس جیسی حقیقت کی طرف ملتفت ہوتا ہے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جسم انسانیت کو بیماریوں نے اس طرح گھیر رکھا ہے کہ وہ اب وہ قطع رحمی کے درد کو محسوس ہی نہیں کرتا، اور اس حقیقت کو حقیقت ہی نہیں سمجھتا یعنی اس کا ادراک ہی نہیں رکھتا۔

آیات ۲ تا ۶

○ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰىٓ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰىٓ اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

○ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳ۭ

○ وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــــًٔـا مَّرِيْۗـــــًٔـا ۝۴

○ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ فِيْھَا وَاكْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵

○ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْھِمْ اَمْوَالَھُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْھَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْھِمْ اَمْوَالَھُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْھِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

ترجمہ

○ ''اور تم یتیموں کو ان کے اموال دے دو اور ناپاک کو پاک کے ساتھ نہ بدلو اور ان کے اموال کو اپنے اموال کی طرح نہ کھاؤ کہ ایسا کرنا یقیناً بہت بڑا گناہ ہے۔''

(۲)

○ ''اور اگر تمہیں یہ اندیشہ لاحق ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان میں سے دو، تین اور چار سے نکاح کر لو، لیکن اگر تمہیں ان کے درمیان عدل نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایک ہی سے نکاح کرو یا ان سے کہ جن کے تم مالک ہو، یہ بات عدل سے بہت قریب ہے کہ تم ناانصافی سے بچ جاؤ۔''

(۳)

○ ''اور تم عورتوں کو ان کے حق مہر پورے کے پورے با رضا و رغبت ادا کرو اور اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ دیں تو جی بھر کر کھاؤ۔''

(۴)

○ ''اور تم بے وقوفوں و نادانوں کو اپنے وہ اموال نہ دو جو خدا نے تمہارے امرارِ معاش اور زندگی بسر کرنے کے لئے قرار دیئے ہیں اور تم ان میں سے انہیں روزی دو اور لباس دو اور ان سے اچھی اچھی باتیں کرو۔''

(۵)

○ ''اور تم یتیموں کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کرتے رہو یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں اور نکاح کے قابل ہوں، پس اگر تم ان میں رشد اور سوجھ بوجھ محسوس کرو تو ان کے اموال ان کے سپرد کر دو اور تم ان کے اموال اسراف و زیادتی کرتے ہوئے مت کھاؤ کہ کہیں بڑے ہو کر تم سے پوچھ گچھ نہ کرلیں، اور جو شخص مالدار ہو وہ ان اموال میں تصرف کرنے سے گریز کرے اور جو شخص نادار ہو وہ مناسب حد تک اسے استعمال میں لائے، اور جب تم ان کے اموال ان کے سپرد کرو تو ان پر گواہ مقرر کرو اور اللہ حساب و کتاب کرنے والا کافی ہے۔''

(۶)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ سابقہ آیت کا تتمہ ہے اور تکمیلی سلسلہ سے مربوط ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی تمہید و مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں تا کہ ابتدائے سورہ میں بیانِ احکام شرعیہ کا آغاز ہو سکے کہ جن میں میراث اور ازدواج سے مربوط بنیادی احکام شامل ہے۔ مثلاً کتنی عورتوں سے شادی ہو سکتی ہے اور محرم کون ہیں اور یہ دو مسئلے یعنی تعدّدِ ازواج اور محرم کا تعین انسانی معاشرہ میں رائج و نافذ قوانین و احکام میں سے سب سے زیادہ اہم اور حیاتی ہیں اور ان دو مسئلوں کو معاشرہ کی تشکیل و بقاء میں بنیادی کردار حاصل ہے کیونکہ نکاح سے نسل انسانی کی شناخت کی راہ ہموار ہوتی ہے کہ وہی معاشرہ کے اجزاء اور عوامل ہیں جن پر معاشرہ کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں، اور میراث کا تعلق اس مال و ثروت سے ہے جس پر معاشرتی زندگی کا نظام و بقاء موقوف ہوتی ہے۔

ان آیات مبارکہ میں مذکورہ بالا دو مسئلوں کے احکام بیان کرنے کے ضمن میں زنا و بدکاری اور ناجائز طریقہ سے مال کھانے کی ممانعت بھی مذکور ہے کہ سوائے باہمی رضایت کے ساتھ ہونے والی تجارت کے کوئی شخص کسی کا مال نہ کھائے، اسی سے انسانی معاشرہ کی دو اہم ترین بنیادوں کی تشکیل ہوتی ہے یعنی افزائش نسل اور مالی امور!

اسی سے تمہیدی بیان میں مذکور مطالب کے ربط و ارتباط کی اہمیت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ ان کا انسانی معاشرہ کی اصل و اساس سے کس قدر گہرا تعلق ہے، اور ان میں افرادِ بشر کو ان اعمال سے روکا گیا ہے جو ان کے ہاں عام ہو چکے ہیں کہ ان کے افکار ان سے مانوس، انہی پر ان کی نشوونما، انہی سے ان کے اسلاف اور بزرگوں کی حیات و موت وابستہ اور انہی سے ان کے اخلاق و عادات کی صورتگری ہو چکی ہے اگر چہ یہ کام نہایت مشکل ہے کہ انہیں ان عادات و رسوم کو ترک کر دینے کی راہ پر لایا جائے اور وہ اپنے اسلاف کے اعمال کو بالکل چھوڑ دیں لیکن انہیں اس راہ پر لانا ہی ان کی سعادت کو یقینی بنانے کا ضامن ہے لہٰذا ابتدائے سورہ میں ان احکام کو ذکر کیا گیا ہے، ان احکام کے بیان کی اہمیت و تاثیر اسی دور کے انسانی معاشرہ کے حالات بالخصوص دنیائے عرب (کہ جس میں نزول قرآن اور ظہور اسلام ہوا) کی صورتحال کے تناظر میں بخوبی واضح ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے تدریجی نزول اور اسلامی احکام و دستورات کی تشریع و قانون

سازی کے مراحل کا جائزہ لینے اور اس کی بابت اجمالی غور وفکر کرنے سے ان آیات مبارکہ میں ذکر کئے جانے والے تمہیدی مسائل کے بیان کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت کا پہلا دور

قرآن مجید میں قبل از اسلام اور ظہور اسلام سے متصل دور کو ''زمانۂ جاہلیت'' سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اس دور میں عربوں کی زندگی صرف اور صرف جہالت پر مبنی تھی اور وہ علم و دانش سے کلی طور پر دور تھے، ان کا معاشرہ ایسا تھا کہ ان کے ہر سلسلہ میں باطل وسفاہت اور بے وقوفی ہی ان پر چھائی ہوئی تھی اور حق ودلیل اور منطق واستدلال سے کوئی سروکار نہ تھا۔

زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے بارے میں قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۵۴

○ ''یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاھِلِیَّۃِ''

(اور وہ اللہ کے بارے میں ناحق گمان کرتے تھے جاہلانہ گمان)

سورۂ مائدہ، آیت: ۵۰

○ ''اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ''

(کیا وہ جاہلیت کا قانون چاہتے ہیں)

سورۂ فتح، آیت: ۲۶

○ ''اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ''

(جب کافروں نے ان کے دلوں میں غیرت ڈال دی جاہلانہ غیرت (انانیت)

سورۂ احزاب، آیت: ۳۳

○ ''وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی''

(اور وہ پہلی جاہلیت کی طرح زیب وزینت کو ظاہر نہ کریں)

جغرافیائی حوالہ سے ان ایام میں عرب اس طرح سے تھے کہ جنوب میں حبشہ کے قریب تھے اور وہ نصرانیت کا عقیدہ رکھتے تھے اور مغرب میں سلطنت روم کے قریب تھے کہ وہ بھی نصرانی تھے، شمال میں سلطنت فارس سے قریب تھے کہ

جو مجوسی تھے اور ان کے علاوہ دیگر علاقوں میں ہندوستان اور مصر تھا کہ جہاں بت پرست رہتے تھے اور عربوں کے اپنے علاقوں میں یہودیوں کے مختلف گروہ آباد تھے جبکہ وہ خود بھی بت پرست تھے اور ان کی اکثریت قبائلی طرزِ زندگی اپنائے ہوئے تھے، ان تمام چیزوں نے ان کے معاشرہ کو ایک مخلوط بدوی معاشرہ بنا دیا تھا کہ جس میں یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کی رسوم وعادات کا راج تھا اور وہ سب جہالت کے نشہ میں گھرے ہوئے تھے چنانچہ اس حوالہ سے خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورۂ انعام، آیت: ۱۱۶

○ ''وَ اِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ ۝''

(اور اگر تو زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے تابع ہو جائے تو وہ تجھے اللہ کے راستہ سے گمراہ کر دیں گے، وہ گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے اور وہ اٹکل پچو کے سوا کچھ بھی نہیں (فضول و بے ربط باتیں کرتے ہیں اور خیال بافیوں میں مصروف رہتے ہیں)۔

اور اس دور میں عشائر وقبائل کی یہ حالت تھی کہ وہ زندگی کی نہایت پست صورت کے ساتھ رہتے تھے اور روزمرہ کے معاملات میں باہمی تنازعات اور لڑائی جھگڑوں کے سوا ان کا کوئی کام ہی نہ تھا یہاں تک کہ وہ ہر وقت دوسروں کے اموال پر ہاتھ صاف کرنے، اور ان کی عزت وناموس کی بے حرمتی کرنے ہی میں اپنی تمام تر قوتیں وصلاحیتیں بروئے کار لاتے رہتے تھے، اسی وجہ سے ان کے ہاں امن وامان کا نام ونشان نہ ملتا تھا اور نہ ہی صلح وسلامتی کے کوئی آثار پائے جاتے تھے بلکہ صورتحال یہ تھی کہ جو غالب آتا تھا وہی حکومت کرتا تھا اور جس کے ہاتھ جو لگتا تھا وہی اس کا مالک بن جاتا تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں مردوں، عورتوں اور بچوں کا یہ حال تھا کہ مردوں کے لئے قتل وغارت، خونریزیاں، جاہلانہ انانیت، تکبر وغرور، ظالموں کا ساتھ دینا اور ان کے نقش قدم پر چلنا، مظلوموں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا، باہمی عداوت کا بازار گرم کرنا، ایک دوسرے سے دست وگریباں رہنا، شرابخوری، بدکاری، مُردار کا گوشت کھانا، خون پینا اور گندی کھجوروں سے پیٹ بھرنا وغیرہ اچھی صفات اور فضیلت سمجھا جاتا تھا۔

ان کی خواتین انسانی معاشرہ کی سہولتوں سے یکسر محروم تھیں، انہیں اپنا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا اور نہ ہی وہ کوئی کام کرنے کا حق رکھتی تھیں، انہیں میراث میں بھی کچھ نہ ملتا تھا، مردان کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرنے میں کوئی حدو شرط نہیں رکھتے تھے بلکہ ہر قاعدہ وقانون سے ماوراء ان کے ساتھ جنسی روابط رکھتے تھے جیسا کہ یہودی اور بعض بُت پرست کرتے ہیں، اس کے باوجود بن سنور کر رہتی تھیں اور اپنی زیب وزینت غیروں کے سامنے ظاہر کرتی تھیں اور جسے پسند کرتیں اسے اپنے ساتھ نزدیکی کرنے کی دعوت دیتی تھیں اسی وجہ سے ان کے درمیان زنا وبدکاری پھیل گئی یہاں تک کہ ان میں سے شادی شدہ عورتیں بھی اس طرح کے اعمال میں مبتلا تھیں، عجیب ترین بات تو یہ ہے کہ ان کی جہالت وجاہلیت اس حد تک جا چکی تھی کہ

وہ بالکل ننگی ہو کر حج ادا کرنے جاتی تھیں۔

اور ان کی اولاد کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آباء سے نسبت تو رکھتے تھے لیکن ان کے کم سن بچے ان سے میراث نہیں پاتے تھے بلکہ صرف بڑی اولاد میراث لیتی تھی اور متوفی شخص کی زوجہ کو میراث ملتا تھا لیکن چھوٹے لڑکے لڑکیاں اور عورتیں محروم قرار دی جاتی تھیں، البتہ اگر وارثوں میں بڑے لڑکے نہ ہوتے تو چھوٹے لڑکوں کو حق ملتا تھا لیکن طاقتور افراد یتیموں کے اموال اپنے پاس رکھتے تھے اور ان کی سرپرستی کے نام پر ان کے اموال ہڑپ کر جاتے تھے اگر یتیم لڑکی ہوتی تو اس کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کر لیتے تھے اور اس کے اموال پر قبضہ کر کے اسے طلاق دے کر اسے آوارۂ وطن کر دیتے تھے، کہ نہ تو اس کے پاس مال ہوتا کہ جس سے اپنا گزر بسر کر سکے اور نہ ہی کوئی اس سے شادی کرنے کو پسند کرتا تھا کہ اس پر اپنا مال خرچ کرے اور اس کا نان ونفقہ دے، ان کے ہاں یتیم بچوں کا حال بہت برا تھا اور اس حوالہ سے وہ نہایت بدترین صورتحال کا شکار ہوئے تھے، یتیموں کی ابتر حالت اس دور کا سب سے زیادہ گھمبیر مسئلہ تھا کیونکہ ہمیشہ جنگی حالت میں رہے اور تباہ کن لڑائیوں کے نتیجہ میں یتیموں کی تعداد بڑھ جاتی تھی اور آئے دن قتل کے واقعات کی وجہ سے اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا تھا جس سے ان یتیموں کی دیکھ بھال پر کوئی بھی توجہ نہ دیتا تھا، اور ان کی اولاد کی بدبختی کا یہ عالم تھا کہ ان کے ویران ملکوں اور فقیر و نادار خطوں میں بھوک وافلاس اور قحطی اس حد تک پہنچ جاتی تھی کہ لوگ اپنے بچوں کو قتل کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور بھوک کے ڈر سے انہیں جان ہی سے مار دیتے تھے جیسا کہ آیات مبارکہ سورۂ انعام آیت ۱۵۱، سورۂ تکویر آیت ۸ اور سورۂ زخرف آیت ۱۷ میں ان مطالب کو صریح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھوک وافلاس کے خوف سے اپنی اولاد کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے تھے اور بیٹیوں پر تشدد کرتے تھے اور ان کے ہاں بیٹی کی پیدائش کی خبر سخت ناگوار و ناپسندیدہ ترین ہوتی تھی۔

ان حالات میں ان کے حکومتی سلسلوں کی صورتحال یہ تھی کہ جزیرہ نما کے اطراف میں اگرچہ کہیں کوئی بادشاہ ہوتا تھا جو اپنے طاقتور ہمسایوں اور نزدیکیوں کی حمایت سے امور سلطنت چلاتا تھا جیسے شمالی جانب ایران، مغربی جانب روم اور جنوبی جانب حبشہ تھا تو ان علاقوں میں سلطنتی نظام حاکم تھا لیکن درمیانی علاقوں مثلاً مکہ، یثرب، طائف وغیرہ تو ان میں جمہوریت جیسی صورتحال تھی لیکن جمہوریت حقیقی صورت میں نہ تھی، اور بدوی قبائل بلکہ بستیوں کے اندر اصل حکمرانی ان کے رؤساء اور دولتمندوں اور قبیلوں کے شیوخ کے پاس ہوتی تھی کہ جو ایک بادشاہت میں ڈھل جاتی تھی، تو اس طرح ان کے درمیان ہرج و مرج کا ایک ماحول تھا جس میں ہر گروہ اپنے ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور جزیرہ نما کا علاقہ ہر طرف سے عجیب وغریب رسوم و عادات اور خرافی وبیہودہ عقائد کا گڑھ بن چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اَن پڑھ اُمّی وان پڑھ ہونے کی بلا بھی چھائی ہوئی تھی اور عشائر وقبائل کے طرزِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں تعلیم وتعلم کا فقدان تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں بسنے والے لوگوں کے حالات و اعمال اور عادات و رسوم کے بارے میں جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ سب قرآنی آیات مبارکہ کے سیاق اور مربوطہ بیانات سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، چنانچہ وہ آیات و بیانات جو ان کے بارے میں نازل و صادر ہوئے کہ جن میں ظہور اسلام سے قبل مکہ میں ان سے خطاب ہوا اور پھر ظہور اسلام کے بعد اور دین اسلام کے قوی ہو جانے کے بعد مدینہ منورہ میں ان کے بارے میں آیات نازل ہوئیں کہ جن میں ان کے اوصاف اور ان قابل مذمت امور و اعمال کا تذکرہ ہوا ہے جن سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا اور انہیں ان اعمال سے باز رہنے کی بھرپور تاکید ہوئی، اگر قارئین کرام ان پر اچھی طرح غور و فکر کریں تو انہیں ہمارے ذکر کردہ مطالب کی صحت و درستی سے آگاہی حاصل ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی ان تمام امور و مطالب کا تفصیلی تذکرہ کرتی ہے جو ہم نے بیان کئے کیونکہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اجمالی اور مختصر و اشاراتی ہے۔ تاہم ان تمام مطالب و امور کا جو اجمالی تذکرہ قرآن مجید میں ہوا ہے اسے ایک ہی جملہ میں بیان کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید نے اُس دور کو دور جاہلیت سے موسم کیا ہے تو اس بناء پر ''زمانۂ جاہلیت'' (عہد جاہلیت) کا لفظ ان تمام تفاصیل کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، تو یہ ہے اُس دور کے عربوں کا حال! اور جہاں تک ان کے اردگرد کے علاقوں میں بسنے والوں کے حالات کا تعلق ہے یعنی روم، فارس، حبشہ، ہندوغیرہ تو ان کے بارے میں قرآن مجید میں صرف اجمالی بیان پر اکتفاء کی ہے، البتہ ان میں سے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اور ان سے ملحق لوگوں کے معاشروں کا استبدادی بنیادوں پر استوار تھا اور ان میں شخصی حکومتیں راج کرتی تھیں کہ جن میں بادشاہ، رؤساء، حکمران اور مزدوروں کے حوالوں سے تقسیم بندیاں ہو چکی تھیں، گویا وہ معاشرے دو طبقوں میں تقسیم ہو چکے تھے:

ایک حاکم طبقہ اور دوسرا محکوم طبقہ، حاکم طبقہ کی حالت یہ تھی کہ وہ جس طرح چاہتا تھا اسی طرح لوگوں کی جانوں، اموال اور عزت و ناموس کے ساتھ سلوک کرتا تھا جبکہ دوسری جانب محکوم طبقہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور ذلت کی زندگی بسر کر رہا تھا کہ نہ تو ان کی جانیں محفوظ تھیں اور نہ ہی مال و عزت کو تحفظ حاصل تھا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اُنہیں آزادی اظہار رائے کا حق بھی حاصل نہ تھا اور وہ وہی کچھ کہنے پر مجبور تھے جو ان کے بالاتر طبقہ کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا، اس حوالہ سے حاکم طبقہ نے علماء دین اور مذہبی رہنماؤں کو اپنے دست نگر بنا کر ان کا گھیرا تنگ کر دیا تھا اور پھر ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتے تھے، چنانچہ انہوں نے اس طرح معاشرے کے عوام کے دل اور ان کی سوچوں پر اس طرح پہرے لگا دیئے تھے کہ وہ سب ان کے ہاتھوں اسیر ہو کر رہ گئے تھے اور صورتحال کچھ اس طرح کی ہو گئی تھی کہ حاکم طبقہ ہی لوگوں کے دین و دنیا کا مالک بن چکا تھا اور وہ لوگوں پر ان کے دینی معاملات میں علماء سے تقریروں و تحریروں کے ذریعے جبکہ دنیاوی امور میں تازیانہ و تلوار یعنی ریاستی وسائل و طاقت کے ذریعے حکومت کرتے تھے اور حاکم طبقہ کی اندورنی صورتحال یوں تھی کہ وہ بھی

داخلی انتشار کا شکار تھے اور ان کے درمیان طاقت کی رسہ کشی کے حوالہ سے وہی صورت ہوگئی تھی جو سابقہ طبقاتی تقسیم بندی کی بابت ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایک گروہ حکمرانوں کے ساتھ ان کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے تھا اور دوسرا عاجز و ناتوان! پہلے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جو "الناس علی دین ملو کھم" (لوگ بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) کے مصداق روش اختیار کئے ہوئے تھے اور دوسرے گروہ میں کچھ نہ کر سکنے والے لوگ تھے جو حالات کی تلخیوں کے ساتھ اپنا سفر حیات طے کر رہے تھے، گویا مجموعی طور پر دو ہی طبقے تھے۔ ایک دولتمند و طاقتور اور دوسرا کمزور و ناتوان اور غریب و نادار، اسی طرح کا حال گھریلو زندگی کا تھا جس میں گھر کا مالک عورتوں اور بچوں پر حکومت کئے ہوئے تھا اور ان پر اپنا ارادہ مسلط کرتا تھا، یہی حالت معاشرے میں عمومی طور پر مردوں اور عورتوں کے درمیان تھی کہ مرد حضرات عورتوں کے ارادہ و اختیار اور آزادیٔ اظہار رائے سمیت تمام امور اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور انہیں ہر حق سے محروم کر کے انہیں پوری طرح اپنا تابع فرمان بنائے ہوئے تھے اور انہیں خدمت گزاروں سے زیادہ کوئی اہمیت و مقام حاصل نہ تھا، بلکہ جو چیزیں خود خواتین سے مربوط تھیں ان میں بھی انہیں اپنی مرضی سے کام کرنے کا حق حاصل نہ تھا اور وہ اپنی استقلالی حیثیت سے یکسر محروم تھیں۔

مذکورہ بالا حالات کے تناظر میں جب ہم قرآن مجید کی مقدس آیات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس صورتحال کو مختلف بیانات میں ذکر کیا گیا ہے مثلاً:

سورۂ آل عمران، آیت: ۶۴

○ "قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝"

(کہہ دیجئے) اے اہل کتاب تم اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہ دیں اور ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں، پس اگر وہ اس سے بھی روگردانی کریں تو تم کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں)

اس آیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس مکتوب گرامی میں شامل کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بادشاہِ روم ہرقل کے نام بھیجا، بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی طرح کے خطوط آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصر، حبشہ، فارس کے بادشاہوں وحکمرانوں اور نجران والوں کو بھی بھجوائے اور ان میں یہ آیت مبارکہ درج کی۔

اسی حوالہ سے قرآن مجید میں یوں مذکور ہے:

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

○ ''یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ''

(اے لوگو، ہم نے تمہیں مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا کیا اور تمہیں گروہ اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو)

ازدواجی رشتہ کے حوالہ سے کنیزوں اور نوانون لڑکیوں کی عزت واحترام کے تحفظ کا عملی فرمان اس طرح صادر ہوا:

سورۂ نساء، آیت: ۲۵

○ ''بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْکِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ''

(تم ایک دوسرے سے ہو، توان سے ان کے اہل سے اجازت کے ساتھ نکاح کرو)

خواتین کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۵

○ ''اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ''

(میں کسی بھی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے سے ہو)

یہ تھی اہل کتاب کی حالت، اور جہاں تک ان کے علاوہ دیگر ادیان کے پیروکاروں کا تعلق ہے توان ایام میں وہ بت پرست اور ان سے ملحق گروہ تھے کہ جن کی حالت اہل کتاب سے بھی زیادہ بری اور ناگفتہ بہ تھی، چنانچہ ان کے حوالہ سے قرآنی آیات مبارکہ میں جو مطالب مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام امور میں ناکامی اور نقصان ان کا مقدر بن چکا تھا اور وہ سعادت وخوشبختی سے قطعی محروم تھے اور ان حالات میں ان کے لئے اعلیٰ زندگی اور بلند معیار کو بیان کیا گیا۔

سورۂ انبیاء، آیت ۱۰۵ تا ۱۰۹:

○ ''وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُکُمْ عَلٰی سَوَآءٍ''

(اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کی وراثت میرے نیک وصالح بندوں کو ملے گی، اس میں عبادت گزار لوگوں کے لئے واضح بیان ہے، اور ہم نے آپ ﷺ کو کائنات کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے، پس اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں واضح طور پر آگاہ کر چکا ہوں)۔

سورۂ انعام، آیت: ۱۹

''وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ''

(اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تا کہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور جسے یہ پیغام پہنچے انذار کروں)

ظہور اسلام کیونکر ہوا؟

ظہور اسلام سے قبل یعنی زمانہ جاہلیت میں انسانی معاشرہ کی حالت کے بارے میں آپ سن چکے ہیں کہ لوگ باطل پرستی میں مست تھے اور زندگی کے ہر شعبہ میں ظلم وفساد ان پر حاکم تھا، اس حالت میں توحیدی دین جو کہ دین حق ہے ان کی اصلاح احوال کیلئے ظہور پذیر ہوا تا کہ ان پر حق کی حاکمیت اور ہر شعبہ زندگی میں حق کے بول بالا ہونے کو یقینی بنائے اور ان کے دلوں کو شرک کی پلیدی سے پاک کر کے ان کے اعمال کو پاکیزہ اور ان کے معاشرہ کو نیکی کا حامل بنا دے اور انہیں اس گندگی کے ڈھیر سے نکالے کہ جس نے انہیں گھیر رکھا ہے اور اخلاقی گراوٹوں نے ان کی رگوں اور ان کے ظاہر و باطن میں جگہ کر لی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انہیں حق وحقیقت کی طرف رہنمائی کرے اور وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ ان پر سختی کرے یا انہیں تکلیف میں مبتلا کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انہیں پاک و پاکیزہ رکھے اور ان پر اپنی نعمتیں پوری کرے، بنا برایں لوگ جس عقیدہ و مذہب کے پیروکار ہیں وہ باطل ہے جبکہ خداوند عالم انہیں جس دین کی راہ پر لانا چاہتا ہے وہ حق ہے اور یہ دونوں یعنی حق اور باطل ایک دوسرے کے مدمقابل اور مخالف سمت میں ہیں کہ جو یکجا نہیں ہو سکتے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس صورتحال میں کیا کرنا چاہیے؟ آیا اہل باطل میں سے کچھ لوگوں کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کر کے ان کے دیگر افراد کی اصلاح کی تدبیر کی جائے اور اس سلسلہ کو وسعت دے کر غلبہ حق کیلئے ہر ممکن روش اختیار کی جائے خواہ وہ نادرست ہی کیوں نہ ہو؟ کہ متمدن سیاست کے کھلاڑیوں کا عام طریقہ وطرز عمل یہی ہے، اور یہ طرز عمل اور مقصود و مطلوب تک پہنچنے کا یہ طریقہ عام طور پر کامیاب رہتا ہے اور اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ حق وحقیقت کے باب میں اسے اختیار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دعوت اسلامیہ حق وحقیقت کے اتباع ہی کی دعوت دیتی ہے اس کے علاوہ کسی بھی روش کو قرین صحت قرار نہیں دیتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مقصد کا تعین وتشخص اور وجودی شناخت ان اعمال ہی سے ہوتی ہے جو اس کے حصول کیلئے انجام دیئے جائیں اور اس تک پہنچنے میں جو وسائل استعمال میں لائے جائیں وہی مقصد کو جنم دیتے ہیں۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ باطل حق کو جنم دے اور بیمار صحتمند تک پہنچا دے جبکہ جنم لینے والا، جنم دینے والوں ہی سے وابستہ ومنسوب ہوتا ہے۔

عام طور پر سیاسی عمل کا بنیادی مقصد حکومت واقتدار حاصل کرنا اور جس طرح بھی ممکن ہو دوسروں پر حکمرانی کر کے عیش وعشرت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہوتا ہے خواہ خیر ونیکی کر کے ہو یا شر وبرائی کے ذریعے سے ہو، اور خواہ حق وحقیقت کی راہ وروش اپنا کر ہو یا باطل وناحق طریقہ اختیار کر کے ہو، اس میں حق کی پیروی اور حقیقت کا راستہ اختیار کرنا ہرگز مقصود نہیں ہوتا،

جبکہ دعوتِ حق میں حق کے سوا کچھ بھی ملحوظ و مقصود نہیں ہوتا کیونکہ اگر اس میں باطل و نادرست راہ اختیار کی جائے تو اس سے باطل کی تائید اور حمایت ہوگی جس سے دعوت حق دعوت باطل میں بدل جائے گی۔

دعوتِ حق کے عملی مظاہر، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت طیبہ میں واضح طور پر موجود ہیں اور اسی حقیقت کے بارے میں خداوند عالم نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا اور اسی کی بابت قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر واضح احکام صادر ہوئے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہل باطل سے کسی قسم کی نرمی برتنے اور دین کے معاملے میں کسی صورت میں اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے، چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد حق تعالیٰ ہوا:

سورۂ کافرون:

○ ''قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۚ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ؕ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۠''

(کہہ دیجئے، اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرسکتا جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ ہی تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں، اور نہ ہی میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ ہی تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں، تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے ہے)

ایک آیت میں دھمکی آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے یوں کہا گیا:

سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۷۴۔۷۵

○ ''وَ لَوْ لَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْهِمْ شَیْـًٔا قَلِیْلًا ۗ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ''

(اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ بناتے تو آپ کچھ نہ کچھ ان پر اعتماد کر لیتے، اگر ایسا ہو جاتا تو ہم آپکو زندگی اور موت دونوں میں دگنے عذاب میں مُبتلا کر دیتے)

ایک مقام پر وسیع ترمعنی کے ساتھ اس طرح ارشاد ہوا:

سورۂ اعراف، آیت: ۵۸

○ ''وَ الْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا''

(اور پاک زمین سے اس کا میوہ اپنے رب کے اذن سے نکلتا ہے اور جو ناپاک ہو اس سے گندی و بیکار چیز کے سوا کچھ نہیں نکلتا)۔

اور چونکہ حق و باطل یکجا نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان کے درمیان کسی طرح سے بھی قربت و ہمرنگی ممکن ہے لہٰذا خداوند

عالم نے آنحضرت ﷺ کو دعوت حق کی عظیم تر ذمہ داری سونپتے ہوئے حکم دیا کہ اپنے طرزِ عمل میں محبت وتدبر اور تدریجی روش کے ساتھ مربوطہ اقدامات بجالائیں کیونکہ اصل عمل وہدف اور حقیقی مشن ومقصد اسی کا متقاضی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان میں تین مختلف حوالوں سے بات کی:۔

(۱) پہلا حوالہ: دین کے معارف وقوانین!

دین اسلام جن معارف اور احکام وقوانین پر مشتمل ہے وہ انسانی معاشرہ کے امور کی اصلاح کی ضمانت دیتے ہیں اور فتنہ وفساد کو جڑ سے کاٹ دیتے ہیں کیونکہ لوگوں کے عقائد ونظریات کو تبدیل کرنا نہایت مشکل ودشوار ترین کام ہے بالخصوص اس صورت میں کہ جب وہ عقائد ونظریات اخلاق واعمال سے وجود میں آئے ہوں۔ تو وہ لوگوں کی عادات میں رچ بس گئے ہوں کہ صدیاں گزر چکی ہوں اور اسلاف ان عادات کے رسیا بھی ہو چکے ہوں اور بعد والی نسلوں نے بھی انہیں اپنالیا ہو تو اس صورتحال میں دشواریاں زیادہ ہوتی ہیں بالخصوص جب دعوت دین عمومی ہو اور زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو اور تمام انسانی اعمال پر اس طرح چھانے لگے کہ کوئی حرکت وسکون، ظاہر وباطن زمان ومکان اور افراد ومعاشرہ اس سے خالی نہ رہے، تو اس طرح کی کیفیت کا وجود میں آنا بلکہ اس کا تصور ہی دلوں کو ہلا دیتا ہے کیونکہ ایسا ہونا عادتاً ممکن نہیں ہوتا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت ہرگز بھلائی نہیں جاسکتی کہ معاشرہ میں اس قدر وسیع تبدیلی اعتقادات سے زیادہ اعمال میں دشوار ومشکل ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر انسان اعتقاد سے پہلے عمل میں مانوس اور عادی ہو جاتا ہے اور عمل کی اثر گزاری زیادہ اور جلدی ہوتی ہے چنانچہ اگر کبھی عمل اور عقیدہ کا تصادم ہو تو نفس کی رغبت عمل کی طرف زیادہ ہو جاتی ہے اور عقیدہ کا احترام کم ہو جاتا ہے (جیسا کہ کسی بھی برے عمل کی پرکشش صورت میں نفس کی توجہ ورغبت اس کی انجام دہی کی طرف ہو جاتی ہے کہ پھر عقیدہ کو اہمیت نہیں دی دی جاتی) یہی وجہ ہے کہ دعوتِ اسلامیہ اپنے ابتدائی مراحل میں اعتقادات سے مربوط تھی کہ لوگوں کو صحیح عقائد قبول کرنے کی اجمالی دعوت دی گئی جبکہ قوانین واحکام اور دستورات شرعیہ تدریجی طور پر یکے بعد دیگرے صادر ہوئے، یعنی دعوت اسلامی نے تدریجی طور پر لوگوں تک اپنے حقائق ومعارف پہنچائے تاکہ وہ طبیعتوں پر گراں نہ ہوں اور دلوں وسوچوں میں ان کی ترتیبات وترکیبات تزلزل پیدا نہ کریں اور ہم نے جو مطالب ذکر کئے ہیں وہ پختہ و ناقابلِ انکار حقائق ہیں کہ جو محقق ودانشوران کے بارے میں غور وفکر کرے وہ مختلف قرآنی آیات کے مطالعہ سے اس امر سے بخوبی آگاہ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے مکی ومدنی تمام آیات میں معارف الٰہیہ اور احکام شرعیہ موجود ہیں اور وہ اس طرح کہ مکی آیات میں کلیات اور بنیادی اصولوں کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے جبکہ مدنی آیات میں کلیات اور بنیادی اصولوں کو مفصلاً بیان

کیا گیا ہے اور مدنی آیات یعنی وہ آیات جو ہجرت کے بعد جہاں بھی نازل ہوئیں ان میں تفصیلی بیان کے ساتھ ان احکام و دستورات کی جزئیات ذکر کی گئی ہیں جو مکی زندگی میں کلی اور مجمل صورت میں بیان ہوئے، اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ علق، آیت ۶ تا ۱۴:

○ ''كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۭ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۭ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَي الْهُدٰٓى ۙ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۭ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۭ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۭ''

(سچ یہ ہے کہ انسان سرکشی کرتا ہے کہ اپنے آپ کو دوسروں سے مستغنی و بالاتر دیکھتا ہے، یقیناً تیرے پروردگار کی طرف ہی لوٹنا ہے، کیا تو نے دیکھا اسے جو بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے، کیا تو نے دیکھا کہ اگر وہ راہ راست پر ہوتا یا تقویٰ کا حکم دیتا کیا تو نے دیکھا یہ کہ اس نے تکذیب کی اور روگردانی کی، کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے)

اس کے علاوہ وہ آیات مبارکہ جو بعثت نبوی ﷺ کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئیں کہ جن کے حوالہ سے جلد دوم میں روزہ سے متعلق آیات کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں ان میں توحید و معاد (روز قیامت) سے مربوط بنیادی اصول اور تقویٰ و عبادت کے دستورات اجمالی طور پر مذکور ہیں۔

سورۂ مدثر، آیت ۳:

○ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۽ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

(اے مدثر) کھڑے ہوں اور انذار کریں اور اپنے پروردگار کی کبریائی بیان کریں)

سورۂ شمس، آیت ۱۰:

○ ''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۽ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۽ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۽ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝''

(اور قسم ہے نفس کی اور جو کچھ اس نے اس کو درست کیا، پھر اسے اس کا فجور و تقویٰ (برائی اور اچھائی) الہام کیا (سمجھا دیا) تو جس نے اسے پاکیزہ رکھا وہ کامیاب ہو گیا، اور جس نے اُسے آلودہ کیا وہ ناکام ہوا)

سورۂ اعلیٰ، آیت: ۱۵

○ ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝''

(یقیناً جس نے اسے پاک رکھا وہ کامیاب ہوا اور اس نے تیرے پروردگار کے نام کو یاد رکھا پھر نماز ادا کی)

سورۂ حم سجدہ: آیت ۸

○ ''قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝''

(کہہ دیجئے کہ میں تم جیسا انسان ہوں، مجھ پر وحی ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس تم اسی کی طرف بڑھو۔ اسی سے لو لگاؤ اور اسی کے بن کر رہو اور اس سے طلب مغفرت کرو، اور مشرکوں کے لئے عذاب ہے، وہ کہ جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، بے شک جو لوگ ایمان لائیں اور نیک اعمال انجام دیں ان کے لئے اجر ہے)

یہ آیت بھی بعثت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئیں:

سورۂ انعام، آیت: ۱۵۱۔ ۱۵۳

○ "قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝"

(کہہ دیجئے کہ آؤ میں تمہیں بیان کروں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو تنگدستی کی وجہ سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی! اور تم برائیوں کے قریب نہ جاؤ خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، اور جس کا خون بہانا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل مت کرو، سوائے اس کے کہ جو حق ہو (قتل کا حقدار ہو) یہ وہ چیزیں ہیں جن کا اس نے تمہیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار بن سکو، اور تم یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے اس کے مال کے نزدیک بھی نہ جاؤ مگر اس طرح سے کہ اس کے لئے اچھا ہو اور ناپ تول میں انصاف سے کام لو، ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں لگاتے، اور جب کوئی بات کرو تو عدل کے مطابق کرو خواہ وہ تمہارا قریبی ہی کیوں نہ ہو، اور اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا کرو، اس سب کچھ کے بارے میں وہ تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تمہیں یاد رہے، اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے، پس تم اس پر چلتے رہو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستہ سے دور کر دیں گے، ان باتوں کا وہ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ)۔

آپ مذکورہ بالا آیات مبارکہ کے سیاق و اسلوب بیان پر غور کریں کہ ان میں نواہی و اوامر کو کس طرح بیان کیا گیا ہے، پہلے نواہی کو اور پھر اوامر کو اجمالی صورت کے ساتھ بیان کیا گیا اور ان سب کو ایک ہی جامع بیان میں اس طرح ذکر کیا گیا

کہ کوئی تھوڑی بہت سوچ رکھنے والا عام شخص بھی اس کا انکار اور اسے تسلیم کرنے سے سرتابی نہیں کرسکتا، کیونکہ کوئی باشعور انسان برائیوں کی گندگی اور اس سے اجتناب و دوری اختیار کرنے کے لازم وضروری ہونے کا انکار نہیں کرسکتا، اسی طرح صراطِ مستقیم پر اکٹھا ہونے کی افادیت اور اس کے ذریعے تفرقہ و پراگندگی اور کمزوری وتباہی سے بچنے کے یقینی ہونے کے بارے میں کسی باشعور انسان کو کوئی شک وشبہ لاحق نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ باتیں فطرت سلیمہ کا تقاضا وفیصلہ ہیں۔ چنانچہ دعوتِ اسلامیہ میں فطری تقاضوں وفیصلوں کا سہارا لیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں تمام محرمات اور ممنوعہ اعمال کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے مثلاً ایسے اعمال کا ارتکاب جس کی وجہ سے والدین عاق کردیں، اسی طرح والدین کی بیحرمتی، والدین کا غربت وافلاس کی بناء پر اولاد کو قتل کرنا، بے گناہ انسان کو قتل کرنا اور یتیم کا مال کھانا وغیرہ، تو ان اعمال کے حوالہ سے جب ہم انسانی طبع وجود کے تقاضوں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان سے سخت نفرت کرتی ہے اور ان سے دور رہنے کا حکم دیتے ہوئے اس کے مرتکب کو ''مجرم'' قرار دے کر دعوتِ اسلامیہ کی تائید کرتی ہے، اس سلسلہ میں ہم نے جو آیات ذکر کی ہیں ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات ایسی ہیں جن میں ان امور کی بابت واضح دستورات مذکور ہیں۔

بہرحال مکی آیات مبارکہ میں عمومی طور پر صورتحال یہ ہے کہ ان میں احکام و دستورات اجمالی بیان کے ساتھ مذکور ہیں جن کی تفصیلات بعد میں مدنی آیات مقدسہ میں ذکر ہوئیں۔ لیکن اس کے باوجود مدنی آیات بھی بیان احکام کے حوالہ سے تدریجی کیفیت نزول کی حامل نظر آتی ہیں، بنابرایں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مدنی آیات میں بیان ہونے والے تمام احکام ایک ہی دفعہ نازل ہوئے بلکہ ان کا نزول تدریجی اور یکے بعد دیگرے ہوا، چنانچہ ان کی چند مثالیں ہی آپ دیکھیں اور ان میں غور وفکر اور تدبر کریں تو آپ کو حقیقت حال معلوم ہوجائے گی مثلاً شراب کی حرمت کے حکم پر مشتمل آیات مبارکہ کچھ اس طرح ہیں:

سورۂ نحل، آیت: ۶۷

○ ''وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا''

(اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے تم نشہ آور چیز بناتے ہو اور اچھا رزق کماتے ہو)

یہ مکی آیت ہے، اس میں شراب کی حرمت کا اجمالی حکم مذکور ہے لیکن اس میں اس کی تفصیلات ذکر نہیں کی گئیں سوائے اس کے کہ اس میں ''اچھا رزق'' کے الفاظ سے نشہ آور چیز کے ''اچھا رزق'' نہ ہونے کی طرف لطیف اشارہ ہوا ہے۔

درج ذیل آیت میں یوں بیان ہوا۔

سورۂ اعراف، آیت: ۳۳

○ ''قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ''

(کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے برائیوں کو حرام قرار دیا ہے خواہ وہ ظاہری ہوں یا چھپی ہوئی، اور گناہ کو حرام

قرار دیتا ہے)۔

یہ آیت بھی مکی ہے، اس میں صریح و واضح الفاظ میں ''اثم'' یعنی گناہ کی حرمت بیان ہوئی ہے لیکن یہ بیان نہیں کیا گیا کہ شراب خوری ''گناہ'' اور ''اثم'' کے زمرے میں آتی ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس حوالہ سے نہایت نرمی برتی گئی اور بیان حکم میں نرم انداز اپنایا گیا کیونکہ عربوں میں شرابخوری اس قدر عام تھی اور وہ اس برائی کے اس قدر رسیا ہو چکے تھے کہ وہ ان کے گوشت پوست میں رچ بس گئی تھی، گویا ان کی ہڈیاں بھی اسی سے پختہ ہوئی تھیں، اس حال میں ضروری تھا کہ ان کے ساتھ بات کرنے میں معتدل لہجہ اختیار کیا جائے اور نرمی کے ساتھ انہیں اس برے عمل سے اجتناب برتنے کا کہا جائے، لیکن اس کے بعد اس حوالہ سے نازل ہونے والی مدنی آیات میں واضح وصریح الفاظ میں تفصیلی بیان اس طرح ہوا۔

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۹

○ ''یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ فِیۡہِمَاۤ اِثۡمٌ کَبِیۡرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثۡمُہُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِہِمَا''

(لوگ آپ سے شراب اور جوا کے بارے میں پوچھتے ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے مالی فائدے ہیں جبکہ ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ بڑا ہے)

یہ مدنی آیت ہے، اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ شراب خوری بہت بڑا گناہ ہے اور خداوند عالم نے اسے حرام قرار دیا ہے کہ جس کا ذکر سورۂ اعراف کی آیت ۳۳ میں ہو چکا ہے، اور اس میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا نرمی ونصیحت کا انداز اپنایا گیا ہے۔

پھر ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ مائدہ، آیت: ۹۰۔۹۱

○ ''یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَ الۡمَیۡسِرُ وَ الۡاَنۡصَابُ وَ الۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّوۡقِعَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃَ وَ الۡبَغۡضَآءَ فِی الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ وَ یَصُدَّکُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ عَنِ الصَّلٰوۃِ ۚ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَہُوۡنَ ﴿۹۱﴾''

(اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور قرعہ کے تیر سب شیطانی اعمال ہیں ان سے پرہیز کرو تا کہ تم فلاح پا سکو، شیطان تو چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی وعداوت قائم کر دے اور شراب و جوا کے ذریعے تمہیں آپس میں لڑوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے دور کر دے، تو کیا تم رک سکتے ہو؟)

یہ مدنی آیت ہے اس میں شراب خوری و جوا وغیرہ کی حرمت کا آخری بیان موجود ہے کہ جس میں اس سلسلہ میں مربوطہ دستورات واضح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔

اسی کی مانند میراث کے حکم پر مشتمل آیت میں تدریجی بیان موجود ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے اپنے اصحاب کے درمیان مواخات و بھائی بھائی ہونے کا رشتہ قائم کیا، اور دو بھائیوں کو ایک دوسرے کا وارث بنایا تا کہ انہیں وراثت کے بارے میں بعد میں صادر ہونے والے احکام و دستورات کے لئے ذہنی طور پر آمادہ و تیار کریں، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

سورۂ احزاب، آیت:۶

○ ''وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ''

(رشتہ دار ایک دوسرے کے وارث ہیں، یہ حکم اللہ کی کتاب میں ہے، مومنین و مہاجرین میں خواہ کوئی بھی ہو)

تو اکثر ناسخ و منسوخ احکام اسی طرح سے ہیں۔

ان تمام موارد اور ان جیسے دیگر موضوعات میں احکام و دستورات کے اظہار و بیان اور اجراء و نفاذ میں نرم انداز اختیار کیا گیا تا کہ آسانی کے ساتھ ان پر وہ قوانین لاگو کئے جاسکیں اور وہ محبت کے ساتھ انہیں قبول کرلیں اس حوالہ سے ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ بنی اسرائیل، آیت:۱۰۶

○ ''وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾''

(اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اسے تدریجی صورت میں نازل کیا ہے)۔

لہٰذا اگر قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک ہی بار نازل ہوتا اور پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس کے تفصیلی احکام و دستورات کو بیان کرتے جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۴۴ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا حکم بھی دیا گیا اور یوں کہا گیا: ''وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ'' (اور آپ پر قرآن نازل کیا گیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو واضح طور پر بتائیں وہ جو اُن پر نازل کیا گیا) چنانچہ اس میں تمام اعتقادی و اخلاقی معارف و دستورات اور عبادات سے مربوط احکام کے ساتھ ساتھ معاملات و سیاسیات وغیرہ کے متعلقہ قوانین کلی صورت میں بیان کئے گئے ہیں، تو اس صورت میں ان احکام کا ادراک عام لوگوں کی سوچوں اور افہام سے بالاتر ہوتا اور وہ ان کا تصور بھی نہ کر پاتے چہ جائیکہ انہیں تسلیم کر کے ان پر عمل کرتے اور وہ احکام ان کے دلوں اور ارادوں و اعضاء و جوارح پر حاکم ہوتے، اس وجہ سے قرآن مجید کی تدریجی تنزیل نے لوگوں کے دلوں میں اسے قبول و تسلیم کرنے کی راہیں ہموار کیں اور اسے کتاب الٰہی قرار دینے میں ایک بنیادی اور مؤثر کردار ادا کیا، چنانچہ اس حوالہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ فرقان، آیت: ۳۲

○ ''وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا ﴿۳۲﴾''

(اور کافروں نے کہا کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ نازل کیوں نہیں ہوتا، اسی طرح ہم اس کے ذریعے تیرے دل کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں، اور ہم نے اسے ترتیل کے ساتھ قرار دیا ہے)

اس آیت مبارکہ میں واضح ثبوت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن کے تدریجی انداز میں اپنے رسول ﷺ کے ساتھ نرم انداز اختیار کرتے ہوئے آپ ﷺ کی امت پر اپنی رحیمانہ وکریمانہ شفقت کا عملی مظاہرہ کیا، اس کا ثبوت آیت شریفہ کے جملہ ''وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا'' پر غور کرنے سے واضح طور پر معلوم ہوسکتا ہے۔

اس موضوع کے حوالہ سے قرآنی آیات میں غور وفکر اور تدبر کرنے والے اہل دانش پر واجب وضروری ہے کہ بیان احکام میں اجمال سے تفصیل اور تدریجی انداز اختیار کرنے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھیں کہ یہ سب کچھ نرمی و شفقت، حسن تربیت اور بہتری وبھلائی کی عملی پاسداری کے طور پر کہا گیا ہے تاکہ کسی دشواری ومشکل کے بغیر اصل غرض و مقصد حاصل ہوسکے۔

(۲) دوسرا حوالہ: احکام ودستورات کا تدریجی بیان

احکام ودستورات کے بیان میں لوگوں کی عمومی حالت اور معاشرتی عادات کے تناظر میں تدریجی انداز اختیار کیا گیا یہ بات واضح ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تمام افراد بشر کے لئے مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ کی نبوت کسی مخصوص قوم وقبیلہ اور خاص خطہ وعلاقہ کے لئے مختص نہ تھی بلکہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کے لئے آپ کو ذمہ داری دی گئی، اس سلسلہ میں واضح بیان پر مشتمل قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ اعراف، آیت: ۱۵۸

○ ''قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَاۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ''

(کہہ دیجئے، اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، وہ اللہ کہ جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے)

سورۂ انعام، آیت: ۱۹

○ ''وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ''

(اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا جاتا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پہنچے اسے انذار کروں)

سورۂ انبیاء، آیت: ۱۰۷

○ ''وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۞''

(اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر کائنات کے لئے رحمت بنا کر)

اس کے ساتھ ساتھ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سب کو اسلام کی دعوت دی جن میں یہودی جو کہ بنی اسرائیل میں سے تھے، روم، عجم، حبشہ اور مصر کے غیر عرب اقوام شامل تھیں اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں میں قوموں کی بزرگ شخصیات تھیں، مثلاً مسلمان جن کا تعلق عجم سے تھا، بلال مؤذن جن کا تعلق حبشہ سے تھا اور صہیب جن کا تعلق روم سے تھا، تو اس دور میں آپ ﷺ کی نبوت کا تمام افراد بشر کے لئے ہونا مسلم الثبوت ہے کہ جس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور سابق الذکر آیات مبارکہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کے ہر دور اور ہر خطہ وعلاقہ کے لئے یکساں ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

سورۂ حم السجدہ، آیت: ۴۲

○ ''وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ ۞ لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ ۞''

(اور وہ عزت والی کتاب ہے کہ باطل نہ تو اس کے سامنے سے اس پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، وہ حکیم وحمید کی طرف سے نازل ہوا ہے۔)

سورۂ احزاب، آیت: ۴۰

○ ''وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ''

(لیکن وہ اللہ کا رسول اور سب سے آخری نبی ہے)

یہ دونوں آیتیں آنحضرت ﷺ کی نبوت کے عام اور ہر مکان وزمان کے لئے ہونا ثابت کرتی ہیں، یعنی ان سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کسی خاص علاقہ وقوم کے لئے مبعوث نہیں ہوئے بلکہ پوری کائنات کے لئے اور ہر خطہ کے لئے بھیجے گئے ہیں ان آیات کی بابت تفصیلی تذکرہ و بحث ان کے مربوطہ مقامات میں ان کی تفسیر کے حوالہ سے ہوگی۔

بہر حال آنحضرت ﷺ کی نبوت عام ہے یعنی ہر فرد بشر اور ہر قوم وقبیلہ اور خطہ وعلاقہ کے لئے ہے۔ جو شخص اسلامی قوانین ومعارف کے پھیلاؤ اور ظہور اسلام کے زمانہ میں دنیا کے حالات اور دور جہالت کی فتنہ وفساد بھری بھیانک تاریخ کا مطالعہ کرے اور اس کی نہایت زبوں حالی کا بغور جائزہ لے تو اسے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کی اصلاح اور شرک وفساد سے بھرے ہوئے معاشروں کو راہ راست پر لانا دفعتاً اور ایک ہی مرتبہ ممکن نہ تھا، بلکہ ضروری تھا کہ حالات کے تناظر میں حکیمانہ طرز عمل کے ساتھ دعوت اسلامیہ کا اقدام کیا جائے اور وہ اس طرح کہ پہلے چند مخصوص افراد کے ذریعے اس کا آغاز

ہو جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی قوم وقبیلہ ہی سے ہوں، اس کے بعد ان کے ذریعے دوسروں کو اس میں شامل کیا جائے تا کہ تدریجی طور پر اس سلسلہ کو وسعت حاصل ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ ابراہیم: آیت ۴

○ ''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ''

(اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں، تا کہ وہ اُنہیں واضح طور پر احکام الٰہی بتا سکے)

سورۂ شعریٰ، آیت: ۱۹۹

○ ''وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۝ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝''

(اور اگر ہم اسے کسی عجمی پر نازل کرتے تو وہ ان پر اس کی قرائت کرتا، وہ لوگ اس پر ایمان نہ لاتے)

جو آیات، دعوت اسلامیہ کے عربوں کو انذار سے مربوط ہونے کو ثابت کرتی ہیں ان سے اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ ان لوگوں سے مراد صرف وہی بعض افراد ہیں جنہیں دعوت وانذار ہوا، اسی طرح جن آیات میں قرآن کے ذریعے چیلنج ہوا اگر ان میں سے صرف بلاغت کے حوالہ سے چیلنج ہوا ہے تو بھی اس وجہ سے ہے کہ بلاغت، قرآن کے معجزہ ہونے کے حوالہ سے چیلنج کا ایک پہلو ہے، لہٰذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دعوتِ اسلامیہ میں مقصد ومقصود ہی صرف امت عربیہ ہے، ہاں جو بات درست ہے وہ یہ کہ مطالب کے بیان کیلئے عربی زبان ہی کو مستقل حیثیت دی گئی ہے یعنی صرف بیان میں عربی زبان مخصوص کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ قرآن صرف عربوں کے لئے نازل ہوا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت (سورۂ ابراہیم: آیت ۴) میں اس حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے جس میں ارشاد ہوا: ''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ'' (اور ہم نے جس رسول کو بھیجا اسے اس کی قوم کی زبان میں بھیجا)

اس کے علاوہ درج ذیل آیات میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ یوسف، آیت: ۳

○ ''نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ''

(اور ہم یہ قرآن آپ کی طرف وحی کر کے بہترین واقعات آپ کو بیان کرتے ہیں)

سورۂ شعراء، آیت: ۱۹۲۔۱۹۵

○ ''وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝''

(اور وہ عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل کردہ ہے، اسے روح الامین نے واضح عربی زبان میں آپ کے دل پر نازل کیا تا کہ آپ انذار کرنے والوں میں سے ہو جائیں)

بنابرایں عربی زبان، معانی اور ذہنی مقاصد کے بھرپور اظہار کا عمدہ ترین ذریعہ ووسیلہ ہے، اسی وجہ سے خداوند عالم نے تمام زبانوں میں سے اسے ہی چنا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں واضح ارشاد ہوا:

سورۂ زخرف، آیت: ۳

○ ''اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝''

(ہم نے اسے عربی زبان والا قرآن بنایا ہے تا کہ تم اچھی طرح سمجھ سکو)

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو دعوت اسلامیہ کے لئے اقدام کرنے کا حکم دیتے ہوئے اس کی ابتداء اپنے عشیرہ وقبیلہ سے کرنے کا فرمایا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ شعراء، آیت: ۲۱۴

○ ''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝''

(اور اپنے قریبی ترین خاندان والوں کو انذار کریں)

آنحضرت ﷺ نے خداوند عالم کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے اپنے عشیرہ والوں کو اکٹھا کیا اور انہیں اس بات کی دعوت دی جس کے لئے آپ ﷺ مبعوث ہوئے اور ان سے وعدہ کیا کہ جو سب سے پہلے اس کی دعوت پر لبیک کہے گا وہی اس کے بعد اس کا خلیفہ وجانشین ہوگا، چنانچہ صحیح روایات اور سیرت وتاریخ کی کتب سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اعلان پر امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے لبیک کہہ کر دعوت اسلامیہ میں آنحضرت ﷺ کا ساتھ دینے کا اظہار کیا، جس پر آنحضرت ﷺ نے اپنے وعدہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے ان کی وصایت کا اعلان کردیا، اس پر وہاں موجود دیگر افراد نے آنحضرت ﷺ کا مذاق اڑایا، حضرت علیؑ کے لبیک کہنے کے بعد آپ ﷺ کے دیگر اہل خاندان میں سے کچھ افراد ملحق ہوئے جن میں آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؑ، آپ ﷺ کے چچا محترم حضرت حمزہؑ بن عبدالمطلبؑ اور آپ ﷺ کے چچا محترم حضرت ابو طالب سرفہرست ہیں، یہ مطالب شیعہ کتب میں معتبر راویوں کے حوالہ سے مذکور ہیں اور حضرت ابو طالبؑ کے اشعار میں ان مطالب وحقائق کی طرف واضح اشارات وتصریحات موجود ہیں (مزید تفصیلات کے لئے کتاب بحار الانوار جلد ششم طبع قدیم اور سیرہ ابن ہشام اور دیگر مستند کتب کا مطالعہ کریں) حضرت ابو طالبؑ نے اپنے ایمان کو اس لئے ظاہر نہیں کیا تا کہ آنحضرت ﷺ کی حمایت میں غیر جانبداری کی صورت میں بھرپور کردار ادا کرسکیں۔

اپنے قریبیوں کو دعوت دینے کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اپنی دعوت کا دائرہ وسیع کریں چنانچہ اس سلسلہ میں ارشادِ الٰہی ہوا:

سورۂ شوریٰ، آیت: ۷

○ ''وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ''

(اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف عربی زبان والا قرآن وحی کیا تا کہ آپ مکہ اور اس کے اردگرد کے علاقہ والوں کو انذار کریں)

سورۂ سجدہ، آیت: ۳

○ ''لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ۝ ''

(تا کہ آپ اس قوم کو انذار کریں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا تا کہ وہ ہدایت پاسکیں)

اسی طرح سورۂ انعام، آیت ۱۹ (وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ) سے بھی اس امر کی گواہی ملتی ہے کہ دعوت اسلامیہ عربوں کے لئے مخصوص نہ تھی ان کے ذریعے دعوتِ حق کا آغاز حکمت و مصلحت خداوندی کے تحت تھا۔

اپنے عشیرہ و خاندان اور اہل مکہ و قریبی علاقہ کے لوگوں کو دعوت دینے کے بعد تیسرا مرحلہ شروع ہوا تو خداوند عالم نے حکم دیا کہ اب اپنی دعوت کا دائرہ مزید وسیع کریں اور اسے پوری دنیا کی اقوام تک پھیلائیں جیسا کہ سابق الذکر آیات مبارکہ میں اس کا واضح ثبوت موجود ہے جن میں آیت شریفہ: ''قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا'' (کہہ دیجئے! اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف) اور آیت شریفہ: ''وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ '' (لیکن اللہ کا رسول اور آخری نبی ہے) ان آیتوں کے علاوہ دیگر مذکورہ بالا آیات میں بھی اسی حقیقت کے ثبوت پائے جاتے ہیں۔

(۳) تیسرا حوالہ: دعوت و نصیحت کے دیگر مراتب!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد اور احکام الٰہی کے اجراء و نفاذ کے مراتب و مراحل میں زبانی اظہار عملی دعوت اور جہاد کے مرحلہ وار طریقے اختیار کئے۔

جہاں تک زبانی اظہار کے ذریعے دعوت کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے پورا قرآن گویا ہے کہ جس کے لئے کسی اضافی دلیل کی ضرورت ہی نہیں چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ انسانی عظمتوں اور اخلاق حسنہ کی پاسداری کا عملی مظاہرہ کریں، اس حوالہ سے چند آیات ملاحظہ ہوں۔

سورۂ کہف، آیت: ۱۱۰

○ ''قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ''

(کہہ دیجئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے)

سورۂ حجر، آیت: ۸۸

○ ''وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾''

(اور اپنا پہلو خم کریں ایمان لانے والوں کے لئے)

سورۂ حم سجدہ، آیت ۳۴:

○ ''وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾''

(نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتیں، احسن طور پر برائی کی روک تھام کریں، وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان عداوت ودشمنی ہوگئی گویا وہ صحیح دوست ہے)۔

سورۂ مدثر، آیت: ۶

○ ''وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ﴿٦﴾''

(اور احسان نہ جتلاؤ، زیادہ بہتری پاؤ گے)

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ دیگر متعدد آیات مبارکہ میں زیرنظر موضوع کے واضح ثبوت موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ دعوتِ حق میں لوگوں کے افہام اور مختلف صلاحیتوں کے تناظر میں اظہار و بیان کے تمام انداز اپنائیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ نحل، آیت: ۱۲۵

○ ''ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ''

(اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ بلائیں اور اُن سے احسن انداز میں جدال کریں)

اور سلبی دعوت اس طرح ہوئی کہ مومنین کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے دین واعمال اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں کافروں سے علیحدگی اختیار کریں اور اپنے دین میں دوسروں کے دین کی ملاوٹ نہ ہونے دیں یعنی کسی ایسے کے دین کو اپنے دین میں شامل نہ کریں جو خدا کی وحدانیت کا قائل نہ ہو اور نہ ہی غیر مسلموں کے معصیت وگناہ پر مشتمل اعمال اور اخلاقی پستیوں کو اپنی معاشرتی زندگی میں داخل ہونے دیں اور ان لوگوں سے صرف اسی حد تک راہ ورسم رکھیں جس سے معاشرتی زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکیں، اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ کافرون، آیت: ۶

○ ''لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ﴿٦﴾''

(تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے)

سورۂ ہود، آیت: ۱۱۳

○ ''فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ﴿١١٣﴾''

(پس آپ کو جس طرح حکم دیا گیا ہے اسی طرح استقامت و ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں اور وہ شخص بھی ایسا ہی کرے جس نے آپ کے ساتھ ہو کر اپنے ماضی سے توبہ کر لی ہے، اور طغیان ہرگز نہ کریں، یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے، اور تم ظالموں کا سہارا نہ لو ورنہ تمہیں جہنم کی آگ گھیر لے گی، اور اللہ کے سوا تمہارا اولی کوئی نہیں اور نہ تمہاری مدد کی جائے گی)

سورۂ شوریٰ، آیت: ۱۵

○ ''فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿١٥﴾''

(بس اسی بنیاد پر دعوت دو، اور جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اس طرح استقامت و ثابت قدمی دکھاؤ، اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، اور کہہ دو کہ میں اسی کتاب پر ایمان رکھتا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل و انصاف قائم کروں، اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت ہی نہیں، اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اسی کی طرف ہی جانا ہے)

سورۂ ممتحنہ، آیت: ۱۔۹

○ ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ .... لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٨﴾ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٩﴾''

(اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان سے محبت کے رشتے جوڑتے ہو جبکہ وہ اس حق کا انکار کرتے ہیں جو تمہارے پاس آ چکا ہے......... اللہ تمہیں ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع نہیں کرتا جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال باہر نہیں کیا کہ تم ان سے برائت و دوری اختیار کرو اور ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، بے شک

اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے اور دوستی کا رشتہ قائم کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے دین کے معاملہ میں تمہارے ساتھ لڑائی کی اور تمہیں تمہارے وطن و دیار سے نکال باہر کیا اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کی بھرپور مدد کی، خدا ان سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے اور جو ان سے دوستی کرے وہی لوگ ظالم ہیں)

بہر حال دشمنانِ دین سے دوری اختیار کرنے اور ان کے اعتقاد و اعمال سے برائت کرنے کے حکم پر مشتمل آیات بہت زیادہ ہیں اور ان میں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں برائت اختیار کرنے کا معنی اور اس کی کیفیت و خصوصیت واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔

اب جہاں تک ''جہاد'' کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے سورۂ بقرہ میں موجود آیات مبارکہ کی تفسیر میں مربوطہ مطالب پیش کئے جا چکے ہیں۔

تو دعوت اسلامیہ کے مذکورہ بالا تین طریقے در حقیقت دین مبین اسلام کی اہم ترین خصوصیات اور قابل فخر مطالب میں سے ہیں، ان میں سے پہلا طریقہ، دیگر دو طریقوں سے اور دوسرا طریقہ تیسرے طریقہ سے جڑا ہوا ہے۔ گویا ان تینوں طریقوں میں ایک دوسرے سے گہرا ربط اور بنیادی تعلق پایا جاتا ہے اور دعوت کے یہ مربوطہ سلسلے باہم پیوستہ ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل اور دعوتِ حق میں طریقہ کار بھی یہی تھا کہ جنگوں میں آپ سب سے پہلے مدمقابل گروہ کو وعظ و نصیحت فرماتے تھے اور اپنے پروردگار کے اس حکم کے عین مطابق عمل کرتے ہوئے مرحلہ وار اپنی منصبی ذمہ داری پوری کرتے تھے جس میں خداوند عالم نے فرمایا: ''فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنْتُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ'' (پس اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دیجئے کہ میں نے تو پوری طرح تمہارے گوش گزار کر دیا ہے)

یہاں اس مطلب کا بیان ضروری ہے کہ اسلام پر ایک نہایت غلط الزام اور تہمت لگائی جاتی ہے کہ وہ تلوار کا دین ہے دعوتِ فکر و نظر کا دین نہیں، یہ الزام و بہتان نہایت بے بنیاد اور حقائق کے منافی ہے کیونکہ قرآنِ مجید اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و تاریخ کے درخشندہ اوراق اس حقیقت پر زندہ گواہ ہیں کہ اسلام اپنی حقانیت سے ظہور پذیر ہوا اور اپنی ٹھوس حقیقت کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلتا چلا گیا، مگر کیا کیا جائے کہ جب اللہ کسی کو نور حقیقت سے استفادہ کی سعادت ہی عطا نہ کرے تو وہ حقیقت کی روشنی سے کیونکر بہرہ ور اور مالا مال ہو سکتا ہے؟

اسلام کے حوالہ سے اس طرح کی الزام تراشیاں کرنے والوں میں کلیسائی عناصر کا زیادہ حصہ ہے کہ جو صدیوں سے اس طرح کی بہتان بازیوں اور بیہودہ سازشوں میں لگے ہوئے ہیں، انہوں نے کلیساؤں میں ایک عدالت قائم کر دی جسے دینی عدالت کا نام دے کر مسیحیت سے منحرف ہونے والوں کے خلاف سخت سزائیں تجویز کرنے کے لئے استعمال کیا گیا اور اسے قیامت کے دن خدائی عدالت سے مشابہ قرار دیا گیا کہ جس کے فیصلے اٹل اور برحق ہیں ان کے کارندے چنانچہ شہروں

میں گھوم پھر کر ان عیسائیوں کو ڈھونڈتے تھے جو کسی بھی سلسلہ میں کلیسائی فکر و نظریہ سے اختلاف رکھتے تھے اور انہیں پکڑ کر اس عدالت کے سپرد کر دیتے تھے اور پھر انہیں زندہ زندہ نذر آتش کر دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اُن میں ایسے افراد بھی ہوتے تھے جو اعتقادی امور کی بجائے سائنس و ریاضیات وغیرہ میں کلیسائی نظریہ سے اختلاف رکھتے تھے، تو انہیں بھی مذکورہ عدالت میں سزائیں دی جاتی تھیں اور دینی مرتد قرار دے کر زندہ جلا دیا جاتا تھا۔

اے کاش کہ اس مطلب کو بخوبی سمجھ لیا جاتا کہ آیا دنیا میں توحید کی روشنی پھیلانا اور بت پرستی کی بیخ کنی کر کے عالم انسانیت کو فتنہ و فساد کی گندگی سے پاک کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا زمین کے متحرک ہونے اور افلاک کے تخیلی و موہومی فرضیے کی نفی کرنے والے کا گلا گھونٹنا؟ تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ کلیسا ہی نے دنیائے مسیحیت کو مسلمانوں کے خلاف ''بت پرستی سے جہاد'' کے نام پر برانگیختہ کیا جس کے نتیجہ میں تقریباً دو صدیوں تک صلیبی جنگوں کی آگ بھڑکتی رہی جس نے شہروں کو تباہ و برباد کر دیا اور کروڑوں افراد کی جانیں لے لیں اور عزتیں پامال ہوگئیں۔

دوسری جانب دو گروہ تھے جو تمدن اور آزادی کے نام پر اسلام کے خلاف برسرِ پیکار ہوگئے، انہی لوگوں نے عالمی جنگوں کی آگ بھڑکائی اور دُنیا کو زیر و زبر کر دیا، چنانچہ جب بھی ان کے مادی مفادات ذرہ بھر خطرے میں پڑنے لگے تو انہوں نے دنیا کو خاک و خون سے بھر دیا، تو کیا دنیا میں شرک کی جڑیں مضبوط کرنا، اخلاقی پستیوں میں گرنا، فضیلتوں کی بیخ کنی اور زمین اور اس میں بسنے والوں کو بدبختی و فساد کے طوفانوں میں دھکیلنا زیادہ نقصان دہ ہے یا چند گز زمین پر بادشاہت و حکومت سے ہاتھ دھونا اور نہایت معمولی و معدودے چند ٹکوں سے محروم ہو جانا؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہے (اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝) سورۂ عادیات آیت ۶۔

اس مقام پر مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک جلیل القدر شخصیت (الشیخ محمد حسین کاشف الغطاء رحمۃ اللہ علیہ) کا وہ بیان پیش کروں جو انہوں نے اپنی ایک کتاب (المثل العلیا فی الاسلام لا فی بحمدون) میں ذکر کیا ہے کہ جس میں انہوں نے فرمایا: معاشرتی امور کی اصلاح اور ظلم و جور کی بیخ کنی کرنے اور برائی و فساد کا بھرپور مقابلہ کرنے کے لئے جن وسائل و ذرائع سے استفادہ کیا گیا وہ درج ذیل تین قسموں میں منحصر ہیں۔

(ا) خطابات و مقالات (تقریروں و تحریروں):۔

اور مولفات و منشورات (کتب و جرائد) کے ذریعے دعوت و ارشاد کا سلسلہ، یہی وہ طریقہ و روش ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ

اَحْسَنُ "(اپنے رب کے راستہ کی طرف دعوت دو حکمت و دانائی اور موعظہ حسنہ کے ساتھ، اور ان کے ساتھ نہایت احسن انداز میں بحث و جدال کرو) (سورۂ نحل، آیت: ۱۲۵) اور پھر یوں ارشاد فرمایا: "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ" (نہایت احسن انداز میں دفاع کرو، تو وہ شخص جس کے اور آپ کے درمیان دشمنی ہے گویا وہ نہایت صمیمی دوست بن جائے گا) (سورۂ فصلت، آیت ۳۴)

(۲) پُرامن تحریکیں اور احتجاج کے ذریعے:۔

مثلاً مظاہرے ہڑتالیں، اقتصادی قطع تعلقی، ظالموں کے ساتھ عدم تعاون اور ان کے اعمال و حکومتوں میں عدم شرکت وغیرہ، اس طرح کے وسائل و ذرائع استعمال کرنے والے افراد جنگ اور قتل و غارت کے راستے نہیں اپناتے اور نہ ہی ان راستوں و طریقوں کو اختیار کرنا درست قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس حوالہ سے قرآن مجید میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

سورۂ ہود، آیت: ۱۱۳

○ "وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ"

(اور تم ظالموں کا سہارا نہ لو ورنہ تمہیں جہنم کی آگ اپنی لپیٹ میں لے لے گی)

سورۂ مائدہ، آیت: ۵۱

○ "لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ"

(یہود و نصاریٰ کو اپنے دوست نہ بناؤ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں)

اس کے علاوہ قرآن مجید میں کثیر آیات ایسی ہیں جن میں اس طریقہ و اسلوب کی طرف اشارہ ہوا ہے، اور غیر مسلم رہنماؤں میں سے جنہوں نے اس طرز عمل کو اپنانے کی تاکید کی اور اس کی عملی پیروی پر زور دیا ان میں مشہور و معروف افراد کی فہرست میں ہندی مدعی نبوت بوذا، روسی ادیب ٹولسٹوی، اور ہندوستان کے روحانی پیشوا مہاتما گاندھی کے نام آتے ہیں۔

(۳) جنگ و قتال اور انقلاب:۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو وہ ان طریقوں اور طرز ہائے عمل کے تدریجی طور پر اپنانے کا قائل ہے، یعنی سب سے پہلے موعظۂ حسنہ اور پُرامن دعوت و ارشاد کہ اگر وہ نتیجہ بخش ثابت نہ ہو اور اس سے ظالموں اور ان کے فتنہ و فساد و جور و استبداد کا

خاتمہ نہ ہو سکے تو دوسرے مرحلہ میں پُرامن احتجاج یا اقتصادی قطع تعلقی اور عدم تعاون و عدم شراکت کا راستہ اپنایا جائے، اگر اس سے بھی مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں تو مسلحانہ انقلاب کا راستہ ناگذیر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ظلم کو ہرگز پسند نہیں کرتا بلکہ ظلم پر راضی ہونے والا اور اس پر خاموش رہنے والا ظالم کا شریک کار کہلاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک عقیدہ و نظریہ ہے اور وہ لوگ نہایت غلطی اور واضح نادرستی پر ہیں جو کہتے ہیں کہ اسلام نے اپنا مشن تلوار اور جنگ کے ذریعے پھیلایا، جبکہ اسلام ایک عقیدہ ہے اور کوئی عقیدہ جبر و اکراہ سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ عقیدہ دلیل و برہان کے تابع ہوتا ہے، اور اسی مطلب کے بارے میں قرآن مجید نے واضح لفظوں میں اعلان کیا اور متعدد آیات میں اس کا اظہار کیا جن میں سے ایک آیت یہ ہے: (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۵۶)

○ "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ"

(دین میں کوئی جبر نہیں، حقیقت، گمراہی کے مقابلے میں واضح ہو چکی ہے)

ہاں، اسلام نے تلوار اُٹھائی اور اسلحہ کھینچا تو ان ظالموں کے مقابلے میں جو کہ آیات و دلائل پر سر تسلیم خم کرنے کے بجائے ظلم و فساد پھیلانے پر تل گئے، اسلام نے ان لوگوں پر تلوار تانی جنہوں نے دعوت حق کی راہ میں روڑے اٹکانا اور حق کی تبلیغ کے راستہ میں سنگ اندازی کرنا اپنا معمول بنا لیا تھا، اسلام نے اگر اسلحہ استعمال کیا تو ان ظالموں کے شر و فساد کو ختم کرنے کے لئے کیا نہ کہ اُنہیں تلوار کے زور سے دائرہ اسلام میں لانے کے لئے! چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ" (تم ان سے قتال کرو تا کہ فتنہ ختم ہو جائے) لہٰذا قتال و جنگ فتنہ و فساد کے خاتمہ کے لئے تھا نہ کہ انہیں دین اور عقیدہ کی بالجبر قبول کی راہ پر لانے کے لئے!

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے کوئی ابتدائی جنگ نہیں کی اور نہ ہی کسی پر اپنا عقیدہ مسلط کرنے کے لئے کوئی پہل کی بلکہ اس پر جنگیں مسلط کی گئیں اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو اسلام نے اپنی عادلانہ روش ترک نہ کی بلکہ میدان کارزار میں نہایت شریفانہ انداز اختیار کیا اور اپنی بزرگوارانہ روش کو ہرگز ترک نہ کیا، چنانچہ اسلام نے جنگ و امن دونوں حالتوں میں اپنے انسانیت نواز اصولوں کو یکساں ملحوظ رکھا مثلاً خانہ سوزی، فریب کاری، دشمن کے پانی میں زہر ملانا، دشمنوں پر پانی بند کرنا، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا، قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا وغیرہ تمام اعمال کو حرام قرار دیا، بلکہ اس کے برعکس قیدیوں کے ساتھ حُسن سلوک اختیار کرنے اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کی تاکید کی خواہ وہ دشمنی میں جس حد تک بھی چلے جائیں، اسی طرح اسلام نے دشمن کو چھپ کر قتل کرنے اور عمر رسیدہ و ناتوان افراد اور ان لوگوں کو قتل کرنے کی ممانعت کی جو جنگ کی آگ بھڑکانے میں شریک نہ تھے، بلکہ رات کی تاریکی میں بھی دشمن پر حملہ کرنے کو ممنوع قرار دیا، اور اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا: "فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ" (ان کی طرف معائدہ نامہ درست طور پر پھینکو) (سورۂ انفال، آیت: ۵۸) اسی طرح

اسلام نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو صرف الزام وتہمت کی بناء پر قتل کرے یا اس سے پہلے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرے اس پر دھاوا بولے اور اسے سزا دے، بلکہ ہر اس کام سے منع فرمایا جو سنگدلی وحشی گری کو فروغ دے اور انسانی شرف وجوانمردی کو پامال کرے۔

اسلام نے ہرگز ایسے اعمال کو روا قرار نہیں دیا جو انسانیت کے منافی ہوں اگر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں اور اس میں رونما ہونے والی جنگوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کس طرح کی روش اختیار کی، اسلام نے کسی جنگ میں غیر انسانی اعمال کی اجازت نہیں دی جبکہ عصر حاضر میں اپنے آپ کو تمدن وتہذیب کی اعلیٰ ترین اقدار کا حامل سمجھنے والوں کو دیکھیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو کس طرح سے انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بناتے ہیں اور بدترین اعمال کا شکار کرتے ہیں، اور پھر وہ اپنے اس دور کو روشنی کا زمانہ بھی کہتے ہیں کہ جس میں عورتوں، بچوں، بزرگوں، بیماروں کو قتل کرنا اور شبخوں مارنا، شہروں پر بمباری کر کے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارنا اور دشمن کا قتل عام کرنا جیسے وحشیانہ اعمال اس روشنی کے دور کا معمول بن چکا ہے۔

کیا یہ جرمنی نہیں تھا جس نے دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ پر وحشیانہ بمباری کی اور شہر در شہر تباہی مچا دی، بے گناہ لوگوں، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر اسی جرمنی نے ہزاروں قیدیوں کو قتل نہیں کیا؟ کیا یہ امریکہ، برطانیہ اور روس کی مشترکہ فوج نہ تھی جس نے ہزاروں جنگی جہاز جرمنی کے شہروں پر حملہ کرنے کے لئے بھیجے؟ اور کیا یہی متمدن امریکہ نہ تھا جس نے جاپان کے بے گناہ لوگوں پر ایٹمی بم برسائے۔

اور انہی متمدن ممالک نے تباہ کن ہتھیار، میزائل، ایٹم بم اور ہیڈروجن بم تیار کر کے دنیا بھر میں بنی نوع آدم کی بربادی کے جو سلسلے شروع کر رکھے ہیں اب خدا ہی جانے تیسری جنگ عظیم میں کس قدر تباہی ہوگی اور افراد بشر پر کیا گزرے گی؟ اگر جنگوں کے تمام فریق ان وسائل کے استعمال سے اپنے مدمقابل کو ختم کرنے پر تل گئے تو زمین کا چپہ چپہ انسانی خون سے رنگین ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نوع بشر کو سیدھے راستہ کی رہنمائی کرے اور صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق بخشے۔"

یہ تھی کتاب "المثل العلیا فی الاسلام لا فی بحمدون" کی تحریر کا خلاصہ۔

یتیموں کے بارے میں حکم

○ "وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ"

(اور تم یتیموں کو ان کے اموال دے دو)

اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ یتیموں کو اُن کے اموال دے دو، یہ حکم دراصل بعد والے ان دو جملوں کی تمہید کے طور پر ہے جن میں کہا گیا ہے: ''وَلَا تَتَبَدَّلُوا...... '' یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعد والے دو جملے اس حکم کی تفسیر کرتے ہیں، لیکن آیت کے آخر میں اصل سبب سے کہ جس کی بازگشت دونوں جملوں یا آخری جملہ کی طرف ہوتی ہے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ پہلا جملہ بعد والے دو جملوں میں مذکور نہی کے تمہیدی بیان پر مشتمل ہے۔

اور جہاں تک اصل حکم یعنی یتیموں کے اموال میں نقصان دہ تصرف کرنے کی ممانعت کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ وہ بعد میں ذکر کئے جانے والے مسائل واحکام میراث اور بعد والی آیت میں شادی کے حکم سے مربوط مسائل کے لئے مقدمہ وتمہید کے طور پر ہے۔

اور جملہ ''وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ '' سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے گندے اموال ان کے اچھے اموال سے تبدیل نہ کرو یعنی ایسا نہ ہو کہ ان کے جو اچھے اموال تمہارے پاس ہیں وہ اپنے لئے رکھ لو اور انہیں اپنے ردی وگندے اموال ان کے اموال میں رکھ دو۔ ایسا کرنا غلط ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ سے مراد یہ ہو کہ حرام غذا کو حلال غذا سے تبدیل نہ کرو (یہ بھی ایک قول ہے) لیکن پہلا معنی زیادہ واضح ہے کیونکہ دونوں جملے: ''وَلَا تَتَبَدَّلُوا...... '' اور ''وَلَا تَأْكُلُوْا'' اموال میں ناجائز تصرف کی خاص قسم کو بیان کرتے ہیں جبکہ جملہ: '''' وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى .... '' ان دونوں کے یکجا بیان کی تمہید ہے، اور جملہ ''اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا '' میں لفظ ''الحوب '' مصدر اور اسم مصدر ہے جس کا معنی اثم یعنی گناہ ہے۔

یتیموں کے ساتھ رشتہ ازدواج کا حکم

○ ''وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ''

(اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر پاؤ گے تو جو عورتیں تمہیں بھلی لگیں ان سے نکاح کر لو)

سابق الذکر مطالب میں اس امر کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی یہ حالت تھی کہ وہ اکثر اوقات جنگوں، باہمی قتل وغارت اور ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے جیسے وحشیانہ اعمال میں ہی مصروف رہتے تھے جس کے نتیجہ میں معاشرے میں یتیموں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی اور ان میں سے جو لوگ طاقتور اور قوم کے بزرگ شمار ہوتے تھے وہ یتیم بچوں کو ان کے اموال سمیت اپنے پاس رکھتے تھے اور ان کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ ملا کر خورد برد

کر لیتے تھے، اس سلسلہ میں وہ نہ فقط یہ کہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ ان کے اموال ختم ہونے پر انہیں طلاق دے دیتے تھے اور انہیں بھوکا پیاسا اور برہنہ حالت میں باہر نکال دیتے تھے حالانکہ ان کے پاس نہ تو کوئی ٹھکانہ ہوتا تھا جس میں وہ اپنا سر چھپا سکیں اور نہ ہی رزق وروزی کہ جس سے پیٹ کی آگ بجھا سکیں، ان کا شریک حیات بھی کوئی نہ ہوتا تھا جو اُن کی عزت وناموس کی حفاظت کر سکے اور نہ ہی معاشرے میں کوئی اُنہیں شریک حیات بنانے پر راضی ہوتا تھا کہ اس طرح ان کی ضروریات زندگی پوری ہو سکیں، اسی وجہ سے قرآن مجید نے نہایت سخت لہجہ میں ان کی اس نہایت پست وغیر انسانی روش وعادت اور ظلم ووحشی گری کی سخت مذمت وممانعت کی اور یتیموں پر مظالم ڈھانے اور اُن کے اموال پر ڈاکہ زنی کی شدید نہی کی، چنانچہ اُن کے اموال پر ناجائز قبضہ کرنے اور انہیں اپنے استعمال میں لانے کی سخت الفاظ میں ممانعت کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

سورۂ نساء، آیت: ۱۰

○ ''اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا۠''

(جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور وہ بہت جلد دوزخ کی آگ میں جلیں گے)

اور پھر زیر بحث آیات میں اس حوالہ سے اس طرح ارشاد ہوا:

○ ''وَ اٰتُوا الْیَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا۠''

(اور یتیموں کو ان کے اموال دے دو، اور ناپاک کو پاک کے ساتھ تبدیل نہ کرو، اور ان کے اموال اپنے اموال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ کہ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ ہے)۔

اس طرح شدید لہجہ میں یتیموں کے اموال کے بارے میں حکم دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنے بارے میں فکر مند ہو گئے اور اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ یتیموں کو اپنے ہاں سے نکال باہر کرنے لگے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اموال میں کسی طرح کی کمی بیشی میں مبتلا ہو کر اپنے لئے عذاب مول لے لیں، اور اگر کسی کے پاس کوئی یتیم ہوتا تو وہ غذا میں اس کا اضافی حصہ رکھ دیتا تھا تا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو اور اگر ان کی غذا سے کچھ بچ جاتا تو اسے ہرگز اپنے استعمال میں نہ لاتے تھے خواہ وہ خراب ہی کیوں نہ ہو جاتا، لیکن وہ اس طرح کرنے سے سخت تکلیف کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اپنی پریشانی کا اظہار حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا اور اس صورتحال کی شکایت پیش کی تو اس وقت یہ آیت شریفہ نازل ہوئی:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۲۰

○ ''وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ

لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۲۰''

(اور وہ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ ان کی اصلاح بہتر ہے، اور اگر وہ تمہارے ساتھ مل کر رہیں تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ کون فسادی ہے اور کون اصلاح کرنے والا ہے، اور اگر اللہ چاہے تو تم پر عرصہ حیات تنگ کردے، بے شک اللہ غلبہ والا حکمت والا ہے)

تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اجازت دی کہ یتیموں کو پناہ دیں، ان کا پورا پورا خیال رکھیں، اور ان کے امور کی اصلاح کے لئے انہیں اپنے پاس رکھیں کہ اگر وہ ان کے ساتھ مل کر رہیں تو انہیں بھائیوں کی طرح سمجھیں، اس فرمان سے لوگوں کے دلوں کا اضطراب جاتا رہا اور ان کی تشویش و پریشانی ختم ہوگئی۔

اگر آپ ان مطالب پر غور کریں اور پھر مذکورہ بالا آیت مبارکہ ''وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا'' پر نگاہ کریں جو کہ آیت مبارکہ ''وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ'' کے بعد آئی ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ آیت سابقہ آیت میں ذکر ہونے والی نہی کی نسبت ترقی کا درجہ رکھتی ہے لہٰذا اس بناء پر اس کا معنی یوں ہوگا (واللہ اعلم) یتیموں کے معاملات میں تقویٰ سے کام لو، اور اپنے خراب اموال کو ان کے اچھے اموال سے تبدیل نہ کرو، اور ان کے اموال، اپنے اموال کے ساتھ مخلوط کر کے نہ کھاؤ، یہاں تک کہ اگر تمہیں یتیم بچیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو اور تمہیں ان سے شادی کرنا پسند نہ ہو تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان کے علاوہ جو عورتیں تمہیں بھلی لگیں ان سے شادی کر لو دو، تین اور چار۔

بنا برایں جملہ شرطیہ یعنی ''وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ'' (اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر پاؤ گے تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے شادی کرو) میں حرفِ شرط ''اِنْ'' کے ساتھ جو مطلب بیان کیا گیا ہے اس کا معنی کچھ اس طرح ہوگا کہ اگر تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکنے کے خوف کی وجہ سے انہیں پسند نہ کرو کہ ان کے ساتھ نکاح کرو تو پھر ان سے نکاح نہ کرو بلکہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں کے ساتھ نکاح کرو، گویا جملہ ''فَانْكِحُوْا'' (تم نکاح کرو) جملہ شرطیہ کی حقیقی جزاء کے طور پر ہے، اور جملہ ''مَا طَابَ لَكُمْ'' (جو تمہیں پسند ہوں) سے آیت میں لفظ ''غیرھن'' کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یعنی جملہ ''مَا طَابَ لَكُمْ'' نے ان عورتوں کے بارے میں کوئی نشانی وغیرہ بیان کرنے سے بے نیاز کر دیا۔

یہاں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ آیت میں ''من طاب لکم'' کی بجائے ''مَا طَابَ لَكُمْ'' ذکر کرنے میں ان کی تعداد کی طرف اشارہ مقصود ہے جس کا تذکرہ بعد والے الفاظ ''مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'' میں ہوا۔

اور جملہ ''اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا'' کو ناپسندیدگی کی جگہ ذکر کرنا سبب کو مُسبب کی جگہ ذکر کرنے کے طور پر ہے جبکہ جملہ شرطیہ کی جزاء میں مُسبب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یوں ارشاد ہوا: ''مَا طَابَ لَكُمْ'' (جو تمہیں پسند ہوں)

پانچ اہم امور کا بیان

زیر بحث آیہ مبارکہ کے معنی کی بابت جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ چند مفسرین کرام نے دیگر مختلف امور ذکر کئے ہیں جو ان کی کتب میں مذکور ہیں، ذیل میں ہم ان میں سے پانچ کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) عربوں میں عام رواج تھا کہ وہ چار، پانچ اور اس سے زیادہ شادیاں کرتے تھے اور پھر ان میں سے ہر ایک کہتا تھا کہ میں کیوں ایسا نہ کروں، کیا میں فلاں شخص سے کمتر ہوں؟ اور جب کسی کے ہاں بچوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی تھی اور ان کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے تو ان خواتین میں سے جو بیوہ یا مطلقہ خاتون اپنے پہلے شوہر کی اولاد ساتھ لاتی تھی تو ان یتیموں کے اموال کام میں لاتے تھے، جس پر خداوند عالم نے حکم دیا کہ کسی کو چار سے زیادہ شادیاں کرنے کا حق حاصل نہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی شخص یتیموں کے اموال کا محتاج نہ ہوا اور ان کی بابت ظلم و زیادتی کا مرتکب نہ ہونے پائے

(۲) عرب، یتیموں کے ساتھ ناگوار سلوک کرتے تھے لیکن جن عورتوں کے والدین زندہ ہوتے تھے ان کے ساتھ سخت روش تو نہیں اپناتے تھے لیکن اتنی زیادہ تعداد میں شادیاں کرتے تھے کہ ان کے درمیان عدل نہ کر پاتے تھے، اس لئے خداوند عالم نے فرمان جاری کیا کہ اگر تم یتیموں کے بارے میں کوئی خوف رکھتے ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر پاؤ گے تو خواتین کی بابت بھی خوف کھاؤ اور ان میں سے ایک سے چار تک ہی شادی کرو (چار سے زیادہ شادیاں نہ کرو) تا کہ ان کے درمیان عدل قائم رکھ سکو۔

(۳) عرب، یتیموں کی سرپرستی ناگوار سمجھتے تھے اور ان کے اموال میں تصرف کرنا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا خداوند عالم نے فرمان جاری کیا کہ اگر تم ایسا کرنے سے پرہیز کرتے ہو تو اسی طرح زنا سے بھی اجتناب کرو اور جو عورت تمہیں اچھی لگے اس سے شادی کرلو۔

(۴) آیت مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہے کہ جن عورتوں کے ساتھ تم نے شادی کی ان کی ان یتیم بچیوں کے ساتھ انصاف نہ کر پاؤ گے جو تمہاری گود میں پلی ہیں تو ان میں سے جو یتیم بچیاں تمہارے رشتہ داروں کے لئے حلال ہوں ان کی دو، تین اور چار شادیاں کر دو۔

(۵) آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر یتیموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا تمہیں ناگوار ہو تو پھر زیادہ بیویاں اکٹھی کرنے سے بھی پرہیز کرو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر پاؤ، لہٰذا ان میں سے صرف اُنہی کے ساتھ شادی کرو جن کے بارے میں تمہیں اطمینان ہو کہ ان پر زیادتی نہ کرو گے۔

یہ ہیں وہ پانچ امور جو مفسرین نے ذکر کئے ہیں لیکن آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی آیت کے الفاظ سے حقیقی مطابقت نہیں رکھتا، لہٰذا اصل اور صحیح معنی وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔

ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت

○ ''مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ''

(دو، تین اور چار)

لفظ ''مَثْنٰی'' ''مفعل'' کے وزن پر ہے اور ''ثُلٰثَ'' اور ''رُبٰعَ'' فعال کے وزن پر ہیں اور یہ دونوں یعنی مفعل اور فعال جب تعداد یعنی گنتی کے باب میں استعمال ہوں تو اس سے مراد تکرار یعنی ''بار بار'' ہوتا ہے۔ لہٰذا ''مَثْنٰی'' کا معنی دو دو ''ثُلٰثَ'' کا معنی تین تین اور ''رُبٰعَ'' کا معنی چار چار ہے، اور آیت مبارکہ میں چونکہ خطاب تمام افراد بشر سے ہے اور مثنٰی و ثلاث و رباع کے درمیان حرف واو ذکر ہوا ہے جو کہ تخییر پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا کہ مؤمنین میں سے ہر ایک کے لئے جائز ہے کہ دو شادیاں کرے یا تین یا چار، اس وجہ سے تمام افراد کو مخاطب قرار دیتے ہوئے مثنٰی و ثلاث و رباع کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

زیر نظر موضوع کی بابت ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے جس کا ازالہ آیات مبارکہ ہی میں کر دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ''مثنٰی و ثلاث و رباع'' کے الفاظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ شاید اس سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص ایک ہی عقد کے ساتھ دو یا تین یا چار شادیاں کر سکتا ہے، جبکہ ایسا درست نہیں کیونکہ جملہ ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' اور اسی طرح اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۴ (وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ............) سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ غلط فہمی بھی دور ہو جاتی ہے کہ آیت سے مراد یہ ہو کہ پہلے ایک ہی عقد سے دو عورتوں سے شادی کر سکتا ہے اور پھر دوسرے عقد سے دو عورتوں سے شادی کر سکتا ہے اور اسی طرح دو دو عورتوں کے ساتھ ایک ہی عقد میں شادی کر سکتا ہے، یا یہ کہ پہلے ایک عقد سے تین، اور پھر دوسرے عقد سے تین یا اسی طرح ایک ہی عقد سے چار اور پھر دوسرے عقد سے چار شادیاں کر سکتا ہے، یا یہ کہ ایک عورت کے ساتھ ایک سے زیادہ مرد شادی کر سکتے ہوں، تو یہ سب غلط فہمیاں ہمارے مذکورہ بیان اور آیات کے قرائن سے خود بخود دور ہو جاتی ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی صورت بھی جائز نہیں اور نہ ہی زیر نظر آیہ مبارکہ میں اس طرح کے معانی کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام ایک وقت میں نہ تو چار عورتوں سے زیادہ کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی ایک وقت میں ایک عورت کو ایک سے زیادہ شوہر کرنے کا حق دیتا ہے۔

ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یہ غلط فہمی بھی دور ہو جاتی ہے کہ آیہ مبارکہ ''مثنیٰ وثلاث ورباع'' میں واو جمع کا معنی دیتی ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ہی وقت میں نو شادیاں کرنا جائز ہو یعنی دو + تین + چار = نو، جبکہ یہ ہرگز درست نہیں، چنانچہ اسی حوالہ سے تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ اس طرح کا خیال کسی بھی صورت میں قرین صحت و قابل تصور نہیں کیونکہ عام استعمالات میں ایسا نہیں ہوتا مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ لوگ دو دو، تین تین اور چار چار کی صورت میں شہر میں داخل ہوئے تو اس سے کوئی سننے والا یہ نہیں سمجھے گا کہ لوگ نو نو کی صورت میں داخل ہوئے، کیونکہ نو کے عدد کے لئے مخصوص لفظ موجود ہے (عربی زبان میں نو کے عدد کے لئے لفظ ''تسع'' ہے) تو اس لفظ کو چھوڑ کر دو دو، تین تین، چار چار (مثنیٰ وثلاث ورباع) کہنا بیوقوفی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا جبکہ کلام الٰہی اس سے بالاتر اور منزہ و پاک ہے۔

عدل نہ کر سکنے کی صورت میں!

○ ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً''

(اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی شادی کرو)

اس سے مراد یہ ہے کہ عدل نہ کر سکنے کا ڈر ہو تو ایک سے زیادہ شادی نہ کرو، اس میں لفظ خوف استعمال ہوا ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل نہ کر سکنے کا خوف ایک سے زیادہ شادیاں کرنے میں مانع ہے نہ کہ اس کا علم، یعنی یہ نہیں کہا گیا کہ اگر تمہیں معلوم ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے، بلکہ یہ کہا گیا کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہ کر پاؤ گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے امور میں کہ جہاں نفسانی خواہشوں اور شیطانی وسوسوں کی اثر گزاری زیادہ ہوتی ہے وہاں ''علم'' کی نوبت ہی نہیں آتی، یعنی کسی کو معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ عدل قائم نہ کر پائے گا لہٰذا اگر آیت میں خوف کی جگہ علم کو شرط قرار دیا جاتا تو حکم کی اصل مصلحت ہی ہاتھ سے نکل جاتی اور جس مقصد کے پیش نظر (یعنی قیام عدل) یہ حکم دیا گیا وہ حاصل نہ ہو سکتا۔

کنیزوں کے حوالہ سے!

○ ''اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ''

(یا وہ عورتیں جو تمہاری ملکیت میں ہوں)

اس جملے میں زر خرید کنیزیں مراد ہیں، اس حوالہ سے آیت کا معنی یہ ہے کہ جو شخص بیویوں کے درمیان عدل نہ کرنے

سے ڈرتا ہو (اسے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ وہ عدل نہ کر پائے گا) تو اسے چاہیے کہ وہ صرف ایک شادی کرے اور اگر ایک سے زیادہ شادیاں کرنا چاہتا ہو تو کنیزیں رکھے کیونکہ کنیزوں میں بیویوں جیسے حقوق کی پابندی نہیں ہوتی۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کنیزوں کے بارے میں جو حکم دیا گیا ہے اس سے ہرگز مراد یہ نہیں کہ ان کے بارے میں عدل کرنا ضروری نہیں اور ان پر ظلم و زیادتی روا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ خداوند عالم کسی بھی صورت میں ہونے والے ظلم کو پسند نہیں کرتا (ان اللہ لا یحب الظالمین، اللہ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا) اور خود بھی بندوں سے زیادتی نہیں کرتا چنانچہ اس نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے لیس بظلام للعبید کہ وہ بندوں پر کوئی ظلم نہیں کرتا، بنا بر ایں اصل مقصود یہ ہے کہ جب کنیزوں کے درمیان ازدواجی حقوق کی تقسیم ازواج کی طرح نہیں تو ان کے بارنے میں عدل کرنا بہت آسان ہے۔ یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کی بناء پر "مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" (جو تمہاری زرخرید کنیزیں ہوں) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ وہ عورتوں کو خرید کر کنیزیں بناتے ہیں تو ان سے نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی لہٰذا ان کی تعداد میں کوئی محدودیت و پابندی نہیں، اور جہاں تک ان سے نکاح کرنے کا مسئلہ ہے تو اس سلسلہ میں تفصیلی بیان اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۵ میں ہو گا جس میں ارشاد ہوا: "وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ............" (اور تم میں سے جو شخص مالی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ نیک مؤمن خواتین سے شادی کرے تو جو مؤمنہ جواں بچیاں تمہاری ملکیت میں ہوں.....)

حقوق میں ناانصافی کی ممانعت

○ "ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا"

(یہ سب سے کم حد ہے تاکہ ناانصافی نہ کرسکو)

اس آیت میں لفظ "عول" ذکر کیا گیا ہے (ان لا تعولوا) اس کا معنی منہ موڑنا اور روگردانی ہے، اس طرح آیت کا معنی یہ ہو گا کہ یہ طریقہ جو مقرر کیا گیا ہے سب سے زیادہ اچھا اور اس مقصد سے زیادہ قریب تر ہے کہ تم عدل سے روگردانی نہ کرو اور نہ ہی ان کے حقوق میں ان کے ساتھ تجاوز و زیادتی کرو، ایک قول یہ ہے کہ "عول" کا معنی ثقل یعنی بوجھ ہے، لیکن یہ بات لفظ و معنیٰ دونوں حوالوں سے درست نظر نہیں آتی۔

اس جملے میں کہ جو اصل حکم کی حکمت کے بیان پر مشتمل ہے ثبوت موجود ہے کہ نکاح کے احکام کی اصل و اساس عدل پر قائم ہے اور اس میں زیادتی و ناانصافی کی نفی اور حقوق میں ظالمانہ روش اختیار کرنے کی ممانعت ملحوظ ہے۔

حق مہر کی ادائیگی کا حکم

○ ''وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً''

(اور عورتوں کو ان کے حق مہر آسانی سے دے دو)

''صدقہ'' دال پر پیش اور زبر کے ساتھ، صداق کا معنی حق مہر ہے۔

''نِحْلَةً'' یعنی بغیر معاوضہ و قیمت کے دیا جانے والا عطیہ، لفظ ''صدقات'' کو ضمیر ''ھن'' کے ساتھ اضافت کی صورت میں ذکر کرنے میں یہ ثبوت پایا جاتا ہے کہ حق مہر ادا کرنے کا وجوبی حکم ایک ایسا معاشرتی مسئلہ ہے جو بنی نوع انسان کے درمیان عام رائج ہے، اور لوگ شادی بیاہ میں کوئی مال یا قیمتی چیز مہر کے طور پر خواتین کو دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کے ساتھ ازدواجی تعلق کے قیام کا حق حاصل ہو جاتا ہے، گویا ایک طرح کا معاملہ ہے جس پر فریقین اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہیں کیونکہ لوگوں میں عام رسم ہے کہ شادی کرنے کا خواہشمند مرد ''خواستگاری'' کی صورت میں اپنا مقصود ظاہر کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں عنقریب آنے والی علمی بحث میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے کوئی خریدار کچھ خریدنے کے لئے مال لاکر بیچنے والے کے پاس آتا ہے تاکہ اس سے اپنی مطلوبہ چیز وصول کرے (یہ مثال موضوع کی وضاحت اور مطالب کی تفہیم کے لئے دی گئی ہے ورنہ شادی کوئی مادی معاملہ نہیں جسے خرید و فروخت کا نام دیا جائے، مترجم) بہرحال آیت مبارکہ لوگوں کے درمیان عام رائج مسئلہ کی تائید و تصدیق پر مبنی بیان پر مشتمل ہے۔

یہاں ایک ممکنہ غلط فہمی کو بھی دور کر دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ بات ذہن میں آئے کہ شوہر حق مہر میں کسی طرح بھی تصرف نہیں کر سکتا خواہ بیوی راضی بھی ہو، لہٰذا اس میں ان کی رضا ایک طرح کی شرط مقرر کر دی گئی اور کہا گیا: ''فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا'' پس اگر وہ رضا و خوشی سے تمہیں کچھ دینا چاہیں تو جی بھر کر کھاؤ) تو اس میں ان کی رضایت کو شرط قرار دینا اصل حکم یعنی حق مہر میں تصرف کے جواز کی تاکید کے لئے ہے، یہاں اس نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ آیت میں لفظ ''فکلوہ'' (صیغۂ امر) یعنی اسے کھاؤ، سے وجوبی حکم مراد نہیں بلکہ جواز کا حکم مراد ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ راضی ہوں تو تمہارے لئے جائز ہے کہ وہ مال استعمال کرو نہ یہ کہ تم پر واجب ہے کہ تم وہ مال کھاؤ، اسے علمی اصطلاح میں ''وضعی حکم'' کہتے ہیں جو کہ ''تکلیفی حکم'' کے مقابل میں جواز پر دلالت کرتا ہے۔

لفظ ''هَنِيْٓـًٔا'' کا لفظی اشتقاق ''ھناء'' سے ہے جس کا معنی آسانی سے غذا کا ہضم ہونا ہے اور اس کا معنی قبول و پسندیدگی طبع ہے، عام طور پر یہ لفظ کھانے کے موارد میں استعمال ہوتا ہے اور قبول طبع و پسندیدہ غذا کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور

لفظ ''مَرِیْئًا'' ری سے مشتق ہے اس کا معنی بھی وہی ہے جو ہناء کا ہے البتہ یہ لفظ پینے کے موارد میں استعمال ہوتا ہے لیکن ہناء کھانے اور پینے دونوں موارد میں استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا جب ''هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا'' کہا جاتا ہے تو اس میں ''هَنِيْٓئًا'' سے کھانے اور ''مَّرِيْٓئًا'' سے پینے کا مورد مراد ہوتا ہے اور جب اکٹھا ''هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا'' کہا جائے تو اس میں پہلے کا تعلق کھانے سے اور دوسرے کا تعلق پینے سے ہوتا ہے۔

بے وقوفوں کو اپنے اموال نہ دو

○ ''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا ''

(اور تم اپنے وہ اموال بے وقوفوں کو نہ دو جو اللہ نے تمہارے امرارِ معاش کے لئے تمہارے لئے قرار دیئے ہیں)

''سفہ'' کا معنی کم عقلی ہے، دراصل اس کا معنی ہر اس چیز کا ہلکا پن اور سستی و کمزوری ہے جس میں ہلکا پن اور سستی و کمزوری نہیں ہونی چاہیے، چنانچہ اسی حوالہ سے ''کمزور لگام'' اور ''کمزور کپڑا'' کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، کمزور کپڑا کہنے میں اس کی بافت و بناوٹ کا کمزور و ناپختہ ہونا ملحوظ ہوتا ہے، اسی مناسبت سے عقل کی کمزوری و ناپختگی میں یہی لفظ استعمال ہونے لگا لیکن اغراض و متعلقہ امور کے حوالہ سے اس کا استعمال بھی مختلف ہو گیا مثلاً دُنیاوی امور میں کمزور تدبیر کرنے والے شخص کو ''سفیہ'' کہا جانے لگا اور دینی امور میں لاپرواہی اور لاابالی پن کا عملی مظاہرہ کرنے والے فاسق کو بھی سفیہ کے لفظ سے موسوم کیا گیا، اسی طرح دیگر امور میں بھی کمزوری و ناپختگی اور بے توجہی و لاپرواہی برتنے والے کو سفیہ کہا گیا۔

آیت مبارکہ کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بیوقوفوں و کم عقلوں پر انفاق کرنے اور ان کی ضرورت سے زیادہ انہیں کھلانے پلانے میں مال دینے کی ممانعت کا حکم بیان ہوا ہے، البتہ اس مقام پر سفہاء سے عام سفہاء مراد نہیں بلکہ یتیموں میں سے سفہاء مراد ہیں کیونکہ آیت میں یتیموں کے اموال کے بارے میں تذکرہ کے ذیل میں یہ نہی وارد ہوئی ہے لہٰذا اس سے وہی افراد مراد ہیں جو یتیموں میں سے ہوں، اور ''اَمْوَالَكُمُ'' (اپنے اموال) سے مراد یتیموں ہی کے وہ اموال ہیں جو کسی حوالہ سے یتیموں کے سرپرستوں کے پاس ہوں، گویا جملہ کے مخاطب اولیائے ایتام ہیں اور ان سے کہا گیا ہے کہ اپنے اموال یتیموں کے سفیہ و کم عقل افراد پر ان کی ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کرو، چنانچہ جملہ ''وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ'' سے بھی اسی مطلب کی گواہی ملتی ہے، اور اگر آیت سے یتیموں کے علاوہ دیگر سفہاء مراد لینا ناگزیر ہو تو پھر یتیم اور غیر یتیم دونوں سفہاء مراد لینے ہوں گے لیکن پہلی رائے زیادہ واضح و درست معلوم ہوتی ہے کہ صرف یتیموں ہی میں سے سفہاء مراد ہوں۔

بہر حال اگر سفہاء سے یتیم سفہاء ہی مراد ہوں تو جملہ: ''اَمْوَالَكُمْ'' (اپنے اموال) سے یتیموں ہی کے اموال مراد ہوں گے، اور یتیموں کے اموال کو ان کے اولیاء وسرپرستوں سے نسبت دے کر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا کا مال تمام اہل دنیا کے لئے ہے اور جب کچھ مال ان میں سے بعض افراد کے نام ہو جاتا ہے تو اُس میں وہ عمومی بھلائی و بہتری ملحوظ ہوتی ہے جس کی بناء پر ملکیت قائم ہوتی ہے اور وہ مال بعض افراد کے نام ہو جاتا ہے، بنا بر ایں ضروری ہے کہ لوگ اس حقیقت کو عملی صورت دیں اور جان لیں کہ وہ سب ایک ہی معاشرہ سے عبارت ہیں اور مالِ دنیا سب کا سب اُن کے معاشرہ کے لئے ہے لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اس مال کی حفاظت کرے اور اسے ضائع ہونے سے بچائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوقوف لوگوں کی فضول خرچیوں و بیجا استعمال میں لانے اور ان لوگوں کی بے تدبیری و بد تدبیری کی وجہ سے ضائع ہو جائے جو صحیح طور پر اس کی تدبیر سے قاصر و عاجز ہوں مثلاً کم سن بچے اور دیوانے وغیرہ، بلکہ ضروری ہے کہ عقلمند افراد، سفیہ و کم عقل لوگوں کے اموال کی نگرانی و حفاظت کریں۔

یہ آیت مبارکہ، اموال کی اضافت (اَمْوَالَكُمْ) کے حوالہ سے اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۵ ''وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ ......'' کی طرح ہے، اس آیت میں مسلمانوں کی کنیزوں کو تمام مسلمانوں کی طرف اضافت دی گئی ہے کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ اس میں ''فتیات''، یعنی نوجوان لڑکیوں سے مراد وہ لونڈیاں نہیں جن سے نکاح کرنے والا ان کا مالک ہوتا ہے، اس طرح آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تم میں سے جو شخص نیک و صالح آزاد مؤمنہ سے شادی نہ کر سکتا ہو تو وہ تمہاری مملوکہ نوجوان لڑکیوں سے شادی کر لے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں ایک عمومی حکم کا بیان مقصود ہے جو پورے اسلامی معاشرہ کے لئے ہے اور وہ یہ کہ پورا معاشرہ ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسی شخصیت کی طرح سے ہے جو روئے زمین پر موجود تمام اموال کی مالک ہے اور خداوند عالم نے اس شخصیت کی رزق وروزی کا سامان انہی اموال کے ذریعے کیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ان اموال کی درست تدبیر کرے اور اسے اپنی ترقی و آسائش کے لئے خرچ کرنے کی منصوبہ سازی اس طرح سے کرے کہ وہ روز بہ روز اس میں اضافہ ہوتا کہ ہر فرد اس سے بخوبی استفادہ کر سکے، اس لئے اسے چاہیے کہ اس کے تصرف میں اعتدال کی راہ اختیار کرے اور اسے ضائع ہونے سے ہر ممکن طور پر بچائے۔ اس عمومی اصول اور قاعدۂ کلیہ کی ایک فرع یہ ہے کہ انسانی معاشروں کے سرپرست حضرات سفیہ و کم عقل افراد کے امور کی تدبیر میں ان کے اموال خود ان کے ہاتھوں میں نہ دیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غیر ضروری موارد میں خرچ کر دیں بلکہ ان کے سرپرستوں پر لازم ہے کہ ان کے اموال اپنے ہاتھوں میں رکھیں اور ان کی بہتری و بھلائی کے لئے ان کو استعمال میں لائیں، ان میں اضافہ کے لئے تجارت اور دیگر معاملات بھی انجام دیں تا کہ اس سے سفیہ و کم عقل افراد کی دولت و ثروت بڑھتی رہے، البتہ اموال کے اصل مالکان یعنی سفیہ و کم عقل افراد کو ان

کی روزمرہ کی ضروریات کے لئے اتنا کچھ دیتے رہیں جس سے ان کا گزر بسر آسانی کے ساتھ ہوتا کہ اس طرح اصل اموال بھی محفوظ رہیں اور اصل مالکان تنگدستی و ناداری کا شکار نہ ہونے پائیں۔

اس بیان سے یہ مطلب واضح و آشکار ہوتا ہے کہ جملہ "وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ" سے مراد یہ ہے کہ سفیہ و کم عقل شخص کو اس کے مال میں اس قدر رزق و روزی کا انتظام کیا جائے جس سے وہ اصل مال سے حاصل ہونے والے فائدہ و اضافہ سے اپنی ضروریات زندگی پوری کر سکے نہ یہ کہ اس کے اصل مال ہی سے تھوڑا تھوڑا لے کر اسے خرچ کرتے رہیں اور اس میں کوئی اضافہ نہ ہونے پائے جس سے بالآخر وہ ختم ہو جائے اور کچھ بھی باقی نہ رہے: ایسا کرنا درست نہیں۔ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لفظ "منہا" (اس میں سے) کی بجائے "فِيْهَا" (اس میں) ذکر کیا گیا، یہ نکتہ زمخشری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آیت مبارکہ سے ہر ممنوع التصرف شخص کی سرپرستی کا عمومی حکم بیان کرنا مقصود ہو، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے افراد کے امور کی بابت بے توجہی اور لاپرواہی برتنے کو پسند نہیں کرتا بلکہ اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ان افراد کی سرپرستی کرے اور ان کے امور کی تدبیر کرے، اگر ان کے قریبی سرپرستوں میں سے کوئی ایک بھی موجود ہو مثلاً باپ، دادا، تو اس پر لازم ہے کہ وہ براہ راست ان کی سرپرستی کرے اور اُن کے امور کی تدبیر اپنے ہاتھ میں لے، ورنہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ یہ ذمہ داری انجام دے یا مؤمنین یہ کام سنبھالیں، جیسا کہ اس کی تفصیلات فقہ میں ذکر کی گئی ہیں۔

اموالِ دنیا، تمام اہل دنیا کے لئے!

یہ ایک قرآنی حقیقت ہے اور اسلامی احکام و قوانین کی اصل و اساس بھی یہی ہے جو کہ زیر نظر آیت مبارکہ سے سمجھی جاتی ہے اور وہ یہ کہ مال دولت حقیقت میں اللہ کی ملکیت ہے اور اس نے اسے انسانی معاشرہ کے متعلقہ امور کی بہتری کے لئے بنایا ہے، اس میں کسی شخص کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ اسے اپنے ہاتھ میں لے دوسروں کو اس سے قطعی محروم کر دے کہ پھر اس کے فیصلہ میں کسی طرح کی تبدیلی ممکن نہ ہو، اسی طرح خداوند عالم نے اموالِ دنیا کسی شخص کو ہبہ نہیں کر دیئے کہ اب اس کے تصرفات کو محدود کرنے کے لئے اسے اپنے احکام و قوانین کا سہارا لینا پڑے، لیکن اس نے نوع انسانی کی بہتری اور معاشرتی بھلائی کے لئے اجازت دی کہ ان نعمتوں کو جو تمام افرادِ بشر کے لئے پیدا کی گئی ہیں وراثت، آباد کاری، تجارت وغیرہ کے ذریعے کچھ لوگوں کے دائرۂ اختیار و ملکیت میں قرار پائیں بشرطیکہ ان نعمتوں میں تصرف کرنے والا عقل و بلوغ اور اس طرح

تی دیگر شرائط کا حامل ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ قاعدۂ کلیہ اور بنیادی اصول یہ ہے اور اس کی عملی پاسداری ضروری ہے کہ دنیا میں موجود تمام مال و دولت کا تعلق تمام افراد بشر سے ہے اور مخصوص مقاصد واہداف کی بنیاد پر ان اموال میں سے کچھ، بعض افراد کے نام ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے فوائد وآثار پورے معاشرہ کو حاصل ہوتے ہیں لیکن اگر شخصی اور عمومی معاشرتی مقاصد کے ٹکراؤ ہونے لگے تو اس صورت میں معاشرتی فوائد ہی مقدم ہوں گے اور اس حوالہ سے کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا چنانچہ اس بنیادی اصول کی اسلام میں کثیر ومتعدد فرعیں پائی جاتی ہیں مثلاً انفاق کے احکام اور معاملات ولین دین کے اکثر احکام وغیرہ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے متعدد موارد میں اس کی تصدیق فرمائی ہے مثلاً سورۂ بقرہ، آیت ۲۹: ''خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا'' (اس نے تمہارے لئے پیدا کیا وہ جو زمین میں ہے سب کا سب!) ہم نے اس موضوع کے مربوطہ بعض مطالب سورۂ بقرہ کی آیات انفاق میں ذکر کئے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے ان کی طرف رجوع کریں۔

رزق وروزی کا حکم

○ ''وَّارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا''

(اور انہیں اس میں رزق وروزی دو اور لباس دو اور ان کے ساتھ اچھی طرح بات کرو)

رزق وروزی کے حوالہ سے تفصیلی تذکرہ سورۂ آل عمران، آیت ۲۷ ''وَتَرْزُقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ'' (اور تو رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے!) میں ہو چکا ہے۔

جملہ ''وَّارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ'' آیت مبارکہ ''وعلی المولود لہٗ رزقھن و کسوتھن'' سورۂ بقرہ آیت ۲۳۳ کی مانند ہے۔

اس میں ''رزق'' سے مراد وہ غذا ہے جسے عام طور پر انسان روزانہ کھاتا ہے اور ''کسوۃ'' سے مراد وہ لباس ہے جو انسان گرمی وسردی سے بچنے کے لئے پہنتا ہے (البتہ قرآنی اصطلاح میں رزق اور کسوۃ انہی معانی میں استعمال ہوتے ہیں جو ہماری زبان میں کسوۃ اور نفقہ کہلاتے ہیں) دراصل یہ الفاظ انسان کی مادی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی تمام چیزوں سے کنایۃً ذکر ہوئے ہیں (ان سے ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ مقصود ہے جو انسان کی عمومی زندگی میں اسے ضرورت پڑتی ہیں) لہٰذا اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جس پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے مثلاً مکان وغیرہ یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے لفظ

''اکل'' (کھانا)، یہ لفظ اصل میں مخصوص معنی رکھتا ہے یعنی کچھ کھانا، تناول کرنا، پھر کنایۃً ہر طرح کے تصرفات و استعمالات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ آیت مبارکہ ''فَاِنۡ طِبۡنَ لَکُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَکُلُوۡهُ هَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا'' میں لفظ ''فَکُلُوۡهُ'' (تو اسے کھالو) ہر طرح کے استعمال و تصرف کرنے کے معنی میں ہے۔

اور جہاں تک جملہ ''وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا'' کا تعلق ہے تو ایک اخلاقی جملہ ہے، اس سے سرپرستی کے امور کی انجام دہی درست صورت میں یقینی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ افراد جو سفیہ و کم عقل ہیں اور انہیں ان کے اموال میں تصرف کرنے کی اجازت و حق حاصل نہیں لیکن وہ نہ تو بے زبان حیوان ہیں اور نہ ہی چار پیروں والے جانور ہیں بلکہ انسان ہیں اور ان کے ساتھ انسان جیسا سلوک کیا جانا چاہیے، ان کے ساتھ اسی طرح اچھے انداز میں گفتگو کی جائے جس طرح عام انسانوں کے ساتھ کی جاتی ہے اور اسی طرح معاشرت روا رکھی جائے جس طرح بنی نوع انسان ایک دوسرے کے ساتھ رکھتے ہیں۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جملہ ''وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا'' سے ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور قابل تعریف معاشرت و میل جول رکھو یہ اسی طرح سے ہے جیسے سورۂ بقرہ آیت ۸۳ میں ارشاد ہوا: ''وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا'' (اور لوگوں سے اچھی بات کرو)

یتیموں کے بارے میں خصوصی حکم

○ ''وَابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ''

(اور یتیموں کو آزماؤ یہاں تک کہ وہ نکاح کرنے کے لائق ہو جائیں پس جب تم ان سے محسوس کرو......)

''وَابۡتَلُوا'' میں ابتلاء کا معنی آزمائش و امتحان ہے۔

''بَلَغُوا النِّکَاحَ'' میں نکاح تک پہنچ جانے سے مراد یہ ہے کہ جب وہ نکاح کرنے کے قابل ہو جائیں، اس میں مجاز عقلی پایا جاتا ہے، یعنی ''نکاح تک پہنچنے'' سے ''نکاح کے قابل ہو جانے'' کا معنی مراد لینا اس بناء پر ہے کہ عقلی طور پر اس طرح کے الفاظ سے یہی سمجھا جاتا ہے جیسا کہ جملہ ''واسئل القریۃ'' یعنی بستی سے پوچھئے، میں بستی والے مراد ہوتے ہیں۔

''اٰنَسۡتُمۡ'' میں ایناس سے مراد مشاہدہ ہے، اس میں الفت کے معنی کی جھلک پائی جاتی ہے کیونکہ اس کی اصل ''اُنس'' ہے۔

رشد بمقابل غیّ آتا ہے اس سے مراد مقاصد حیات سے آگاہ ہونا ہے (سوجھ بوجھ)

"فَادْفَعُوْٓا" سے مراد دینا، عطا کرنا ہے، یہاں فادفعوا اس لئے ذکر ہوا ہے کہ گویا یتیم کا ولی وسرپرست اس کا مال اپنے آپ سے دور کر کے اس کے سپرد کر دیتا ہے کہ اسے "دفع" سے تعبیر کیا گیا ہے جو کہ بظاہر غیر موزوں لگتا ہے لیکن حقیقت میں ایک نہایت لطیف کنایہ ہے۔

اور جملہ "حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ" کا تعلق جملہ "وَابْتَلُوا" سے ہے، اس میں تسلسل واستمرار کا ثبوت پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ یتیم کا ولی وسرپرست اسے آزمانے کا کام اس وقت سے شروع کرے جب وہ اچھے برے کی تمیز کرنے کے قابل ہو جائے اور اسے آزمایا جاسکتا ہو، یہاں تک کہ نکاح کرنے کے قابل ہو جائے یعنی بالغ ہو اور مرد کہلائے، اور یہ حکم طبعاً اسی کا متقاضی ہے کہ اس کے بالغ ہونے اور نکاح کرنے کے قابل ہونے کا انتظار کیا جائے پھر جب اس کا راشد یقینی ہو جائے تو اسے بھرپور آزمائے کیونکہ راشد کا یقینی ہونا، بچپن کے عالم میں ایک یا دو واقعات میں آزمانے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ بار بار آزمانا ضروری ہے یہاں تک کہ راشد یقینی طور پر محسوس اور ثابت ہو اور طویل عرصہ تک یہ سلسل جاری رہے یہاں تک کہ وہ بلوغ کی حد تک پہنچ جائے اور پھر شادی کے قابل ہو جائے (بلوغ + قابلیت نکاح + رُشد) اور جملہ "فَاِنْ اٰنَسْتُمْ الخ" جملہ "وَابْتَلُوا" کی فرع اور اس سے مربوط کلام ہے، اس طرح آیت کا معنی یہ ہے: "فامتحنوھم فان انستم منھم الرشد فادفعوا الیھم اموالھم" (تم انہیں آزماؤ، پس اگر تم ان میں رشد محسوس کرو تو انہیں ان کے اموال دے دو) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نکاح کرنے کے قابل ہونا اس بات کی راہ ہموار کرتا ہے کہ یتیم کو اس کا مال دے دیا جائے اور اسے اپنے مال میں تصرف کا مستقل حق دیا جائے یعنی وہ خود ہی اپنا مال استعمال کرے، بنا برایں "رشد" مال میں تصرف کرنے کے حق کی بنیادی شرط ہے۔ اس سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے انسان کے بالغ ہونے کے حوالہ سے ہر موضوع کی بابت اس کا مختلف معنی مراد لیا ہے چنانچہ عبادات اور حدود و دیات جیسے امور میں بلوغ سے مراد شرعی سن تک پہنچنا ہے جو کہ نکاح کا سن ہے، اور مالی امور میں استقلالی طور پر تصرف کرنے میں اس سے مراد نکاح کے سن کے ساتھ رشد کا حامل ہونا شرط قرار دیا گیا ہے کہ جس کی تفصیلات فقہی کتب میں مذکور ہیں اور یہ بات اسلام کی نہایت لطیف حقیقتوں میں سے ہے جسے اس نے اپنی قانون سازی میں بنیادی حیثیت کا حامل قرار دیا ہے کیونکہ رشد کو غیر ضروری قرار دینا اور معاشرتی زندگی کے نظام میں یتیموں کی بابت رشد کو مالی تصرفات میں لازمی قرار نہ دینا ان کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے یعنی اگر رشد شرط نہ ہوتا تو یتیموں جیسے افراد کا نظام زندگی درہم و برہم ہو جاتا اور لوگ آسانی کے ساتھ انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو سکتے تھے کیونکہ اس طرح ان کے ساتھ معاملات انجام دے کر ان کے اموال غارت کر لیتے جس سے وہ اپنی دولت سے محروم ہو جاتے اور پھر کبھی سنبھل نہ سکتے، لہٰذا رشد کو شرط قرار دینا اس طرح کے امور میں ناگزیر ہے اور اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ البتہ جہاں تک عبادات جیسے امور کا تعلق ہے تو ان میں رشد کا ضروری نہ ہونا واضح ہے، اسی طرح حدود و دیات جیسے امور میں بھی رشد ضروری نہیں کیونکہ جرم و گناہ

کے برابر ہونے اور ان سے لازمی طور پر دوری اختیار کرنے سے آگاہ ہونے میں رشد کی ضرورت نہیں بلکہ انسان پہلے ہی سے ان مسائل کے سمجھنے پر قادر ہوتا ہے اور اس حوالہ سے اس کی کیفیت و حالت رشد سے پہلے اور بعد یکساں ہوتی ہے، یعنی ایسا نہیں کہ رشد سے پہلے وہ ان برائیوں کو اچھا سمجھتا تھا رشد کے بعد اس کے برعکس ہو گیا۔

اسراف اور دھوکہ دہی کی ممانعت

○ ''وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا''

(اور تم ان کے اموال اسراف و زیادتی کرتے ہوئے مت کھاؤ کہ کہیں بڑے ہو کر تم سے پوچھ گچھ نہ کر لیں)

اسراف کا معنی عمل میں اعتدال و درمیانی حد سے تجاوز کرنا ہے، بدار کا معنی کسی چیز کی طرف جلدی آگے بڑھنا، اور جملہ ''وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا'' کا معنی یہ ہے کہ اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو وہ تمہیں اپنے اموال پر قبضہ نہ کرنے دیں گے، یہاں حرف نفی یعنی لاَ ذکر نہیں کیا گیا یعنی یوں نہیں کہا گیا: ''وبدارا أن لا یکبروا'' (اور جلدی کرتے ہوئے کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ علم نحو کے ماہرین کا کہنا ہے کہ حرف ''اَنْ'' کے بعد حرف نفی کا حذف کرنا قواعد کے مطابق ہے جیسا کہ آیت مبارکہ ''يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا'' (خداوند عالم تمہارے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) سورۂ نساء آیت ۱۷۶، جبکہ اصل میں یوں ہے: ''لئلا تضلّوا'' (تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) یا ''حذر ان تضلّوا'' (اس ڈر سے کہ تم گمراہ ہو جاؤ گے)

آیت میں دو جملے تقابلی صورت میں ذکر ہوئے ہیں:

(۱) وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا

(۲) وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا

اس تقابلی تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ''اسراف کی صورت میں کھانے'' سے مراد ان کے اموال کو بغیر ضرورت کے اور بغیر استحقاق کے ہتھیایا جائے بلکہ کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر، ظلم و زیادتی کرتے ہوئے اسے استعمال میں لایا جائے۔

اور دوسرے جملے سے مراد یہ ہے کہ یتیم کا ولی اس طرح اس کا مال کھائے جیسے اپنے کام کی اجرت لے رہا ہو۔ یعنی جس طرح اسے اپنے کام کی عام طور پر اجرت ملتی ہو اس طرح سے یتیم کا مال اپنے لئے مخصوص کر کے استعمال میں لائے جبکہ ممکن ہے کہ یتیم بڑا ہونے کے بعد اسے ایسا نہ کرنے دے اور اس طرح اپنے مال پر ہاتھ نہ ڈالنے دے، تو یہ تمام صورتیں

ممنوع ہیں سوائے اس کے کہ یتیم کا ولی خود نادار ہو تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں کہ وہ کام کر کے اپنا بسر اوقات کرے یا پھر یتیم کے لئے کام کر کے اس کی ضروریات کو خود اس کے مال سے پورا کرے، یہ حقیقت میں ایسے ہے جیسے کوئی کام کرنے والا تجارت وغیرہ کر کے اپنا حق لیتا ہے اسی مطلب کا تذکرہ جملہ ''وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ'' میں کیا گیا ہے یعنی جو شخص اپنے بسر اوقات کے لئے یتیم کے مال سے کچھ لینے کا محتاج نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ عفت و خودداری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے اموال میں سے کچھ نہ لے، اور جو شخص نادار ہو وہ ان کے اموال میں سے مناسب صورت میں لے لے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ یتیم کا ولی اپنے مال سے مناسب خرچ کرے نہ کہ یتیم کے مال سے! لیکن یہ قول آیت میں مذکور غنی (مالدار) اور فقیر (نادار) کے درمیان فرق سے موزونیت نہیں رکھتا۔

گواہ بنانے کا حکم

○ ''فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ''

(جب تم انہیں ان کے اموال سپرد کرو تو ان پر گواہ قرار دو)

قرار دینے کا قانون اس لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ کام میں استحکام و پختگی ہو اور اختلاف پیدا ہونے کا سد باب ہو جائے کیونکہ ممکن ہے رشد کے مرحلہ تک پہنچنے کے بعد یتیم، ولی سے مال کا مطالبہ کرے۔

گواہ قرار دینے سمیت تمام مربوطہ احکام بیان کرنے کے بعد تمام مطالب کی اصل و اساس کو اس جملہ میں ذکر فرمایا: ''وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا'' (اور اللہ حساب و کتاب کرنے والا ہی کافی ہے) تاکہ مذکورہ حکم کو اس کے اصل سرچشمہ و بنیادی اصول سے مربوط کرے یعنی اس حقیقت کو واضح کرے کہ اس کا ہر حکم اس کے کسی نہ کسی اسم اور صفت سے وابستہ ہوتا ہے کیونکہ خداوند عالم چونکہ حساب و کتاب کرنے والا ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے بندوں کے احکام کسی حساب و کتاب اور بھرپور محاسبہ کے بغیر صادر کرے، اس کے ساتھ ساتھ اس میں دین اسلام کے تربیتی نظام کی تکمیل بھی ملحوظ ہے کیونکہ اسلام لوگوں کی تربیت کو توحیدی بنیاد پر استوار قرار دیتا ہے اور جہاں تک لین دین اور معاملات میں گواہ مقرر کرنے کا تعلق ہے تو اگرچہ اس سے عام طور پر اختلافات اور تنازعات کا سد باب ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہدف حاصل نہیں ہوتا اور گواہوں کے عادل نہ ہونے یا عادل گواہوں کے میسر نہ آنے جیسے عوامل اس راہ میں حائل ہو جاتے ہیں البتہ اختلافات و تنازعات کی راہ روکنے کا قوی اور معنوی و حقیقی سبب تقوائے الٰہی ہے اور اگر اللہ کہ جو حساب و کتاب اور محاسبہ کرنے والا ہے صرف اسی کی

کفایت ملحوظ ہو تو نزاع بال و پر پھیلا ہی نہیں سکتا، یعنی اگر ولی، گواہ اور خود یتیم کہ جسے مال سپرد کیا جائے تینوں ہی اس عظیم حقیقت کو مدنظر وملحوظ قرار دیں اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کریں تو اختلاف ونزاع جنم لے ہی نہیں سکتا۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں پر اچھی طرح غور وفکر کریں کہ ان میں کس قدر عمدہ بیان واسلوب سخن اختیار کیا گیا ہے اور درج ذیل تین امور واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) یتیموں اور ممنوع التصرف افراد کے اموال کی سرپرستی و ذمہ داری کے بنیادی مسائل اور ان سے مربوط امور مثلاً ان کی وصولی کی کیفیت، حفاظت، ان میں اضافہ وافزائش کے لئے ضروری اقدامات، ان میں تصرف کرنا (استعمال میں لانا) واپس اصل مالکان کو لوٹانا، ان کی سپردگی کی کیفیت اور اُن سے مربوط تمام اُمور کی پختگی کو عمومی بہتری و بھلائی کے ساتھ وابستہ کرنے کے مسائل، عمومی بہتری وبھلائی یہ ہے کہ دنیا بھر میں موجود تمام مال اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے جو نوع انسانی کی زندگی کی بہتری وبہتر صورتگری کے لئے قرار دیا گیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں مربوط مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

(۲) ایک اخلاقی بنیادی اصول کہ اس کی عملی پاسداری سے تربیت کے مربوطہ تمام امور شریعت الٰہیہ واحکام دینیہ کے عین مطابق انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اس اخلاقی اصول کا تذکرہ خداوند عالم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ''**وقولوا لھم قولاً معروفاً**'' (اور اُن سے نہایت عمدہ اور محبت بھری باتیں کرو)

(۳) تمام امور کی اصل: اساس توحید ہے جو تمام عملی واخلاقی احکام میں یکتا حاکم ہے، اور اگر بالفرض عملی احکام اور اخلاقی دستورات کی اثر گزاری کمزور پڑ جائے تب بھی اصل توحید تمام موارد میں اپنے حسن تاثیر کے ساتھ باقی رہے گی اور اس کی اثر آفرینی میں کسی طرح سے کمی نہ آئے گی چنانچہ اس حقیقت کو جملہ ''وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا'' میں بیان کر دیا گیا ہے۔

روایات پر ایک نظر

تفسیر درمنثور کی روایت

آیہ مبارکہ ''وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ......'' کی تفسیر میں کتاب ''درمنثور'' میں ابن ابی حاتم کے حوالہ سے سعد بن جبیر سے منقول ہے کہ غطفان میں ایک شخص اپنے یتیم بھتیجے کا بہت زیادہ مال اپنے تصرف واستعمال میں لایا اور جب اس کا بھتیجا بالغ ہو گیا تو اس نے اپنے چچا سے اپنا مال طلب کیا مگر اس کے چچا نے اسے انکار کر دیا اس یتیم نے اس کی شکایت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ......''

امام صادقؑ کا فرمان

تفسیر العیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:
''لا یحل لماء الرجل ان یجری فی اکثر من اربعة ارحام من الحرائر''
(کسی مرد کے لئے جائز نہیں کہ اس کا نطفہ چار آزاد رحموں سے زیادہ میں جائے)
یہ حکم ایک ہی وقت میں چار سے زیادہ شادیاں کرنے کی ممانعت پر دلالت کرتا ہے۔م
(تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۱۸)

کافی کی ایک روایت

فی فروع الکافی عن الصادق (ع) قال، اذا جمع الرجل اربعاً فطلق احداهن فلا یتزوج الخامسة حتی تنقضی عدة المرأة التی طلق

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جب کوئی شخص چار شادیاں کرے اور پھر ان میں سے ایک کو طلاق دے تو پانچویں دفعہ اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا جب تک اس عورت کی عدت ختم نہ ہو جائے جسے اُس نے طلاق دی (کافی ا جلد ۵ صفحہ ۴۲۹)
اس موضوع کی بابت کثرت سے روایات موجود ہیں۔

امام رضا علیہ السلام کا فرمان

کتاب علل الشرائع میں مؤلف نے اپنے اسناد سے محمد بن سنان کی روایت بیان کی ہے کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے اس کے خط کے جواب میں اس کے سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ مرد کے لئے چار شادیاں کرنے کے جواز اور عورت کے لئے ایک سے زیادہ مردوں سے بیک وقت شادیاں کرنے کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ جب مرد چار عورتوں سے شادیاں کرتا ہے تو اس کی اولاد اسی سے منسوب ہوتی ہے لیکن اگر عورت کے دو شوہر یا اس سے زیادہ ہوں تو معلوم نہ ہو سکے گا کہ اولاد کس کی ہے؟ کیونکہ وہ سب اس سے ہمبستری کرتے ہوں گے تو اس سے نسب، میراث اور شناخت میں خلل

واقع ہوجائے گا۔

محمد بن سنان نے کہا کہ ایک مرد کی چار آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت کی ایک وجہ یہ ہے کہ دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے لہٰذا اسی بناء پر۔ واللہ اعلم۔ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'' (پس تم نکاح کروان عورتوں سے جو تمہیں پسند آئیں دودو، تین تین، اور چار چار) تو خدائی قانون اس لئے ہے تاکہ مالدار و نادار کے لئے اپنی مالی استطاعت کے مطابق اس بات کی گنجائش موجود ہو کہ مرد چار شادیاں کر سکے (کتاب علل الشرائع جزا ص ۵۰۴)

چار شادیوں کے جواز کی ایک حکمت

کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ آپؑ نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

''ولذلك حرّم على المرأة الا زوجها واحل للرجل اربعاً. فان الله اكرم من ان يبتليهن بالغيرة ويحل لرجل معها ثلاثاً''

غیرت مردوں کے حصہ میں آئی ہے، اسی لئے عورت کے لئے اپنے شوہر کے علاوہ کسی مرد سے تعلق قائم کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، جبکہ مرد کے لئے چار شادیاں کرنا حلال و جائز ہے، کیونکہ خداوند عالم کی ذات اس سے برتر و برزگ تر ہے کہ عورتوں کو غیرت کے مسائل میں مبتلا کردے، اور مرد کے لئے حلال و جائز ہے کہ ایک بیوی کے ساتھ مزید تین عورتوں سے شادی کرے۔ (فروع کافی، جلد ۵۔ صفحہ ۵۰۴)

اس بیان سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ''غیرت'' پسندیدہ اخلاق اور پاکیزہ صفات وصلاحیات میں سے ایک ہے اور وہ انسان کی عام عادات میں ایک انقلاب برپا کردیتی ہے اور اسے ہر اس شخص کے مقابل میں پوری طاقت کے ساتھ ڈٹ جانے اور دفاع وانتقام کے جذبات سے لیس کرتے ہوئے ٹھوس عملی اقدامات کرنے کی راہ پر لاتی ہے جو اس کے دین، عزت و ناموس یا جاہ وجلال اور شرف وحرمت کو پامال کرے یا ان کی طرف ٹیڑھی نظر کرے، اور یہ ایک ایسی فطری صفت ہے جو تقریباً ہر انسان میں بحیثیت انسان پائی جاتی ہے اور چونکہ اسلام دین فطرت ہے لہٰذا اس میں فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کا سامان نہایت احسن طور پر کیا گیا ہے اور دین مقدس اسلام میں فطری تقاضوں کو اعتدال کی اس صورت سے ہم رنگ کرنے کے یقینی اسباب فراہم کئے گئے ہیں جس میں انسان کی بہتری و بھلائی کی ضمانت موجود ہے اور اگر طبع انسانی میں ایسے امور کی

طرف رغبت جنم لے کہ جن کی اسے ضرورت ہی نہ ہو مثلاً مال و دولت کا لالچ، کھانے پینے اور پہننے وازدواجی امور میں افراطی راہ اختیار کرنے وغیرہ میں اسے اعتدال پر رکھنے کے لئے ان امور کو فطری تقاضوں کی فہرست سے خارج کرنے میں اسلام کا کردار نہایت مؤثر ہے۔ بنابراین اگر اللہ تعالیٰ نے مرد کے لئے جائز قرار دیا ہے کہ ایک بیوی کے ساتھ تین مزید عورتوں کے ساتھ شادی کرسکتا ہے۔ جبکہ دینی احکام و دستورات فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہیں تو اس سے لازمی طور پر یہ سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی طبعی و مزاجی کیفیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا حکم دیا ہے کہ غیرت کی بجائے حسد کے رجحانات کا جنم لینا معمول کا حصہ ہے، اس موضوع کی بابت عنقریب تعدد ازواج (ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت) کی بحث میں مزید وضاحت پیش کریں گے کہ صنف نازک میں اس طرح کے رجحانات ان کی فطرت و طبع وجودی میں شامل نہیں بلکہ حالات کی وجہ سے ان پر اس طرح کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔

فروع کافی کی روایت

کتاب فروع کافی میں زرارہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''لایرجع الرجل فیما یھب لامرأتہ ولا المرأۃ فیما تھب لزوجھا جیزت ام لم تجز الیس اللہ تبارك و تعالیٰ یقول: "ولا تاخذوا مما اتیتموھن شیئاً" وقال: "فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا"''

مرد نے جو کچھ اپنی بیوی کو دے دیا ہے اس سے واپس نہیں لے سکتا اور نہ ہی عورت جو کچھ اپنے شوہر کو دے چکی ہے وہ اس سے واپس لے سکتی ہے خواہ اس کے نگہداشت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، کیا اللہ تعالیٰ نے ارشاد نہیں فرمایا: اور تم نے جو کچھ انہیں دے دیا ہے اس سے کچھ بھی نہ لو، اور یہ بھی ارشاد فرمایا: پس اگر وہ خود اپنی مرضی سے تمہیں کچھ دے دیں تو جی بھر کر کھاؤ، ان دو آیتوں میں حق مہر اور ھبہ کئے ہوئے مال کے بارے میں حکم مذکور ہے۔

(فروع کافی جلد ۷ صفحہ ۳۰)

امیر المومنینؑ کا نہایت عمدہ و لطیف نسخہ

تفسیر العیاشیؒ میں عبداللہ بن قداح سے روایت کی گئی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے پدر بزرگوار کے حوالہ سے بیان فرمایا کہ ایک شخص حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے شکم درد کی شکایت پیش کی، تو

امیر المومنینؑ نے اس سے پوچھا: کیا تیری بیوی ہے؟ اس نے عرض کی: جی ہاں، امامؑ نے فرمایا، اس سے اس کی رضا و رغبت کے ساتھ کچھ رقم لے لو پھر اس سے شہد خرید کرو اور اس پر بارش کا پانی ڈالو اور اسے پی لو، کیونکہ میں نے سنا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے: ''وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا'' (اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کیا ہے) اور شہد کے بارے میں فرمایا: ''يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ'' (اس کے اندر سے ایسا پانی نکلتا ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، ان میں لوگوں کے لئے شفا ہے) اور ارشاد ہوا: ''فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــــًٔا مَّرِيْٓــــًٔا'' (پس اگر وہ تمہیں اپنی مرضی سے کچھ دے دیں تو اسے سیر ہو کر کھاؤ) اگر تم نے ایسا کیا تو انشاء اللہ شفایاب ہوگا، چنانچہ اس شخص نے امیر المومنینؑ کے بتائے ہوئے نسخہ پر عمل کیا اور شفایاب ہوگیا۔ (تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۲۱۸)

اس روایت کو تفسیر ''در منثور'' میں عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے امیر المومنین علیہ السلام کی نسبت سے ذکر کیا گیا ہے اور امامؑ نے آیات قرانیہ سے نہایت عمدہ اور لطیف استفادہ کرتے ہوئے نسخہ تجویز فرمایا جو کہ آیات کے معانی سے وسیع مفہوم اخذ کرنے پر مبنی ہے، اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول روایات میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ ہم ان میں سے بعض روایات ان کے موزوں موارد میں پیش کریں گے۔

کثرتِ سوال کی ممانعت

کتاب اصول کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے ''اذا حدثتکم بشئ فاسئلونی من کتاب اللہ'' جب میں تم سے گفتگو کروں اور کوئی مسئلہ بیان کروں تو مجھ سے اس کی قرآنی دلیل پوچھا کرو، پھر امامؑ نے سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''ان رسول اللہ (ص) نهی عن القیل والقال و فساد المال و کثرة السؤال'' حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے بیجا بحث، مال کے ضیاع اور کثرت سوال سے منع فرمایا ہے اس پر آپؑ سے پوچھا گیا: ''یابن رسول اللہ (ص) این هذا من کتاب اللہ'' (اے فرزند رسولؐ! یہ باتیں کلام الٰہی میں کہاں لکھی ہوئی ہیں)؟ امامؑ نے فرمایا: خداوند عالم کا ارشاد ہے: ''لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ'' (ان کی سرگوشیوں میں کوئی نیکی نہیں پائی جاتی مگر یہ کہ جو شخص صدقہ دینے یا نیک عمل انجام دینے کا حکم دے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا عمل انجام دیں) اور اموال کے حوالہ سے یوں ارشاد ہوا: ''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا'' (اور کم عقل لوگوں کو اپنے وہ اموال نہ دو جو خدا نے تمہارے لئے زندگی بسر کرنے کے لئے قرار دیئے ہیں) اور کثرت سوال کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''لَا تَسْــَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ'' (اور تم ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تمہارے سامنے ظاہر ہو جائیں تو تمہیں تکلیف ہوگی) (اصول کافی جلد اول، صفحہ ۶۰)

سفیہ کسے کہتے ہیں؟

تفسیر العیاشی میں یونس بن یعقوب سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ آیہ مبارکہ ''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ'' (اور تم سفیہ لوگوں کو اپنے اموال نہ دو) میں ''سفیہ'' سے مراد کون ہیں؟
امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''من لا تثق بہ'' (اس سے مراد وہ ہے جس پر آپ اعتماد و وثوق نہ کرتے ہوں)
(تفسیر العاشی، جلد اول صفحہ ۲۲۰)

شرابخور سفیہ ہے

تفسیر العیاشی میں ابراہیم بن عبدالحمید کے حوالہ سے منقول ہے اُنہوں نے کہا میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ آیہ مبارکہ ''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ'' (اور تم سفیہوں کو اپنے اموال نہ دو) میں سفیہ سے کون مراد ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''کل من یشرب الخمر فھو سفیہ'' (ہر وہ شخص جو شرابخوری کرتا ہو وہ سفیہ ہے) (تفسیر العیاشی جلد اول، صفحہ ۲۲۰)

اولیائے ایتام کو حکم

علی بن حمزہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیہ مبارکہ ''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ'' کے بارے میں پوچھا کہ اس میں سفیہوں سے مراد کون ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''ھم الیتامیٰ لا تعطوھم اموالھم حتی تعرفوا منھم الرشد'' ان سے مراد ایتام ہیں، تم اُنہیں ان کے اموال نہ دو یہاں تک کہ وہ رشد تک پہنچ جائیں۔ میں نے پوچھا: فکیف اموالھم اموالنا؟ ان کے اموال ہمارے اموال کس طرح ہو گئے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اذا کنت انت الوارث لھم، جب تم ان کے وارث ہوئے تو ان کے اموال تمہارے اموال ہی کہلائیں گے (تفسیر العیاشی جلد اول، صفحہ ۲۲۰)

امام محمد باقرؑ کا فرمان

تفسیر قمی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان مذکور ہے کہ امامؑ نے آیہ مبارکہ ''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ''

کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''فالسفهاء النسآء والولد اذا علم الرجل ان امرأته سفیهة مفسدة وولده سفیه مفسد لم ینبغ له ان یسلط واحداً منهما علی ماله الذی جعل الله له قیاماً یقول: معاشا'' سفیہوں سے مراد بیوی بچے ہیں، جب کسی شخص کو معلوم ہو جائے کہ اس کی زوجہ کم عقل اور فسادی ہے (مال کو ضائع کرنے والی) اور اس کے بچے کم عقل ہیں (اور مفسد ہیں مال کو ضائع کر دینے والے ہیں) تو اسے چاہیے کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے اموال پر کوئی اختیار نہ دے، وہ اموال کو جو اللہ نے اس کے امرارِ معاش اور گزر بسر کے لئے قرار دیئے ہیں۔ (تفسیر قمی، جلد اوّل صفحہ ۱۳۱)

اس موضوع کی بابت کثیر روایات موجود ہیں اور ان سب میں اسی مطلب کی تائید ملتی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ سفاہت وسیع معانی کا حامل لفظ ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں مثلاً وہ سفاہت جو اموال میں تصرف کی ممنوعیت کا سبب بنتی ہے اور وہ سفاہت جو بچے کے رشد تک پہنچنے سے پہلے اسے ممنوع التصرف بناتی ہے، اور وہ سفاہت جو لالچی عورت میں آتی ہے، اور وہ سفاہت جو شراب خور پر چھاتی ہے، اور وہ سفاہت جو ناقابل اعتماد شخص کو گھیرے میں لیتی ہے، بنابرایں مذکورہ بالا تمام موارد میں سفاہت کا معنی موضوع سے مناسبت اور مصداق سے ہمرنگی کا حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ ''اَمْوَالَكُمْ'' میں ضمیر مخاطب بھی سفہاء کے اولیاء کے حوالہ سے مختلف معانی کا حامل ہے؟ ان میں سے ہر مورد کی تطبیق خود قارئین کرام کریں اور دیکھیں کہ کس پر کون سا معنی منطبق ہوتا ہے۔

اور جہاں تک امامؑ کے اس ارشاد گرامی کا تعلق ہے جو آپؑ نے ابن ابی حمزہ کی روایت میں ''اَمْوَالَهُمْ'' کی تفسیر میں فرمایا: ''اذا کنت انت الوارث لهم'' (جب تو ان کا وارث ہو) اس مطلب کی طرف اشارہ ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ تمام اموال اصل وحقیقت میں معاشرہ کی ملکیت ہے اور دوسرے مرحلہ میں افراد اس کے مالک بنتے ہیں کیونکہ مال میں پورے انسانی معاشرہ کے افراد کا اشتراک ہی ایک فرد کی ملکیت دوسرے فرد کو منتقل ہونے کا سبب بنتا ہے۔

من لایحضرہ الفقیہ کی دو روایتیں

کتاب ''من لایحضرہ الفقیہ'' میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے دو روایتیں مذکور ہیں جن میں سے ایک روایت میں ہے کہ امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یتیم بچہ اس وقت یتیمی کے دائرہ سے باہر آتا ہے جب وہ احتلام کی حد تک پہنچ جائے جو کہ اس کے بلوغ کا مرحلہ ہے جسے قرآن مجید میں ''اشدہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اگر وہ احتلام کی حد تک تو پہنچ جائے لیکن ابھی ''رشد'' کے مرحلہ تک نہ پہنچا ہو اور اسے سفیہ وضعیف کہا جائے تو اس کے ولی کو چاہیے کہ اس کا مال اس کے سپرد نہ کرے بلکہ اس سے روکے رکھے۔

اور دوسری روایت میں امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ آیۂ مبارکہ: ''وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى .... ''میں یتیموں کے رشد پانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس مرحلہ تک پہنچ جائیں کہ اپنے اموال کی حفاظت خود کر سکیں (من لایحضرہ الفقیہ جلد ۴ صفحہ ۱۶۳، ۱۶۴)

رشد کے معنی کی بابت آیت مبارکہ سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس سلسلہ میں، ہم مربوطہ مطالب پہلے بیان کر چکے ہیں۔

نادار ولی کے لئے مخصوص اجازت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے آیۂ مبارکہ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص خود تنگدست ہو اور یتیم کی نگہداشت اس کے لئے دشوار ہو تو مناسب صورت میں یتیم کے مال سے یتیم کی بہتری ورفاہ کے لئے خرچ کرسکتا ہے اور اگر اس کا مال نہایت قلیل ہے تو اسے اس میں سے کچھ بھی خرچ نہیں کرنا چاہیے (کتاب التہذیب جلد ۶ صفحہ ۳۴۱)

اسراف وفضول خرچی کی ممانعت

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم اور نحاس نے اپنی کتاب ناسخ میں ابن عمر سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ''ان رجلاً سال رسول الله (ص) فقال: لیس لی مال ولی یتیم، فقال (ص): کل من مال یتیمك غیر مسرف ولا مبذر ولا متاثل مالاً ومن غیر ان تقی مالك بماله''

ایک شخص حضرت رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کہ میرے پاس مال نہیں ہے اور میرے پاس ایک یتیم ہے، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: یتیم کا مال استعمال کرو البتہ اس میں اسراف وفضول خرچی نہ کرو اور نہ ہی اسے بے پرواہی سے واندھادھند خرچ کرو اور اس کے مال سے اپنے لئے مال نہ بناؤ اور نہ ہی اس کے مال کو اپنے مال کی ڈھال بناؤ۔

(تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۲۲)

یہ مطلب کثیر روایات میں مذکور ہے جن میں آئمہ اہل بیتؑ اور دیگر کی طرف سے بیانات موجود ہیں، البتہ ان میں فقہی بحثیں بھی ہیں اور مربوطہ موضوعات پر مشتمل روایات بھی ہیں، جو شخص مزید تفصیلات جاننا چاہے وہ حدیث وفقہ کی جامع کتب کا مطالعہ کر کے آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔

آیت کا منسوخ ہونا؟

تفسیر العیاشی میں رفاعہ سے روایت مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے آیہ مبارکہ ''فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ'' کی بابت ارشاد فرمایا کہ میرے پدر بزرگوار (امام محمد باقرؑ) فرمایا کرتے تھے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔
(تفسیر العیاشی جلد ۹ صفحہ ۲۲۲)۔

ابن عباس کا قول

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابو داؤد اور نحاس دونوں نے کتاب الناسخ میں اور ابن منذر نے عطاء کے حوالہ سے جناب ابن عباس کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ آیت ''فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ'' کو آیت ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا'' کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۲۲)

مذکورہ بالا دونوں روایتیں قرین صحت نہیں لگتیں کیونکہ آیہ مبارکہ کا منسوخ ہونا اصول و معیار نسخ سے موزونیت نہیں رکھتا اور آیات مبارکہ کے درمیان ناسخ و منسوخ کی کوئی نسبت دکھائی نہیں دیتی، مثلاً آیہ مبارکہ ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا......'' اور زیر بحث آیت مبارکہ کے مضامین کے درمیان ایک دوسرے سے نفی کا کوئی پہلو ہی نہیں پایا جاتا کیونکہ زیر بحث آیت میں مال میں تصرف کرنا اور اسے استعمال میں لانا ''بِالْمَعْرُوْفِ'' کے الفاظ کے ساتھ مقید و مشروط صورت میں ذکر کیا گیا ہے جبکہ مذکورہ آیت میں لفظ ''ظُلْمًا'' کے الفاظ کے ساتھ اموال کے تصرف و استعمال کو حرام قرار دیا گیا ہے لہٰذا ان دونوں کے درمیان نفی کا کوئی پہلو موجود نہیں کیونکہ معروف یعنی اچھی و درست صورت میں تصرف کرنے کے جواز اور ظلم و زیادتی کرتے ہوئے تصرف کی حرمت دو الگ الگ احکام ہیں جن کے درمیان ٹکراؤ نہیں پایا جاتا، بنابریں حق یہ ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، اور مذکورہ بالا دو روایتیں چونکہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں اور کلام الٰہی سے ہم رنگی بھی نہیں رکھتیں لہٰذا قابل توجہ نہیں۔

رشد یعنی محبت آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تفسیر العیاشی میں عبداللہ بن مغیرہ سے منقول ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ''فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا

فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ '' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ: ''اذا رأیتموھم یحبون آل محمد فارفعوھم درجة، جب تم دیکھو کہ وہ آلِ محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں تو ان کا مقام و مرتبہ بلند کرو۔''

یہ روایت قرآن مجید کے باطنی مفاہیم کی ان کے مصادیق پر تطبیق کے طور پر ہے کہ جسے اصطلاح میں ''جری'' کہا جاتا ہے کہ اس کی بابت ہم گذشتہ مختلف موارد میں بیان کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئمہ اطہار علیہم السلام مؤمنین کے روحانی آباء ہیں اور مؤمنین ایتام کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جو علوم و معارف کسب کرنے میں ان کے محتاج ہیں، اور مؤمنین آلِ محمد ﷺ سے جس قدر زیادہ محبت کریں اتنا زیادہ ان کا احترام اور بلندیٔ درجات ہونی چاہیے کہ انہیں ان کے آباء کی میراث یعنی معارفِ حقہ کی تعلیم دے کر ان کا رتبہ بلند کیا جائے۔

ایک علمی بحث

(۱) نکاح: طبع انسانی کا ایک اہم مقصود

مرد اور عورت کے باہمی تعلق و پیوستگی کا مسئلہ طبع انسانی بلکہ طبع حیوانی کے بنیادی و وجودی تقاضوں میں سے ایک ہے کہ جس پر ان کی اصل و اساس استوار ہے اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے لہٰذا وہ لامحالہ اس تعلق و پیوستگی کو جائز و درست قرار دیتا ہے۔

اور تولید و افزائش نسل اور تخم گذاری کے مسائل و مراحل بھی اصل طبیعت کے تقاضے اور اس پیوستگی و تعلق کے ذریعے تخلیق بشر کی اغراض و مقاصد قرار پائے ہیں جو کہ اس عمل کو اس کی درست صورت دینے اور اسے صحیح ازدواجی شکل میں لا کر غلط و غیر شرعی تعلق کی بجائے نکاح و شادی کی قانونی و باضابطہ صورتگری کا واحد سبب ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حیوانات کہ جن کی اولاد کی تربیت ماں باپ دونوں کے ذمہ میں ہوتی ہے جیسا کہ پرندوں میں ہے کہ اپنے انڈوں کی حفاظت اور ان کے وجودی مراحل میں ان کی غذائی و نشوونما کی ضرورت کو پورا کرنا نر اور مادہ دونوں کی مشترکہ کاوشوں سے یقینی ہوتا ہے، اسی طرح وہ حیوانات جو تولید و افزائش نسل اور تربیت اولاد کے مسائل و مراحل میں کوئی ٹھکانہ و مکان چاہتے ہیں اور ان میں سے نر اور مادّہ دونوں کی مشترکہ کوششوں اور باہمی تعاون کے ساتھ ان کے مربوطہ امور انجام پذیر ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے درمیان ازدواجی تعلق قائم ہو جاتا ہے اور وہ اسی رشتہ و ناطہ کے ساتھ متعلقہ ذمہ داریاں مشترک صورت میں ادا کرتے ہیں

چنانچہ ان کی باہمی اشتراک پر مبنی کاوشیں ان کے درمیان ازدواجی تعلق کی عکاسی کرتی ہیں، ان کا ایسا کرنا اُن کی نسل واولاد میں بھی رائج ہوجاتا ہے اور وہ بھی اپنے والدین کی طرح نر و مادہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ازدواجی بندھن کے ساتھ تولید نسل سے مربوط ذمہ داریوں کو مشترکہ صورت میں ادا کرتے ہیں کہ جوں ہی اپنی عمر کی مخصوص حد تک پہنچتے ہیں تو ازدواجی تعلق قائم کرنے کی راہ اپنا لیتے ہیں کہ پھر ان کی زندگی اور نشوونما سے مربوط مسائل اسی تعلق کی بنیاد ہی پر طے پاتے ہیں، ان کا عملی طور پر ازدواجی تعلق کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہی اس نظام کی اساس و بنیاد کی پختگی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ بنا برایں یہ واضح ہوا کہ نکاح و شادی کا اصل عامل و سبب تولید و افزائش نسل اور تربیت اولاد ہے اور جہاں تک شہوت کی آگ بجھانے اور زندگی کے امور مثلاً کام کاج، مال و دولت اکٹھا کرنا، روٹی کپڑا اور مکان کی تلاش، گھریلو ساز و سامان مہیا کرنا وغیرہ تو یہ سب کچھ طبیعت وخلقت کی غرض و غایت کے دائرہ سے باہر ہے، ان کی حیثیت اصل غرض کے حصول کی نسبت مقدماتی وتمہیدی ہے یا یہ کہ اصل غرض سے حاصل ہونے والے فوائد ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہر طرح کی جنسی آزادی یعنی ہر مرد کو ہر عورت کے ساتھ اور ہر عورت کو ہر مرد کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کا کھلا اختیار کہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں اکٹھے ہوں اور چوپایوں کی طرح کسی قانون وضابطہ کے بغیر آپس میں ملاپ کریں جیسا کہ مغربی تمدن نے تدریجاً اس طرح کی صورت حال پیدا کردی ہے یہاں تک کہ شادی شدہ عورت کے ساتھ مباشرت کرنا معمول بن چکا ہے، اسی طرح طلاق کو ممنوع قرار دیتے ہوئے ازدواجی تعلق کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھنا اور باہمی معاشرت کے باوجود ایک شوہر کو چھوڑ کر دوسرا شوہر اختیار کرنا، اس کے ساتھ ساتھ تولید و افزائش نسل اور اولاد کی تربیت اور گھریلو زندگی کو مشترک بنیاد پر استوار کر کے ازدواجی نظام چلانے کا سرے سے خاتمہ کردینا جیسا کہ موجودہ دور میں ترقی یافتہ قوموں میں عام رائج ہے کہ جس کی مثال نومولود بچوں کو رضاعت و تربیت کے لئے بنائے گئے عمومی مراکز میں بھجوا دینا وغیرہ سب کچھ طبع وجود اور فطرت سلیمہ کے سراسر منافی ہے جبکہ انسان اس طرح کے نت نئے رواجوں وعادات سے متصادم مزاج کا حامل ہے کہ اس حوالہ سے اجمالی بیان اور اشاراتی تذکرہ ہوچکا ہے۔

البتہ وہ حیوانات کہ جنہیں تولید نسل اور تربیت اولاد میں اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ماں حاملہ ہو، بچے کو دودھ پلائے، اور اس کی تربیت کے حوالہ سے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ماں بچے کے ساتھ ساتھ رہے، چلنے پھرنے میں اسے اکیلا نہ چھوڑے بلکہ اسے آب و دانہ مہیا کرنے میں مدد دے، تو اس میں نہ تو انہیں نکاح وازدواج پر مبنی تعلق کی طبعی احتیاج ہوتی ہے اور نہ ہی ساتھ رہنے اور ایک دوسرے سے مختص ہونے یعنی مصاحبت واختصاص کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اس طرح کے حیوان جنسی تعلق میں جائز و ناجائز اور اپنے وغیر کی تمیز نہیں رکھتے بلکہ اس حوالہ سے پدر مادر آزاد ہوتے ہیں البتہ ان کی آزادی اسی حد تک ہوتی ہے جس سے طبع وجودی کی غرض یعنی حفظ نسل میں خلل واقع نہ ہو۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی پیدا

نہ ہونے پائے کہ خلقت کے اصولوں اور طبع وجود کے تقاضوں کی دنیا سے باہر نکلنے میں کوئی حرج نہیں اور اسے زندگی اور جو کچھ اس میں ہے اس سے لطف اندوز ہونے کی بناء پر غور وفکر کرتے ہوئے ان نواقص وخامیوں کی تلافی وتدارک کے ذریعے قرین صحت بنایا جاسکتا ہے، ایسا ہرگز صحیح نہیں اور یہ بہت بڑی نادانی و بیوقوفی ہے کیونکہ یہ طبعی بنیادی ڈھانچے کہ جن میں انسانی طبع وجود بھی شامل ہے کثیر اجزاء سے مرکب ہیں اور وہ اس بات کے موجب بنتے ہیں کہ ہر جزء اپنی خاص جگہ اور مخصوص حالات کے ساتھ اس طرح قرار پائے کہ طبیعت وخلقت دونوں کی غرض ومقصد سے ہمرنگی ہو اور مربوطہ نوع درجۂ کمال کو پہنچ جائے، اور وہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے کسی معجون ومرکب میں اس کے اجزاء کی حیثیت وکیفیت ہوتی ہے کہ اس کی خصوصیات، اندازے، وزن اور مخصوص صفات اس کی اثر گزاری میں دخیل ہوتی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی نہ پائی جائے یا اس میں کمی ہو تو وہ اپنا اثر کھودے گی۔

اب اس حوالہ سے انسان کو دیکھیں کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جس کا وجود، اجزاء کا مجموعہ مرکب ہے اور اس کی خاص ترکیب ایسے باطنی اوصاف اور روحانی خصوصیات کی حامل ہے کہ جو تمام افعال واعمال کا سرچشمہ ہیں، چنانچہ اگر اس کے افعال واعمال میں سے کوئی ایک بھی اپنی اصل طبعی حیثیت سے کسی دوسری حیثیت میں تبدیل ہو جائے تو اس کی صفات اور روحانی خصوصیات میں انحراف وکجی اور تبدیلی رونما ہو جائے گی کہ جس کے نتیجہ میں تمام خصوصیات وصفات اپنی طبیعی حیثیت کھو دیں گی اور اپنی خلقت کی اصل راہ سے ہٹ جائیں گی اور پھر اس کا اپنے طبعی کمال اور تخلیقی غرض وغایت سے رابطہ ختم ہو جائیگا۔

ہم ان مصائب وآلام پر نگاہ کرتے ہیں جن سے عالم انسانیت آج دوچار ہے کہ جس کے نتیجہ میں لوگوں کے وہ اعمال اور کوششیں بے سود و بے اثر ہو چکی ہیں جو راحت وآرام اور سعادت مند زندگی کے حصول کے لئے وہ کرتے ہیں اور ان مصائب وشدائد کے باعث کاشانۂ انسانیت کے در و بام لرزہ براندام ہو گئے ہیں تو ہم اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتے ہیں کہ ان تمام حالات کا سب سے بڑا عامل وسبب تقویٰ کا فقدان اور اس کی جگہ بے حیائی، سنگدلی، درندگی لالچ اور بزدلی وغیرہ جیسی برائیوں نے لی ہے، اور ان سب کے پیچھے وہ بے پدر و مادر آزادیاں ہیں جو انسانی معاشرے میں گھر کئے ہوئے ہیں کہ جن میں ازدواجی اصولوں اور اولاد کی تربیت کے بنیادی قواعد وضوابط کو نظر انداز کر کے فطری تقاضوں کو یکسر پامال کر دیا جانا سرفہرست ہے۔ معاشرہ میں جو روش عام ہے اور اولاد کی تربیت نے موجودہ دور میں جو رنگ ڈھالا ہوا ہے اس سے رأفت و مہربانی، عفت و پاکدامنی، حیاء وشرافت اور اخلاق وانکساری کا جنازہ نکل گیا ہے اور انسان شعور کے ابتدائی مرحلہ سے زندگی کی آخری سانسوں تک اسی حالت میں رہتا ہے۔

لیکن ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے جو طرزِ تفکر اپنایا گیا اور اس کے سہارے نواقص وکمزوریوں کے ازالہ کی تجویز سامنے لائی گئی وہ ہرگز قرین صحت نہیں اور وہ اس درد کا مداوا نہیں کر سکتی کیونکہ قوتِ فکر ونظر، زندگی کے دیگر وسائل وقوتوں

میں سے ایک ہے جسے خود کارخانہ تخلیق نے وجود عطا کیا ہے اور نظام طبیعت میں اسے ایسا ذریعہ و وسیلہ قرار دیا ہے جو طبع وجود میں پیدا ہونے والے انحرافی عوامل کا راستہ روک کر فطرت سلیمہ کے اصولوں و تقاضوں کا تحفظ کرے اور نظام طبیعت کو اُس کے حقیقی دائرہ سے باہر نہ جانے دے، نہ یہ کہ وہ طبیعت و فطرت کی عملداری کا راستہ ہی روک لے اور نظام طبیعت کا سرے ہی سے خاتمہ کردے جبکہ اس کا وجود میں آنا انسانی طبع وجود سے متصادم چیزوں کو اس سے دور رکھنے کے لئے ہے، اور واضح ہے کہ اگر اس سے طبع وجودی سے متصادم انحرافی عوامل کی تقویت کا کام لیا جائے، تو خود اس کا وجود بھی ختم ہو کر رہ جائے گا، گویا وہ خود اپنے آپ کو ختم کرنے کا بھی سبب بن جائے گی، چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ عصر حاضر کا انسان جس قدر اپنی مادی قوت فکر کو استعمال میں لاتا ہے اور معاشرتی مفاسد کو دور کرنے کے لئے جتنے اصلاحی اقدامات اُٹھاتا ہے وہ بے نتیجہ ہوئے ہیں بلکہ اس سے مزید خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر بنی نوع انسان پر شدید سے شدید تر مصائب و آلام اور سختیاں چھا جاتی ہیں جو کہ برداشت نہیں ہوسکتیں اور ان کی شدت قابل تحمل نہیں ہوتی اور وہ معاشرہ کو تہ و بالا کر دیتی ہیں۔

ممکن ہے کہ مادی قوت فکر کے سہارے تمام معاشرتی خامیوں کو دور کرنے میں کوشاں افراد میں سے کوئی یہ کہے کہ یہ روحانی صفات کہ جنہیں نفسانی فضائل سے موسوم کیا جاتا ہے وہ زمانہ قدیم اور عصر جاہلیت کی یادگاریں ہیں اور غیر متمدن دور کے باقی ماندہ آثار ہیں کہ جو موجودہ ترقی یافتہ زمانہ سے مطابقت نہیں رکھتے اور انسانی زندگی ان سے کہیں بالاتر مرحلہ کو پہنچ چکی ہے مثلاً عفت و پاکدامنی، سخاوت و توانگری انسان کی ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیتی ہے جو وہ اس مال و دولت جمع کرنے کے لئے کرتا ہے کہ جس سے اپنی زندگی کی مالی ضروریات کو پورا کرسکے جبکہ سخاوت کے نتیجہ میں اس کی تمام تر کاوشیں اور محنتیں رائیگاں جاتی ہیں اور پھر لوگوں کو مفت خوری اور گداگری کی عادت ہو جاتی ہے جس سے انسانی وقار سخت مجروح ہوتا ہے۔ شرم و حیاء انسان کی زبان پر ایسی لگام ہے جو اسے اپنے حقوق طلب کرنے اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار سے روکتی ہے، رافت و دلسوزی دل کو کمزور کرتی ہے، اور صداقت و راست گوئی موجودہ دور کی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتی۔

آپ غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ مذکورہ بالا مطالب انحرافی سوچ کی ترجمانی کرتے ہیں کہ جس کی بابت ہم بات کر چکے ہیں، اس طرح کی باتیں کرنے والے کو شاید یہ معلوم نہیں کہ انسانی معاشرہ میں یہ فضیلتیں ایسے لازمی امور میں سے ہیں کہ جن پر معاشرتی زندگی کی بقاء موقوف ہے اور اگر ان امور کی سرے ہی سے نفی ہو جائے تو معاشرتی حیات کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے اور معاشرہ لحہ بھر کے لئے بھی باقی نہ رہے گا۔ عملی طور پر بھی اس کا ثبوت موجود ہے کہ اگر ان پاکیزہ و اعلیٰ صفات کا سرے ہی سے فقدان ہو اور ہر شخص دوسروں کے حقوق، اموال و ناموس پر ڈاکہ زنی کرنے لگے، کوئی شخص معاشرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے سخاوت و توانگری سے کام نہ لے، کوئی شخص ان قوانین و احکام کی خلاف ورزی کرنے کی پرواہ ہی نہ کرے، کسی کو کسی عاجز و ناتواں اور بے قصور افراد مثلاً بچوں اور ان جیسے کمزور طبقہ سے تعلق رکھنے والے معذوروں کی حالت

زار پر رحم نہ آئے اور ہر شخص ہر کسی سے گفتگو کرنے میں جھوٹ بولے تو اس سب کچھ کا نتیجہ انسانی معاشرہ کی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لہٰذا اس طرح کے نظریات کے حامل شخص کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ صفات انسانی معاشرہ سے نہ کبھی دور ہوتی ہیں اور نہ ہی دور ہو سکتی ہیں کیونکہ طبع انسانی ان سے وابستہ ہے اور جب تک انسان معاشرتی زندگی کا طلبگار رہتا ہے تو ان صفات کی حفاظت و نگہبانی بھی طبع انسانی کی ذمہ داری قرار پائی ہے کہ جسے وہ ادا کرتی ہے، اس حوالہ سے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ان صفات کی صحیح ترتیب و تنظیم اور عملداری کا ایسا نظام بنایا جائے جس سے وہ غرض و ہدف حاصل ہو جائے جو طبعی و تخلیقی طور پر انسان کو سعادت مند زندگی کی راہ پر لاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ عظیم و پاکیزہ صفات موجودہ ترقی یافتہ معاشرے میں انسانی کمالات و فضائل کی صورت میں درست سمت میں قرار پائیں تو معاشرہ فساد و تباہی سے ہرگز دوچار نہ ہوگا بلکہ افرادِ بشر امن و سکون اور سعادت سے بہرہ ور ہوں گے۔

اب ہم اپنے زیر بحث موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام نے ازدواجی زندگی کو اس کے فطری تقاضوں کے عین مطابق قرار دیتے ہوئے نکاح کو حلال اور زنا و فحشاء کو حرام قرار دیا ہے بلکہ ازدواجی تعلق و رشتہ کو اس طرح وضع کیا ہے جس میں معقول بنیاد پر جدائی کی گنجائش موجود ہو اور مخصوص شرائط پر مبنی اس رشتہ کا ایسا نام وضع کیا ہے کہ اس کے ذریعے افزائش نسل اور تربیت کے اہداف کا حصول ممکن ہو، چنانچہ اس حوالہ سے مشہور و معروف حدیث نبوی ﷺ میں اس طرح وارد ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تناكحوا تناسلوا تكثروا'' نکاح کرو، نسل بڑھاؤ اور بنی نوع انسان میں اضافہ کرو' اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے ملاپ کو نسل انسانی کی افزائش کا واحد مؤثر ذریعہ قرار دیا ہے کہ جس سے تخلیق و تکوین کا بنیادی ہدف حاصل ہو سکتا ہے۔

(۲) مردوں کی عورتوں پر برتری کا مسئلہ

حیوانات کے ازدواجی تعلق اور ان میں سے نر و مادّہ کے باہمی جنسی ملاپ کی بے قاعدہ و بے ضابطہ صورت حال پر اچھی طرح غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نر حیوانات مادہ حیوانات پر برتری کا احساس رکھتے ہیں، گویا نر حیوان مادہ حیوان کی شرمگاہ کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے جس سے اپنے آپ کو اس کا مکمل مالک قرار دیتا ہے اور اس پر اپنی برتری کا احساس پیدا کر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ متعدد نر حیوانات، ایک مادہ حیوان سے جنسی تعلق قائم کرنے کے حوالہ سے آپس میں نزاع کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس مادہ حیوان اس طرح نہیں کرتے اور ان میں نر حیوانات سے جنسی ملاپ کی بابت جھگڑا نہیں ہوتا، یعنی جب کوئی نر حیوان کسی مادہ حیوان کی طرف لپکے تو عین ممکن ہے کہ دوسرا نر حیوان بھی اس کی طرف بڑھنے لگے اور پہلے حیوان سے جھگڑا و نزاع کرے لیکن کوئی مادہ حیوان اس طرح کا منظر دیکھ کر دوسرے مادہ حیوان پر حملہ نہیں کرتا بلکہ دور

ہٹ جاتا ہے یہی صورت حال بنی نوع انسان میں پائی جاتی ہے کہ خواستگاری کا عمل مرد انجام دیتا ہے نہ کہ عورتیں، اس کی اصل وجہ اس کے علاوہ نہیں کہ جنسی ملاپ کے حوالہ سے عملی طور پر مرد کو فاعلی برتری حاصل ہوتی ہے جبکہ عورت قبولی کیفیت رکھتی ہے کہ مرد کی چاہت پر سر تسلیم خم کر دیتی ہے۔ البتہ اس کے علاوہ دیگر وہ امور کہ جن میں مرد، عورت کی چاہت کے مطابق کرتا ہے اور اس کی پسند و خواہش کو مقدم کرتے ہوئے اقدام کرتا ہے تو وہ سب عشق و شہوت اور زیادہ لطف اندوز ہونے کے فطری جذبہ کی بناء پر ہوتا ہے، بنا بر ایں اس اطاعت کی اصل و اساس حیوانی شہوانی قوت ہے جبکہ مردانگی برتری فطری و طبعی تقاضہ پر مبنی ہے۔

اور جہاں تک مردوں میں شدت و سختی اور قوت و جذبہ برتری جبکہ عورتوں میں نرمی و قبولی کیفیت کا تعلق ہے تو یہ ایسے حقائق ہیں جو کم و پیش ہر قوم و ملت اور دین و مذہب کے پیروکاروں کے ہاں قابل قبول بلکہ مسلمہ عقائد میں شامل ہیں یہاں تک کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں مرد اور عورت کے الفاظ ضرب المثل قرار پا گئے ہیں مثلاً ہر طاقتور آدمی اور نا قابل شکست چیز کو ''مرد'' جبکہ ہر نرم شخص اور آسانی سے قبولی کیفیت کی حامل چیز کو ''عورت'' سے موسوم کرتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: حدید ذکر (لوہا مرد ہے) سیف ذکر (تلوار مرد ہے) نبات ذکر (گھاس مرد ہے) مکان ذکر (جگہ مرد ہے) وغیرہ، تو اس طرح کے استعمالات میں مرد سے تعبیر و تمثیل دنیاوی قوت و شدت کے حوالہ سے ہوتی ہے۔

یہ مسئلہ نوع انسانی کے مختلف معاشروں اور اقوام میں بعض حوالوں سے فرق کے ساتھ عام رائج ہے اور اسلام نے بھی اسے اپنی قانون سازی میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے: ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ'' (مرد، عورتوں پر قیومیت رکھتے ہیں، یہ اس فضیلت کی بناء پر ہے جو خداوند عالم نے ان میں سے بعض کو بعض پر عطا فرمائی ہے) سورۂ نساء، آیت ۳۴، اللہ تعالیٰ نے اس فرمان و دستور کے ذریعے عورتوں پر واجب و لازم قرار دیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ مردوں کی چاہت پر ان کے ساتھ جنسی ملاپ کریں اور ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔

(۳) تعددِ ازواج کا مسئلہ

ایک اور ایک سے زیادہ ازواج کا مسئلہ حیوانات کی مختلف اقسام میں غیر واضح صورت میں پایا جاتا ہے، چنانچہ ان میں سے جن کے درمیان گھریلو معاشرتی ماحول پایا جاتا ہے ان میں ایک بیوی ہوتی ہے جس کا ایک ہی شوہر ہوتا ہے (ایک مادہ حیوان، ایک نر حیوان ہی سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر نر حیوان کا شانہ و آشیانہ سے متعلقہ امور میں مادہ حیوان کا ساتھ دیتا ہے اور اس کی مدد و معاونت کرتا ہے، مثلاً رہائش گاہ کی درستگی و دیکھ

بھال، بچوں کی پرورش و تربیت وغیرہ البتہ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ ان کے درمیان متعلقہ امور کی انجام دہی میں قدرے تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور مختلف طریقوں سے ان کی مشارکت عملی صورت اختیار کرتی ہے مثلاً مخصوص ماحول میں ان کی پرورش و تربیت اور نگہبانی کے انتظامات وغیرہ، جیسا کہ مرغ و مرغی اور کبوتر وغیرہ میں دیکھنے میں آیا ہے۔

یہ تو ہے عام حیوانات کے درمیان پائے جانے والے ازدواجی مسائل کی بات، اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے تو اس کا ایک سے زیادہ شادیاں کرنا قدیم ادوار کی اقوام میں عام رائج تھا مثلاً مصر، ہندوستان، چین، فارس بلکہ روم و یونان میں بھی یہ رواج عام تھا، گاہے ایسا ہوتا تھا کہ وہ ایک زوجہ کے ساتھ متعدد دیگر عورتوں کو اس کا ساتھ دینے کے لئے گھر میں رکھتے تھے تا کہ وہ احساس تنہائی نہ کرے، بلکہ بعض قوموں میں ازدواج کی تعداد شمار سے بالاتر ہوتی تھی اور وہ کسی معین تعداد پر نہیں رکتے تھے مثلاً یہودی اور عرب اقوام، کہ ان کا ایک مرد دس، بیس اور اس سے بھی زیادہ بیویاں رکھتا تھا، یہاں تک کہ بعض تواریخ میں مذکور ہے کہ سلیمان بادشاہ نے کئی سو عورتوں سے شادی کی۔

ایک سے زیادہ عورتوں سے شادیاں کرنے کی رسم و عادت عام طور پر قبیلوں اور قبائلی طرز زندگی کے حامل لوگوں مثلاً دیہات نشینوں و پہاڑوں پر رہنے والوں میں پائی جاتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ گھر کے مالک کو زیادہ افراد اور ساتھیوں کی کثرت مطلوب ہوتی تھی اور وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زیادہ بیٹوں کی خاطر زیادہ شادیاں کرتے تھے تا کہ اس طرح وہ اپنی افرادی قوت حاصل کر کے اپنے خاندانی و قومی دفاع کو مضبوط و یقینی بنا سکیں بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اس طرح اپنی سرداری اور دوسروں پر حاکمیت قائم کر سکیں کیونکہ زیادہ شادیاں کرنے سے اولاد اور رشتہ داروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔

بعض علماء نے تعدد ازواج کے قبائل و دیہات نشینوں میں رائج ہونے کا سبب اور بنیادی عامل ان لوگوں کے کثیر مشاغل اور ان بھاری کاموں کو قرار دیا ہے جو وہ اپنی عام زندگی میں کرتے تھے مثلاً سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا، جانور چرانا (ان کے لئے چراگاہیں بنانا اور ان کی حفاظت و نگہبانی کرنا) زراعت، فصلوں کی آبیاری، جانوروں کا شکار، کھانا پکانا، کپڑا بننا وغیرہ۔

اگرچہ یہ بات فی الجملہ اور کسی حد تک درست اور قرین صحت ہے لیکن ان کے ہاں ثانوی حیثیت رکھتی تھی اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ ان دیہات نشینوں کی نگاہ میں اصل اور حقیقی حیثیت کا حامل امر تھا کہ جس کی بناء پر وہ متعدد شادیاں کرتے تھے، اور یہ بعینہ اسی طرح سے تھا جیسے ان کے درمیان منہ بولے بیٹے بنانا وغیرہ عام رائج تھا کہ وہ بھی ہمارے مذکورہ بالا موضوع ہی کی ایک فرع بنتا ہے۔

اس کے علاوہ زیادہ شادیاں کرنے میں ایک بنیادی عامل و سبب یہ بھی کارفرما تھا کہ عورتوں کی تعداد مردوں کے

مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔اور وہ ہر دور میں مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں، یہ ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں اور نہ ہی اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اور قبائلی زندگی گزارنے والی قوموں میں چونکہ جنگیں اور لڑائی جھگڑے، قتل و غارت اور خونریزیاں زیادہ ہوتی ہیں جن کی وجہ سے مردوں کی تعداد میں کمی جبکہ عورتوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ طبعی و فطری ضرورتیں تعدد ازواج کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں۔

البتہ اسلام نے ایک شادی کرنے کا قانون بنایا اور پھر چار شادیاں کرنے کی اجازت مشروط طور پر دی کہ اگر ان کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھ سکیں اور ان سے مربوط مسائل و مشکلات دور کرنے کی صلاحیت بھی ہو، اس موضوع کی بابت ہم بہت جلد واضح طور پر مطالب بیان کریں گے، اس حوالہ سے خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے۔

سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۸:

O ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ''

(اور ان کے لئے ویسے ہی حقوق ہیں قاعدہ وقانون کے مطابق، جیسا کہ خود ان پر حقوق مقرر کئے گئے ہیں)

تعدِ ازواج پر اعتراضات اور ان کے جوابات

بعض حضرات نے تعدِ ازواج پر چند اعتراضات پیش کئے ہیں جو ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں اور ان کے جوابات بھی دیتے ہیں۔

پہلا اعتراض:۔اس سے معاشرہ میں منفی اثرات ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ اس سے عورتوں کے دل مجروح ہوتے ہیں اور ان کے نسوانی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے، ان کے دلوں میں اپنے شوہر سے محبت و عشق کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور محبت و عشق کی جگہ ان سے انتقام لینے کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ گھر کے امور میں بے توجہی، اولاد کی تربیت میں بے رغبتی اور اپنے مردوں کے ساتھ اسی طرح کا برا سلوک کرنا جس طرح انہوں نے ان پر سوکن ڈال کر کیا اور اپنے فرائض کی عدم ادائیگی کی راہ پر چل پڑتی ہیں، اور پھر جو صورت حال پیدا ہو جاتی ہے اس پر خدا کی پناہ! یعنی زنا و بدکاری عام ہونے لگتی ہے، مال اور عزت و ناموس میں خیانت کے راستے کھل جاتے ہیں، یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

دوسرا اعتراض:۔تعدِ ازواج کا جواز صنف نازک کی عددی کثرت کی بناء پر پیش کیا جاتا ہے جو کہ زمینی حقائق کے قطعی طور پر مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ قوموں اور نسلوں کی مردم شماری سے جو نتیجہ سامنے آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

مردوں اور عورتوں دونوں صنفوں کی تعداد تقریباً برابر ہے، لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ فطرت نے ایک مرد کے لئے ایک عورت مقرر کی ہے اور اس کی خلاف ورزی فطرت کی خلاف ورزی ہوگی۔

تیسرا اعتراض:۔ تعددِ ازواج کے قانون سے مردوں میں جنسی بے راہ روی اور شہوت پرستی کے رجحان کو ہوا ملتی ہے جس سے پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔

چوتھا اعتراض:۔ تعددِ ازواج کے قانون سے معاشرہ میں خواتین کے احترام میں خاطر خواہ کمی واقع ہوتی ہے اور ان کے مقام و منزلت پر پانی پھر جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے چار عورتیں ایک مرد کے برابر ہو جاتی ہیں جو کہ واضح طور پر زیادتی اور کھلم کھلا ناانصافی پر مبنی ہے۔ اور یہ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی متصادم ہے کیونکہ اسلام نے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا ہے جیسا کہ میراث اور شہادت (گواہی) وغیرہ میں قرار دیا گیا ہے، تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک مرد دو عورتوں سے شادی کر سکتا ہے اس سے زیادہ جائز نہیں، لہٰذا چار شادیوں کا قانون اور اجازت دینا عدل و انصاف سے عدول و انحراف ہے کہ جس کی بہر حال کوئی واضح وجہ نہیں۔

یہ چار اعتراضات عیسائیوں اور ان کے ہم خیال لوگوں نے معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے حقوق کی برابری کے دعوے کی بنیاد پر اسلام کے خلاف کئے ہیں۔

اب ہم ذیل میں ان کے جوابات پیش کرتے ہیں:۔

پہلے اعتراض کا جواب

سابق الذکر بحثوں میں ہم متعدد بار بیان کر چکے ہیں کہ اسلام نے انسانی معاشرہ کو احساسات پر مبنی زندگی کی بجائے عقلیات پر مبنی زندگی پر استوار قرار دیا ہے، بنا بر ایں اسلام معاشرہ میں ان اصولوں کی حکم فرمائی و عملداری کو یقینی بنانا چاہتا ہے جو جذبات و احساسات کی بجائے عقل و خرد پر مبنی ہوں، اس سے جذبات و احساسات کی سراسر نفی اور فطرت سلیمہ و عنایات خداوندی کی حکمتوں کی بے اثری کا پہلو ہرگز نہیں نکلتا کیونکہ علم النفسیات کی بحثوں میں یہ بات ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ روحانی صفات اور باطنی جذبات و احساسات میں کمیت و کیفیت کے حوالوں سے فرق پایا جاتا ہے کہ جن کی بازگشت تربیت اور عادات کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اہل مشرق کے ہاں متعدد آداب و رسوم ایسی ہیں جو مذموم کہلاتی ہیں جبکہ اہل مغرب انہیں مذموم نہیں سمجھتے، اسی طرح اس کے برعکس بھی ہے کہ جن عادات و رسوم کو مغرب والے مذموم قرار دیتے ہیں وہ اہل مشرق کے نزدیک مذموم نہیں، اور ہر امت و ملت دوسروں سے عادات و رسومات میں

فرق رکھتی ہے، اور جہاں تک اسلام کی دینی تربیت کا تعلق ہے تو اس میں عورت کو ایسا مقام و مرتبہ دیا گیا ہے جس سے اس کے نفسانی و نسوانی جذبات و احساسات مجروح نہیں ہوتے، البتہ مغربی عورت چونکہ صدیوں سے ''وحدت'' کی عادی ہے اور اسی بات کو نسل در نسل پھیلاتی چلی آ رہی ہے لہٰذا اسکے اندر ایک مخصوص نفسانی احساس پیدا ہو چکا ہے کہ جو تعدد سے متضاد و متصادم ہے، اس کا ثبوت عملی طور پر ان کی وہ پدر مادر آزادی ہے جو موجودہ دور کی تمدن یافتہ قوموں کے درمیان مردوں اور عورتوں میں عام ہو چکی ہے۔

کیا یہ بات حقیقت نہیں رکھتی کہ ان کے مرد اپنی نفسانی خواہشوں اور شہوت رانیوں میں اس قدر مغلوب ہو چکے ہیں کہ انہیں محرم و نامحرم کی تمیز ہی نہیں ہوتی، وہ اپنی جنسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہر عورت سے تعلق قائم کر لیتے ہیں خواہ وہ اپنی ہو یا غیر ہو، باکرہ و غیر شادی شدہ ہو یا بیوہ ہو یا شادی شدہ ہو، انہیں ان معیاروں کی پرواہ تک نہیں ہوتی، یہی حال مغربی عورتوں کا ہو گیا ہے کہ وہ کسی بھی مرد سے جنسی تعلق قائم کرنے کو عار نہیں سمجھتی، اس حوالہ سے ان کی حالت اس قدر ابتر ہو چکی ہے کہ ان کے مردوں اور عورتوں میں ہزاروں میں ایک بھی شاید ایسا نہ ملے جو زنا سے بچا ہوا ہو، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان کا کوئی مرد لواطت جیسے قبیح فعل سے محفوظ نہیں، اس حوالہ سے بہت ہی نادر ایسا کوئی شخص ملے گا جو اس غیر فطری عمل کا مرتکب نہ ہوا ہو، اس ذلت بار صورتحال کا عملی مظاہرہ تو اس وقت دیکھنے میں آیا جب کچھ عرصہ قبل برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا گیا کہ لواطت (ہم جنس بازی) کو قانونی حیثیت دی جائے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ عمل اس قدر عام ہو چکا تھا کہ جس کی روک تھام حکمرانوں کے بس سے باہر ہو گئی تھی، اور ان کے سامنے اسے قانونی تحفظ دینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ تھا، اور اس حوالہ سے ان کی عورتیں بالخصوص باکرہ لڑکیاں اور غیر شادی شدہ خواتین تو اس قدر ہم جنس بازی میں مبتلا ہو چکی تھیں کہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔

ہمیں تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ مغربی عورتیں اپنے شوہروں کی اس حد تک بے غیرتی کا مشاہدہ کرنے کے باوجود خاموش رہتی ہیں اور ان کے دلوں پر نہ تو اس کا کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، اور وہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود ان کے ساتھ زندگی گزارنے پر راضی رہتی ہیں، اسی طرح ان کے مردوں کی غیرت پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ شادی کی پہلی رات اپنی بیوی کو باکرہ نہیں پاتے اور اس کے باوجود اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر راضی ہوتے ہیں اور ان کے دلوں کو اس صورتحال سے ٹھیس نہیں پہنچتی، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ وہ اس حالت پر افسردہ ہونے کی بجائے خوشی اور فخر و مباہات کرتے ہیں اور ان کی بیوی نے جس قدر زیادہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا ہو وہ ان کے لئے مایۂ افتخار ہوتا ہے اس حوالہ سے ان کی سوچ یہ ہے کہ ہماری بیوی کے چاہنے والے کس قدر زیادہ ہیں اور اس کے ساتھ محبت و عشق کرنے والوں کی تعداد سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں ہے، اس سوچ کے حامل مردوں کے درمیان اس طرح کی عورت سے شادی کرنے

کے لئے لڑائیاں بھی ہوتی ہیں اور ہر شخص اسے اپنانے کے لئے اپنی تمام تر کاوشیں بروئے کار لاتا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی جنسی آزادی ان کے درمیان اس حد تک جا پہنچی ہے کہ اب وہ اسے عیب ہی نہیں سمجھتے کہ اس سے نہ توان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے احساسات کو ٹھیس پہنچتی ہے بلکہ صورتحال اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے کہ وہ لوگ اس طرح کی آزادی کے خلاف بات کرنا ہی گوارا نہیں کرتے اور اگر اس پدر مادر آزادی کے خلاف بات کی جائے توان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور وہ اسے ہرگز قبول و برداشت نہیں کر سکتے۔

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ تعدد ازواج یعنی ایک سے زیادہ شادیاں کرنے سے خواتین کی گھریلو کاموں اور امور خانہ داری میں بے رغبتی اور اولاد کی تربیت میں بے توجہی بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں نہایت سستی کا مظاہرہ کرتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک سے زیادہ شادیاں کرنا معاشرے میں زنا اور اخلاق باختگی کے فروغ کا باعث بنتا ہے اور خیانت و دھوکہ دہی کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ تو یہ بات درست نہیں اور تجربات نے اس کے برعکس ثابت کیا ہے۔

تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ صدر اسلام میں ہی تعدد ازواج کا حکم صادر ہوا تو کوئی مؤرخ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسی دور میں اس قانون کی وجہ سے خواتین نے امور خانہ داری اور اولاد کی تربیت جیسے امور میں اپنی ذمہ داریوں میں کمی کی ہو یا اپنے شوہر کے ساتھ تعلقات میں بے رغبتی کا مظاہرہ کیا ہو یا معاشرے میں زنا کاری عام ہوگئی ہو، ہرگز ایسا نہیں بلکہ تاریخ اس کے برعکس ثابت کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ جو عورت کسی مرد کی دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی بنتی ہے وہ اپنی رضا و رغبت کے ساتھ اس طرح کا فیصلہ کرتی ہے خواہ وہ اسلامی معاشرہ میں رہتی ہو یا غیر اسلامی معاشرہ میں زندگی بسر کرنے والی ہو اس حوالہ سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ خواتین اسی معاشرہ ہی سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں، ایسا نہیں کہ ان کے شوہر انہیں کسی دوسرے معاشرہ سے کنیزیں بنا کر لائے ہوں یا ان کے ساتھ دھوکہ کر کے انہیں اپنی زوجیت میں لائے ہوں۔ درحقیقت ان خواتین کا اپنی رضا و رغبت کے ساتھ اس طرح کا فیصلہ کرنا معاشرتی صورتحال کے عین مطابق ہوتا ہے اور علاقائی ماحول سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت طبعی طور پر تعدد ازواج کی مخالف نہیں اور اس کا دل اس سے افسردہ نہیں ہوتا، ہاں اگر کوئی افسردگی و دل برداشتگی ہو تو وہ پہلی بیوی کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ صورتحال کو بگاڑنے کی ذمہ دار ہوتی ہے نہ کہ اپنی مرضی سے دوسری یا تیسری بیوی بننے والی عورت! کیونکہ جو عورت پہلی بیوی بنی ہو وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ کوئی دوسری عورت اس کے گھر میں آئے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے بارے میں خوف کھاتی ہے کہ کہیں اس کا دل دوسری عورت کی طرف زیادہ راغب ہو جس سے وہ اسے اس پر برتری دینے لگے یا دوسری بیوی کی اولاد کو اس کی اولاد سے زیادہ اہمیت دے جس سے اس کی اولاد غمگین ہو، تو اس طرح کے خوف کی وجہ سے پہلی بیوی دوسری عورت پر راضی نہیں ہوتی اور اسے روحانی تکلیف ہوتی ہے نہ یہ کہ طبعی و فطری طور پر تعدد ازواج کی مخالف ہو۔

دوسرے اعتراض کا جواب

مردوں اور عورتوں کا تعداد میں برابر ہونا تعدد ازواج میں حائل نہیں اور نہ ہی تعدد ازواج میں سے کسی طبعی وفطری اصول کی نفی ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:۔

(۱) مسئلہ ازدواج کا تعلق صرف دونوں صنفوں کی تعداد میں برابری سے نہیں، بلکہ اس میں دیگر مختلف ومتعدد عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور گونا گوں اہداف ملحوظ ہوتے ہیں، یعنی ایسا نہیں کہ اگر ایک مرد چار عورتوں سے شادیاں کرے تو تین مردوں کے لئے کوئی عورت باقی نہ ہوگی، ازدواجی مسئلہ میں جو دیگر عوامل موثر ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ''رُشد'' کے مرحلہ کو پہنچ جائیں یعنی وہ سوج بوجھ کی اس حد کو پالیں کہ شادی کے قابل سمجھے جائیں اور اس طرح کی کیفیت عام طور پر لڑکیوں میں لڑکوں کی نسبت جلدی پیدا ہوجاتی ہے بالخصوص ان علاقوں میں جہاں گرمی زیادہ پڑتی ہے تو وہاں لڑکیاں نو برس کو پہنچ جائیں تو شادی کے قابل ہوجاتی ہیں جبکہ لڑکے عام طور پر سولہ برس سے کم عمر تک ایسے نہیں ہوتے (یہی وہ عمر ہے جسے اسلام نے شادی کے لئے موزوں قرار دیا ہے)۔

اس حقیقت کی دلیل ترقی یافتہ قوموں میں رائج عادات سے ملتی ہے چنانچہ بہت ہی کم ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی لڑکی قانونی بلوغ تک پہنچنے سے پہلے اپنا کنوارہ پن باقی رکھ سکے، تو یہ صرف اس لئے ہے کہ ان کی طبع وجودی مردوں کی نسبت بہت پہلے شادی کے لئے تیار ہوجاتی ہے۔ اسی بناء پر اگر ہم مردوں اور عورتوں کی تعداد برابر قرار دیتے ہوئے یہ فرض کریں کہ سولہ سال پہلے ایک لڑکا پیدا ہوا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی، تو لڑکا سولہویں سال کی ابتداء میں شادی کے قابل ہوا جبکہ لڑکی سات سال کو پہنچی تو شادی کے قابل ہوگئی، اس طرح ایک لڑکا دو لڑکیوں کے برابر عمر کی حد کو پہنچنے کے بعد شادی کے قابل قرار پایا، اسی طرح اگر ہم یہ فرض کریں کہ کسی ملک میں ایک لڑکا پچیس برس پہلے پیدا ہوا اور ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی تو لڑکا اس عمر میں کامل رشد کے مرحلہ تک پہنچا جبکہ لڑکی پندرہ برس کی عمر کو پہنچ کر کامل رُشد کو پہنچ گئی، اس طرح بھی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا برابر قرار پائے، اس حساب سے اگر درمیانی مدت ہی کو فرض کرلیں تب بھی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک لڑکے کے مقابلے میں دو لڑکیاں شادی کے لئے آمادگی کے مرحلہ کو پہنچتی ہیں، تو یہ نسبت دونوں صنفوں کی طبع وجودی کی بناء پر سامنے آتی ہے جو کہ فطری تقاضائے وجود ہے۔

(۲) مردم شماری کے حوالہ سے جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی عمریں مردوں کی نسبت زیادہ طولانی ہوتی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورتوں کی وفات بھی مردوں کی وفات کے برابر نہیں ہوگی، اس بات کی تصدیق ان ایام میں شائع ہونے والے بعض جرائد سے ہوتی ہے جس میں فرانس کے ادارۂ مردم شماری کی رپورٹ کے حوالہ

سے لکھا گیا ہے کہ فرانس میں ہر ۱۰۰ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی پیدائش ۱۰۵ ہوتی ہے، اس کے باوجود عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے، اس بناء پر فرانس کی چالیس ملین آبادی میں بیس ملین سے زیادہ مرد ہونے چاہیے، تو عورتوں کی تعداد ایک ملین سات سو پینسٹھ کے برابر ہوگی، اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکوں میں لڑکیوں کی نسبت بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی جسمانی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور ۱۹ سال تک پہنچتے پہنچتے ان میں ۵% سے زائد افراد مر جاتے ہیں اس رپورٹ میں مذکورہ بالا تفصیلی تجزیہ پیش کرنے کے بعد مجموعی تعداد کی کمی کا تلخیصی ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ۲۵ سے ۳۰ سال اور ۶۰ سے ۶۵ سال کی عمر تک پہنچتے ہوئے ایک ملین پانچ لاکھ عورتوں کے مقابلے میں سات سو پچاس ہزار مردوں سے زیادہ کوئی باقی نہیں رہتا۔

(۳) عورتوں کی نسبت مردوں میں تولیدی قوت زیادہ پائی جاتی ہے چنانچہ عام طور پر خواتین پچاس سال کی عمر میں یائسہ ہو جاتی ہیں اور ان میں بچے پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے جبکہ مردوں میں اس سے کہیں زیادہ عمر تک تولیدی قوت برقرار رہتی ہے بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مردوں میں یہ قوت زندگی بھر باقی ہوتی ہے جو کہ عموماً ایک سو سال ہوتی ہے اس طرح مردوں کی تولیدی قوت تقریباً اسی سال (۸۰) اور عورتوں کی اس سے نصف یعنی چالیس سال (۴۰) بنتی ہے اب اس تجزیاتی نتیجہ کو سابقہ مطالب کے ساتھ ضمیمہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کارخانہ تخلیق ہی نے طبع وجودی کی بنیاد پر مردوں میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی گنجائش قرار دی ہے۔ لہٰذا یہ بات نہایت بے معنی ہوگی کہ تولیدی قوت تو موجود ہو مگر تولید سے روک دیا جائے اور اس قوت کے استعمال کی ممانعت ہو۔ ایسا کرنا علل واسباب کے جاری وساری نظام کی نفی اور اس سے سراسر متصادم ہے۔

(۴) جنگوں اور لڑائیوں میں انسانی جانوں کے ضیاع میں مردوں کی تعداد عورتوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کی وجہ مردوں میں مقابلہ کی طاقت زیادہ ہوتی ہے اور وہ میدانوں میں اپنی جانوں پر کھیلنے سے دریغ نہیں کرتے اسی وجہ سے قبائل میں تعدد ازواج کے سلسلے عام اور بہت زیادہ ہیں۔ لہٰذا اپنے شریک حیات سے محروم ہو جانے والی خواتین کے لئے تین راستوں کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا، یا وہ کسی شادی شدہ مرد سے رشتۂ ازدواج قائم کریں، یا حرام میں مبتلا ہو جائیں اور یا پھر اپنے طبعی وفطری جذبات وتقاضوں کو اپنے اندر ہی اندر دبا دیں، اس حقیقت کا ثبوت کچھ عرصہ قبل جرمنی میں ہونے والے اس احتجاجی مطالبہ سے ملتا ہے جس میں بیوہ خواتین نے اپنے بے شوہر ہونے کا حوالہ دے کر حکومت سے اس سلسلہ میں ٹھوس اقدامات کرنے کا کہا اور مطالبہ کیا کہ انہیں اسلامی قانون کی طرح تعدد ازواج کی اجازت دی جائے تا کہ وہ جس مرد سے چاہیں شادی کر سکیں اور اس طرح ان کے فطری جذبات زندہ رہ جائیں۔ لیکن حکومت نے ان کا مطالبہ نہ مانا اور کلیسائی رہنماؤں نے اسے قبول کرنے سے سراسر انکار کر دیا اور دینی رہنماؤں نے اسلامی قانون کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں معاشرے میں زنا وفحشاء کے عام ہونے اور نسل خراب ہونے کی بھی پرواہ نہ کی۔

(۵) نوع انسانی کی طبع وجودی کے حوالہ سے مردوں اور عورتوں کی تعداد میں برابری کا دعویٰ سابق الذکر تمام مطالب سے قطع نظر، زیر نظر موضوع میں اس وقت درست قرار پاسکتا ہے جب ہر مرد چار شادیاں کرے یا کم از کم ایک سے زیادہ شادی کرے، جبکہ امر واقع یہ ہے کہ نہ کبھی ایسا ہوا اور نہ کبھی ہوگا کیونکہ ہر شخص کی طبع وجودی اس کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی ہر شخص کو اس کے حالات ایسا کرنے دیتے ہیں، اسلام نے جہاں اپنے دیگر احکامات فطرت سلیمہ کے عین مطابق بنائے ہیں وہاں اس سلسلہ میں بھی ان اصولوں کی پاسداری کو یقینی بنایا اور ہر مرد کو چار شادیاں کرنا لازمی قرار نہیں دیا بلکہ صرف انہی افراد کو ایسا کرنے کی اجازت دی جو ان کی متعلقہ ذمہ داریاں پوری کر سکتے ہوں اور دو بیویوں کے درمیان عادلانہ ماحول برقرار رکھ سکتے ہوں، چنانچہ اس حقیقت کا ثبوت کہ اسلام کے اس حکم سے معاشرے میں حرج و مرج پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی اخلاقی خرابیوں کو ہوا ملتی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں اور اسی طرح دیگر اقوام کے درمیان یہ عمل عام رائج ہے اور اس سے کسی طرح کی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی کہ عورتوں کی تعداد میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی ہے بلکہ اس کے برعکس مشاہدہ میں آیا ہے کہ جن قوموں نے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی ممانعت کی ان میں خواتین عائلی زندگی سے محروم ہوئیں اور پھر زنا کے ارتکاب کی طرف رغبت بڑھ گئی اور اسی پر اکتفاء کرنے کی رسم عام ہوگئی۔

(۶) تعدد ازواج پر پیش کیا جانے والا استدلال اس صورت میں قرین صحت قرار پاسکتا ہے جب اس سے پیدا ہونے والی ممکنہ خرابیوں اور مفاسد کا سد باب نہ کر دیا گیا ہو اور اس میں ایسی حدود قیود شامل نہ کردی گئی ہوں جو اس میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا مداوا کرسکیں، چنانچہ اسلام نے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے والے شخص پر یہ شرط عائد کردی ہے کہ وہ بیویوں کے ساتھ معاشرت میں نیک عادلانہ روش اختیار کریں اور شب باشی کی تقسیم میں برابری روا رکھیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ پہلے ان کے نان ونفقہ کا انتظام کریں پھر ان کی اولاد کے اخراجات کا بندوبست کریں، اور یہ ایک امر واقع ہے کہ چار بیویوں اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد کے ساتھ عادلانہ سلوک روا رکھنے کی شرط کو پورا کرتے ہوئے ان کے نان ونفقہ اور بنیادی اخراجات وضرورتوں کو پورا کرنا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں بلکہ صرف وہی افراد ایسا کر سکتے ہیں جو مالی طور پر مضبوط اور ذمہ داریاں پوری کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اس کے علاوہ کئی دینی وشرعی ایسے طریقے موجود ہیں جن کے اپنانے سے بیوی اپنے شوہر کو صرف اسی کے ساتھ زندگی گزارنے اور اس کے علاوہ کسی کی طرف رغبت نہ کرنے کی راہ پر لاسکتی ہے۔

تیسرے اعتراض کا جواب

یہ اعتراض اسلامی تربیتی نظام سے لاعلمی اور شریعت مقدسہ کے مقاصد واہداف سے ناآگاہی پر مبنی ہے کیونکہ

اسلامی معاشرہ میں خواتین کی دینی تربیت جن اصولوں پر قائم ہے ان میں ان کا اپنے آپ کو عفت و پاکدامنی کی چادر سے ڈھانپنا اور شرم وحیاء کی ردا اوڑھے رکھنا بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اسلام نے ان کی تربیت اس طرح سے کی کہ اُن میں شہوت رانی کا رجحان ہی جنم نہ لے بلکہ وہ فطری جذبات کی حدود میں رہتے ہوئے جنسی چاہت کے حوالہ سے مردوں کی نسبت کم رجحان کی حامل ہوں (جبکہ ان کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ وہ مردوں سے زیادہ جنسی چاہت رکھتی ہیں اور اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ان میں ہر وقت اپنے آپ کو بنانے سنوارنے اور خوبصورت و دلکش رکھنے کا طبعی رجحان پایا جاتا ہے) یہ ایسی واضح حقیقت ہے کہ جس میں ان مسلمان مردوں کو ذرا بھر شک نہیں جن کی بیویاں دینی تربیت کے ساتھ پلی بڑھی ہیں اور انہیں اسلامی ماحول میں تربیت پانے کا موقع میسر آیا ہے۔ وہ خواتین شرم وحیاء کی پاکیزہ صفات سے آراستہ و پیراستہ اور عفت و پاکدامنی کے زیور سے اپنے آپ کو مزین رکھتی ہیں، بنابر ایں عمومی طور پر مردوں میں جنسی شہوت کا رجحان ایک بلکہ تین عورتوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اسلام نے طبعی وفطری جذبات وخواہشات اور تقاضوں کو پورا کرنے میں واجب وضروری حد تک ہر مرد کو موقع دیا اور کسی کو اس سے محرومیت کا شکار نہیں ہونے دیا تا کہ اس حوالہ سے وہ اپنی طبعی چاہتوں سے بے بہرہ نہ ہوں اور اپنے جنسی تقاضوں کو پورا نہ کرسکنے کے نتیجہ میں بدکاری اور حرام میں مبتلا نہ ہوجائیں جبکہ عورت مباشرت وجنسی ملاپ کے اوقات میں سے ایک تہائی حصہ محرومیت کا شکار ہوتی ہے یعنی ماہواری کے ایام، حاملگی کے بعض ایام، وضع حمل اور رضاعت کے بعض ایام وغیرہ میں مردوں کی جنسی خواہش کو پورا نہیں کرسکتی، اسی بناء پر اسلام نے مردوں کی جنسی خواہش جو کہ ایک فطری تقاضا ہے اس کو پورا کرنے میں فوری اقدام کرنے پر زور دیا ہے تا کہ خدانخواستہ کسی حرام عمل کی طرف توجہ نہ ہو اور کسی غلط کام کی راہ نہ کھل جائے، اس سلسلہ میں ہم نے سابق الذکر بحثوں میں بارہا اس امر کو بیان کیا ہے کہ دین اسلام معاشرہ کی تشکیل احساسات وجذبات کی بجائے عقل وخرد پر مبنی زندگی پر یقینی بناتا ہے، چنانچہ پدر مادر آزادی کے ساتھ نفسانی خواہشات کے سیلاب میں بہہ جانے والا شخص جذبات واحساسات کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ جاتا ہے کہ اس کی حالت اس نوجوان جیسی ہوجاتی ہے جو اپنی جنسی شہوت کا کاسہ ہاتھ میں لے کر گلی کوچوں میں گداگری کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو کہ اسلام کی نظر میں خطرناک ترین صورتحال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ ومدنظر رہے کہ شریعت اسلامیہ مسلمانوں کی افزائش نسل اور خطۂ ارضی کو اسلامی معاشرہ میں ڈھالنے کے اہم ترین ہدف تک رسائی کو یقینی بنانا چاہتی ہے کہ ایک ایسا پاکیزہ ماحول قائم ہو جس میں شرک اور اخلاقی برائیوں کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

تو یہ وہ نہایت اہم وجوہات اور بنیادی جہات ہیں جن کے حوالہ سے اسلام نے تعدد ازواج کی قانون گزاری کی اور اس میں ہرگز یہ بات مقصود نہیں کہ شہوت رانی کو رواج بخشا جائے اور لوگوں کو جنسی بے راہ روی کا ماحول دیا جائے۔ اگر

تعددِ ازواج کے اسلامی قانون پر اعتراض کرنے والے حضرات انصاف سے کام لیتے تو اسلام پر جو کہ معاشرہ کو اپنی سعادت کی بنیاد پر قائم واستوار دیکھنا چاہتا ہے اعتراض کرنے کی بجائے ان لوگوں کو تنقید کا نشانہ بناتے جنہوں نے معاشرہ کو مادیات کی زنجیروں میں جکڑ کر افرادِ بشر میں اخلاقی برائیاں اور بدکاری ومنکرات کو اس قدر عام کر دیا ہے کہ روحانی ومعنوی اقدار پامال ہو کر رہ گئی ہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ تعددِ ازواج کا قانون مردوں کے جنسی لالچ کا راستہ روکتا ہے اور یہ ایک واضح عملی حقیقت ہے کہ جسے بھی کسی چیز سے روکا جائے وہ اس کے حصول میں بھرپور کوشاں ہوتا ہے کہ جسے عربی زبان میں ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے: ''کل محروم حریص'' (ہر محروم شخص، حریص یعنی جس چیز سے اسے محروم کیا گیا ہو اس کا شدت سے طلبگار ہوتا ہے) اور ''الانسان حریص علی ما منع عنه'' (انسان اپنی ممنوعہ چیز کا حریص ہے) لہٰذا عمومی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز سے محروم وممنوع شخص کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ محرومیت ممنوعیت کے تمام پردے چاک کر دے اور اپنے مطلوب کو حاصل کر کے ہی دم لے، یہی حال مردوں کا ہے کہ اگر انہیں قانونی طور پر ایک سے زیادہ شادیاں کرنے سے روک دیا جائے تو وہ طبعی طور پر اس کی طرف رجحان کرے گا اور اسے کر گزرنے میں اپنی کامیابی سمجھے گا لیکن اگر مسلمان مرد خواہ ایک بیوی رکھتا ہو جس سے اس کی زندگی خوشیوں سے مالا مال ہو اور اس کے باوجود یہ سمجھتا ہو کہ دوسری یا تیسری شادی کرنا اس کے لئے ممنوع نہیں تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنی موجودہ خوشحال زندگی اور اپنی ایک زوجہ سے ہر طرح کی تسکین پانے کی وجہ سے کوئی دوسرا اقدام ہی نہ کرے بلکہ اپنی مالی ومعاشرتی حیثیت کے مطابق فیصلہ کرے لیکن تعددِ ازواج سے عدم ممنوعیت ہی اسے جنسی بے راہ روی اور برائیوں وبدکاریوں کی راہ لینے سے روکنے کے لئے کافی ثابت ہوگی کہ جس سے اس کی نفسانی شدت جذبات پر قابو پانا اس کے لئے ممکن ہوگا، اسی حقیقت کا اعتراف بعض مغربی دانشوروں نے اپنے ان اظہارات میں کیا ہے کہ مسیحی اقوام میں بدکاری وزنا کے عام ہونے میں کلیسا کی طرف سے تعددِ ازواج کی ممنوعیت کے حکم سے بڑا عامل وسبب کوئی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسیحی علماء تعددِ ازواج سے منع نہ کرتے تو عیسائی معاشروں میں زنا وبدکاری کا اس قدر عام ہونا دیکھنے کو نہ ملتا۔

چوتھے اعتراض کا جواب

یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ تعدد ازواج معاشرہ میں عورت کے مقام ومرتبہ میں کمی کا سبب ہے، چنانچہ ہم نے ''اسلام میں عورت کا مقام ومرتبہ'' کے عنوان سے دوسری جلد میں ایک علمی بحث کے تحت تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور یہ ثابت کی

کہ جس قدر دین مبین اسلام نے عورتوں کی عزت و احترام کی پاسداری کو یقینی بنایا اور ان کے معاشرتی حقوق کے تحفظ کا نظام وضع کیا اتنا کسی دوسرے مسلک و مکتب او دین و مذہب و ملت نے نہ زمانۂ قدیم میں اور نہ ہی زمانۂ جدید میں اتنا مقام و مرتبہ اسے عطا کیا۔

اور جہاں تک تعددِ ازواج کے قانون کا تعلق ہے تو وہ خواتین کے اجتماعی و معاشرتی حقوق میں کمی اور ان کی معاشرتی زندگی میں بے احترامی پر مبنی نہیں بلکہ اس میں دیگر اعلیٰ ترین مصلحتیں ملحوظ ہیں کہ جن میں سے بعض کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں اور اس اسلامی دستور العمل کی حمایت میں متعدد مغربی دانشوروں نے جن میں مرد اور عورتیں شامل ہیں واضح اظہارات پیش کئے ہیں اور اس کی ممنوعیت سے جو معاشرتی خرابیاں اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں ان کو بھی کھلے لفظوں میں بیان کیا، جس سے اس قانون کی اہمیت آشکار ہو جاتی ہے، ان دانشواروں کے بیانات و اظہارات کا مطالعہ کر کے اس سے بھرپور آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔

ایک اہم موضوع کی وضاحت

تعددِ ازواج کے اسلامی دستور العمل کی مخالفت کرنے والے مغربی دانشوروں نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اپنے مؤقف و نظریہ کی صحت و درستی کی دلیل کے طور پر مسلمانوں کے ان گھروں کی مثالیں پیش کیں جنہوں نے اس قانون پر عمل کیا اور پھر ان کی زندگیاں مشکلات کا شکار ہو گئیں، ان حضرات نے اس طرح کے واقعات کے ذریعے استدلال کرتے ہوئے ان گھروں کے حالات بیان کئے جن میں دو یا دو سے زیادہ بیویوں والے شوہروں کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی اور وہ اچھے و پرسکون ماحول سے محروم ہو چکے تھے، ان کے گھروں میں ایسا جہنمی ماحول بن جاتا ہے کہ پناہ بخدا، یعنی جوں ہی دوسری یا تیسری بیوی آتی ہے تو گھر کا ماحول یکسر بدل جاتا ہے اور گھر میں حسد کی آگ کے شعلے تمام اہل خانہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور بیویاں ایک دوسرے سے اس قدر مخاصمت و عداوت اختیار کر لیتی ہیں کہ گویا ان میں انسانی اقدار کی پاسداری نام کی کوئی چیز موجود نہیں اور انسانی جذبات کو ہرگز خاطر میں نہیں لایا جاتا بلکہ جن صفات سے صنف نازک کی شناخت وابستہ ہے ان کی جگہ ان کی متضاد صفات آ جاتی ہیں یعنی محبت و پیار، نرمی طبع، رحم دلی، شفقت، خیر خواہی، وفاداری، قلبی لگاؤ اور شوہر اور اس کی اولاد کے ساتھ پیار اور خلوص و اخلاص کے جذبات ختم ہو کر رہ جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں ہنستا بستا گھر اجڑ جاتا ہے اور سکون و اطمینان کا ٹھکانہ روحانی و جسمانی اضطراب کی آماجگاہ بن جاتا ہے یہاں تک کہ پھر وہاں کسی کی جان، مال، عزت و ناموس اور جاہ و جلال محفوظ نہیں ہوتا بلکہ گھر ایک میدانِ جنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ جس میں کوئی چیز اپنی جگہ

برقرار نہیں ہوتی اور زندگی بے لطف ہو جاتی ہے، ایک دوسرے پر سب وشتم، گالی گلوچ، لعن طعن، چغلخوری، الزام تراشی، رقابتیں، دھوکہ وفریب، اولاد کی ایک دوسرے سے لڑائیاں اور اختلافات ودشمنیاں اس حد تک۔ بڑھ جاتی ہیں کہ بیوی شوہر کو اور بچے ایک دوسرے کو قتل کرنے پر تل جاتے ہیں، قرابتیں رقابتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلے اس قدر وسیع ہو جاتے ہیں کہ نسل درنسل عداوتوں ہی عداوتوں کی بنیادیں پختہ ہوتی چلی جاتی ہیں اور پھر ان دشمنیوں اور لڑائیوں۔ کے نتیجہ میں پورا معاشرہ تباہی کا شکار ہو جاتا ہے کہ جس میں بدبختی، اخلاقی برائیاں، سنگدلی، ظلم وناانصافی، فسق وفجور، بدامنی ودہشت گردی اور بداعتمادی عام ہو جاتی ہے اور ان تمام برائیوں کو اس وقت ہوا ملتی ہے جب طلاق کا جواز وکھلی اجازت واختیار بھی مرد کے ہاتھ میں ہو، جو کہ جلتی پر تیل کا کام کرتا ہے، ایک طرف تعدد ازواج اور دوسری طرف طلاق کی کھلی اجازت واختیار، ان دونوں کی وجہ سے معاشرہ ایسے مردوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے جو رنگین مزاج وآوارہ خیال ہوں اور انہیں نفسانی خواہشات کی پیروی کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہوتا کہ پھر وہ ایک کے بعد دوسری عورت کو گھر لانے کی سوچ میں ہی لگے رہتے ہیں، اس سے معاشرہ کا نصف حصہ معاشرتی زندگی کی اعلیٰ قدروں اور سعادتوں سے محرومی کا شکار ہو کر شقاوت وبدبختی کے گہرے کھڈ میں جا گرتا ہے اور وہ خواتین کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا کہ پھر ان کے پاس صورتحال سے دوچار ہونے کے نتیجہ میں دوسرا نصف حصہ بھی فاسد اور تباہ ہو جاتا ہے۔

یہ ہے تعددِ ازواج کے مخالفین کا استدلال، اگرچہ ان کی باتیں حالات کے تناظر میں قرین صحت ہیں لیکن ان امور اور حالات کا تعلق افراد کی ذاتی عملداری سے ہے نہ کہ دین اسلام کی اعلیٰ قانون گزاری سے! یعنی ممکن ہے مسلمانوں میں اس طرح کے حالات ہوں لیکن اس کا اصل اسلام سے کوئی تعلق نہیں، اسلام کو ان حالات کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا، مسلمانوں نے کب اسلام کی اعلیٰ وارفع تعلیمات پر عمل کیا کہ اب ان کے اعمال اسلام کے کھاتے میں ڈالے جائیں؟ مسلمان صدیوں سے اس صالح حکومت سے محرومی کا شکار ہیں جس نے لوگوں کو دینی تربیت کی اعلیٰ تعلیمات سے نوازا اور انہیں پاکیزہ زندگی گزارنے کے زندہ اصول بتائے بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں پر مسلط ہونے والے حکمرانوں اور خلفاء وبادشاہوں نے اسلامی اقدار کی پامالی کا اس حد تک ارتکاب کیا کہ دینی حرمت کے سب پردے چاک کر دیئے اور اسلامی دستورات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی طرح ڈال دی، انہوں نے اسلامی حدود سے تجاوز کیا اور احکام دینیہ کو یکسر باطل وبے اثر کر دیا، عوام الناس تو اسی دین کے پیروکار بن جاتے ہیں جس پر بادشاہوں وحکمرانوں کا عقیدہ ہوتا ہے (الناس علی دین ملوکھم) اگر ہم بادشاہوں اور مسلمان حکمرانوں کے گھروں میں رونما ہونے والے واقعات اور ذلت بار حالات سے بعض نہایت شرمناک اعمال کا تذکرہ وتبصرہ کرنے لگیں اور دینی حکومت کو ملوکیت وبادشاہت میں تبدیل کرنے کے زمانہ سے لے کر اب تک کے حالات وواقعات کا تجزیہ کریں تو ایک مستقل ضخیم کتاب بن سکتی ہے، لیکن ہم اجمالی طور پر بیان کرتے ہیں کہ اگر مذکورہ بالا

حالات اور تلخ و ناگوار واقعات کے متعلقہ پہلوؤں کے حوالہ سے اٹھائے جانے والے اعتراضات درست قرار دیئے جائیں تو وہ سب کے سب مسلمانوں کے اختیار کردہ طرز ہائے زندگی سے تعلق رکھتے ہیں کہ انہوں نے ایسی معاشرتی زندگی اپنائی جس میں ان کی سعادت کی ضمانت نہ تھی اور ایسی سیاسی روش اختیار کی کہ پھر سیدھی راہ سے منہ موڑنے سے محفوظ رہنے کا اختیار ان کے ہاتھ سے نکل گیا، اور اس تمام تر صورتحال میں اصل ذمہ داری اور گناہ و جرم صرف مردوں کا ہے نہ کہ عورتوں اور اولاد کا، اگرچہ ہر شخص خود اپنے کئے کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے، اور یہ سب کچھ مردوں ہی کا کیا دھرا ہے کہ اُنہوں نے اپنی اور اپنے اہل و عیال اور اولاد کی سعادت کو داؤ پر لگا کر اپنے معاشرہ کو برائیوں اور جہالت کی راہ پر لگا دیا جس سے تمام مفاسد اور کبھی ختم نہ ہونے والی شقاوت کے اسباب فراہم ہو گئے اور انسانیت ایک خطرناک و تباہ کن دوراہہ پر پہنچ گئی۔

اور ہم اس حوالہ سے بیان کر چکے ہیں کہ اسلام نے تعددِ ازواج کو لازم و واجب حکم کے طور پر قرار نہیں دیا کہ ہر شخص پر ایسا کرنا ضروری و ناگذیر ہو بلکہ اس دستور العمل کی اصل وجہ افراد بشر کی طبع وجودی اور اس پر طاری ہونے والی کیفیات کی لحاظ داری ہے، اسلام نے اس قانون میں تمام متعلقہ امور کے تناظر میں عائلی زندگی کی بہتری کو ملحوظ قرار دیا کہ جس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے پھر ایک سے زیادہ شادیاں کرنے میں ممکنہ مشکلات اور مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی اجازت کو انسانی معاشرہ کی بہتری سے وابستہ کر دیا اور اسے ایک ایسی شرط کے ساتھ مقید کر دیا کہ جس سے تمام ممکنہ خطرات کا سدباب ہو سکے اور وہ یہ کہ جو شخص ایک سے زیادہ شادیاں کرنا چاہے اسے اپنے اوپر بھرپور وثوق و اطمینان حاصل ہو کہ ازواج کے درمیان عدل قائم رکھ سکتا ہے تو جو شخص اس طرح کا اطمینان رکھتا ہو اور اسے متعلقہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے اسباب میسر آ جائیں اسے ہی دین تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے، لیکن وہ لوگ جو نہ خود اپنی سعادت مندی کا سوچیں اور نہ اپنے اہل و عیال اور اولاد کی فلاح و بہتری کا خیال رکھیں بلکہ ان کا مطمع نظر اپنی ہی مادی و جسمانی خواہشات کو پورا کرنا یعنی اپنا ہی من راضی رکھنا ہو اور وہ عورت کو اپنی شہوت رانیوں اور نفسانی و جنسی تقاضوں کو پورا کرنے کے علاوہ کوئی مقام و منزلت نہ دیتے ہوں اسلام کی نگاہ میں ان کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی اسلام اُنہیں تعددِ ازواج کی اجازت دیتا ہے بلکہ ایک شادی کی اجازت بھی اس شرط پر دیتا ہے کہ وہ اس کی متعلقہ ذمہ داریاں پوری کر سکتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اعتراض کرنے والوں نے تشریع یعنی قانون گزاری اور ولایت یعنی حاکمیت کے اسلامی حوالوں میں خلط ملط کر دیا ہے اور وہ ان دونوں جہتوں اور پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ موجودہ دانشوروں کی نگاہ میں کسی قانون و ضابطہ اور دستور العمل و مروجہ طریقہ کار کی صحت و عدم صحت کا معیار اس کے آثار و نتائج ہیں کہ اگر اس کے آثار اچھے ہوں تو اسے اچھا اور اگر اچھے نتائج حاصل نہ ہوں تو اسے اچھا قرار نہیں دیا جاتا۔ گویا وہ کسی قانون و ضابطہ کے اچھا یا اچھا نہ ہونے کا معیار لوگوں کی پسند و ناپسند کو قرار دیتے ہیں اور

لوگوں کے بارے میں کوئی معیار بھی طے نہیں کہ ان کا علمی وعملی مقام کیا ہو اور وہ کس طرح کے فکری رجحانات کے حامل ہوں، میرے خیال میں اعتراض کرنے والے حضرات اس امر سے غافل نہ ہوں گے کہ معاشرے میں کچھ ایسی عادات ورسوم رائج ہوں جو ہمارے زیر بحث حکم سے موزونیت وہمرنگی نہ رکھتی ہوں اور یہ کہ معاشرہ میں ایسی روش وطرز عمل عام کرنا ضروری ہے جو مذکورہ حکم یا عادات کے منافی نہ ہوتا کہ معلوم رہے کہ معاشرہ کس سمت اور کس منزل کی طرف رواں دواں ہے؟ اور اس کا انجام کار کیا ہوگا، خیر یا شر، نفع یا نقصان؟ البتہ ان حضرات کے نزدیک قوانین کا معیار معاشرہ کی موجودہ چاہت اور ظاہری سوچ کے سوا کچھ بھی نہیں خواہ وہ کچھ بھی ہو! چنانچہ وہ صرف اسی قانون کو صالح ودرست قرار دیتے ہیں جو ان کی چاہتوں کو پورا کرے اور جو ایسا نہ ہو وہ غیر صالح ونادرست ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مسلمانوں کا حال دیکھتے ہیں کہ وہ گمراہی کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی سراسر فسق وفجور اور برائیوں سے بھری ہوئی ہے کہ جس کا کوئی شعبہ فساد سے خالی نہیں تو وہ تمام برائیوں کو ان کے دین وعقیدہ سے جوڑ دیتے ہیں اور ان کے ذاتی اعمال مثلاً جھوٹ، خیانت، بدزبانی، حق تلفی، عائلی تنازعات اور معاشرتی ہرج ومرج وغیرہ کو ان کے درمیان رائج دینی احکام وقوانین سے منسوب کردیتے ہیں اور پھر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ اسلام بھی اسی طرح اپنے قوانین واحکام کی اثرگزاری رکھتا ہے جس طرح دیگر معاشرتی رسوم وعادات لوگوں میں رائج ہوجاتی ہیں حالانکہ وہ رسوم وعادات احساسات کی کوکھ سے جنم لینے والی کیفیات کی بناء پر معاشرے پر مسلط ہوتی ہیں جبکہ اسلام کی اعلیٰ وارفع تعلیمات ودستورات ایسے ہرگز نہیں اور وہ حضرات اپنی غلط فہمی یا غلط اندیشی کی وجہ سے اپنے تئیں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام ہی ان معاشرتی خرابیوں کے وجود میں آنے کا سبب ہے اور مسلمانوں کے درمیان جو ظلم و جور اور ناانصافیاں پائی جاتی ہیں وہ سب اسلام کے احکام کی وجہ سے ہیں جبکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ بدترین ظلم اور نہایت وحشت ناک وسنگین جرائم خود انہی کے ہاں پائے جاتے تھے بلکہ ان کے اپنے معاشروں میں عام رائج تھے لیکن وہ اپنی غلط اندیشی کی وجہ سے اسلام کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اسلام صحیح معنی میں حقیقی دین ہوتا اور اس کے احکام و دستورات لوگوں کی بہتری وسعادت کے ضامن ہوتے تو ان کے آثار افرادِ بشر پر ظاہر ہوتے نہ یہ کہ ان کے لئے وبال جان و مصیبت بنتے!

حق یہ ہے کہ ان کے اظہارات درست نہیں کیونکہ انہوں نے صالح ومصلح حکم اور لوگوں کی فاسد ومفسد طبیعتوں کے درمیان فرق کو سمجھا ہی نہیں بلکہ ان کے درمیان خلط ملط کردیا، اسلام تو اعتقادی واخلاقی معارف اور ایسے عملی دستورات کے مجموعہ کا نام ہے جس کے تمام پہلوؤں میں ہمرنگی اور اجزاء میں پیوستگی پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی جزء کو خراب کردے تو وہ پورے مجموعہ کی خرابی کا موجب ہوگا اور پھر کسی بھی جزء کی اثرگزاری درست سمت میں باقی نہ رہے گی، یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے ادویات اور معجون مرکبات میں ہوتا ہے کہ ان کے تمام اجزاء کی درستی اور ہر ایک کا برمحل قرار پانا ہی انسان کی

صحت و سلامتی کو یقینی بناتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی جزء فاسد ہو جائے یا اسے استعمال کرنے والا شخص اس کے استعمال کی شرائط کو پورا نہ کرے تو وہ دوا و معجون بے اثر ہو گا بلکہ عین ممکن ہے کہ جس مقصد کے لئے اسے بنایا گیا اس کے برعکس اثر کرے۔

ہاں، اگر بالفرض ہم یہ بات تسلیم بھی کرلیں کہ اسلامی نظام و آئین میں خرابیاں و خامیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اصلاحی اقدامات بے نتیجہ ہوئے اور معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ نہ ہوسکا تو پھر ڈیموکریسی کا نظام ان امور میں ہمارے مشرقی معاشرے میں بھی وہ اثر کیوں نہ دکھا سکا جو یورپی ممالک میں اس نے دکھایا؟ چاہیے تو یہ تھا کہ جو کام اسلام نہ کرسکا وہ ڈیموکریسی والے کرلیتے! اس صورتحال کے پیش نظر ایسا کیوں ہے کہ ہم جس قدر ترقی کرتے ہیں اتنا بلکہ اس سے زیادہ پیچھے کی طرف چلے جاتے ہیں اور کسی کو اس حقیقت میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں برائیوں اور اخلاقی فسادات کی شرح حد سے بڑھ چکی ہے اور اس پر قابو پانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے بلکہ برائیوں کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہو رہی ہیں جبکہ ہم اپنے آپ کو تمدن یافتہ اور نئی تہذیب کے راہی و رسیا ہونے کے ساتھ ساتھ روشنی کی دنیا کے مکین کہلاتے ہیں اور نصف صدی کے لگ بھگ طویل عرصہ سے اپنے آپ کو اس طرح کے عنوانات سے پہچنوا رہے ہیں حالانکہ ہم معاشرتی عدل، انسانی حقوق، بلند پایہ اخلاق و اقدار اور عوامی خوشحالی کو زبانی جمع خرچ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے اور ان الفاظ کو معانی و حقائق کا لباس پہنانے کا اہتمام ہی نہیں کرتے یہاں تک کہ ہماری حالت اور عمومی زندگی حیوانات سے بدتر ہو چکی ہے ہم اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہلاتے ہیں مگر عملی طور پر ہماری حالت ابتر ہے تو ڈیموکریسی نظام نے اس ابتری کو ختم کیوں نہیں کیا؟

اگر آپ ہم سے یہ کہیں کہ اس ابتری کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ نے ڈیموکریسی نظام کے اعلیٰ و ارفع دستورات اور اصولوں پر عمل نہیں کیا اور اس کے نہایت عمدہ احکام کو نظر انداز کیا تو ہم یہی بات آپ سے کہیں گے کہ اگر معاشرے کی ابتری کی وجہ آپ کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل نہ کرنا ہے تو اسلامی تعلیمات و دستورات پر عمل نہ کرنے کے آثار کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ کیا معاشرے کی ابتری اسلامی نظام کو عملی طور پر نظر انداز کرنے سے پیدا نہیں ہوئی؟

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اگر فرض کریں کہ (نعوذ باللہ) اسلام ایک کمزور بنیادوں پر قائم نظام ہے جس کی وجہ سے اس نے لوگوں کے دلوں میں جگہ نہ بنائی اور اس کی حکومت و حاکمیت انسانی معاشرہ میں قائم نہ ہوسکی، صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی معاشرہ میں بھی اس کا سکہ نہ جم سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جڑیں کھوکھلی پڑ گئیں اور اس کا نام و نشان مٹ گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ڈیموکریسی پر مبنی نظام کہ جو دوسری عالمی جنگ سے پہلے لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا اور جنگ کے بعد اسے روس سے نکال باہر کر دیا گیا اور اس کی جگہ کمیونزم نے لے لی ایسا کیوں ہوا؟ اور دوسری عالمی جنگ کے بعد کمیونزم کا جال پھیلتا گیا جس سے اکثر جمہوری ممالک میں اس کا پرچم لہرانے لگا مثلاً چین، لیتھوانیا، رومانیہ، پولینڈ، یوگوسلاویہ اور اس طرح کے دیگر ممالک کہ جن میں ڈیموکریسی کا راج تھا وہ سب کمیونزم کے شیفتہ ہوگئے اور پھر ان میں

ڈیموکریسی پر مبنی نظام دفن ہو گیا تو کیوں؟ جبکہ ڈیموکریسی کے تانے بانے اپنے دائرے وسیع کرتے جا رہے تھے!

اور پھر کمیونزم کے ساتھ کیا ہوا؟ تقریباً چالیس سال کا عرصہ گزرا ہی تھا کہ اس کی بساط اُلٹ گئی اور انسانی معاشرہ کے نصف حصہ پر اس کی حکومت کا دھڑن تختہ ہو گیا، چنانچہ اس کے فریفتہ دانشور کہ اس کی قصیدہ خوانی جن کا معمول بن چکا تھا اور وہ اس کی تعریف و ستائش کرتے تھکتے نہیں تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ کمیونزم ہی واحد نظام ہے جو استبداد و استعمار اور ڈیموکریسی کی استحصالی روش سے آلودہ نہیں ہوا، اور اس سے بھی بالاتر یہ کہ کمیونسٹ دانشوار ان ممالک کو اس ''بہشت'' سے تعبیر کرتے تھے جس کا وعدہ دینی نظام دیتے ہیں، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان دانشوروں کے نظریات و آراء میں تبدیلی آ گئی اور انہوں نے اس نظام کے قائد اور واحد سپوت اسٹالین کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور اس طرح کے بیانات جھاڑنے لگے کہ اسٹالین کا تیس سالہ دور حکومت ظالمانہ و استبدادی و استحصالی و استعماری دور تھا، بہرحال اسٹالین نے جو نظام پیش کیا اس کے آثار کا دائرہ کم نہ تھا بلکہ اس کی اثر گزاری قانون سازی اور اس کے نفاذ تک کے تمام شعبوں تک پہنچی ہوئی تھی اور اس کی شخصی حکمرانی کے استبدادی طریقوں نے ہزاروں لوگوں کو زندگی دی اور ہزاروں کو موت کے منہ میں ڈالا، متعدد اقوام کو خوشبخت کہا اور متعدد کو بدبختی سے دوچار کیا، اور خدا ہی جانے اب ان حکمرانوں کا جانشین کون ہوگا اور وہ ان کی کارستانیوں کا سلسلہ کس انداز میں آگے بڑھائے گا جس سے کتنی قومیں بدبختی کا شکار ہوں گی؟

حقیقت یہ ہے کہ عالمی معاشروں میں رائج رسوم و آداب اور طرز ہائے زندگی خواہ صحیح تھے یا غلط ان کی بساطیں الٹنے میں دو اہم عوامل کارفرما تھے۔ ایک حکام کی خیانت کاری اور دوسرا عوام کی عدم توجہی و عملی لاپرواہی، ان حقائق سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے کتب تواریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو اہم معلومات مل سکتی ہیں۔

میں مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں اس امر کی بابت صورتحال پر کیا اظہار خیال کر سکتا ہوں کہ مغربی دانشوروں کی نظروں میں اسلام کے قائم و ثابت و مستقل معاشرتی نظام اور ان کے آئے دن بدلتے بگڑتے نظاموں کے درمیان ان کے نفاذ و اجراء کے حوالہ سے پیش کئے جانے والے عوامل میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ان عوامل کو اسلام کے حوالہ سے قابل قبول قرار نہیں دیا جاتا جبکہ دیگر نظاموں کی بابت تسلیم کر لیا جاتا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ عصر حاضر میں کلمہ حق مغرب کی وحشت ناک حکومتوں اور مشرق کی خوفزدہ و مرعوب ان قوموں کے درمیان دب کر رہ گیا ہے جو مغربی طاقتوں کی اندھی تقلید کرتی ہیں، پس نہ تو کوئی آسمان ہے جو اس پر سایہ افگن ہو اور نہ ہی زمین ہے جو اسے اپنی پشت پر اُٹھائے۔

بہرحال مذکورہ بالا تفصیلی تذکرہ سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ کسی بھی نظام و طرز عمل کا لوگوں میں موثر ہونا یا مؤثر واقع نہ ہونا اور اسی طرح اس کی بقاء و عدم بقاء صرف اور صرف اس کی صحت و درستی اور عدم صحت و نادرستی پر موقوف نہیں

ہوتی کہ اسی کو دلیل قرار دیا جائے بلکہ اس میں دیگر عوامل و اسباب کی عملداری بھی دخیل ہوتی ہے، چنانچہ تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ لوگوں کے درمیان کسی بھی نظام وطرز عمل کا رائج و عام ہونا خواہ جس دور میں کیوں نہ ہو دائمی نہیں ہوتا بلکہ کبھی مطلوبہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور کبھی بے اثر ہوتا ہے، کبھی لوگوں کی نظروں میں با احترام قرار پاتا ہے اور کبھی ان کی نظروں سے گرجاتا ہے، یہ سب کچھ مختلف عوامل و اسباب کی کارگزاری کے نتیجہ میں ہوتا ہے اسی حوالہ سے قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہوا: ''وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ '' (سورۂ آل عمران: آیت ۱۴۰)

خلاصۂ سخن یہ کہ اسلامی قوانین و دستورات لوگوں میں رائج دیگر معاشرتی قوانین سے بنیادی طور پر ہی مختلف ہیں، ان میں حقیقی و اصولی فرق پایا جاتا ہے، اور وہ یوں کہ لوگوں کے مروجہ معاشرتی قوانین ایسے ہیں جن میں وقتاً فوقتاً تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے اور مخصوص مصلحتوں کی بناء پر مختلف صورتوں میں ڈھلتے رہتے ہیں جبکہ اسلامی قوانین جن ٹھوس بنیادوں پر استوار ہیں ان میں اختلاف وتبدیلی واقع نہیں ہوتی یعنی اسلام کے پانچ احکام اپنی اصل حیثیت کے ساتھ قابل عمل ہوتے ہیں کسی واجب، حرام، مستحب اور مکروہ میں اختلاف وتبدیلی واقع نہیں ہوتی، البتہ معاشرے کا ہر فرد ان افعال کو انجام دینے یا ترک کرنے کا حق و اختیار رکھتا ہے اور اپنے عملی فرائض کی ادائیگی میں جس طرح چاہے فیصلہ کرسکتا ہے لیکن والیٔ حکومت کا حق ہے کہ وہ لوگوں کو احکام پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا فرمان دے اور اس سلسلہ میں آخری فیصلہ کرے، گویا اسلامی معاشرہ ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے اور والیٔ حکومت وسربراہ مملکت ہی اس کی فکری وارادی قوت ہے کہ والیٔ امر ہی اسے عمل کرنے یا نہ کرنے کی راہ پر لاتا ہے۔

بنابرایں اگر اسلامی معاشرہ میں ایک حکمران ہو تو وہ لوگوں کو ان مظالم سے روک سکتا ہے جو وہ ''تعدد ازواج'' اور اس طرح کے دیگر قوانین کے نام پر کرتے ہیں اور اس طرح ان ناانصافیوں کا سدباب کرے تا کہ اصل خدائی حکم میں کسی طرح کی تبدیلی نہ آنے پائے، حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازواج کا قانون ایسا خدائی دستور العمل ہے جو بنی نوع بشر کی بہتری کی غرض سے صادر ہوا ہے، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے کوئی شخص اپنے ذاتی وانفرادی حالات کی وجہ سے اس قانون پر عمل نہیں کرتا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ خدائی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے یا اس میں تبدیلی پیدا کرتا ہے بلکہ وہ اس پر عمل نہ کرکے ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک مباح حکم ہے جس کو ترک کرنا اس کے اختیار میں ہے کہ اس سے اس کی حکم عدولی ظاہر نہیں ہوتی۔

تعدد ازواج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علمی بحث

تعدد ازواج کی بحث میں ایک اہم ترین اعتراض جو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ تعدد ازواج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ

سے ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں معترضین کہتے ہیں کہ کہ تعددِ ازواج کا سبب شہوترانی کا غلبہ اور جنسی وخواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کچھ نہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلہ میں اپنی امت کے لئے چار شادیوں کا جو قانون بنایا اس سے تجاوز کر کے نو شادیاں کیں۔

تعددِ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسئلہ قرآن مجید کی مختلف وکثیر آیات مبارکہ سے مرتبط ہے اور اس کے گوناگوں پہلوؤں پر بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر مربوطہ آیت سے متعلقہ امور پر تفصیلی و تحقیقی عمل ہوتا کہ کوئی موضوع تشنہ تکمیل نہ رہ جائے، لہٰذا اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اس تفصیلی بحث کو اس کے موزوں مقام پر موکول کرتے ہیں اور یہاں اس حوالہ سے اجمالی اشارہ کرنے پر اکتفاء کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تعددِ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لب کشائی کرنے والے معترض پر لازم ہے کہ وہ اس امر کو مدنظر وملحوظ رکھے کہ یہ مسئلہ اتنا آسان وسادہ نہیں کہ اس کی بابت کھلے لفظوں میں کہہ دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کی محبت میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ نو شادیاں رچائیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس خاتون کو زوجیت کے لئے اختیار کیا وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ سے خاص حوالہ پر مبنی تھا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے مخصوص حالات اس میں دخیل تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا سے شادی کی اور ان کے ساتھ زندگی کا بیس سال سے زیادہ عرصہ گزارا جو کہ شادی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک کا تقریباً تیسرا حصہ بنتا ہے اور اس میں اعلانِ نبوت کے بعد اور مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت سے پہلے تیرہ برس شامل ہیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں ہجرت فرمائی اور اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی کرتے ہوئے دعوتِ اسلامیہ اور اعلاء کلمہ دین میں سرگرم عمل ہو گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن عورتوں سے شادیاں کیں ان میں باکرہ، بیوہ، جوان، عمر رسیدہ اور نہایت بوڑھی خواتین شامل تھیں، اور یہ سب شادیاں تقریباً دس برسوں میں ہوئیں اور ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی سے شادی نہیں کی، اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان شادیوں میں عورتوں سے محبت وشہوت رانی اور جنسی ہوس پرستی دخیل نہ تھی چنانچہ پہلی سیرت اور آخری صورتحال ایک دوسری سے قطعی مختلف ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ جو شخص عورتوں سے محبت کا رسیا ہو اور اس کے دل ودماغ پر جنسی خواہش کی تکمیل اور صنف نازک کی جنسی ناز برداریوں کا خمار چھایا ہوا ہو وہ زیب وزینت کا فریفتہ، حُسن وجمال پر مر مٹنے والا، جوان عورتوں کی جسمانی نزاکتوں کا اسیر اور رنگین مزاجی کا سرخیل ہوتا ہے جبکہ یہ صفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے ہرگز تطبیق نہیں کرتیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات زندگی ان کی نفی کرتے ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باکرہ کے بعد بیوہ سے اور جوان کے بعد عمر رسیدہ خواتین سے شادیاں کیں چنانچہ عائشہ اور ام حبیبہ جیسی نوجوان بیویوں کے بعد ام سلمہ اور زینب بنت جحش کہ جن کی عمر اس وقت پچاس برس سے زائد تھی سے شادی کی۔

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج کو اپنے ساتھ رہ کر ازدواجی زندگی بسر کرنے اور اچھے انداز میں الگ ہوجانے یعنی طلاق میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق و آزادی دی، اسی طرح اس میں بھی انہیں آزادی دی کہ اگر چاہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتے ہوئے زہد و ترک دنیا اور خود آرائی و بناؤ سنگھار میں سے ایک کو اختیار کریں جیسا کہ اس سلسلہ میں آیت مبارکہ یوں گویا ہے:

سورۂ احزاب، آیت: ۲۸-۲۹

''يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾''

(اے نبی! اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیاوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کی خواہاں ہو تو آؤ میں تمہیں دنیا کے مال و متاع سے بہرہ ور کروں اور پھر خوشی خوشی تمہیں چھوڑ دوں (طلاق دے دوں) اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہو تو اللہ نے تم میں سے نیک عورتوں کے لیے عظیم اجر مقرر کر رکھا ہے)

اس آیت میں ازواج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا و آخرت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق و آزادی دیئے جانے کا تذکرہ ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ازواج کو اس حق آزادی سے باخبر کریں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کی آزادی کسی شہوت پرست اور عورتوں کے ساتھ جنسی روابط قائم کرنے کے رسیا شخص سے موزونیت نہیں رکھتی۔ یعنی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (نعوذ باللہ) عورتوں سے عشق کرنے ہی کے اسیر ہوتے تو اپنی ازواج کو اس طرح کا حق و آزادی نہ دیتے۔

بنا برایں کسی منصف مزاج محقق و دانشور کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعدد ازواج کی بابت اوائل بعثت اور آخری عمر میں ہونے والی شادیوں کے اسباب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شہوت پرستی کا الزام عائد نہ کرتا بلکہ اس کے حقیقی عوامل پر نظر کرتا اور اس کی معاشرتی وجوہات کو مدنظر قرار دیتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے عوامل و اسباب

اگر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے عوامل و اسباب پر نگاہ ڈالیں تو اس میں مختلف خواتین کے ساتھ شادی کرنے میں جو عوامل کارفرما دکھائی دیتے ہیں اُن میں سے بعض یہ ہیں:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض خواتین سے اس لئے شادی کی تاکہ اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی اور توحیدی مشن میں دیگر اقوام کی افرادی قوت کو اپنے ساتھ شریک کار بنا سکیں اور خاندانی قرابتداری کی بنیاد پر انہیں اسلام کے راستہ پر لا کر اپنے

مقدس اہداف تک رسائی کو آسان بنا سکیں، اور بعض خواتین سے دلجوئی اور ان کے قبائلی مخاصمانہ ردِ عمل کا راستہ روک سکیں، بعض خواتین سے ان کی مالی دستگیری و معاشی کفالت کو یقینی بنانے کے لئے شادی کی تا کہ یہ عمل یعنی دوسروں کی معاشی کفالت اور عمر رسیدہ افراد کی معاونت و بے سہاروں کے ساتھ انسانی بنیادوں پر نصرت کی سنت قائم کر سکیں، اور بعض خواتین سے اس لئے شادی کی کہ معاشرے میں پھیلی ہوئی جاہلانہ رسموں کی بیخ کنی کریں جیسا کہ زینب بنت جحش کے ساتھ شادی کرنے میں ہوا اور وہ زید بن حارثہ کی زوجہ تھی جسے زید نے طلاق دی، زید آنحضرت ﷺ کا منہ بولا بیٹا کہلاتا تھا کہ جسے آنحضرت ﷺ نے پالا تھا اور اس معاشرے میں منہ بولے بیٹے کی زوجہ حقیقی و صلبی بیٹے کی زوجہ سمجھی جاتی تھی کہ جس سے باپ شادی نہیں کر سکتا تھا، جب آنحضرت ﷺ نے اس سے شادی کی تو اس کے بارے میں آیات نازل ہوئیں، یہ اس لئے تھا تا کہ زمانہ جاہلیت کی غلط رسومات کو عملی طور پر ختم کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے بعد سودہ بنت زمعہ سے شادی کی جو کہ دوسری ہجرت حبشہ سے واپسی پر بیوہ ہو گئی تھی، اس کا شوہر انتقال کر گیا تھا اور وہ خود ایک مومنہ خاتون تھیں جنہوں نے ہجرت کی تھی، اگر وہ اپنے قبیلہ و خاندان کی طرف واپس چلی جاتی جو کہ سب کے سب کفر کی حالت پر باقی تھے تو وہ اسے یا تو موت کے گھاٹ اتار دیتے، یا نہایت تشدد کا نشانہ بناتے اور یا پھر کفر کی طرف واپس آنے پر مجبور کرتے، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اسے ان مصائب و تکالیف سے نجات دلانے اور امن و امان کی زندگی مہیا کرنے کی غرض سے اس کے ساتھ شادی کی۔

اور زینب بنت خزیمہ کے ساتھ شادی کرنے کا سبب یہ تھا کہ اس کا شوہر عبداللہ بن جحش جنگ احد میں مارا گیا اور وہ زمانہ جاہلیت ہی میں اپنی غریب نوازی و نادار پروری میں معروف تھی جس کی وجہ سے معاشرے میں نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی، چنانچہ وہ اس عظیم صفت کی بناء پر ام المساکین کہلاتی تھیں۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس کے ساتھ شادی کر کے اس کے معاشرتی مقام و منزلت کو تحفظ دیا۔

اور ام سلمہ کے ساتھ شادی کرنے کا سبب یہ تھا کہ ان کا اصل نام "ہند" تھا اور وہ آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد اور رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سلمہ کی زوجہ تھیں اور وہ سب سے پہلی خاتون تھیں جنہوں نے حبشہ کو ہجرت کی، وہ ایک نیک و صالح اور عابدہ زاہدہ و نہایت دیندار خاتون تھیں، ان کے شوہر کے انتقال کے بعد آپ ﷺ نے اس لئے اس سے شادی کی کہ ایک تو یہ کہ وہ عمر رسیدہ خاتون تھیں کہ جن سے عام طور پر شادی کوئی نہیں کرتا اور دوسرا یہ کہ ان کے یتیم بچوں کی دیکھ بھال خود ان کے لئے نہایت مشکل تھی۔

صفیہ حی ابن اخطب کی بیٹی تھیں جو بنی نضیر قبیلہ کے یہودیوں کا سردار تھا اور وہ جنگ میں مارا گیا تھا اسی طرح اُن کا شوہر بھی جنگ خیبر میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا اور وہ جنگی قیدیوں میں شامل تھیں، حضرت رسول خدا ﷺ نے انہیں

اپنی زوجیت کے لیے اختیار کیا اور انہیں آزاد کر کے اس سے شادی کی، اس طرح انہیں اسارت کی ذلت سے بچالیا اور بنی اسرائیل سے قرابتداری کا سلسلہ قائم ہونے کی وجہ سے ان کی ممکنہ سازشوں سے بھی بچ گئے۔

''جویریہ'' کہ جن کا اصل نام ''برہ'' تھا اور وہ یہودی قبیلہ بنی مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں، جنگ بنی مصطلق کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں دوسو کے لگ بھگ عورتیں قید ہوئیں جن میں ''جویریہ'' بھی شامل تھیں، آنحضرت ﷺ نے ان سے شادی کی تا کہ اس قبیلہ کی عورتوں کے ساتھ قرابتداری کا سلسلہ قائم ہوجائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آنحضرت ﷺ کی شادی کے بعد مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ سب رسول خدا ﷺ کی رشتہ دار ہیں لہٰذا ان کا اسیر رہنا مناسب نہیں تو انہیں آزاد کر دیا گیا جس کے نتیجہ میں بنی مصطلق کے تمام افراد نے اسلام قبول کرلیا اور اہل اسلام کے اس نہایت اعلیٰ انسانی رویہ کی وجہ سے سارا قبیلہ دین مقدس کا شیدائی ہوگیا، یہاں تک کہ اس قبیلہ کا کوئی ایک شخص بھی کفر پر باقی نہ رہا بلکہ مسلمانوں کی صف میں شامل ہوگیا، اس قبیلہ کے افراد کی تعداد زیادہ تھی ان کے اسلام لانے کا اثر عرب قبائل میں نہایت اچھا ظاہر ہوا۔

''میمونہ'' کہ جن کا اصل نام ''برہ'' تھا اور وہ حارث ہلالیہ کی بیٹی تھیں، انہوں نے اپنے دوسرے شوہر ابورہم بن عبدالعزیٰ کی وفات کے بعد اپنے آپ کو رسول خدا ﷺ کو بخش دیا اور آپ ﷺ کی کنیزی میں آگئیں، آنحضرت ﷺ نے اُن کے اس پاکیزہ جذبہ کے پیش نظر اُنہیں آزاد کر دیا اور اس کے ساتھ شادی کرلی، اس سلسلہ میں ان کی بابت آیت بھی نازل ہوئی۔

''ام حبیبہ'' جن کا نام رملہ تھا وہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر عبیداللہ بن جحش جب ان کے ساتھ دوسری مرتبہ حبشہ کو ہجرت میں گیا تو اس نے عیسائیت اختیار کرلی مگر ام حبیبہ دین اسلام پر قائم و ثابت قدم رہیں جبکہ ان کا باپ ابوسفیان اسلام دشمنی اور رسول خدا ﷺ کی عداوت میں حد سے تجاوز کر رہا تھا اور آپ ﷺ کے مقابلے میں جنگجو اکٹھے کرنے میں منہمک تھا، آنحضرت ﷺ نے ام حبیبہ کے ساتھ شادی کر کے اُنہیں اپنی حفاظت میں لے لیا اور اس طرح وہ اسلام دشمنی کی خاندانی روایت سے بچ گئیں۔

اور حفصہ بنت عمر کا شوہر خنیس بن حذقہ جنگ بدر میں مارا گیا اور وہ بیوہ ہوگئی تو آنحضرت ﷺ نے اس سے شادی کرلی اور عائشہ بنت ابی بکر سے شادی کی جبکہ وہ کنواری تھی۔

مذکورہ بالا مطالب پر غور کریں اور آنحضرت ﷺ کی پاکیزہ سیرت کا جائزہ لیں کہ کس طرح آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے ابتدائی ایام گزارے اور آخری عمر میں کن حالات سے سامنا ہوا اور آپ ﷺ نے زہد و تقویٰ اور دنیا کی زیب و زینت کو کس طرح ناچیز قرار دیتے ہوئے اپنی اور اپنی عائلی و ازدواجی زندگی کے مراحل طے کئے جس میں اپنی ازواج کو دنیا کی چمک دمک سے مغلوب نہ ہونے کی تاکید کرتے رہے تو پھر کسی طرح کا شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی عام لوگوں جیسی نہ تھی، اس پر مزید یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج کی تعمیر ذات اور زمانہ جاہلیت کی بیہودہ رسموں

میں جکڑی ہوئی صنف نازک کی فطری عظمتیں بحال کرنے اور اُن کی زندگی کے مسلمہ حقوق کی پاسداری کو کس طرح یقینی بنانے میں موثر کردارادا کیا، حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خواتین کی معاشرتی عزت و احترام کا تحفظ کیا اور ہر ممکن ذرائع بروئے کار لا کر عورتوں کو ان کا حقیقی مقام دلانے کی کوشش کی اور ظاہری زندگی کے آخری لمحات میں بھی اس طرح تاکیدی ارشادات صادر فرمائے چنانچہ اس حوالہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''الصلاۃ، الصلاۃ، وما ملکت ایمانکم لا تکلفوھم مالا یطیقون، اللہ، اللہ فی النسآء، فانھن عوان فی ایدیکم ''(نماز، نماز، اور جو کنیزیں تمہاری ملکیت میں ہیں ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو، خدارا، خدارا، خواتین کا خیال رکھنا کہ وہ تمہارے ہاتھوں میں ہیں اور ان کے امور تمہارے اختیار میں ہیں) ملاحظہ ہو سیرت النبی ﷺ، حلبی، جلد ۳ صفحہ ۴۷۳۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج کے درمیانی عدل، حسن معاشرت اور ان کے حقوق کے تحفظ و پاسداری کا جو اعلیٰ طرزِ عمل اپنایا وہ آپ ﷺ ہی کے ساتھ مخصوص تھا (اس سلسلہ میں مزید تفصیلات عنقریب آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے تذکرۂ جمیل میں پیش کی جائیں گی) اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو چار سے زیادہ شادیاں کرنے کی جو اجازت و اختیار دیا وہ اسی طرح سے آنحضرت ﷺ کے مختصات میں شمار ہوتا ہے جس طرح روزۂ وصال کا حکم آپ ﷺ سے مختص ہے یعنی کئی دن تک ایک ہی افطار کے ساتھ روزہ رکھنا جو کہ آپ ﷺ کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں، یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے آپ ﷺ کے دشمن بھی آپ پر تعدد ازواج کی بابت لب کشائی نہ کر سکے جبکہ وہ ہمیشہ کسی ایسے کمزور نکتہ کی تاک میں رہتے تھے کہ آپ ﷺ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جو ان کی زبانیں کھول دے۔

آیات ۷ تا ۱۰

○ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۖ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷

○ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸

○ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹

○ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۚ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰

ترجمہ

○ ”مردوں کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قرابتدار چھوڑ کر جائیں، اور عورتوں کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قرابتدار چھوڑ کر جائیں، خواہ کم ہو یا زیادہ، واجب کیا گیا حصہ ہے۔“

(۷)

○ ”اور جب وراثت کی تقسیم کے وقت قریبی رشتہ دار، یتیم و مساکین آجائیں تو انہیں اس مال میں سے عطا کرو اور ان سے اچھی طرح بات کرو۔“

(۸)

○ ”اور جو لوگ اپنے پیچھے کمزور اولاد کو چھوڑ کر جائیں کہ جن کے بارے میں انہیں ڈر ہو تو انہیں خشیت اختیار کرنی چاہیے، پس وہ تقوائے الٰہی اپنائیں اور ٹھوس بات کریں۔“

(۹)

○ ”جو لوگ یتیموں کے اموال کو ظالمانہ طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور وہ بہت جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں جلیں گے۔“

(۱۰)

تفسیر و بیان

ان آیات سے میراث کے احکام کی قانون سازی کا آغاز ہوا جبکہ اس سے پہلے جو مطالب ذکر کئے گئے وہ سب تمہید و مقدمہ کی صورت میں تھے۔ چنانچہ تمہیدی بیانات میں اجمالی طور پر میراث کے احکام ایک قاعدہ کلیہ کی صورت میں پیش کئے گئے اور وہ یہ کہ ولادت اور قرابت ثابت ہونے کے بعد میراث سے دائمی محرومی کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور زمانہ جاہلیت میں چھوٹے بچوں اور عورتوں کو میراث سے محروم کردیئے جانے کی جو رسم عام تھی وہ درست نہیں، بلکہ وہ میراث میں حصہ دار ہیں، اس قاعدۂ کلیہ کے اثباتی بیان کے ساتھ ساتھ یتیموں کو میراث سے محروم کرنے کی سختی سے ممانعت ہوئی کیونکہ اس سے دیگر وارثوں کو میراث سے محروم کرنے کی ظالمانہ روش کو تقویت ملتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے شدت کے ساتھ اس کی ممانعت کی ہے، میراث کے حکم میں قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب وہ میراث کی تقسیم کے وقت موجود ہوں تو انہیں بھی ازراہِ کرم اس میں سے کچھ دو خواہ وہ حقیقی وارث نہ بھی ہوں۔

والدین اور قرابتداروں کا ترکہ

○ ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ........''

(مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو والدین اور قرابتدار ترکہ چھوڑیں........)

اس آیت میں جو الفاظ مذکور ہیں ان کے معانی یہ ہیں:

(ا) نَصِيبٌ، اس کا معنی حصہ و سہم ہے، اس کی اصل ''نصب'' ہے جس کا معنی قائم کرنا ہے (اسی سے منصوب کرنا آتا ہے) حصہ کو نصیب اس لئے کہا جاتا ہے کہ تقسیم کے وقت ہر حصہ، علیحدہ کردیا جاتا ہے تاکہ دوسرے اموال کے ساتھ مخلوط نہ ہوجائے۔

(۲) ترکہ، اس مال کو کہتے ہیں جو کسی شخص کی وفات کے بعد موجود ہو، گویا مرنے والے نے اسے چھوڑا اور خود دنیا سے کوچ کر گیا، تو یہ لفظ اصل میں بطور استعارہ استعمال ہوا اور رفتہ رفتہ عام ہو گیا۔

(۳) اقربون، نزدیکی قرابتداروں کو کہتے ہیں، قرابتداروں اور نزدیکی رشتہ داروں کے لئے اس لفظ (اقربون) کا استعمال اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ میراث میں اصل معیار وارث کا مرنے والے سے قریبی رشتہ ہے، اس کی تفصیلات عنقریب آیت: ۱۱ (اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ لَکُمۡ نَفۡعًا) میں ذکر کی جائیں گی۔

(۴) فرض، اس کا معنی کسی سخت چیز کو توڑنا اور اس کے حصے بخرے کرنا ہے، اسے "وجوب" کے معنی میں بھی اسی مناسبت سے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس کام کا انجام دینا اور حکم کی فرماں برداری قطعی و یقینی اور اس طرح واضح و معین ہوتی ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں پایا جاتا، لہٰذا فرض کئے گئے حصہ (النصیب المفروض) سے مراد یقینی و معین (المقطوع المعین) ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں ایک عمومی و کلی حکم بیان کیا گیا ہے اور ایک نئی سنت و روش کی قانون گزاری ہوئی ہے کہ جس سے مکلفین کے اذہان غیر مانوس تھے، حقیقت یہ ہے کہ میراث کے حوالہ سے جس طرح اسلام نے قانون گزاری کی اس سے پہلے اس کی مثال موجود نہ تھی بلکہ معاشرتی عادات و رسوم تو اس طرح لوگوں کے درمیان رائج ہو چکی تھیں کہ وہ کئی وارثوں کو ان کے حق سے محروم کر دیتے تھے اور محرومی کے خلاف احتجاج کرنا تو بجائے خود اس کے بارے میں کوئی بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اور اگر کوئی اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تو اس پر برس پڑتے تھے۔ یہ سب کچھ ان کی جھوٹی انانیت اور غلط و بے بنیاد جذبات کے باعث ہوتا تھا، اسی وجہ سے اسلام نے وراثت کی قانون گزاری سے پہلے مؤمنین کے درمیان باہمی ایثار کو فروغ دینے اور اللہ سے محبت کو دلوں میں مستحکم کرنے کو یقینی بنانے کا اہتمام کیا اور اہل دین کے درمیان اخوت و برادری کا رشتہ قرار دیا، پھر دو بھائیوں کے درمیان وراثت کا قانون بنایا جس سے زمانۂ جاہلیت کا وراثتی نظام منسوخ ہو گیا اور مؤمنین کو بے بنیاد دشمنیوں اور تعصّبات کی خونین روایات سے نجات مل گئی، پھر جب دین کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور لوگ اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے مانوس ہوئے تو قرابتداروں کے درمیان وراثت کا قانون بنا دیا اور ترکہ کی تقسیم کو عادلانہ اصولوں پر استوار کر کے رشتہ داروں کو میراث میں حصہ پانے کا حقدار بنایا کہ جسے مؤمنین کی غیر معمولی و معتد بہ تعداد نے نہایت احسن طور پر اور دل و جان سے قبول کر کے اس کی عملی پاسداری کا دم بھرا۔

اس تمہیدی بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیۂ مبارکہ "لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا تَرَکَ الۡوَالِدٰنِ وَ الۡاَقۡرَبُوۡنَ" کے نہایت واضح و صریح جملے سے ایک قاعدۂ کلیہ سے آگاہی دلاتے ہوئے مربوطہ حکم کی بابت ہر طرح کی غلط فہمی کو دور کر دیا گیا اور اس حوالہ سے کج خیالی کا راستہ روک دیا گیا، یہ حکم مطلق و عام ہے اس میں کوئی قید و شرط نہیں اور نہ ہی اسے کسی خاص حالت

وکیفیت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، اس حکم کا موضوع و مورد یعنی مرد، اس میں بھی عمومیت ہے اور اسے کسی چیز کے ساتھ محدود نہیں کیا گیا مثلاً ایسا نہیں کہ اس میں مردوں کا خاص طبقہ مقصود وملحوظ ہو بلکہ اس میں سے چھوٹے بڑے سب شامل ہیں اور چھوٹوں کو بھی اسی طرح وراثت میں حصہ دار قرار دیا گیا ہے جس طرح بڑوں کو! لہٰذا اس حوالہ سے کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔

مردوں کے بارے میں حکم بیان کرنے کے فوراً بعد عورتوں کی وراثت کا ذکر ہوا اور یوں ارشاد فرمایا: ''وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ'' یہ حکم بھی عام اور ہر طرح کی قید و شرط سے خالی ہے، اس میں کسی طرح کی کوئی تخصیص نہیں پائی جاتی لہٰذا لفظ ''نساء'' میں تمام خواتین شامل ہیں، یہاں یہ مطلب نہایت قابل توجہ ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کی وراثت کے بیان میں یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں: ''مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ'' جبکہ پہلے بیان میں مردوں کے بارے میں یہ الفاظ ذکر کرنے کے بعد اگر ضمیر لا کر پورا جملہ ذکر نہ کیا جاتا تو بات پوری ہو سکتی تھی لیکن بعینہ وہی الفاظ ذکر کئے گئے جو مردوں کے حکم میں مذکور تھے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صراحت و وضاحت کا حق ادا کرتے ہوئے پورا جملہ ذکر کر کے ہر طرح کی محدودیت کی نفی کی گئی اس کے بعد ارشاد ہوا: ''مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ'' (کم یا زیادہ) یہ اصل حکم کی مزید وضاحت کے لئے ہے کہ حصہ کی کمی یا زیادہ ہونا تقسیم میں کسی بے پرواہی کا سبب نہیں ہونا چاہیے، یعنی ایسا نہ ہو کہ اگر کسی کا حصہ کم ہو تو اسے نظر انداز کر دیا جائے یا حقارت سے دیکھا جائے لہٰذا مقدار کو معیار قرار دینا صحیح نہیں۔

پھر فرمایا: ''نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا'' عبارت کے لحاظ سے یہ ''نَصِيبٌ'' سے حال ہے اور اس میں مصدری معنی پایا جاتا ہے، اور معنی کے لحاظ سے تاکید بر تاکید کے لئے ہے جو حصے مقرر کئے گئے ہیں وہی یقینی اور ناقابل تبدیلی ہیں کہ جن میں ایک دوسرے سے مخلوط ہو جانے اور ابہام وغیر واضح صورت کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔

اس آیت کو بعض حضرات نے وراثت کے عمومی حکم وقانون کی دلیل قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے علاوہ دیگر سب کے لئے ہے، اور یہ کہ فرائض یعنی مقررہ واجب حصوں میں عول نہیں ہو سکتا، یاد رہے کہ عول کی اصطلاح خالصۃً فقہی ہے اور اسے میراث کی بحث میں استعمال کیا جاتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جب وارثوں کے حصے موجودہ ترکہ سے زیادہ ہو جائیں تو حصوں میں کمی کر کے سب کو کم دیا جائے، لیکن فقہ اہل بیتؑ میں اس کی نفی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ واجب شدہ حصوں میں عول نہیں ہو سکتا، اس کی تفصیلی بحث فقہی کتب میں موجود ہے۔

قرابتداروں وفقراء کے بارے میں!

○ ''وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى......''

(اور جب تقسیم کے وقت قرابتدار آجائیں......)

آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم کے وقت آجانے اور موجود ہونے سے مراد یہ ہے کہ جب وارث اپنا اپنا حصہ لے رہے ہوں اس وقت قریبی رشتہ دار اور یتیم و مسکین تقسیم کے عمل کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

البتہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب مرنے والا وصیت کر رہا ہو اور رشتہ دار آجائیں یا موجود ہوں تو انہیں بھی کچھ دے دیا جائے، لیکن یہ رائے درست نہیں اور ہم نے جو بیان کیا ہے وہی بظاہر درست معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم کے وقت موجود ہوں۔

یاد رہے کہ یہاں قرابتداروں سے مراد وہ افراد ہیں جو وراثت کی تقسیم میں طبقہ بندی کے حوالہ سے وراثت نہیں پاتے اور وہ مالی طور پر نادار ہوں چنانچہ انہیں یتیموں و مسکینوں کے ساتھ ذکر کرنے سے ان کا نادار ہونا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔ اور عبارت کا لحن و لہجہ و طرز بیان بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ان پر نیکی و احسان اور شفقت و مہربانی کرتے ہوئے کچھ دینے کا حکم دیا گیا ہے جس سے ان کی ناداری کا اشارہ ملتا ہے، اس بناء پر یہ کہا جائے گا کہ فَارْزُقُوْهُمْ (انہیں کچھ دے دو) کا مخاطب میت کے وارث ہیں۔

یہاں یہ مطلب بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ فقہاء و مفسرین نے اس حکم کے بارے میں آپس میں اختلاف رائے کیا ہے کہ آیا یہ واجب حکم ہے یا مستحب ہے یعنی تقسیم کے وقت موجود رشتہ داروں کو کچھ دینا واجب و ضروری ہے کہ اگر نہ دیا گیا تو معصیت ہوگی یا مستحب ہے کہ اگر دے دیں تو ثواب ہوگا؟ یہ خالصۂ فقہی بحث ہے جو ہماری اس کتاب کے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی۔

اس کے علاوہ اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ آیت محکم آیات میں سے ہے یا میراث کی آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہے؟ حالانکہ ان دونوں آیتوں کے درمیان تناقض اور ایک دوسرے کی نفی کا پہلو نہیں پایا جاتا کیونکہ میراث کی آیت میں وارثوں کے واجب شدہ حصوں کا تعین ہوا ہے کہ کس وارث کو کتنا حصہ ملے گا جبکہ زیر بحث آیت وارثوں کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کے بارے میں حکم بیان کرتی ہے خواہ واجبی حکم ہو یا مستحبی کہ جس حصہ کا تعین نہیں ہوا لہٰذا اس کے منسوخ ہونے کی وجہ ہی نہیں بنتی، اور پھر لفظ ''رزق'' خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس سے مراد مستحبی عمل ہے کہ جو شخص وارث نہیں اسے کچھ دینا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور آیت بھی بظاہر اسی مطلب کو بیان کرتی ہے۔

کمزور اولاد کے بارے میں حکم

○ ''وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ''

(اور جو لوگ اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ کر جائیں وہ خشیت اختیار کریں)

یہاں لفظ ''خشیت'' سے مراد وہ قلبی کیفیت واحساس ہے جو کسی ایسی چیز کے رونما ہونے کے خوف سے پیدا ہوتا ہے جو اس کی نظر میں اہم وعظیم اور بھاری ہو۔

لفظ ''سَدِیۡدًا'' کا مصدر ''سداد'' ہے جو کہ کلام کی بابت استعمال ہو تو اس کا معنی اچھا اور صحیح ومناسب کلام ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس آیت کا تعلق ایک حوالہ سے آیۂ مبارکہ ''لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ'' سے ہو، کیونکہ وراثت کے عمومی حکم میں چھوٹے یتیم بچے بھی شامل ہیں، بنا برایں یہ آیت ایک طرح سے ان لوگوں کو خبردار کرنے کے طور پر ہے جو چھوٹے بچوں کو وراثت سے محروم کرتے ہیں، لہٰذا جملہ ''وَلۡيَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا'' (اور انہیں چاہیے کہ صحیح ومناسب بات کریں) سے کنایۃً یہ مراد ہوگا کہ ان کے بارے میں مناسب روش اختیار کی جائے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھتے ہوئے یتیموں کو وراثت کے حق سے محروم کرنے سے اجتناب برتا جائے، گویا یہاں ''قول'' سے مراد ''عمل'' ہے، تو آیت کا یہ معنی ہوگا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، قول سے کنایۃً عمل مراد لینا اس حوالہ سے ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک طرح کی پیوستگی پائی جاتی ہے اور وہ لازم وملزوم کی طرح ہیں چنانچہ اس کی قرآنی مثال یہ ہے: سورۂ بقرہ، آیت: ۸۳ ''وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا'' (اور لوگوں سے اچھی بات کرو۔ اچھی طرح بات کرو) اس آیت میں اچھی روش اور اچھے سلوک وبرتاؤ کو اچھی بات سے تعبیر کیا گیا ہے، اور زیر نظر آیت میں قول سے عمل مراد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قول کو ''معروف'' (اچھے) اور ''لین'' (نرم) اور اس طرح کے الفاظ کے ساتھ توصیف کرنے کی بجائے ''سدید'' کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ قول کو سداد کی صفت سے متصف کرنے سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عقیدہ وعمل کی گنجائش ہے جبکہ دیگر صفات مثلاً اچھا اور نرم وغیرہ سے متصف ہونے میں اس طرح کی گنجائش موجود نہیں ہوتی بلکہ صرف عزت واحترام کا اظہار مقصود وملحوظ ہوتا ہے۔

بہرحال جملہ ''الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوۡا عَلَيۡهِمۡ'' سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایسے کمزور بچوں پر نرمی وشفقت برتنا ملحوظ ہے جن کا کوئی سرپرست نہ ہو کہ جو ان کی کفالت ونگرانی کر سکے اور انہیں معاشرے میں ذلت وبیچارگی سے بچا سکے۔

یہاں نہایت اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ آیۂ مبارکہ میں خوف وڈر کی جو نسبت کمزور اولاد والے والدین کی طرف دی گئی ہے اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ اس سے صرف وہی لوگ مقصود ہیں جن کے ہاں کمزور بچے موجود بھی ہوں کیونکہ اس میں حرف ''لو'' استعمال ہوا ہے جو کہ تمثیلی طور پر ہے یعنی ''لو ترکوا ذریتھم الضعاف'' کی بجائے ''لَوۡ تَرَكُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّيَّةً'' کہا گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک طرح سے تمثیل مقصود ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑے تو وہ یوں کرے، گویا مثال کے طور پر حکم بیان کیا گیا ہے اور ''الَّذِيۡنَ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان صفات کے حامل ہیں یعنی ان میں اعلیٰ انسانی صفتیں پائی جاتی ہیں اور ان کے دل انسانی محبت ورحم دلی اور نرمی وشفقت سے بھرے ہوئے ہیں کہ وہ بے

سہارا اور یتیم و کمزور بچوں کی سرپرستی کرتے ہیں اور ان کی دستگیری عمل میں لاتے ہیں کہ حقیقت میں وہی انسان ہیں بالخصوص وہ اہل اسلام کہ جو اسلامی اخلاق و آداب سے مزین ہیں اور ان کے دلوں میں خدائی عنایات کے نتیجہ میں انسان دوستی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ بنابرایں آیۂ مبارکہ کے معنی کی بازگشت اسی مطلب کی طرف ہوگی کہ گویا یوں کہا گیا ہے: "ولیخش الناس ولیتقوا اللہ فی امر الیتامیٰ فانھم کایتام انفسھم فی انھم ذریۃ ضعاف یجب ان یخاف علیھم ویعتنی بشانھم ولا یضطھروا ولا یھضم حقوقھم " (لوگوں کو چاہیے کہ وہ یتیموں کے بارے میں خشیت اور تقوائے الٰہی اختیار کریں کیونکہ وہ (یتیم بچے) بھی کمزور اولاد کے حوالہ سے ان کے اپنے یتیموں جیسے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ان کے بارے میں خوف کھائیں اور ان کے امور کی بابت اہتمام کریں، ان پر ظلم و زیادتی نہ کریں اور ان کے حقوق پامال نہ کریں) بنابرایں یہ بیان اس طرح سے ہے کہ جو شخص اپنے بچوں کے بارے میں تشویش کا شکار ہو کہ وہ ذلت و بیچارگی میں مبتلا ہو جائیں گے تو اسے اس کا مداوا کرنا چاہیے اور اس کی پیش بندی کا اہتمام و اقدام کرنا چاہیے، سچ تو یہ ہے کہ سبھی اس تشویش کا شکار ہوتے ہیں۔

آیۂ مبارکہ میں لوگوں کو رحم دلی و شفقت داری وغیرہ کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ خشیت و تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ صرف اس لئے ہے کہ لوگوں کو خبردار کیا جائے کہ دوسروں کے یتیموں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہو اور ان کے اموال کو غارت کر کے ان کے حقوق کی پامالی کے مرتکب ہوتے ہو تو اپنے یتیموں کے بارے میں بھی غور کرو کہ یہ سب کچھ ان کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، گویا لوگوں کو متنبہ و آگاہ کیا جا رہا ہے کہ وہ جو زیادتی دوسروں کے یتیموں کے ساتھ کریں وہ خود ان کے یتیموں کی طرف لوٹیں گی اور ان کے یتیموں کے ساتھ بھی اسی طرح کا برتاؤ ہوگا۔

اور جہاں تک جملہ "فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا" کا تعلق ہے تو اس کی بابت بیان ہو چکا ہے کہ "قول" سے مراد بظاہر عملی برتاؤ ہے، البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے رائے و نظریہ اور موقف مراد ہو۔

عمل اور ردِّ عمل کے بارے میں!

یہاں عمل اور ردِّ عمل سے مراد یہ ہے کہ جو شخص کسی یتیم پر ظلم و زیادتی کرتے ہوئے اس کا مال اس سے چھین لے تو وہی سلوک اس کے اپنے یتیموں اور نسل سے ہوگا۔ یہ ایک نہایت پختہ قرآنی حقیقت ہے اور ایک ایسے اصول سے مربوط امر ہے جو کلام الٰہی سے معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اچھے و نیک اعمال اور برے و بد اعمال، وقوع پذیر ہونے والے امور و حوادث سے گہرا تعلق و ربط رکھتے ہیں، اعمال کے احکام کی بابت ہم نے اس حوالہ سے المیزان کی دوسری جلد میں کچھ مربوطہ مطالب

ذکر کئے ہیں اور یہاں ان میں اضافہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ لوگ اجمالی طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اعمال کا پھل پاتا ہے۔ اگر اس کے اعمال نیک واچھے ہوں تو وہ زندگی ہی میں نیکی وخیر پاتا ہے اور اگر اس کے اعمال برے ہوں تو وہ جلد یا بہ دیر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ اس حوالہ سے قرآن مجید میں بعض آیات مبارکہ کا اطلاق عمل کے رد عمل یا جزاء و کیفر کے مسلمہ اصول کو ثابت کرتا ہے اور واضح طور پر اس سلسلہ میں حقیقت الامر کو آشکار کرتا ہے، ملاحظہ ہو۔

سورۂ فصلت، آیت: ۴۶

○ ''مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا''

(جو شخص نیک عمل کرے وہ خود اسی کے لئے ہے وہ اس کا اجر و جزا پائے گا، اور جو شخص برائی کرے تو اس نے خود اپنے اوپر زیادتی کی)۔

سورۂ زلزال، آیت: ۸

○ ''فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۞''

(جو شخص ذرہ بھر نیک عمل کرے وہ اسے دیکھے گا اور جو شخص ذرہ بھر برا عمل کرے وہ اسے دیکھے گا)

سورۂ یوسف، آیت: ۹۰

○ ''قَالَ اَنَا يُوۡسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِىۡ قَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا ؕ اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۞''

(اس نے کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، خداوند عالم نے ہم پر احسان فرمایا ہے کیونکہ جو شخص تقوا اختیار کرے اور صبر سے کام لے تو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا)۔

سورۂ حج، آیت: ۹

○ ''لَهٗ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ''

(اور اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہے)

سورۂ شوریٰ، آیت: ۳۰

○ ''وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ ....''

(اور جو مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے کئے کی وجہ سے ہے......)

ان کے علاوہ متعدد دیگر آیات موجود ہیں جن میں اس امر کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ انسان جو عمل بھی کرے خواہ اچھا ہو یا برا، اس کی جزا یا سزا وہ ضرور پاتا ہے اور دنیا ہی میں اس کا ردِ عمل اس پر آشکار ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر اچھا عمل ہو تو اس کی اچھائی اسے مل جاتی ہے اور اگر برا عمل ہو تو اس کی برائی سے بچ نہیں سکتا۔

یہاں اس امر کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ معاشرے میں ہمیں عملی طور پر جو تجربات حاصل ہوتے ہیں ان کی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں ایک خاص کیفیت سی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی کی اثر گزاری کی بناء پر مذکورہ بالا آیات مبارکہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہر شخص کو اپنے عمل کا ردِ عمل دیکھنا ہی پڑتا ہے، بلکہ بعض آیات اس سے بھی زیادہ وسیع حقیقت کو ثابت کرتی ہیں اور وہ یہ کہ کسی شخص کا اچھا یا برا عمل اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی اولاد و نسل تک جاتا ہے، اس کی قرآنی دلیل ملاحظہ ہو:

سورۂ کہف: آیت ۸۲

○ ''وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ''

(اور جو دیوار تھی وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا اور ان کا باپ نیک آدمی تھا لہٰذا تیرے پروردگار نے چاہا کہ یہ دونوں بالغ ہو کر اپنے خزانہ کو نکالیں، یہ تیرے پروردگار کی رحمت ہے)

اس آیۂ مبارکہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد کی نیکی ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سبب بنی اس کے مقابل ہماری زیر بحث آیۂ شریفہ ہے جس میں والدین کو ان کے اعمال کی بناء پر خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بعد اپنی کمزور اولاد کے بارے میں ڈریں چنانچہ ارشاد ہوا: ''وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ'' (اور وہ لوگ ڈریں کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑیں کہ جن کے بارے میں انہیں اندیشہ لاحق ہو)۔

بنابرایں ردِ عمل ایک وسیع تر اور عمومی تر مسئلہ ہے، اور نعمت یا مصیبت دونوں میں سے جو بھی کسی شخص کو لاحق ہو وہ اس کے اپنے یا اس کے آباء و اجداد کے کئے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

کلامِ الٰہی میں غور و فکر کرنے سے عمل و ردِ عمل کے سبب کی اصل حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ المیزان جلد دوم میں دعا کی بحث کے ضمن میں آیت مبارکہ ''وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۖ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ'' (بقرہ:۱۸۶) (اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں نزدیک ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا کو سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارے) کلام الٰہی سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ انسان کو ملتا ہے وہ اس کی اس دعا کی بناء پر ہوتا ہے جو وہ اپنے پروردگار سے مانگتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جو اعمال انجام دیتا ہے ان کی اثر گزاری سبب و مسبب کے ٹھوس نظام کی عملداری کی راہ ہموار کرتی ہے، اس حوالہ سے قرآنی آیات اس طرح گویا ہیں:۔

سورۂ رحمان، آیت:۲۹

○ ''يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾''

(اس سے آسمانوں اور زمین میں موجود ہر شخص مانگتا ہے ہر دن وہ (اللہ) ایک کام میں ہے)

سورۂ ابراہیم، آیت: ۳۴

○ "وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا"

(اور اس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا ہے جو تم نے اس سے مانگا، اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو ان کا احصار وشمار نہیں کر سکتے ہو)۔

اس آیت میں ارشاد ہوا: "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو انہیں شمار نہیں کر سکتے) اس کی جگہ یہ نہیں فرمایا: "وان تعدوہ لا تحصوہ" (اور اگر تم اسے شمار کرو تو اسے شمار نہیں کر سکتے) یعنی اگر تم اپنی دعاؤں کو شمار کرو تو شمار نہیں کر سکتے کہ تم نے کیا کچھ مانگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی دعاؤں میں ایسے امور بھی تھے یعنی اُنہوں نے جو کچھ مانگا اس میں ایسی چیزیں بھی تھیں جو "نعمت" نہیں تھیں اور چونکہ یہ مقام منت واحسان نعمتیں عطا کرنے کے تذکرہ کا ہے اور کفر ان نعمت پر مذمت وملامت کا مقام ہے لہٰذا آیت مبارکہ میں لوگوں کی مانگی ہوئی بعض چیزوں کے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہوا ہے جو کہ "نعمت" ہے۔

دوسری طرف یہ حقیقت کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ انسان جو کام بھی اپنے فائدہ کے لئے انجام دیتا ہے اور اسے دوسروں کے لئے بھی انجام دیتا ہے وہ کام خواہ خیر ہو یا شر تو اس کا دوسروں کے لئے جو کہ وہ بھی انسانیت میں اس کے ساتھ شریک ہیں اس کام کو پسند کرنا اس کا ثبوت بنتا ہے کہ وہ خود اس کام کو پسند کرتا ہے کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ جس کام کو خود اپنے لئے ناپسند کرتا ہو اور اپنی دعاؤں میں اسے شامل نہ کرتا ہو وہ دوسروں کے لئے انجام دے۔

بنابراین حقیقت یہ ہے کہ تمام کام کہ جو بنی نوع انسان کے افراد انجام دیتے ہیں ان میں "انسانیت" ملحوظ ہوتی ہے لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پر نیکی واحسان کرے تو گویا اس نے وہ نیکی خود اپنے لئے اپنی دعا میں خدا سے طلب کی اور یہ دعا مستجاب بھی ہوتی ہے، اس کا رد ہونا ممکن نہیں کیونکہ اس میں نعمت ہی نعمت ملحوظ ومعمول اور مطلوب ومسئول ہے اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ بُرا سلوک کرے اور اُس پر ظلم ڈھائے تو گویا اس نے خود اپنے لئے اسی برائی کو پسند کیا، یہی حال دوسروں کے یتیموں کے ساتھ اچھا یا برا سلوک کرنے میں ہے کہ گویا اپنے یتیموں کے ساتھ اسی طرح کے سلوک کا خواستگار ہوا ہے اسی حوالہ سے قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۴۸

○ "وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ"

(ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رُخ کرتا ہے، پس تم نیکیوں کی طرف سبقت حاصل کرو)

اس آیت میں نیکیوں میں سبقت لینے کا فرمان اس بناء پر ہے کہ تمہارا ہدف ومنزل "خیر" ونیکی قرار پائے۔

بنی نوع انسان کے افراد کا ایک دوسرے کے ساتھ خون میں اشتراک اور رحم میں یگانگت نسب کا تسلسل یعنی عترت واولاد اور ذریت ونسل کو ایک ہی اکائی میں پرو دیتا ہے لہٰذا اس اکائی کو جو صورتحال لاحق ہو یا کوئی تکلیف ومصیبت وارد ہو تو گویا وہ اس کی اصل پر وارد ہوتی ہے اور اس سے مربوط سب ہی افراد متاثر ہوتے ہیں، رحم کے حوالہ سے مربوطہ مطالب اسی سورۂ مبارکہ کی ابتداء میں ذکر ہو چکے ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح وآشکار ہو جاتی ہے کہ جو شخص کسی بھی دوسرے شخص یا اس کی اولاد سے کوئی سلوک کرے تو لامحالہ اس کا ردِ عمل خود اس پر یا اس کی نسل واولاد پر ظاہر ہو ہی جاتا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کچھ اور ہو! اس استثناء کی وجہ بھی یہ ہے کہ عالم الوجود میں عوامل واسباب کا ایک وسیع ولامحدود سلسلہ پایا جاتا ہے کہ انسان ان سب کو شمار نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان سے کامل آگاہ ہو سکتا ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ ایسے عوامل کارفرما ہوں جو ردِ عمل کی راہ روک دیں کہ ہم ان سے آگاہ نہ ہوں، چنانچہ درج ذیل آیۂ مبارکہ میں انہی پوشیدہ ونامرئی عوامل کی اثر گزاری کا اشارہ پایا جاتا ہے:۔

سورۂ شوریٰ، آیت: ۳۰

○ ''وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؈''

(تم پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ انہی اعمال کا نتیجہ ہے جو تمہارے ہی ہاتھوں انجام پائے اور خدا تمہارے بہت سے اعمال سے درگزر کرتا ہے)

یتیموں کے اموال پر ڈاکہ زنی

○ ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا''

(جو لوگ ظالمانہ طور پر یتیموں کے اموال کھاتے ہیں وہ اپنے شکموں میں آگ ڈالتے ہیں)

اس آیت میں مال کو ''کھانے'' کے الفاظ سے نسبت دی گئی ہے کہ وہ لوگ مال کھاتے ہیں، عام طور پر جب کوئی شخص کوئی چیز کھاتا ہے تو کہا جاتا ہے ''اکلہ'' (اس نے وہ چیز کھائی) اور یوں بھی کہا جاتا ہے: ''اکلہ فی بطنہ'' (اس نے وہ چیز اپنے پیٹ میں کھائی) تو دونوں طرح بیان کیا جاتا ہے۔ البتہ دوسرا بیان زیادہ واضح وصریح ہے۔

یہ آیت، ماقبل آیت کی طرح موضوع کے حوالہ سے آیۂ مبارکہ ''لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ......'' سے مربوط ہے، درحقیقت اس میں وراثت میں یتیموں کا مال کھانے اور ان کے حقوق کو پامال کرنے سے بچنے کی تاکید ہوئی ہے اور لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ میراث میں یتیموں کے حقوق پر ڈاکہ زنی نہ کی جائے، یہ آیت ان آیات مبارکہ میں سے ایک ہے جو تجسم

اعمال پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سلسلہ میں ہم نے سورۂ بقرہ آیۂ مبارکہ "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا......" کی تفسیر میں مربوطہ مطالب ذکر کئے ہیں اور جس مفسر نے کہا ہے کہ "اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا" مجازی طور پر نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت ہے۔ اگر اس کا مطلب ومراد یہی ہو جو ہم نے ذکر کیا ہے تو اس پر کئے جانے والا اعتراض خود بخود دور ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جملہ "يَاْكُلُوْنَ" سے مراد یہ ہے کہ وہ "کھاتے ہیں" یعنی زمانۂ حال ملحوظ ہے کیونکہ جملہ "سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا" کا عطف اس پر ہے یعنی جملہ "يَاْكُلُوْنَ" پر! اور "یصلون" فعل مضارع ہے جس پر حرف سین آیا ہے (سَيَصْلَوْنَ)، اگر اس سے مراد حقیقی معنی میں "اکل" یعنی "کھانا" ہوتا اور وہ بھی زمانۂ مستقبل میں! تو ضروری تھا کہ یوں کہا جاتا: "سیأکلون فی بطونهم ناراً ویصلون سعیراً" (وہ اپنے شکموں میں آگ کھائیں گے اور وہ دوزخ میں جلیں گے) بنابراین حق یہ ہے کہ اس سے مجازی معنیٰ مراد ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ یتیموں کے اموال کھاتے ہیں وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو اپنے شکموں میں آگ ڈالتے ہیں، بظاہر اعتراض کرنے والا شخص تجسم اعمال کے اصل معنیٰ ہی سے غافل ہے اور اس نے اس کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں کہ اگر وہ اسے سمجھ لیتا تو اس طرح کا اعتراض ہرگز زبان پر نہ لاتا۔

اور جملہ "وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا" (اور بہت جلد آگ میں جلیں گے) اُخروی عذاب کی طرف اشارہ ہے، لفظ "سعیر" دوزخ کی آگ کا ایک نام ہے، چنانچہ عربی زبان میں کہا جاتا ہے: صلی النار یصلاها، صلی وصلیًا، اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں شخص آگ میں جل گیا اور اس کی سختی کا نشانہ بنا۔

روایات پر ایک نظر

مجمع البیان کی روایت

تفسیر "مجمع البیان" میں آیۂ مبارکہ "لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ" کی بابت مذکور ہے کہ اس آیت کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ آیت، منسوخ نہیں ہوئی بلکہ آیات محکمات میں سے ہے، اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہ منسوخ ہو چکی ہے، پہلا قول حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے (تفسیر "مجمع البیان" جلد ۳ ص ۱۱)

اور تفسیر قمی (جلد اول صفحہ ۱۳۱) میں مذکور ہے کہ یہ آیت بذریعہ آیت "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ" منسوخ ہو چکی

ہے، لیکن یہ درست نہیں اور اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، چنانچہ ہم نے سابق الذکر مطالب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے واضح ہو چکا ہے کہ یہ آیت وراثت کے عمومی قانون کے بیان پر مشتمل ہے اور اس میں اور میراث کی دیگر آیات محکمات کے درمیان کوئی منافات کا پہلو نہیں پایا جاتا یعنی وہ ایک دوسری کی نفی نہیں کرتیں جس کی وجہ سے اس کے کسی آیت کے ذریعے منسوخ ہونے کی بات کی جائے۔

تفسیر "درمنثور" کی روایت

تفسیر "درمنثور" میں مذکور ہے کہ ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ اس آیت کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ "**ام کلثوم بنت ام کحلة**" یا خود ام کحلہ اور ثعلبہ بن اوس اور سوید کے بارے میں نازل ہوئی جو کہ سب کے سب انصار میں سے تھے اور ان میں سے ایک اس کا شوہر تھا اور دوسرا اس کے بیٹے کا چچا تھا، وہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرا شوہر فوت ہو گیا ہے اور مجھے اور میری بیٹی کو وراثت کے حقوق سے محروم کر گیا ہے، اس وقت اس کے بیٹے کے چچا نے کہا کہ اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ نہ تو اس قدر طاقتور ہے کہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدانِ جنگ میں شریک ہو اور دشمن کو پچھاڑے اور نہ ہی اس کے پاس مال و دولت ہے کہ اس سے کاروبار کرے، ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ یہ آیت نازل ہوئی: "لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ"

(تفسیر "درمنثور" جلد ۲ ص ۱۲۲)

بعض روایات میں مذکور ہے کہ جناب ابن عباس نے کہا: یہ آیت انصار میں سے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی کہ اس کا انتقال ہوا اور اس کی دو بیٹیاں تھیں، اس کے دو چچا زاد بھائی اس کے گھر آئے (چچا زاد بھائیوں کو میراث کے قانون میں "عصبہ" کہا جاتا ہے اس کی بیوہ نے ان دونوں سے کہا کہ وہ اس کی دو بیٹیوں کے ساتھ شادی کر لیں، وہ لڑکیاں خوبصورت نہیں تھیں، لہٰذا انہوں نے ان کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا، وہ یہ معاملہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آئی، اس وقت میراث کی آیات نازل ہوئیں کہ جن میں چچا زاد بھائیوں (عصبہ) کو وراثت سے حصہ نہ پانے کا بیان ہے)، (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ ص ۱۲۲)

البتہ عین ممکن ہے کہ یہ تمام واقعات آیت کے نزول کے اسباب ہوں اور متعدد بار اس سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ کسی آیت کے اسباب نزول کا زیادہ ہونا خارج از امکان نہیں۔

قرابتداروں کے بارے میں!

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیہ مبارکہ ''وَ إِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ .... '' (اور جب وراثت کی تقسیم کے وقت قرابتدار آجائیں ....) کی بابت مذکور ہے کہ اس کے بارے میں دوقول پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ محکم آیات میں سے ہے کہ جو منسوخ نہیں ہوئی۔ اس قول کی نسبت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف دی گئی ہے۔
(تفسیر مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۱۱)

شیبانی نے کتاب نہج البیان میں لکھا ہے کہ یہ قول امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں سے منسوب ہے (بحوالہ تفسیر البرہان، جلد ۱ صفحہ ۳۴۵)

بعض روایات میں مذکور ہے کہ یہ آیت (وَ إِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ ....) میراث سے مربوطہ آیات کے ذریعے منسوخ ہو چکی ہے، لیکن ہم سابق الذکر مطالب میں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ میراث کی آیات کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتیں۔

اموال یتامیٰ کے بارے میں شدید حکم

تفسیر العیاشی میں امام ابوعبداللہ جعفر الصادقؑ اور امام ابوالحسنؑ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ اُنہوں نے ارشاد فرمایا: ''ان اللہ اوعد فی مال الیتیم عقوبتین اثنتین، اما احدیھا فعقوبۃ الآخرۃ بالنار، واما الاخریٰ فعقوبۃ الدنیا، قولہ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا'' اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے اموال پر ڈاکہ ڈالنے کی دو سزائیں مقرر کی ہیں ان میں سے ایک اخروی عقوبت ہے یعنی دوزخ کی آگ میں جلنا، اور دوسری دنیوی عقوبت کہ جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے: ''وَلْيَخْشَ الَّذِينَ .... '' (اور ڈریں وہ لوگ کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ کر جائیں .....) اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ یتیموں کے اموال پر ڈاکہ ڈالتے ہیں وہ اس دن سے ڈریں کہ ان کے یتیموں کے ساتھ بھی اسی طرح کا سلوک کیا جائے گا۔ (تفسیر العیاشی، جلد ۱ ص ۲۲۳)

اس روایت کی مانند کافی میں امام جعفر صادقؑ اور معانی الاخبار میں حضرت امام محمد باقرؑ سے روایات مذکور ہیں
(فروع کافی جلد ۵، ص ۱۳۸، معانی الاخبار بحوالہ اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۳۳۲)

تفسیر العیاشی میں عبدالاعلیٰ (غلام آل سام) سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد

فرمایا: ''من ظلم سلط اللہ علیہ من یظلمہ او علی عقبہ او علی عقب عقبہ ''جو شخص کسی پر ظلم کرے تو اللہ اس پر کسی کو مسلط کر دیتا ہے جو اس پر یا اس کی اولاد پر یا اس کی اولاد کی اولاد پر نسل در نسل ظلم کرتا ہے۔

امامؑ کی بات سُن کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آخر اس کے ظلم کا خمیازہ اس کی اولاد اور نسل در نسل دیگر افراد کیوں بھگتیں؟ امامؑ نے میری لوحِ دل کا مطالعہ کر لیا اور اس سے پہلے کہ میں اپنی زبان پر وہ بات لاؤں، امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک قرآنی حقیقت ہے اور اس سلسلہ میں یہ آیت واضح طور پر بیان فرما رہی ہے: ''وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝''

قتادہ کی ایک روایت

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ عبد بن حمید نے قتادہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اتقوا اللہ فی الضعیفین: الیتیم والمرأۃ، ایتمہ ثم اوصٰی بہ، وابتلاہ وابتلیٰ بہ ''تم دو کمزوروں کے بارے میں تقوائے الٰہی اختیار کرو، یتیم اور عورت، خدا نے اسے یتیم بنایا پھر اس کے بارے میں لوگوں کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی، اسے یتیمی کی مصیبت میں مبتلا کیا اور لوگوں کو اس کے بارے میں امتحان وآزمائش میں ڈالا۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۲۴)

یتیموں کے اموال پر ڈاکہ زنی کی شدت سے مذمت اور اس کے انجام کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے اسناد سے کثیر روایات وارد ہوئی ہیں جن میں اسے گناہانِ کبیرہ اور بہت بڑے جرائم میں شمار کیا گیا ہے۔

آیات ۱۱ تا ۱۴

○ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۱﴾

○ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿۱۲﴾

○ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۳﴾

○ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿۱۴﴾

ترجمہ

○ ''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ، دو عورتوں کے حصوں کے برابر ہے، اگر دو سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ کا ایک تہائی حصہ ہے، اور اگر صرف ایک (بیٹی) ہو تو اس کے لئے ترکہ کا نصف حصہ ہے اور اس کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے ایک چھٹا حصہ (۱/۶) ہے بشرطیکہ اس کے اولاد ہو، اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کے لئے ایک تہائی (۱/۳) ہے، اگر اس کے بھائی موجود ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ (۱/۶) ہے البتہ اس کی وصیت پوری کرنے اور قرضہ ادا کرنے کے بعد ترکہ تقسیم کیا جائے گا۔ تمہارے آباء اور تمہاری اولاد، تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہارے لئے نفع پہنچانے میں زیادہ نزدیک ہے، یہ سب اللہ کی طرف سے مقرر شدہ ہے، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، دانا ہے۔''

(۱۱)

○ ''اور تمہارے لئے تمہاری بیویوں کے ترکہ کا آدھا (نصف) ہے اگر ان کی اولاد نہ ہو، لیکن اگر ان کی اولاد موجود ہو تو تمہارے لئے ایک چوتھائی (۱/۴) حصہ ہے، البتہ یہ تقسیم اس کی وصیت پوری کرنے اور قرضہ ادا کردینے کے بعد عمل میں آئے گی، اور ان کے لئے ایک چوتھائی حصہ (۱/۴) ہے اس ترکہ میں سے جو تم چھوڑ کر جاؤ، اگر تمہاری اولاد نہ ہو، اگر تمہاری اولاد موجود ہو تو تمہاری بیویوں کے لئے تمہارے ترکہ میں سے تمہاری وصیت پوری کرنے اور قرضہ ادا کرنے

کے بعد آٹھواں حصہ (۱/۸) ہے، اور اگر مرنے والا شخص ایسا ہو جس کی میراث کلالہ پائیں یا وہ عورت ہو، اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کو ایک چھٹا (۱/۶) ملے گا، اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی حصہ (۱/۳) میں شریک ہوں گے البتہ وصیت پوری کرنے اور قرضہ ادا کرنے کے بعد! لیکن کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، یہ حکم خدا ہے اور اللہ بہت جاننے والا بردبار ہے۔''

(۱۲)

○ ''یہ خدائی احکام ہیں، جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو وہ اسے بہشت عطا کریگا جس کے نیچے نہریں چلتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

(۱۳)

○ ''جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور احکام خدا سے تجاوز کرے تو خدا اسے دوزخ کی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

(۱۴)

تفسیر و بیان

وراثت کا قرآنی فرمان

○ ''یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ''
(اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ مردوں کے لئے عورتوں کے مقابلے میں دو حصے ہیں)

''یُوْصِیْکُمْ'' کا مصدر ''ایصاء'' ہے (باب افعال) اس کا معنی عہد لینا، حکم کرنا ہے، ''توصیہ'' بھی اسی معنی میں ہے۔

مشہور و معروف لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے: ''الوصیة التقدم الی الغیر بما یعمل بہ مقترنًا بوعظ'' وصیت کا معنی کسی کو کسی کام کی پیشکش کرنا ہے اس پر عمل کرنے کی نصیحت کے ساتھ ساتھ!

آیت مبارکہ میں لفظ ''ابناء'' کی بجائے ''اَوْلَادِ'' ذکر ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک یا دو حصے مرنے والے کے ان بچوں کے لئے مخصوص ہیں جو اس کی بلاواسطہ اولاد ہو، اور جہاں تک اولاد کی اولاد کا تعلق ہے تو ان کا حصہ اسی کے حصہ جیسا ہے جس سے ان کی نسبت ہو، لہٰذا بیٹے کی بیٹی کو دو حصے اور بیٹی کے بیٹے کو ایک حصہ ملے گا بشرطیکہ ان سے پہلے طبقہ والوں میں کوئی موجود نہ ہو، یہی حال بھائیوں کی اور بہنوں کی اولاد کے حصوں کا ہے کہ وہ جس سے نسبت رکھتے ہوں ان کے حصوں کے برابر حصے پائیں گے۔ اور لفظ ''ابن'' (بیٹا) سے بالواسطہ بیٹیوں کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ لفظ ''اب'' (باپ) بلاواسطہ والد کے معنی میں زیادہ وسعت کا حامل ہے، (باپ، دادا وغیرہ سب پر اس کا اطلاق درست ہے)۔

آیت کے ذیل میں جملہ ''اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا'' (تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے، تمہیں معلوم نہیں کہ ان میں سے کون تمہارے لئے زیادہ مفید ہے) ذکر کیا گیا ہے اور لفظ اولاد کی بجائے ''ابناء'' استعمال ہوا ہے، اس میں جو خاص نکتہ ملحوظ ہے اس کے بارے میں عنقریب مربوطہ مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

جملہ ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ '' نہایت لطیف اسلوب بیان پر مشتمل ہے، اس میں عورتوں کو وراثت سے محروم کرنے کی زمانۂ جاہلیت کی مروجہ روایت کو غلط قرار دیئے جانے کا اشارہ پایا جاتا ہے اور عورتوں کے حق وراثت کو معین و متعین صورت میں بیان کرتے ہوئے آگاہ کیا گیا ہے کہ مرد کا عورت سے دگنا حصہ ہے، یا یوں بھی ممکن ہے کہ عورت ہی کے حق کو بیان کرنے کی غرض سے قانون سازی کے ضمن میں مرد کے لئے عورت سے دگنا حصہ ہے، یا یوں بھی ممکن ہے کہ عورت ہی کے حق کو بیان کرنے کی غرض سے قانون سازی کے ضمن میں مرد کے حصہ وحق کا تذکرہ ہوا ہو، گویا اصل مقصود یہ ہو کہ مرد، عورتوں کی طرح وراثت میں حقدار و حصہ دار ہیں لیکن ان کا حصہ عورتوں سے دگنا ہے، اس طرح بنیادی طور پر عورت کی وراثت اصل اور مرد کی وراثت اس کی فرع و مربوط امر کے طور پر ہو، یعنی عورتوں کے حصہ کے تعین میں مردوں کا حصہ بھی بیان کر دیا گیا ہو تا کہ معلوم ہو جائے کہ عورتیں وراثت میں حصہ دار ہیں اور ان کا حق محفوظ و متعین ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یوں بیان کیا جاتا: ''للانثیٰ نصف الذکر '' (عورت کے لئے مرد سے آدھا حصہ ہے)، لیکن اس سے مقصود حاصل نہ ہو سکتا اور نہ ہی سیاق کلام سے موزونیت تحقق پذیر ہوتی۔

یہ بات بعض علماء نے پیش کی ہے جو کہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے، اور ممکن ہے کہ اس مطلب کی مزید تاکید اور تائید و تصدیق اس سے بھی ہو کہ آیت میں واضح و صریح طور پر مستقل صورت میں خواتین ہی کے حق و حصہ کو بیان کرنا مقصود ہو اور مردوں کے حصہ کا بیان ضمنی طور پر ہوا ہو، چنانچہ اس کا ثبوت بعد والی آیت اور سورۂ مبارکہ کے آخر میں ذکر کی جانے والی آیت میں موجود ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جملہ ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ '' دراصل جملہ ''يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ '' کی تفسیر و توضیح کے مقام میں ہے، اور ''الذکر '' اور ''الانثیین '' پر الف ولام، تعریف الجنس کے لئے آیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ ''مرد'' ذاتاً عورت کے مقابلے میں دگنا حصہ پاتا ہے، یعنی ایک مرد ذاتاً دو عورتوں کے برابر حق دار ہوتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب وراثتوں میں مرد اور عورتیں دونوں موجود ہوں، تو وراثت کی تقسیم میں مرد کو عورت کے مقابلے میں دگنا حصہ دیا جائے گا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مرد، دو عورتوں کے برابر ہوتا ہے، اگر صرف حصہ کے تعین میں دونوں صنفوں کی مقدار کا بیان ملحوظ ہوتا تو یوں کہا جاتا: ''للذکر مثل حظی الانثی '' (مرد کے لئے عورت کے حصہ کا دگنا ہے) یا یوں کہا جاتا: ''للذکر مثل حظ الانثی '' (مرد کے لئے عورت کے حصہ جیسا ہے) جبکہ ان دونوں کی اصل ذات کی بنیاد پر وراثت کے حکم کا بیان مقصود ہے کہ ایک مرد، دو عورتوں کے برابر ہے اور اسی بناء پر اسے دو عورتوں کے حصہ کے برابر دیا جائے گا۔ لہٰذا اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے یوں کہا گیا: ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ '' (مرد کے لئے دو عورتوں کے حصہ جیسا ہے) بہر حال اس آیۂ مبارکہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب وارثوں میں مرد اور عورتیں دونوں موجود ہوں خواہ ان کی تعداد جس قدر بھی ہو ان میں سے مرد کو دو حصے اور عورت کو ایک حصہ دیا جائے گا۔

عورتوں کے حصوں کا بیان

○ "فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ"

(اگر دو سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ میں سے دو ثلث ہیں)

یہ جملہ چونکہ "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" کے بعد ذکر ہوا ہے لہٰذا تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کا عطف ایک محذوف جملے کی طرف ہے اور وہ یہ کہ گویا اصل کلام اس طرح سے ہے کہ اگر وارثوں میں مرد اور عورتیں دونوں ہوں تو مرد کے لئے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے لیکن اگر سب کی سب عورتیں ہوں تو ان کا حکم یوں ہوگا۔ معطوف علیہ کا حذف کرنا ادبی استعمالات میں عام ہے چنانچہ اس کی قرآنی مثالیں بھی موجود ہیں، ملاحظہ ہو:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۶

○ "وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ"

(اور تم حج و عمرہ کو مکمل کرو اللہ کے لئے، پس اگر تم محصور ہو جاؤ تو جو قربانی میسر آئے وہ دے دو)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۴

○ "أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ"

(روزہ کے مقررہ دن ہیں، پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے ایام میں گنتی پوری کرے)

پہلی آیت میں جملہ "فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ..." اور دوسری آیت میں "فَمَنْ كَانَ...." کا معطوف علیہ محذوف ہے۔

لفظ "كُنَّ" کی ضمیر کی بازگشت لفظ "اولاد" کی طرف ہوتی ہے کہ جو جملہ "يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ" میں مذکور ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر لفظ "كُنَّ" کی ضمیر کی بازگشت لفظ "اولاد" کی طرف ہوتی ہے تو ضمیر کو مؤنث کیوں لایا گیا ہے جبکہ لفظ "اولاد" مذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حرف "كَانَ" ان افعال میں سے ہے جو اسم اور خبر دونوں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں، یہاں اس کا اسم "اولاد" اور خبر "نساء" ہے، لہٰذا خبر کے مؤنث ہونے کی بناء پر "كُنَّ" استعمال ہوا ہے۔

اور فعل "تَرَكَ" میں ضمیر فاعل کی بازگشت لفظ میت کی طرف ہوتی ہے جو کہ سیاق کلام سے سمجھا جاتا ہے۔

ایک بیٹی کی میراث

○ "وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ"

(اور اگر ایک بیٹی ہو تو اس کے لئے آدھا ترکہ ہے)

لفظ ''كَانَتْ'' کی ضمیر لفظ ''ولد'' کی طرف لوٹتی ہے جو کہ سیاق کلام سے سمجھا جاتا ہے، اور یہاں بھی ''کان'' کی بجائے ''كَانَتْ'' کا استعمال اس بناء پر ہے کہ اس کی خبر مؤنث ہے، کیونکہ لفظ ''ولد'' سے مراد بیٹی ہے لہٰذا ضمیر مؤنث استعمال ہوئی ہے، یعنی اگر ایک بیٹی وارث ہو تو وہ مال کا آدھا لے گی۔

یہاں ایک سوال یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں مال کا لفظ ذکر نہیں ہوا بلکہ صرف یہی کہا گیا ہے ''فَلَهَا النِّصْفُ'' (اس کے لئے آدھا ہے) تو ایسا کیوں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''النِّصْفُ'' پر الف ولام دراصل مضاف الیہ کے عوض میں لایا گیا ہے، لہٰذا مقصود واضح ہو جاتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

آیۂ مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے جبکہ عورتوں کا حصہ بیان نہیں کیا گیا تو عورتوں کے حصہ کی مقدار کا تعین کس طرح ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جملہ ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' ہی سے ان کے حصوں کی مقدار واضح ہو جاتی ہے اور وہ یوں کہ جب معلوم ہو گیا کہ مرد عورتوں سے دگنا حصہ لے گا تو اس بناء پر اگر وارثوں میں مرد بھی ہوں اور عورتیں بھی، تو مال کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، دو حصے مردوں کے لئے اور ایک حصہ عورتوں کے لئے ہوگا، یعنی (۱/۳) عورتوں کو دیا جائے گا اور (۲/۳) مردوں کو ملے گا جو کہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر بنتا ہے۔ یعنی ان کا دگنا!

آیۂ مبارکہ سے اتنا ہی سمجھا جاتا ہے، ممکن ہے اس کے علاوہ بھی کسی مطلب کا استفادہ ہو، کیونکہ یوں بھی کہا جا سکتا تھا: وان كانتا اثنتين فلهما الجميع، کہ اگر وہ دو ہوں تو ان کے لئے سارا مال ہے، لیکن اس طرح کے جملے استعمال نہ ہونا اسی معنی کو متعین کرتا ہے جو سطورِ بالا میں ذکر ہوا ہے اور آیۂ مبارکہ میں صراحۃً بیان کیا گیا ہے کہ اگر دو سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لئے ترکہ میں سے دو ثلث (۲/۳) ہوں گے (فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو عورتوں کے حصوں کی مقدار عمداً ذکر نہیں کی گئی۔

اس کے ساتھ ساتھ تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عملی طور پر اس قانون کا اظہار فرمایا کہ دو عورتیں وارث ہوں تو انہیں دو تہائی ملے گا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وراثت کی تقسیم میں اسی پر عمل کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے ہمارے زمانہ تک علماء اسلام اسی پر عمل کرتے آ رہے ہیں، اس سلسلہ میں کسی نے اختلاف رائے کا اظہار نہیں کیا سوائے جناب ابن عباس کی ایک روایت کے، کہ اس میں اس حوالہ سے مختلف رائے پائی جاتی ہے لیکن اسے مورد عمل قرار نہیں دیا گیا۔

اور دو عورتوں کے حصہ کی مقدار کے صریح طور پر ذکر نہ کئے جانے کی بابت مذکورہ بالا توجیہ و تاویل نہایت احسن ہے، کافی میں کلینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو عورتوں کا حصہ دو ثلث (۲/۳) قرار دیا ہے اور اس کا ثبوت یہ آیہ مبارکہ ہے: ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' (مرد کے لئے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے) اور وہ اس طرح سے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جائے اور ایک بیٹی اور ایک بیٹا چھوڑ جائے تو وہاں ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' کے قانون کے مطابق بیٹا، دو بیٹیوں کے برابر حصہ لے گا، اس بناء پر ترکہ تین حصوں میں تقسیم ہوگا، دو حصے بیٹا اور ایک حصہ بیٹی لے گی، نتیجتاً دو بیٹیوں کا حصہ دو تہائی بنتا ہے، آیہ مبارکہ میں اسی پر اکتفاء ہوئی کہ مرد، دو عورتوں کے حصہ کے برابر لے گا یعنی ایک عورت کا حصہ ایک تہائی، دو عورتوں کا حصہ دو تہائی جبکہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر یعنی دو تہائی ہوگا، (فروع کافی جلد ۷ صفحہ ۷۳) کلینی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کی مانند مشہور مفسر ابو مسلم نے بھی کہا ہے کہ یہ بات جملہ ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' سے ثابت ہوتی ہے لہٰذا علیحدہ بیان کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ اگر وارثوں میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو اور بیٹا، بیٹی کے حصہ کا دگنا لے تو نتیجتاً بیٹی کو ایک ثلث (۱/۳) اور بیٹے کو دو ثلث (۲/۳) ملے گا، اس سے حصوں کی مقدار واضح ہو جاتی ہے۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ علامہ کلینی رحمۃ اللہ علیہ اور ابو مسلم دونوں کے بیانات میں دو عورتوں کے حصہ کی مقدار کے واضح طور پر بیان نہ کئے جانے کی توجیہات موجود ہیں، تاہم ان بیانات میں فہم المعنیٰ کے حوالہ سے جو خامی پائی جاتی ہے اسے ہمارے مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں بآسانی دور کیا جا سکتا ہے۔

ان دو حضرات کے علاوہ دیگر اہل دانش نے بھی اس سلسلہ میں اظہار خیال کیا ہے لیکن اُن کے اظہارات میں وزن نہیں پایا جاتا، مثلاً بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جملہ ''فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ........'' میں دو سے زیادہ بیٹیوں کے حصہ کا بیان مقصود ہے کہ جس سے دو بیٹیوں کا حصہ بھی معلوم ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ کا حصہ بھی! بعض حضرات نے کہا ہے کہ دو بیٹیوں کے حصہ کی مقدار کا تعین اس سورہ کی آخری آیہ مبارکہ سے ہو سکتا ہے جس میں دو بہنوں کا حصہ بیان ہوا ہے چنانچہ اس میں دو بہنوں کا حصہ دو ثلث (۲/۳) ذکر ہوا ہے تو اس سے دو بیٹیوں کا حصہ بھی دو ثلث سمجھا جا سکتا ہے۔ تو اس طرح کے کمزور خیالات و آراء کی نہ تو کوئی قیمت ہے اور نہ ہی وہ قرآنِ مجید کی عظمت و رفعت شان سے مطابقت رکھتی ہیں۔

والدین کی میراث

○ ''وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ....فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ''

(اور والدین میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے...... اور ماں کے لئے چھٹا ہے)

اس آیت میں والدین کی میراث اولاد کی میراث کے ساتھ بیان کی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں میراث پانے والوں کے ایک ہی طبقہ میں شامل ہیں، اور جملہ ''وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ'' کا معنی یہ ہے کہ مرنے والے کے ورثہ میں سے صرف اس کے والدین ہی موجود ہوں۔ اور جملہ ''فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ'' کے بعد جملہ ''فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ'' کا آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ بھائی بہن، میراث کے دوسرے طبقہ میں آتے ہیں یعنی بیٹوں اور بیٹیوں کے بعد ان کی باری آتی ہے کہ بیٹوں اور بیٹیوں کے ہوتے ہوئے بھائی بہن میراث نہیں پا سکتے بھائی بہن کا موجود ہونا ماں کے حصہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے، البتہ اس کے علاوہ وہ خود بیٹوں اور بیٹیوں کی موجودگی میں کوئی حصہ نہیں پا سکتے۔

وصیت و قرضہ کا خصوصی قانون

○ ''مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصِیْ بِهَاۤ اَوْ دَیْنٍ''

(وصیت کے بعد کہ جو اس نے کی ہو یا قرضہ دینا ہو)

وصیت سے مراد وہ استحبابی حکم ہے جو ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ''كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَیْرَا ۖۚ الْوَصِیَّةُ'' (سورۂ بقرہ، آیت:۱۸۰) اگر کسی کا موت کا وقت نزدیک ہو اور وہ مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو بہتر ہے کہ اس میراث کے علاوہ جو خداوند عالم نے ماں باپ کے لئے مقرر کی ہے کچھ زیادہ حصہ ان دونوں کے لئے اور قریبیوں کے لئے مخصوص کرے۔

ممکن ہے یہ سوال سامنے آئے کہ مستحبی عمل کا مقام واجب عمل کے بعد آتا ہے لہٰذا مناسب تو یہ تھا کہ پہلے قرضہ کی ادائیگی کا حکم بیان کیا جاتا جو کہ واجب ہے اور اس کے بعد مستحبی حکم ذکر کیا جاتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ واجب حکم کا مقام مستحب حکم سے مقدم ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ احکام کے بیان میں مستحب حکم پہلے اور واجب حکم اس کے بعد ذکر کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لازم کام (واجب) کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی تاکید مزید کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس کے لازم العمل ثابت ہونے ہی میں کفایت ہوتی ہے جبکہ دیگر کاموں میں تاکید مزید اور شدید بیان ضروری ہوتا ہے اور انہی تاکیدی انداز ہائے بیان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے پہلے ذکر کیا جائے، بنابرایں جملہ ''اَوْ دَیْنٍ'' (یا قرضہ) یقیناً بعد میں ہونا چاہیے۔

اس توجیہ و تاویل پر مبنی بیان کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے اور قابل توجہ بھی ہے کہ آیۂ مبارکہ میں مسئلہ

وصیت کو ''یوصی بھا'' کے الفاظ کے ذریعے توصیفی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور اس لئے ایسا کیا گیا ہے کہ اس کی بابت تاکید ہو جائے، اور اس توصیف کے انداز میں جہاں اصل موضوع کی تاکید ملحوظ و مقصود ہے وہاں یہ بات بھی مدنظر قرار دی گئی ہے کہ ورثہ حضرات، مرنے والے کی عزت و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی وصیت پر عمل کریں اور اس کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کو یقینی بنائیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۰ جو کہ سطور بالا میں ذکر ہو چکی ہے اس کے فوراً بعد ارشاد ہوا: ''فَمَنۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ'' (پس جو شخص وصیت کو اس کے سننے کو بعد تبدیل کردے تو اس کا گناہ انہی پر ہوگا جو اسے تبدیل کریں) سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۱

خاص تاکید اور احتیاط کا حکم

○ ''اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا''

(تمہارے باپ دادا، اور تمہارے بیٹے، تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہارے لئے زیادہ فائدہ مند ہے)

آیت میں تمام وارثوں کو مخاطب کیا گیا ہے یعنی تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وہ جو اپنے اموات سے میراث پاتے ہیں اس مطلب کو ملحوظ رکھیں، یہ بیان درحقیقت والدین اور اولاد کی وراثت میں حصوں کے اختلاف کے حوالہ سے مسلمانوں کو آگاہی دلانے کے طور پر ہے کہ جس میں ''لَا تَدۡرُوۡنَ'' (تم نہیں جانتے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس طرح کے الفاظ ہر زبان بولنے والوں کے ہاں عام استعمال ہوتے ہیں۔

اس سے قطع نظر اگر بیان کے اسلوب پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ورثہ کے علاوہ عام لوگ مخاطب قرار پا ہی نہیں سکتے کہ انہیں کہا جائے کہ تم مر جاؤ گے اور اپنے پیچھے اپنے ماں باپ اور اولاد چھوڑ جاؤ گے کہ تمہیں معلوم نہیں ان میں سے کون تمہارے لئے مفید ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جملہ ''لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا'' کہنے کی ضرورت نہ تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ''نفع'' سے مرنے والے کے مال سے وارثوں کا نفع پانا مراد ہے میت کا وارثوں سے نفع پانا مراد نہیں ہے۔ لہٰذا وارثوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ تم میں سے کون پہلے مرے گا اور کون کس سے جلد نفع پائے گا؟۔

آیت مبارکہ میں ''آباء'' کو ''ابناء'' سے پہلے ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ عام طور پر آباء کی میراث ابناء کو پہلے ملتی ہے، اس کی قرآنی مثال درج ذیل آیت میں موجود ہے:

سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۸:

○ ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ''

(بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں)

اس میں صفا کو مروہ سے پہلے ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ طواف کی ابتداء صفا سے ہوتی ہے، اس حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلام کا ارشاد گرامی ہے: ابدأ بما بدأ اللہ (میں اسی سے آغاز کرتا ہوں جس سے اللہ نے آغاز کیا)

وراثت کی تقسیم کا نظام درحقیقت خونی رشتوں اور انسانی عاطفوں و احساسات پر مبنی ہے کیونکہ انسان اپنے والدین کے مقابلہ میں اپنی اولاد سے زیادہ رافت و محبت رکھتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اولاد کو اپنی بقاء کا سبب سمجھتا ہے جبکہ والدین کے حوالہ سے اس طرح کی صورتحال نہیں، بنابرایں آباء، وجودی تعلق کے حوالہ سے اپنی اولاد کے ساتھ زیادہ پیوستگی رکھتے ہیں جبکہ ان کی اولاد سے پیوستگی اس حد تک نہیں ہوتی، اس وجودی پیوستگی کے تناظر میں وراثت کے نظام پر نظر کریں اور اسے میراث میں حصہ پانے والوں کی طبقہ بندی کا معیار قرار دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب کوئی شخص اپنے ''آباء'' سے وراثت پائے تو اس کا حصہ زیادہ ہوگا جبکہ ''ابناء'' سے وراثت پانے میں اس سے کہیں کمتر ہوگا، اگرچہ ابتدائی طور پر اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے لیکن واقع الامر اور حقیقت الحال وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ وجودی تعلق و وابستگی اور پیوستگی کو حصوں کی مقدار کا معیار قرار دینے سے آباء کا ابناء سے پہلے ذکر کیا جانا درست و قرین صحت معلوم ہوتا ہے اور یہی تقاضائے فطرت بھی ہے۔ چنانچہ آیہ مبارکہ ''اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا'' اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میراث کے احکام، دیگر اسلامی دستورات کی طرح فطری و تکوینی اصولوں پر مبنی قرار دیئے ہیں۔ اس کا مزید ثبوت ان آیات مبارکہ میں پایا جاتا ہے جو احکام کی اصل تدوین و تشریعی ترتیب و قانونی صورت میں لانے کا تذکرہ کرتی ہیں، مثلاً:

سورۂ روم، آیت: ۳۰

○ ''فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ''

(آپ اپنا رخ خالص دین کی طرف کریں جو کہ وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے لوگوں کی تخلیق کی، اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی مضبوط دین ہے)۔

اس طرح کے واضح و صریح بیانات کے باوجود یہ بات کیونکر قابل تصور ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ایسے احکام و دستورات اور نا قابل تبدیلی فرائض و واجبات قرار دیئے گئے ہوں جو کسی بھی حوالہ سے فطرت و تخلیق کی اعلیٰ ترین بنیادوں سے ہم آہنگ نہ ہوں۔

زیر نظر آیہ مبارکہ میں اس مسئلہ کے اشارے بھی ملتے ہیں کہ ''اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ'' میں پوتے پوتیاں، دادادادیوں سے میراث میں مقدم ہیں کیونکہ وارثوں کی طبقہ بندی کے حوالہ سے اولاد اور ان کی اولاد کی موجودگی میں اجداد وجدات وراثت نہیں پاتے۔

وراثت کے خدائی فیصلے

○ ''فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ.....''

(اللہ کی طرف سے مقررہ فریضہ ہے)

لفظ ''فَرِيْضَةً'' بظاہر منصوب (زبر کے ساتھ ہے) جس کا فعل محذوف (مقدر، یعنی لفظوں میں مذکور نہیں) ہے اور وہ فعل یہ ہے: ''خذوا، الزموا'' اس میں میراث کے حصوں کی بابت سخت تاکید مقصود ہے کہ وہ مقررہ ومعینہ حصے ہیں جن میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی اور ان کا تعین خداوند عالم کی طرف سے ہوا ہے۔

اس آیت میں میراث میں حصہ پانے والوں کے پہلے گروہ (طبقہ) کا تذکرہ ہوا ہے اور وہ یہ ہیں: اولاد، والدین، ان کے حصوں کی تفصیلات صراحۃً اور اشارۃً دونوں طرح سے بیان ہوئی ہیں، صراحۃً یوں کہ اس میں باپ اور ماں میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ جبکہ اولاد بھی موجود ہو، اور تیسرا حصہ ماں کے لئے ہے بشرطیکہ مرنے والے کے بھائی موجود نہ ہوں، اگر بھائی موجود ہوں تو ماں باپ دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔ اگر ایک بیٹی ہو تو آدھا ترکہ لے گی اور اگر ایک سے زیادہ بیٹیاں ہوں کہ ان کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو تو وہ دو تہائی لیں گی، اور اگر بیٹے و بیٹیاں دونوں ہوں تو ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ'' کے مطابق بیٹا، دو بیٹیوں کے برابر حصہ لے گا، اسی سے ملحق، دو بیٹیوں کا حصہ ہے جو کہ دو ثلث ہے کہ جن کی تفصیل ذکر ہو چکی ہے۔

اور اشارۃً یوں بیان ہوا ہے کہ اگر صرف ایک بیٹا وارث ہو تو وہ سارا ترکہ لے گا کیونکہ ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ'' (مرد دو عورتوں کے حصہ جیسا لے گا) کے مطابق مرد کو عورت کے حصہ کا دگنا ملتا ہے اور ایک بیٹی کی میراث کی بابت ارشاد ہوا: ''وان کانت واحدۃ فلھا النصف'' (اور اگر ایک بیٹی ہو تو اس کے لئے نصف ترکہ ہے) اس بناء پر ایک بیٹے کے لئے سارا ترکہ ہوگا جو نصف کا دگنا بنتا ہے۔ اسی طرح اگر صرف بیٹے ہی بیٹے ہوں یعنی ایک سے زیادہ ہوں اور اُن کے ساتھ بیٹی یا ماں باپ موجود ہوں تو ان کے درمیان ترکہ کی تقسیم کا حصوں کی صورت میں تفصیلی تذکرہ نہیں ہوا لیکن عمومی قانون وضابطہ

کے مطابق (ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے) سب یکساں طور پر حصہ پائیں گے۔

اس آیت میں جس خوش اسلوبی کے ساتھ میراث کے احکام بیان ہوئے ہیں وہ نہایت دلچسپ اور اپنی مثال آپ ہے

یہاں اس اہم نکتہ کا تذکرہ ضروری ہے کہ میراث کی آیت میں ورثہ کے حصوں اور ان کی مقدار کی بابت جو عمومیت و اطلاق پایا جاتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلام ﷺ اور افرادِ امت کے درمیان فرق نہیں پایا جاتا بلکہ جس طرح یہ احکام عام لوگوں کی وراثت میں جاری و نافذ ہیں آنحضرت ﷺ کی بابت بھی ان کا نفاذ و اجراء اسی طرح ہوگا یعنی کسی کے وارث ہونے یا نہ ہونے کے حوالہ سے قانون یکساں ہے۔ چنانچہ اس عمومیت و اطلاق کی قرآنی مثال جملہ ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ'' موجود ہے کہ جس کا تفصیلی تذکرہ پہلے ہو چکا ہے، اس سلسلہ میں جن حضرات نے کہا ہے کہ قرآن مجید کے عمومی خطابات میں آنحضرت ﷺ شامل نہیں کیونکہ یہ بیانات خود انہی کی زبان مبارک سے صادر ہوئے ہیں ان کی بات قابل اعتناء ہی نہیں۔ البتہ میراث کی بحث میں شیعہ و سنی کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ آیا پیغمبر اسلام ﷺ کے ترکہ میں وراثت ہوتی ہے یا نہیں؟ یعنی آیا ان کی رحلت کے بعد کوئی ان کا وارث بنتا ہے یا ان کا ترک صدقہ ہوتا ہے؟ اس اختلاف کا سبب ایک روایت ہے جسے ابوبکر نے بیان کیا ہے اور وہ فدک کے بارے میں ہے اس روایت کی بابت تفصیلی بحث ہماری اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے لہٰذا اسی اشاراتی و اجمالی بیان پر اکتفاء کرتے ہوئے اس سلسلہ میں تفصیلات سے آگاہی کے خواہشمند حضرات اس کے موزوں مقامات کی طرف رجوع کریں اور مربوطہ کتب کا مطالعہ کر کے حقیقت الامر سے آگاہ ہوں۔

ازواج کی میراث کا بیان

○ ''وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ .... يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ''

(اور تمہارے لئے آدھا ترکہ ہے اس میں سے جو تمہاری ازواج چھوڑیں..... وہ جن کی وصیت کریں یا قرضہ)

آیت کا معنی واضح ہے، اس میں لفظ ''نِصْفُ'' کو اضافت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے: ''نِصْفُ مَا تَرَكَ''۔ ''نِصْفُ'' مضاف اور ''مَا تَرَكَ'' مضاف الیہ ہے۔ جبکہ ''وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ'' میں ایسا نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کے ادبی قواعد کی رو سے ایسا ہوتا ہے کہ جہاں اضافت نہ لائی جائے وہاں حرف ''مِنْ'' سے اس کی کمی پوری کر دی جاتی ہے، خواہ حرف ''مِنْ'' کو لفظوں میں ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے بلکہ اسے فرض کر کے جملہ مکمل کیا جائے بہر حال اس جملہ سے ابتداء کرنے کا معنی ملحوظ و مقصود ہوتا ہے جو کہ حرف ''مِنْ'' کو ابتداء کی ہوئی چیز سے وابستہ و پیوستہ جزء کی طرح قرار دیئے جانے یا

اس چیز کے وجودی تشخص کا حصہ ہو جانے سے موزوں تر ہے، البتہ یہ موزونیت اس صورت میں درست قرار پاتی ہے کہ جس پر حرف ''مِنْ'' داخل ہو وہ مقدار میں کم یا کم جیسا ہو مثلاً کل ترکہ کا چھٹا حصہ (۱/۶) چوتھا حصہ (۱/۴) اور تیسرا حصہ (۱/۳) جبکہ ''نِصْفُ'' (۱/۲) اور دو ثلث (۲/۳) میں ایسا نہیں ہوتا، اسی بناء پر ارشاد ہوا: ''السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ''، ''فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ''، ''فَلَكُمُ الرُّبُعُ'' ان میں کسی کے ساتھ اضافت نہیں، جبکہ اضافت کے ساتھ یوں ارشاد ہوا: ''وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ''، ''فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ'' اور ''فَلَهَا النِّصْفُ'' یعنی ''نِصْفُ مَا تَرَكَ'' اس میں اضافت کی بجائے حرف ''لام'' لایا گیا۔

وراثت کے باب میں حصوں کی مقدار کے بیان میں اس قرآنی اسلوب کی مثالیں عربی زبان کی ادبیات میں عام ہیں (م)

کلالہ کا بیان

○ ''وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ.........''

(اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کا وارث صرف بھائی ہوں (کلالہ) یا کوئی عورت)

لفظ ''کلالہ'' مصدر ہے جس کا معنی چھا جانا، گھیر لینا، احاطہ کرنا آتا ہے، ''تاج'' کو اکلیل کہنے کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ وہ سر پر احاطہ کر لیتا ہے یعنی پورے سر کو گھیر لیتا ہے، لفظ ''کُل'' (کاف پر پیش کے ساتھ) کسی مجموعہ کو کہتے ہیں اس میں بھی یہی مناسبت ملحوظ ہوتی ہے کہ وہ تمام اجزاء پر احاطہ کئے ہوتا ہے یعنی تمام اجزاء اس میں یکجا ہوتے ہیں، اور لفظ کلالہ سے ''کلّ'' (کاف پر زبر اور لام پر شدہ و تنوین) بھی اس لئے بنتا ہے کہ وہ معاشرہ پر اپنا بوجھ ڈال دیتا ہے کہ معاشرہ پر اس کا بوجھ احاطہ کئے ہوتا ہے، چھایا ہوا ہوتا ہے۔

لفظ ''کلالہ'' کی لفظی و لغوی بحث میں اس کے استعمالی موارد کا تذکرہ کرنے کے بعد اب ہم مشہور ماہر لغت راغب اصفہانی کی کتاب ''المفردات'' پر نظر کرتے ہیں، وہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ''الکلالة اسم لما عدا الولد والوالد من الورثة وروی ان النبی (ص) سئل عن الکلالة فقال (ص): من مات ولیس لہ ولد ولا والد'' کہ لفظ ''کلالہ'' اولاد اور والدین کے علاوہ دیگر ورثہ کو کہتے ہیں، اور جب رسول خدا ﷺ سے کلالہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من مات ولیس لہ ولد ولا والد، اس سے مراد وہ شخص ہے جو مرے تو اس کی اولاد اور باپ موجود نہ ہو، حدیث نبوی ﷺ میں مرنے والے شخص کو ''کلالہ'' کہا گیا ہے، اور دونوں قول صحیح ہیں کیونکہ لفظ ''کلالہ'' مصدر ہے جس میں وارث اور مورث (جس سے وراثت لی جائے) سب شامل ہیں، (کتاب المفردات صفحہ ۴۳۷)

مذکورہ بالا مطالب کے تناظر میں یہاں حرف ''کَانَ'' (وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ.......) کو افعال ناقصہ میں سے قرار دیا جائے تو کوئی حرج لازم نہیں آتا، اور لفظ ''رجل'' کو اس کا اسم جبکہ فعل ''یورث'' کو ''رجل'' کی صفت اور ''کلالہ'' اس کی خبر قرار دیا جائے گا، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اگر میت ورثہ کے لئے ''کلالہ'' ہو یعنی نہ اس کی اولاد موجود ہو اور نہ ہی والدین موجود ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ حرف ''کان'' کو افعال ناقصہ کی بجائے افعال تامہ میں سے قرار دیں تو اس صورت میں جملہ ''رَجُلٌ یُوْرَثُ'' اس کا فاعل اور لفظ ''کلالۃ'' مصدر ہو جو جملہ میں حال کی جگہ ذکر ہوا ہو، اگر ایسا ہو تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میت، وارثوں کے لئے کلالہ قرار پائے، معروف لغت دان اور علم نحو کے ماہر زجاج کے حوالہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: ''من قرأ یورث .بکسر الراء. فکلالۃ مفعول، ومن قرأ یورث. بفتح الراء. فکلالۃ منصوب علی الحال'' جو شخص فعل مضارع ''یورث'' کو ر کے نیچے زیر کے ساتھ پڑھے تو اس صورت میں لفظ کلالۃ جملہ میں مفعول واقع ہوگا اور جو شخص پر زبر کے ساتھ پڑھے تو لفظ کلالہ حال قرار پا کر منصوب ہوگا۔

جملہ ''غیر مضار'' میں لفظ ''غیر'' حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے، لفظ ''مضار'' کا مصدر ''مضارۃ'' ہے جس کا معنی کسی کو ضرر (نقصان) پہنچانا ہے۔ آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نقصان پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ میت پر قرضہ ہونے کی وجہ سے وارثوں کو وراثت میں کمی یا محرومی ہوگی، چونکہ قرضہ کی ادائیگی ترکہ کی تقسیم سے پہلے واجب ولازم ہے لہٰذا اس سے ورثہ کے حصوں میں کمی آئے گی جو کہ ان کے لئے ضرر ہے، یعنی مرنے والا اپنے آپ کو اس لئے مقروض کرے کہ اس کے وارث اس کے ترکہ سے حصہ نہ پا سکیں تو اس حوالہ سے خود میت وارثوں کے لئے نقصان کا باعث ہوگا، یا یہ کہ اگر اس نے اس مقصد کے لئے ایسا نہ کیا ہو بلکہ اتفاقی طور پر ایسا ہوا ہو کہ اس کے مقروض ہونے کی وجہ سے وارثوں کو کم حصہ ملے، تو اس صورت میں بھی وہ موجب ضرر کہلائے گا، جیسا کہ وصیت کے بارے میں ہے کہ اگر وہ ایک تہائی سے زائد کی وصیت کرے تو اس سے وارثوں کو نقصان ہوگا۔

خدائی حدود

○ ''تِلْکَ حُدُوْدُ اللهِ.............. وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ''

(یہ خدائی احکام ہیں............. اور اس کے لئے دردناک عذاب ہے)

لفظ ''حُدُوْدُ'' جمع کا صیغہ ہے جس کا مفرد حدّ ہے، اس کا معنی دو چیزوں کے درمیان وہ رکاوٹ ہے جو ایک

کو دوسرے کے ساتھ مخلوط ہونے میں حائل ہوا اور دونوں کی وجودی شناخت اور ان کے الگ اور ایک دوسرے سے مستقل ہونے کا تحفظ کرے، مثلاً گھر کی دیوار، باغ کی دیوار، یہاں اس سے مراد میراث کے احکام اور وراثت کے وہ حصے ومقدار ہے جو خداوند عالم نے مقرر کی ہے اور ان دو آیتوں میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت پر ثواب کے بیان کے ضمن اور ان کی نافرمانی پر سخت عذاب سے دوچار ہونے اور ذلت وخواری کا سامنا کرنے سے خبردار کرنے کے ضمن میں ان احکام پر عملداری کو یقینی بنانے کی تاکید ہوتی ہے کہ ان خدائی حدود میں رہیں اور ان سے تجاوز نہ کریں، ان خدائی مقررہ حدود کی عملی پاسداری کر کے ثواب واجر پائیں اور ان کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہو کر سخت ترین عذاب کا شکار ہونے سے بچیں۔

میراث کی عمومی بحث

قرآن مجید میں میراث کے اسلامی قوانین کلی وعمومی طور پر پانچ یا چھ آیتوں میں بیان ہوئے ہیں:

(۱) زیر نظر دو آیتیں "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ تا آخر" (نساء:۱۱)

(۲) اس سورۂ مبارکہ نساء کی آخری آیت، جس میں ارشاد ہوا: "يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ" تا آخر (نساء:۱۷۵)

(۳) آیۂ مبارکہ: "لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ تا آخر" (نساء:۷)

(۴) آیۂ مبارکہ: "وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ" (احزاب،۶) (انفال،۷۵)

یہ آیات مبارکہ وراثت کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہیں، ان کی تفسیر حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث وروایات میں تفصیلی طور پر مذکور ہے، ان آیات مبارکہ سے چار بنیادی اصولوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ جو میراث کے احکام کی اساس ہیں:

پہلا بنیادی اصول

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آیۂ مبارکہ: "اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّھُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا" کو آیۂ مبارکہ "وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ" کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو اس امر سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ وارث جس قدر قریب ہو وہ دور والے وارثوں کو حصہ پانے میں مانع ہوتا ہے یعنی قریبی وارث، دور والے وارث کے لئے رکاوٹ بنتا

ہے، چنانچہ میت کے سب سے زیادہ نزدیک اس کے ماں باپ اور اولاد، بیٹا بیٹی، ہیں اور یہ میت کے بلاواسطہ قریبی ہیں یعنی ان کے اور میت کے درمیان کوئی دوسرا شخص نہیں ہوتا، اس بناء پر بیٹا اور بیٹی (بلاواسطہ اولاد) وراثت میں پوتے پوتیوں سے مقدم ہیں اور وہ پوتے پوتیوں کی وراثت میں رکاوٹ بنتے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے پوتے پوتیوں کو کچھ نہیں ملتا، کیونکہ بیٹے کی اولاد اور بیٹی کی اولاد، اپنے باپ اور ماں کے ذریعہ سے مرنے والے سے قرب وقرابت رکھتے ہیں اور وہ تب ہی وراثت پاسکتے ہیں جب ان کے ماں باپ موجود نہ ہوں۔

تو یہ ہے میراث کے پہلے طبقہ کے بارے میں قرآنی حکم کی وضاحت! اس کے بعد دوسرے طبقہ میں بھائی، بہنیں، دادا دادی، نانا نانی ہیں جو بالواسطہ یعنی باپ یا ماں کے ذریعہ سے مرنے والے سے قربت وقرابت رکھتے ہیں، بنابراین اگر مرنے والا پہلے طبقہ میں سے کوئی وارث نہ رکھتا ہو تو دوسرے طبقہ کے افراد وراثت پائیں گے، اگر دوسرے طبقہ کے اصل وارث موجود نہ ہوں تو ان کی اولاد وراثت پائے گی جو کہ بالواسطہ، میت سے قربت رکھتے ہیں یعنی وہ اپنے حقیقی و بلاواسطہ ماں باپ کے ذریعہ سے مرنے والے شخص یعنی اپنے دادا یا نانا سے قربت وقرابت رکھتے ہیں۔ گویا ہر قریبی دوسرے بالواسطہ قریبی کے لئے مانع وحائل ہوتا ہے۔

دوسرے طبقہ کے بعد تیسرے طبقہ کی باری آتی ہے جس میں چچا چچی، ماموں ممانی، دادا دادی اور نانا نانی شامل ہیں کہ ان کے اور مرنے والے شخص کے درمیان دو طبقے ہیں جن کی وساطت سے ان کی قربت وقرابتداری ثابت ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر میراث کے سلسلے طبقوں میں متعین ہوئے ہیں اور اسی قرب وبعد کے حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص میت سے قربت وقرابت میں دو سبب رکھتا ہو وہ ایک سبب رکھنے والے سے مقدم ہوتا ہے کہ اس کی مثال ماں باپ دونوں کے حوالہ سے قربت والوں کی ہے کہ وہ صرف باپ کے حوالہ سے قربت والوں سے مقدم ہیں اور وہ دونوں کے حوالہ سے قرابت کے حامل افراد کی موجودگی میں وراثت نہیں پائیں گے لیکن دونوں کے حوالہ سے کلالہ، صرف ماں کے حوالہ سے قرابت پانے والوں کے لئے مانع نہیں ہوگا۔

دوسرا بنیادی اصول

وراثت میں دوسرا بنیادی اصول کہ جو زیر نظر آیہ مبارکہ سے مستفاد ہے وہ یہ کہ وارثوں کی طبقہ بندی میں قرب وبُعد (نزدیکی و دوری) کے علاوہ تقدم و تاخر کے دیگر اسباب بھی پائے جاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ تمام حصے یکجا ہو جاتے ہیں اور اصل ترکہ سے زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان تزاحم وٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو اس حال

میں بعض حصہ دار ایسے ہوتے ہیں جن کے حصوں کی تعداد ٹکراؤ کی صورت میں بھی معین ہے اور قرآن مجید میں اسے بیان کر دیا گیا ہے مثلاً شوہر کہ اس کا اصل حصہ نصف ہے (۱/۲) لیکن جب اولاد موجود ہو تو اس کا حصہ خود بخود ایک چوتھا (۱/۴) ہو جاتا ہے اسی طرح بیوی کہ جس کا حصہ اولاد کے نہ ہونے کی صورت میں ایک چوتھا (۱/۴) اور اولاد کی موجودگی میں آٹھواں (۱/۸) ہوتا ہے یہی حال ماں کا ہے کہ اس کا اصل حصہ ایک تہائی (۱/۳) ہے لیکن اگر میت (یعنی اس کا اپنا بیٹا) کی اولاد موجود ہو یا بھائی موجود ہوں تو ماں کا حصہ چھٹا (۱/۶) ہو جاتا ہے جبکہ باپ کا حصہ یعنی (۱/۶) ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی خواہ میت کی اولاد ہو یا نہ ہو۔

اسی مسئلہ سے ملحق ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بعض حصے دار ایسے ہیں جن کے اصل حصے تو معین ہیں لیکن ٹکراؤ کی صورت میں قرآن مجید نے ان کے حصوں کے بارے میں کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ یکسر خاموشی ہے مثلاً ایک بیٹی اور چند بیٹیاں، ایک بہن اور چند بہنیں، کہ ان میں سے ایک بیٹی کا حصہ نصف (۱/۲) معین ہے اور ایک بہن کا حصہ دو تہائی (۲/۳) معین ہے، لیکن اگر چند بیٹیاں اور چند بہنیں ہوں اور ان کے درمیان تزاحم و ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو قرآن مجید میں ان کے حصوں کے بارے میں کچھ مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو ورثہ، طبقات کے حوالہ سے دوسروں سے مقدم ہیں پہلا (طبقہ، دوسرے طبقہ سے، اور دوسرا طبقہ تیسرے طبقہ سے) اگر حصے، اصل ترکہ سے زائد ہوں تو مقدم افراد کے حصوں میں کمی نہیں آئے گی، بلکہ ان کے بعد والے طبقہ کے افراد کے حصوں میں کمی واقع ہوگی یعنی ان لوگوں کے حصوں میں کمی آئے گی جن کے بارے میں قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے کہ اگر کوئی تزاحم و ٹکراؤ نہ ہو تو ان کے حصوں کی مقدار یہ ہے لیکن اگر کوئی مزاحم ہو اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو قرآن مجید میں ان کے حصوں کے بارے میں کچھ مذکور نہیں (یاد رہے کہ تزاحم و ٹکراؤ سے مراد وہ یہ ہے جو بیان کر چکے ہیں کہ ایک طبقہ، دوسرے طبقہ کے لئے رکاوٹ بنتا ہے کہ ان کے حصوں میں کمی یا محرومی آتی ہے)

تیسرا بنیادی اصول

آیات مبارکہ سے وراثت کے قانون میں تیسرا بنیادی اصول یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب حصے، اصل ترکہ سے زیادہ ہو جائیں جیسے شوہر اور ماں باپ دونوں کی نسبت والے بھائی (کلالہ) موجود ہوں تو وہاں نصف (۱/۲) اور دو تہائی (۲/۳) حصے کئے جائیں گے جو کہ اصل ترکہ کی تقسیم میں درست نہیں بنتے بلکہ زائد بنتے ہیں، اسی طرح اگر ماں باپ، دو بیٹیاں اور شوہر ہو تو اس میں بھی حصے اصل ترکہ سے زائد ہوتے ہیں یعنی (۲/۶)، (۲/۳) اور (۱/۴) اس میں پہلا حصہ (۲/۶) ماں باپ کے لئے، دوسرا حصہ (۲/۳) دو بیٹیوں کے لئے اور تیسرا حصہ (۱/۴) شوہر کے لئے ہے۔ لیکن اس کی تقسیم میں تمام حصوں کی

مقدار اصل ترکہ سے زائد بنتی ہے، کبھی اس کے برعکس صورت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ یوں کہ اصل ترکہ، حصوں سے زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ اگر کوئی عورت مرجائے صرف اور صرف ایک بیٹی یا دو بیٹیاں یا زیادہ چھوڑے تو قرآن مجید میں ان کا حصہ نصف ترکہ ذکر ہوا ہے۔ دوسرے نصف ترکہ کے بارے میں کچھ مذکور نہیں۔ اسی طرح دیگر مثالیں ہیں جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات مبارکہ میں جو کہ احکام کی تفسیری حیثیت رکھتی ہیں ذکر ہوئی ہیں اور ان میں ورثہ کے حصوں کا تعین ہوا ہے اور دیگر ورثہ کے حصوں کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ اگر حصے، ترکہ سے زیادہ ہوں تو کمی ان کے حصوں میں آئے گی جن کے بارے میں قرآن مجید میں صرف ایک حصہ بیان ہوا ہے اس سے زیادہ نہیں ذکر ہوا اور وہ یہ ہیں: بیٹیاں، بہنیں لیکن ان کے حصوں میں کمی نہیں آئے گی جن کے دو حصے قرآن مجید میں بیان ہوئے مثلاً ماں باپ اور شریک حیات، اسی طرح اگر حصے، اصل ترکہ سے کم ہوں اور ترکہ ان سے زیادہ ہو تو اضافہ ان ورثہ کو ملے گا جن کے لئے قرآن مجید میں ایک حصہ ذکر ہوا ہے یا یوں کہیں کہ اضافہ انہی کو ملے گا جن کے حصوں میں کمی آتی ہے، مثلاً اگر وارثوں میں ایک بیٹی اور باپ ہو تو بیٹی کو نصف (۱/۲) اور باپ کو ایک چھٹا (۱/۶) حصہ ملے گا اور باقی مال یعنی (۲/۶) حصہ بیٹی کو دیا جائے گا۔ فقہی اصطلاح میں فرض و مقررہ حصہ سے زائد حصہ دیئے جانے کو بطور ''رد'' دینا کہا جاتا ہے، یعنی پلٹا کر، دوبارہ، پھر اسی کو، کے معانی میں واجب و مقررہ حصہ کے علاوہ دیئے جانے کو مبنی بر ''رد'' کہتے ہیں۔ لیکن عمر بن خطاب نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اس قانون اور شرعی حکم کو تبدیل کر دیا اور وہ اس طرح کہ اگر حصے، اصل ترکہ سے زیادہ ہو جائیں تو تمام حصوں کی معینہ قرآنی مقدار کو ختم کر کے کمی کو تمام وارثوں کے حصوں سے پورا کیا جائے گا، گویا ہر وارث کو اس کے مقررہ حصہ سے کم دیا جائے گا، فقہی اصطلاح میں اسے ''عول'' کہتے ہیں، البتہ صدر اول میں لوگ ترکہ کے حصوں سے زیادہ ہونے کی صورت میں اضافی مال میت کے پدری قرابتداروں کو دیتے تھے کہ جسے فقہی اصطلاح میں ''تعصیب'' کہتے ہیں۔ عول اور تعصیب کے بارے میں عنقریب ''روایات پر ایک نظر'' کے باب میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

چوتھا بنیادی اصول

میراث کے باب میں مردوں اور عورتوں کے حصوں کی مقدار کے بارے میں آیات مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا حصہ فی الجملہ مرد کے حصہ ... صورتوں میں باپ کے حصہ سے مقررہ واجب مقدار سے صرف برابر ہی نہیں بلکہ زیادہ ہے، اور اس حوالہ سے شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ماں کا باپ کے ساتھ برابر حصہ پانا یا بعض صورتوں میں باپ سے بھی زیادہ حصہ پانا اس وجہ سے ہو کہ اسلامی نقطہ نظر سے ماں وجودی اعتبار سے اپنی اولاد کے ساتھ پیوستگی، باپ

سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور وہ باپ سے زیادہ اپنے بچوں کے ساتھ وابستگی رکھتی ہے کیونکہ وہ حمل، وضع حمل، حضانت و دیکھ بھال اور تربیت کے مراحل میں شدید ترین حالات کا سامنا کرتی ہے اور ان میں نہایت سختیاں و دشواریاں جھیلتی ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ احقاف، آیت: ۱۵

○ ''وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا''

(اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کرنے کی تاکید کی، کہ اس کی ماں نے سخت تکلیف کے ساتھ حمل کے ایام بسر کئے اور اس کے وضع حمل (سے جنم دینے) کی تکلیف برداشت کی اور اس کے حمل اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت تیس مہینے بنتی ہے)

بنابرایں اگر ماں کا حصہ دیگر عورتوں کی نسبت، مرد کے حصہ کا آدھا قرار دیا گیا ہے یا بعض صورتوں میں مرد (میت کے باپ) کے حصہ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہوجاتا ہے تو یقیناً اس وجہ سے ہے کہ خداوند عالم ماں کے لئے عزت و احترام میں اضافہ اور باپ سے زیادہ مقام و منزلت کا حامل قرار دیتا ہے۔

اور جہاں تک مرد کے حصہ کا عمومی طور پر عورت کے حصہ سے دُگنا قرار دیئے جانے کا تعلق ہے تو اس کی بنیادی وجہ امور زندگانی کی تدبیر میں مرد کا وجودی و طبعی طور پر قوی و مضبوط ہونا اور عمومی طور پر مالی امور میں عورت سے زیادہ ذمہ دار قرار دیا جانا ہے کیونکہ عورت کے اخراجات بھی اسی کے ذمہ میں قرار دیئے گئے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ نساء، آیت: ۳۴

○ ''الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ''

(مرد عورتوں کے امور کے ذمہ دار ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر برتری عطا فرمائی ہے اور وہ جو اپنے اموال میں سے انفاق کرتے ہیں)

لفظ ''قَوَّامُونَ'' کا مصدر ''قوام'' ہے جو لفظ ''قیام'' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی امورِ زندگانی کا انتظام و اہتمام اور ذمہ داری نبھانا ہے۔ اور فضیلت و برتری دینے کا فلسفہ و سبب یہ ہے کہ امور کی تدبیر و تفکیر اور تعقل کے حوالہ سے مردوں میں عورتوں کی نسبت زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے جبکہ خواتین میں عطوفت و احساساتی وابستگی کے جذبات مردوں کی نسبت کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم مرد اور عورت کی وجودی و طبعی اور تخلیقی حیثیت و کیفیت اور اس کے ساتھ ساتھ امور زندگانی کی تدبیر و ترتیب میں ذمہ داریوں کی تقسیم کا جائزہ لیں اور پھر دنیا میں موجود دولت و ثروت جو کہ ہر دور میں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے اس پر نظر ڈالیں اور باریک بینی سے موازنہ کریں تو اس ناقابل انکار حقیقت سے

آگاہ ہوسکتے ہیں کہ اسلام نے دنیا کی دولت کے دوتہائی حصہ کی تدبیر و ذمہ داری مردوں پر جبکہ ایک تہائی عورت کے ذمہ میں قرار دی ہے۔ لہٰذا نتیجتاً تعقل کو عواطف و احساسات پر برتری حاصل ہوگی اور معاشرہ کے امور کی بہتر اصلاح اور زندگی کی سعادت مندی یقینی ہوجائے گی۔

دوسری جانب عورتوں کے حصہ میں کمی کی تلافی اس انداز میں کی گئی کہ مردوں کو حکم دیا گیا کہ عورتوں کے امور میں عدل اختیار کریں، اس طرح وہ مردوں کے ساتھ ان کے حصہ یعنی دوتہائی میں بھی ان کی شریک بن جائیں گی اور دوسری جانب ایک تہائی خود ان کا اپنا حصہ ہے جو کہ ان کی ملکیت ہے اور وہ اس کے خرچ کرنے کا اختیار بھی رکھتی ہیں، لہٰذا مجموعی طور پر وہ پوری دنیا کے دوتہائی حصہ والی بن جائیں گی۔ اب اسلامی قانون وراثت کی نہایت عادلانہ اور منفرد تقسیم کا نتیجہ ملاحظہ کریں کہ مرد اور عورت کے حصوں کی مقدار میں ملکیت و تصرف کے حوالہ سے صورتحال یوں ہے کہ مرد دنیا کی دوتہائی ثروت کا مالک ہے مگر ایک تہائی کا تصرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ جبکہ عورت ایک تہائی کی مالک ہے مگر دوتہائی اس کے تصرف میں ہے، اس حکیمانہ تقسیم بندی میں مردوں کی قوت تعقل و تدبر کو عورتوں کی قوت جذبات و احساسات پر ترجیح دی گئی ہے کیونکہ مالی امور کی تدبیر اور مال و دولت سے استفادہ کی مؤثر راہیں تلاش کر کے اس سے ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا اہتمام کرنا قوت تعقل سے زیادہ تعلق رکھتا ہے جبکہ اخراجات کی متوسط و درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے دولت کی ریل پیل سے زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کو یقینی بنانے میں عواطف و احساسات کی اثرگزاری زیادہ ہوتی ہے، تو یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو میراث کی تقسیم اور نان و نفقہ کی ذمہ داریوں میں مرد اور عورت کے درمیان فرق قرار دیئے جانے کا اصل سبب ہے۔

بنابرایں اس موضوع میں فضیلت و برتری کی بابت کہا جاسکتا ہے کہ مردوں میں طبعی طور پر روحِ تعقل کا عورتوں کی نسبت زیادہ ہونا ہی مراد ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

○ ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ''

(مرد عورتوں کے امور کے ذمہ دار ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر برتری عطا کی ہے)

لہٰذا اس برتری کی وجہ مردوں کی جسمانی طاقت اور قوی و مضبوط ہونا نہیں ہے اگرچہ عورتوں کی نسبت مردوں میں جسمانی طور پر زیادہ طاقتور ہونا ایک وجودی خصوصیت اور امتیازی صفت ہے کہ جس سے مرد، عورت پر برتری پاتا ہے اور اس سے انسانی معاشرہ میں بہت بڑے آثار ظاہر ہوتے ہیں کہ معاشرہ کا دفاع و تحفظ اور امن و امان کا قیام سخت ترین اعمال اور نہایت شدید مشکلات و دشواریوں کا مقابلہ کرنے ہی کے نتیجہ میں یقینی ہوتا ہے جو کہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے کہ طبعی طور پر نزاکت کا حامل ہونے کی وجہ سے عورت ایسا نہیں کرسکتی۔ تاہم آیہ مبارکہ میں جس فضیلت و برتری کا حوالہ مذکور ہے اس سے مراد یہ جسمانی امتیازات نہیں بلکہ تعقل و قوت تدبر ملحوظ قرار پائی ہے۔ البتہ خواتین بھی طبعی و وجودی طور پر ان خصوصیات اور امتیازات سے آراستہ ہیں کہ جن کے بغیر معاشرتی زندگی کا نظام چل ہی نہیں

سکتا، اللہ تعالیٰ نے انہیں بلند پایہ صفات عطا فرمائی ہیں اور عواطف و احساسات سے نوازا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خصوصیات ان کی برتری کا باعث ہوں، ایسا ہرگز نہیں بلکہ برتری کی جو نسبت مردوں میں ان کی وجودی قوتوں کے حوالہ سے پائی جاتی ہے خواتین میں بھی ایسی خصوصیات موجود ہیں جو مردوں میں نہیں یا اگر موجود بھی ہیں لیکن ان سے کم ہیں، تو ان امور کی نسبت سے معاشرہ کا نظام قائم و استوار رہتا ہے اور ان اوصاف کے آثار سے تمام افراد بہرہ ور ہوتے ہیں مثلاً انس و محبت، دل موہ لینا، الفت و نرمی، رافت و شفقت، سلسلہ افزائش نسل کی سختیاں جھیلنا، حمل و وضع حمل کی دشواریوں کو سہنا، بچوں کی نگہداشت اور دیکھ بھال و تربیت اور امور خانہ داری میں بھرپور اور بنیادی و مؤثر کردار ادا کرنا وغیرہ، لہٰذا اگر خواتین کی مذکورہ بالا صفات اور نرمیٔ طبع نہ ہو تو صرف مردوں کی سختی طبع معاملات کو صحیح سمت میں باقی نہ رکھ سکتی۔

تو مردوں کی سختی طبع کے ساتھ ساتھ عورتوں کی نزاکت طبع کے تقاضوں کی تکمیل کے بغیر چارہ کار ہی نہیں، نتیجتاً جاذبہ کے بغیر دافعہ ہی دافعہ سے کام نہیں چلتا، دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری و ناگذیر ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مرد اور عورت میں پائی جانے والی متوازی وجودی خصوصیات اور امتیازات ہی ہیں جو معاشرتی زندگی میں توازن پیدا کرتی ہیں کہ جن سے انسانی معاشرہ جو کہ مردوں اور عورتوں ہی سے ترکیب پاتا ہے ترازو کے دو پلڑوں کی طرح برابر حیثیت کا حامل ہو جاتا ہے، معاشرتی توازن میں دونوں صنفوں کی وجودی صفات اپنی عملداری و اثر گزاری سے نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ خداوند عالم اپنے مقدس کلام میں حق و عدل کے منافی بات کرے یا اپنے احکام و دستورات میں ظلم و جور اور ناانصافی سے کام لے، (نعوذ باللہ) اسی مطلب کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ''اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ'' (سورۂ نور، آیت: ۵۰) کیا وہ ڈرتے ہیں کہ اللہ ان پر زیادتی کرے گا۔ ''وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا'' (سورۂ کہف، آیت: ۴۹) اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ خداوند عالم ہی نے تو افراد بشر کے وجودی ربط و ارتباط کی بابت ارشاد فرمایا ہے: ''بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ'' (تمہارے بعض، دوسرے بعض سے ہیں، تم ایک دوسرے سے ہو) اسی وجودی ارتباط و پیوستگی کے بارے میں زیر بحث آیت میں ارشاد ہوا: ''بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ'' (بوجہ اس فضیلت و برتری کے، جو اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر عطا کی ہے)، اسی سلسلہ میں سورۂ روم آیت ۲۰۔۲۱ میں یوں ارشاد ہوا۔

○ ''وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۞ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۞''

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا کہ پھر تم بشریت کی صورت میں روئے زمین میں پھیل گئے، اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہی سے تمہارے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کے ذریعے سکون قلب پاؤ، اور اس نے تمہارے درمیان محبت و مودت و رحیمانہ جذبات قرار دیئے ان سب میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں)

قارئین کرام، آپ مذکورہ بالا دو آیتوں کے الفاظ پر نگاہ کریں اور ان کے معانی پر توجہ فرمائیں کہ ان میں انسان (کہ یہاں اس سے مراد، مرد ہے کیونکہ اس کے مقابل میں ازواج مذکور ہے) کو روئے زمین میں پھیل جانے والا بشر کہا گیا ہے کہ پھیل جانے سے مراد روزی کی تلاش میں ادھر ادھر جانا ہے اور اسی کی طرف زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انجام دیئے جانے والے اعمال کی بازگشت ہوتی ہے کہ اس کے لئے وجودی قوت وشدت کو بروئے کار لانا ناگذیر ہے، اگر تمام افراد بشر صرف اور صرف ایک ہی وجودی قوت کے حامل ہوتے اور اس کے اظہار میں سرگرم عمل رہتے تو دیکھتے ہی دیکھتے نسل انسانی کا خاتمہ ہو جاتا، اس لئے خداوند عالم نے انسان کے بارے میں اس کے روئے زمین میں پھیل جانے والے بشر کے بیان کے بعد عورتوں کی تخلیق کا تذکرہ کیا اور اس میں اس مطلب کا ذکر کیا کہ اس کا وجود ہی مردوں کی زندگی میں سکون وتسکین کا باعث ہے اور دونوں کے درمیان الفت ومحبت کا رشتہ قائم کر دیا گیا ہے کہ عورتیں اپنے حسن وجمال اور وجودی خوبصورتی کے ذریعے مردوں کو اپنی محبت والفت کا دلدادہ بنائیں، بنا برایں خواتین انسانی معاشرہ کا پہلا ستون اور بنیادی وحقیقی سپوت ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام نے گھریلو معاشرہ یعنی ازدواجی وابستگی کو اس سلسلہ میں اصل واساس اور بنیاد قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

○ ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ''

(اے لوگو، ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہ گروہ اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت اسے حاصل ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہو)

تو اللہ تعالیٰ نے پہلے مرد اور عورت کے ازدواجی سلسلہ کو بیان کیا اور اس کے ذریعے افزائش نسل انسانی کا تذکرہ کیا پھر اس پر ہی بڑے انسانی معاشرہ کی تشکیل اور اس میں شعبے وقبیلے بنانے کو بیان کیا۔

یہاں اس اہم نکتہ کا بیان ضروری ہے کہ آیۂ مبارکہ ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ'' میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر ''فضیلت'' عطا کئے جانے کا ذکر فرمایا ہے تو اس ''فضیلت'' سے مراد وجودی طور پر ان قوتوں سے لیس ہونا مراد ہے جن کی عملداری سے دنیوی زندگی کے معاشی امور کی بہتر ترتیب وتنظیم یقینی ہو سکتی ہے اور معاشرہ کے بنیادی مسائل نہایت احسن طریقہ سے حل ہو سکتے ہیں۔ اس ''فضیلت'' سے وہ برتری اور حقیقی افضیلت مراد نہیں جسے اسلام میں ''برتری'' کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب (تقویٰ) کیونکہ اسلام ان جسمانی اضافی خصوصیات کو اہمیت نہیں دیتا جن سے صرف زندگی کی مادی ضروریات پوری ہونے میں مدد ملتی ہو بلکہ وہ ان کی اہمیت صرف اس حوالہ سے ملحوظ رکھتا ہے کہ جب

وہ اخروی درجات کے حصول کا وسیلہ بنیں اور ان کے ذریعے خدا کا قرب اور رضائے پروردگار تک رسائی میں مدد ملے۔

نتیجہ بحث یہ کہ اب تک مذکورہ تمام مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مردوں کو عورتوں پر جو "فضیلت" دی گئی ہے کہ جس سے وراثت کے حصوں کی مقدار اور بعض دیگر امور میں فرق پیدا ہوتا ہے وہ روح تعقل وقوتِ تدبر وتدبیر ہے لہٰذا اس سے مراد صرف "اضافہ" ہے "شرف و بزرگی اور اعزاز" مراد نہیں ہے کیونکہ اسلام جس شرف و بزرگی اور اعزاز کو اہمیت کا حامل قرار دیتا ہے وہ صرف اور صرف "تقویٰ" ہے خواہ مرد میں ہو یا عورت میں ہو، حقیقی فضیلت و برتری کا معیار اس کے سوا کچھ نہیں۔

روایات پر ایک نظر

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تفسیر "درمنثور" میں عبد بن حمید کے حوالہ سے اور بخاریؔ، مسلم، ابوداوٗدؔ، ترمذیؔ، نسائیؔ، ابن ماجہؔ، ابن جریرؔ، ابن منذرؔ، ابنؔ ابی حاتم اور بیہقیؔ نے اپنی کتاب السننؔ میں جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بنی سلمہ افراد کے ہمراہ پیدل چل کر کر میری عیادت کو تشریف لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ مجھ پر غشی سی طاری تھی اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی منگوایا اور اس سے وضو کیا، پھر اس پانی کو مجھ پر چھڑکا تو میں ہوش میں آ گیا، تو موقع پا کر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ میرے اموال کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس وقت یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی: "يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" (اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے، مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے)۔ (تفسیر "درمنثور" ج ۲ ص ۴۲۵)

جناب جابر کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس غرض سے یہ بات پوچھی کہ مرنے کے بعد انسان کے ترکہ کا کیا بنے گا؟ اس حوالہ سے، ہم سابقہ موضوعات میں متعدد بار بیان کر چکے ہیں کہ ایک آیت کے شان نزول کی بابت ایک سے زیادہ واقعات کا ہونا خارج از امکان نہیں اور تمام واقعات کو اس کے شان نزول کا نام دیا جا سکتا ہے لہٰذا ان واقعات میں سے کسی ایک کا آیت کے ظاہری الفاظ سے مطابقت نہ رکھنا اسے شان نزول کی فہرست سے باہر نہیں کرتا بلکہ سیاق وسباق سے اصل مقصود واضح ہو جاتا ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ آیت کا نزول ان تمام واقعات کے رونما ہونے میں زمانی وحدت رکھتا ہو اور متعدد روایات سے ہمزمان ہو، بنا بر ایں سوال و جواب کے درمیان لفظی یگانگت ضروری نہیں۔ چنانچہ جابر کا سوال یہ تھا:

مأتامرنی ان اصنع فی مالی (مجھے آپ کیا حکم دیتے ہیں کہ میں اپنے مال میں کیا کروں اے اللہ کے رسول ﷺ!) تو اس وقت جو آیت نازل ہوئی اس میں ایک قاعدۂ کلیہ بیان ہوا کہ مرد کے لئے عورتوں کے حصہ جیسا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے وصیت کے بارے میں پوچھا ہو کہ اس کا تعلق ایک تہائی ترکہ سے ہوتا ہے، بہرحال اس سے شانِ نزول کی وابستگی کے بنیادی اصول کی نشاندہی ہوتی ہے اس روایت سے زیادہ عجیب روایت وہ ہے کہ جسے تفسیر درمنثور میں عبد بن حمید کے حوالہ سے اور حاکم نے مستدرک میں جابر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں بیمار تھا تو رسول خدا ﷺ میری تیمارداری کے لئے تشریف لائے تو میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا: میں اپنا مال اپنی اولاد میں کس طرح تقسیم کروں؟ (کیف اقسم مالی بین ولدی) تو آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ'' (اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے) (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۲۵)

رسم جاہلیت کی نفی

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا زمانۂ جاہلیت میں عام رسم تھی کہ لوگ اپنی بیٹیوں اور کمزور بیٹوں کو میراث میں حصہ نہیں دیتے تھے اور میراث صرف اسی بیٹے کو ملتی تھی جو میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے کی طاقت رکھتا ہو، چنانچہ عرب کے مشہور شاعر حسان کے بھائی عبدالرحمان کا انتقال ہوا، اس کے وارثوں میں ایک بیوی جس کا نام ''ام کحہ'' تھا اور پانچ بیٹیاں تھیں، اس کے دیگر رشتہ داروں نے کہ جو اولاد کے بعد والے طبقہ میں شامل ہیں اس کا ترکہ آپس میں تقسیم کرلیا، اس کی زوجہ ''ام کحہ'' نے اپنی شکایت حضرت رسول خدا ﷺ کے سامنے پیش کی تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: ''فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ'' (اگر دو بیٹیوں سے زیادہ ہوں تو ان کے لئے ترکہ میں سے دوثلث (۲/۳) ہے اور اگر ایک ہو تو اس کے لئے نصف ترکہ ہے) اس کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے ''ام کحہ'' کے بارے میں یہ آیت تلاوت فرمائی: ''وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ'' (بیویوں کے لئے تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی (۱/۴) ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو، اگر تمہاری اولاد ہو تو ان کے لئے آٹھواں حصہ (۱/۸) ہے۔ (ملاحظہ ہو، تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۱۲۵)

اسی تفسیر (درمنثور) میں انہی دو حضرات یعنی ابن جریر اور ابن ابی حاتم کے اسناد سے جناب ابن عباس کا بیان مذکور ہے کہ انہوں نے کہا:

لما نزلت اٰیة الفرائض التی فرض اللہ فیها ما فرض للولد الذکر والانثٰی والابوین کرهها

الناس اوبعضهم وقالوا: تعطى المرأة الربع اوالثمن، وتعطى الابنة النصف، ويعطى الغلام الصغير، وليس من هٰؤلاء احد يقاتل القوم ولا يحوز الغنيمة وكانوا يفعلون ذلك فى الجاهلية لا يعطون الميراث الا لمن قاتل القوم ويعطونه الاكبر فالاكبر

جب وہ آیت نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے مقرر فرما دیئے کہ بیٹا، بیٹی اور ماں باپ کے لئے کتنا حصہ ہے تو اسے کچھ یا تمام لوگوں نے پسند کیا اور کہنے لگے کہ ترکہ کا ایک چوتھائی یا آٹھواں حصہ مرنے والے کی بیوی کو دیں؟ اور نصف مال بیٹی کو دیں؟ چھوٹے بچے کو بھی حصہ دیں؟ جبکہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو میدان کارزار میں دشمن سے جنگ کر سکے اور مال غنیمت لے آئے، ان کی یہ بات دراصل زمانۂ جاہلیت کی اس رسم کی بناء پر تھی کہ وہ صرف اسے وراثت میں حصہ دیتے تھے جو میدانِ جنگ میں دشمن سے لڑ سکتے ہوں، بنا برایں زمانۂ جاہلیت میں میراث میں صرف وہی لوگ حصہ پاتے تھے جو طاقتور ہوں اور پھر بڑی اولاد یا قرابتداروں میں سے جو زیادہ طاقتور ہوتا تھا وہ زیادہ حصہ پاتا تھا (درمنثور، ج ۲ ص ۱۲۵)

زمانۂ جاہلیت کی مذکورہ بالا رسم ہی سبب ہوئی کہ میراث میں ''تعصیب'' کا عمل جاری ہوا، ''تعصیب'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر مرنے والے کا بڑا بیٹا نہ ہو جو میدان جنگ میں دشمن کو پچھاڑ سکے تو میراث اس کے پدری قرابتداروں میں تقسیم ہوگی۔ اہل سنت اس پر عمل کرتے ہیں بشرطیکہ ترکہ، مقررہ حصوں سے زیادہ ہو اور حصے تمام مال سے پورے نہ ہوں، ممکن ہے کہ ان کا عمل ان کی روایات میں مذکورہ مطالب کی بنیاد پر ہو، لیکن آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے منقول روایات میں اس کی نفی ملتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اگر ترکہ، حصوں سے زیادہ ہو تو اضافہ انہی کے وارثوں کو ملے گا کہ مختلف صورتوں میں ان کے حصوں میں کمی واقع ہوتی ہے یعنی اولاد، پدری و مادری بھائی یا صرف پدری بھائی، یا بعض صورتوں میں صرف باپ، چنانچہ آیات مبارکہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس سے آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ ہم اس سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں۔

میراث میں عول کا قانون

المستدرک میں حاکم نے اور السنن میں بیہقی نے جناب ابن عباس کی روایت ذکر کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: مقررہ معین شدہ حصوں میں عول کی رسم سب سے پہلے عمر نے ڈالی اور فرائض و معینہ حصوں کے خدائی دستورات کو درہم برہم کر دیا اور ان کی اکھاڑ پچھاڑ کر دی اور کہا کہ خدا کی قسم! مجھے معلوم نہیں میں تم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کروں، خدا کی قسم! مجھے معلوم

نہیں اللہ تعالیٰ نے تم میں سے کسے مقدم کیا ہے اور کسے مؤخر کیا ہے؟ اور خدا کی قسم! اس ناچیز مال میں اس سے بہتر کوئی بات میری نظر میں نہیں کہ اسے تم میں برابر برابر حصوں میں تقسیم کروں۔

اس پر ابن عباس نے کہا کہ خدا کی قسم، اگر وہ اسی کو مقدم رکھتا جسے خدا نے مقدم کیا ہے اور اسے مؤخر کرتا جسے اللہ نے مؤخر کیا ہے تو کسی بھی فریضہ ومعین شدہ حصہ میں کمی واقع نہ ہوتی، اس پر کسی نے ابن عباس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسے مقدم قرار دیا ہے؟ ابن عباس نے جواب دیا کہ ہر فریضہ کہ جس کے لئے خداوند عالم نے کمی کی صورت میں دوسرا فریضہ معین کر دیا ہے وہی مقدم اور جس فریضہ کے لئے کمی کی صورت میں دوسرا فریضہ مقرر نہیں کیا بلکہ صرف باقی ماندہ مال سے لے گا وہی مؤخر کہلاتا ہے، اس بناء پر مقدم کی مثال شوہر اور بیوی اور ماں ہے جبکہ مؤخر کی مثال بہنیں اور بیٹیاں ہیں، اور اگر کہیں دونوں موجود ہوں یعنی مقدم بھی ہو اور مؤخر بھی ہو تو وہاں پہلے مقدم کا حصہ الگ کیا جائے گا اور اس کا پورا حق اسے دیا جائے گا اور اگر کچھ بچ جائے تو اسے بہنوں اور بیٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، اگر کچھ باقی نہ رہے تو انہیں کچھ نہیں ملے گا۔

(بحوالہ تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۲۷)

ابن عباس کی دیگر دو روایتیں

(۱) سعید بن منصور نے ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا! آیا تم جانتے ہو کہ جو ذات ریت کے ذروں کی تعداد سے آگاہی رکھتی ہے اسی نے میراث میں نصف (۱/۲) ثلث (۱/۳) اور ربع (۱/۴) حصے مقرر کئے ہیں، یعنی مال کو دو نصف، دو ثلث اور دو ربع میں تقسیم کیا ہے۔

(۲) عطا سے مروی ہے اس نے کہا کہ میں نے ابن عباس سے کہا کہ لوگ نہ میری بات پر عمل کرتے ہیں اور نہ آپ کی بات پر عمل کرتے ہیں، اگر ہم دونوں مر جائیں تو ہمارے بیانات کے مطابق ترکہ تقسیم نہیں کریں گے، ابن عباس نے کہا کہ میں لوگوں کے ساتھ مباہلہ کرنے کو تیار ہوں ہم اور وہ خانۂ کعبہ کے ایک رکن پر ہاتھ رکھیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا لعنت کرے اور وہ ہلاک ہو جائے، مجھے یقین کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آراء کے مطابق حکم نہیں دیا یعنی جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ خدائی حکم کے مطابق نہیں ہے۔

مذکورہ بالا دونوں روایتیں تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۲۷ میں مذکور ہیں۔

ابن عباس کی مذکورہ روایت شیعہ اسناد سے بھی ذکر ہوئی ہے جسے ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

فروع کافی کی روایت

عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ ہم ابن عباس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک میرے دل میں فرائض یعنی میراث میں مقررہ حصوں کا مسئلہ آیا تو میں نے وہ بحث چھیڑ دی، تو ابن عباس نے کہا کہ سبحان اللہ العظیم، کیا تم نے غور کیا ہے کہ جس ذات کو بیابان کی ریت کے ذرّوں کا علم ہے اس نے کس طرح سے میراث کے حصوں کی تقسیم کا نظام بنایا ہے کہ ترکہ میں نصف اور نصف اور ثلث قرار دیا جبکہ جو مال بھی تصور کیا جائے وہ دو ثلث پر مشتمل ہوتا ہے تو تیسرا ثلث کہاں ہے؟ ان کے جواب میں زفر بن اوس بصری نے کہا: اے ابو العباس! یہ بتائیں کہ فرائض وسہام اور میراث کے معینہ ومقررہ حصوں میں عول کی رسم سب سے پہلے کس نے شروع کی؟ ابن عباس نے کہا کہ عمر نے اس کی ابتداء کی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وراثت کی تقسیم میں حصوں کی مقدار کے تعین میں پیچیدگی کا شکار ہوئے تو عول کا قانون بنا دیا اور میراث کے قرآنی نظام کو درہم برہم کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ خدا کی قسم، مجھے معلوم نہیں کہ خدا نے تم وارثوں میں سے کسے مقدم کیا ہے اور کسے مؤخر کیا ہے (یعنی کسے پہلے حقدار قرار دیا ہے اور کسے بعد میں حصہ دار بنایا ہے) لہٰذا میں اس کا سادہ اور آسان حل اس طرح کرتا ہوں کہ پورے مال کو تمہارے درمیان برابر برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہوں اور جو بچ جائے اسے ہر حقدار کے حصہ میں ڈال دوں گا، لہٰذا عمر نے سب سے پہلے فرائض یعنی میراث کے مقرر شدہ ومعینہ حصوں میں عول کی طرح ڈالی، خدا کی قسم! اگر عمر نے خدا کے مقدم کردہ کو مقدم اور خدا کے مؤخر کردہ کو مؤخر کیا ہوتا تو خدائی مقررہ حصوں میں عول کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

زفر بن اوس نے پوچھا کہ خداوند عالم نے کسے مقدم کیا ہے اور کسے مؤخر کیا ہے؟

ابن عباس نے جواب دیا کہ جو بھی فریضہ دیکھیں کہ خداوند عالم نے کسی دوسرے فریضہ کی وجہ سے اسے کم نہیں کیا اس کا حقدار شخص مقدم ہے اور مؤخروہ ہے کہ جب کوئی فریضہ کم ہو تو اس کی کمی کو دور کرنے کے لئے دوسرا فریضہ معین نہ کیا گیا ہو بلکہ اپنے باقی ماندہ فریضہ ہی سے لے گا، پہلا گروہ کہ درحقیقت قرآن مجید میں اس کے لئے دو فریضے مذکور ہیں اس میں سے ایک شوہر دوسری بیوی اور تیسری ماں ہے کہ بیوی مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو شوہر آدھا ترکہ لے گا اور اگر اس کی اولاد ہو تو اس کا حصہ ایک چوتھائی ہو جائے گا، اس کے علاوہ کسی بھی صورت میں اس کا حصہ ایک چوتھائی سے کم نہ ہوگا، اور اگر شوہر مر جائے تو اس صورت میں بیوی کا حصہ اس طرح ہوگا کہ اگر اس کے شوہر کی اولاد ہو تو وہ ایک چوتھائی حصہ یعنی آدھے کا آدھا لے گی اور اگر اولاد موجود ہو تو اس کا حصہ ایک چوتھائی سے ایک آٹھواں (۱/۸) ہو جائے گا لیکن اس کے علاوہ کسی بھی صورت میں کم نہ ہوگا یہی حال ماں کے حصہ کا ہے کہ اس کے لئے بھی دو طرح سے حصہ کا تعین ہوا ہے، ایک اس صورت میں جب

مرنے والے کا بھائی نہ ہو، تو ماں ایک تہائی (۱/۳) حصہ لے گی، اور اگر اس کے بھائی ہوں تو ماں ایک چھٹا (۱/۶) حصہ لے گی جو کہ ایک تہائی کا آدھا بنتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کسی بھی صورت میں اس کا حصہ کم نہ ہوگا۔ تو یہ وہ فرائض ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مقدم قرار دیا ہے، اور جو فرائض مقررہ و معینہ حصے مؤخر قرار دیئے گئے ہیں ان میں بیٹیوں اور بہنوں کے حصے ہیں، یعنی نصف (۱/۲) اور دو ثلث (۲/۳) کہ اگر کسی صورت میں ان میں کمی آئے تو ان کے لئے باقی ماندہ مال کے علاوہ کوئی مقدار معین نہیں، اب ایک صورت یہ ہے کہ اگر دونوں ورثہ موجود ہوں یعنی مقدم اور مؤخر دونوں یکجا ہوں تو تقسیم میں مقدم افراد کو پہلے پورے حصے دیئے جائیں گے اور اگر کچھ بچ گیا تو مؤخر افراد لیں گے، اگر کچھ نہ بچے تو مؤخر کے لئے کچھ نہ ہوگا۔

یہ سن کر زفر بن اوس نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو آپ نے یہ بات عمر سے کیوں نہ کہی؟

ابن عباس نے جواب دیا کہ ان کا رعب مانع تھا۔ (فروع کافی جلد ۷ صفحہ ۷۹)

ابن عباس کا مذکورہ بالا قول دراصل وہی ہے جو ان سے پہلے حضرت علی علیہ السلام نے عول کی نفی میں بیان فرمایا اور یہی بات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی ہے کہ ذیل میں اس کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

امام محمد باقرؑ کا فرمان

کافی میں منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

کان امیر المومنین (ع) یقول: ان الذی احصیٰ عدد رمل عالج لیعلم ان السھام لا تعول علی ستة لو تبصرون وجھھا لم تجز ستة.

(حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے تھے کہ وہ ذات کہ جسے بیابان کی ریت کے ذروں کی تعداد کا علم ہے وہ جانتا ہے کہ میراث کے حصے چھ سے کم نہیں ہوتے، اگر تم بھی غور کرو اور اس کا سبب جان لو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ حصے چھ سے تجاوز نہیں کرتے) (فروع کافی جلد ۷ صفحہ ۷۹)

کتاب صحاح اللغہ میں مذکور ہے کہ لفظ ''عالج'' بیابان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں ریت ہو، اور امامؑ کا یہ فرمان کہ میراث کے حصے چھ سے کم نہیں ہوتے (**ان السھام لا تعول علی ستة**) اس سے مراد یہ ہے کہ مجموعی طور پر چھ ہی رہتے ہیں اس سے بڑھتے نہیں اور وہ قرآن مجید میں اس طرح صراحت کے ساتھ ذکر ہوئے ہیں۔

نصف (۱/۲)، ثلث (۱/۳)، ثلثان (۲/۳) ربع (۱/۴) سدس (۱/۶)، ثمن (۱/۸)

یعنی آدھا، ایک تہائی، دو تہائی، ایک چوتھائی، ایک چھٹا اور ایک آٹھواں۔

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے: الحمد لله الذی لا مقدم لما اخر ولا مؤخر لما قدم (حمد ہے اللہ کے لئے کہ جسے اُس نے مؤخر کیا ہے اسے کوئی مقدم نہیں کرسکتا اور جسے اس نے مقدم کیا ہے اسے کوئی مؤخر نہیں کرسکتا) اس کے بعد امامؑ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارا اور فرمایا: اے امت محمدی ﷺ کہ جو اپنے نبی ﷺ کی رحلت کے بعد حیرت زدہ ہوگئی ہو اور سرگرداں نظر آتی ہو، اگر تم اسے ہی مقدم رکھتے جسے اللہ نے مقدم کیا اور اسے مؤخر کرتے جسے اللہ نے مؤخر کیا اور ولایت و وراثت اسی طرح رکھتے جس طرح خدا نے مقرر فرمایا تو نہ کوئی ولی اللہ محروم ہوتا اور نہ اللہ کے مقرر کردہ و معینہ حصوں میں کمی آتی، بلکہ اللہ کے حکم میں کوئی دو اختلاف ہی نہ کرتے، اور اگر امت کسی چیز میں اختلاف رائے بھی کرتی تو اس کے حل کے لئے قرآنی رہنمائی موجود تھی کہ جس کا علم علی بن ابی طالب علیہ السلام کے پاس تھا، اب تم اپنے کئے کی سزا کا سامنا کرو کہ تم نے نہایت کوتاہی سے کام لیا جبکہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا، "ولیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون" (بہت جلد ظالم اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے) ظلم کرنے والوں کو ان کا ٹھکانہ معلوم ہو جائے گا۔ "یا ایتها الامة المتحیرة بعد نبیها لو کنتم قدمتم من قدم الله واخرتم من اخر الله وجعلتم الولایة والوراثة حیث جعلها الله ما عال ولی الله ولا عال سهم من فرائض الله، ولا اختلف اثنان فی حکم الله ولا تنزعت الامة فی شیئ من امر الله الّا وعند علی (ع) علمه من کتاب الله، فذوقوا وبال امرکم وما فرطتم فیما قدمت ایدیکم، وما الله بظلام للعبید، وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون" (فروع کافی جلد ۷ صفحہ ۷۸)

میراث میں ورثہ کے حصوں میں کمی آنے کے بارے میں ہم مربوطہ مطالب بیان کر چکے ہیں، اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ کلام الٰہی میں چھ مقررہ حصے ذکر ہوئے ہیں: آدھا، ایک تہائی، دو تہائی، ایک چوتھائی، چھٹا حصہ اور آٹھواں حصہ، یہ حصے کبھی یکجا ہوتے ہیں اور کبھی ان کے درمیان تزاحم و ٹکراؤ کی صورت بن جاتی ہے مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ طبقۂ اول کے وارثوں میں نصف، سدس اور ربع یکجا ہو جاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ایک بیٹی، ماں باپ اور شوہر وارث ہوں تو (۱/۲) بیٹی کا، (۲/۶) ماں باپ کا اور (۱/۴) شوہر کا حصہ ہے، تو ترکہ کی تقسیم میں حصے، اصل مال سے زائد ہو جاتے ہیں، اسی طرح کبھی (۲/۳) اور (۲/۶) اور (۱/۴) یکجا ہوتے ہیں مثلاً دو بیٹیاں، ماں باپ اور شوہر، تو ان میں بھی حصوں کی مقدار کی بابت تزاحم و ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے طبقہ میں تزاحم کی مثال یہ ہے کہ ایک بہن، پدری و مادری، دادا دادی، نانا نانی، اور بیوی ہو تو نصف (۱/۲)، ثلث (۱/۳) ربع (۱/۴) اور سدس (۱/۶) اکٹھے ہوتے ہیں مثلاً دو بہنیں، جد، جدہ

اور شوہر، تو اس صورت میں بھی حصے، ترکہ سے زائد بنتے ہیں۔

مذکورہ بالا صورتوں میں اگر ہم کمی کو تمام حصوں میں تقسیم کریں تو اسے ''عول'' کہتے ہیں اور اگر ہم ماں باپ، شوہر و بیوی اور مادری قرابتداروں کے حصوں کو ان کی اصل مقدار میں باقی رکھیں اور کمی نہ آنے دیں بلکہ جس طرح کلام الٰہی میں مذکور ہے اسی پر عمل کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حصے معین کر دیئے ہیں اور ان میں کسی طرح کے ابہام کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی جبکہ ایک بیٹی یا ایک سے زیادہ بیٹیوں، اور پدری و مادری ایک یا ایک سے زیادہ بہنیں یا صرف پدری بہن و بہنیں، اس طرح مرد اور عورت کے حصے، خواہ ایک ہوں یا زیادہ ہوں تو کمی صرف اولاد، بھائیوں و بہنوں کے حصوں میں واقع ہوگی کہ اس حوالہ سے مربوطہ مطالب بیان ہو چکے ہیں۔

یہ سب کچھ اس صورتحال میں ہے جب حصے، ترکہ سے زیادہ ہوں۔ لیکن اگر اس کے برعکس صورتحال ہو یعنی ترکہ، حصوں سے زیادہ ہو تو مقررہ حصوں کی تقسیم کے بعد اضافی مال کس طرح تقسیم ہوگا اس کی تفصیل کتب حدیث و فقہ میں مذکور ہے لہٰذا ان کا مطالعہ کیا جائے۔

بھائیوں کی میراث کے بارے میں

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ حاکم نے مستدرک اور بیہقی نے سنن میں زید بن ثابت کے حوالہ سے روایت ذکر ہے کہ وہ میراث کی تقسیم میں میت کے دو بھائیوں کو ماں کے حصے میں حاجب قرار دیتے تھے یعنی ان کی وجہ سے ماں کو ثلث (۱/۳) کی بجائے سدس (۱/۶) حصہ دیتے تھے کہ دو بھائی، ماں کے اصل حصہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، جب ان سے پوچھا گیا کہ اے ابوسعید! قرآن مجید میں تو لفظ اِخْوَۃٌ آیا ہے ''فَاِنْ کَانَ لَہٗ اِخْوَۃٌ'' (اگر اس کے بھائی موجود ہوں) جو کہ کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے جبکہ آپ دو بھائیوں کو بھی ماں کے حصے میں حاجب و رکاوٹ سمجھتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ عرب دو بھائیوں کے لئے بھی لفظ ''اِخْوَۃٌ'' استعمال کرتے ہیں۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۲۶)

لغت کے اعتبار سے یہ بات درست ہے کہ لفظ ''اِخْوَۃٌ'' جو کہ ''اخ'' (بھائی) کی جمع کا صیغہ ہے اور وہ تین اور اس سے زیادہ افراد کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن میراث میں دو بھائیوں کے لئے استعمال ہونے میں بھی آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات موجود ہیں، چنانچہ اس کی تائید درج ذیل روایت سے ہوتی ہے:

''عن الصادق علیہ السلام قال: لا یحجب الام عن الثلث الا اخوان او اربع اخوات لاب وام اولاب''

(ماں کو ثلث (۱/۳) حصہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا سوائے دو بھائیوں یا چار پدری و مادری یا پدری بہنوں کے!) (فروع کافی، جلد ۷ ص ۹۲) لیکن یہاں لفظ ''اخوۃ'' کی بجائے ''اخوان'' مذکور ہے جو کہ لفظ ''اخ'' کا تثنیہ ہے اور اس کا معنی ''دو بھائی'' ہے۔ (م)

ماں کی میراث میں دو بھائیوں کے حاجب قرار پانے کی بابت کثیر روایات موجود ہیں، اور جہاں تک مادری بھائیوں کا تعلق ہے تو چونکہ ان کا حوالہ و نسبت ہی ماں کے ساتھ ہے لہٰذا وہ ماں کے لئے حاجب بن ہی نہیں سکتے بلکہ صورتحال اس کے برعکس ہے کہ ماں ان کے لئے حاجب و رکاوٹ بنتی ہے۔ شیعہ و سنی فریقین کی روایات میں مذکور ہے کہ بھائی، ماں کے ثلث (۱/۳) حصہ میں مانع ہوتے ہیں حالانکہ وہ خود دوسرے طبقہ میں سے ہونے کی وجہ سے میراث میں حصہ نہیں پاتے اور اپنے پہلے طبقہ کے افراد مثلاً والدین کی موجودگی میں میراث سے محروم ہوتے ہیں، یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب وہ خود میراث سے حصہ نہیں پاتے تو ماں کے لئے حاجب و مانع کیسے ہو سکتے ہیں اور اس کے حصہ کو ثلث سے سدس تک کیوں لے جا سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ قانون ایک طرح سے باپ کی مالی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ رکھتے ہوئے بنا ہے کہ میت کے بھائیوں یعنی اپنے بیٹوں کے اخراجات اسی کے ذمہ ہیں لہٰذا مقررہ حصہ سے زائد بھی باپ کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مادری بھائی، ماں کے حصہ میں کمی کا سبب نہیں بنتے کیونکہ ان کے اخراجات خود ان کے والد کے ذمہ ہیں نہ کہ میت کے باپ کے ذمہ!

وصیت اور قرضہ کا حکم

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیۂ مبارکہ ''مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ'' کے ذیل میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد گرامی منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''انکم تقرون فی ھٰذہ الآیۃ الوصیۃ قبل الدین، وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قطی بالدین قبل الوصیۃ'' (تم اس آیۂ مبارکہ میں ملاحظہ کرتے ہو کہ وصیت، قرض سے پہلے مذکور ہے، البتہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ قرضہ کی ادائیگی کو وصیت پر مقدم کرتے تھے۔''

سیوطی نے اس روایت کو تفسیر ''در منثور'' میں متعدد اسناد کے ساتھ کتب حدیث و تفسیر کے حوالوں سے ذکر گیا ہے، ملاحظہ ہو تفسیر ''در منثور'' جلد ۲ ص ۱۲۶۔

کلالہ کا معنی

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ کلالہ سے مراد وہ ہے جو نہ تو والد ہو اور نہ اولاد ہو (من لیس بوالد ولا ولد) (فروع کافی ۔ ج ۷ ص ۹۹)

اس سلسلہ میں ایک روایت مزید بھی فروع کافی میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ آیۂ مبارکہ ''وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً'' میں کلالہ سے مراد صرف مادری بھائی بہنیں ہیں (فروع کافی جلد ۷، صفحہ ۱۰۱)

کلالہ کی تفسیر میں اہل سنت کی اسناد سے متعدد روایات وارد ہوئی ہیں اور وہ شمار سے باہر ہیں، علم الحدیث کی اصطلاح میں اسی حد تک کثرت کے ساتھ وارد ہونے والی احادیث کو ''مستفیضہ'' کہا جاتا ہے۔ پدری اور پدری و مادری کلالہ کا حکم اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت ''یَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ'' میں بیان کیا گیا ہے، چنانچہ اس کی ثبوتی شہادت اس سے ملتی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں کلالہ کے لئے جن فرائض و مقررہ حصوں کا تذکرہ ہوا ہے وہ اس سے دگنا یا اس سے بھی زیادہ ہیں، اور جہاں تک زیر بحث آیۂ مبارکہ کا تعلق ہے تو اس میں غور و فکر کرنے اور آیات کے سیاق اور معینہ حصوں (فرائض) کو ملحوظ رکھنے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ خداوند عالم نے مردوں کا حصہ فی الجملہ، عورتوں سے دگنا یا اس سے بھی زیادہ مقرر فرمایا ہے جو کہ ''ترجیح المثلین علی المثل'' کے طور پر ہے یعنی دو ایک جیسوں کو ایک پر تقدم حاصل ہوتا ہے، یا اس سے قریب تر معنی کی بنیاد پر! اور کلالہ اسے کہتے ہیں جو ماں باپ دونوں یا ان میں سے ایک سے نسبت کی بناء پر میت سے قرابت رکھتا ہو، لہٰذا نتیجتاً حصوں کی مقدار کے تعین میں وہی فرق ان میں بھی پایا جائے گا جو خود باپ اور ماں (یعنی مرد اور عورت) کے حصوں میں پایا جاتا ہے، یعنی پدری کلالہ اور مادری کلالہ میں وہ فرق ملحوظ ہوگا جو خود پدر اور مادر میں پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ پدری کلالہ یا پدری و مادری کلالہ کا حصہ مادری کلالہ سے زیادہ ہے، اس سے واضح ہوا کہ مادری کلالہ کے لئے کم اور دوسروں کے لئے زیادہ حصہ ہے۔

امام رضا علیہ السلام کا مکتوب گرامی

کتاب ''معانی الاخبار'' میں محمد بن سنان کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے اس کے سوالات کے جواب میں جو خط لکھا اس میں مردوں اور عورتوں کی میراث میں فرق پائے جانے کی وجہ کے سوال کا جواب یہ دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت شادی ہوتے ہی مرد سے مال لیتی ہے (حق مہر) جبکہ مرد مال دیتا ہے لہٰذا مرد کے لئے عورت سے زیادہ حصہ مقرر ہے، اور مرد کو عورت سے دگنا حصہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ عورت کے اخراجات مرد کے ذمہ ہوتے ہیں اور اس کی تمام بنیادی ضروریات کو پورا کرنا مرد ہی پر واجب ہے جبکہ عورت پر اس طرح کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ شوہر کے اخراجات اور ضرورتوں کو پورا کرے، یہاں تک کہ اگر شوہر محتاج ہی کیوں نہ ہو تب بھی عورت پر اس کے

اخراجات کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، اسی وجہ سے میراث میں مرد کا حصہ عورت سے دگنا مقرر کیا گیا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے: ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ''(مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں بہ سبب اس فضیلت واضافہ کے، جو کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض پر عطا فرمایا ہے، اور بہ سبب اس کے کہ جو وہ اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں۔

امام صادقؑ کا صریح وواضح بیان

کتاب کافی میں احول کے حوالہ سے مذکور ہے کہ ابن ابی العوجاء نے کہا کہ بیچاری عورت کا کیا قصور ہے کہ وہ ایک حصہ لیتی ہے جبکہ مرد دو حصے لیتا ہے؟ اس کی یہ بات بعض احباب نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو بتائی، امامؑ نے اس کے جواب میں واضح وصریح الفاظ میں ارشاد فرمایا: ''ان المرأة ليس عليها جهاد ولا نفقة، ولا معقلة، فانما ذلك على الرجال. فلذلك جعل للمرأة سهمًا واحداً وللرجل سهمين ''عورت پر نہ تو جہاد واجب ہے اور نہ گھر کے اخراجات اور نہ ہی کسی کے جرم کی دیت کی ذمہ داری، جبکہ یہ سب کچھ مرد پر واجب ہے لہٰذا عورت کا حصہ ایک جبکہ مرد کا حصہ اس کا دگنا ہے (فروع کافی، جلد ۷ صفحہ ۸۵)

اس مطلب پر متعدد روایات موجود ہیں اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آیات قرآنیہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

ایک علمی بحث

اب ہم میراث کی بحث میں علمی حوالوں سے مربوطہ مطالب آٹھ فصلوں میں پیش کرتے ہیں تاکہ موضوع کے متعلقہ پہلوؤں سے آگاہی کا حصول ممکن ہو۔

پہلی فصل: میراث کا تاریخی حوالہ

میراث یعنی بعض زندوں کا اس مال کا مالک بننا جو مرنے والا شخص چھوڑ کر جائے، یہ سلسلہ انسانی معاشرہ میں رائج نہایت قدیم عادات ورسوم میں سے ہے۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا اور اس کی ابتداء کس دور میں ہوئی؟ اس حوالہ سے ہمارے

پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں اور جو مدارک و اسناد ہماری دسترس میں ہیں ان سے اس سلسلہ کے آغاز کا زمانی تعین ہمارے بس میں نہیں، البتہ اس قدر واضح و معلوم ہے کہ یہ سلسلہ قدیم زمانہ سے شروع ہوا اور انسانی معاشرہ میں رائج ہو گیا، اس کے ساتھ ساتھ طبع انسانی بھی اس کی صحت و ضرورت کی تائید و تاکید کرتی ہے کیونکہ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ معاشرتی زندگی میں ہر انسان مال و دولت بالخصوص وہ مال جس کا تصرف کسی کے ہاتھ میں نہ ہو اس کے حصول میں بھرپور رغبت رکھتا ہے تا کہ اس سے اپنی ضروریات کو پورا کرے، یہ طبعی رغبت و رجحان ابتدائی دور ہی سے انسان کی زندگی کے معمولات اور عمومی عادات کا حصہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اہم ترین نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جب سے انسان نے معاشرتی زندگی میں قدم رکھا۔ خواہ تہذیب و تمدن کا حامل معاشرہ یا غیر متمدن معاشرہ اسے قرب و قرابت کے رشتوں سے بے نیازی نہ رہی کہ جس کی بنیاد پر اقربیت و اولویت کے سلسلے قائم ہوئے یعنی کوئی کسی کا قرابتدار بنا اور کسی کو کسی پر فوقیت مل گئی کیونکہ اسی بنیاد پر افراد معاشرہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہوئے اور اسی سے گھر، نسل، قوم و قبیلہ اور اس طرح کے دیگر سلسلے تشکیل پائے، لہذا معاشرہ میں اس کے بغیر کوئی چارۂ کار ہی باقی نہ رہا کہ بعض افراد دوسرے بعض پر نزدیک اور دور ہونے کے حوالہ سے فوقیت کے حامل ہوں مثلاً بیٹا باپ سے بیٹا ہونے کے حوالہ سے، رشتہ دار مربوط رشتہ و تعلق کے حوالہ سے، دوست، دوست کے ساتھ دوستی کے ناطہ سے، آقا اپنے غلام سے آقائی کی نسبت سے، میاں بیوی ایک دوسرے سے زوجیت کے تعلق کی بناء پر، حاکم اپنی رعایا سے، یہاں تک کہ طاقتور کمزور سے، ان تمام حوالوں اور نسبتوں میں قرب و قرابت کی بناء پر ایک دوسرے سے وابستگی اور فوقیت قائم ہوگی۔ البتہ قرب و قرابت کے اصول و معیار معاشروں کے مختلف ہونے کی وجہ سے یکساں نہیں بلکہ ان میں اس قدر شدید اختلاف اور فرق پایا جاتا ہے کہ جسے لفظوں میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ نتیجتاً یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ میراث کا سلسلہ قدیم ترین معاشرتی معمولات سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسری فصل: میراث میں تدریجی تبدیلیاں

انسانی معاشروں میں مروّجہ عادات و رسوم کی طرح سلسلۂ میراث میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں اور اس کے ابتدائی دور ہی سے مرحلہ بہ مرحلہ ترقی کا ساماں ہوتا چلا گیا البتہ ان معاشروں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے تاریخ دار سلسلوں و مرحلوں سے آگاہی کا حصول نہایت دشوار ہے جو کسی خاص نظم و نظام اور اصول و اقدار کی پابند نہ تھیں بلکہ ان میں عام و خود ساختہ طرز زندگی رائج و معمول تھا، اس طرح کے معاشروں کے حالات کی تفصیلات معلوم کرنا مشکل ہے۔ البتہ صرف اس حد تک ان کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہو سکا ہے کہ وہ لوگ عورتوں اور کمزور افراد کو میراث سے محروم کرتے تھے اور

صرف طاقتور افراد کو میراث کا حقدار قرار دیتے تھے، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ان معاشروں میں خواتین، کمزور افراد، غلاموں اور بچوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھتے تھے جیسا کہ اس حیوان کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے جس کا کامل اختیار انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح مالک کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور وہ لوگ خواتین و کمزور افراد کو ان عام اسباب زندگی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے جن سے انسان اپنی عمومی ضروریات کو پورا کرنے میں استفادہ کرتا ہے جبکہ انہیں انسان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، ایسی صورت خواتین وضعیف افراد کی تھی کہ وہ اپنے معاشرتی حقوق سے سراسر محروم تھے اور انہیں انسانی حیثیت وشناخت قطعی حاصل نہ تھی، بنابرایں اس حالت میں میراث پانے والوں کا معیار مختلف رہا اور وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلی آتی رہی چنانچہ کبھی قوم یا قبیلہ کا سربراہ ہونا اور کبھی خاندان کا بزرگ ہونا معیار قرار پایا اور کبھی قوم کا شجاع و بہادر اور طاقتور ہونا ملحوظ ہوتا تھا، اس طرح میراث کے اصولوں اور ضوابط میں جوہری و بنیادی تبدیلیوں کی راہ ہموار ہوگئی اور ہر قوم نے اپنے مخصوص معیاروں کے مطابق میراث کے حقداروں کا تعین کرلیا، لیکن ان کمزور معیاروں اور خود ساختہ اصولوں میں انسانی فطرت کے تقاضوں کی تکمیل اور نوع بشر کی سعادت کی کوئی ضمانت موجود نہ تھی جس کی وجہ سے ان میں تبدیلیوں وتغیرات کا وسیع سلسلہ شروع ہوگیا یہاں تک کہ متمدن اقوام بھی اس کی لپیٹ میں آگئیں یا وہ مخصوص قومی عادات ان پر حاکم رہیں کہ جو معاشرتی قوانین کی صورت میں رائج تھیں۔ ان معاشروں میں سے روم و یونان کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن میراث کے مروجہ قوانین اور قوموں کے درمیان قائم وجاری اصول دیرپا ثابت نہ ہوسکے اور جس طرح اسلامی قانونِ وراثت کی جڑیں مضبوط ہوئیں اس طرح کسی دوسرے قانون نے استحکام نہ پایا چنانچہ اسلامی قانون وراثت کو اپنی ابتداء سے اب تک چودہ سو سال کا طویل ترین عرصہ مل چکا ہے اور اس کی افادیت کا سکہ جما ہوا ہے۔

تیسری فصل: متمدن اقوام میں قانون وراثت!

رومی معاشرہ کی مخصوص روایات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگ گھر یعنی خاندان کو ایک مستقل مملکت کی طرح سمجھتے تھے کہ جسے عمومی معاشرہ سے الگ حیثیت حاصل تھی، یہاں تک کہ وہ لوگ عمومی معاشرتی قوانین سے اپنے آپ کو مستثنیٰ گردانتے تھے اور اپنے لئے مخصوص معاشرتی حقوق قرار دیتے تھے چنانچہ اوامر ونواہی اور جزائی قوانین وسیاسی اصولوں میں اپنا مستقل نظام قائم کرتے تھے، اس بناء پر گھر یعنی خاندان کا سربراہ اپنے اہل وعیال یعنی زوجہ واولاد اور غلاموں کا خدا قرار پاتا تھا اور وہ اس کی پرستش کرتے اور اسے اپنا ''معبود'' سمجھتے تھے اور صرف وہی مالک ہونے کا حقدار تھا، اس کی زندگی میں کسی کو کسی چیز کی مالکیت حاصل نہ ہوتی تھی، وہی ان کے تمام امور کا ذمہ دار اور ان پر مطلق حاکم ہوتا کہ اسی کا فرمان نافذ

العمل ہوتا تھا، وہ خود اپنے گھر اور خاندان کا علی الاطلاق حاکم اور ''معبود'' قرار پانے کے باوجود اپنے سابق بزرگوں اور اسلاف کی پرستش کرتا تھا۔ لہٰذا اگر اس خاندان میں سے کوئی شخص مرجاتا تو اس کا تنہا وارث وہی ہوتا تھا مثلاً اگر کوئی لڑکا خاندان کے سربراہ کی اجازت سے کسی مال کا مالک ہوتا یا کوئی لڑکی اس کی اجازت سے مہر کی رقم کی مالک بنتی یا بعض رشتہ دار کسی مال کے مالک ہوتے تو ان کی وفات کے بعد ان کی وراثت صرف خاندان کے سربراہ کو ملتی تھی جو کہ رب البیت ہونے اور افراد خاندان کے علی الاطلاق مالک ہونے کا مطلب و مقتضیٰ بھی یہی تھا، اور جب وہ خود وفات پاتا تو اس کے بیٹوں یا بھائیوں میں سے کوئی ایک وارث قرار پاتا کہ جسے افرادِ خاندان اس مقام کا اہل سمجھتے تھے، وہی ان کے خشک وتر کا مالک ہوتا تھا، البتہ اگر اس کی اولاد میں سے کوئی شادی کرتا اور اپنے خاندان سے علیحدہ کوئی نیا خاندان تشکیل دیتا تو وہ اپنے خاندان اور گھر والوں کا سربراہ بن جاتا اور ان کا مالک ومختارِ کل قرار پاتا تھا، لیکن اگر وہ سب اپنے قدیم گھر میں ہی رہتے اور اکٹھے زندگی بسر کرتے تو اس صورت میں وہی شخص ان کا مالک ہوتا تھا جسے سب نے اس کے لئے اہل قرار دیا تھا خواہ وہ اس سابق سربراہ کا بھائی ہی کیوں نہ ہو، اور اسے وہی مقام حاصل ہوتا تھا جو سابق سربراہ کو حاصل تھا چنانچہ تمام افراد اسی کے تابع فرمان ہوتے اور اسی کی سربراہی وسرپرستی میں زندگی کا نظام اور متعلقہ امور چلاتے تھے، گویا وہ علی الاطلاق حاکم ہوتا تھا۔ اس معیار کے مطابق کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ منہ بولا بیٹا ہی وارث قرار پاتا کیونکہ عربوں میں منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کی حیثیت حاصل ہوتی تھی اور زمانہ جاہلیت میں یہ رسم عام تھی۔ لیکن زوجہ، بیٹی اور ماں ہرگز وارث نہ بنتی تھیں تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی شادیوں کی وجہ سے ترکہ دوسرے خاندانوں کو منتقل ہوجائے کیونکہ وہ لوگ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف مال وسرمایہ کے منتقل ہونے کو جائز وروا نہیں سمجھتے تھے، شاید اسی حوالہ سے بعض دانشوروں کا نظریہ ہے کہ روم والے انفرادی وشخصی مالکیت کی بجائے اجتماعی ومعاشرتی اور عمومی واشتراکی مالکیت کے قائل تھے۔ لیکن میرے خیال میں اس نظریہ کی بنیاد اشتراکی مالکیت کے عقیدہ کے علاوہ کچھ اور ہے کیونکہ غیر متمدن اقوام اور وحشی زندگی بسر کرنے والے لوگ بھی قدیم زمانہ سے اشتراکی مالکیت کو قبول نہیں کرتے تھے اور وہ اپنی چراگاہوں اور آباد وشاداب زمینوں میں کسی کی مالکیت کا اشتراک برداشت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ اپنی مملوکات کے تحفظ ودفاع میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ اگر اس سلسلہ میں انہیں جنگ بھی کرنی پڑتی تو وہ کر گزرتے تھے لیکن اپنی ملکیت میں کسی کو شریک نہیں ہونے دیتے تھے، تو یہ ایک طرح کی عام معاشرتی مخصوص مالکیت تھی کہ جس پر افراد کی بجائے انسانی معاشرہ کے مخصوص ومعین افراد کا اختیار تھا، البتہ اس کے باوجود انفرادی وشخصی مالکیت ممنوع نہ تھی اور نہ ہی عام معاشرتی مخصوص مالکیت افراد کی شخصی مالکیت کا راستہ روکتی تھی۔ انفرادی وشخصی مالکیت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور صحیح معنی میں اسے ہی تسلیم کیا جانا چاہیے لیکن جہاں تک زمینی حقائق کا تعلق ہے تو غیر متمدن اقوام نے اس کی عملی پاسداری کا حق ادا نہیں کیا اور اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اس میں اعتدال برقرار نہیں رکھا اور

اس کے مربوطہ پہلوؤں کی درستگی پر توجہ نہیں دی جبکہ اسلام نے اس کی حرمت وعزت کا تحفظ کیا اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اسے قانونی حیثیت عطا کی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا'' (اللہ نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے) سورۂ بقرہ، آیت: ۲۹ بنابرایں انسانی معاشرہ ہی اصل میں اسلامی معاشرہ ہے کہ جو شخص دائرہ اسلام میں ہو اور انسانی معاشرہ کا فرد ہو وہ روئے زمین پر موجود مال وثروت کا مالک بن سکتا ہے، اور پھر اسلامی معاشرہ کو اس مال و دولت کی مالکیت حاصل ہے جو اس کے اختیار میں ہو یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون وراثت میں کافر شخص مسلمان کی وراثت نہیں پا سکتا۔ اس اسلامی اصول کی مثالیں اور عملی نمونے بعض دیگر اقوام میں بھی موجود ہیں کہ وہ اپنی زمینوں اور غیر منقولہ اموال کی مالکیت کا حق غیروں (غیر ملکیوں اور غیر اقوام) کو نہیں دیتے بلکہ اپنے وطن کے مالک صرف اپنوں ہی کو قرار دیتے تھے اور چونکہ قدیم روم میں ''گھر'' کو مستقل مملکت کی حیثیت حاصل تھی لہٰذا ان میں بھی وہی قدیم رسوم وعادات حاکم ہو گئیں جو دیگر اقوام اور ممالک میں رائج تھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چونکہ رومیوں کے ہاں محرم عورتوں سے شادی بھی ممنوع تھی تو ان میں قرابت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی: (۱) خونی قرابت ورشتہ داری، اس لحاظ سے ان کے درمیان محرم عورتوں سے شادی ممنوع جبکہ غیر محرم عورتوں سے جائز وروا تھی (۲) قانونی قرابت ورشتہ داری، اس بنیاد پر ان کے درمیان وراثت، نان ونفقہ، ولایت وغیرہ کے قوانین حکم فرما ہوئے، قرابت ورشتہ داری کے ان دو حوالوں کی بناء پر بیٹوں کو دونوں ہی قرابتیں حاصل تھیں اور وہ ''گھر'' کے سربراہ اور خود اپنے درمیان اس حوالہ سے خونی وقانونی رشتہ دار تھے، جبکہ عورتیں سب کی سب صرف خونی قرابت رکھتی تھیں قانونی قرابت داری نہیں رکھتی تھیں لہٰذا عورت اپنے باپ، اولاد، بھائی، شوہر اور ان کے علاوہ دیگر افراد سے وراثت نہیں پاتی تھی۔

یہ تھی قدیم روم کے ہاں رائج عادت، اور جہاں تک قدیم یونان کا تعلق ہے تو ان کی صورتحال بھی قدیم روم سے زیادہ مختلف نہ تھی بلکہ ''گھر'' کی تشکیل اور خاندانی نظام کے حوالہ سے وہ بھی قدیم روم سے مشابہت رکھتے تھے اور ان میں وراثت کی صورت یہ تھی کہ بیٹوں میں سے صرف وہی وارث بنتا تھا جو سب سے زیادہ رشد رکھتا ہو جبکہ عورتیں خواہ بیوی ہو یا بیٹی یا بہن، سب ہی وراثت سے محروم ہوتی تھیں اور ان کے ساتھ چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم ہوتے تھے، البتہ اہل یونان بھی رومیوں کی طرح جسے بھی وارث بنانا چاہتے خواہ وہ بچہ ہو یا بیوی یا بیٹی و بھائی، اس کے لئے استثنائی راستے نکال لیتے تھے اور کسی بہانہ پر اسے وراثت کا حقدار قرار دے کر تھوڑا بہت مال دے دیتے تھے مثلاً وصیت وغیرہ کے ذریعے عمومی قانون و ضابطہ سے ہٹ کر اپنی پسند کے مطابق آسان ترین طریقہ سے انہیں میراث میں حصہ دار قرار دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں عنقریب وصیت کی بحث کے ضمن میں مزید مطالب ذکر کئے جائیں گے۔

اور ہندوستان، مصر اور چین میں بھی اسی طرح کی صورتحال تھی کہ میراث میں عورتوں کو مطلقاً محروم کرتے تھے

اور کمزور اولاد کو بھی وراثت کا حقدار نہیں سمجھتے یا انہیں ہمیشہ کسی کے تابع فرمان رکھتے تھے جو کہ قدیم روم و یونان کے ہاں رائج عادات سے مشابہ تھا۔

فارس میں صورتحال قدرے مختلف تھی اور وہ یوں کہ وہ لوگ محارم مثلاً بہن وغیرہ سے شادی روا جانتے تھے اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے وہ لوگ تعدد ازواج کو بھی جائز سمجھتے تھے اور متبنّٰی یعنی منہ بولے بیٹے بنانے کو بھی قانونی حیثیت دیتے تھے، یہاں تک کو شوہر اپنی محبوب ترین زوجہ کو منہ بولے بیٹے کا مقام دیتا تھا کہ جس کی بناء پر وہ حقیقی بیٹے کی طرح شوہر کی میراث میں حصہ دار ہوتی تھی جبکہ دیگر بیویاں وراثت میں حصہ دار نہیں ہوتی تھیں لیکن شادی شدہ بیٹی میراث نہیں پاتی تھی کیونکہ اس سے مال کے ''گھر'' سے نکل جانے کا اندیشہ ہوتا تھا البتہ غیر شادی شدہ بیٹی، بیٹے کے حصہ کا آدھا لیتی تھی، اور غیر عمر رسیدہ بیویاں اور شادی شدہ بیٹی میراث نہیں پاتی تھی کیونکہ اس سے مال کے ''گھر'' سے نکل جانے کا اندیشہ ہوتا تھا البتہ غیر شادی شدہ بیٹی، بیٹے کے حصہ کا آدھا لیتی تھی، اور غیر عمر رسیدہ بیویاں اور شادی شدہ بیٹی وراثت سے محروم قرار پاتی تھیں البتہ بڑی زوجہ، بیٹا، منہ بولا بیٹا اور غیر شادی شدہ بیٹی کو ترکہ میں سے رزق دیا جاتا تھا اور ان کی مالی ضروریات، نان ونفقہ پورا کیا جاتا تھا۔

جہاں تک عربوں کا تعلق ہے تو وہ عورتوں کو مطلقاً اور چھوٹے بچوں کو میراث سے محروم کرتے تھے جبکہ بیٹوں میں سے جو طاقتور اور قوی بدن ہوتا تھا کہ میدانِ جنگ میں شجاعت کے مظاہرے کرنے اور قبیلہ کی عزت و مقام کا دفاع کر سکتا ہو اسے خوب مال دیتے اور ترکہ میں حقدار قرار دیتے تھے، لیکن اگر ایسا کوئی شخص موجود نہ ہوتا تو میت کے دیگر رشتہ داروں (عصبہ) کو دے دیا جاتا تھا۔

یہ تھی میراث کی آیات کے نزول کے وقت دُنیا کی عمومی حالت! اس دور کی عمومی صورتحال کے بارے میں کثیر مؤرخین، محققین، ارباب فکر ونظر اور سفرناموں و کتب حقوق کے مؤلفین نے تفصیلات رقم کی ہیں، جو شخص ان تفصیلات سے آگاہی حاصل کرنا چاہے وہ ان کتب کا مطالعہ کر کے مربوطہ مطالب معلوم کر سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ میراث کی آیات کے زمانہ نزول میں عمومی صورتحال یہ تھی کہ خواتین، چھوٹے بچوں اور یتیموں کو میراث میں سے کچھ نہیں ملتا تھا، عورت کو اس بناء پر حصہ نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ یا تو کسی کی زوجہ ہے یا ماں ہے یا بیٹی ہے یا بہن ہے، اور اگر ان میں سے کسی کو کچھ مال دینا مقصود ہوتا تو اس کے لئے ''میراث'' کے علاوہ دیگر عناوین قائم کئے جاتے تھے، چھوٹے بچوں اور یتیموں کو بھی عمومی قانون وراثت کے علاوہ ولایت اور دائمی وغیر منقطع قیومت یعنی سرپرستی و ذمہ داری کے عنوان سے ترکہ میں سے کچھ دیا جاتا تھا۔

چوتھی فصل: ان حالات میں اسلام نے کیا کیا؟

متعدد بار بیان ہو چکا ہے کہ دینی احکام اور انسانی قوانین واصولوں کی حقیقی بنیاد وہ فطرت بشر ہے جس پر اللہ تعالیٰ

نے انسان کی تخلیق کی کہ جس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی (فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ) اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے میراث کا نظام ''رحم'' کی بنیاد پر استوار کیا جو کہ اصل فطرت اور محکم و مستحکم خلقت ہی سے عبارت ہے، اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹے کو وارث قرار نہیں دیا، چنانچہ ارشاد ہوا:

سورۂ احزاب، آیت ۴، ۵

○ ''وَمَا جَعَلَ اَدۡعِیَآءَکُمۡ اَبۡنَآءَکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ قَوۡلُکُمۡ بِاَفۡوَاهِکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ یَقُوۡلُ الۡحَقَّ وَهُوَ یَهۡدِی السَّبِیۡلَ ۝ اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَمَوَالِیۡکُمۡ''

(اور اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے قرار نہیں دیا، یہ سب تمہارے منہ سے نکلی ہوئی باتیں ہی ہیں (لقلقہ ءزبان) جبکہ اللہ جو کہتا ہے وہ حق ہے اور وہ سیدھی راہ کی رہنمائی فرماتا ہے، تم ان کو ان کے آباء کے نام سے پکارو کہ ایسا کرنا ہی اللہ کے نزدیک عدل کے عین مطابق ہے، اگر تم اُن کے آباء کو نہیں جانتے تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے دوست ہیں)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میراث میں خونی رشتہ اصل بنیاد ہے، اس کے بعد ترکہ میں حصہ پانے کے لئے قانونِ وراثت کے علاوہ ''وصیت'' کو بنیاد بنایا گیا ہے اور اسلام نے اسے مستقل اصولوں کے طور پر قرار دے کر اس کے حوالہ سے ترکہ میں حصہ داری کی راہ کھولی ہے، اگرچہ لوگ اسے بھی وراثت ہی سے منسلک سمجھتے ہیں اور وصیت کے ذریعے ترکہ میں حصہ دار ہونے کو بھی ''میراث'' ہی کا نام دیتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں صرف نام کا فرق نہیں بلکہ بنیادی فرق پایا جاتا ہے اور دونوں کی اصل و اساس ایک دوسرے سے مختلف ہے، وصیت کا معیار و اصول اور میراث کی اساس و بنیاد مستقل فطری حوالہ کی حامل ہے اور وہ یوں کہ میراث کی بنیاد ''رحم'' اور خونی رشتہ ہے کہ جس میں متوفی کی خواہش و چاہت ہرگز دخیل نہیں جبکہ وصیت میں متوفی کی چاہت و ارادہ ہی اصل بنیاد ہے جو کہ اس کی وفات کے بعد (یا یوں کہیں کہ وصیت کرنے کے وقت اس کا ارادہ مؤثر واقع ہوتا ہے) اور جن چیزوں کا وہ اپنی زندگی میں مالک ہوتا ہے کہ ان میں اس کی چاہت و ارادہ ہی عملی طور پر ملحوظ قرار پاتا ہے ان کے بارے میں اس کی وصیت پر عمل کرنا لازمی ہے، بنابرایں اگر ''وصیت'' کو ''میراث'' میں شامل کر لیا جائے تو صرف نام کا فرق باقی رہ جائے گا جبکہ عملی طور پر اور نتیجتاً یکساں ہیں)۔

اور جہاں تک عام لوگوں مثلاً قدیم روم والوں کے نزدیک ''میراث کے معیار'' کا تعلق ہے کہ وہ لوگ نہ تو خونی رشتہ کو اور نہ ہی متوفی کی خواہش و چاہت کو ملحوظ و معیار قرار دیتے تھے بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ ان کے ہاں متوفی کی اس ذاتی خواہش کے علاوہ کوئی چیز معیار نہ تھی کہ اس کا مال اس کے اس ''گھر'' ہی میں رہے جس میں وہ ''گھر کے سربراہ'' کے ماتحت زندگی بسر کرتا تھا یا یہ کہ اس کی موت کے بعد اس کا ترکہ اسے منتقل ہو جائے جسے وہ دوست رکھتا تھا اور اس پر شفقت کیا کرتا تھا،

بہر حال میراث کا معیار اور اصل واساس متوفی کی چاہت کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن اگر اس کا معیار خونی رشتہ اور رحمی تعلق ہوتا تو نجانے کتنے ایسے افراد ترکہ سے حصہ پاتے جو محروم ہوئے اور کتنے ایسے افراد محروم ہوتے جو حصہ دار بن گئے۔

میراث کے حوالہ سے جن دو معیاروں کا ذکر ہوا یعنی خونی رشتہ ورحمی تعلق اور متوفی کی چاہت وارادہ، ان کے تناظر میں اسلام نے وراثت کے لئے دو بنیادی اصول مقرر کئے اور انہی کو ترکہ کی تقسیم کا حقیقی معیار قرار دیا:

(۱) رحمی تعلق

(۲) مرد اور عورت کا وجودی فرق

رحمی تعلق کے حوالہ سے تمام افراد یکساں ہیں یعنی ان میں مرد اور عورت اور چھوٹوں و بڑوں کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا یہاں تک کہ ماں کے شکم میں موجود بچوں میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا، بلکہ سب ہی اس تعلق کی بناء پر ''قرابتداری'' میں مشترک حیثیت رکھتے ہیں اگر چہ ان کے درمیان تقدم و تاخر کی وجہ سے مختلف آثار پائے جاتے ہیں اور بعض افراد بالواسطہ اور بعض بلا واسطہ متوفی سے قربت وقرابت رکھتے ہیں مثلاً باپ، بھائی اور چچا، بنا برایں وراثت میں حصہ داری کا استحقاق رحمی تعلق میں پہلے اور بعد والے طبقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے متعین ہوتا ہے کہ پہلے طبقہ والے افراد دوسرے طبقہ والے افراد کے مانع ہوتے ہیں اور دوسرے طبقہ والے افراد تیسرے طبقہ والوں کے مانع ہوتے ہیں)۔

مرد اور عورت کے درمیان فرق کے حوالہ سے ان دونوں میں وجودی طور پر پائی جانے والی صفات وقوتیں ملحوظ ہوتی ہیں جو کہ تعقل واحساسات سے عبارت ہیں۔ چنانچہ مرد اپنی طبع وجودی کی بناء پر تعقل جبکہ عورت نہایت لطیف عواطف واحساسات کی حامل ہے، ان دو صنفوں میں پائے جانے والے اس وجودی فرق کی وجہ سے ان دونوں کی زندگیوں میں مملوکہ مال کی تدبیر اور ضرورتوں کو پورا کرنے میں اسے خرچ کرنے کے حوالہ سے واضح ونمایاں آثار دکھائی دیتے ہیں، یہی وہ بنیادی سبب ہے جس سے ایک ہی طبقہ میں ہونے والے افراد مثلاً بیٹا بیٹی، بھائی بہن کے حصوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی تفصیلات ہم عنقریب بیان کریں گے۔

پہلے معیار یعنی خونی رشتہ ورحمی تعلق کے حوالہ سے وارثوں کے درمیان طبقہ بندی متوفی سے نزدیکی ودوری اور قرابت میں بالواسطہ وبلا واسطہ یا واسطوں کے کم یا زیادہ ہونے کے تناظر میں ہوئی مثلاً پہلا طبقہ متوفی سے بلا واسطہ قربت کی بناء پر تشکیل پایا جس میں بیٹا، بیٹی اور ماں باپ شامل ہیں، دوسرا طبقہ بھائی، بہن اور جدہ وجد دادا دادی، نانا نانی) تو یہ افراد متوفی سے ایک ''واسطہ'' سے نسبت رکھتے ہیں یعنی باپ یا ماں یا دونوں! تیسرا طبقہ چچا، چچی، ماموں، ممانی، یہ افراد متوفی سے دو واسطوں کے ساتھ قرابت رکھتے ہیں یعنی متوفی کا باپ یا ماں اور اس کا جد اور جدہ تو اسی اصول پر دیگر رشتوں کا تعین ہوتا ہے، اور جہاں تک اولاد کا تعلق ہے تو وہ خواہ جس طبقہ سے کیوں نہ ہو وہ اپنے آباء کے قائم مقام ہوتے ہیں اور بعد والے طبقہ کے

افراد کے مانع ہوتے ہیں، اور شوہر و بیوی ازدواجی بندھن کی بناء پر خونی اختلاط کے نتیجہ میں تمام طبقوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں کہ نہ تو کسی طبقہ والے ان کے حصہ دار بننے میں مانع ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ خود کسی طبقہ کے افراد کی وراثت میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

دوسرے میعار یعنی مرد اور عورت کے درمیان وجودی حوالہ سے پائے جانے والے فرق کے تناظر میں مرد کو عورت کا دگنا حصہ دار قرار دیا گیا ہے البتہ اس میں ماں اور ماں سے قرابت رکھنے والے رشتہ دار شامل نہیں کیونکہ ماں، باپ سے آدھا حصہ نہیں لیتی اور نہ ہی ماں سے قرابت والے رشتہ داروں میں مرد کا حصہ عورت سے دگنا ہوتا ہے بلکہ وہ ماں کے حصہ ہی میں برابر مقدار کے وارث ہوتے ہیں۔

اور اسلام کے قانونِ وراثت میں مقرر کئے گئے چھ حصے نصف (۱/۲) دوثلث (۲/۳) ثلث (۱/۳) ربع (۱/۴) سدس (۱/۶) ثمن (۱/۸) اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح وہ مال جو صرف ایک وارث کو ملتا ہے اگرچہ مذکورہ بالا مقررہ و متعینہ حصوں سے مختلف ہو جاتا ہے یعنی بعنوانِ ''رد'' اسے ہی دے دیا جاتا ہے جس سے وہ اپنے حصہ سے زیادہ یا کبھی کم حاصل کرتا ہے، اسی طرح باپ، ماں اور کلالۃ الام یعنی ماں کے قرابتدار، اگرچہ ان کے فرائض یعنی مقررہ و معینہ حصے عمومی ضابطہ یعنی ''مرد کے لئے عورت کا دگنا حصہ'' (لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ) سے مختلف ہیں کہ اس بناء پر میراث کے باب میں کلی طور پر اور جامع صورت میں بحث کرنا دشوار ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود تمام افراد ایک ہی ''نوع'' ہونے کے حوالہ سے ایک دوسرے کو اپنا جانشین بناتے ہیں، تاہم نتیجتاً اسلام کے قانون وراثت کی بنیاد وہی عمومی ضابطہ یعنی ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' ہوتا ہے کہ جس سے عملی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے دنیا میں موجودہ مال و ثروت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے: (۱) ثلث (۱/۳) دوثلث (۲/۳) ایک تہائی عورتوں کے لئے اور دو تہائی مردوں سے مختص ہو جاتی ہے، تو یہ حصہ داری ان دو صنفوں کی مالکیت کے حوالہ سے ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اس مقدار کا مالک قرار دیا گیا ہے لیکن جہاں ان اموال کو خرچ کرنے کا تعلق ہے تو اس میں عمومی ضابطہ ملحوظ نہیں ہوتا بلکہ زوجہ کے اخراجات شوہر کے ذمہ ہوتے ہیں اور اسلام شوہر کو بیوی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ اس سلسلہ میں عادلانہ روش اختیار کریں اور تقاضائے عدل یہ ہے کہ بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں برابری و مساوات اختیار کریں، اس کے باوجود اسلام عورت کو اس کے مملوکہ اموال میں مرد کی حالت کے بغیر کامل استقلال دیتا ہے کہ وہ اپنے اموال میں جس طرح چاہے تصرف کرے، لہٰذا ان تین حوالوں کے تناظر میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ عملی طور پر اسلام نے عورت کو دنیا کی تمام ثروت میں سے دو تہائی (۲/۳) پر تصرف کا حق عطا کیا ہے (ایک تہائی خود اس کا اپنا مال اور ایک تہائی مرد کے حصہ (دو تہائی) میں سے!) اس طرح مرد کے لئے ایک تہائی سے زیادہ کچھ نہیں بچتا، یہ ہے اسلام کی عادلانہ تقسیم کا ایک عملی نمونہ!

پانچویں فصل: اسلام میں خواتین اور یتیموں کا مقام واحترام

جہاں تک یتیموں کا تعلق ہے تو وہ طاقتور مردوں ہی کی طرح وراثت میں حصہ پاتے ہیں اور ان کے اموال میں ان کے اولیاء مثلاً باپ، دادا یا عام اہل ایمان یا اسلامی حکومت کی نگرانی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یعنی ان کے اولیاء ان کے اموال کو تجارت وغیرہ میں استعمال کر کے ان کے لئے ان میں اضافہ کی راہیں کھولتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بالغ ہو جائیں اور اموال کی حفاظت کی سوج بوجھ پالیں تو ان کے اموال ان کے سپرد کر دیتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنی مستقل زندگی دوسرے افراد معاشرہ کی طرح گزار سکیں، تو سب سے زیادہ عادلانہ طریقہ یہی ہے جو ان کے بارے میں تصور کیا جاسکتا ہے۔

اور خواتین کو عام طور پر دنیا کے ایک ثلث کا مالک سمجھا جاتا ہے جبکہ وہ حقیقت میں دوثلث میں تصرف کرتی ہیں جیسا کہ اس سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے، اور وہ آزادی واستقلال سے بہرہ ور ہوتی ہیں انہیں ان کے اموال میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ اس میں انہیں مردوں کی طرف سے کسی طرح کی سرپرستی ونگرانی وغیرہ کی دائمی یا عارضی وغیر دائمی صورت میں بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ جو کچھ خود اپنے بارے میں نیک کام کرنے کا فیصلہ کریں اس میں مردوں کو مداخلت کا حق حاصل نہیں، یعنی ان کی اپنی ذات تک کچھ کرنے کا انہیں اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کوئی اچھا و نیک کام کرنا چاہیں تو اس میں مردوں کی دخل اندازی نہیں ہوتی ہے۔

اس بناء پر اسلام میں عورت کو ارادہ وعمل میں ہر حوالہ سے مرد کے برابر آزادی حاصل ہے۔ اور وہ مرد سے قطعی مختلف مقام نہیں رکھتی سوائے ان امور کے، کہ جو اس کی مخصوص وجودی کیفیات سے مربوط ہیں جو کہ مردوں کی وجودی صفات وکیفیات سے فرق رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ ان کی زندگی احساسات جبکہ مردوں کی زندگی تعقل سے آمیختہ ہے کہ اسی وجہ سے اموال کی عمومی ملکیت میں اسے زیادہ حق دیا جاتا ہے تا کہ دنیا میں تعقل پر مبنی تدبیر کو احساسات وجذبات اور عواطف پر مبنی تدبیر پر فوقیت حاصل ہو اور اس کمی کا تدارک بھی ہو جائے جو اموال میں زیادہ تصرف کا حق پانے کی وجہ سے پیدا ہو سکتی ہے کہ مرد اپنے تعقل کے ساتھ اس کا جبران کر لیتا ہے، عورت پر واجب قرار دیا گیا ہے کہ وہ مباشرت وہمبستری کے معاملہ میں شوہر کی اطاعت کرے اور اس کا تدارک حق مہر معین کر کے کیا گیا ہے۔ عورت کو قضاوت وحکمرانی اور خود میدان میں آکر جنگ میں شامل ہونے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ یہ تمام امور احساسات کی بجائے تعقل پر مبنی ہوتے ہیں اور اس ممنوعیت کا تدارک وتلافی اس طرح کی گئی ہے کہ مردوں پر واجب قرار دیا گیا ہے کہ ان کی حفاظت ومحافظت اور ان کی عزت وناموس کے تحفظ کو یقینی بنائیں اور اس سلسلہ میں اپنے تمام وسائل وتوانائیاں بروئے کار لائیں۔ چنانچہ مردوں ہی کو ان کے لئے رزق وروزی کما کر ان پر اولاد ووالدین پر خرچ کرنے اور ان کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے شوہروں سے بچوں کی نگہداشت کا معاوضہ بھی طلب کر سکتی ہیں ان تمام امور میں عادلانہ صورت پیدا

کرنے کے لئے دیگر امور کے ذریعے ان کی عزت وحرمت کی پاسداری کے اسباب مہیا کئے گئے ہیں مثلاً انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ حجاب لیں اور نامحرم مردوں کے ساتھ کم سے کم حد تک میل جول کریں اور گھر کے امور کی تدبیر اور اولاد کی تربیت پر اپنی توجہات مبذول کریں۔

اسلام نے خواتین کو عمومی معاشرتی امور کی تدبیر کی ذمہ داری سونپنے کی جو ممانعت کی ہے مثلاً دفاع، قضاوت اور حکمرانی وغیرہ تو اس کی وجہ ان میں طبعی طور پر موجود عاطفہ وجذبات اور احساسات ہیں کہ اس کی تصدیق وتائید ان تلخ نتائج سے ہوتی ہے جن سے عصر حاضر میں انسانی معاشرہ دو چار ہوا ہے اور وہ سب کچھ تعقل پر احساسات کے غالب آنے سے ہے، چنانچہ آپ عالمی جنگوں کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو ان حقائق سے بخوبی آگاہی حاصل ہو جائے گی کہ ان جنگوں نے کیا اثرات باقی چھوڑے ہیں، یہ جنگیں موجودہ تمدن ہی کے تحفے ہیں کہ ان کے نتیجہ میں دنیا کس قدر سنگین ترین حالات کا شکار ہو چکی ہے اور کس قدر شدائد میں مبتلا ہے، اگر ان حالات اور سنگین ترین صورتحال کو عقل واحساس کی روشنی میں دیکھیں تو واضح طور پر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ لوگوں کے دھوکہ میں آنے کا اصل سبب کیا ہے اور ان تلخ حالات سے چھٹکارا و بچاؤ کا صحیح راستہ کونسا ہے، اللہ ہی راہ حق کی رہنمائی کرنے والا ہے۔

اس کے علاوہ یہ مطلب قابل توجہ ہے کہ مغرب کی متمدن قومیں صدیوں سے کوشاں ہیں اور اسی سلسلہ میں انہوں نے کسی طرح کی کوتاہی سے کام نہیں لیا کہ لڑکیاں، لڑکوں کے ساتھ مل کر تربیت حاصل کریں اور دونوں ایک ہی صف میں کھڑے ہوں، تاکہ اس طرح صنف نازک میں جو بنیادی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں وہ مرحلۂ قوت سے مرحلۂ عمل میں آجائیں، اگر آپ اس سلسلہ میں میدانی حقائق پر غور کریں اور دنیا میں موجود نابغۂ روزگار سیاسی شخصیات، عدلیہ وقانون سازی کے ماہرین، عسکری سربراہان وفوجی قیادتیں (یعنی معاشرے کے تین اہم ترین ستون، حکمران، عدلیہ اور فوج) ان میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں بھی خواتین کے نام اور تعداد مردوں کے مقابلے میں غیر معمولی دکھائی نہیں دیتی۔ یہ بات اپنی جگہ ایک بہت بڑا سچا گواہ ہے کہ خواتین طبعی طور پر ان امور میں ٹھوس صلاحیتیں نہیں پاتیں کہ جن میں تعقل ہی کو فوقیت وبرتری اور حاکمیت حاصل ہے چنانچہ ایسے امور میں جذبات واحساسات کی عملداری جس قدر زیادہ ہوگی اتنا ہی مقصود کے حصول میں ناکامی و ناامیدی اور خسارہ ونقصان زیادہ ہوگا۔

مذکورہ بالا مطالب اور ان جیسے دیگر حقائق اس مشہور غلط نظریہ کا ایک مضبوط ترین جواب ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ انسانی معاشرہ پر مردوں کے مقابلے میں خواتین کی عدم پیشرفت کا واحد سبب یہ ہے کہ قدیم ترین زمانے سے ان کی صالح تربیت پر توجہ نہیں دی گئی اور اس سلسلہ میں نہایت کمزور وضعیف اقدام ہوئے جس کے نتیجہ میں وہ مردوں سے پیچھے رہیں ورنہ اگر ان کی تربیت صالحہ پر بھرپور توجہ دی جاتی تو ان میں پائے جانے والے جذبات واحساسات اور وجودی وطبعی عواطف انہیں کمالات کی اس منزل تک لے جاتے کہ وہ مردوں کے برابر یا ان سے بھی تقدم حاصل کر لیتیں۔

یہ استدلال اس استدلال سے مشابہت رکھتا ہے جو مطلوب کے برعکس نتیجہ دیتا ہے کیونکہ خواتین کا جذبات و احساسات اور عواطف کا حامل ہونا ہی ان کی عدم پیش رفت اور جن امور میں تعقل کو احساسات پر فوقیت حاصل ہے مثلاً حکمرانی وقضاوت، ان میں مردوں سے پیچھے رہ جانے کا اصل سبب و بنیادی عامل ہے جبکہ ان امور میں احساسات وعواطف سے زیادہ عقلانی قوت کے حاملین یعنی مردوں کو تقدم حاصل ہے۔ چنانچہ تجربات اس حقیقت پر مضبوط اور قطعی گواہ ہیں کہ جو شخص کسی بھی روحانی صفت سے مزین ہو اور وہ صفت اس میں راسخ ہو چکی ہو تو وہ اس کام میں اپنا مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو اس صفت کی عملداری سے موزونیت رکھتا ہو، لہٰذا اس کا منطقی ولازمی نتیجہ یہ ہے کہ مردوں کی تربیت کا اثر و نتیجہ حکمرانی و قضاوت جیسے امور میں خواتین سے زیادہ ہوگا اور وہ ان امور میں ان سے ممتاز ہوں گے۔ جبکہ خواتین کی تربیت ان امور میں زیادہ نتیجہ بخش ثابت ہوگی جن میں عواطف و احساسات اور طبعی نزاکتیں مؤثر ثابت ہوتی ہیں مثلاً بعض طبی شعبے، فوٹوگرافی، موسیقی، سلائی، کڑھائی، کھانا پکانا، بچوں کی تربیت، تیمارداری اور آرائش و زیبائش وغیرہ، اس طرح کے امور میں خواتین، مردوں سے ممتاز ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر امور میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ وہ برابر ہوتے ہیں۔

یہاں ایک بات یہ بھی کی گئی ہے کہ مذکورہ امور میں خواتین کا مردوں سے پیچھے رہ جانا اتفاقی امر ہے نہ کہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہوتا جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تو انسانی معاشرہ میں طویل ترین زمانہ گزر جانے کے بعد کسی بھی دور میں اس کے برعکس صورتحال سامنے آجاتی جبکہ ایسا نہیں ہوا اور کروڑوں سالوں کے طویل دورانیہ میں اس کے برعکس صورتحال نظر نہیں آئی، اور یہی صورت مردوں کی بابت بھی پائی جاتی ہے کہ جو امور خواتین کے ساتھ مختص ہیں ان میں مردوں کو پیش رفت و تقدم حاصل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم کسی بھی نوع کے مخصوص ومختص امور بالخصوص انسانیت سے مربوط بنیادی امور کو اتفاقی قرار دیں تو پھر ہمارے پاس کسی انسانی صفت کے حوالہ سے فطری حقیقت کا تصور ہی باقی نہ رہے گا مثلاً انسان کا طبعی طور پر تمدن وتہذیب اور ترقی و پیشرفت کا خوگر ہونا، علم و آگاہی کا دلدادہ ہونا، کائنات کے اسرار ورموز کے بارے میں تحقیق کاری اور اس طرح کے دیگر امور ومسائل، تو یہ تمام صفات فطری ہیں اور نوع انسانی کی طبع وجودی کا بنیادی حصہ ہیں اور یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہیں جیسے ہم نے کمالی ظریف امور میں خواتین کے تقدم اور تعقلی و بھاری اور شدید مشکل و دشوار امور میں ان کے تاخر کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس کا سبب ان کی طبع وجودی ہے یہی حال مردوں کے تقدم و تاخر کا ہے کہ اس میں بھی ان کی طبع وجود دخیل ہے۔ تو ان مطالب کے تناظر میں مردوں اور عورتوں کی کمالی جہات کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ تعقلی حوالہ سے مردوں کے مقابلے میں خواتین کم درجہ کی حامل ہوں اور احساسات وعواطف کے حوالہ سے مردوں پر فوقیت رکھتی ہوں۔ جبکہ یہ بات درست نہیں کیونکہ اسلام، تعقل و احساس دونوں کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں قرار دیتا ہے کہ جو انسان کے وجود میں رکھی گئی ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی میں ان سے بھرپور استفادہ کر سکے، نہ یہ کہ ان کے حوالہ سے ان کے درمیان ایک دوسرے پر برتری و فوقیت کی نسبتیں قائم کی جائیں کیونکہ

فضیلت و برتری اور شرف و اعزاز کا معیار تقویٰ کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا دیگر تمام کمالات خواہ ان کا تعلق کسی بھی امر سے ہو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر ملحوظ ہوں گے کہ اگر ان میں تقوا ملحوظ نہ ہو تو ان کی حیثیت اور قدر و قیمت کچھ بھی باقی نہ ہو گی بلکہ وہ بدترین صورت کے ساتھ ان کے اعمال نامہ کو داغدار کر دیں گے۔

چھٹی فصل: عصر حاضر کے قوانین میراث

عصر حاضر میں جو قوانین وراثت جاری و نافذ ہیں وہ اگرچہ کمیت و کیفیت دونوں حوالوں سے اسلامی قانون وراثت کہ اس کا اجمالی تذکرہ عنقریب ہوگا اس سے قطعی مختلف ہیں بلکہ اس سے کسی طرح کی مطابقت نہیں رکھتے، لیکن ان قوانین کی تدوین میں ابتداء سے لے کر اب تک یعنی ان کے ظہور پذیر ہونے اور معاشرے میں نافذ و قابل عمل ہونے تک اسلامی قوانین و احکام کا سہارا لیا گیا جبکہ خواتین کے بارے میں اسلامی قانون وراثت کی تدوین و تشکیل کا موجودہ قوانین کی تشکیل و تدوین کے ساتھ بہت زیادہ زمانی و اصولی فرق و فاصلہ پایا جاتا ہے، اسلام نے جب میراث کو قانونی صورت دی اس وقت دنیا میں اس حوالہ سے کچھ بھی موجود نہ تھا اور نہ ہی لوگوں کے کانوں تک اس سلسلہ میں کسی بھی دین و آئین کی طرف سے کچھ سننے کو ملا تھا، بلکہ اس سلسلہ میں نسل در نسل کسی ضابطہ و اصول کے بارے میں کوئی بات کسی کو معلوم نہ تھی یعنی کسی بھی قوم کے بڑوں نے اس حوالہ سے کوئی اصول و ضابطہ اپنی نسل کو نہیں بتایا تھا۔ یہ تو اسلام کی عطا و عنایت تھی کہ لوگوں میں صدیوں تک میراث کے قوانین کو عام کیا اور اس کی بنیادیں مضبوط و مستحکم کیں جس کے نتیجہ میں دس صدیوں سے زیادہ عرصہ تک نسل در نسل ان قوانین کی عملداری ہوئی تو لوگ ان کی اہمیت و آثار سے آگاہ ہوئے اور پھر عصر حاضر کے قوانین کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علم النفس کی بحثوں میں یہ نکتہ ملحوظ ہوتا ہے بلکہ اس کا شمار مسلم الثبوت امور میں ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز عالم الخارج میں وجود پذیر ہو اور پھر معاشرہ میں اس کی جڑیں مضبوط ہو جائیں، یہاں تک کہ مرحلۂ عمل و نفاذ میں اس کے آثار ظاہر ہوں تو وہ اپنے مشابہ امور کی وجود پذیری میں بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے اور ہر معاشرتی سنت و روش کا یہی حال ہے کہ وہ بعد میں وجود پانے والی ہر روش و اصولِ عمل کی بنیاد قرار پاتی ہے بلکہ حقیقت میں وہی بعد والی سنت و روش کی تبدیل شدہ صورت ہوتی ہے۔ لہٰذا علم الاجتماع کا کوئی محقق اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ موجودہ قوانین میراث دراصل اسلامی قانون میراث ہی کی روشنی میں تشکیل دیئے گئے اور اسی کی بنیاد پر ان کی تدوین یقینی ہوئی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو ان کی صورتگری ممکن نہ ہوتی، اس تبدیل شدہ صورت میں اس کے ساتھ انصاف برتا گیا یا ناانصافی ہوئی یہ الگ مسئلہ ہے۔

مذکورہ بالا مطالب و حقائق کے باوجود کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ کوئی شخص تعصب کی بناء پر کہ خدا اس طرح کے قدیم جاہلانہ تعصب کا خاتمہ کرے یوں کہے کہ عصر حاضر کے قوانین کا سرچشمہ قدیم روم کے قوانین ہیں۔ جبکہ آپ قارئین کرام قدیم

روم کی روش ہائے زندگی اور معاشرتی اصولوں سے آگاہ ہو چکے ہیں اور آپ کو ان امور سے بھی آگاہی حاصل ہو چکی ہے جو اسلام نے انسانی معاشرہ کے لیے پیش کیے اور میراث کے حوالہ سے اسلام نے جن اصولوں سے نوازا وہ قدیم روم کے قوانین اور جدید مغربی قوانین کے ظہور پذیر ہونے اور قابل عمل ہونے کے درمیانی دورانیہ میں عملی صورت کے ساتھ سامنے آئے اور ان کی وجودی شناخت ان کی عملداری کے واضح آثار کے ذریعے ہوئی، ان اسلامی قوانین کو کروڑوں بلکہ اربوں وکھربوں انسانوں نے صدیوں تک اپنایا اور عملی طور پر اپنے معاشروں میں نافذ کیا، تو کیونکر ممکن ہے کہ عصر حاضر کے قانون سازوں نے ان قوانین سے استفادہ نہ کیا ہو اور ان کی ٹھوس نظریاتی خصوصیات ان کے افکار پر اثر انداز نہ ہوئی ہوں؟

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسلامی قانون میراث کے بارے میں یہ حضرات کہتے ہیں کہ وہ قدیم رومی قانون میراث سے ماخوذ ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے!

خلاصہ کلام یہ کہ موجودہ دور میں مغربی اقوام کے درمیان مروجہ قوانین میراث اپنی بعض خصوصیات میں اختلاف کے باوجود مردوں اور عورتوں کی وراثت میں برابری پر متفق ہیں اور ان میں بیٹوں، بیٹیوں اور ماں باپ کے حصے مساوی قرار دیئے گئے ہیں، اس طرح بھائیوں، بہنوں، چچوں چچیوں کے حصوں میں بھی مساوات قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ فرانس میں مرتب کئے جانے والے حصہ داروں کی فہرست اس طرح مقرر کی گئی ہے: (۱) بیٹے بیٹیاں (۲) والدین اور بہن بھائی (۳) دادا دادی و نانا نانی (۴) چچا چچی، ماموں ممانی، پھپھا پھپھی، اس تقسیم بندی میں زوجیت کے رشتہ کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ اسے دونوں کے درمیان محبت و الفت پر موقوف و مبنی قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان محبت و الفت ہوگی تو وہ ایک دوسرے کے لئے میراث کا حصہ خود ہی معین کر دیں گے، بہرحال اس وقت ہم اس کی تفصیلات بیان کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہی دیگر طبقات کے حصوں کی صحت و عدم صحت پر کوئی بحث کرنا چاہتے ہیں، جو ان تفصیلات سے آگاہ ہونا چاہے وہ ان کے موزوں مقامات کی طرف رجوع کرے۔

اس مقام پر جو بات ہمارے لئے اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ اس طرزِ عمل اور روش و قانون کے اثر و نتیجہ پر نظر ڈالیں کہ جس میں مرد اور عورت کو دنیا کی دولت و ثروت میں یکساں شریک قرار دیا گیا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ عصر حاضر کے قانون وراثت میں اگرچہ بظاہر عورت کو مرد کے برابر حصہ و حق دینے کی بات ہوتی ہے لیکن حقیقت میں اور امر واقع میں ایسا نہیں بلکہ اہل مغرب نے بیوی کو شوہر کا دست نگر قرار دے کر اسے اس کے مملوکہ اموال میں تصرف کرنے کا حق بھی نہیں دیا، یہاں تک کہ وہ اس مال میں بھی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کر سکتی جو میراث میں اسے حاصل ہوا، تو نتیجتاً وہ مال بھی مرد اور عورت دونوں کی ملکیت ہو جاتا ہے اور اس کے تصرف کے موارد اور استعمال کے مواقع صرف مرد معین کرتا ہے، گویا پورے مال کا اختیار مرد کے پاس ہوتا ہے، اس قانون کے خلاف کچھ گروہ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جنہوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور وہ اپنی توانائیاں بروئے کار لا کر اس سلسلہ میں بھرپور کوشاں ہیں کہ خواتین کو استقلالی

حیثیت دیں اور انہیں مردوں کی سرپرستی و ذمہ داری کے نظام سے باہر کریں تاکہ وہ اپنے اموال میں مالکیت کی بنیاد پر تصرف کرسکیں، اگر وہ لوگ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہو گئے تو نتیجتاً دونوں صنفیں اموال کی ملکیت اور تدبیر و تصرف میں برابر ہو جائیں گے اس سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ساتویں فصل: مختلف قوانین میراث کا موازنہ

اب تک ہم نے سابقہ امتوں اور صدیوں پر محیط مختلف معاشروں میں جاری و نافذ قوانین کا جو اجمالی تذکرہ کیا ہے اس کی روشنی میں ہم ارباب بحث و تحقیق کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ وہ خود ان قوانین کے درمیان موازنہ کریں اور یہ فیصلہ کریں کہ ان میں سے کون سے قوانین کامل اور کون سے ناقص ہیں، کن قوانین میں انسانی معاشرے کے لئے بہتری و فوائد ہیں اور کن میں نقصانات ہیں، اور کون سے قوانین نوع انسانی کے لئے سعادت بخش ہیں اور کون سے اس اثر گزاری سے محروم ہیں، اس جامع موازنہ کے بعد اس کا تقابلی جائزہ لے کر اسلامی قانون میراث پر نظر ڈالیں اور ملاحظہ کریں کہ اسلام نے خواتین کو وراثت میں جو حق دیا ہے وہ کس قدر عادلانہ ہے، اس طرح صحیح نتیجہ تک پہنچنا آسان اور یقینی ہو جائے گا۔

البتہ ہم یہاں اس سلسلہ میں جس نتیجہ تک پہنچے ہیں اور ایک واضح حقیقت کے طور پر اسے بیان کرسکتے ہیں وہ یہ کہ اسلامی قانون میراث اور دیگر قوانین کے درمیان غرض و غایت کے حوالہ سے بنیادی و جوہری فرق پایا جاتا ہے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا اپنی بہتری کی منزل پالے جبکہ دیگر اپنی خواہشات کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں چاہتے، انہی دو بنیادوں پر تمام امور مرتب ہوتے ہیں اور انہی دو اصولوں پر تمام فروع تشکیل پاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۶

○ ''وَعَسٰٓی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾''

(کتنی چیزیں ایسی ہیں جو تمہیں ناپسند ہیں جبکہ ممکن ہے وہ تمہارے لئے بہتر ہوں، اور کتنی چیزیں ایسی ہیں جو تمہیں پسند ہیں جبکہ ممکن ہے وہ تمہارے لئے بری ہوں، اللہ ہی جانتا ہے تم کچھ نہیں جانتے)

سورۂ نسا، آیت: ۱۹

○ ''وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّیَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا ﴿۱۹﴾''

(اور تم ان کے ساتھ نیک سلوک کرو، لیکن اگر تم انہیں ناپسند کرو تو ممکن ہے کسی چیز کو تم ناپسند کرو جبکہ اللہ اس میں خیر کثیر قرار دے)

آٹھویں فصل: وصیت

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلام نے "وصیت" کو "میراث" کے باب سے نکال کر اسے الگ عنوان دیا ہے کیونکہ اس کا معیار و بنیاد ہی الگ اور میراث سے مختلف ہے اور وہ عبارت ہے اس سے کہ مالک اپنی زندگی میں اپنی مملوکہ اشیاء کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے، یعنی مالک کی مالکیت کا عمل با احترام ہونا چاہیے اور اسے اس میں تصرف کا پورا پورا حق حاصل ہونا چاہیے، جبکہ دیگر ادیان وقوانین اور خود کو ترقی یافتہ سمجھنے والی قوموں میں رائج دستور ہائے عمل میں ایسا نہیں بلکہ انہوں نے "وصیت" کے نام پر مالک کو یہ راہ دکھائی کہ وہ اپنے اموال یا اس کا کچھ حصہ غیر وارث حضرات سے مختص کر دے اور میراث پانے والوں مثلاً باپ اور گھر کے سربراہ کے علاوہ کسی کے لئے اپنے اموال میں جس قدر چاہے مخصوص کرے، چنانچہ وہ مسلسل اپنے قوانین میں ترامیم کرتے رہتے ہیں اور وصیت میں محدودیت قائم کرتے ہوئے قانونِ میراث کو یکسر بے اثر کر دیتے ہیں، ان کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور وہ نت نئی قانون سازی اور ترامیم کے ذریعے وراثت کے قوانین کا دائرہ تنگ کرتے رہتے ہیں۔

اسلام نے وصیت کے حوالہ سے جو قانون پیش کیا ہے اس میں اسے ثلث مال (۱/۳) تک محدود کر دیا ہے یعنی اس سے زائد میں وصیت نافذ نہیں ہو سکتی، اسلام کے اس ضابطہ و اصول کی پیروی کرتے ہوئے عصر حاضر کے بعض قوانین مثلاً فرانسیسی قانون میں بھی وصیت کے قابل عمل ہونے کو ایک تہائی تک محدود کیا گیا ہے، البتہ دونوں کے بنیادی نظریہ میں فرق پایا جاتا ہے کیونکہ اسلام لوگوں کو "وصیت" کی بھرپور تاکید اور انہیں اس کی بابت اقدام کرنے کے لئے فکری و عملی آمادگی دلاتا ہے جبکہ دیگر قوانین یا تو اس کی راہ روکتے ہیں یا اس کی بابت خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

اگر ہم وصیت، صدقات، زکوٰۃ، خمس اور عام انفاق کے موارد سے مربوط آیات مبارکہ کا مطالعہ کریں اور ان کے معانی و مفاہیم پر اچھی طرح غور و فکر کریں تو معلوم و واضح ہو جاتا ہے کہ ان قوانین و احکام کا اصل مقصد یہ ہے کہ آسان ترین طریقوں سے دنیا کی دولت کا تقریباً نصف حصہ (۱/۲) اور اس سے حاصلہ فوائد و منافع کا دو تہائی (۲/۳) نیک کاموں، رفاہی امور اور فقراء و مساکین و حاجتمندوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں خرچ کیا جائے تاکہ اس طرح معاشرے کے مختلف طبقات میں ایک دوسرے سے قربت پیدا ہو اور ان کے درمیان جو فاصلے پائے جاتے ہیں وہ دور ہوں، جس کے نتیجہ میں مساکین، مرفہ ہوں گے اور ان کی حالت بہتر ہو جائے گی اور اس کے تناظر میں مربوطہ مدوّنہ قوانین میں ثروت مندوں کو اپنی دولت و ثروت کام میں لانے کی کیفیت سے آگاہی حاصل ہوگی کہ وہ کس طرح اپنے اموال میں تصرف کریں جس سے ان کے اور نادار لوگوں کے درمیان موجودہ دوریاں ختم ہوں اور ان میں قربت پیدا ہو، اس موضوع کی بابت تفصیلی بحث عنقریب اس کے مربوطہ مقام پر پیش کی جائے گی۔ انشاءاللہ

آیات ۱۵ تا ۱۶

○ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝

○ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۝

ترجمہ

○ ''اور تمہاری عورتوں میں جو برے عمل (زنا) کی مرتکب ہوں تو ان کے خلاف چار گواہ طلب کرو، اگر وہ گواہی دے دیں تو انہیں گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ ان کی موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ کھول دے۔''

(۱۵)

○ ''اور دو جو اس گناہ کے مرتکب ہوئے ہوں انہیں سخت سزا دو اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے ہاتھ اٹھالو، کہ خدا توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔''

(۱۶)

تفسیر و بیان

برائی کی مرتکب عورتیں

○ ''وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ............مِّنْکُمْ''
(اور جو عورتیں برائی کی مرتکب ہوں............)

عربی زبان میں ''اتیان'' (باب افعال) کا معنی ''آنا'' ہے اور استعمال میں اس سے مراد ''کرنا'' ہے، یعنی جب کوئی شخص کوئی کام انجام دے تو ''اتاہ'' اور ''اتی بہ'' (تعدیہ کے ساتھ) کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

لفظ ''الْفَاحِشَةَ'' کا مصدر ''فحش'' ہے جس کا معنی برا راستہ ہے اور اس کا استعمال برے فعل یعنی ''زنا'' کے لئے عام ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ لواطت یا لواطت اور ''سحق'' (عورتوں کی ہم جنس بازی) دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ عنکبوت، آیت: ۲۸

○ ''اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَکُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۞''
(تم برے عمل کے مرتکب ہوتے ہو، وہ عمل کہ جسے تم سے پہلے دنیا بھر میں کسی ایک نے بھی انجام نہیں دیا)

یہاں بظاہر اس لفظ سے جیسا کہ اکثر مفسرین نے بھی لکھا ہے ''زنا'' مراد ہے، ارباب تفسیر نے اس آیۂ مبارکہ کے ذیل میں ایک روایت ذکر کی ہے کہ جب سورۂ نور کی پہلی آیت نازل ہوئی جس میں کوڑوں کی سزا کا حکم صادر ہوا تو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہی بات ہے جو سورۂ نساء کی آیت ۱۵ میں ''اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۞'' کے الفاظ میں کی گئی ہے اس کی تصدیق آیۂ مبارکہ کے انہی الفاظ ''اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۞'' سے بھی ہوتی ہے کہ مذکورہ حکم دائمی نہیں بلکہ بہت جلد منسوخ ہو جائے گا، اور مساحقہ کی حد کا کسی دوسرے حکم کے ذریعے منسوخ ہونا بھی ثابت نہیں اور نہ ہی یہ بات

ثابت ہوئی ہے کہ یہ حد کسی زانیہ پر جاری ہوئی۔

اور جملہ ''اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ'' سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد چار مرد ہیں۔

گواہی اور حکم

○ ''فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُيُوْتِ.........الخ''
(پس اگر وہ گواہی دیں تو زانیہ عورتوں کو گھروں میں بند کر دو........الخ)

اس جملے میں زانیہ عورتوں کو ہمیشہ کے لئے گھروں میں روک دینے کے حکم کو گواہوں کی طرف سے گواہی دینے پر موقوف کیا گیا ہے اصل عمل کے ارتکاب پر موقوف نہیں کیا گیا، یعنی جب تک چار مرد گواہی نہ دیں انہیں گھروں میں ہمیشہ بند رکھنے کا حکم صادر نہیں ہوسکتا خواہ حاکم کو اصل عمل (زنا) کے ارتکاب کا علم ویقین حاصل کیوں نہ ہوجائے اور یہ بجائے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت اسلامیہ پر عفو درگزر کی صورت میں ایک احسان ہے اور ان نعمات الٰہیہ میں سے ہے جو پروردگار نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کی ہیں۔

اور حکم یعنی ہمیشہ کے لئے گھروں میں بند کر دینے کا اشاراتی ثبوت ''حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ'' کے الفاظ میں موجود ہے کیونکہ اس میں ''تا مرگ'' کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حکم میں ''حبس'' اور ''سجن'' یعنی قید کرنے کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے بلکہ ''گھروں میں روک دینے'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں (فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُيُوْتِ) یہ بھی اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عفو و درگزر اور آسانی پیدا کرنے کی ایک صورت ہے لہٰذا ''حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا'' کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں ہمیشہ گھروں میں بند رکھنے سے نجات پانے کی راہ کھلنے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی راہ کھول دے جس سے وہ ہمیشہ گھروں میں بند رہنے کی سزا سے بچ سکیں۔

اور حرف ''اَوْ'' (اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا) سے اس حکم کے قابل منسوخی ہونے کا اشارہ ملتا ہے جیسا کہ وہ منسوخ ہوہی گیا کیونکہ کوڑوں کی سزا کے حکم نے اسے منسوخ کر دیا اور یہ بات مسلمات اور نا قابل انکار حقائق میں سے ہے کہ زانیہ عورتوں کے بارے میں گھروں میں ہمیشہ بند کر دینے کی بجائے کوڑے مارنے کا حکم عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری ایام میں نازل ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اہل اسلام نے اس پر عمل جاری رکھا، لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ آیت زانیہ عورتوں کی سزا کو بیان کرتی ہے تب بھی اس حوالہ سے کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ یہ آیت کوڑوں کی سزا کے حکم پر مشتمل آیت کے ذریعے منسوخ ہوگئی، اور آیت میں مذکورہ لفظ ''سَبِيْلًا'' سے یقیناً کوڑوں کی سزا مراد ہے۔

ایذاء کا حکم

○ ''وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا''

(اور تم میں سے وہ دونوں جو زنا کا ارتکاب کریں انہیں ایذاء دو)

یہ دو آیتیں مضمون وموضوع کے حوالہ سے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ومتناسب ہیں اور ''يَاْتِيٰنِهَا'' میں ضمیر ''ھا'' کی بازگشت یقیناً پہلی آیت میں مذکور لفظ ''الفاحشة'' کی طرف ہے۔ اس یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیتیں زنا کی سزا کے بیان پر مشتمل ہیں، اس طرح دوسری آیت پہلی آیت میں ذکر کئے گئے حکم کی تکمیل وتتمہ کے طور پر ہے کیونکہ پہلی آیت میں صرف ان عورتوں کی سزا کے بارے میں ہے جو زنا کا ارتکاب کریں جبکہ دوسری آیت میں مرد اور عورت دونوں کی سزا کا باہم تذکرہ ہے (فَاٰذُوْهُمَا) کہ دونوں کو ایذاء دو، بنابرایں دونوں آیتوں میں مجموعی طور پر زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کی سزا کا حکم بیان ہوا ہے کہ دونوں کو ایذاء دی جائے اور عورت کو ہمیشہ کے لئے گھر میں بند کر دیا جائے۔ لیکن یہ بات دوسری آیت میں مذکورہ مطلب سے مطابقت نہیں رکھتی کہ جس میں ارشاد ہوا: ''فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا'' کہ اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح نفس کریں تو ان سے ہاتھ اٹھالو، تو یہ حکم، ہمیشہ گھروں میں بند رکھنے کے حکم سے مطابقت نہیں رکھتا لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ''ہاتھ اٹھالینے'' سے مراد ایذاء سے ہاتھ اُٹھانا ہے جبکہ گھروں میں بند رکھنے کی سزا اپنی جگہ باقی ہے۔

اسی بناء پر بعض مفسرین نے بعض روایات کے پیش نظر (کہ عنقریب ہم وہ روایت ذکر کریں گے) یہ کہا ہے کہ پہلی آیت بیوہ عورت کے بارے میں ہے کہ اگر وہ زنا کا ارتکاب کرے تو اسے ہمیشہ کے لئے گھر میں بند کر دو جبکہ دوسری آیت باکرہ لڑکیوں کے بارے میں ہے کہ اگر وہ اس برائی کی مرتکب ہوں تو انہیں کوڑے مارو اور یہ کہ ''ایذاء'' سے مراد یہ ہے کہ باکرہ لڑکیوں کو قید کرو اور اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح نفس کریں تو انہیں رہا کر دو، لیکن اگر یہ قول درست ہو تو دو سوال بلا جواب باقی رہ جائیں گے، پہلا یہ کہ پہلی آیت میں مذکورہ حکم کو بیوہ عورتوں اور دوسری آیت میں مذکورہ حکم کو باکرہ لڑکیوں کے ساتھ کیوں مخصوص کیا جائے کیونکہ اس کا لفظوں میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور دوسرا یہ کہ پہلی آیت میں صرف زانیہ عورتوں (وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ) جبکہ دوسری آیت میں زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کا تذکرہ ہے (وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ)۔

یہاں ایک اہم مطلب کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ مشہور مفسر ابو مسلم کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے ان دو آیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ پہلی آیت مساحقہ (عورتوں کی ہم جنس بازی) کی سزا کو بیان کرتی ہے جبکہ دوسری آیت میں لواطت (مردوں کی ہم جنس بازی) کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان میں سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہوئی۔

لیکن ان کا یہ نظریہ درست نہیں کیونکہ جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے تو اس کے جملہ ''وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ

نِّسَآئِکُمْ" کی بابت ہم نے حقیقت الامر واضح کر دی ہے اور جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے تو اس کی بابت بھی ان کا قول صحیح نہیں کیونکہ سنت نبوی ﷺ سے قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ لواطت کی سزا قتل ہے چنانچہ ایک حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: من عمل منکم عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول (تم میں سے جو شخص قوم لوط کے عمل کا مرتکب ہو تو فاعل و مفعول دونوں کو قتل کر دو) اب اس حکم کو یا تو ابتدائی حکم مانا جائے کہ جو منسوخ نہیں ہوا یا آیات میں مذکور حکم کو منسوخ کرنے والا مانا جائے، دونوں صورتوں میں اس سے ابو مسلم کے قول کا بطلان ثابت ہو جاتا ہے۔

ایک رائے پر بحث

ممکن ہے کہ ان دو آیتوں کے ظواہر اور کلامی قرائن کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس سلسلہ میں پیش کئے گئے علمی اعتراض کی روشنی میں واقعہ کا حکم ثابت ہوتا ہو کہ اس آیت مبارکہ میں شوہر دار عورتوں کے بارے میں مذکور ہے کہ اگر وہ برائی کی مرتکب ہوں تو انہیں ہمیشہ کے لئے گھروں میں بند کر دو، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں صرف عورتوں کا ذکر ہے مردوں کا نہیں اور لفظ "نسآء" شادی شدہ عورتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ عربی زبان میں یہ استعمال عام ہے خاص طور پر جب اس کی اضافت مردوں کی طرف ہو، جیسا کہ یہاں ارشاد ہوا: "نِّسَآئِکُمْ" اور درج ذیل آیات میں بھی اس کا ثبوتی حوالہ پایا جاتا ہے؟

سورۂ نساء، آیت: ۴

- "وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً"

(اور تم عورتوں کو ان کا حق مہر عطا کرو)

سورۂ نساء، آیت: ۲۳

- "مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ"

(تمہاری ان عورتوں میں سے جن سے تم نے مباشرت کی ہو)

بنا بر ایں اس طرح کی عورتوں کے بارے میں پہلا عارضی حکم یہ تھا کہ انہیں گھروں میں نظر بند کر دیں، پھر یہ حکم سنگسار کرنے میں تبدیل ہو گیا، لہٰذا اس سے جبائی کے قول کی نفی ہوتی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ سنت کے ذریعے آیت منسوخ ہو گئی، جبکہ ایسا ہرگز نہیں اور اسے کتاب اللہ کا سنت نبوی ﷺ کے ذریعے منسوخ ہونا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ نسخ سے ایک آیت میں مذکور کسی ظاہری حکم کا دلیل کے ساتھ دائمی نہ ہونا مراد ہوتا ہے، یعنی اگر کسی آیت میں کوئی حکم مذکور ہو تو ظاہراً وہ دائمی ہوتا ہے لیکن کوئی دلیل اس کے دائمی ہونے کی نفی کرتی ہے اور وہ حکم زوال پذیر ہو جاتا ہے کہ پھر وہ قابل عمل

نہیں رہتا، اس لئے اسے منسوخ کہا جاتا ہے۔ اور یہ حکم یعنی گھروں میں نظر بند کر دینا ایسا ہے کہ آیت میں اس کے دائمی نہ ہونے کا صریح اشارہ موجود ہے بلکہ اس کے بہت جلد ختم ہو جانے کا ثبوت اس جملہ میں پایا جاتا ہے: "اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا" کہ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے بہت جلد کوئی راستہ نکال دے گا، یعنی ان کا گھروں میں نظر بند کیا جانا منسوخ ہو سکتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا حکم آ سکتا ہے، اس تبدیلی کو اگر "نسخ" کا نام دیا جائے تو یہ الگ بات ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتاب اللہ کی آیت منسوخ ہو گئی کیونکہ خود اسی آیت میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ حکم بہت جلد منسوخ ہو سکتا ہے اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو قرآنِ مجید کے مرادی معانی کی وضاحت کرنے والی شخصیت ہیں۔

اور جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے تو اس میں غیر شادی شدہ مرد و عورت کے ارتکاب زنا کی سزا مذکور ہے جو "ایذاء" ہے خواہ وہ قید کی صورت میں ہو یا جوتے مارنے یا زبانی سرزنش وغیرہ کی صورت میں ہو۔ اور یہ آیت سورۂ نور کی اس آیت کے ذریعے منسوخ ہو گئی جس میں کوڑوں کی سزا ذکر ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ جس روایت میں یہ مذکور ہے کہ اس آیت میں باکرہ و غیر شادی شدہ لڑکیوں کی ارتکاب زنا کی سزا بیان ہوئی ہے وہ "خبر واحد" کے باب سے ہے کہ احکام میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، اور وہ ان روایات میں سے ہے جو سند کے لحاظ سے ناقابل اعتماد ہیں کہ اس کے سلسلۂ سند میں وقفہ پایا جاتا ہے یعنی راویوں کے ناموں کو ذکر نہیں کیا گیا کہ جسے علمی اصطلاح میں "روایات مرسلہ" کہتے ہیں، سلسلہ سند میں "ارسال" سے مراد یہ ہے کہ راویوں کی فہرست میں سے کچھ نام چھوڑ دیئے گئے ہیں جس سے روایات کا اعتبار باقی نہیں رہتا، واللہ اعلم

توبہ و اصلاح نفس

○ "فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْھُمَا"

(پس اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کریں تو ان سے ہاتھ اٹھا لو)

اس آیت میں توبہ کے ساتھ اصلاح نفس کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے تا کہ حقیقی توبہ ثابت ہو سکے، اور یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ توبہ صرف زبانی اظہار کا نام نہیں اور نہ ہی ظاہری طور پر متاثر ہونے کی حالت کو توبہ کہتے ہیں، بلکہ حقیقی توبہ باطنی تبدیلی اور اصلاحِ نفس کو کہتے ہیں۔

روایات پر ایک نظر

امام صادقؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر صافی میں تفسیر العیاشی کے حوالہ سے آیۂ مبارکہ "وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ........" کے ذیل میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر منقول ہے، آپؑ نے فرمایا: یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے اور "سبیل" سے مراد "حدود" ہیں۔ جو سزا کے طور پر جاری ہوتی ہیں۔ (تفسیر صافی جلد ۱ صفحہ ۳۳۹)

امام محمد باقرؑ کا فرمان

تفسیر العیاشی میں آیۂ مبارکہ "وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ......." کی تفسیر میں منقول ہے: سئل عن الامام الباقر علیه السلام عن هٰذه الآیة فقال: هی منسوخة، قیل: کیف کانت؟ قال (ع): کانت المرأة اذا فجرت فقام علیها اربعة شهود ادخلت بیتاً ولم تحدث ولم تکلم ولم تجالس و اوتیت بطعامها وشرابها حتی تموت او یجعل الله لهن سبیلاً، قال: جعل السبیل الجلد والرجم، قیل: واللذان یاتیانها منکم؟ قال: یعنی البکر اذا اتت الفاحشة التی اتتها هٰذه الثیب، فاذوهما؟ قال (ع): تحبس حضرت امام باقرؑ سے اس آیت مبارکہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس پر کسی طرح عمل ہوتا تھا، امامؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: جب کوئی عورت برائی کا ارتکاب کرتی تھی اور چار آدمی اس کے خلاف گواہی دیتے تھے تو اسے گھر میں نظر بند کر دیا جاتا تھا، کوئی اس سے کلام نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کوئی اس کی بات سنتا تھا، کوئی اس کے ساتھ نشست و برخاست نہیں کرتا تھا اور صرف اس کے لئے کھانا پانی لے جایا جاتا تھا یہ سلسلہ اس کی زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہتا تھا یا یہ کہ خدا اس کے لئے کوئی راہ نکال دے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی عورتوں کے لئے راہ نکالی کہ اگر وہ شادی شدہ ہوتی تو اسے کوڑے اور سنگسار کیا جاتا تھا، کسی نے پوچھا کہ اس جملے کا معنی کیا ہے: "وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْهُمَا" امامؑ نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی باکرہ لڑکی زنا کا ارتکاب کرے کہ اگر وہ عمل بیوہ انجام دے تو اسے مقررہ سزا دی جائے پوچھا گیا کہ "فَاٰذُوْهُمَا" کا کیا معنی ہے؟ امامؑ نے

فرمایا: ان دونوں (باکرہ لڑکی اور اس کے ساتھ زنا کا عمل انجام دینے والے شخص کو ایذاء دی جائے کا معنی یہ ہے کہ انہیں قید کیا جائے) (تفسیر العیاشی۔ جلد ا ص ۲۲۷)

مذکورہ بالا مطالب یعنی صدر اسلام میں ان عورتوں کو جو زنا کی مرتکب ہوتی تھیں گھروں میں نظر بند کر دیا جاتا تھا اور یہ سزا انہیں برائی کے ارتکاب پر دی جاتی تھی، اس کی بابت متعدد روایات اہل سنت کے اسناد سے وارد ہوئی ہیں جن میں ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور دیگر حضرات شامل ہیں، اور سدی سے منقول ہے کہ گھروں میں نظر بند کر دینے کا حکم بیوہ عورتوں کے لئے تھا اور دوسری آیت میں جس ''ایذاء'' (فَاٰذُوْهُمَا) کا ذکر ہے وہ غیر شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مخصوص تھی، بہر حال اس سلسلہ میں مربوطہ مطالب قارئین کرام کے لئے واضح طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں اور وہ حقیقت الامر سے آگاہ ہو چکے ہیں۔

آیات ۱۷ تا ۱۸

○ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

○ وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

ترجمہ

○ ''اللہ انہی لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے جو جہالت و نادانی سے گناہ کے مرتکب ہوں، پھر فوراً توبہ کرلیں، ایسے لوگوں کی توبہ اللہ قبول کر لیتا ہے، اور خدا سب کچھ جاننے والا، دانا ہے۔''

(۱۷)

○ ''اور ان لوگوں کی توبہ کی کوئی حیثیت نہیں جو پے در پے گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، اور نہ ہی ان کی توبہ قبول ہوتی ہے جو کفر کی حالت میں مر جائیں، ایسے ہی لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب مقرر کر دیا ہے۔''

(۱۸)

تفسیر و بیان

ان دو آیتوں میں مذکورہ مطالب ان سے پہلی دو آیتوں (۱۶،۱۵) سے بے ربط نہیں کیونکہ ان میں بھی توبہ کے بیان پر گفتگو کا اختتام ہوا، لہٰذا ممکن ہے کہ یہ آیتیں ان دو کے ساتھ باہم نازل ہوئی ہوں، اس کے باوجود دو آیتیں ایک مستقل معنی پر مشتمل ہیں جو کہ اسلام کے بلند پایہ حقائق اور قرآن مجید کی اعلیٰ وارفع تعلیمات میں سے ایک ہے، اور وہ عبارت ہے توبہ کی اصل حقیقت اور اس کی حیثیت و احکام سے!

توبہ کی حقیقت اور حقیقی توبہ

○ ''اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ''

(انہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے جو غلطی و غفلت سے گناہ کرنے کے فوراً بعد توبہ کر لیں)

لفظ ''توبہ'' کا معنی رجوع کرنا، واپس آنا ہے، جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ بندہ کا ندامت و پشیمانی کے ساتھ اللہ کی طرف واپس آنا اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے بندگی کے دائرہ سے باہر نکل جانے کی حالت سے روگردانی کرنا ہے، اور جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی رحمت سے نوازتے ہوئے اسے اپنے پروردگار کی طرف واپس آنے کی توفیق دیتا ہے یا یہ کہ اس کے گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔

چنانچہ کئی مرتبہ بیان ہو چکا ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات مبارکہ میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ بندے کی توبہ اللہ تعالیٰ کی دو توبہ سے پیوستہ ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ بندے کی توبہ ایک نیکی ہے جو اپنی صورت پذیری میں خاص طاقت چاہتی ہے اور نیکی کی ہر صورت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا و عنایت ہے اور ہر طاقت کا سرچشمہ بھی ذات پروردگار ہے، بنا بر ایں اللہ تعالیٰ اسباب فراہم کرتا ہے جس سے بندہ توبہ کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے اور خدا سے دوری کی تاریک

راہوں سے نکل کر اپنے رب کی طرف لوٹ آتا ہے، پھر جب توبہ کرنے اور اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آنے کی توفیق پاتا ہے تو اسے گناہوں کی گندگی سے پاک ہو کر معصیت کی نجاست و غلاظت کو اپنے آپ سے دور کرنے اور قرب الٰہی کے مقدس دائرہ میں داخل ہو کر اس میں ہمیشہ باقی رہ جانے کے لئے اسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اسے رحمت، لطف و کرم عفو و درگزر اور مغفرت و بخشش کی ضرورت ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واپسی کی یہ دو صورتیں ہی وہ دو توبہ ہیں جو بندے کی توبہ اور اس کے اپنے رب کی طرف واپس آجانے سے پیوستہ ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ توبہ، آیت: ۱۱۸

- ''ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا''

(پھر اس نے انہیں توبہ دی تا کہ وہ توبہ کریں)

یہی پہلی توبہ ہے اور سورۂ بقرہ، آیت: ۱۶۰ میں یوں ارشاد ہوا:

- ''فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ''

(یہی ہیں جنہیں میں توبہ دیتا ہوں)

یہ دوسری توبہ ہے۔

ان دو توبہ کے درمیان بندے کی توبہ آتی ہے جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں۔

(پہلی توبہ خدا کی طرف سے اسباب کی فراہمی، اس کے بعد بندے کی توبہ، پھر خدا کی طرف سے توبہ کی قبولیت)

ایک لغوی و ادبی نکتہ

آیت مبارکہ میں جملہ ''عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِينَ'' آیا ہے، اس میں لفظ ''اللّٰهِ'' سے پہلے حرف ''عَلَىٰ'' اور لفظ ''الذین'' پر حرف لامؔ ہے اور وہ دونوں حرف نفع و ضرر کے معنے دیئے ہیں، چنانچہ عربی زبان میں یوں کہاں جاتا ہے: ''دارت الدائرة لزید علی عمرو'' (یہ واقعہ زید کے لئے فائدہ مند اور عمرو کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا) اور جہاں صرف حرف ''عَلَىٰ'' آتا ہے وہاں اس کا معنی ضرر و نقصان ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے: ''کان السباق علی فلان'' (یہ مسابقہ و مقابلہ فلاں شخص کے لئے نقصان دہ تھا)۔

یہ دو حرف یعنی ''عَلَىٰ'' اور ''لام'' ضرر و نفع کے معانی میں اس لئے استعمال ہوتے ہیں کہ حرف ''عَلَىٰ'' بنیادی طور پر استعلاء و بلندی کے لئے بنایا گیا ہے جبکہ لامؔ ملکیت و استحقاق کا معنیٰ دیتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان دونوں کے معانی ایسے ہیں کہ ایک جانب کو فائدہ اور دوسری جانب کو نقصان ہوتا ہے یعنی جب دو شخص ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں

تو ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان ہوگا جیسا کہ جنگ و قتال اور نزاع وغیرہ میں ہوتا ہے کہ لڑنے والے دو اشخاص یا دو گروہوں میں سے ایک غالب اور دوسرا مغلوب واقع ہوتا ہے اور ان دونوں پر نفع وضرر کے حوالے منطبق ہوتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ان میں سے جو غالب ہو اس پر ملکیت اور جو مغلوب ہو اس پر استعلاء کا معنیٰ صادق آتا ہے اس کی وضاحت یوں ہے کہ جو غالب آئے اسے وہ کچھ حاصل ہوتا ہے جو اس سے پہلے اسے حاصل نہ تھا، اور جو مغلوب واقع ہوتا ہے گویا وہ غالب آنے والے شخص کے زیر تسلط قرار پاتا ہے، یہی صورتحال اس کے مشابہ دیگر الفاظ میں پائی جاتی ہے مثلاً تاثیر، یہ مؤثر اور متاثر کے درمیان ہوتی ہے، ایک شخص مؤثر ہوتا ہے اور دوسرا متاثر، مؤثر اثر کرتا ہے اور متاثر پر اثر واقع ہوتا ہے، اور عہد و پیمان، عہد کرنے والے اور جس کے لئے عہد لیا گیا ہو ان کے درمیان واقع ہوتا ہے، اور وعدہ، یہ وعدہ دینے والے اور وعدہ لینے والے کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی طرح دیگر معانی کہ جو دو افراد یا گروہوں یا اشیاء کے درمیان واقع ہوتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ حرف ''عَلَیٰ'' اور حرف ''لام'' کہ جو ضرر و نقصان اور نفع و منفعت کے معانی میں آتے ہیں یہ معانی ان کے استعمالی موارد کے لحاظ سے ہیں نہ کہ خود انہی حروف کے! دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان دو حرفوں کا نفع وضرر پر دلالت کرنا ان کے اصل معانی کی وجہ سے نہیں بلکہ استعمالی حوالہ سے ہے۔

ان مطالب کی روشنی میں توبہ کی وقوع پذیری پر غور کریں کہ جو زیر نظر آیہ مبارکہ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کا وعدہ فرمایا ہے اور اسے اپنے اوپر واجب قرار دیتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: ''إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ'' کہ اللہ پر ان کے لئے توبہ لازم ہے جو جہالت و غفلت کی وجہ سے برائی کا ارتکاب کریں، تو اس بناء پر اللہ پر اپنے بندوں کے لئے توبہ کی قبولیت واجب قرار پائی ہے لیکن یہ واجب ہونا ایسا نہیں کہ کسی دوسرے نے اس پر اسے واجب کیا ہو یا کوئی اس طرح کی کوئی ذمہ داری اس پر عائد کرسکتا ہو خواہ اسے ''عقل''، حقیقت الامر حق یا کسی دوسرے نام سے موسوم کریں۔ خداوند عالم کی ذات اس سے بالاتر ہے اور منزہ و پاک ہے کہ کوئی اس پر اپنا حکم یا فیصلہ و مرضی مسلط کرسکے بلکہ یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی توبہ کرے گا وہ اس کی توبہ کو قبول کرے گا اور اللہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، تو یہ ہے اللہ پر توبہ قبول کرنے کے واجب و لازم ہونے کا معنیٰ! کہ جہاں اس پر ایسا کرنا واجب قرار پاتا ہے، یہی معنیٰ ہر اس مقام پر آتا ہے جہاں کسی کام کے اللہ پر واجب ہونے کا کہا جائے۔

آیت کے دو مقاصد

آیت مبارکہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دو مقاصد ملحوظ ہیں:

(۱) توبۂ الٰہی کا بیان اور توبۂ عبد کی حقیقت

(۲) توبہ کے موارد کی وسعت اور عقیدہ وعمل دونوں میں اس کا امکان

پہلے حوالہ سے صورتحال یوں ہے کہ جہاں توبہ کی نسبت خداوند عالم کی طرف ہو وہاں اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ اپنے بندوں کی طرف آتا ہے، اس میں توبۂ عبد ملحوظ نہیں یعنی توبۂ خدا سے توبۂ عبد مراد نہیں، اگرچہ توبۂ خدا کا لازمی حوالہ توبۂ عبد سے ملتا ہے کیونکہ جب توبۂ خدا کی اپنی تمام شرائط پوری ہوں تو اس کے ساتھ ہی توبۂ عبد کی تمام شرائط کا پورا ہونا ثابت ہو جاتا ہے، یہی بات اس سلسلہ میں کافی ہے اور اس کے لئے کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ آیۂ مبارکہ توبۂ خداوند عالم کے بیان پر مشتمل ہے۔

دوسرے حوالہ سے توبہ کے موارد کی وسعت کا بیان مقصود ہے خواہ کوئی بندہ اللہ پر ایمان لا کر شرک وکفر سے توبہ کرے، خواہ ایمان لانے کے بعد اطاعت وفرمانبرداری کر کے معصیت ونافرمانی سے توبہ کرے کیونکہ قرآن مجید میں دونوں قسموں کو ''توبہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم کے بارے میں یوں ارشاد ہوا۔

سورۂ مومن، آیت: ۷

○ ''اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ''

(حاملین عرش اور اس کے اردگرد والے لوگ (ملائکہ) اپنے پروردگار کی تسبیح اس کی حمد کے ساتھ کرتے ہیں اور اس پر ایمان کے ساتھ ان لوگوں کے لئے استغفار کرتے ہیں جو مؤمن ہیں کہ پروردگار! تو ہر چیز پر راحت اور علم کے ساتھ چھایا ہوا ہے، جن لوگوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چل پڑے انہیں معاف کردے)

اس میں ''لِلَّذِيْنَ تَابُوْا'' سے مراد ''لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' ہے اور اس میں ایمان کو ''توبہ'' سے موسوم کیا گیا ہے۔

سورۂ توبہ، آیت: ۱۱۸

○ ''ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ''

(پھر اس نے ان کی توبہ قبول کرلی)

توبہ کے موارد کی وسعت یعنی عقیدہ وعمل (شرک وکفر کو چھوڑ کر ایمان کی طرف آنا اور معصیت کو چھوڑ کر اطاعت کی طرف آنا) دونوں میں اس کی گنجائش کا پایا جانا، آیت ۱۸ کے الفاظ سے ثابت ہے جس میں ارشاد ہوا: ''وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ....'' کیونکہ اس میں کافر اور مؤمن دونوں کا باہم تذکرہ ہے کہ ان میں سے جو بھی برے عمل کا ارتکاب اس وقت تک کرتا رہے جب تک کہ اس کی موت کا لمحہ نہ آجائے تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ بنا برایں جملہ ''يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ'' سے مراد

مسلمان و کافر دونوں ہیں کہ جہالت کی وجہ سے برائی کرنے کے حوالہ سے کافر بھی فاسق مؤمن جیسا ہے کیونکہ کفر ایک قلبی عمل ہے اور عمل قلب و جوارح دونوں سے سرزد ہونے والے کام کو کہتے ہیں، یا یہ کہ کفر جسمانی برے اعمال کا سبب بنتا ہے لہٰذا جملہ ''لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ'' سے کافر اور فاسق دونوں مراد ہیں بشرطیکہ ان کا کفر و معصیت جہالت و غفلت کی وجہ سے ہو دشمنی و عناد کی بناء پر نہ ہو۔

جہالت کا معنیٰ

آیۂ مبارکہ میں لفظ ''بِجَهَالَةٍ'' استعمال ہوا ہے تو لغت میں لفظ ''جہل'' لفظ ''علم'' کے مقابلے میں آتا ہے۔ علم یعنی جاننا اور جہل یعنی نہ جاننا (لاعلمی) البتہ جہاں تک اس کے استعمالی حوالہ کا تعلق ہے تو لوگ جو کام بھی کرتے ہیں وہ اسے اپنے علم و ارادہ کی بنیاد پر قرار دیتے ہوئے انجام دیتے ہیں اور چونکہ ارادہ کسی چیز سے محبت و شوق کی بنیاد پر ہوتا ہے خواہ عقلاء کے نزدیک معاشرے میں اس کام کا انجام دینا درست ہو یا درست نہ ہو لیکن عقل سلیم رکھنے والا کوئی شخص بھی کسی ایسے کام کو انجام دینا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا اقدام کرتا ہے جو عقلاء کے نزدیک برا و مذموم ہو لہٰذا جو شخص بھی اس طرح کے برے و مذموم کام کو انجام دیتا ہے وہ نفسانی خواہشات کا اسیر اور شہوت و غضب کے ہاتھوں بے بس ہو کر انجام دیتا ہے کہ اس کی عقل پر پردہ پڑ چکا ہوتا ہے اور اس کی وہ عقل سلیم کام کرنا چھوڑ دیتی ہے جس کے ذریعے وہ اچھائی و برائی اور اچھے و برے کی تمیز کر سکے بلکہ اس پر اس کی خواہشات نفسانیہ غالب آ جاتی ہیں تو اس حالت میں اس کے علم و ارادہ کو ''جہالت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عرف عام میں اسے جاہل و نادان کہا جاتا ہے جبکہ باریک بینی سے کام لیا جائے تو وہ بھی ایک طرح کا ''علم'' ہی ہے، لیکن اس ''علم'' کے غیر مؤثر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا عمل قبیح قرار پاتا ہے اور اسے برے کام کے ارتکاب اور ناحق عمل کی انجام دہی پر مورد مذمت و سرزنش قرار دیا جاتا ہے لہٰذا لوگوں کے نزدیک وہ جاہل کہلاتا ہے یہاں تک کہ لوگ ایک نوجوان کم تجربہ شخص کو بھی اس حوالہ سے جاہل کہتے ہیں کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کا مغلوب اور اپنے جذبات و احساسات کا محکوم ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر برے اعمال کے رسیا شخص کو جاہل نہیں کہا جاتا بلکہ اس کے اعمال کو جہالت کی بجائے عناد و دشمنی اور تعمد پر مبنی کہا جاتا ہے، تو اس طرح کے عمل کی واضح نشانی یہ ہے کہ چونکہ اس کا انجام پذیر ہونا جہالت کی بناء پر ہوتا ہے لہٰذا جب اس شخص کی قوتیں مضمحل ہو جائیں اور شہوت یا غضب کی وہ آگ ٹھنڈی ہو جائے جس نے اسے ارتکاب گناہ کا رسیا بنا دیا تھا یا گناہ کے ارتکاب کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے یا طویل مدت گزر جانے کے بعد اس کی توجہات کم ہو جائیں، یا جسمانی طاقتیں بڑھاپے کی وجہ سے کام کرنے سے جواب دے دیں اور اس کی سوچ و

مزاج ہی بدل جائے تو اس کی جہالت زائل ہو جاتی ہے اور وہ ''علم'' کی راہ پر آ کر اپنے کئے ہوئے پر نادم و پشیمان ہوتا ہے، لیکن اگر اس کا ارتکاب گناہ دشمنی و عناد اور تعمد کی بناء پر ہو تو چونکہ اس میں اس کی جسمانی قوتوں کے ہیجان و طغیان اور نفسانی خواہشوں کے غلبہ و جذبات دخیل نہیں ہوتے بلکہ ایک ایسی چیز کارفرما ہوتی ہے جسے ذاتی خباثت اور پست فطرتی کہا جاتا ہے کہ جو جسمانی قوتوں کی زوال پذیری سے ختم نہیں ہوتی، نہ جلدی اور نہ دیر سے، بلکہ جب تک وہ شخص زندہ ہوتا ہے اس کی یہ پست و مذموم حالت بھی باقی رہتی ہے اور وہ جلد نادم نہیں ہوتا مگر یہ کہ خدا اس پر کرم نوازی فرمائے اور خاص عنایت سے نوازے۔

ہاں! البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قسم خوردہ دشمن بھی اپنی دشمنی و لجاجت اور حق پر غلبہ پانے کی مذموم خواہش و کوشش سے دستبردار ہو جاتا ہے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے بندگی و اطاعت پروردگار کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے تو اس وقت لوگوں پر یہ راز کھلتا ہے کہ اس کی دشمنی و عناد کی وجہ ''جہالت'' تھی، حقیقت میں ہر معصیت و گناہ انسان کی جہالت کی وجہ سے سرزد ہوتا ہے، بنابراین ''معاند'' اس شخص کے علاوہ کسی کو نہیں کہیں گے جو زندگی کے آخری لمحوں تک صحت و سلامتی کے باوجود اپنے برے عمل سے باز نہ آئے۔

اس بیان سے معلوم و واضح ہوتا ہے کہ آیۂ مبارکہ میں ''ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ'' میں توبہ کے ساتھ ''مِن قَرِيبٍ'' کے الفاظ کا معنیٰ کیا ہے؟ اور وہ یہ کہ اگر برے عمل کے ارتکاب کی وجہ ''جہالت'' ہو تو زندگی بھر وہ سلسلہ جاری نہیں رہتا اور اس کا مرتکب تقویٰ اختیار کرنے اور عمل صالح بجالانے کی راہ پر آنے سے ناامید نہیں ہوتا، یہ تو عناد اور لجاجت و ہٹ دھرمی والا شخص ہے جو اپنے برے عمل پر ڈٹا رہتا ہے جبکہ ''جہالت'' و غفلت سے برائی کا مرتکب شخص بہت جلد (من قریب) اپنے برے عمل سے باز آ جاتا ہے، لہٰذا آیت میں لفظ ''من قریب'' سے مراد عہد قریب یا زمانۂ قریب ہے یعنی فوراً یا جلد، یعنی آخرت کی نشانیاں ظاہر ہونے اور موت کا وقت نزدیک آنے سے پہلے ہی وہ شخص توبہ کر لیتا ہے۔ اور جہاں تک ہٹ دھرم دشمن کا تعلق ہے تو وہ جس قدر سخت دل اور دشمنی میں حد سے بڑھا ہوا ہو لیکن جب اسے اپنے بُرے عمل کا انجام دکھائی دیتا ہے اور اپنے کئے کی سزا آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جاتی ہے تو وہ ندامت و پشیمانی اور اپنے آپ کو کوسنے لگتا ہے اور اپنے کئے سے بیزاری کا اظہار کرنے لگتا ہے جبکہ اس کا نادم و پشیمان ہونا حقیقی نہیں ہوتا کہ اس کی ندامت و پشیمانی طبعی و فطری ہدایت پر مبنی ہو، ایسا نہیں بلکہ وہ بہانہ جوئی کی ایک صورت ہوتی ہے جو اس کے شریر باطن کی طرف سے اس کے برے عمل کے برے انجام سے خلاصی پانے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر بالفرض اسے اپنے کئے کی سزا و انجام سے خلاصی کی راہ مل جائے اور اسے برے عمل کے ارتکاب کا موقع ہاتھ آ جائے تو وہ دوبارہ اپنے بُرے اعمال کی راہ پر لوٹ جاتا ہے، اسی کے بارے میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ انعام، آیت: ۲۸

○ ''وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۲۸''

(اور اگر وہ لوٹا دیئے جائیں تو وہ پھر اسی کی طرف واپس چلے جائیں گے جس سے اُنہیں روکا گیا، اور وہ ہیں ہی جھوٹے)

اور یہ کہ لفظ ''مِنْ قَرِيْبٍ'' سے مراد موت کا وقت نزدیک ہونا ہے اس کی دلیل بعد والی آیت ہے جس میں ارشاد ہوا: ''لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ'' اور ان لوگوں کی توبہ کچھ نہیں جو برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت نزدیک آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔

بنابرایں جملہ ''ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ'' سے کنایۃً اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ وہ توبہ کرنے میں کوتاہی سے کام نہیں لیتے اور اس کے لئے حاصل ہونے والے موقع کو ضائع نہیں ہونے دیتے بلکہ فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام مطالب سے واضح ہوا کہ آیت مبارکہ میں لفظ ''بِجَهَالَةٍ'' اور جملہ ''ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ'' دراصل گناہ و معصیت کے ارتکاب کے اسباب وعوامل کی نشاندہی اور توبہ کی اہمیت کی حدود و قیود کو واضح کرنے کے لئے ذکر ہوئے ہیں اور اس مطلب کو بیان کرتے ہیں کہ پہلے الفاظ یعنی ''بِجَهَالَةٍ'' سے مراد یہ ہے کہ گناہ و معصیت کا ارتکاب عناد و دشمنی اور اللہ پر غلبہ و برتری پانے کی بنیاد پر نہ ہو، اور دوسرے الفاظ یعنی ''مِنْ قَرِيْبٍ'' سے مراد یہ ہے کہ انسان سستی و بے پرواہی اور کوتاہی کرتے ہوئے توبہ کرنے کو موت کا وقت نزدیک آنے تک مؤخر نہ کرے، کیونکہ توبہ سے مراد بندے کا اللہ کی طرف اطاعت و بندگی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے لوٹ آنا ہے کہ جب ایسا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی توبہ سے مراد بندے کی توبہ قبول کرنا ہوگا، اور عبودیت و بندگی کا اس کے سوا کوئی معنی ہی نہیں کہ دنیاوی زندگی ہی میں پروردگار کی فرماں برداری کا عملی مظاہرہ کیا جائے کیونکہ دنیاوی زندگی ہی وہ میدان ہے جس میں انسان کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اطاعت و فرمانبرداری اور معصیت و نافرمانی میں سے جسے چاہے پسند کرے کہ اگر وہ اطاعت و فرمانبرداری کی راہ اپنائے تو وہ عبودیت و بندگی کی راہ پر چلنے والا کہلاتا ہے لیکن جب موت کا وقت نزدیک آ جائے تو پھر اسے اطاعت و معصیت میں سے کسی ایک کا اختیار ہی حاصل نہیں ہوتا اور یہ گنجائش ہی باقی نہیں ہوتی کہ ان میں سے کوئی ایک راہ اپنا سکے، لہٰذا ثابت ہوا کہ عبودیت و بندگی صرف دنیاوی زندگی میں ممکن ہے اور موت کے آثار و علامات ظاہر ہونے کے بعد اختیار سلب ہو جاتا ہے اور معصیت کو چھوڑ کر اطاعت کی راہ اپنانے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، اسی مطلب کا اشارہ درج ذیل آیات مبارکہ میں ہوا ہے۔

سورۂ انعام، آیت: ۱۵۸

○ ''يَوْمَ يَاْتِىْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِىْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا''

(جس دن تیرے پروردگار کی بعض نشانیاں آ جائیں گی تو کسی ایسے شخص کا ایمان لانا اسے فائدہ نہ دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اپنے ایمان کی حالت میں کوئی نیک عمل انجام نہ دیا ہو)۔

سورۂ مومن، آیت: ۸۴۔۸۵

○ ''فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ .... سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ''

(پس جب وہ ہمارا عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ...... یہ تو سنت الٰہیہ ہے جو اس کے بندوں میں اس سے پہلے گزر چکی ہے، وہاں تو کافر خسارے میں ہیں)

اس مطلب پر مشتمل دیگر متعدد آیات موجود ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ کہ آیہ مبارکہ کے معنٰی کی بازگشت اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گنہگار و معصیت کار شخص کی توبہ قبول کرتا ہے جو گناہ کا ارتکاب اللہ کے مقابلے میں آکر جسارت و ڈھٹائی کے ساتھ نہ کرے کہ جس سے اس کی روحِ بندگی مجروح ہو جائے اور پروردگار کے حضور واپسی کی راہیں مسدود ہو جائیں، اور نہ ہی وہ توبہ کے سلسلہ میں اس قدر تساہل و بے پرواہی سے کام لے کہ موت کا وقت نزدیک آ جائے اور اسے توبہ کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔

یہ تو ہے لفظ ''بِجَهَالَةٍ'' کا احترازی قید ہونے کی صورت میں آیت کا معنٰی! علمی اصطلاح میں احترازی قید اسے کہتے ہیں جو کلام کے عام معنٰی میں استثنائی مورد کو الگ کرے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ''توضیحی قید'' ہو یعنی اس کے ذریعے مطلوبہ معنی کی مزید وضاحت مقصود ہو کہ اس صورت میں آیت کا معنی یوں ہوگا کہ خداوند عالم انہی کی توبہ قبول کرتا ہے، جن سے برے اعمال سرزد ہو جاتے ہیں جو کہ ان کی جہالت کے سوا کسی وجہ سے نہیں ہوتے کیونکہ گناہ کا ارتکاب اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا اور دردناک عذاب میں مبتلا کرنا ہے اور ایسا کام جاہل ہی کرتا ہے یا آیت کا معنٰی یہ ہوگا کہ گناہ کا ارتکاب معصیت کی گہرائی اور اس پر مترتب ہونے والے آثار و برے انجام سے ناآگاہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس بنا پر یعنی ''بِجَهَالَةٍ'' کو توضیحی حوالہ قرار دینے کی صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جملہ ''ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ'' سے توبہ کی قبولیت کا استحقاق پانے والوں کی فہرست سے خارج ہو جانا ہے نہ کہ ''بِجَهَالَةٍ'' کے الفاظ سے! لہٰذا جملہ ''ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ'' کا توبہ کرنے میں کوتاہی و سستی برتنے سے کنایۃً ذکر ہونا ممکن نہیں قرار دیا جا سکتا (غور کریں)، شاید پہلی رائے درست ہو اور الفاظ ''بِجَهَالَةٍ'' توضیحی حوالہ کی بجائے احترازی حیثیت کے حامل ہوں کہ یہ بات ظاہر الآیہ سے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آیت کا معنٰی یوں کیا جائے گا کہ ہر توبہ کرنے والے کی توبہ قابل قبول ہے سوائے اس کے کہ جو موت کا وقت قریب ہونے تک توبہ کرنے میں تاخیر کرے اور دوسرا وہ کافر جو مرنے کے بعد توبہ کرے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ جملہ ''ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ'' سے مراد یہ ہے کہ گناہ کرنے کے فوراً بعد یا تھوڑا سا وقت گزرنے کے بعد توبہ کی جائے کہ جسے عرف عام میں فوراً یا قریب وقت کہا جاتا ہے کہ جو معصیت کے وقوع پذیر ہونے سے زیادہ دور نہیں ہوتا نہ یہ کہ موت آنے کے وقت تک چلا جائے، لیکن یہ رائے درست نہیں کیونکہ اس سے بعد والی آیت کا معنٰی

درست نہیں رہتا، اور وہ یوں کہ یہ دونوں آیتیں (۱۷۔۱۸) توبہ خدا یعنی خدا کی طرف سے بندے کی توبہ قبول کرنے کے قاعدۂ کلیہ کے بیان پر مشتمل ہیں کیونکہ پہلی آیت میں حرف "اِنَّمَا" ذکر ہوا ہے (اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَی اللّٰهِ لِلَّذِیۡنَ......) جو کہ حصر پر دلالت کرتا ہے (یعنی یہ کام صرف اللہ کا ہے) اور دوسری آیت ان موارد کو بیان کرتی ہے جن میں توبہ قبول نہیں ہوتی، اور سوائے دو موارد کے کوئی مورد ذکر نہیں ہوا، وہ دو موارد یہ ہیں: (۱) اس گنہگار کی توبہ جو موت کا وقت آنے تک توبہ کرنے میں تاخیر و کوتاہی سے کام لے (۲) مرنے کے بعد کافر کی توبہ، اگر وہی توبہ قابل قبول ہوتی جو گناہ کے فوراً بعد یا تھوڑی دیر کے بعد کی جائے تو ناقابل قبول توبہ کے موارد و مصادیق کچھ اور ہوتے کہ جو آیت میں مذکور نہیں۔

توبہ کی قبولیت کے مستحق افراد

○ "فَاُولٰٓئِكَ یَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَكِیۡمًا ﴿۱۷﴾"

(بس یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے اور اللہ آگاہ و دانا ہے)

یہاں لفظ "اُولٰٓئِكَ" ذکر ہوا ہے جو دور کے اشارہ کے لئے بنایا گیا ہے، اس سے ان لوگوں کی قدر و منزلت اور بلند مقام کا بیان مقصود ہے جن کی توبہ خداوند عالم قبول فرماتا ہے۔ یہ اسی طرح سے ہے جیسے جملہ "یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو شمار کرنے میں تساہل سے کام لیتا ہے (ان پر نرمی کرتا ہے) جبکہ اس کے برعکس دوسری آیت میں یوں ارشاد ہوا: "وَ لَیۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ...... الخ" (ان لوگوں کے لئے توبہ نہیں جو برے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں) اس میں لفظ "سیّئات" ذکر ہوا ہے جس سے ان کے گناہوں کا تذکرہ کر کے ان کی پست صفتی کا بیان و اظہار مقصود ہے۔

اختتام آیت کا راز

زیر نظر آیۂ مبارکہ (۱۷) کا اختتام ان الفاظ سے ہوا: "وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَكِیۡمًا" (اور اللہ سب کچھ جاننے والا، دانائی والا ہے) جبکہ توبہ کے حوالہ سے اس کا اختتام اس طرح ہوتا "وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا" (اور اللہ معاف کر دینے والا، رحم کرنے والا ہے) یہ اس لئے ہے کہ واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھولا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کو بخوبی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان کی کمزوری و جہالت انہیں کس طرف لے جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی حکمت و دانائی اس بات کی

متقاضی تھی کہ وہ اپنی مخلوق کے نظام زندگی اور اس سے مربوطہ امور کے استحکام کا اہتمام کرے جو کہ توبہ کا دروازہ کھولنے سے ممکن تھا، اور اللہ تعالیٰ اپنے علم وحکمت کی بناء پر اس عظمت ومقام کا حامل ہے کہ اسے لوگوں کے ظاہری حالات دھوکہ نہیں دے سکتے بلکہ وہ ان کے دلوں کا امتحان لیتا ہے اور نہ کوئی مکر وفریب اور دھوکہ اسے خیرہ کر سکتا ہے۔ بنابرایں اس کے بندوں میں سے توبہ کرنے والے شخص پر لازم ہے کہ سچی وحقیقی توبہ کرے اور اس طرح توبہ کرے جس طرح توبہ کرنے کا حق ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اسے اس طرح قبول فرمائے جو قبول کرنے کا حق ہے۔

ناقابل قبول توبہ

○ ''وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ''

(اور ان لوگوں کی توبہ نہیں جو برے اعمال کا ارتکاب کریں)

اس آیت میں پہلی آیت جیسے الفاظ (اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ) ذکر نہیں ہوئے جبکہ یہاں بھی وہی مطلب مقصود ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اس کی رحمت خاصہ اور مخصوص عنایت الٰہیہ ایسے افراد سے دور ہے، یہ اسی طرح سے ہے جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ پہلی آیت میں گناہ کو مفرد کے صیغہ میں (السُّوْٓءَ) جبکہ یہاں جمع کے صیغہ میں ''السَّيِّاٰتِ'' ذکر کیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ خداوند عالم ان کے گناہوں (سیئات) کو شمار کرتا ہے اور ان کے خلاف انہیں محفوظ کرتا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

آیت میں جملہ ''يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ'' کو جملہ ''حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ'' سے مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے اس سے ان کی طرف سے مسلسل گناہ کے ارتکاب کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ موت کا وقت قریب آنے تک گناہ کرتے رہتے ہیں، ان کا ایسا کرنا یا اس وجہ سے ہے کہ وہ توبہ کرنے میں سستی وکوتاہی سے کام لیتے ہیں جو کہ بذات خود ایک معصیت ہے جو بار بار وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے، یا اس وجہ سے ہے کہ توبہ کرنے میں سستی وتساہل سے کام لینا گناہ کرنے کی عادت پر باقی رہنے کے مترادف ہے، یا یہ کہ توبہ کرنے میں تاخیر عام طور پر اسی گناہ یا اس جیسے دیگر گناہوں کے بار بار انجام دینے کا سبب بنتی ہے۔

ایک اہم نکتہ

آیت مبارکہ میں ''حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ'' (یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کو موت آجائے) اس میں یہ نکتہ

ملحوظ ہے کہ واضح ہو جائے کہ وہ لوگ توبہ کرنے کو نہایت معمولی وحقیر عمل سمجھتے ہیں اور اس قدر کم اہمیت و بے اہمیت جانتے ہیں کہ جو کچھ چاہتے ہیں انجام دیتے رہتے ہیں اور پدر مادر آزاد ہو کر ہر کام کرتے رہتے ہیں انہیں کسی چیز کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت طاری ہونے لگتی ہے تو وہ کہنے لگتا ہے: ''اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ'' کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، تا کہ اپنے کردہ گناہوں کی سزا اور فرمانِ الٰہی کی خلاف ورزی کے برے انجام سے بچ سکے، ایسے لوگوں کی توبہ صرف زبانی ہوتی ہے یا پھر آخری لحات میں ان کے دلوں میں کوئی بات خطور کرتی ہے جو انہیں اس طرح کے الفاظ زبان پر لانے پر مجبور کر دیتی ہے، لیکن توبہ ایسی چیز نہیں جو لقلقۂ زبان ہی تک محدود ہو یا صرف دل میں اس کا خیال پیدا ہو اور وہ مؤثر ہو جائے، ایسی بات ہرگز نہیں۔

ان مطالب سے معلوم ہوا کہ جملہ ''اِنِّیْ تُبْتُ'' کو لفظ ''الْئٰنَ'' سے مقید کر کے کیوں ذکر کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان الفاظ کو زبان پر جاری کرنے والا شخص جب موت کو اپنے سامنے دیکھتا ہے اور آخرت کا منظر مشاہدہ کرتا ہے کہ جس میں اللہ کی حاکمیت علی الاطلاق کا عملی مظاہرہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ یہ الفاظ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں (اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ) خواہ زبان پر یہ الفاظ لائے یا دل ہی دل میں ان کا خیال کرے، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ وہ کہتا ہے میں توبہ کرتا ہوں کیونکہ میں نے موت جو کہ حق ہے اور جزا و سزا جو کہ حق ہے اس کا مشاہدہ کر لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی آیت کے مشابہ ایک آیت میں قیامت کے دن مجرمین کی حالت کو ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے:

سورۂ سجدہ، آیت: ۱۲

○ ''وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝۱۲''

(اور اگر تو دیکھتا کہ جب مجرمین اپنے سر جھکائے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہوں گے اور کہیں گے: پروردگار! ہم نے دیکھا اور سنا ہے، اب ہمیں دنیا میں واپس لوٹا دے تا کہ ہم نیک عمل انجام دیں کہ اب ہمیں یقین حاصل ہو گیا ہے)

لیکن اس کی یہ توبہ قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس کا سبب دنیا سے ناامیدی اور روز محشر میں حاضری کا خوف ہے جس نے اسے اپنے کئے پر نادم و پشیمان ہونے اور اپنے پروردگار کی طرف واپس آنے پر مجبور کیا ہے مگر اب وقت گزر گیا اور راہ چارہ باقی نہیں رہی، کیونکہ اب دنیا میں زندگی باقی رہی اور نہ کچھ کرنے کا اختیار باقی ہے۔

کافروں کی توبہ

○ ''وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ''

(اور نہ ہی ان لوگوں کی توبہ قبول ہے جو حالت کفر میں مریں)

اس آیت میں توبہ قبول نہ کئے جانے والے دوسرے گروہ کا ذکر ہے، یعنی جو شخص زندگی بھر کفر کا دم بھرتا رہے اور کفر کی حالت میں مر جائے، تو ایسے شخص کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا کیونکہ اس کا ایمان لانا یعنی توبہ کرنا اسے اس دن فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد بار ذکر ہو چکا ہے کہ مرنے کے بعد کافر نجات نہیں پا سکتا اور اگر وہ توبہ کریں اور معافی مانگیں تب بھی ان کی درخواست قبول نہیں کی جائے گی، بعض آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۶۲

○ ''اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾''

(سوائے ان لوگوں کے کہ جو توبہ کریں اور اصلاح کریں اور حق کو واضح طور پر بیان کریں ایسے لوگوں کی توبہ میں قبول کروں گا کہ میں توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہوں وہ لوگ جو کافر ہیں اور حالت کفر میں مر گئے ان پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے، ان پر عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی)

سورۂ آل عمران، آیت: ۹۱

○ ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾''

(بے شک، جو لوگ کافر ہوئے اور مرتے دم تک کافر رہے (کفر کی حالت میں مرے) ان میں سے کسی ایک سے بھی سونے سے بھری ہوئی زمین بھی قبول نہیں کی جائے گی خواہ وہ اسے فدیہ ہی کیوں نہ کر دے، ایسے ہی لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا)۔

مددگاروں کی نفی ان کے حق میں شفاعت کی نفی سے عبارت ہے جیسا کہ اس آیت کے ضمن میں اس کتاب کی جلد سوم میں تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔

اور جملہ ''وَهُمْ كُفَّارٌ'' کے الفاظ سے مقید کر کے ذکر کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ اس گنہگار مؤمن کی توبہ قبول کی جائے گی جو گناہ کا مرتکب ہوا ہے بشرطیکہ اس کا ایسا کرنا تکبر پر مبنی نہ ہو اور نہ ہی توبہ کرنے میں تساہل و کوتاہی برتی گئی ہو کیونکہ بندے کی توبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی بندگی کی طرف لوٹ آئے کہ جو خود اس کی اختیار کردہ ہو اگرچہ موت کے آنے سے اس کا اختیار سرے ہی سے ختم ہو جاتا ہے اور اس کا مورد ہی باقی نہیں رہتا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے لیکن توبہ خدا کا معنی یہ ہے کہ وہ مغفرت و رحمت کے ساتھ بندے کی طرف لوٹ آئے اور اس کا موت کے بعد تحقق پذیر ہونا شفاعت

کرنے والوں کی شفاعت کے ذریعے ممکن ہے، اسی سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو آیتوں میں توبۂ خدا بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنے بندوں کی طرف بخشش و رحمت کے ساتھ واپس آتا ہے توبۂ عبد بیان کرنا مقصود نہیں البتہ اگر توبۂ عبد توبہ خدا کے ضمن میں ہو تو ممکن ہے اسے بھی اس میں شامل کیا جائے۔

دردناک عذاب

○ ''اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا''

(یہی ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب مقرر کر رکھا ہے)

''اُولٰٓئِكَ'' اسم اشارہ ہے، اس سے آیت میں مذکور لوگوں کا بارگاہِ الٰہی کے قرب اور اس کا شرف پانے سے محرومی کا ثبوت ملتا ہے، (کیونکہ اس لفظ کا استعمال دوری کا اشارہ دیتا ہے یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے قرب کی منزل سے دور ہیں)

جملہ ''اَعْتَدْنَا'' کا مصدر ''اعتاد'' ہے جس کا معنیٰ اعداد یعنی شمار کرنا یا وعد یعنی وعدہ کرنا مقرر ہے۔

توبہ کے بارے میں ایک بحث

قرآن مجید میں لفظ ''توبہ'' جہاں جہاں بھی استعمال ہوا اور اس سے اس کے جو جو معانی مقصود ہیں ان سب کے تناظر میں یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ یہ (توبہ) ان حقیقی تعلیمات میں سے ہے جو اس آسمانی کتاب ہی سے مختص ہیں، یعنی توبہ قرآن مجید کی مخصوص و مختص تعلیمات کا حصہ ہے کیونکہ توبہ کا قرآنی معنیٰ کفر و شرک سے ایمان کی طرف آنا ہے، اگرچہ یہ معنی دوسرے ادیان الٰہیہ میں مثلاً دین موسیٰ و دین عیسیٰ علیہما السلام میں بھی موجود ہے لیکن اس طرح نہیں کہ توبہ کی حقیقت کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہوئے اسے ''ایمان'' کی سرحدوں تک لایا جائے بلکہ اس نام کی حد تک کہ وہی ایمان ہے۔ یہاں تک کہ دین و آئین مسیحیت جن اصولوں پر استوار ہے ان سے اس مطلب کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ توبہ کا کچھ فائدہ ہی نہیں بلکہ یہ ناممکن ہے کہ انسان اس سے استفادہ کرے، چنانچہ یہ بات ان مطالب سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے جو حضرت مسیح کے سولی پر چڑھنے اور اپنے آپ کو قربان کرنے کی بحث میں ذکر کئے گئے ہیں اور ہم وہ مطالب اس کتاب (المیزان) کی تیسری جلد میں حضرت مسیح کی خلقت کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں۔

اس کے باوجود کلیسائی ارباب نے اس سلسلہ میں اس حد تک افراط سے کام لیا کہ مغفرت و بخشش کے تعویذ بیچے جانے لگے اور اس سے تجارت کا بازار گرم کیا گیا، ان کے دینی رہنما ان گنہگاروں کے گناہ معاف کرنے لگے جو ان کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے تھے، لیکن قرآن مجید میں اس حوالہ سے انسان کی حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے مطابق قانون سازی کی گئی اور اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ اسے حق و حقیقت کی دعوت دی گئی اور ہدایت کی سیدھی راہ دکھائی گئی لیکن اس کے باوجود وہ اُخروی زندگی میں کہ جو اس کی یقینی منزل ہے اور اسے اپنے اختیاری سفر میں اس سے بے نیازی ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے اسے اپنے آپ کو کمالات واعلیٰ صفات اور سعادت مندی سے ہمکنار کرنا ضروری ہے تو اس حوالہ سے وہ مجسم فقر ہے اور ذاتا اپنے پروردگار کا محتاج ہے بلکہ فقر ہی فقر اس کی ذات میں داخل ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ فاطر، آیت: ۱۵

○ ''يَاأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللهِ ۚ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ''

(اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی ہے جو بے نیاز ہے)

سورۂ فرقان، آیت: ۳

○ ''وَلَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا''

(اور وہ اپنے لئے کسی نفع یا نقصان کا مالک نہیں اور نہ ہی موت وحیات اور دوبارہ زندہ ہونا ان کے ہاتھ میں ہے)

حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر لحہ شقاوت و بدبختی کے گہرے گھڈ میں گرنے، خدا سے دوری اور ذلت و خواری کی تاریک وادی میں گر جانے کے خطرہ سے دوچار رہتا ہے جیسا کہ درج ذیل آیات میں اسی مطلب کا اشارہ موجود ہے۔

سورۂ تین، آیت: ۴۔۵

○ ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝''

(ہم نے انسان کو بہترین بنیادوں پر خلق کیا، پھر اسے پست ترین مقام تک پلٹا دیا)

سورۂ مریم، آیت: ۷۱۔۷۲

○ ''وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝''

(اور تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس میں داخل نہ ہو، یہ تیرے پروردگار کا طے شدہ یقینی فیصلہ ہے، پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات عطا کریں گے اور ظالموں کو اس میں ذلیل و خوار چھوڑ دیں گے)

سورۂ طٰہٰ، آیت: ۱۱۷

○ ''فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ''

(کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں بہشت سے نکال باہر کردے کہ پھر تم بدبختی کا شکار ہو جاؤ گے)

جب اس کی حالت ایسی ہے تو اس کا عزت وشرف کے مقام ومنزلت کا حامل ہونا اور سعادت وخوشبختی کی منزل پر فائز ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ وہ شقاوت وبدبختی اور خدا سے دور کر دینے والے تمام اسباب وعوامل سے روگردانی کرتے ہوئے اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آئے کہ اسی کو توبہ کہتے ہیں اور یہی اس کا اصل سعادت مندی کی راہ پر آنا ہی اس کی توبہ کہلاتا ہے جو کہ حقیقی معنی میں ''ایمان'' ہے، اسی طرح ہر فرعی سعادت یعنی ہر عمل صالح میں توبہ سے مراد یہی ہے کہ اس کی انجام دہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آنا اور شقاوت کی اصل بنیاد یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے سے روگردانی کرنا بلکہ اس کے فروعات یعنی شرک کے بعد برے اعمال سے بھی کنارہ کشی اختیار کرنا حقیقی توبہ کی علامت ہے، بنا برایں توبہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف واپس آکر (چونکہ گناہ ومعصیت کا ارتکاب اللہ تعالیٰ سے دور ہو جانے سے عبارت ہے) ہر طرح کی برائی وبرے عمل اور بدبختی وشقاوت کی پلیدی سے اپنے آپ کو پاک کرنا ہے، اور یہ سب کچھ اس بات پر موقوف ہے کہ ایمان کی پختگی کے ساتھ اپنے آپ کو اعمال صالحہ سے مزین کریں اور اطاعت الٰہی وقرب خداوندی کی نعمتوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے فکر وعمل کی معراج پائیں، اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا حصول اور عظمتوں کی بلند ترین منزل پر فائز ہونا شرک اور ہر معصیت سے توبہ کرنے پر موقوف ہے، اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے۔

سورۂ نور، آیت: ۳۱

○ ''وَتُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيۡعًا اَيُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۝''

(اور تم سب ہی اللہ کی طرف توبہ کرو اے ایمان والو تا کہ تم فلاح پاسکو)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ یعنی اللہ کی طرف لوٹنے میں توبہ کی دونوں قسمیں شامل ہیں (شرک اور معصیت دونوں سے توبہ) بلکہ ان دونوں اور ان کے علاوہ تمام قسمیں شامل ہیں کہ اس سلسلہ میں تفصیلی بیان عنقریب آئے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ چونکہ انسان ذاتاً سراپا فقر ہے اور اپنے پروردگار کی عنایت کے بغیر کوئی خیر وسعادت اس کے اختیار میں نہیں لہٰذا وہ توبہ یعنی اپنے رب کی طرف واپسی میں بھی اس کی خاص عنایت کا محتاج ہے اور اس کی مدد کے بغیر خیر وسعادت کی کسی منزل تک پہنچنا اس کے بس میں نہیں۔ تو جب صورتحال اس طرح سے ہے تو اس کا تقاضائے بندگی کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص توفیق واعانت پر موقوف ہے کہ جسے توبۂ خدا کہا جاتا ہے اور وہ توبۂ عبد سے پہلے ہوتی ہے، اس حوالہ سے ارشاد خداوندی ہے:

سورۂ توبہ، آیت: ۱۱۸

○ ''ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوۡبُوۡا''

(پھر وہ ان کی طرف لوٹ آیا تا کہ وہ اس کی طرف لوٹ آئیں)

توبہ ہے پہلی وہ توبہ جس کی نسبت خدا کی طرف ہے، اسی طرح دوسری توبہ وہ ہے جو توبۂ عبد کے بعد آتی ہے اور وہ بھی اللہ کی طرف منسوب ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتے ہوئے اسے مغفرت و بخشش عطا کرے اور اسے گناہوں و معاصی کی گندگی سے پاک کردے، کہ اس توبہ کا تذکرہ زیر بحث آیۂ مبارکہ (سورۂ نسا، آیت ۱۷) میں ان الفاظ میں ہوا: ''فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ '' (یہی ہیں وہ لوگ کہ اللہ ان کی طرف لوٹ آتا ہے یعنی ان کی توبہ قبول کرتا ہے)

اگر آپ اس مطلب پر بخوبی غور فرمائیں اور اس مسئلہ کی بابت نہایت باریک بینی کے ساتھ توجہ کریں تو اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے کہ خداوند عالم کی دو توبہ دراصل عبد کی توبہ کے تناظر میں ہے ورنہ حقیقت میں اس کی توبہ ایک ہے جو کہ اس کا بندے کی طرف اپنی رحمت کے ساتھ رجوع کرنا ہے۔ اور وہ بندے کی توبہ کرنے سے پہلے اور بعد دونوں حالتوں میں ہوتا ہے، بلکہ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بندے کی توبہ کے بغیر بھی توبہ خداوند تحقیق پذیر ہوتی ہے کہ جس کی بابت جملہ ''وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ '' کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ قیامت کے دن گنہگار شخص کے بارے میں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا قبول ہونا توبۂ خدا ہی کے باب سے ہے اور اسی سلسلہ میں خداوند عالم کا ارشاد گرامی قدر ہے:

سورۂ نساء، آیت: ۲۷

○ ''وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ''

(خدا چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے جبکہ خواہشات کی پیروی کرنیوالے لوگ چاہتے ہیں کہ تم بھرپور طور پر روگردانی کے مرتکب ہو جاؤ)

قُرب اور بُعد کے دو حوالے

توبہ کی بحث میں دو حوالے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے بارے میں بھرپور توجہ کی جائے: (۱) قُرب (۲) بُعد، ان دونوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، یعنی اللہ کا قرب اور اس کے نزدیک ہونا اور اس کا بُعد یعنی اس سے دور ہونا، تو یہ دونوں حوالے تناسب کے حامل ہیں لہٰذا عین ممکن ہے کہ ''بُعد'' کا حوالہ، ''قُرب'' کے حوالہ میں بھی پایا جائے یعنی ایک مرحلہ میں ''قرب'' ہو اور دوسرے مرحلہ میں ''بُعد'' ہو، اس بناء پر ''توبہ'' کا معنی خداوند عالم کے بعض مقرب بندوں کی بازگشت پر بھی صادق آئے گا کیونکہ اگر اس کے عملی مؤقف کا اس شخص کے مقام و منزلت سے موازنہ کریں جو اس کی نسبت، خداوند عالم سے زیادہ قرب رکھتا ہو تو بلاشک اس کا رجوع و بازگشت ''توبہ'' کہلائے گی۔ اس مطلب کا ثبوت وہ آیات مبارکہ ہیں جن میں

معصوم انبیاء علیہم السلام کی ''توبہ'' مذکور ہے، ملاحظہ ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ بقرہ، آیت: ۳۷

○ ''فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ''

(آدم نے اپنے رب سے کلمات حاصل کئے تو خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی)

حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جب کعبہ کی دیواریں کھڑی کر لیں تو انہوں نے اس طرح کہا۔

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۲۸

○ ''وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ''

(اور تو ہماری توبہ قبول فرما کہ بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے)

حضرت موسٰی علیہ السلام کا بیان اس طرح مذکور ہے:

سورۂ اعراف، آیت: ۱۴۳

○ ''سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ''

(تیری ذات پاک ہے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں پہلا مؤمن ہوں)

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مومن، آیت: ۵۵

○ ''فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ''

(پس آپ صبر کریں کہ یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے، اور اپنے گناہ کی مغفرت طلب کریں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بجا لائیں شام کو بھی اور صبح کو بھی!)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے بارے میں ارشاد ہوا:

سورۂ توبہ، آیت: ۱۱۷

○ ''لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ''

(یقیناً اللہ نے نبی کی اور ان مہاجرین و انصار کی توبہ قبول کی جنہوں نے نہایت سخت گھڑی میں ان کی پیروی کی)

تو یہ اس عمومی توبہ الٰہی کی مثالیں ہیں جن پر آیات مبارکہ کا اطلاق دلالت کرتا ہے مثلاً

سورۂ مومن، آیت: ۳

○ ''غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ''

(وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، توبہ قبول کرنے والا ہے)

سورۂ شوریٰ، آیت: ۲۵

○ ''وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ''

(اور وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے)

سات اہم نکات

اب تک جو مطالب ذکر ہو چکے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل سات نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے:

پہلا نکتہ: توبہ الٰہی کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ اپنی رحمت اپنے بندے پر وسیع کرتے ہوئے اس کے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور اس کے دل سے گناہ و معصیت کی ظلمت زائل کر دیتا ہے۔ خواہ اس کے دل میں شرک کا گناہ ہو یا اس سے کم کوئی دوسری معصیت ہو۔ تو اسے ہی ''خدا کی توبہ'' سے موسوم کیا جاتا ہے، اسی کا دوسرا رخ یہ ہے کہ بندہ اپنے گناہوں کی مغفرت اور اپنے معاصی کے ازالہ کے لئے اپنے رب کی طرف رجوع کرے اور پلٹ آئے۔ خواہ وہ گناہ و معصیت شرک ہو یا اس سے کم تو اسے ''بندے کی اپنے رب سے توبہ'' کہا جاتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ دعوتِ حق کے عمل میں گناہوں و معاصی سے اجتناب کی اسی طرح تاکید کی جائے جس طرح شرک سے اجتناب کی تاکید اور اس پر زور دیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو مطلق توبہ کی ترغیب دلائی جائے جس میں شرک اور گناہوں دونوں سے توبہ شامل ہوتی ہے۔

دوسرا نکتہ: ''توبہ الٰہی'' میں بندے کی ابتدائی توبہ اور بندے کی توبہ کے بعد والی توبہ دونوں شامل ہوتی تھیں اور یہ توبہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی ان عمومی نعمتوں میں سے ایک ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو نوازتا ہے وہ ایسی نعمتیں ہیں جن کا عطا کرنا خدا پر لازمی اور واجب نہیں کہ کوئی اس پر ان نعمتوں کے عطا کرنے کو ضروری قرار دیتا ہو، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ یہ اس کی عطا و عنایت ہے اور اللہ تعالیٰ پر عقلاً توبہ قبول کرنے کو لازمی قرار دینے کا معنی اس کے سوا کچھ نہیں جو درج ذیل آیات مبارکہ سے سمجھا جاتا ہے:

سورۂ غافر، آیت: ۳

○ ''وَقَابِلِ التَّوْبِ''

(اور وہ توبہ قبول کرنے والا ہے)

سورۂ نور، آیت: ۳۱

○ ''وَتُوبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ''

(اور تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو اے ایمان والو!)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۲۲

○ ''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ''

(بے شک، اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

سورۂ نساء، آیت: ۱۷

○ ''فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ''

(یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے)

یہ اور اس طرح کی دیگر متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ کی توصیف قبولیت توبہ کے حوالہ سے ہوئی ہے اور ان میں لوگوں کو توبہ کرنے اور گناہوں سے استغفار کرنے کی دعوت و تاکید ہوئی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح لفظوں میں یا لازمہ و نتیجہ کی صورت میں توبہ کی قبولیت کا وعدہ ذکر ہوا ہے، اللہ تعالیٰ تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کرتا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبولیت توبہ پر مجبور نہیں بلکہ وہ مالک ہے اور ہر شے پر اس کا اختیار ہے وہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے اور اس کا ہر فیصلہ اپنا ہوتا ہے جس میں کسی دوسرے کا عمل دخل نہیں ہوتا لہٰذا اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق توبہ قبول کرے یا اس میں سے جو چاہے رد کر دے، جیسا کہ اس کے ارشاد گرامی قدر سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے جس میں اس نے فرمایا:

سورۂ آل عمران، آیت: ۹۰

○ ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ''

(بیشک، جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے تو انکی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائیگی)

ممکن ہے درج ذیل آیۂ مبارکہ سے بھی اسی مطلب کا استفادہ ہو:

سورۂ نساء، آیت: ۱۳۷

○ ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا﴿۱۳۷﴾''

(بیشک، جو لوگ ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ انہیں معاف نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں راہ حق کی ہدایت کرتا ہے)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

توبہ کی بحث میں بعض حضرات نے جو اظہارات کئے ہیں وہ بہت عجیب ہیں، فرعون کے غرق ہوتے وقت اس کے توبہ کرنے کے بارے میں جو آیت نازل ہوئی یعنی:

"حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾ آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۹۱﴾" (سورۂ یونس: ۹۰۔۹۱)

(جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے کہ جسے بنی اسرائیل معبود مانتے ہیں اور میں تسلیم کرنے والوں میں سے ہوں، اب؟ تو نے پہلے نافرمانی کی تھی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا)۔

اس حوالہ سے ان کا کہنا ہے کہ اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا کہ فرعون کی توبہ رد ہوئی ہو، اور نہ ہی قرآنی آیات سے اس کی ابدی ہلاکت و بربادی کا کوئی ثبوت ملتا ہے، اور جو شخص رحمت خداوندی کی وسعت اور اس کا اس کے غضب پر سبقت لینا بخوبی سمجھتا ہو تو بعید ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو رد کردے جو اس کی رحمت کا دروازہ کھٹکائے اور اس کے باوجود خداوند عالم اپنے کرم کا دروازہ اس پر بند کردے اور اسے مایوس و ناامید واپس لوٹا دے، یہ تو ایک عام انسان کو بھی زیبا نہیں کہ وہ اپنی فطری خوبیوں یعنی کرم نوازی، سخاوت اور رحمدلی کی اعلیٰ پاکیزہ صفات و بلند پایہ اخلاق و انسانی کمالات کی عملداری میں اس شخص کو نظرانداز کردے جو اپنے کئے پر نادم و پشیمان ہو اور اپنے بُرے اعمال پر کفِ افسوس ملتا ہوا سامنے آئے مگر وہ اس پر نظرِ کرم نہ کرے، جب ایک عام شخص کو اس طرح کا عمل زیب نہیں دیتا تو اس ہستی کے بارے میں اس طرح کا تصور کرنا کیونکر ممکن ہے جو ارحم الراحمین ہے، اکرم الاکرمین ہے اور ہر فریاد کرنے والے کی فریاد کو سننے والا ہے۔

لہٰذا یہ اظہار و عقیدہ درست نہیں، اس کی عدم صحت زیر نظر آیۂ مبارکہ (سورۂ نسا، آیت: ۱۸) کے الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے: "وَ لَیۡسَتِ التَّوۡبَۃُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ" (اور ان لوگوں کی توبہ نہیں جو برے اعمال کے مرتکب ہوں اور جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آجائے تو وہ کہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں)

اور پہلے یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ موت کا وقت آجانے کے بعد ندامت و پشیمانی جھوٹی پشیمانی ہے کیونکہ اس وقت انسان کو اپنے گناہ و معصیت کے آثار اور عذابِ الٰہی آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا ہے کہ اب اس کے پاس ندامت و پشیمانی کے اظہار کے سوا کوئی راہ چارہ باقی نہیں رہتی۔

اگر بالفرض ہر ندامت و پشیمانی کو ''توبہ'' قرار دیا جائے اور ہر ''توبہ'' بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت پا جائے تو جن آیات میں قیامت کے دن مجرم و گنہگار لوگوں کا حال مذکور ہے وہ بے معنی ہو جائیں گی جبکہ ایسا ممکن نہیں، ملاحظہ ہو:

سورۂ سبا، آیت: ۳۳

○ ''وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ''

(اور وہ جوں ہی عذاب دیکھیں گے ندامت و پشیمانی کو چھپانے لگیں گے)

اس کے علاوہ دیگر کثیر آیات مبارکہ میں ان لوگوں کا حال مذکور ہے جو قیامت کے دن اپنے کئے پر پشیمانی کا اظہار کریں گے اور بارگاہِ خداوندی میں درخواست کریں گے کہ انہیں دنیا میں واپس لوٹایا جائے تو وہ نیک اعمال بجالائیں گے، لیکن ان کی درخواست کو رد کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ اگر انہیں دنیا میں واپس لوٹا بھی دیا جائے پھر بھی وہ وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں روکا گیا اور وہ اپنی بات میں جھوٹے ہیں (لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ)

ایک غلط خیال اور اس کی نفی

''توبہ'' کے حوالہ سے جو کچھ ذکر ہو چکا ہے اس کے تناظر میں عین ممکن ہے کہ قارئین کرام میں سے کوئی شخص یہ خیال کرے کہ قرآن میں ''توبہ'' کے موضوع پر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اور اس کی بابت جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں وہ ایک ذہنی تجزیہ و تحلیل سے زیادہ کچھ نہیں جسے حقائق کی دُنیا میں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نہ ہی عملی طور پر اس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔

یہ خیال غلط و نادرست ہے کیونکہ جب انسان کی سعادت و خوشبختی اور شقاوت و بدبختی، اسی طرح اس کی بہتری و بھلائی اور برائی و ابتری کی بحث میں اس کے علاوہ کوئی نتیجہ حاصل ہی نہیں ہوتا، اس کا علمی مشاہدہ یوں ہے کہ جب ہم معاشرے میں موجود کسی عام شخص کے حال و احوال پر بخوبی نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی لحظہ بہ لحظہ تعلیم و تربیت کے حوالہ سے اثر پذیری کا راز اس کے معاشرہ سے مربوط و مرتبط ہونے میں پوشیدہ ہے کہ اگر وہ معاشرتی زندگی سے وابستہ نہ ہوتا تو اس کے نیک و بد ہونے کی کوئی صورت سامنے نہ آتی، کیونکہ وہ طبعی طور پر ان چیزوں سے خالی تھا البتہ ذہنی طور پر اسے یہ صلاحیت و استعداد حاصل تھی کہ ان میں سے کسی ایک راہ پر چل پڑے کہ اگر نیک و صالح بننا چاہے اور معاشرتی تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہو۔ تو اس کے لئے اس کا امکان موجود ہے لیکن اس مقصد کے لئے اسے اپنی موجودہ حالت کے دائرہ سے باہر قدم رکھنا ہوگا اور مربوطہ اسباب سے وابستگی اختیار کرتے ہوئے اپنی حالت و کیفیت میں تبدیلی لانے کے لئے میدانِ عمل میں کودنا ہوگا، کہ یہی بات توبۂ الٰہی کی وہ پہلی صورت اور پہلا مرحلہ ہے جو معنوی سعادت کے باب میں آتا ہے، اس کے بعد

دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بندہ اپنے آپ کو عملی طور پر اپنے برے اعمال سے دور کرے اور گناہ و معصیت کی پلیدی سے اپنے تن بدن کو پاک کرے اور اس سلسلہ میں کسی طرح کی بے توجہی و غفلت اور لا پرواہی و کوتاہی سے ہرگز کام نہ لے کہ اس کا ایسا کرنا ہی "توبہ" ہے جو ہمارے زیر بحث "توبہ" کے باب میں "توبۂ عبد" کہلاتا ہے، اس مرحلہ کے بعد "توبہ" کا وہ اصل مرحلہ شروع ہوتا ہے جس میں بندہ اپنی لوح نفس سے گناہ کی ہر گندگی کو دور کرتے ہوئے دل پر چھائی ہوئی معصیت کی پلیدی کو اس طرح زائل کر دیتا ہے کہ اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا بلکہ اس کا دل کمالی صفات اور نیکیوں کی روشنی کا مرکز بن جاتا ہے کہ پھر وہ سراپا نیکی و اچھائی قرار پاتا ہے جس میں برائی و معصیت کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ "دل" میں نیکی و برائی دونوں یکجا نہیں ہو سکتیں، یا وہ ہو گی یا وہ! تو جب اس کا دل مرکز نور بن جاتا ہے اور سراپا نیکی قرار پاتا ہے تو اس مرحلہ کو ہمارے زیر بحث موضوع میں "قبولیت توبہ اور مغفرت و بخشش" کا مرحلہ کہتے ہیں اور جب وہ اس مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے۔ تو پھر اس کی فطری قوتیں حرکت میں آجاتی ہیں اور وہ توبہ کے ان احکام و آثار کو ملحوظ و مد نظر رکھتا ہے جو دین میں مذکور و مطلوب میں ان آیات کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے اپنی ان تخلیقی بنیادوں کے عین مطابق عمل کرتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا، اس کا عمل دین فطرت کا آئینہ دار اور اس کی زندگی سراپا نیکی و اچھائی بن جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی زندگی سراپا نیکی و اچھائی بن جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی توبہ بارگاہِ ربوبیت میں قبول ہو چکی ہے اور اب وہ ایک صحیح و سالم نیک و صالح انسان بن گیا ہے کہ اس کا ہر عمل شریعت الٰہیہ کے عین مطابق اور دین کی پاسداری کا مرقع ہے۔

تیسرا نکتہ: جو آیات مبارکہ ذکر ہو چکی ہیں، وہ اور ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں "توبہ" کے حوالہ سے مذکور مطالب کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ "توبہ" ایک ایسی پاکیزہ حقیقت ہے جو نفس انسانی میں اصلاحی اثر ڈالتی ہے اور اس میں ایسی صلاحیت و قابلیت پیدا کر دیتی ہے جس سے انسان اپنی دنیا و آخرت کی سعادت کے حصول میں کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ توبہ جب اپنا اثر دکھائے تو اس سے وہ تمام نفسانی برائیاں زائل ہو جاتی ہیں جو انسان کو اس کی پہلی زندگی یعنی دنیاوی زندگی اور دوسری زندگی یعنی اُخروی حیات میں شقاوت و بدبختی سے دوچار کر دیتی ہیں اور اسے سعادت کی پاکیزہ بلند پایہ مسند پر براجمان ہونے سے مانع ہوتی ہیں، اور جہاں تک شرعی احکام اور دینی قوانین کا تعلق ہے تو وہ اپنے مقام پر باقی رہتے ہیں کہ نہ توبہ اور نہ ہی گناہ و معصیت ان کی اصل حیثیت کو ختم نہیں کر سکتیں، البتہ بعض احکام ایسے ہیں جو "توبہ" سے مربوط ہیں اور بعض مخصوص مصلحتوں کی بناء پر کہ جو خود شارع کی طرف سے مقرر و متعین قرار پاتی ہیں وہ احکام خود بخود ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف توبہ کسی حکم کو ختم کر دیتی ہے، چنانچہ اسی سورۂ مبارکہ "نسآء" کی آیت ۱۶ میں اس حوالہ سے یوں ارشاد ہوا:

○ ''وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ''

(تم میں سے وہ دو جو اس کا ارتکاب کریں تو انہیں ایذاء دو، پس اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کریں تو ان سے درگزر کرلو، بے شک، اللہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان ہے)۔

اور دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مائدہ، آیت: ۳۴

○ ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ''

(بے شک، ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں یہ ہے کہ انہیں قتل کردیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے ہاتھوں اور پیروں کو برعکس کاٹ دیا جائے یا اس زمین سے دور کردیا جائے، یہ دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بہت بڑا عذاب مقرر ہے، سوائے ان لوگوں کے، کہ جو اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پالو توبہ کرلیں، پس تم جان لو کہ اللہ معاف کردینے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے)۔

اس طرح کی دیگر آیات بھی موجود ہیں جن میں توبہ کے حوالہ سے مربوطہ مطالب مذکور ہیں۔

چوتھا نکتہ: ''توبہ'' کی اسلامی حقیقت اور اس کے بارے میں شرعی تدوین وتشریع درحقیقت جس ہدف ومقصد اور پاکیزہ غرض کے پیش نظر عمل میں آئی وہ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ گناہ ومعصیت کی تباہ کاری اور خدا کی نافرمانی کے نہایت برے انجام سے نجات پائی جائے کیونکہ وہی فلاح وصلاح سے بہرہ ور ہونے کا وسیلہ اور سعادت کی پاکیزہ منزل تک پہنچنے کا زینہ ہے جیسا کہ اس حوالہ سے قرآن مجید میں اشارہ ہوا ہے:

سورۂ نور، آیت: ۳۱

○ ''وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ''

(اور تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو اے ایمان والو! تاکہ تم فلاح پاسکو)

توبہ کے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے امید کی روح بیدار ہوتی ہے اور ناامیدی ومایوسی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں کیونکہ طبعی طور پر انسان کی زندگی کے سفر میں ڈر اور امید دونوں ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کے مقابل میں چلتے ہیں تاکہ وہ ضرر ونقصان پہنچانے والے امور سے بچ سکے اور فائدہ دینے والے امور سے آمیختہ وآراستہ ہوسکے، سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ دونوں ساتھ ساتھ نہ ہوتے تو انسان تباہ ہوجاتا اور اپنے لئے ضرر ونقصان اور فائدہ ونفع کی تمیز ہی نہ کرسکتا، اس سلسلہ میں

ارشاد الٰہی ہے:۔

سورۂ زمر، آیات: ۵۳، ۵۴

○ ''قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ''

(کہہ دیجئے! اے میرے وہ بندو کہ جنہوں نے خود اپنے ساتھ زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہے، اور تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آؤ)

انسان کی طبع وجودی کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے معمولات میں فعال وسرگرم عمل رہتا ہے اور سعی وکوشش میں اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لانے میں مشغول ہوتا ہے جب تک اسے بازارِ زندگی میں کسی خسارہ سے دوچار نہ ہونا پڑے اور جوں ہی اس کی کاوشیں اسے بے نتیجہ دکھائی دینے لگتی ہیں اور اس کی امیدیں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں بلکہ نقصان وخسارہ اس کی زندگی پر محیط ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو وہ مایوسی وناامیدی کا شکار ہو کر کچھ بھی نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک عجیب وغریب کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا، اس کی قوتیں جواب دے دیتی ہیں اور ناامیدی کے سائے اس پر چھا جاتے ہیں اور وہ زندگی میں ہر طرح کی فلاح سے قطعی طور پر ناامید ہو جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اب اس کا کوئی عمل نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ وہ جو کچھ بھی کرے گا اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس حالت وکیفیت میں صرف توبہ ہی اس کے درد کی دوا بنتی ہے اور وہ اس سے اپنی بیماری کا مداوا کر سکتا ہے کہ وہی اس کے مایوس وناامید دل کو سہارا اور اس کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کا واحد ذریعہ ہوتی ہے کہ جس سے وہ اپنے مردہ دل کو حیاتِ تازہ عطا کر سکتا ہے کہ اپنی ہلاکت وتباہی سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ گویا توبہ ہی اس کی تمام مشکلوں کا حل اور اس کے تمام مسائل کی گتھی سلجھانے کا واحد ذریعہ بن سکتی ہے۔

اسی بیان سے وہ غلط فہمی بھی خود بخود دور ہو جاتی ہے جو توبہ کی تشریع اور اس کی ترغیب دلانے میں دین اسلام کے مقررہ اصولوں کی بابت پائی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس حوالہ سے بعض حضرات گمان کرتے ہیں کہ توبہ لوگوں کو گناہ ومعصیت کے ارتکاب کی راہ پر لانے اور اطاعت کی راہ چھوڑ دینے کا سبب بنتی ہے کیونکہ جب انسان کو یقین حاصل ہو کہ اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا اور اس کے گناہ ومعصیت پر اسے سزا نہ دے گا تو اس کے دل میں گناہ کرنے کی جرأت بڑھ جاتی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ معصیتوں کا مرتکب ہو کر خدا کی نافرمانی کا رسیا بن جاتا ہے بلکہ ہر گناہ کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اپنے آپ سے کہتا ہے کہ گناہ کے بعد توبہ کا دروازہ بھی تو کھلا ہوا ہے لہٰذا خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جس قدر گناہ کر سکتے ہو کر لو پھر توبہ کر لینا کیونکہ توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے!

یہ خیال قطعی طور پر باطل ونادرست ہے کیونکہ توبہ کا دروازہ اس لئے کھولا گیا ہے کہ فضیلتوں و پاکیزہ صفات سے

آراستہ ہونا اسی وقت ممکن ہے جب لوح نفس پر گناہ و معصیت کا کوئی داغ موجود نہ ہو بلکہ وہ معصیت کی گندگی سے پاک ہو کہ اس سے رحمت خداوندی سے بہرہ ور ہونے کی امید زندہ رہے اور مغفرت و بخشش کی امید کا پاکیزہ اثر ظاہر ہو۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ توبہ کی وجہ سے انسان کو گناہ کے ارتکاب کی جرأت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہر گناہ کرتے ہوئے یہ سوچتا ہے کہ اس کے بعد توبہ کرے گا تو یہ خیال اس لئے درست نہیں اور اسے اس لئے قابل قبول قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس طرح کی توبہ حقیقی توبہ نہیں کہلاتی کیونکہ توبہ حقیقی معنی میں معصیت کی بیخ کنی اور اسے دل سے دور کرنا ہے جبکہ اس طرح کی توبہ سے معصیت دل سے دور نہیں ہوتی، اس کی دلیل یہ ہے کہ معصیت کار شخص معصیت کا ارتکاب کرنے سے پہلے، اور اس کے دوران اور اس کے بعد تمام حالات میں اس طرح کی توبہ کا عزم کئے ہوتا ہے جبکہ کسی کام کا کرنے سے پہلے یعنی گناہ کے ارتکاب سے پہلے ندامت یعنی توبہ کا معنی ہی کچھ نہیں، اور اس طرح کی توبہ کو خداوند عالم کو دھوکہ وفریب دینے کی غرض سے کی جانے والی توبہ کہا جائے گا کہ اسی طرح رب العالمین کو دھوکہ دے کر اس سے معافی لے لی جائے گی جو کہ قطعاً صحیح نہیں، اس طرح کا مکروفریب خود اس کے انجام دینے والے ہی کی طرف آتا ہے، وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (برا مکر تو اس کے اہل ہی کو گھیرے میں لیتا ہے)۔ سورۂ فاطر، آیت: ۴۳

پانچواں نکتہ: معصیت و گناہ انسان کا ایسا برا عملی فیصلہ ہوتا ہے جو اس کی زندگی میں نہایت بُرا اثر چھوڑتا ہے اور وہ اس سے توبہ کرنے اور اسے ترک کرنے کی راہ تب اختیار کرسکتا ہے جب اسے اس کے برائی ہونے کا پختہ علم و یقین حاصل ہو جائے گا۔ اور جب وہ اس کی برائی کو سمجھ جاتا ہے اور اسے یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ گناہ ایک غلیظ و گندی شے ہے تو وہ اس کے وقوع پذیر ہونے پر نادم و پشیمان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ تو ہے پہلی بات، اور دوسری بات یہ ہے کہ ندامت و پشیمانی برے فعل کے انجام دینے کے بعد انسان کے باطن میں ایک خاص اثر چھوڑتی ہے اور وہ حالت و کیفیت تبھی باقی رہ سکتی ہے جب انسان ایسے نیک و صالح اعمال بجالائے جو اس کے سراسر منافی ہوں تا کہ اس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس نے گناہ سے توبہ کر لی ہے اور اب اس کی طرف واپس نہ جائے گا۔ یہی وہ امور ہیں جو شریعت مقدسہ اسلام میں توبہ سے مربوطہ آداب کی صورت میں ذکر کئے گئے ہیں اور ان کی عملی پاسداری ضروری ہے مثلاً انجام دی ہوئی غلطی پر پشیمانی، اس کا استغفار اور خداوند عالم سے اس کی بخشش طلب کرنا، اپنے آپ کو عمل صالح سے آراستہ کرنا اور لوحِ دل کو گناہ و معصیت کی گندگی سے پاک کرنا اور اس طرح کے دیگر اعمال کہ جن کا ذکر روایات میں وارد ہوا ہے اور کتب اخلاق میں بھی مذکور ہیں۔

چھٹا نکتہ: توبہ سے مراد اختیاری طور پر برائی سے منہ موڑ کر اطاعت و عبودیت کی طرف آنا ہے، یعنی عملی طور پر بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ثبوت دینا ہی حقیقی معنی میں توبہ کہلاتا ہے، اور یہ تبھی حقیقی طور پر صورت پذیر ہوتا ہے جب عالم الاختیار میں واقع ہو جو کہ یہی دنیاوی زندگی ہے جس میں انسان کو مختار قرار دیا گیا ہے، لیکن جہاں انسان کو کوئی اختیار ہی حاصل نہیں کہ نیکی و برائی اور سعادت و شقاوت کے دو راستوں میں سے کسی ایک کو اپنائے وہاں توبہ کی گنجائش ہی نہیں، چنانچہ

اس سلسلہ میں مربوطہ مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں جن سے حقیقت الامر واضح ہو جاتی ہے، لہٰذا اسی حوالہ سے توبہ کا تعلق حقوق الناس سے بنتا ہی نہیں کیونکہ اس میں انسان کا اختیار سلب ہو جاتا ہے، توبہ صرف حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ خداوند عالم نے گناہوں کی بخشش کا وعدہ کیا ہے کہ اگر کوئی بندہ اپنے کئے پر پشیمان ہو جائے تو خداوند عالم اس کی توبہ قبول کرتا ہے لیکن جہاں تک بندوں کا تعلق ہے تو ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ توبہ کے ذریعے ممکن نہیں اور اس کا ازالہ صرف اس شخص کی طرف سے رضایت کے حصول پر موقوف ہے کہ اگر وہ معاف کردے اور راضی ہو جائے تو اس پر ہونے والی زیادتی کے آثار ختم ہو سکتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے حقوق مقرر فرمائے ہیں اور ان کی حرمت و پاسداری کا حکم دیا ہے کہ کسی کو کسی کی جان، مال اور عزت و ناموس کی بےحرمتی کا حق حاصل نہیں اور اگر کوئی شخص کسی کی جان، مال و عزت کی بےحرمتی کرے تو جب تک وہ شخص معاف نہ کرے خدا بھی معاف نہیں کرتا اور وہاں توبہ کسی کام نہیں آتی، خداوند عالم نے کسی کی جان و مال اور ناموس پر زیادتی کرنے کو ظلم و عدوان قرار دیا ہے، خدا اس سے منزہ و بالاتر ہے کہ اس کے بارے میں یہ تصور کیا جائے کہ وہ کسی کو کسی کے حقوق سلب کرنے کا اختیار یا حق دے ورنہ تو ایسا ہو جائے گا کہ خداوند عالم نے جس چیز سے لوگوں کو منع فرمایا ہے اسی کا خود ارتکاب کرتا ہے یعنی اس نے بندوں کو دوسروں پر ظلم کرنے سے منع فرمایا جبکہ خود ان پر ظلم کرے یہ ممکن نہیں، خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ یونس، آیت: ۴۴

○ ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا''

(اللہ لوگوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا)

البتہ جہاں تک اصل اسلام کا تعلق ہے جو کہ شرک سے توبہ کی عملی صورت ہے تو اس سے سابقہ تمام گناہ اور ماضی میں ہونے والے تمام معاصی کہ جن کا تعلق فروع دین و عملی احکام سے ہے سب محو ہو جاتے ہیں جیسا کہ مشہور و معروف حدیث نبوی ﷺ میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''الاسلام یجب ما قبلہ'' (اسلام پہلے کاموں کو محو کر دیتا ہے) اس روایت کی بناء پر ان آیات مبارکہ کی تفسیر واضح ہو جاتی ہے جن میں تمام گناہوں کی معافی کا عام اعلان و اظہار ہوا مثلاً:۔

سورۂ زمر، آیات: ۵۳۔ ۵۴

○ ''قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۞ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ''

(کہہ دو! اے میرے وہ بندو کہ جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے، یقیناً وہ معاف کردینے والا، نہایت مہربان ہے، اور تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آؤ اور اس کے حضور سرِ تسلیم خم کردو)

جن موارد میں توبہ کی گنجائش نہیں ہوتی ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو شخص معاشرے میں کسی برے عمل کی بنیاد رکھے یا لوگوں کو حق کی سیدھی راہ سے گمراہ کرے تو اس کے بارے میں روایات میں مذکور ہے کہ اس پر ہی ان تمام لوگوں کے گناہوں کا بوجھ ہوگا جس نے انہیں اس راہ پر لگایا یا حق سے دور کیا کیونکہ اس طرح کے موارد میں حقیقی واپسی صورت پذیر ہوتی ہی نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ گنہگار شخص نے جس برے عمل کی بنیاد رکھ دی اس کے آثار اس برائی کے وجود میں آنے تک باقی رہتے ہیں کہ جن کا ازالہ اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اس نے جس برائی کو معاشرے میں عام کیا اس کے برے آثار کو محو کرنا اب اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہوگیا لہٰذا اب اس میں اس کی توبہ کی قبولیت بے معنی ہے کیونکہ وہ ان موارد میں سے نہیں جو گنہگار اور خدا کے درمیان محدود ہیں کہ اللہ نے اس کی توبہ کے بعد اسے معاف کردینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔

ساتواں نکتہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ توبہ گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہے اور اس سے غلطیوں وخطاؤں کی معافی ہو جاتی ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۵ اس کی دلیل ہے جس میں ارشاد الٰہی ہے: ''فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ '' (جو شخص اللہ کی طرف سے نصیحت کی راہ پر آجائے اور اپنے غلط کام سے باز آجائے تو اس کے سابقہ گناہ معاف کئے جائیں گے اور پھر اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے) اس آیت کی تفسیر وتوضیح المیزان کی دوسری جلد میں ذکر ہو چکی ہے، اس کے علاوہ درج ذیل آیۂ مبارکہ سے بھی بظاہر اسی مطلب سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

سورۂ فرقان، آیت: ۷۰۔۷۱

○ ''اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ ''

(مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان کی راہ پر آجائے اور عمل صالح انجام دے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کردیتا ہے اور اللہ معاف کردینے والا، نہایت مہربان ہے، اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل بجالائے تو یقیناً اس نے اللہ کی بارگاہ میں حقیقی توبہ کرلی)

اس میں خاص طور پر دوسری آیت سے ظاہر وثابت ہوتا ہے کہ توبہ خود ہی یہ اثر رکھتی ہے یا ایمان اور عمل صالح کے اضافہ کے ساتھ گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کردینے کا سبب بنتی ہے۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود شروع ہی سے گناہ نہ کرنا اور اپنے آپ کو معصیت کی پلیدی سے بچانا اس کے ارتکاب اور پھر اس پر توبہ کر کے اسے محو کرنے کی کوشش سے بہتر وافضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے کہ گناہ خواہ جیسے بھی ہوں بالآخر ان کی بازگشت شیطانی وسوسوں کی طرف ہوتی ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے والوں اور خود کو معصیت کی گندگی سے آلودہ نہ کرنے والوں کی مدح وتعریف میں جو

الفاظ استعمال کئے ہیں وہ ان لوگوں کے بارے میں نہیں کئے جو گناہ کرنے کے بعد توبہ کے ذریعے اپنے معاصی کی معافی کا راستہ ڈھونڈتے ہیں، درج ذیل آیات پر غور کریں تو حقیقت الامر واضح ہو جائے گی:

سورۂ حجر، آیت: ۳۹ تا ۴۲

○ ''قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ''

(ابلیس نے کہا، پروردگار! تو نے مجھے جو دھوکہ دیا ہے اس کی وجہ سے میں زمین میں لوگوں کو مادی رنگ و زیبائش میں گھیر لوں گا اور ان سب کو گمراہ کر دوں گا سوائے ان میں سے تیرے ان بندوں کے کہ جو مخلص ہوں گے، خدا نے فرمایا کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے کہ میرے بندوں پر تیرا تسلط ہرگز قائم نہیں ہو سکتا)۔

سورۂ اعراف، آیت: ۱۷

○ ''وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ''

(اور تو ان کے اکثر لوگوں کو شکرگزار نہ پائے گا)

یہ بات شیطان نے خدا سے کی جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے بیان کے طور پر ذکر کیا ہے تو لوگوں میں یہ افراد ایسے ہیں جو عبدیت کی اس بلند ترین منزل و منزلت پر فائز ہیں کہ انہیں جو خصوصیت و امتیاز حاصل ہے اس میں ان کے ساتھ کوئی شریک نہیں یہاں تک کہ نیک و صالح اعمال بجا لانے والے اور گناہوں کی توبہ کر کے اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ کرنے والوں کو بھی اس عظیم مقام تک رسائی حاصل نہیں، وہ اللہ کے خاص و مخصوص و برگزیدہ بندے ہیں جنہیں ''مخلص'' ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

روایات پر ایک نظر

توبہ کی اہمیت فرمان نبوی ﷺ کی روشنی میں!

کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں مذکور ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا:

○ ''من تاب قبل موتہ بسنة تاب الله علیه''

(جو شخص اپنے مرنے سے ایک سال پہلے توبہ کرلے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے)

پھر ارشاد فرمایا:

- ''ان السنة لکثیرة ومن تاب قبل موته بشهر تاب الله علیه''

(سال تو بہت زیادہ ہے، جو شخص اپنی موت سے ایک ماہ قبل توبہ کرے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے)

پھر فرمایا:

- ''وان الشهر لکثیر، ومن تاب قبل موته بیوم تاب الله علیه'

(مہینہ بھی زیادہ ہے، جو شخص اپنے مرنے سے ایک دن پہلے توبہ کر لے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے)

پھر فرمایا:

- ''وان الیوم لکثیر، ومن تاب قبل موته بساعة تاب الله علیه''

(دن بھی زیادہ ہے، جو شخص مرنے سے ایک گھنٹہ پہلے توبہ کرے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے)

پھر فرمایا:

- ''وان الساعة لکثیرة، من تاب وقد بلغت نفسه هٰذه واهوىٰ بیده الیٰ حلقه تاب الله علیه''

(ایک گھنٹہ بھی زیادہ ہے، جو شخص اس وقت توبہ کرے جب اس کی روح یہاں تک پہنچ جائے۔ حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اپنے حلق تک اشارہ فرمایا تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے)

امام صادقؑ کا فرمان

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے: ''وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ '' (ان لوگوں کی توبہ نہیں جو برے اعمال انجام دیتے ہیں اور پھر جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں) امامؑ نے ارشاد فرمایا: یہ اُس وقت کے بارے میں ہے جب انسان آخرت کو اپنے آمنے سامنے دیکھتا ہے۔ اس وقت اس کی توبہ اس کے کام نہیں آتی۔ (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۲۸)

پہلی روایت حضرت امام جعفر صادقؑ کے اسناد سے کتاب کافی میں مذکور ہے، اور اسے اہل سنت کے محدثین نے بھی اپنے اسناد سے ذکر کیا ہے اور اس کے ہم معنی دیگر روایات بھی موجود ہیں۔

اور دوسری روایت، آیہ مبارکہ کی تفسیر کرتی ہے اور ان روایات کی وضاحت کرتی ہے جن میں موت کے وقت توبہ کی

عدم قبولیت کو بیان کیا گیا ہے کہ موت کے آنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اس کا علم ہو جائے اور آخرت کی نشانیاں اسے دکھائی دیں، تو اُس وقت توبہ کی گنجائش باقی نہیں ہوتی، لیکن جسے اس کا علم نہ ہو اور وہ اس سے آگاہ ہو تو اس کی توبہ کی قبولیت میں کوئی مانع نہیں ہوتا۔

بہر حال اس روایت سے مشابہ دیگر روایات موجود ہیں جو عنقریب پیش کی جائیں گی۔

امام محمد باقرؑ کا توضیحی ارشاد!

تفسیر العیاشی میں زرارہ سے منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''اذا بلغت النفس هٰذه واهوىٰ بيده الى حنجرته لم يكن للعالم توبة، وكانت للجاهل توبة ''(جب روح یہاں تک پہنچ جائے۔ اس وقت امامؑ نے اپنے ہاتھ سے اپنے گلے تک اشارہ فرمایا۔ تو اس وقت جسے اس کا علم ہو اس کی توبہ قبول نہیں، لیکن جسے معلوم نہ ہو اس کی توبہ قبول ہوگی)(تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۲۲۸)

حجاب شرک سے مبرا

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ احمدؔ اور بخاریؔ نے اپنی تاریخ میں اور حاکمؔ و ابن مردویہ نے حضرت ابوذرؓ کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان الله يقبل توبة عبده او يغفر لعبده مالم يقع الحجاب، قيل: وما وقوع الحجاب؟ قال: تخرج النفس وهي مشركة (اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے یا اپنے بندے کو معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ پردہ نہ ڈالا ہوا ہو، پوچھا گیا کہ پردہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پردہ یہ ہے کہ جب روح نکلے تو شرک کی حالت میں نکلے)(تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲، صفحہ ۱۳۱)

حدیث نبوی ﷺ سے استدلال

تفسیر ''درمنثور'' ہی میں مذکور ہے کہ ابن جریر نے حسن کے حوالہ سے بیان کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان ابليس لما رأى ادم اجوف قال: وعزتك لا اخرج من جوفه مادام فيه

الروح. فقال الله تبارك و تعالیٰ: وعزتی لا احول بینه و بین التوبة مادام الروح فیه'' جب ابلیس نے دیکھا کہ آدم اندر سے خالی ہیں تو کہنے لگا: خدایا، تیری عزت کی قسم! میں اس کے بدن سے ہرگز باہر نہ آؤں گا جب تک اس میں روح باقی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مجھے اپنی عزت کی قسم! جب تک اس میں روح موجود ہے اس کے اور توبہ کے درمیان حائل نہ ہوں گا۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲، صفحہ ۱۳۰)

اصول کافی کی روایت

کتاب کافی میں علی احمسی کے حوالہ سے حضرت امام ابوجعفر محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی قدر مذکور ہے کہ امامؑ نے فرمایا:

- ''والله ما ینجو من الذنوب الا من اقر بها''

(اللہ کی قسم! کسی کو گناہوں سے نجات نہیں ملے گی سوائے اس شخص کے کہ جو اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کرے)

علی احمسی کہتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ نے ارشاد فرمایا:

- ''کفی بالندم توبة''

(توبہ میں یہی کافی ہے کہ اپنے کئے پر نادم و پشیمان ہوں) (اصول کافی ج ۲ ص ۴۲۶)

توبہ نصوح کا اثر

کتاب اصول کافی میں دو اسناد سے ابوذہب کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''اذا تاب العبد توبةً نصوحاً احبه الله تعالیٰ فستر علیه. فقلت: و کیف یستر علیه؟ قال (ع): ینسی ملکیه ما کانا یکتبان علیه ثم یوحی الله الیٰ جوارحه والی بقاع الارض: ان اکتمی علیه ذنوبه فیلقی الله حین یلقاه ولیس شئ یشهد علیه بشیئ من الذنوب''

(جب بندہ توبۂ نصوح کرتا ہے تو اللہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے، میں نے پوچھا کہ اللہ کس طرح اُس پر پردہ ڈالتا ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم ان دو فرشتوں کو جو اس کے اعمال لکھتے ہیں اُنہیں

ان کا لکھا ہوا بھلوا دیتا ہے۔ پھر اس بندے کے اعضاء و جوارح اور تمام روئے زمین کو حکم دیتا ہے کہ اس کے گناہوں کو چھپالیں، پھر جب اللہ تعالیٰ اسے اپنے حضور لاتا ہے، جب بھی لاتا ہے، تو وہ اس حال میں ہوتا ہے کہ کوئی ایسا گناہ نہیں ہوتا جو اس کے خلاف گواہی دے) (اصول کافی، جلد ۲ صفحہ ۴۲۶)

رحمت خدا سے ناامید نہ ہوں

محمد بن مسلم نے بیان کیا کہ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"یا محمد بن مسلم، ذنوب المؤمن اذا تاب عنها مغفورة له فلیعمل المؤمن لما یستأنف بعد التوبة والمغفرة اما واللہ انها لیست الا لاهل الایمان، قلت: فان عاد بعد التوبة والاستغفار فی الذنوب وعاد فی التوبة؟ فقال: یا محمد بن مسلم اتریٰ العبد المؤمن یندم علیٰ ذنبه فیستغفر اللہ منه ویتوب، ثم لا یقبل اللہ توبته؟ قلت: فان فعل ذلك مرارا یذنب ثم یتوب ولیستغفر فقال: کلما عاد المؤمن بالاستغفار والتوبة عاد اللہ علیه بالمغفرة، وان اللہ غفور رحیم یقبل التوبة، ویعفو عن السیئات فایاك ان تقنط المومنین من رحمة اللہ"

(اے محمد بن مسلم! مؤمن جب اپنے گناہوں سے توبہ کرے تو اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، لہٰذا مومن کو چاہیے کہ توبہ اور مغفرت کے بعد اعمال صالحہ بجالائے، خدا کی قسم! توبہ صرف اہل ایمان کے لئے ہے، میں نے پوچھا کہ اگر توبہ واستغفار کے بعد پھر گناہوں کی دنیا میں پلٹ جائے تو پھر اس کی توبہ کیسی؟ امامؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اے محمد بن مسلم! کیا تو سمجھتا ہے کہ کوئی بندۂ مومن اپنے گناہ پر نادم و پشیمان ہو اور اللہ سے اپنے گناہ کی بخشش طلب کرے اور توبہ کرے تو خدا اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا؟ میں نے عرض کی کہ اگر بار بار گناہ کا مرتکب ہو پھر توبہ واستغفار کرے، تو کیا پھر بھی اس کی توبہ قبول ہوگی اور اس کے گناہ معاف ہوجائیں گے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: جب مؤمن دوبارہ استغفار کرے اور توبہ کرے تو اللہ بھی دوبارہ اسے مغفرت سے نوازتا ہے، خواہ جتنی بار توبہ واستغفار کرے اللہ اتنی بار اُسے معاف کرتا ہے اور اُسے مغفرت عطا کرتا ہے اور اس کی توبہ قبول کرتا ہے، خدا تو ہے ہی معاف کرنے والا، نہایت مہربان، وہ توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں وغلطیوں سے درگزر کرتا ہے، بس، مؤمنوں کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ کرو!) (اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۳۶)

جہالت سے ہونے والی برائیوں کی توبہ

تفسیر العیاشی میں ابو عمرو زبیری سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیۂ مبارکہ ''وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ'' کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے ارشاد فرمایا اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے جس سے اس کی اس تفسیر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ صرف اسی بندے کا عمل قبول کرے گا جس سے قیامت کے دن ملاقات میں عملی وفاداری نمایاں ہوگی، تو یہ ہے آیت کی تفسیر! اور آیت میں توبہ کی قبولیت میں ''جہالت'' کا جو حوالہ دیا گیا ہے اور یوں کہا گیا ہے: ''إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ'' (اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہوں کے مرتکب ہوں) تو اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ خواہ جو گناہ کرے اگرچہ وہ اس کا علم بھی رکھتا ہو تب بھی وہ جاہل ہے کیونکہ اس کے دل پر اپنے پروردگار کی نافرمانی کے ارتکاب کی خواہش کا پیدا ہونا ہی اس کی حقیقی معنی میں جہالت ہے، چنانچہ اس کا قرآنی ثبوت سورۂ یوسف، آیت:۸۹ میں موجود ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کا بیان ذکر کیا جو انہوں نے اپنے بھائیوں سے فرمایا اور اس میں انہیں جاہل سے تعبیر کیا، ملاحظہ ہو:

''قَالَ هَلْ عَلِمْتُم مَّا فَعَلْتُم بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ''

(اُس نے کہا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے جو کچھ یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ سلوک کیا جبکہ تم جاہل تھے)

یہ نسبت اس لئے اُن کی طرف دی کہ اُن کے دلوں میں خدا کی نافرمانی کی طرف توجہ پیدا ہوگئی تھی۔

(تفسیر عیاشی، جلد اوّل صفحہ ۲۲۸)

اس روایت کا متن غیر مربوطہ ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پہلے جملہ ''جس بندے سے قیامت کے دن عملی وفاداری نمایاں ہوگی'' سے مراد یہ ہے کہ عمل تب قبول ہوگا جب بندہ اس کے ساتھ وفا کرے یعنی اس کے منافی عمل انجام دے کر اسے نقض نہ کرے، لہٰذا توبہ تب قبول ہوگی جب گنہگار کو گناہ کے ارتکاب سے روکے اور اسے معصیت و نافرمانی سے دور رکھے خواہ لحہ بھر کے لئے کیوں نہ ہو، اور آیت مبارکہ میں جملہ ''إِنَّمَا التَّوْبَةُ...... '' نیا اور مستقل کلام ہے جس کے ذریعے یہ بتانا مقصود ہے کہ لفظ ''بِجَهَالَةٍ'' مطلوب کی وضاحت کے لئے ذکر ہوا ہے (جسے علمی اصطلاح میں ''قید توضیحی'' کہتے ہیں) اس سے مراد یہ ہے کہ ہر گناہ کا ارتکاب جہالت کی بناء پر ہوتا ہے اور اس آیت کے ذیل میں جو دو احتمال پیش کئے گئے ہیں ان میں سے ایک کی تائید اس بیان سے ہوتی ہے۔ اسی موضوع سے مربوطہ دیگر روایات بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہیں۔

آیات ۱۹ تا ۲۲

○ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

○ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾

○ وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

○ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

ترجمہ

○ ''اے ایمان والو! تمہیں یہ روا نہیں کہ تم عورتوں کے ان کی ناپسندیدگی کے باوجود وارث و مالک بنو، اور تم انہیں اس لئے پابند نہ کرو کہ اس مال میں سے جو تم نے انہیں دیا ہے کچھ ہتھیا لو سوائے اس کے کہ وہ کھلم کھلا برائی کا ارتکاب کریں، ان کے ساتھ نیکی کے ساتھ معاشرت کرو، ہاں اگر تم انہیں ناپسند کرو تو ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں خیر کثیر قرار دے۔''

(۱۹)

○ ''اور اگر تم ایک زوجہ کی جگہ دوسری زوجہ لانا چاہو جبکہ تم انہیں (پہلی زوجہ کو) سونے سے بھری بوری دے چکے ہو تب بھی اس میں سے کچھ نہ لو، کیا تم اس میں سے کچھ ان پر الزام تراشی کر کے اور واضح گناہ کا ارتکاب کر کے لیتے ہو؟''

(۲۰)

○ ''اور تم اس مال سے لے بھی کیونکر سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے سے جسمانی قربت اختیار کر چکے ہو اور وہ تم سے مضبوط عہد و پیمان لے چکی ہیں''

(۲۱)

○ ''اور تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے آباء نے نکاح کیا البتہ جو پہلے ہو چکا وہ ہو چکا کہ وہ بہت برا عمل اور گناہ ہے اور نہایت ہی برا طرزِ عمل ہے۔''

(۲۲)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں خواتین سے مربوط ان مسائل کا تسلسلی تذکرہ ہوا جو پہلے ذکر ہو چکے ہیں، اس کے باوجود ان آیات مبارکہ سے جملہ ''وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا'' عورت کی معاشرتی زندگی کے ایک نہایت بنیادی اصول کے بیان پر مشتمل ہے۔

زمانۂ جاہلیت کی ایک فرسودہ رسم کا بطلان

○ ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ .... كَرْهًا''
(اے ایمان والو! تمہارے لئے جائز نہیں............الخ)۔

تاریخ اور روایات کے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہ رسم عام تھی کہ جب کوئی شخص مرجاتا تو اس کی بیوی یا بیویاں اس کے ترکہ میں شمار کی جاتی تھیں بشرطیکہ وہ وارث کی ماں نہ ہو، اس بناء پر میت کے وارث انہیں دوسرے اموال کی طرح ترکہ کی صورت میں قرار دیتے تھے اور اس کے حصہ وتقسیم کا حساب کرتے تھے، اس کا طریقۂ کار یہ ہوتا تھا کہ وارثوں میں سے کوئی ایک شخص میت کی زوجہ کے سر پر کپڑا ڈال دیتا تھا اور اسے وراثت میں اپنا حصہ قرار دیتا تھا، اب وہ اس کی ملکیت ہو جاتی تھی کہ اگر چاہتا تو اس کے ساتھ شادی کر لیتا کہ جس میں کوئی حق مہر مقرر نہ کیا جاتا تھا بلکہ وراثت کے طور پر وہ اس کا حصہ قرار پاتی تھی، اور اگر اس سے شادی کرنا ناپسند کرتا تو اسے اپنے پاس رہنے دیتا کہ اگر چاہے تو کسی سے اس کی شادی کر دے اور اس کا حق مہر وصول کر کے اس سے استفادہ کرے، اور اگر چاہے تو اسے اپنے گھر میں رہنے دے اور اس سے کام کاج لے کہ اگر اس کے پاس کوئی مال ہو تو اسے بھی اپنے کام میں لائے اگرچہ آیت مبارکہ سے بظاہر یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس میں زمانۂ جاہلیت کی اس عام رسم سے ممانعت ہوئی ہے جسے ہم نے ذکر کیا ہے یعنی خواتین کو ترکہ قرار دیا جانا اور ان

کی تقسیم عام مال کے طور پر! چنانچہ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت میں اسی معاشرتی عام بری رسم سے باز رہنے کی سخت تاکید وارد ہوئی ہے لیکن آیت مبارکہ کے ذیل میں لفظ ''کرھًا'' سے اس قول کی تائید نہیں ملتی اور نہ ہی اس کے ظاہر سے مطابقت و ہمرنگی ثابت ہوتی ہے خواہ اسے ''قید توضیحی'' قرار دیا جائے یا ''قید احترازی'' قرار دیں، دونوں صورتوں میں اس سے آیت کے ظاہر سے ہمرنگی کا اشارہ نہیں ملتا، (قید توضیحی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خواتین ہمیشہ خود کو ترکہ قرار دیے جانے اور وراثت کے مال کی طرح شمار کئے جانے کو ناپسند کرتی ہیں اور انہیں کبھی یہ بات گوارا نہیں کہ وہ میراث کی صورت میں کسی وارث کا حصہ قرار پائیں، اور قید احترازی ہو تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ اگر عورت خود کو ترکہ کا حصہ اور میراث میں شامل مال کی طرح ہونے کو ناپسند کرے تو اسے وراثت کا حصہ قرار نہ دو)۔

اب ان دونوں صورتوں کا تفصیلی تجزیہ کریں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسے قید توضیحی قرار دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خواتین ہمیشہ اپنے آپ کو وراثت کا حصہ بننے کو ناپسند کرتی ہیں، جبکہ ایسا نہیں کیونکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، بلکہ عین ممکن ہے کہ کوئی خاتون شوہر کے وارثوں میں کسی کو پسند کرے یا کسی دوسری وجہ سے اس گھر ہی میں رہنا پسند کرے۔ اور اگر اسے قید احترازی قرار دیں تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اگر عورت خود پسند نہ کرے کہ اسے وراثت کے حصہ کے طور پر قرار دیا جائے تو اسے وراثت کا حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اگر اس میں عورت کی رضا اور رغبت شامل ہو تو کوئی حرج نہیں، جبکہ اصل حکم شرعی ایسا نہیں، یعنی اس کی اپنی پسند و ناپسند کو شرعی حکم کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔

البتہ جہاں تک ناپسندیدگی کا تعلق ہے تو وہ اس طرح سے ہے کہ ہمیشہ یا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن عورتوں کے شوہر فوت ہو جاتے ہیں ان کی میراث کے طمع و لالچ میں ان سے شادی کرنے کو پسند نہیں کیا جاتا یا خود انہیں میراث کا حصہ قرار دے کر ان پر تسلط قائم کرنے کے بعد ان کی وراثت ہتھیالی جاتی ہے، بنا برایں آیۂ مبارکہ اس طرح کی ناپسندیدگی پر مبنی وراثت سے منع کرتی ہے، کیونکہ اصل مالک اسے ناپسند کرتا ہے، اور جہاں تک وراثت کے طور پر ان سے شادی کرنے کا تعلق ہے تو اس کی ممانعت بعد والی آیت (۲۲) میں ان الفاظ سے ہوئی ہے: ''وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ'' (اور تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے آباء نے نکاح کیا) اور جہاں تک کسی دوسرے کے ساتھ ان کی شادی کر کے ان کا حق مہر خود رکھ لینے کا تعلق ہے تو اس کی ممانعت اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۳۲ میں ان الفاظ سے ہوئی ہے: ''وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ'' بہر حال ان تمام مطالب کا جامع بیان درج ذیل آیۂ مبارکہ میں ہوا جس کی تفسیر پہلے ذکر ہو چکی ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۳۴

○ ''فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ''

(جو کچھ وہ خود کے ساتھ اپنے لئے کریں اس میں کوئی حرج نہیں اس میں تم پر کوئی حرف نہیں آتا)۔

اور "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ کَرْهًا" کے بعد جملہ "وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا ......" میں "عضل"، یعنی روکے رکھنے سے انہیں میراث کا حصہ قرار دے کر ان کا مال ہتھیانے کے لئے انہیں روکنا مراد نہیں کیونکہ "لَا تَعْضُلُوْهُنَّ" (انہیں روکے نہ رکھو) کے بعد یہ جملہ مذکور ہے: "لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ" یعنی تم انہیں اس لئے نہ روکے رکھو کہ ان سے اس مال میں سے کچھ ہتھیا لو جو تم نے انہیں دیا ہے، کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں "اس مال میں سے کچھ ہتھیانے" سے مراد وہ مال ہے جو شوہر نے اپنی بیوی کو اس کے حق مہر کے طور پر اسے دیا ہو نہ کہ وہ مال جو حق مہر کے علاوہ کسی دوسری راہ سے اس کی ملکیت میں آیا ہو۔ خلاصۂ کلام یہ کہ آیۂ مبارکہ میں عورتوں کے اموال کو ان کی ناپسندیدگی وعدم رضایت سے وراثت قرار دے کر ہتھیانے کی ممانعت ہوئی ہے نہ کہ خود ان کو وراثت کا حصہ قرار دینے کی! لہٰذا جملہ "تَرِثُوا النِّسَآءَ" میں وراثت کی نسبت خود عورتوں کی طرف دینا اس صورت میں معنی کو واضح کرے گا کہ اس میں لفظ "اموال" فرض کر کے یوں سمجھا جائے: "ترثوا اموال النسآء" (کہ تم عورتوں کے اموال کے وارث بنو) یا یہ کہ اسے "مجاز عقلی" قرار دے کر یوں معنیٰ کیا جائے کہ خود ان کی وراثت سے مراد ان کے اموال کی وراثت ہے یعنی عقل کہتی ہے کہ ان کے مالک بننے کو مجازاً ذکر کیا گیا ہے جبکہ اس سے ان کے اموال کا مالک بننا مقصود ہے، (علمی اصطلاح میں اس طرح کے استعمال کو "مجاز عقلی" کہا جاتا ہے)۔

عورتوں کو روکے رکھنے کی ممانعت

○ "وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ"

(اور تم انہیں اس لئے نہ روکو کہ انہیں تم نے جو مال دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو، مگر یہ کہ وہ کسی کھلے گناہ کا ارتکاب کریں)

اس جملہ کا عطف دو طرح سے قابل تصور ہے: ایک یہ کہ اسے "اَنْ تَرِثُوْا" کا معطوف قرار دیں اور عبارت کو اس طرح فرض کریں: "ان ترثوا ولا ان تعضلوھن" دوسرا یہ کہ اسے جملہ: "لَا یَحِلُّ لَکُمْ" کا معطوف قرار دے کر نہی قرار دیں کیونکہ یہ جملہ "وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا" بھی نہی کا معنی دیتا ہے جیسا کہ "لَا یَحِلُّ لَکُمْ" نہی کے معنی میں ہے۔

لفظ "عضل" کا معنی منع یعنی روکنا، تضییق یعنی تنگی کرنا اور تشدید یعنی سختی کرنا ہے "لَا تَعْضُلُوْهُنَّ" یعنی انہیں مت روکو، ان پر تنگی نہ کرو اور ان پر سختی نہ کرو۔

لفظ "فاحشة" کا معنی نہایت بُرا طرزِ عمل ہے البتہ عام طور پر اسے "زنا" کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

لفظ "مُبَیِّنَةٍ"، "متبینه" کے معنی میں آتا ہے یعنی کھلم کھلا، واضح و آشکار، مشہور ماہر علم لغت ونحو سیبویہ سے منقول

ہے کہ انہوں نے کہا کہ ''اَبَانَ'' (اس نے واضح کیا) باب اِفعال ''اِسْتَبَانَ'' باب استفعال ''بَیَّنَ'' باب تفعیل ''تَبَیَّنَ'' باب تفعل ـــــ سب ایک ہی معنی دیتے ہیں، یہ سب لازم و متعدی دونوں صورتوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ لازم ہونے کی صورت میں یوں کہا جاتا ہے:

''اَبَانَ الشَّیئُ، اِسْتَبَان، بَیَّنَ'' اور ''تَبَیَّنَ'' ان سب کا معنی کسی چیز کا واضح ہونا ہے اور متعدی ہونے کی صورت میں یوں کہا جاتا ہے: ''اَبَنْتُ الشَّیْءَ، اِسْتَبَنْتُہٗ، بَیَّنْتُہٗ'' اور ''تَبَیَّنْتُہٗ'' ان سب کا معنی یہ ہے کہ ''میں نے اس چیز کو واضح کیا''۔

اس آیۂ مبارکہ میں اس بات کی ممانعت وارد ہوئی ہے کہ کسی طرح سے انہیں تنگ نہ کرو، ان پر تنگی نہ کرو کہ وہ عقد نکاح کو فسخ کرنے کے لئے اپنا حق مہر معاف کرنے پر مجبور ہو جائے، اور معاشی طور تنگ آ کر حق مہر دے کر خلاصی پانے پر مجبور ہو جائے، لہٰذا اس ارادے سے شوہر پر حرام ہے کہ وہ اپنی بیوی پر تنگی و سختی کرے، ہاں وہ اس صورت میں ایسا کر سکتا ہے جب عورت کسی کھلی برائی کا ارتکاب کرے، اس صورت میں شوہر کا حق ہے کہ وہ اس پر سختی کرے اور اس پر اس طرح تنگی کرے کہ وہ کچھ مال دے کر اسے چھوڑ جائے، یہاں یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ یہ آیت سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۹ سے منافی نہیں جس میں یوں ارشاد ہوا:

○ ''وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ''

(اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم نے جو کچھ اُنہیں دے دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لو مگر یہ کہ انہیں اندیشہ ہو کہ وہ احکامِ الٰہی کی پاسداری نہ کر پائیں گے، پس اگر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کی پاسداری نہ کر پائیں گے تو ان پر کوئی حرج و گناہ نہیں کہ وہ (عورت) خود کچھ مال دے دے)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت میں جو عام حکم بیان کیا گیا ہے وہ زیر بحث آیت مبارکہ میں ایک خاص مورد سے مختص ہو گیا ہے، یعنی اس آیت میں ایک استثنائی مورد ذکر کیا گیا ہے کہ اگر وہ کسی واضح برائی کا ارتکاب کریں (اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ) تو ان سے کچھ مال لے کر انہیں چھوڑ دینا جائز ہے، یعنی ان سے جان چھڑانے کے لئے ان سے مال لینے میں کوئی حرج نہیں، اور سورۂ بقرہ میں مال دینے کا حکم دونوں کی رضامندی پر موقوف ہے لہٰذا زیر بحث آیت، سورہ بقرہ کی آیت سے مال دے کر ایک دوسرے سے الگ ہونے کے حکم سے مخصوص نہیں ہوتی بلکہ صورتحال اس کے برعکس ہے۔

نیک سلوک کرنے کا حکم

○ ''وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ''

(اوران کے ساتھ نیکی کے ساتھ معاشرت کرو)

آیۂ مبارکہ میں لفظ ''معروف'' ذکر ہوا ہے جس سے مراد ہر وہ کام ہے جسے لوگ اپنے معاشرہ میں پہچانتے ہوں کہ نہ تو اس سے نا آشنا ہوں اور نہ ہی اس سے نا آگاہ ہوں، بلکہ وہ ان کے درمیان اس قدر معروف ہو کہ اس کا انکار بھی نہ کر سکیں، یہاں معاشرت کو ''معروف'' کے ساتھ مقید کر کے ذکر کرنے سے یہ مطلب مقصود ہے کہ ان کے ساتھ اس طرح کی معاشرت اختیار کریں جو ان لوگوں یعنی ہل اسلام کے ہاں معروف ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس طرح کی معاشرت ہے؟ تو اس حوالہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوگ عموماً جس طرزِ معاشرت کو اپناتے ہیں اور ان کے درمیان وہی متعارف ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر فرد کو معاشرہ کا بنیادی حصہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے کہ وہ دیگر افراد کی طرح معاشرہ کی تشکیل میں برابر مقام رکھتا ہے تا کہ باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی وجودی قوتوں سے استفادہ کرتے ہوئے معاشرتی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے اور ہر شخص اپنے مقدور بھر کوشش کر کے اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل پر قناعت کرے جس چیز کے بغیر اس کی زندگی کا نظام چل سکتا ہو وہ دوسرے ہمنوع افراد کو دے کر صرف اسی چیز کو اپنے پاس رکھے جس پر اس کا گزر بسر موقوف ہو، اسی طرح دیگر افراد کی کار آرائی سے حاصل ہونے والے فوائد میں سے اسی حد تک لے لے جس میں سے اس کی اپنی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں، تو یہ ہے معاشرت کی وہ عام معروف صورتحال! لیکن اگر افرادِ معاشرہ میں سے کسی فرد کے ساتھ اس کے علاوہ برتاؤ کیا جائے اور ایسا سلوک کیا جائے جس سے اس کی استقلالی حیثیت ختم ہو کر رہ جائے کہ گویا اسے معاشرہ کا حصہ ہی نہ سمجھا جائے اور وہ اس طرح کہ اس سے تو ہر طرح کا استفادہ کیا جائے لیکن وہ اس کے مقابلے میں کوئی استفادہ نہ کر سکے تو یہ ایک استثنائی صورت ہو جائے گی جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں تمام بنی نوع انسان کو خواہ مرد ہوں یا عورتیں ایک ہی انسانی حقیقت کے اجزاء قرار دیا ہے، کہ تمام افرادِ بشر ایک وجودی حقیقت کے حصے ہیں! اور معاشرہ اپنے وجود میں آنے میں ان سب کا محتاج ہوتا ہے اور وہ سب معاشرہ کی تشکیل میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں، اس حوالہ سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا خواہ مرد ہوں یا عورتیں! جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ'' (تم ایک دوسرے سے ہو) سورۂ نساء، آیت: ۲۵

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ عمومی حوالہ سے مرد و زن کا یکساں ہونا اس بات کے منافی نہیں کہ ان میں سے ہر صنف

کو کچھ مخصوص صفات حاصل ہوں مثلاً مردوں میں نوعی طور پر شدت وقوت پائی جائے جبکہ خواتین طبعی طور پر نرم دلی وعطوفت کے جذبات کی حامل ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طبع انسانی کو اپنی تکوینی و معاشرتی زندگی کے حوالہ سے دونوں چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی شدت وقوت اور نرم دلی وعطوفت دونوں ایسی صفتیں ہیں جو طبع انسانی کی بنیادی ضرورت ہے۔ گویا ہر انسان اپنی زندگی میں طبعی وفطری طور پر ایک طرف سختی وطاقت اور دوسری طرف نرمی وعطوفت چاہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے ہمنوع افراد سے بھی اپنے لئے انہی دوصفتوں کی عملداری کا خواہاں بلکہ ضرورت مند ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ دو صفتیں انسانی معاشرہ میں جاذبہ ودافعہ کے عمومی مظاہر ہیں، بنابرایں مرد اور عورتیں دونوں ہی اپنی حیثیت ومقام اور انسانی حوالہ سے معاشرتی عملداری میں ہم پلہ ہیں اور یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے مرد حضرات اپنے تمام صفاتی فرق کے باوجود معاشرتی امور میں اپنی کارآرائی کے حوالہ سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں جبکہ ان میں سے کوئی قوی اور کوئی ضعیف، کوئی عالم اور کوئی جاہل، کوئی زیرک وہشیار اور کوئی کودن ونادان، کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا، کوئی حاکم اور کوئی محکوم، کوئی خادم اور کوئی مخدوم، کوئی بزرگوار اور کوئی پست وخوار، کوئی عالی مرتبت وعالی ظرف اور کوئی خسیس وکم ظرف ہوتا ہے، لیکن جہاں تک معاشرتی عملداری کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے سب یکساں مقام رکھتے ہیں اور سب ہی معاشرہ کے استحکام وترقی میں برابر کے شریک اور انسانیت کی نسبت سے ہم پلہ ہیں، یہی وہ حقیقت ہے جو فطرت سلیمہ کے اصولوں پر چلنے والے انسانی معاشرہ کے عادلانہ مزاج کی عکاسی کرتی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرتی عملداری میں کسی طرح کی کج روی نہیں پائی جاتی، اور اسلام کا بنیادی ہدف ہی یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ہر طرح کی کجروی وانحراف سے محفوظ رہے اور فطرتِ سلیمہ ہی پر قائم واستوار ہو، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے ناگذیر ہے کہ معاشرہ میں افراد کے درمیان مساوات قائم ہو اور مردوں وعورتوں میں معاشرتی حوالہ سے برابری کا نظام رائج ہو، اسے ہی ''معاشرتی آزادی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسے ہی ''مرد وعورت کی برابری و مساوات'' کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان، انسان ہونے کے حوالہ سے فکر وارادہ رکھتا ہے اور وہ مختار بھی ہے یعنی اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے وہ کچھ اپنائے جو اس کے لئے فائدہ مند ہو اور وہ کچھ نہ اپنائے اور اختیار نہ کرے جو اس کے لئے نقصان دہ ہو، وہ اس سلسلہ میں کامل استقلال رکھتا ہے یعنی نقصان دہ کام کو ترک کرنے اور فائدہ مند کام کو انجام دینے کا فیصلہ کرنے میں مختار ومستقل ہے، یہ تو ہے اس کی انفرادی ونجی زندگی میں اس کا اختیار واستقلال! اور جب وہ معاشرتی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو وہاں بھی اسے یہی اختیار واستقلال حاصل ہوتا ہے لیکن اس میں اسے یہ بات ملحوظ رکھنی ہوتی ہے کہ اس کا اختیار کردہ کام انسانی معاشرہ کی سعادت وخوشبختی اور فلاح سے متصادم ومنافی نہ ہو، اس بناء پر وہ جو چاہے اختیار کرے اس میں کوئی چیز اس کے سدِ باب نہیں ہوسکتی اور نہ ہی وہ کسی حوالہ سے اس سلسلہ میں کسی دوسرے کے رحم وکرم کا دست نگر ہوسکتا ہے بلکہ بھرپور استقلال کے ساتھ اپنی راہ وروش کا انتخاب کرسکتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی برابری ومساوات کے باوجود اگر معاشرہ کے بعض

طبقات یا ایک ہی طبقہ وصنف کے بعض افراد کو کچھ خصوصیات و امتیازات حاصل ہوں یا بعض کچھ محرومیتوں کا شکار ہوں تو اس میں کوئی حرج لازم نہیں آتا اور نہ ہی اصل برابری ومساوات میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہے، بلکہ اس کے باوجود یہ امتیازات و خصوصیات باقی رہتی ہیں مثلاً اسلام میں مردوں کے لئے قضاوت وحکومت اور جہاد کا اختصاص اور ان پر عورتوں کے اخراجات، نان ونفقہ کا واجب ہونا وغیرہ ان کے امتیازات میں شامل ہے جبکہ عورتیں ان خصوصیات سے محروم ہیں، اس طرح نابالغ بچوں کو ان کے اقرار کا بے اثر ہونا، معاملات ولین دین میں ان کے فیصلوں کی عدم صلاحیت اور ان پر کوئی شرعی فریضہ عائد نہ ہونا (ان کا غیر مکلف ہونا وغیرہ) تو اس طرح کی تمام خصوصیات وامتیازات ایسے مخصوص احکام ہیں جو معاشرہ کے طبقات واشخاص کے لئے مقرر کئے گئے ہیں کہ ان کی وجہ ان کی مخصوص معاشرتی حیثیت ومقام ہے جبکہ وہ سب اصل انسانی معاشرتی حوالہ سے مشترک ویکساں ہیں کیونکہ اس کا معیار ان کا فکر وارادہ کا حامل ہونا ہے، کہ اسی معیار کے مطابق ان سب کا معاشرتی مقام ایک ہے۔

اس مقام پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ مذکورہ بالا اختصاصات وامتیازات اور طبقات وافراد کی خصوصیات صرف شریعت اسلامیہ ہی میں نہیں بلکہ تمام معاشرتی قوانین میں موجود ہیں، بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان تمام انسانی معاشروں میں پائے جاتے ہیں جو اپنی بود وباش اور طرزِ معاشرت کے مخصوص اصول رکھتے ہوں خواہ ان میں کسی خاص قانون کی حکمرانی نہ ہو بلکہ ایک طرح کا جنگلی طرزِ معاشرت رائج ہو ان میں بھی کم وبیش اس طرح کے امتیازات کے عملی نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ بنا بر ایں اگر ہم ان تمام مطالب کو ایک ہی جملہ میں بیان کرنا چاہیں تو ان سب کا جامع جملہ یہی ہے جو خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے یعنی ''وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو) جیسا کہ اس سلسلہ میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔

اور جہاں تک اس جملہ کا تعلق ہے ''فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْــٴًـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا'' (اگر تم انہیں ناپسند کرو تو عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں خیر کثیر قرار دے) تو اس جملہ میں ایک واضح ومعلوم بات کو مشکوک وامکانی صورت میں پیش کیا گیا ہے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مخاطب کے دل میں تعصب کے جذبات برانگیختہ و بیدار ہو جائیں، اس کی مثال درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی پائی جاتی ہے:۔

سورۂ سبا، آیت: ۲۴۔۲۵

○ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ قُلْ لَّا تُسْــٴَـلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْــٴَـلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

(کہہ دیجئے، کون ہے جو تمہیں آسمانوں اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ کہہ دیجئے کہ وہ خدا ہے، اور ہم اور تم یا ہدایت کی راہ پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں، کہہ دو کہ تم سے ہماری غلطیوں کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی اور نہ

ہی ہم سے تمہارے اعمال کے بارے میں باز پرس ہوگی)

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دور یعنی زمانۂ نزول قرآن میں انسانی معاشرہ کی حالت یہ تھی کہ صنف نازک کو ان کا حقیقی انسانی مقام و مرتبہ دیا ہی نہ جاتا تھا بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اسے انسانی معاشرہ کا حصہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اور اسے معاشرہ کا حصہ قرار دینا ناپسند کیا جاتا تھا، اس دور میں خواتین کو مردوں جیسا مقام دینا تو درکنار بلکہ انہیں معاشرتی حوالہ سے اس لائق ہی نہیں سمجھا جاتا تھا کہ ان پر کوئی معاشرتی ذمہ داری عائد کر کے انہیں معاشرہ کی بقاو استحکام میں کسی کردار کا حامل قرار دیا جائے، تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ اس زمانہ میں جو معاشرے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے تھے ان میں بھی عورت کو ایک طرح سے طفیلی فرد قرار دیتے ہوئے معاشرہ سے باہر کی مخلوق سمجھا جاتا تھا کہ صرف ان سے استفادہ کیا جاسکے اور اس کی وجودی قوتوں کو اپنی پسند کے مطابق استعمال میں لایا جاسکے بلکہ بعض معاشروں میں اسے ناقص انسان قرار دیتے ہوئے بچوں و دیوانوں جیسی حیثیت دی جاتی تھی، بلکہ ان سے بھی بدتر، کیونکہ بچے جوان ہو کر دیگر افراد بشر کی طرح معاشرہ کا حصہ بن جاتے ہیں اور دیوانوں کی صحت یابی ممکن ہوتی ہے کہ وہ بھی معاشرہ میں اپنی انسانی حیثیت کے ساتھ زندگی بسر کر لیتے ہیں لیکن خواتین کو ہمیشہ ہی انسانیت کے مقام و منزلت سے دور رکھتے ہوئے انسانی معاشرہ کا حصہ سمجھا ہی نہ جاتا تھا نتیجتاً وہ ہمیشہ مردوں کی بالادستی میں رہیں اور ہمیشہ مردوں کے تابع فرمان ہو کر زندگی بسر کریں، ممکن ہے کہ جملہ ''فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ ''میں کراہت و ناپسندیدگی کی نسبت خود انہی کی طرف دینے میں مذکورہ بالا مطالب کی طرف اشارہ مقصود ہو نہ کہ ان سے نکاح و شادی کرنے سے کراہت و ناپسندیدگی کی طرف!

تبدیلی کی صورت میں حق مہر کا قانون

○ ''وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ........''

(اور اگر تم ایک زوجہ کی جگہ دوسری زوجہ لانا چاہو..........)

یہاں لفظ ''اسْتِبْدَالَ '' ذکر ہوا ہے کہ جو باب استفعال ہے جس کا معنی بدل طلب کرنا ہے، گویا اس سے مراد ایک زوجہ کی جگہ دوسری زوجہ لانا ہے، یعنی پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری عورت سے شادی کرنا مقصود ہے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں لفظی طور پر'' تبدیل'' کرنے سے مراد یہ ہو کہ دوسری بیوی کو پہلی بیوی کے قائم مقام بنا دیا جائے، لہٰذا آیت میں دونوں الفاظ ذکر کئے گئے ہیں ''أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ '' جبکہ لفظ ''اسْتِبْدَالَ ''میں ارادہ و طلب دونوں معانی پائے جاتے ہیں کہ اس کے لانے سے ''أَرَدْتُمْ ''ذکر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی (کیونکہ باب استفعال میں طلب کا معنی موجود ہے) تو معلوم ہوتا ہے

کہ آیت میں ''اسْتِبْدَال'' سے مراد بدل طلب کرنا نہیں بلکہ تبدیل کر کے قائم مقام بنانا مراد ہے۔

لفظ ''بھتان'' سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کو حیران و ششدر کر دے، عام طور پر یہ لفظ ''جھوٹے الزام'' کی جگہ استعمال ہوتا ہے، البتہ یہ لفظ اصل میں مصدر ہے، اور آیۂ مبارکہ میں قول کی بجائے فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی بیجا طور پر عورت کا حق مہر لینا، بنا برایں یہ لفظ یعنی ''بہتانًا'' اور لفظ ''اِثْمًا'' دونوں ہی ادبی حوالہ سے جملہ ''اَتَاْخُذُوْنَهٗ'' سے حال ہیں۔

اور ''اَتَاْخُذُوْنَهٗ'' میں جو سوالیہ انداز یعنی استفہام مذکور ہے وہ انکاری صورت میں ہے۔ ادبی اصطلاح میں اسے ''استفہام انکاری'' کہا جاتا ہے، اس طرح آیت کا معنیٰ یوں ہوگا کہ اگر تم اپنی کسی بیوی کو طلاق دینا چاہو اور اس کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو تو تم نے اس بیوی کو جو کچھ حق مہر میں دے دیا ہے وہ واپس نہ لو خواہ وہ جتنا زیادہ مال کیوں نہ ہو، اور جو کچھ ان کی رضایت کے بغیر لو گے وہ تمہارے دیئے ہوئے کے مقابلے میں نہایت معمولی و ناچیز ہے۔

حیرت و تعجب کا مقام

○ ''وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ......''

(اور تم وہ کیونکر لو گے جبکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہو چکے ہو.........)

یہاں استفہام اور سوالیہ انداز میں پوچھنا حیرت میں ڈالنے کے معنی میں مذکور ہے۔

''افضاء'' سے مراد سے مباشرت و نزدیکی کرنا اور باہم و پیوستہ ہونا ہے۔ لفظی حوالہ سے اس کی اصل ''فضا'' ہے جس کا معنی وسعت ہے۔

اور چونکہ عورت کی مرضی کے بغیر حق مہر لے لینا ظلم و زیادتی ہے کیونکہ یہ مقام وصل و پیوستگی اور یکجا ہونے کا مقام ہے لہٰذا اس طرح کے سلوک کا تعجب اور حیرت انگیز ہونا درست قرار پاتا ہے اور وہ یوں کہ میاں بیوی دونوں ازدواجی تعلق قائم ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے قریب و نزدیکی اور باہم پیوستگی کے نتیجہ میں ''ایک'' ہو جاتے ہیں تو حیرت و تعجب کا مقام ہے کہ وہ ''ایک'' شخص اپنے اوپر ظلم کرے اور اپنے آپ کو اذیت و آزار کا نشانہ بنائے یا اس کے بعض اجزاء دوسرے بعض کو اذیت کا شکار کریں، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اور جہاں تک جملہ ''وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا'' (جبکہ وہ تم سے سخت قسم کا عہد و پیمان لے چکی ہیں) کا تعلق ہے تو بظاہر ''سخت قسم کے عہد و پیمان'' سے مراد وہی ازدواجی بندھن ہے جسے مرد عقد و مباشرت کے ذریعے مستحکم کرتا ہے، اور اسی عہد و میثاق کے لازمی امور میں سے ایک ''حق مہر'' ہے جو عقد نکاح کے وقت مقرر و معین ہو جاتا ہے اور عورت، کا مرد پر واجب

حق بن جاتا ہے، کہ جس کی وہ مالک قرار پاتی ہے۔

''میثاقِ غلیظ'' یعنی سخت و پختہ عہد و پیمان کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو عقد کے وقت مرد سے عورت کے لئے لیا جاتا ہے کہ وہ اسے اچھی طرح نیک سلوک کرتے ہوئے اپنے پاس رکھے گا یا پھر اچھے انداز میں اسے الگ کردے گا جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: ''فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ'' (سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۹)

''میثاقِ غلیظ'' سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد دونوں یعنی زوج اور زوجہ کا عقد نکاح کے ذریعے شرعی طور پر ایک دوسرے کے لئے حلال ہونا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں اقوال کا آیت مبارکہ کے ظاہری الفاظ کے تناظر میں نادرست ہونا کسی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

روایات پر ایک نظر!

تفسیر عیاشی کی ایک روایت

تفسیر العیاشی میں ہاشم بن عبداللہ سے مروی ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ میں نے سری بجلی سے پوچھا: آیۂ مبارکہ ''وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ'' کا مطلب کیا ہے؟ تو اُنہوں نے کسی بات کا حوالہ دیا اور پھر کہا کہ اس میں جو نہی یعنی ممانعت ذکر ہوئی ہے وہ نبطیوں کے ہاں رائج طرزِ عمل کے بارے میں ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا تھا تو جو شخص اس کی بیوہ پر کپڑا ڈالتا وہ اس کے علاوہ کسی سے شادی نہ کرسکتی تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے ہاں بھی یہی رسم تھی۔

(تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۲۹)

ناپسندیدگی سے وراثت پانے کی ممانعت

تفسیر قمی میں ابوالجارود کی روایت مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: زمانۂ جاہلیت میں عرب قبائل کے اسلام لانے کے ابتدائی ایام میں یہ رسم تھی کہ جب کسی شخص کا دوست مرجاتا تو وہ شخص اس کی بیوہ کے سر پر اپنی ردا ڈال دیتا کہ جس سے اسے یہ حق حاصل

ہوجاتا تھا کہ وہی اس عورت سے شادی کرے اور اسے حق مہر دینے کی ضرورت بھی نہ ہوتی تھی بلکہ اپنے دوست ہی کے دیئے ہوئے حق مہر سے اس کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کرلیتا تھا، اس کا ایسا کرنا ازدواجی رشتہ قائم کرنے کو وراثت کی صورت میں ہوتا تھا جس طرح پر وہ اس کے مال کا وارث بنتا تھا، یعنی وہ جس طرح اس کے ترکہ کا وارث بنتا تھا اسی طرح اس کی بیوہ سے شادی کرنا بھی اپنا وراثتی حق سمجھتا تھا، اسی بناء پر جب ابوقیس بن اسلت کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے محصن بن ابی قیس نے اپنے باپ کی زوجہ کبیشہ بنت معمر بن معبد کے سر پر اپنی ردا ڈال دی اور اس طرح اس سے شادی کرنے کا حقدار بن بیٹھا، یعنی جو حق مہر اس کے باپ نے اپنی بیوی کو دیا تھا اسی کی بناء پر اس نے اپنی وراثت قرار دے کر ازدواجی رشتہ قائم کرنے کا مجاز بن گیا، پھر اس نے اس عورت کو مباشرت ونزدیکی کئے بغیر اور کسی طرح کا نفقہ واخراجات دیئے بغیر چھوڑ دیا، وہ عورت حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنا مقدمہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! ابوقیس بن اسلت کا انتقال ہوگیا ہے اور اس کا بیٹا محصن میرے ساتھ شادی کرنے کا حقدار بن بیٹھا ہے اور وہ نہ تو میرے ساتھ مباشرت کرتا ہے، نہ میرا نان ونفقہ دیتا ہے اور نہ ہی مجھے میرے خاندان والوں کے پاس جانے دیتا ہے، اس کی شکایت سن کر حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے بارے میں کوئی حکم آیا تو میں تمہیں مطلع کردوں گا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا'' (اور تم ان عورتوں سے شادی نہ کرو جن سے تمہارے آباء نے شادی کی ہو سوائے اس کے کہ جو پہلے ہو چکا کہ وہ نہایت ہی بُرا عمل اور گناہ تھا اور بہت ہی برا طریقہ تھا) یہ سن کر وہ اپنے گھر والوں کے پاس چلی گئی، کبیشہ کے علاوہ مدینہ میں متعدد دیگر خواتین موجود تھیں جو وراثتی شادیوں کا شکار ہو چکی تھیں البتہ وہ ایسی نہ تھیں کہ جن کے بیٹے ان کے وراثتی شوہر بنے ہوں، صرف کبیشہ ہی تھی جو اپنے شوہر کے بیٹے کی وراثتی زوجہ بنی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا'' (اے ایمان والو! تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم جبراً عورتوں کے وارث بنو) (تفسیر قمی، جلد اول صفحہ ۱۳۴)

اس روایت کا آخری حصہ قرین صحت نہیں دکھائی دیتا، جہاں تک اسی روایت میں ذکر کئے گئے واقعہ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں اہل سنت کی متعدد روایات میں بھی ان آیات مبارکہ کے شان نزول میں یہی واقعہ ذکر ہوا ہے، البتہ جو اہم مطلب قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ان روایات یا ان میں سے اکثر روایات میں آیۂ مبارکہ ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا...... الخ'' کے شانِ نزول میں اسی واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے جبکہ آپ ہمارے سابقہ بیان کی روشنی میں آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیت کے سیاق سے اس کی تائید نہیں ہوتی، لیکن اس کے باوجود اس واقعہ کے رونما ہونے اور آیات کے بعض حوالوں سے اس واقعہ سے مربوط ہونے اور اس دور میں عرب قبائل کے ہاں اس طرح کی رسم کے عام رائج ہونے میں کوئی شبہ نہیں پایا جاتا لہٰذا اس کی تاویل ہمارے سابقہ بیان کی روشنی میں اسی معنی میں ہوسکتی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔

کھلی برائی سے کیا مراد ہے؟

تفسیر مجمع البیان میں آیۂ مبارکہ "اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ بہتر یہ ہے کہ آیت میں اس سے مراد ہر گناہ و معصیت لی جائے، اور یہی معنی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں بھی مذکور ہے۔ (تفسیر مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۲۴)

تفسیر "البرھان" میں شیبانی کا قول مذکور ہے کہ "فاحشة" سے مراد زنا ہے، اور حکم یہ ہے کہ اگر مرد کو معلوم ہو جائے کہ اس کی بیوی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے تو اس کا حق ہے کہ اس سے فدیہ وصول کرے، یہ مطلب حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منسوب ایک روایت میں بھی ذکر ہوا ہے (جو کہ سند اور متن کے لحاظ سے امام کا بیان معلوم نہیں ہوتا) (تفسیر البرھان، جلد اول صفحہ ۳۵۵)

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استدلال

تفسیر "درمنثور" میں ابن جریر کے حوالہ سے مذکور ہے کہ جابر نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اتقوا الله فی النسآء فانکم اخذتموھن بامانة الله، واستحللتم فروجھن بکلمة الله، وان لکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احداً تکرھونہ فان فعلن ذلك فاضربوھن ضرباً غیر مبرح ولھن علیکم رزقھن و کسوتھن بالمعروف" (خواتین کے بارے میں تقوائے الٰہی اختیار کرو، کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے، اور تم نے ان کی شرمگاہوں کو کلام الٰہی کے ذریعے اپنے لئے حلال کیا ہے، عورتوں پر بھی لازم و ضروری ہے کہ کسی غیر آدمی کو کہ جسے تم ناپسند کرتے ہو تمہارے گھروں میں نہ آنے دیں، اگر وہ ایسا کریں تو انہیں مارو لیکن ایسا نہ مارو کہ وہ گھر بار ہی سے بیزار ہو جائیں، مردوں پر لازم و واجب ہے کہ عورتوں کے نان و نفقہ اور لباس و پوشاک کا مناسب انتظام کریں)
(تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۳۲)

تفسیر "درمنثور" ہی میں ابن جریر کے حوالہ سے مذکور ہے کہ ابن عمر نے بیان کیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یاایھا الناس ان النسآء عند کم عوان اخذتموھن بامانة الله واستحللتم فروجھن بکملة الله ولکم علیھن حق ومن حقکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احداً ولا یعصینکم فی معروف واذا فعلن ذلك فلھن رزقھن و کسوتھن بالمعروف" اے لوگو! عورتیں تمہارے پاس "عوان" (بارش زدہ زمین پر کہ جس پر بار

بار جنگ ہوئی ہو) ہیں، تم نے انہیں اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے، اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے کلام کے ذریعے اپنے لئے حلال کیا ہے، اور تمہارے ان پر حقوق ہیں، اور ان پر تمہارے حقوق میں سے یہ ہے کہ وہ کسی کو تمہارے بستر پر نہ لائیں، اور نہ ہی کسی اچھے کام میں تمہاری نافرمانی کریں، اور جب وہ ایسا کریں تو صرف موزوں روٹی کپڑا ہی لینے کا حق رکھیں گی (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم ص ۱۳۲)

ان روایات کے فہم معانی کے لئے ہمارے سابقہ بیان میں مذکور مطالب کافی ہیں۔

میثاق سے کیا مراد ہے؟

کتاب کافی اور تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت مذکور ہے آپؑ نے آیۂ مبارکہ ''وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: ''المیثاق الکلمة التی عقد بها النکاح'' میثاق سے مراد وہ الفاظ ہیں جن سے عقد نکاح انجام پاتا ہے (تفسیر العیاشی، ج ا ص ۲۲۹)

تفسیر مجمع البیان میں ''میثاق'' کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو نکاح کے وقت شوہر سے لیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زوجہ سے اچھا سلوک کرتے ہوئے اسے اپنے پاس رکھے گا یا پھر اچھے انداز میں اسے چھوڑ دے گا (یعنی اس کے ساتھ زیادتی نہ کرے گا) مفسر نے یہ لکھنے کے بعد اسے امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا: **وهو المروی عن ابی جعفر (علیه السلام)** اور یہ بات حضرت امام ابوجعفر (محمد باقر) علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے (تفسیر ''مجمع البیان'')

مذکورہ بالا مطالب معروف قدیم مفسرین مثلاً ابن عباس، قتادہ اور ابوملیکہ سے بھی منقول ہیں اور آیۂ مبارکہ سے بھی اس کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ یہ وہ عہد و پیمان ہے جو عام طور پر مردوں سے عورتوں کے بارے میں لیا جاتا ہے لہٰذا اسے ''میثاقِ غلیظ'' یعنی پختہ وعدہ کا نام دینا درست ہے، اگرچہ اس سے زیادہ روشن و واضح بات یہ ہے کہ اس سے مراد وہی عقد ہو جو نکاح کے وقت جاری کیا جاتا ہے۔

حق مہر کی مقدار؟

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ زبیر بن بکار نے کتاب ''الموفقیات'' میں عبداللہ بن معصب کے حوالہ سے بیان کیا ہے

انہوں نے کہا: قال عمر : لاتزیدوا فی مھور النسآء علی اربعین اوقیة. فمن زاد القیت الزیادة فی بیت المال" عمر نے حکم دیا کہ عورتوں کا حق مہر چالیس اوقیہ سے زیادہ نہ کرو، جو شخص اس سے زیادہ کرے گا تو میں اضافہ کو بیت المال میں ڈال دوں گا، فقالت امرأة: ماذاك لك. وہاں موجود ایک عورت نے کہا: آپ کو ایسا حکم دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، عمر نے پوچھا: وَلِمَ ؟ وہ کیوں؟ قالت: لان الله تعالیٰ یقول: "واتیتم احدیٰھن قنطاراً" عورت نے جواب دیا کہ وہ اس لئے کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ اگر تم ان میں سے کسی کو سونے سے بھری ہوئی بوری ہی دو، تب بھی واپس نہیں لے سکتے، تو اس میں مقدار کی حد مقرر نہیں کی گئی، فقال عمر : امرأة اصابت ورجل اخطاء، عمر نے کہا کہ عورت نے صحیح کہا ہے جبکہ مرد سے غلطی ہوئی ہے (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۳۳)

اسی روایت کو ابن کثیر نے عبدالرزاق اور ابن منذر نے عبدالرحمٰن سلمی کے حوالہ سے بیان کیا ہے، اسی طرح سعید بن منصور اور ابویعلیٰ نے اچھی سند کے ساتھ مسروقؔ کے حوالہ سے اسے ذکر کیا ہے، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ وہاں چالیس اوقیہ کی بجائے چار سو درہم ذکر ہوا ہے، اور ان کے علاوہ سعید بن منصور، عبد بن حمید نے بکر بن عبداللہ مزنی کے حوالہ سے اسے بیان کیا ہے، بہرحال یہ تمام روایات ایک دوسرے سے قریب المعنیٰ ہیں۔

شان نزول کے بارے میں ایک روایت

آیۂ مبارکہ "وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِنَ النِّسَآءِ" کی تفسیر میں ابن جریر نے عکرمہ کا قول ذکر کیا کہ انہوں نے کہا یہ آیت ابوقیس بن اسلت کے بارے میں نازل ہوئی کہ اس نے اپنے باپ کے انتقال کے بعد اس کی زوجہ ام عبید بنت ضمرہ سے وراثتی شادی کر لی (اسے میراث کا حصہ قرار دے کر اس کا وارث بن گیا، جیسا کہ عربوں میں رسم تھی کہ کسی کے مرنے کے بعد اس کی زوجہ کے سر پر اپنی چادر ڈال کر اس پر اپنا وراثتی حق قرار دے کر اس کے مالک شوہر بن جاتے تھے) اسی طرح یہ آیت اسود بن خلف کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ اپنے باپ خلفؔ کے مرنے کے بعد اس کی زوجہ بنت ابی طلحہ بن عبدالعزیٰ بن عثمان بن عبدالدار کا وارث (مالک شوہر) بن گیا، اور یہ آیت صفوان بن امیہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ اپنے باپ امیہ بن خلف کی بیوہ فاختہ بنت اسود بن مطلب بن اسد کا وراثتی شوہر بن گیا، اسی طرح یہ آیت منظور بن رباب کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ اپنے باپ رباب بن سیار کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ ملیکہ بنت خارجہ کا وارث (مالک شوہر) بن گیا۔ (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ ص ۱۳۴)

تفسیر "درمنثور" ہی میں مذکور ہے کہ ابن سعد نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: زمانۂ

جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی شخص مرجاتا اور اس کی زوجہ زندہ ہوتی تو اس کا بیٹا اس کا دوسروں سے زیادہ حقدار ہوتا کہ اگر چاہے تو خود اس سے شادی کرے بشرطیکہ وہ اس کی حقیقی ماں نہ ہو، اور اگر خود نہ چاہے کہ اس سے شادی کرے تو جسے چاہے اس سے اس کی شادی کردے، چنانچہ جب ابوقیس بن اسلت کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا محصن اس کا قائم مقام بنا اور اس نے اس کی بیوی سے وراثتی حق کی بنیاد پر شادی کرلی مگر نہ تو اس کے ساتھ مباشرت و ہمبستری کی اور نہ ہی اسے کوئی مال دیا، وہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں آئی اور اپنا حال بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے اسے حکم دیا کہ تو اپنے خاندان والوں کے پاس واپس چلی جا، کہ شاید خداوند عالم تیرے حوالہ سے کوئی فرمان جاری کرے، تب یہ آیت نازل ہوئی: ''وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ'' (اور تم ان عورتوں سے شادی نہ کرو جن سے تمہارے آباء نے شادی کی ہو......) اور یہ آیت بھی نازل ہوئی: ''لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا'' (تمہارے لئے جائز نہیں کہ عورتوں کی ناپسندیدگی کے باوجود ان کے وارث بن جاؤ........) (تفسیر درمنثور جلد دوم صفحہ ۱۳۴)

اس سے پہلے کچھ روایات ذکر ہوچکی ہیں جو شیعہ اسناد سے تھیں ان میں بھی مذکورہ بالا مطالب کے توضیحی ثبوت موجود ہیں۔

ابن عباس کی ایک روایت

ابن جریر اور ابن منذر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: کان اهل الجاهلية يحرمون ماحرم الله الا امرأة الأب والجمع بين الاختين فانزل الله: ''وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ''، ''وَاَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ'' زمانہ جاہلیت میں لوگ خدا کے حرام کئے ہوئے کو حرام قرار دیتے تھے سوائے باپ کی بیوی اور دو بہنوں کو یکجا عقد میں رکھنے کے! تو اللہ تعالیٰ نے پہلے مسئلہ کی بابت یہ آیت نازل فرمائی: ''اور جن عورتوں سے تمہارے آباء نے نکاح کیا ہو تم ان سے نکاح نہ کرو'' اور دوسرے مسئلہ میں یہ آیت نازل فرمائی: ''اور دو بہنوں کو یکجا عقد میں رکھنا حرام ہے'' (سورۂ نسا، آیت ۲۳) (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲۔ص ۱۳۴)

اس مطلب کی بابت دیگر روایات بھی موجود ہیں۔

آیات ۲۳ تا ۲۸

○ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۙ﴿۲۳﴾

○ وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

○ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

○ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾

○ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

○ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

ترجمہ

○ ''تم پر حرام قرار دی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھپھیاں، تمہاری خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو، تمہاری رضاعی بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہاری وہ پروردہ بیٹیاں جو تمہاری گود میں پلی ہوں کہ وہ تمہاری ان بیویوں کی بیٹیاں ہوں جن سے تم نے مباشرت کی ہو، اگر تم نے ان سے مباشرت نہ کی ہو تو ان سے شادی کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں تم پر حرام ہیں جو تمہاری صلبوں سے ہوں، اور یہ بھی ہے کہ تم دو بہنوں کو یکجا عقد میں رکھو لیکن جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا، یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والا مہربان ہے۔''

(۲۳)

○ ''اور وہ عورتیں (حرام ہیں) جو شوہر والی ہیں، سوائے ان کے کہ جو تمہاری ملکیت میں آجائیں، یہ اللہ نے تم پر فرض کر دیئے ہیں، اور ان کے علاوہ دیگر عورتیں تم پر حلال کی گئی ہیں کہ تم اپنے اموال کے ذریعے انہیں شریک حیات بناؤ پاکدامنی کے ساتھ، نہ کہ غلط کاری کے ساتھ! تو جس قدر ان سے استمتاع کرو تو انہیں واجب فریضہ کے طور پر ان کے حق مہر ادا کرو، اور مقررہ مہر کے علاوہ جس پر تم ایک دوسرے سے راضی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، یقیناً اللہ بہت جاننے والا، نہایت حکمت والا ہے۔''

(۲۴)

○ ''اور تم میں سے جو شخص مالی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مومنہ عورت سے شادی کرے تو وہ ان مومنہ لڑکیوں سے شادی کرلے جو تمہاری ملکیت ہیں (کنیزیں) اللہ تمہارے ایمان کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے، تم ایک دوسرے ہی سے ہو، تو ان سے ان کے اہل (مالکوں) کی اجازت سے شادی کرو اور انہیں ان کے حق مہر نیکی کے ساتھ ادا کرو اس طرح کہ ان کے ساتھ عقد نکاح کرو کہ نہ تو وہ بدکار ہوں اور نہ ہی غیر شرعی دوستیاں رچانے والی ہوں، جب وہ منکوحہ بیویاں ہو جائیں اور اس کے بعد بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر آزاد عورتوں کی نصف حد جاری کی جائے گی، یہ حکم (کنیزوں سے شادی کرنا) تم میں سے اس شخص کے لئے ہے جسے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، اور تم صبر کرو (ضبط نفس سے کام لو) تو تمہارے لئے بہتر ہے، اور اللہ بہت ہی معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

(۲۵)

○ ''اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے واضح کردے اور تمہیں ان لوگوں کے طرز زندگی سے آگاہی دلائے جو تم سے پہلے گزرے، اور تم پر اپنی عنایات نازل کرے (تمہارے گناہوں کو معاف کرکے تم پر احسان کرے) اور اللہ ہر شے سے آگاہ اور نہایت دانا ہے۔''

(۲۶)

○ ''اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی عنایت نازل کرے، اور جو لوگ نفسانی خواہشات کی پیروی میں سرمست ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم سخت ترین کجی کے راستہ پر گامزن رہو۔''

(۲۷)

○ ''اللہ چاہتا ہے کہ تمارے ساتھ نرمی و آسانی کرے، اور انسان تو کمزور ہی پیدا کیا گیا ہے۔''

(۲۸)

تفسیر و بیان

یہ آیات محکمات ہیں کہ ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کن عورتوں سے نکاح حرام ہے اور کن سے جائز ہے؟ اگرچہ ان آیات سے پہلی آیت (۲۲) میں بھی ان عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت کا حکم مذکور تھا جن سے آباء نے نکاح کیا ہو اور وہ بھی مضمون و مقصود کے حوالہ سے زیر نظر آیات مبارکہ میں شمار ہوتی ہے لیکن اس کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ما قبل آیات کے تتمہ کے طور پر ہے لہٰذا ہم نے اسے سابقہ آیات سے مربوط قرار دیا اور معنی کے لحاظ سے بھی وہ انہی آیات سے ملحق تھی۔

بہر حال یہ آیات مبارکہ ہر اس نکاح کو بیان کرتی ہیں جسے شریعت مقدسہ اسلامیہ میں حرام قرار دیا گیا ہے کہ جس کی حرمت میں کسی قسم کی تخصیص یا تقیید نہیں، یعنی ایسا نہیں کہ فلاں حرام نکاح، فلاں صورت میں حلال ہو سکتا ہو یا اس کی حرمت میں کوئی قید و شرط وغیرہ ہو، بلکہ ان کی حرمت واضح و مسلم ہے کہ جس میں کوئی استثنائی صورت نہیں پائی جاتی، چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ نکاح کی حرام و ممنوع صورتوں کا ذکر کرنے کے بعد یوں ارشاد الٰہی ہوا: ''وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ ......'' (اور ان کے علاوہ سب تمہارے لئے حلال قرار دیا گیا ہے) یہی وجہ ہے کہ کسی اہل علم نے اس آیت سے بیٹے اور بیٹی کی بیٹی اور باپ یا ماں کی ماں سے نکاح کرنے کے عدم جواز پر استدلال کرنے میں اختلاف رائے نہیں کیا، اسی طرح آیۂ مبارکہ: ''وَلَا تَنْکِحُوْا مَا نَکَحَ اٰبَآؤُکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ......'' سے دادا و نانا کی بیوگان سے شادی کے حرام ہونے پر استدلال کرنے میں بھی کسی نے اختلاف رائے نہیں کیا، اور اسی عام و مطلق حکم سے یہ واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ تشریعی حوالہ سے بیٹوں اور بیٹیوں کی تشخیص کا قرآنی معیار کیا ہے؟ اس سلسلہ میں تفصیلی تذکرہ عنقریب آئے گا انشاءاللہ تعالیٰ۔

نسبی حوالہ سے نکاح کی حرمت

○ ''حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّهٰتُکُمْ وَبَنٰتُکُمْ وَاَخَوٰتُکُمْ وَعَمّٰتُکُمْ وَخٰلٰتُکُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ''

(تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہارے بھائی کی بیٹیاں اور تمہاری بہن کی بیٹیاں)

اس آیت میں ان عورتوں سے نکاح کی حرمت کا حکم ذکر کیا گیا ہے جو نسب کے حوالہ سے حرام کی گئی ہیں، وہ سات قسم کی ہیں (۱) مائیں (۲) بیٹیاں (۳) بہنیں (۴) پھپھیاں (۵) خالائیں (۶) بھائی کی بیٹیاں، بھتیجیاں (۷) بہن کی بیٹیاں، بھانجیاں۔ ان کی تفصیلات یہ ہیں:۔

(۱) مائیں، ''ماں'' سے وہ خاتون مراد ہے جس سے انسان کا ولادت کے حوالہ سے نسبی تعلق ہو، خواہ وہ ولادت بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ ہو، بلاواسطہ ولادت سے مراد وہ حقیقی ماں جس نے جنا ہو، اور بالواسطہ ولادت سے مراد باپ یا ماں کی ماں، (دادی، نانی) دادی و نانی باپ اور ماں سے بالواسطہ ''ماں'' ہوتی ہے، یہی حکم پردادی پرنانی اور ان سے اوپر تمام طبقوں کا ہے۔

(۲) بیٹیاں، ''بیٹی'' اسے کہتے ہیں جس کا نسبی تعلق انسان سے اس حوالہ سے ہو کہ وہ اس سے پیدا ہوئی ہے، جیسا کہ حقیقی بیٹیاں انسان کی صلب سے بلاواسطہ پیدا ہوتی ہیں۔

(۳) بہنیں، ''بہن'' اس عورت کو کہتے ہیں جس کا نسلی تعلق انسان سے اس حوالہ سے ہو کہ دونوں کی ولادت ایک ہی باپ یا ایک ہی ماں یا ایک ہی ماں باپ سے بلاواسطہ ہوئی ہو۔

(۴) پھپھیاں، باپ کی بہن کو ''پھپھی'' کہتے ہیں، اسی طرح دادا یا نانا کی بہن بھی ''پھپھی'' کہلاتی ہے، خواہ ان کا بھائی بہن ہونا ایک ہی ماں باپ سے ہو پیدا ہونے کے حوالہ سے ہو یا صرف ایک باپ یا صرف ایک ماں کے حوالہ سے ہو۔

(۵) خالائیں، ماں کی بہن کو ''خالہ'' کہتے ہیں، اسی طرح دادی و نانی کی بہن بھی ''خالہ'' کہلاتی ہے خواہ وہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو یا صرف ایک باپ یا صرف ایک ماں سے ہوں۔

(۶) بھائی کی بیٹیاں ''بھتیجیاں'' اس میں بھی فرق نہیں کہ وہ بھائی ماں باپ دونوں یا صرف ماں یا صرف باپ کے حوالہ سے بھائی ہوں، ان کی بیٹیاں ''بھتیجیاں'' کہلاتی ہیں۔

(۷) بہن کی بیٹیاں ''بھانجیاں'' بہن کی بیٹیوں یعنی بھانجیوں میں بھی فرق نہیں کہ وہ اس بہن کی بیٹیاں ہوں جو ماں باپ دونوں کے حوالہ سے بہن ہو یا صرف باپ یا صرف ماں کی نسبت سے بہن ہو۔

یہ ہیں وہ سات صنفیں جن سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے، اور آیت میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یعنی حرمت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ......... (تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں.....) تو اس حرمت سے مراد ان سے نکاح کرنے کی حرمت ہے کیونکہ اس طرح کے اطلاقی بیان سے حکم و موضوع کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی کچھ سمجھا جاتا ہے، یعنی یہاں حرام قرار دیئے جانے سے ان سے شادی کرنے کی حرمت مقصود ہے، اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ مائدہ، آیت: ۳

○ ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ..........''

(تم پر حرام کیا گیا ہے مردار اور خون........)

اس میں حکم وموضوع کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے کھانے کی حرمت مقصود ہے۔

سورۂ مائدہ، آیت: ۲۶

O ''فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ.........''

(وہ ان پر حرام کی گئی ہے)

اس میں حکم وموضوع کی مناسبت کو ملحوظ قرار دیتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سکونت ورہائش مقصود ہے

اس طرح کے استعمال کو ''مجاز عقلی'' کہا جاتا ہے جو کہ محاوروں میں عام ہے۔

لیکن یہ معنیٰ، بعد والے جملہ ''اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' سے موزونیت نہیں رکھتا کیونکہ یہ استثناء، مباشرت وہمبستری کے حکم سے ہے ازدواجی بندھن سے نہیں، اس کی وضاحت عنقریب پیش ہوگی، اسی طرح جملہ ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ'' سے بھی موزونیت نہیں رکھتا، اس کی وضاحت بھی عنقریب پیش ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں آیۂ مبارکہ میں حرام کئے جانے کا جو موضوع (یعنی کیا حرام کیا گیا ہے) لفظوں میں ذکر نہیں ہوا وہ ازدواجی بندھن نہیں بلکہ وہ ہے جو مباشرت وہمبستری کا معنی دیتا ہو، اور لفظوں میں صراحتہً ذکر نہ کرنے میں ادبی اخلاق اور عفت بیان مانع تھی جیسا کہ اس طرح کے موارد میں قرآنی اسلوب بیان بھی یہی ہے۔

خطاب کی باریکیوں پر ایک نظر!

آیۂ مبارکہ میں صرف مردوں کو مخاطب کیا گیا ہے (عَلَيْكُمْ) ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ......'' (تم پر حرام قرار دی گئی ہیں تمہاری مائیں......) اور عورتوں کو مخاطب کر کے یوں نہیں کہا گیا: ''حرم علیهن ابنائهن......'' (ان پر ان کے بیٹے حرام قرار دیئے گئے ہیں......) یا یوں نہیں کہا گیا: ''لا نکاح بین المرأة وولدها........'' (عورت اور اس کے بیٹوں کے درمیان نکاح کی کوئی گنجائش نہیں......) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ طبعی طور پر طلب وخواستگاری صرف مردوں کی طرف سے ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آیۂ مبارکہ میں جمع کی ضمیر ذکر کی گئی ہے! ''عَلَيْكُمْ''، ''اُمَّهٰتُكُمْ''، ''بَنٰتُكُمْ'' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے حکم سے مربوط تمام افراد کا مقصود ہونا بیان ہو جائے، یعنی یہ واضح ہو جائے کہ تم میں سے ہر مرد پر اس کی ماں اور بیٹی حرام قرار دی گئی ہے کیونکہ یہ بات معقول نہیں کہ سب پر سب کا حرام ہونا اور ہر ماں کا اور ہر بیٹی کا ہر مرد پر حرام ہونا مقصود

ہو بلکہ وہ بے معنی بات ہے ورنہ اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ کوئی شخص کسی سے نکاح نہیں کرسکتا اور اصل نکاح کرنا ہی حرام ہو جائے گا، بنا بر ایں آیۂ مبارکہ سے یہ بیان مقصود و مطلوب ہے کہ ہر مرد پر حرام ہے کہ اپنی ماں، بیٹی، بہن سے نکاح کرے۔

سببی حوالہ سے نکاح کی حرمت

○ ''وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ''

(اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور تمہاری رضائی بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں)

یہاں سے سببی حوالہ سے حرام ہونے والی عورتوں کے بارے میں بیان کا آغاز ہوا ہے، یہ بھی سات ہیں جن میں سے چھ اسی آیۂ مبارکہ میں اور ایک آیۂ ''وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ'' سے مستفاد ہے۔

اس آیۂ مبارکہ کے سیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ جو عورت کسی کو دودھ پلائے ان دونوں کے درمیان ماں اور اولاد کا رشتہ قرار دیا گیا ہے، اسی طرح دودھ پینے والے بچے اور بچی کے درمیان رضاعت یعنی اکٹھا دودھ پینے کی وجہ سے بھائی اور بہن کا رشتہ قرار دیا گیا ہے، چونکہ یہاں ان رشتوں کو یقینی و مسلم قرار دیتے ہوئے اس انداز میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں کسی طرح کے شک وشبہ یا بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، لہٰذا رضاعت تشریعی بنیاد پر نسبی روابط کو وجود میں لاتی ہے اور یہ بات شریعت اسلامیہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کی بابت مزید اشاراتی تذکرہ عنقریب ہوگا۔

فریقین یعنی شیعہ وسنی محدثین نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو روایت اپنے معتبر اسناد سے بطور صحیح ذکر کی ہے اس میں وارد ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان اللہ حرم من الرضاعۃ ما حرم من النسب'' (اللہ تعالیٰ نے رضاعت کی وجہ سے وہی کچھ حرام قرار دیا جو نسبی رشتہ کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے) تو اس فرمان کے مطابق رضاعت کی وجہ سے پیدا ہونے والی حُرمت کا دائرہ ان تمام اصناف تک وسعت رکھتا ہے جو نسب کی وجہ سے حرام کی گئی ہیں، وہ اصناف یہ ہیں: ماں، بیٹی، بہن، پھپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، یہ ساتوں اصناف ایسی ہیں کہ ان میں نکاح کی حرمت جس طرح نسب کی وجہ سے ہوئی ہے اسی طرح رضاعت کی وجہ سے بھی ہے (یعنی جس طرح حقیقی ماں سے نکاح نہیں ہوسکتا اسی طرح رضاعی ماں سے بھی نکاح نہیں ہوسکتا، جس طرح حقیقی بیٹی و بہن سے نکاح نہیں ہوسکتا اسی طرح رضاعی بیٹی و بہن سے بھی نکاح نہیں ہوسکتا مثلاً زید نے صفیہ کا دودھ پیا تو صفیہ اس کی ماں اور زید اس کا بیٹا ہو جائے گا، صفیہ کی بہن زید کی خالہ، صفیہ کے شوہر کی بہن زید کی پھپھی، صفیہ کے بیٹے یا بیٹی کی اولاد زید کے بہن بھائی ہو جائیں گے، م)

اب سوال یہ ہے کہ کتنی مقدار میں دودھ پینا محرم ہونے کا سبب بنتا ہے اور اس کی کیفیت و مدت کتنی ہے اور اس سے

دیگر کونسے احکام مترتب ہوتے ہیں؟ اس کا جواب فقہی کتب میں واضح طور پر مذکور ہے اور اس سلسلہ میں مزید بحث کرنا ہماری اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

اور آیۂ مبارکہ میں جملہ "وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ" سے مراد وہ بہنیں ہیں جو کسی شخص کی حقیقی ماں کا دودھ پئیں کہ جس کا دودھ اس کے حقیقی باپ سے ہو، یہی حکم ان تمام افراد کے لئے ہے جو رضاعت کے ذریعے ایک دوسرے کے محرم بنتے ہیں۔

بیوی کی ماں (ساس)

○ "وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ"
(اور تمہاری بیویوں کی مائیں)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیوی کی ماں (ساس) سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا خواہ اس بیوی سے مباشرت وہمبستری کی ہو یا نہ کی ہو، دونوں صورتوں میں حکم ایک ہی ہے کیونکہ جب کسی عورت کو کسی مرد کی "بیوی" کہا جاتا ہے تو اس سے مراد ہر بیوی ہے خواہ اس کے ساتھ مباشرت کر چکے ہوں یا نہ کی ہو، اس سے ساس سے نکاح کی حرمت کے حکم میں فرق نہیں آتا، اس کا ثبوت بعد والی آیت کے ان الفاظ میں موجود ہے جو بیٹیوں کے بارے میں مذکور ہے: "مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ" (تمہاری وہ پروردہ بیٹیاں جو تمہاری ان بیویوں سے ہیں جن سے تم مباشرت کر چکے ہو، لیکن اگر تم نے ان سے ہمبستری نہ کی ہو تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں) ان الفاظ میں حکم کو مباشرت کرنے سے مقید کیا گیا ہے کہ پروردہ لڑکیاں اس صورت میں حرام ہوں گی جب ان کی ماؤں سے مباشرت کی ہو، لیکن جہاں اس طرح کی قید وشرط مذکور نہ ہو جیسا کہ زیر نظر آیت میں ہے تو وہاں اطلاق ہی ملحوظ ہوگا۔

پروردہ بیٹیوں کے بارے میں!

○ "وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ .... فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ"
(اور تمہاری وہ پروردہ بیٹیاں جو تمہاری گود میں پلی ہوں .... تو تم پر کوئی گناہ نہیں)

"ربائب" جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد "ربیبہ" (پروردہ) ہے، اس سے مراد وہ لڑکی جو کسی شخص کی زوجہ کی پہلے

شوہر سے بیٹی ہو، اور اسے "ربیبہ" اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو شخص کسی عورت سے شادی کرتا ہے اگر اس عورت کی اس سے پہلے شوہر سے کوئی اولاد ہو جو اس کے ساتھ آ جائے تو اس کی تربیت اور اس کے متعلقہ امور کی ذمہ داری اسی شخص پر عائد ہو جاتی ہے جس نے اس سے شادی کی، تو ایسا ہونا عام طور پر معاشرے میں رائج ہے خواہ ہمیشہ ایسا نہ بھی ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ لڑکیاں ہمیشہ ماں کے نئے شوہر کے ساتھ رہتی ہوں بلکہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے لہٰذا آیہ مبارکہ میں جو الفاظ ذکر ہوئے ہیں یعنی "الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ" (وہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہوں) تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ ان کی گود میں ہوتی ہوں۔ یعنی ان کے زیر سایہ ہوں۔ بلکہ اس سے عام طور پر ایسا ہونے کی طرف اشارہ مقصود ہے، بنابرایں پروردہ بیٹیاں اس شخص پر حرام قرار دی گئی ہیں جن کی ماں سے ان کے حقیقی باپ کے علاوہ کسی نے شادی کی ہو، خواہ وہ لڑکیاں اپنی ماں کے شوہر سے تربیت پائیں یا نہ پائیں، لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہاں "فِیْ حُجُوْرِکُمْ" کے الفاظ قید توضیحی کے طور پر ہیں قید احترازی کے طور پر نہیں، قید توضیحی اور قید احترازی سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

جملہ "الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ" کی بابت یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس حکمت کی طرف اشارہ مقصود ہے جو نسب اور سبب کی وجہ سے حرمت کے حکم میں ملحوظ ہے کہ اس سلسلہ میں مزید بحث عنقریب ہوگی، اس حکم میں جو حکمت و وجہ ملحوظ ہے وہ اس اختلاط اور باہمی آمیزش و یکجا ہونے سے عبارت ہے جو مرد اور اس طرح کی خواتین کے درمیان وجود میں آتا ہے اور عام طور پر اس طرح کی آمیزش و ساتھ ہونا گھروں میں ہوتا ہے یعنی وہ ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر حرمت کا حکم ابدی نہ ہوتا تو صرف زنا کے حرام کئے جانے سے برائی کے ارتکاب سے بچنا ممکن نہ تھا، یعنی عین ممکن تھا کہ وہ شخص ان لڑکیوں سے برا عمل انجام دینے کی جرأت کر لیتا لہٰذا ان لڑکیوں کو اس کی بیٹیاں قرار دے کر اس طرح کی صورتحال کا سدباب ہو گیا اور یہی بات انہیں حرام قرار دیئے جانے کے حکم کی اصل حکمت ہے، اس سلسلہ میں مزید تفصیلات عنقریب ذکر ہوں گی۔

بنابرایں یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ جملہ "الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ" اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عام طور پر "ربائب" (پروردہ لڑکیاں) تمہاری ہی آغوش میں اور تمہارے ساتھ ہوتی ہیں لہٰذا ان میں بھی وہی معیار ملحوظ ہوگا جو دیگر خواتین کے ساتھ نکاح کی حرمت اور اس کی اصل وجہ و حکمت میں ملحوظ تھا، یعنی نسبی و سببی تعلق کی وجہ سے جو عورتیں حرام قرار دی گئی تھیں اسی وجہ سے ربائب اور پروردہ لڑکیاں بھی حرام قرار دی گئی ہیں، حرمت کے حکم کا فلسفہ ایک ہی ہے۔

بہر حال یہ امر ثابت ہے کہ جملہ "الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ" قید احترازی نہیں کہ جس پر حرمت کا حکم موقوف ہو کہ اگر وہ پرورش کرنے والے کی آغوش میں نہ ہو تو اس کے لئے حلال ہے جیسا کہ وہ لڑکی جو بڑی ہو چکی ہو اور کسی شخص نے اس کی ماں سے شادی کی ہو، چنانچہ اس کا ثبوت آیت کے ان الفاظ کے واضح مفہوم سے ملتا ہے جن میں ارشاد ہوا: "فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ" (اگر تم نے ان سے مباشرت و ہمبستری نہ کی ہو تو تم پر کوئی حرج نہیں) کہ ان الفاظ میں مباشرت کے واقع نہ ہونے کا حوالہ مذکور ہے کیونکہ مباشرت و ہمبستری کا واقع ہونا حرمت کے حکم میں دخیل ہے، اگر صرف آغوش میں قرار

پانا مباشرت جیسا ہوتا تو ضروری تھا کہ اسے بھی ذکر کیا جاتا، اور یہ ایک ظاہر و واضح امر ہے۔

اور ''فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ'' میں جملہ ''فی ان تنکحوهن'' محذوف ہے، اسے اختصار کی بناء پر ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ آیت کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے۔

''بہو'' سے شادی کرنے کی ممانعت

○ ''وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ''

(اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلبوں سے ہوں)

''حَلَآئِلُ'' جمع کا صیغہ ہے، اس کا مفرد حلیلہ ہے، تفسیر ''مجمع البیان'' میں مذکور ہے کہ حلائل جو کہ حلیلہ کی جمع کا صیغہ ہے، اس (حلیلہ) کا معنی محللہ ہے اور وہ ''حلال'' سے مشتق ہے جس کا معنی ''حلال کی ہوئی'' ہے، اس کا مذکر ''حلیل'' اور جمع ''احلہ'' ہے جیسے عزیز اور اعزہ، (عورت کو ''حلیلۃ'' اور مرد کو ''حلیل'' کہتے ہیں)، مرد اور عورت یعنی شوہر اور بیوی کو ان ناموں سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے حلال ہوتا ہے یعنی دونوں ایک دوسرے سے مباشرت و نزدیکی کرنے کا حق رکھتے ہیں، اس اشتقاقی حوالہ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ''حلول'' سے مشتق ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے ساتھ حلول یعنی اس کے ساتھ ایک ہی بستر میں (احل) (اکٹھے) ہوئے ہیں۔

''ابناء'' ابن کی جمع کا صیغہ ہے جس سے مراد وہ شخص ہے جو ولادت کی وجہ سے کسی سے جڑا ہو، خواہ بلاواسطہ ہو جیسے حقیقی بیٹا، یا بالواسطہ ہو جیسے بیٹے کا بیٹا، یا بیٹی کا بیٹا، دونوں کو ''ابناء'' کہا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ''الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ'' کی قید لگانے سے یہ مقصود ہے کہ اس سے منہ بولے بیٹے مراد نہیں کہ جو ولادت کے ذریعے ہونے والی اولاد نہیں ہوتی۔

دو بہنوں کا یکجا عقد میں ہونا

○ ''وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ''

(اور یہ بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو یکجا عقد میں لو، مگر جو پہلے ہو چکا)

اس جملے میں یہ حکم بیان کرنا مقصود ہے کہ جب تک بیوی زندہ ہو اور اس کے ساتھ رشتہ ازدواج بھی باقی ہو تو اس کی

بہن سے نکاح کرنا حرام ہے، آیت مبارکہ کے الفاظ اس مقصود کو واضح کرنے کے لئے نہایت خوبصورت و جامع ہیں، الفاظ و عبارت کے اطلاق سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں دو بہنوں کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں لہٰذا اگر کوئی شخص کسی خاتون سے نکاح کرے اور پھر اسے طلاق دے یا وہ فوت ہو جائے تو اس کے بعد اس کی بہن سے نکاح کرسکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ عہد نبوی ﷺ ہی میں ایسا ہونا مسلمانوں کے درمیان قطعی طور پر ثابت ہے اور اس کا انکار نہیں ہوسکتا۔

اور جملہ ''اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ'' اسی طرح سے ہے جیسے اس سے پہلی آیت (۲۲) میں ارشاد ہوا: ''وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ'' اس سے اس عام رسم کی طرف اشارہ ہے جو عربوں کے درمیان زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں دو بہنوں سے نکاح کرتے تھے لہٰذا ان الفاظ ''اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ'' سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ آیت کے نزول سے پہلے دو بہنوں سے جو نکاح کرتے تھے ان کا ایسا کرنا معاف کیا جاتا ہے کہ جو ہو چکا سو ہو چکا، لیکن اگر آیت کے نزول کے وقت صورتحال یوں تھی کہ کوئی شخص دو بہنوں سے عقد تو کر چکا تھا مگر ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے بارے میں حرمت کا حکم نازل ہو گیا تو اب وہ اُنہیں گھر نہیں لاسکتا کیونکہ اس سے آیت کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی، اس کی قرآنی مثال ''وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ'' کی تفسیر میں اس کے شانِ نزول کے بیان سے واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے آیت نازل ہونے کے بعد بیٹوں اور ان کے آباء کی بیویوں کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانے کا حکم دیا جبکہ ان کی شادیاں آیت کے نزول سے پہلے ہو چکی تھیں۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

زیر نظر آیۂ مبارکہ میں ''تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ'' (دو بہنوں کے ساتھ اکٹھا عقد میں رکھنا۔ یعنی ایک بہن کی موجودگی میں دوسری بہن کے ساتھ نکاح کرنا) کی حرمت کے بیان کے ساتھ ''اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ'' کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا اسے معاف کیا گیا، یعنی آیت کے نزول سے قبل زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کے عمل کو معاف کر دیا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سابقہ زمانہ میں جو کچھ ہو چکا اسے معاف کرنے یا نہ کرنے کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ یعنی اب اسے جائز و درست قرار دینے سے کیا فائدہ؟ زمانۂ حال میں جو کام حرام قرار دیا گیا ہے اب زمانۂ ماضی میں اس کے وقوع پذیر ہونے کو جائز سمجھنے سے کیا حاصل ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انجام پذیر ہونے والے عمل کے بارے میں اب جواز کا فیصلہ

بظاہر بے فائدہ لگتا ہے کہ جس کا عملی اثر ونتیجہ کچھ نہیں لیکن اس سے مربوط آثار کہ جو اس موجود زمانہ میں موجود ہیں ان کے بارے میں شرعی فیصلہ خالی از فائدہ نہیں مثلاً اس سے پیدا ہونے والی اولاد کا حلال ہونا اور ان سے نسبی تعلق قائم ہونا وغیرہ، تو یہ ایسے اُمور ہیں جن کے بارے میں شرعی حکم ضروری ہے۔

اسی مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ سابقہ دور میں واقع ہونے والے عمل یعنی نکاح کہ جس میں ایک کے ہوتے ہوئے دوسری بہن سے نکاح ہوا، کے بارے میں اب اس کے حلال یا حرام ہونے کا فیصلہ کیا جائے جبکہ وہ دونوں مرچکی ہوں یا ان میں سے ایک مرچکی ہو، یا دونوں کو طلاق دی جاچکی ہوں یا ان میں سے ایک کو طلاق ہو چکی ہو، تو اس سے کیا عملی نتیجہ حاصل ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے نکاح سے موجودہ دور میں حرمت کا حکم اٹھا لینا اور اسے لغو و بے اثر قرار نہ دینا اس پر مترتب ہونے والے آثار کے حوالہ سے ہے نہ کہ اصل عمل کے حوالہ سے، کیونکہ وہ تو بہر حال واقع ہو چکا ہے کہ خواہ حلال تھا یا حرام! لیکن اس سے مربوط آثار کے بارے میں شرعی حکم کا تعین ضروری ہے مثلاً اس سے جو اولاد پیدا ہوئی آیا وہ حلال کہلائے گی یا حرام؟ یعنی ان کی ولادت پاک قرار دی جائے گی اور ان کے ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں سے قرابت کو شرعی حیثیت حاصل ہوگی یا نہیں؟ تو یہ احکام میراث اور نکاح وغیرہ میں مؤثر ہیں، یعنی جب ان کے سابق عمل کو درست قرار دیا جائے گا تو اس کے نتیجہ میں ان کی اولاد کو حلالی کہا جائے گا کہ وہ اپنے آباء سے میراث بھی پائیں گے اور اُن کے ساتھ شرعی عقد کرنا بھی درست ہوگا، اس کے ساتھ ساتھ نکاح وغیرہ کے علاوہ دیگر احکام میں بھی ان کی حیثیت دیگر حلالی افراد جیسی ہوگی۔

بنا برایں جملہ ''اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ'' (سوائے اس کے کہ جو پہلے ہو چکا) میں حرمت کے حکم سے استثناء اس کے شرعی آثار کے حوالہ سے ہے نہ کہ اس اصل عمل سے کہ جو تشریع سے پہلے وقوع پذیر ہو چکا، اس سے واضح ہوا کہ یہاں استثناء متصل ہے منقطع نہیں، جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے یعنی اسے استثناء منقطع قرار دیا ہے، بلکہ یہ استثناء متصل ہے، علمی اصطلاح میں استثناء متصل و منقطع کی وضاحت یہ ہے کہ جس فرد کو مستثنیٰ کیا گیا ہو اگر وہ اس مجموعہ میں شامل ہو (مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہو) کہ جس سے اسے مستثنیٰ کیا گیا تو اسے استثناء متصل کہا جاتا ہے اور اگر شامل نہ ہو تو منقطع کہا جاتا ہے مثلاً اگر کہا جائے کہ میرے پاس لوگ آئے مگر زید نہیں آیا، تو اسے استثناء متصل کہتے ہیں کیونکہ زید لوگوں میں شامل تھا کہ جسے ''مگر زید نہیں آیا'' کے الفاظ سے آنے والوں سے مستثنیٰ کیا گیا، اور اگر یوں کہا جائے کہ میرے پاس لوگ آئے مگر گدھا نہیں آیا، تو چونکہ گدھا لوگوں میں شامل نہیں تھا اس لئے اسے استثناء منقطع کہا جائے گا۔م)

استثناء کے حوالہ سے ایک اہم ترین نکتہ یہ بھی ملحوظ ہے کہ ممکن ہے اس کی بازگشت صرف جملہ ''وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ'' کی طرف نہ ہو بلکہ آیۂ مبارکہ میں مذکور تمام جملوں کی طرف ہو، البتہ یہ بات واضح ہے کہ عربوں کے ہاں صرف یہی رسم تھی کہ وہ ایک بہن سے نکاح کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی موجودگی میں اس کی دوسری بہن سے بھی نکاح کر لیتے تھے لیکن دیگر حرام کی گئی عورتوں مثلاً ماؤں و بہنوں وغیرہ سے نکاح نہیں کرتے تھے، تاہم کچھ قوم میں ایسی بھی تھیں جو ان کے ساتھ

ساتھ ماؤں بہنوں اور دیگر محرم خواتین کے ساتھ بھی شادیاں کرتے تھے مثلاً پارسی، رومی اور دیگر متمدن وغیر متمدن قومیں جو نزول قرآن کے زمانہ میں تھیں اور ازدواجی رسومات میں باہم اختلاف بھی رکھتی تھیں، اس تناظر اور صورتحال میں اسلام نے یہ استثنائی حکم صادر کر کے غیر مسلم قوموں کے درمیان ان کے اپنے مذاہب کے مطابق رائج ازدواجی اصولوں کو خود ان کے لئے صحیح قرار دے کر ان کی اولاد کے حلال ہونے کا اعلان کیا کہ وہ اسلام لانے کے بعد اپنی انہی نسبی نسبتوں کے حامل رہیں گے جو قبل از اسلام ہونے والے نکاح سے قائم ہوئی تھیں تاکہ قرابتی سلسلے اپنی اصل نسبت کے ساتھ باقی رہیں اور اسلام قبول کرنے کے بعد اس کی نسلیں پاک ولادتوں وقرابتوں کی حامل ہوں۔

لیکن اس وضاحت کے باوجود بظاہر پہلا جواب زیادہ پختہ لگتا ہے یعنی استثنائی حکم میں آیت میں مذکور تمام رشتے ملحوظ نہیں بلکہ ''جمع بین الاختین'' ملحوظ ومقصود ہے۔

اور جملہ ''اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا'' (بے شک اللہ معاف کردینے والا، نہایت مہربان ہے) مذکورہ بالا استثناء کی وجہ کے بیان پر مشتمل ہے کہ ''اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ'' (مگر یہ کہ جو پہلے ہو چکا) میں خدا کی طرف سے ماضی کی غلطی سے عفوو درگزر کرنے کا بیان ہے۔ تو یہ ان موارد میں سے ایک ہے جن میں عفوو مغفرت اور بخشش کا تعلق اصل گناہوں ومعصیتوں کے بجائے اعمال کے ظاہری آثار سے ہے۔

شادی شدہ عورتیں

○ ''وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ''

(اور شادی شدہ عورتیں، سوائے ان کے جو تمہاری ملکیت میں آجائیں)

لفظ ''محصنات'' صؔ پر زبر کے ساتھ مصدر ''حصن'' سے باب افعال ''احصان'' سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ ''حصن'' کا معنی ''منع'' (روکنا) ہے، اسی سے ''الحصن الحصین'' بنا ہے جس کا معنی مضبوط ڈھال ہے، چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے: ''احصنت المرأۃ'' تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس نے عفت وپاکدامنی اپنائی، اپنی عزت وناموس کی حفاظت کی اور اپنے آپ کو برائی وفجور سے روکا، جیسا کہ اس کی قرآنی مثال سورۂ تحریم آیت ۱۲ میں موجود ہے: ''الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا'' (وہ عورت کہ جس نے اپنی شرمگاہ کو برائی سے روکا) اسی حوالہ سے جب کہا جاتا ہے: ''اَحۡصَنَتِ المرأۃُ'' (احصنت فعل معلوم، المرأۃ اسم فاعل) عورت نے اپنے آپ کو روکا، اپنی ناموس کی حفاظت کی، یا ''اُحۡصِنَتِ المرأۃُ'' (احصنت فعل مجہول،

المرأۃ اسم مفعول) عورت کو روک لیا گیا، اس کی ناموس محفوظ کر لی گئی، تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے شادی کر لی، کہ اس کے شوہر نے اس کی ناموس کو محفوظ کر لیا) یا شادی کرنے ہی سے وہ محفوظ ہوگی، اور یہی الفاظ یعنی ''احصنت المرأۃ'' کنیز کے مقابلے میں آزاد عورت کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں اور اس سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ آزاد ہے یعنی کوئی اس کی ناموس کا مالک نہیں۔ بلکہ وہ خود اپنی ناموس کی مالک ہے، یا یہ کہ اس کا آزاد اور کسی کی کنیز و مملوکہ نہ ہونا ہی اس کے ارتکاب زنا کی راہ میں حائل ہے کیونکہ اس دور میں کنیزوں میں زنا عام تھا اور آزاد عورتیں اسے اپنے لئے عار سمجھتی تھیں۔

آیۂ مبارکہ ''محصنات'' سے بظاہر دوسرا معنی مراد ہے یعنی شادی شدہ عورتیں، پہلا اور تیسرا معنی مراد نہیں کیونکہ مذکورہ بالا دو آیتوں میں جن چودہ اصناف کو حرام قرار دیا گیا ہے یعنی ان کے ساتھ نکاح کرنا ممنوع ہے ان کے علاوہ صرف شادی شدہ عورتیں ہی ہیں جن سے نکاح کرنا حرام و ممنوع قرار دیا گیا ہے، ان کے علاوہ کسی سے نکاح ممنوع نہیں خواہ وہ عفیفہ و پاکدامن ہو یا نہ ہو، اور خواہ آزاد ہو یا کنیز ہو، بنا برایں آیت مبارکہ میں لفظ ''محصنات'' سے صرف عفیفہ عورتیں مراد لینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جبکہ نکاح کرنے کی حرمت کا حکم عفیفہ کے ساتھ مختص ہی نہیں کہ پھر اسے شادی شدہ ہونے کی شرط لگا کر محدود کر دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ اس لفظ سے مراد آزاد عورتیں ہیں جبکہ کنیزوں میں بھی یہی حکم جاری ہوتا ہے کہ پھر اسے شادی شدہ ہونے کی شرط کے ساتھ مقید کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ اس طرح کی عملداری طبع سلیم کو بھی ناگوار و ناپسند ہے۔

بنا برایں یہاں ''محصنات'' سے شادی شدہ عورتیں مراد ہیں کہ جو شادی کے بندھن میں محصور ہوتی ہیں، لہٰذا یہ لفظ ''امھاتکم'' پر عطف ہے، اس طرح آیت کا معنی یوں ہوگا: تم پر حرام قرار دی گئی ہیں تمہاری مائیں، اور ہر شادی شدہ عورت، جب تک وہ شادی شدہ ہو یعنی شوہر دار ہو۔

مذکورہ مطالب کی روشنی میں جملہ ''اِلَّا مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ'' کی بابت بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مباشرت و ہمبستری صرف ان عفیفہ و پاکدامن عورتوں سے جائز ہے جن سے تم نے نکاح کیا ہو یا انہیں کنیز کے طور پر خریدا ہوا، اس بناء پر ''مَلَکَتْ'' میں ملکیت سے ان کے ساتھ مباشرت کرنے کے حق کی ملکیت مراد ہے۔

لیکن یہ قول دو وجہوں سے درست نہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں لفظ ''محصنات'' سے صرف عفیفہ و پاکدامن عورتیں مراد لینی پڑیں گی نہ کہ شادی شدہ عورتیں، جبکہ اس سلسلہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ درست نہیں، دوسری وجہ یہ کہ قرآنی اطلاق و استعمال کے مطابق ان الفاظ (مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ) سے صرف کنیزوں کی وجودی ملکیت مراد لی جاتی ہے نہ کہ مباشرت و ہمبستری کے حق کی ملکیت۔

یہاں ایک قول یہ بھی ہے کہ جسے بعض دیگر مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ ''مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ'' سے مراد وہ جوان شادی

شدہ عورتیں ہیں جو جنگ میں قیدی ہو جاتی ہیں اور ان کے شوہر کافر ہوتے ہیں، اس قول کی تائید میں یہ روایت ذکر کی گئی ہے کہ ابوسعید الخدری نے بیان کیا کہ یہ آیت اوطاس کے قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی جس میں مسلمانوں نے مشرکین کی عورتوں کو قید کر لیا جبکہ وہ عورتیں شادی شدہ تھیں لیکن اس آیت کے نازل ہونے سے وہ مسلمانوں کے لئے حلال ہو گئیں تو اس وقت حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے فوراً اعلان ہوا کہ کسی حاملہ عورت کے ساتھ ہمبستری نہ کی جائے جب تک کہ وہ بچہ نہ جنے، اور جو کنیزیں حاملہ نہیں ہیں ان کے پاک ہونے تک صبر کیا جائے، یہ قول بھی درست نہیں کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو روایت ذکر کی گئی ہے وہ سند کے حوالہ سے ضعیف ہے، دوسری بات یہ کہ اگر روایت کو صحیح مان کر اس قول کو درست قرار دیا جائے تو اس سے آیت کا اطلاق متاثر ہوگا اور اس میں تخصیص بلا مخصص لازم آجائے گی۔ آیت کے اطلاق سے مراد یہ ہے کہ ''مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' میں شادی شدہ جنگی قیدی عورتیں اور ان کے علاوہ دیگر کنیزیں سب اس جملہ میں شامل ہیں اور تخصیص یہ ہے کہ اگر مذکورہ روایت کو درست مانا جائے تو صرف جنگی قیدی شادی شدہ عورتیں ہی مراد ہوں گی، جبکہ ان الفاظ سے صرف قیدی عورتیں مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں، بنا برایں اس سلسلہ میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اسے ہی اپنانا چاہیے۔

خدائی قانون کی پیروی

- ''كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ''
  (اللہ کا تم پر مقررہ قانون ہے)

یہاں جملہ ''كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم لکھ دیا ہے تم اسی کی پیروی کرو، تم پر اسی کا اتباع ضروری ہے۔

البتہ مفسرین کا کہنا ہے کہ جملہ ''كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ'' میں لفظ ''کتاب'' مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا فعل تقدیری ہے لہٰذا فہم معنی کے لیے عبارت کو یوں فرض کیا جائے گا: ''کتب اللہ کتاباً علیکم'' (خدا نے تم پر ایک حکم لکھ دیا ہے، واجب کر دیا ہے) تو فعل ''کتب'' کو حذف کر کے اس کی جگہ مصدر کو اس کے فاعل کی طرف مضاف کر دیا گیا: (کتاب مضاف، اللہ مضاف الیہ) لہٰذا ''عَلَيْكُمْ'' اسم فعل نہیں، کیونکہ اسم فعل عملداری میں ضعیف ہوتا ہے اور مقدم مفعول پر اس کی عملداری نہیں ہوتی۔

(اس نحوی بحث کی وضاحت یہ ہے کہ آیت میں لفظ ''كِتٰبَ'' منصوب ہے یعنی اس کے آخر میں حرف ''ب'' پر زبر

ہے، تو سوال یہ ہے کہ یہ زبر کیوں ہے؟ کیونکہ اس کے لئے کوئی وجہ (عامل) ضروری ہے، مؤلف کے نزدیک ''عَلَيْكُمْ'' اسم فعل ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ تم پر واجب ہے کہ اس حکم پر عمل کرو، لیکن مفسرین کہتے ہیں کہ اسے اسم فعل قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ نحویوں کے نزدیک اسم فعل کی عملداری (عامل ہونا) ضعیف ہے لہٰذا اس کے مفعول کو اس پر مقدم نہیں کیا جاسکتا، مفسرین کہتے ہیں کہ اگر ''عَلَيْكُمْ'' اسم فعل ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: ''علیکم کتاب اللہ'' مؤلف کے نظریہ کے مطابق مفعول کا فعل پر مقدم ہونا بلا اشکال ہے لہٰذا جملہ ''كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ'' ہی ''علیکم کتاب اللہ'' کا معنی دیتا ہے۔م)

اصل حکم کی وضاحت

○ ''وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ''

(اور تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے جو کچھ بھی اس کے علاوہ ہے)

اس جملہ سے فہم المعنیٰ کی بابت نہایت دلچسپ ادبی بحث ہوئی ہے، ذیل میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

پہلی بات یہ ہے کہ حرف ''مَا'' ذکر ہوا ہے جو عموماً غیر ذوی العقول (اشیاء) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ضمیر ''ذٰلِكُمْ'' سے مفرد مذکر کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس جملے کے بعد ارشاد ہوا: ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ'' جو کہ معنی کے حوالہ سے نہایت اہم جہت کی طرف اشارہ ہے۔

ان مذکورہ امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ حرف ''مَا'' جو کہ ادبی حوالہ سے ''موصولہ'' ہے اور اسم اشارہ ''ذٰلِكُمْ'' ان دونوں سے مراد وہ عمل ہے جو ''حرمت علیکم امھاتکم'' میں حرمت کے حکم کی بابت مقصود و ملحوظ ہے یعنی مباشرت و ہمبستری یا اس طرح کے کام، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے ان کے ساتھ مباشرت کرنا سوائے ان عورتوں کے کہ جن کے بارے میں تمہیں آگاہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی جن پندرہ قسموں کی عورتوں کے علاوہ دیگر عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کنیزوں کے ساتھ بھی مباشرت حلال کی گئی ہے جو تمہاری ملکیت میں قرار پائیں۔ اس طرح یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ جملہ ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ'' کو جملہ ''وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ'' کا بدل قرار دیا جائے۔

لیکن مفسرین کی طرف سے آیت مبارکہ کے اس جملہ کے بارے میں عجیب تفسیریں منقول ہیں مثلاً:۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جملہ "وَ اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ" کا معنیٰ یہ ہے: "احل لکم ماوراء ذات المحارم من اقاربکم" (تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں تمہاری قریبی محرم عورتوں کے علاوہ دیگر خواتین)

کچھ حضرات نے کہا ہے کہ اس جملہ سے مراد یہ ہے: "احل لکم مادون الخمس وھی الاربع فما دونہا ان تبتغوا باموالکم علیٰ وجہ النکاح" (تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں پانچ سے کم عورتیں، یعنی چار یا اس سے کم، کہ تم اپنے اموال کے ساتھ ان سے نکاح کر سکتے ہو)۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ "اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ" سے مراد یہ ہے: "اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ" (تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں اس کے علاوہ وہ عورتیں جو تمہاری ملکیت میں آئیں (کنیزیں)۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں وہ عورتیں جو تمہاری محرم نہ ہوں اور چار سے زیادہ بھی نہ ہوں کہ تم اپنے اموال کے ساتھ ان سے نکاح کرو یا انہیں کنیزوں کے طور پر خرید کر ان کے مالک بنو۔

یہ ہیں وہ اقوال و آراء جو مفسرین نے آیۂ مبارکہ کی بابت ذکر کی ہیں، لیکن یہ سب کی سب آراء نہایت کمزور و بے قیمت ہیں کیونکہ آیت کے الفاظ سے ان کی صحت کا ثبوت نہیں ملتا، اس کے علاوہ یہ کہ ان سب پر جو مشترکہ اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ان میں لفظ "مَّا" کو صرف ذوی العقول کے لئے استعمال کئے جانے کو ملحوظ رکھا گیا ہے جبکہ ایسا نہیں اور نہ ہی اس طرح کے اختصاص و تعیین کی کوئی ضرورت ہے جیسا کہ اس حوالہ سے چند سطور قبل وضاحت ہو چکی ہے، (یعنی جو لفظ غیر ذوی العقول کے لئے ہے اسے ذوی العقول کے لئے مخصوص و مختص کریں) اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ آیۂ مبارکہ صرف اس مطلب کو بیان کرتی ہے کہ کون سی عورتیں حلال اور کون سی حرام ہیں، اس میں یہ بیان مقصود نہیں کہ کتنی عورتیں حلال ہیں اور کتنی حرام، یعنی آیت مبارکہ اس مطلب کے بیان پر مشتمل نہیں کہ کتنی عورتوں کے ساتھ شادی جائز ہے اور اس سے زیادہ سے جائز نہیں اس میں ازواج کی تعداد کے بارے میں شرعی حکم بیان نہیں کیا گیا لہٰذا آیت کو ازواج کی تعداد کے بیان پر مشتمل قرار دینا بلا دلیل ہے، بنابرایں حق یہ ہے کہ اس جملے میں صرف یہ بیان مقصود ہے کہ سابقہ دو آیتوں میں جن عورتوں کا تذکرہ ہوا ہے ان کے علاوہ دیگر عورتوں سے مباشرت جائز ہے خواہ نکاح کر کے ہو یا کنیزی میں لا کر ملکیت کی بنیاد پر ہو۔

شرعی طریقۂ حلیت

○ "اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ"

(یہ کہ تم اپنے اموال سے چاہو، پاکدامن بن کر، نہ کہ غلط کار بن کر)

یہ جملہ ماقبل "مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ" کا بدل یا عطف بیان ہے، اس میں عورتوں سے مباشرت کے شرعی طریقہ حلیت کو

بیان کیا گیا ہے کیونکہ جملہ ''وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ''میں جن اصناف سے مباشرت قابل تصور تھی وہ تین ہیں: نکاح، کنیزی، سفاح (زنا)، جبکہ زیر نظر جملہ ''تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ........''میں تیسری قسم یعنی سفاح (زنا) کی ممانعت بیان ہوئی ہے لہٰذا مباشرت کا جواز صرف دوطریقوں میں منحصر ہوجاتا ہے: نکاح وکنیزی، اور جملہ ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ''میں جس مطلب کو بیان کیا گیا ہے وہ مال خرچ کرنا ہے جو کہ نکاح میں حق مہر کی صورت میں۔حق مہر، نکاح کی صحت وجواز کا ایک رکن ہے اور کنیزی میں قیمت ادا کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جو کہ کنیزی میں مالکانہ حق کے لئے عام طور پر یہی طریقہ واصول اپنایا جاتا ہے۔

بنا بر ایں آیت مبارکہ کا معنی یوں کیا جائے گا کہ جن عورتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے ان کے علاوہ دیگر عورتوں سے مباشرت، تمہارے لئے جائز قرار دی گئی ہے کہ اپنے اموال خرچ کر کے ایسا کر سکتے ہو خواہ نکاح کر کے حق مہر کی صورت میں ہو یا کنیزی میں ان کی قیمت ادا کر کے ہو، لیکن سفاح (زنا) میں مال خرچ کر کے ایسا کرنا جائز وحلال نہیں۔

ان مطالب سے یہ واضح ہوا کہ جملہ ''مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ''میں ''حصان'' سے مراد عفت و پاکدامنی کے ذریعے اپنے آپ کو محفوظ کر لینا ہے نہ کہ وہ دو معانی، جو پہلے ذکر ہو چکے ہیں یعنی شادی کر کے اپنے آپ کو محفوظ کر لینا اور آزاد عورت ہونے کے حوالہ سے اپنے آپ کو محفوظ کر لینا، یہ دو معنیٰ ہرگز مراد ومقصود نہیں کیونکہ آیت مبارکہ میں ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ '' سے نکاح میں حق مہر ادا کرنا اور کنیزی میں قیمت ادا کرنا دونوں شامل ہیں لہٰذا اس سے صرف نکاح میں حق مہر ادا کرنا مراد نہیں لیا جا سکتا اور نہ ہی ایسا مراد لینے پر کوئی دلیل موجود ہے کہ جس کی وجہ سے ہم اس کے سوا کچھ مراد نہ لے سکتے ہوں، اور عفت و پاکدامنی کے ذریعے اپنے آپ کو محفوظ کر لینے سے مراد یہ نہیں کہ عورتوں سے مباشرت کو ہی ترک کر دیا جائے اور اس کی طرف رغبت ہی نہ ہو، بلکہ اس سے مراد ترک زنا ہے اور اس چیز سے دوری اختیار کرنا مقصود ہے جو ''سفاح'' (زنا) کہلائے، یعنی برائی وفحشاء کی طرف جانا خواہ جس صورت میں کیوں نہ ہو، بلکہ صرف انہی راہوں سے اس عمل کی طرف رغبت کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہیں اور ان کے علاوہ ہر راہ سے اجتناب برتا جائے اور خدا کی حرام کردہ چیزوں وراہوں سے اپنے آپ کو روکتے ہوئے اپنی فطری خواہش کو پورا کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت وطبع وجودی میں جنسی عمل کی طرف رغبت وجذبات ودیعت کر دیئے ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب سے بعض مفسرین کے اس بیان کا نادرست ہونا بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں انہوں نے ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ........''میں حرف ''لام'' فرض کرتے ہوئے اس طرح معنی کیا: ''لتبتغوا، یعنی یہاں غرض وغایت والا حرف لام تصور کیا جائے یا وہ کہ جو غرض وغایت کا معنیٰ دے، اس بناء پر عبارت اس طرح فرض کر کے معنیٰ کیا جائے گا: ''لتبتغوا باموالکم '' یا اس طرح فرض کریں گے: ''ارادۃ ان تبتغوا باموالکم ''

اس قول کا درست ہونا اس حوالہ سے ہے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ جملہ ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ........'' پہلے

جملہ ''مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ'' کا بدل ہے یعنی ایک طرح سے بعینہٖ اس جیسا ہے، یعنی ایسا نہیں کہ اس کے نتیجہ کے طور پر ہو کہ جو اس سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ ایک واضح حقیقت ہے۔

اس طرح ایک مفسر کا یہ کہنا بھی قرین صحت نہیں کہ یہاں مسافحہ (مسافحین) سے مراد پانی ڈالنا ہے یعنی مباشرت کے ذریعے صرف پانی ڈالنا، کہ جس میں وہ غرض و غایت ملحوظ و مقصود ہی نہ ہو جس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں اس فطری شہوت کو ودیعت فرمایا ہے یعنی خاندان کی تشکیل اور نسل و اولاد کا وجود میں لانا، (بچے پیدا کرنا) لہٰذا اس قرینہ کی روشنی میں ''محصنین'' میں ''احصان'' سے مراد دائمی نکاح ہوگا کہ جس میں توالد و تناسل یعنی اولاد و نسل پیدا کرنا مقصود و ملحوظ ہوتا ہے۔

مجھے اس مفسر کے بیان سے اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس بحث میں خلط ملط سے دوچار ہوئے ہیں اور اصل موضوع کی بجائے دوسرے موضوع میں مصروف بحث ہو گئے، چنانچہ اُنہوں نے حکم کے معیار و بنیاد کہ جسے حکمۃ التشریع یعنی قانون گزاری کی حکمت و فلسفہ کہا جاتا ہے اور اصل حکم کے درمیان خلط ملط کر دیا جس کے نتیجہ میں انہیں ایسے نتائج کا سامنا ہوا جو اصل بحث کے نتائج نہیں بن سکتے۔

ان دو بحثوں میں فرق یہ ہے کہ ان میں سے ایک یہ کہ حکم کی عقلی اساس و بنیاد اور ملاک و فلسفہ کیا ہے؟ اور دوسری بحث یہ کہ اصل حکم شرعی کیا ہے اور اس کا موضوع و متعلقات کیا ہیں، اسی طرح شارع مقدس کے بیان میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں حکم کی شرائط و موانع کیا ہیں کہ جن کی بنیاد پر حکم کے دائرہ کی حدود کا تعین ہو سکے اور اس کی وسعت معلوم ہو سکے؟ کیونکہ ان امور کا تعلق الفاظ سے ہے لہٰذا شارع مقدس کی زبان سے صادر ہونے والے الفاظ ہی اصل دلیل قرار پاسکتے ہیں، اور ہمیں اس سلسلہ میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں کہ شارع مقدس نے جو احکام صادر فرمائے ہیں وہ سب حقیقی مصلحتوں اور معیاروں پر استوار و مبنی ہیں، ان میں سے ایک حکم نکاح ہے کہ اس کی تشریع میں بھی ایک حقیقی مصلحت اور حقیقی معیار ملحوظ و کار فرما ہے یعنی توالد و تناسل، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عالم الایجاد میں نوع انسانی کی نوعی بقاء کا راز افراد کی بقاء میں مضمر ہے کہ جب تک خدا چاہے اس نوع کو بقاء حاصل ہو تو اس کا سلسلہ قائم رہنا چاہیے، لہٰذا اس غرض کے حصول کے لئے انسانی جسم کو تناسلی آلات سے مجہز کر دیا گیا کہ جن کی عملداری کے نتیجہ میں ایک نیا انسان وجود میں آسکے اور نر و مادہ کے اجزاء ایک دوسرے سے مل کر ایک خاص و مخصوص نظام کے تحت اس طرح ایک نئے انسان کے وجود میں آنے کے مراحل طے کریں کہ جس کے وجود میں آنے سے نوع انسانی کا سلسلہ باقی رہے اور وہ منقطع نہ ہونے پائے، چنانچہ اس حوالہ سے ان تناسلی آلات کی عملداری اور اس سے مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے شہوانی قوت قرار دی گئی کہ جس کے ذریعے نر اور مادہ میں سے ہر ایک کو، دوسرے سے انس و رغبت ہو اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ جائیں کہ مباشرت کا عمل وقوع پذیر ہو، کارخانۂ قدرت نے اس سلسلہ کے تمام مراحل کی درست تکمیل کے لئے ان پر عقل کی حاکمیت قرار دی تا کہ اس کے ذریعے نظام خلقت کے اصل مقصود میں ہر ممکنہ خرابی کی راہ روکی جا سکے۔

لیکن اس کے باوجود کہ نظام خلقت نے اپنے مراحل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اپنے مقصود یعنی نوع انسانی کی بقاء کو بھی پالیا ہم دیکھتے ہیں کہ مرد اور عورت بلکہ ان تمام اصناف (نر و مادہ) کے درمیان مباشرتی پیوستگیاں ہمیشہ خلقت کی اصل غرض وغایت کو نہ پاسکیں بلکہ عموماً تو ایسا ہوگیا دائمی طور پر ایسا نہ ہوسکا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ نظام خلقت کے تمام مراحل کا طے ہونا بھی ایک لحاظ سے ابتدائی سلسلوں کی تکمیل ہے کہ جس سے مطلوبہ نتائج کا حصول اکثر تو ہوجاتا ہے لیکن دائماً نہیں، بنا بر ایں نہ تو ہر نکاح و ازدواجی عمل سے اولاد پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی ہر تناسلی عمل سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی اس عمل کی طرف رغبت کا پیدا ہونا اس طرح کے اثر کے ظہور پذیر ہونے میں مؤثر واقع ہوتا ہے، بلکہ نہ تو ہر مرد یا ہر عورت میں اور نہ ہی ہر شادی میں اضطراری طور پر مباشرت کی راہ اپنانے کا جذبہ و حالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس سے بچے پیدا ہوں، لہٰذا تمام امور اکثر نتیجہ بخش تو ثابت ہوتے ہیں دائمی طور پر نہیں۔

بنا بر ایں تخلیقی طور پر تناسلی آلات سے لیس ہونا انسان کو نسل کی طلب وخواہش کو پورا کرنے کے لئے شہوت کے ذریعے ازدواجی تعلق قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے اور انسانی وجود میں عقل کی قوت جو ودیعت کی گئی ہے وہ مباشرت کے عمل کی طبعی دعوت کے ساتھ ساتھ اسے ہدایت کرتی ہے کہ اپنے آپ کو فحشاء و برائی سے بچائے کہ وہ اس کی زندگی کی سعادت کو تباہ، اس کی خاندانی بنیادوں کو منہدم اور اس کے سلسلۂ نسل کو قطع کردیتی ہے۔

تو یہی مصلحت کہ جو دو اہداف سے مرکب ہے یعنی افزائش نسل اور فحشاء کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہونا اسلام میں نکاح کی قانون گزاری کا اصل معیار ہے کہ جس پر عموماً توجہات مرکوز ہوتی ہیں البتہ احکام کے معیاروں کا اکثر مورد توجہ قرار پانا ہی ملحوظ ہوتا ہے، لیکن وہ احکام جو اپنے موضوعات کے لئے وضع کئے گئے ہیں وہ دائمی ہوتے ہیں ان میں عموماً و اکثر علمی التفات کے حوالے نہیں پائے جاتے، لہٰذا یہ کہنا جائز نہیں کہ نکاح یا مباشرت اپنے جواز میں مذکورہ غرض و معیار اور مقصود کے ساتھ پیوستہ اور اس کے تابع ہیں کہ اگر وہ غرض ملحوظ ہوگی تو جائز ورنہ حرام، ایسا ہرگز نہیں، مثلاً یہ کہ اگر اولاد پیدا کرنا مقصود نہ ہو تو نکاح جائز نہیں، عقیم (بانجھ) مرد یا عورت کا نکاح جائز نہیں، جس بوڑھی عورت کو حیض نہ آتا ہو اس سے نکاح جائز نہیں، جو بچی ابھی بالغ نہیں ہوئی اس سے نکاح جائز نہیں، زنا کار کا نکاح جائز نہیں، حاملہ عورت سے مباشرت جائز نہیں، اگر انزال نہ ہو تو مباشرت جائز نہیں، اگر خاندان کی تشکیل معمول و مقصود نہ ہو تو نکاح جائز نہیں، وغیرہ وغیرہ، تو اس طرح کے اظہارت درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نکاح ایک سنت اور قانونی شرعی طرزِ عمل ہے جو مرد اور عورت کے درمیان دائمی احکام کا حامل ہے اور اس سے عمومی مصلحت کا تحفظ مقصود و ملحوظ ہے جیسا کہ آپ سابقہ بیانات ومطالب سے اس حقیقت کو جان چکے ہیں، بنا بر ایں یہ درست نہیں کہ ایک طرزِ عمل کو قانونی حیثیت دینے میں کسی غرض وغایت کے پائے جانے یا نہ پائے جانے مثلاً افزائش نسل کے تابع قرار دیا جائے کہ اگر وہ ملحوظ و مقصود ہوگی تو جائز ورنہ ناجائز ہو، اور ہر فرد کا جائزہ لیا جائے کہ اگر اس میں وہ غرض و معیار موجود ہو تو جائز ورنہ ناجائز قرار پائے، ایسا ہرگز نہیں۔

نکاح متعہ کا بیان

○ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً''
(توتم ان سے جو استمتاع کروتو ان کی واجبی اجرت ادا کرو)

ایک ادبی بحث

اس جملہ میں ''بِهٖ'' کی ضمیر اس چیز کی طرف لوٹتی ہے جس پر جملہ ''وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ'' دلالت کرتا ہے یعنی مباشرت یا جو اس کے ہم معنی ہو، بنا برایں حرف ''مَا'' زمانی ہوگا یعنی ''جب، جس وقت'' اور ''مِنْهُنَّ'' میں حرف ''من'' جار اور ضمیر ''هن'' مجرور کا تعلق ''اسْتَمْتَعْتُمْ'' سے ہے، اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہے: ''فما استمتعتم بالنیل منهن فاتوهن اجورهن فریضة'' جب بھی تم عورتوں کے ساتھ مباشرت کروتو واجب فریضہ کے طور پر انہیں اُن کی اجرت ادا کرو۔

ممکن ہے کہ حرف ''مَا'' کو موصولہ اور جملہ ''اسْتَمْتَعْتُمْ'' کو اس کا صلہ قرار دیں اور ''بِهٖ'' کی ضمیر کی بازگشت موصول کی طرف ہو اور ''مِنْهُنَّ'' میں حرف ''من'' کو بیانیہ قرار دے کر ''مِنْهُنَّ'' جار و مجرور کو موصول کا بیان قرار دیں، تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: ''ومن استمتعتم به من النسآء...... ''(اور عورتوں میں سے جس سے بھی تم مباشرت کرو......) ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ'' میں حرف ''مَا'' پر حرف ''ف'' ماقبل جملے کی فرع ہے، اس میں ماقبل جملے کو کل اور اسے جزء قرار دے کر جزء کی کل پر تفریع کہا جائے گا یا اس جملے کو کلی اور اسے جزئی قرار دے کر جزئی کی کلی پر تفریع کہا جائے گا، تو یہ یقینی و بلا شک امر ہے کیونکہ ماقبل جملہ میں یوں مذکور ہے: ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ'' اس کی بابت بیان ہو چکا ہے کہ اس میں نکاح کرنا اور کنیز بنانا دونوں شامل ہیں یعنی اپنے اموال خرچ کر کے استمتاع کرو بشرطیکہ عفت و پاکدامنی کو اختیار کرو، زنا و برائی نہ کرو، اس میں نکاح کر کے اور کنیز بنا کر دونوں طرح سے استمتاع شامل ہے، اس بناء پر جملہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً'' جزء کی کل پر یا جزئی کی بعض اقسام کی کلی پر تفریع یقینی ہوگی اور اس طرح کی تفریع کلام الٰہی میں کثرت سے وارد ہوئی ہے، مثلاً:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۴

○ ''اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ''
(گنتی کے چند دن، پس جو شخص تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو.........)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۶

○ ''فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ ۟ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ''

(پس جب تم امن پالو، تو جو شخص عمرہ تمتع بجالائے اور حج کا احرام پہننے تک مباشرت کریں تو......)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۵۶

○ ''لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ..........''

(دین میں جبر نہیں، حقیقت، گمراہی کے مقابلے میں روشن اور واضح ہو چکی ہے، پس جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے.........)

ان کے علاوہ دیگر آیات میں بھی یہ طرزِ سخن موجود ہے، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ آیۂ مبارکہ میں مذکور ''استمتاع'' سے مراد نکاح متعہ ہے کیونکہ یہ آیت مبارکہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور یہ سورۂ مبارکہ نساء میں ہے کہ جو ہجرت کے بعد عہد نبوی ﷺ کے نصف اول میں نازل ہوا جیسا کہ اس کی اکثر روایات سے اس کی شہادت ملتی ہے، اور یہ نکاح یعنی نکاح متعہ اس دور میں اہل اسلام کے درمیان رائج تھا اور اس پر عمل کیا جاتا تھا، یہ ایسی تاریخ حقیقت ہے جس میں کوئی شک نہیں پایا جاتا اور روایات اس کے مسلم الثبوت ہونے پر متفق ہیں، اب اسے اسلام کا تشریع کردہ کہیں یا قبل از ظہور اسلام اس کا رائج ہونا قرار دیں، ہر صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں اور آپ ﷺ کی دید و شنید میں اس کا رائج و معمول ہونا ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے، اور یہ بھی مسلم ہے کہ اس دور میں بھی اس کا نام یہی تھا اور اسے ''متعہ'' ہی سے موسوم کیا جاتا تھا اس کے علاوہ کسی نام سے نہیں، لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا کہ جملہ ''فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ'' سے یہی نکاح (متعہ) مراد لیا جائے اور اس سے یہی نکاح سمجھا جائے، یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے نزول قرآن کے زمانہ میں جو سنن و طرز ھای عمل اور رسومات رائج تھیں اور جب کسی حکم پر مشتمل آیات نازل ہوتیں تو ان مروجہ ناموں ہی کے حوالہ سے نازل ہوتی تھیں جو معاشرے میں مشہور تھے کہ یا تو ان رسومات کے جواز کو قائم رکھتیں، یا ان کی ممانعت کا حکم دیتیں، کیونکہ ایسا کرنا ہی ضروری تھا کہ انہی ناموں کو استعمال کیا جائے جو لوگوں میں متعارف تھے اور ان کے اصل لغوی معانی مقصود و مراد لینے کی ضرورت ہی نہ تھی لہٰذا مروجہ رسومات و سنن سے ان کے عام معروف معانی مراد لئے جاتے تھے، مثلاً ''حج''، ''بیع''، ''ربا''، ''ربح''، ''غنیمت'' اور اس طرح کے دیگر الفاظ کہ جن کے استعمال میں ان کے لغوی معانی کی بجائے عام معروف استعمالی معانی مراد لئے جاتے تھے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس لفظ سے اس کا لغوی معنی مراد ہے، مثال کے طور پر لفظ ''حج'' کہ جس کا لغوی معنی قصد و ارادہ کرنا ہے تو ''حج البیت'' سے بیت اللہ کا قصد و ارادہ کرنے کا معنی لغوی ہے جسے کوئی بھی مراد نہیں لیتا تھا بلکہ وہی مخصوص اعمال مراد لئے جاتے تھے جو فریضہ حج میں مقرر ہیں، اسی طرح دیگر قرآنی الفاظ اور حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان مبارک سے جاری ہونے والے موضوعات و عناوین کو ان کے لغوی معانی کی بجائے مقصودہ معانی میں سمجھا جاتا تھا کہ جو کثرت استعمال کی وجہ سے شرعی ناموں سے شہرت پا گئے مثلاً صلوٰۃ، صوم،

زکوٰۃ، حج تمتع وغیرہ، تو ان الفاظ کے کثیر الاستعمال ہونے اور ان سے مخصوص معانی مراد لئے جانے کے بعد ان الفاظ سے مخصوص شرعی معانی ایک حقیقت بن چکے تھے اور اب بھی یہی صورتحال ہے کہ جب یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو ان کے شرعی معانی ہی مراد لئے جاتے ہیں کہ اسے علمی زبان میں حقیقت شرعیہ یا متشرعہ کہا جاتا ہے، کہ اس حقیقت کے پایۂ ثبوت کو پہنچنے کے بعد ان سے ان کے اصل لغوی معانی مراد لینا کسی صورت میں صحیح نہیں، لفظ ''صلوٰۃ'' کا لغوی معنی دعا ہے جبکہ شرعی معنی نماز ہے، لفظ صوم کا لغوی معنی رکنا ہے جبکہ شرعی معنی روزہ ہے، لفظ ''زکوٰۃ'' کا لغوی معنی پاکیزگی ہے جبکہ شرعی معنی مخصوص نصاب کے مطابق مال کا کچھ حصہ ادا کرنا ہے، اسی طرح دیگر الفاظ کہ جن کے استعمالی معانی شرعی حوالہ سے لغوی معانی سے قطعی مختلف ہیں لیکن یہ الفاظ صرف شرعی معانی میں استعمال ہوتے ہیں کوئی شخص ان سے لغوی معانی مراد نہیں لیتا یا نہیں لے سکتا۔ م۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ آیت مبارکہ میں لفظ ''استمتاع'' سے نکاح متعہ مراد ہے کیونکہ آیت کے نزول کے زمانہ میں اس سے یہی معنیٰ سمجھا جاتا تھا، خواہ کوئی اس بات کا قائل ہو کہ قرآن کی کسی آیت یا سنت کے ذریعے نکاح متعہ کا حکم منسوخ ہو گیا یا قائل نہ ہو، یہ الگ مسئلہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اس آیت سے نکاح متعہ کا حکم ہی سمجھا جاتا ہے اور قدماء صحابہ و تابعین کے مفسرین کرام سے بھی یہی منقول ہے مثلاً ابن عباس، ابن مسعود، ابی ابن کعب، قتادہ، مجاہد، سعدی، ابن جبیر، حسن اور ان کے علاوہ دیگر حضرات اس کے علاوہ یہ بات اصل اور بنیادی ہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے بھی یہی فرمایا ہے جو کہ فہم قرآن میں حقیقی سند ہے۔

اسی بیان سے واضح ہوتا ہے کہ آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین کا یہ قول قرین صحت نہیں کہ استمتاع سے مراد اصل نکاح ہے کیونکہ نکاح و ازدواجی تعلق ہی ایک طرح سے تمتع و جنسی استفادہ کو طلب کرنا ہے، یعنی جو شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے وہ اس لئے کرتا ہے کہ اس سے تمتع کرے یعنی مباشرت و جنسی تلذذ کرے، چنانچہ بعض حضرات نے اسی قول کے ضمن میں کہا ہے کہ یہاں ''اسْتَمْتَعْتُمْ'' میں حرف سین اور ت تاکید کے لئے ہیں اور اس کا معنیٰ ''تمتعتم'' ہے، یعنی استمتاع کا معنی تمتع ہے۔

یہ قول اس لئے قرین صحت نہیں کہ اس زمانہ میں اس لفظ سے نکاحِ متعہ کا سمجھا جانا اس قدر معروف تھا کہ اس سے کسی بھی سننے والے کے ذہن میں اس کے لغوی معنی کی طرف توجہ کی گنجائش ہی موجود نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اگر بالفرض یہ قول صحیح ہو اور یہاں تمتع طلب کرنے کا معنی درست بنتا ہو یا یہ کہ ''اسْتَمْتَعْتُمْ'' بمعنیٰ ''تمتعتم'' ہو تب بھی اس کے ساتھ جو جزاء ذکر ہوئی یعنی ''فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ'' (تو انہیں ان کی اجرتیں ادا کرو) اس کے تناظر میں ''اسْتَمْتَعْتُمْ'' سے دائمی نکاح مراد ہی نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اس میں عقد کے ساتھ ہی حق مہر واجب ہو جاتا ہے اور وہ نہ تو تمتع یعنی جنسی استفادہ و مباشرت پر موقوف ہے اور نہ ہی خواستگاری و اجراء عقد و ملاعبت و مباشرت وغیرہ سے تمتع کی طلب کے سمجھے جانے پر موقوف ہے بلکہ وہ تو عقد واقع ہونے ہی سے واجب ہو جاتا ہے کہ آدھا عقد کے ذریعے اور آدھا مباشرت کے ذریعے ادا کرنا ضروری و لازمی ہے۔

ان تمام مطالب سے قطع نظر ایک اہم مطلب یہ بھی ہے کہ اس آیت سے پہلے جو آیات نازل ہوئی ہیں ان میں ہر صورت میں حق مہر کے واجب ہونے کو نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا لہٰذا دوبارہ اس آیت میں وجوب کے حکم کو بیان کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ تھی، اس آیت سے پہلے جو آیات نازل ہوئیں ان میں اس طرح بیان ہوا: ''وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً'' (اور تم عورتوں کو ان کے حق مہر خوشی خوشی ادا کرو) نساء، ۴۔ اور اسی سورۂ مبارکہ نساء کی آیت ۲۰ تا ۲۱ میں یوں ارشاد ہوا: ''وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا'' (اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو جبکہ تم ان میں سے ایک کو سونے کی بھری ہوئی مشک بھی دے چکے تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو......) اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ و ۲۳۷ میں یوں ارشاد فرمایا: ''لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ......... تا ....وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ....... الخ'' (اگر تم انہیں طلاق دو جبکہ ابھی ان سے ہمخوابی نہ کی ہو یا ان کے لئے حق مہر معین نہ کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں، انہیں بہرہ مند کرو (کچھ مال وغیرہ دو) امیر آدمی پر اس کی استطاعت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی مالی حیثیت کے مطابق نیکی کے ساتھ دینا ضروری ہے......اور اگر تم انہیں مباشرت کرنے سے پہلے طلاق دے دو جبکہ ان کے لئے حق مہر معین کر چکے ہو تو جو کچھ معین کیا اس کا آدھا ادا کرو........الخ)

یہاں یہ مطلب بیان کرنا ضروری ہے کہ بعض مفسرین نے جو احتمالی نکتہ پیش کیا ہے کہ آیۂ مبارکہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً''، حکم کی تاکید کے لئے ہے، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جو آیات یہاں ذکر کی گئی ہیں بالخصوص اس جملہ ''وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ'' (دو آیتوں کے آخر تک) کا سیاق، زیر نظر آیت کے سیاق سے زیادہ تاکیدی ہے اور اس کے اندازِ بیان میں مطلوبہ مقصد کی بابت زیادہ تاکید موجود ہے لہٰذا جملہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ......'' کے ذریعے مزید تاکید کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

نکاح متعہ کے منسوخ ہونے کی بحث

نکاح متعہ کی بحث میں ایک بات یہ بھی مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ وہ منسوخ ہو گیا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں جن آیات سے استدلال کیا گیا وہ یہ ہیں:

پہلا قول: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ نکاح متعہ کے جواز پر مشتمل آیت (زیر بحث آیت) سورۂ مومنون کی آیت ۷ کے ذریعے منسوخ ہو چکی ہے کہ جس میں ارشاد ہوا: ''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ

فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ''(وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے یا اپنی کنیزوں کے، کہ ان کے ساتھ مباشرت کرنے میں ان پر کوئی سرزنش نہیں ہوگی، پس جو شخص اس کے علاوہ کچھ چاہے تو ایسے لوگ زیادتی کرنے والے ہیں) یعنی جو شخص اپنی بیوی یا اپنی کنیز کے علاوہ کسی عورت کے ساتھ مباشرت کرے تو وہ گنہگار ہوگا۔

دوسرا قول: اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت سورۂ طلاق کی آیت ا کے ذریعے منسوخ ہو چکی ہے جس میں عدت کا حکم مذکور ہے: ''يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ''(اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں طلاق دو) اس کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ ضمیمہ کریں کہ جس میں یوں ارشاد الٰہی ہے: ''وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ...... ''(اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین دفعہ پاک ہونے تک روکے رکھیں......) تو مقصود یہ ہوگا کہ ان دو آیتوں میں چونکہ عورت کا شوہر سے جدا ہونا طلاق اور عدت ہی میں منحصر ہے یعنی ان کی علیحدگی طلاق اور عدت ہی کے ذریعے یقینی ہوتی ہے جبکہ متعہ میں نہ طلاق ہے اور نہ ہی عدت۔

تیسرا قول: یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت، میراث کی آیت کے ذریعے منسوخ ہو چکی ہے کہ جس میں یوں ارشاد ہوا: ''وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ ''(اور تمہارے لئے تمہارے شوہر کے ترکہ کا آدھا حصہ ہے) نساء، ۱۲۔ جبکہ متعہ میں میراث ہی نہیں۔

چوتھا قول: ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت تحریم والی آیت کے ذریعے منسوخ ہو چکی ہے کہ جس میں ارشاد ہوا: ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ ''(تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں) تو یہ نکاح کے بارے میں ہے۔

پانچواں قول: ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت، ازواج کی تعداد کے حکم پر مشتمل آیت کے ذریعے منسوخ ہوئی ہے کہ جس میں ارشاد ہوا: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ''(پس تم جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرو، دو (دو) تین تین اور چار چار......) نساء، آیت: ۳

چھٹا قول: یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے منسوخ ہوئی اور اسے خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سال منسوخ کیا جس سال جنگ خیبر ہوئی، بعض کہتے ہیں فتح مکہ والے سال اور بعض کہتے ہیں حجۃ الوداع یعنی آخری حج کے موقع پر منسوخ کیا۔

ساتواں قول: ایک قول یہ ہے کہ نکاح متعہ حلال ہوا تھا لیکن دو بار یا تین بار اس سے منع کیا گیا اور آخری بار اسے حرام قرار دیا گیا، اور یہی حکم باقی رہا۔

اب ان کے جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) جہاں تک سورۂ مومنون کے ذریعے اس کے منسوخ ہونے کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ مومنوں کی

آیت، نکاح متعہ والی آیت کو منسوخ کر ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ مکی آیات میں سے ہے جبکہ نکاح متعہ والی آیت مدنی آیات میں سے ہے، اور مکی آیت، مدنی آیت کو منسوخ نہیں کر سکتی، اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ متعہ کو نکاح قرار نہ دینا اور جس عورت سے متعہ کیا جائے اسے زوجہ نہ سمجھنا غلط ہے۔ کیونکہ آیت میں لفظ ''ازواجکم'' کا اطلاق متعہ والی عورت پر بھی ہوتا ہے، اس کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ احادیث نبویہ ﷺ میں متعہ کو نکاح قرار دیا گیا ہے اور صدر اسلام کے صحابہ اور ان کے بعد تابعین کے بیانات میں بھی متعہ کو نکاح تسلیم کیا گیا ہے، اب رہا یہ سوال یا اعتراض کہ اگر وہ نکاح ہے تو شوہر و بیوی کے درمیان میراث و طلاق کے احکام بھی جاری ہونے چاہئیں جبکہ ایسا نہیں اور ان کے درمیان یہ احکام جاری نہیں ہوتے، تو اس کا جواب عنقریب دیا جائے گا۔

(۲) جہاں تک اس کا دیگر آیاتِ مبارکہ مثلاً میراث کی آیت، طلاق کی آیت اور تعدد ازواج کی آیت کے ذریعے منسوخ ہونے کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اور ان آیتوں کے درمیان ناسخ و منسوخ ہونے کی نسبت نہیں پائی جاتی، بلکہ ان کے درمیان، منطقی نسبتوں کے حوالہ سے عام و خاص (مخصص) یا مطلق و مقید کی نسبت پائی جاتی ہے کیونکہ میراث کی آیت میں تمام ازواج شامل ہوتی ہیں خواہ دائمی عقد والی ہوں یا متعہ والی ہوں اور سنت یعنی ارشاد نبوی ﷺ نے اس عمومیت میں تخصیص پیدا کر دی یعنی ان افراد میں سے بعض کو اس کے دائرہ سے خارج کر دیا جو کہ عقد منقطع (متعہ) ہے، یہی بات آیۂ طلاق اور آیۂ تعدد ازواج میں ہے یعنی احادیث نبویہ ﷺ کے ذریعے متعہ والی عورت کے لئے طلاق ضروری نہیں، اور تعداد میں بھی یہی حکم ہے کہ ایک ہی وقت میں چار عورتوں سے زیادہ سے نکاح نہیں ہو سکتا جبکہ متعہ میں یہ شرط نہیں، جن حضرات نے ان کے درمیان ناسخ و منسوخ کی نسبت قرار دی ہے شاید وہ نسبتوں کے درمیان فرق نہیں کر پائے یعنی عام و خاص اور مطلق و مقید میں اور ناسخ و منسوخ میں فرق کو سمجھ ہی نہ سکے جس کی وجہ سے اصل نسبت کی تطبیق نہ کر سکے، البتہ علم الاصول کے بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ جب کوئی خاص پہلے آئے اور عام بعد میں آئے اور عام، اثبات و نفی کے حوالہ سے خاص سے مختلف بلکہ نقطۂ مقابل میں ہو تو اس صورت میں عام ناسخ اور خاص منسوخ ہوگا، لیکن یہ نظریہ پہلی بات تو یہ کہ قرین صحت نہیں بلکہ ضعیف ہے جیسا کہ علم الاصول کی مربوطہ بحث میں اس کی بابت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اور اسے بے اساس قرار دیا گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ ہمارے موضوع پر اس کا انطباق نہیں ہوتا کیونکہ آیاتِ طلاق (جو کہ عام ہیں) وہ سورۂ بقرہ میں ہیں اور سورۂ مبارکہ مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی پہلی سورت ہے جو کہ سورۂ نساء کہ جس میں آیۂ متعہ (جو کہ خاص ہے) مذکور ہے، سے پہلے نازل ہوئی، اسی طرح تعداد والی آیت سورۂ نساء میں ہے اور وہ آیۂ متعہ سے پہلے ہے، یہی صورتحال آیۂ میراث کی ہے کہ وہ آیۂ متعہ سے پہلے ہے، اور ان آیات کے سیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں تسلسلی حوالہ پایا جاتا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے نازل ہوئی ہیں، بنابرایں خاص یعنی آیۂ متعہ ہر صورت میں عام یعنی آیاتِ طلاق و عدد کے بعد نازل ہوئی۔

(۳) جہاں تک آیۂ عدت کے ذریعے اس کے منسوخ ہونے کا تعلق ہے تو اس کا بطلان وعدم صحت زیادہ واضح ہے کیونکہ عدت کے حکم میں دونوں برابر ہیں یعنی جس طرح دائمی عقد والی عورت کے لئے طلاق کے بعد عدت لازمی ہے اسی طرح عقد منقطع یعنی متعہ میں بھی عدت ہے البتہ ان کی عدت کی مدت میں فرق ہے لہٰذا اسے حکم میں تخصیص کہا جائے گا نسخ نہیں کہا جاسکتا۔

(۴) جہاں تک آیۂ تحریم کے ذریعے اس کے منسوخ ہونے کا تعلق ہے تو اس موضوع میں اس سے استدلال نہایت حیران کن اور نہایت عجیب ہے، کیونکہ پہلی بات یہ ہے کہ حرمت والی آیت اور متعہ والی آیت ایک ہی کلام ہے جس کے اجزاء ایک دوسرے سے پیوستہ اور جڑے ہوئے ہیں، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ آیۂ متعہ کو آیۂ تحریم سے پہلے قرار دیا جائے اور یہ بھی کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی کلام میں ابتدائی جملے، بعد والے جملے کو منسوخ کردیں؟ (کلام میں بلاغت کے اصول اس کے متقاضی ہیں کہ کلام کے صدر و ذیل میں ہم رنگی ہونی چاہیے) دوسری بات یہ کہ آیۂ تحریم میں کسی بھی حوالہ سے غیر دائمی عقد (متعہ) کی ممانعت مذکور نہیں، نہ ہی صریح الفاظ میں اور نہ ہی ظاہر الکلام وظہوری دلالت سے اس کا کوئی ثبوت یا اشارہ نہیں پایا جاتا، آیۂ تحریم میں تو ان عورتوں کی فہرست ذکر کی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے اور اس کے آخری حصہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان عورتوں کے علاوہ دیگر خواتین سے نکاح جائز ہے اور ان سے بھی مباشرت روا ہے جو کنیزیں قرار پائیں (ان پر مالکانہ حق حاصل ہو جائے) اور نکاح متعہ کے بارے میں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ بھی نکاح کی ایک قسم ہے لہٰذا ان آیات کے درمیان یعنی آیۂ تحریم اور آیۂ متعہ کے درمیان مباینت نہیں پائی جاتی کہ جس کی بنیاد پر یہ کہا جائے کہ ان میں سے ایک، دوسری کی ناسخ ہے۔

البتہ ایک بات ممکن ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ کہا جائے کہ آیۂ مبارکہ "وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ" میں حلیت کا حکم حق مہر اور احصان وعدم سفاح (زنا) سے مشروط و مقید ہے جبکہ متعہ میں احصان نہیں (احصان سے مراد دائمی نکاح ہے) یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص متعہ کرے اور اس عورت کے ہوتے ہوئے کسی عورت سے برائی (زنا) کا مرتکب ہو تو اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اسے شادی شدہ زانی مرد نہیں کہا جاتا کہ جس کی سزا سنگساری ہے، اس بناء پر جملہ "وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ" میں متعہ شامل نہیں۔

لیکن یہ بات بھی قرین صحت نہیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہاں "احصان" سے مراد عفت و پاکدامنی ہے شادی شدہ ہونا مراد نہیں کیونکہ اس جملہ میں جس طرح نکاح مقصود ہے اسی طرح خریداری شدہ کنیز کی ملکیت بھی شامل ہے، (مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ میں دونوں شامل ہیں) اور اگر بالفرض ہم تسلیم بھی کرلیں کہ "احصان" سے مراد شادی شدہ ہونا ہے تب بھی اس کی عمومیت میں فرمان نبوی ﷺ کے ذریعے تخصیص ہو چکی ہے اور وہ یہ کہ شادی شدہ مرد کہ جس کے عمل زنا کی سزا سنگساری ہے اس سے مراد اگرچہ دائمی و منقطع دونوں شامل ہیں لیکن حدیث میں متعہ والے شخص کو اس حکم سے مستثنیٰ کردیا گیا

ہے اور اس تخصیص واستثناء کا حکم قرآن مجید میں مذکور نہیں کیونکہ اصل عام حکم یعنی سنگساری کا بیان قرآنِ مجید میں ہوا ہی نہیں کہ جس کی تخصیص ذکر کی جاتی۔

(۵) جہاں تک سنت یعنی فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے منسوخ ہونے کا تعلق ہے تو پہلی بات یہ ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا اور اس طرح کا نسخ بنیادی طور پر ہی باطل و بے اساس ہے کیونکہ وہ ان روایات سے منافی ہے جو تواتر رکھتی ہیں اور جن میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر روایت کی صحت کو قرآن کے ذریعے پرکھا جائے کہ اگر اس کے مطابق ہو تو صحیح ورنہ اسے پھینک دیا جائے اور صرف قرآن کو دیکھا جائے، دوسرا یہ کہ اس سلسلہ میں تفصیلی بیان عنقریب روایات پر ایک نظر کے عنوان سے ہونے والی بحث میں آئے گا کہ اس حوالہ سے روایات کا متن و مضمون کیا ہے؟

مالی عدم استطاعت کی صورت میں قرآنی حکم

○ ''وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ............''

(اور جو شخص تم میں سے مالی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مومنات سے نکاح کرے ....)

لفظ ''طول'' کا معنی دولتمندی اور مالی طور پر مستحکم ہونا ہے، اور یہ دونوں معنی آیۂ مبارکہ سے ہم رنگی و موزونیت رکھتے ہیں۔

لفظ ''محصنات'' سے مراد آزاد خواتین ہیں (کہ جو کنیزیں نہ ہوں) کیونکہ ان کے مقابل میں ''فتیات'' مذکور ہے جس سے مراد کنیزیں ہیں، اسی تقابلی تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ''محصنات'' سے پاکدامن عورتیں مراد نہیں کیونکہ اگر اس سے پاکدامن عورتیں مراد ہوتا تو اس میں آزاد اور کنیزیں دونوں قسم کی عورتیں شامل ہوتیں کہ جس کے بعد ''فتیات'' (کنیزوں) کا نام لینے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ ان کے مقابلے میں ناپاک دامن (بدکار) عورتوں کا نام لیا جاتا، اور لفظ ''محصنات'' سے یہاں شادی شدہ عورتیں بھی مراد نہیں کیونکہ شادی شدہ عورت کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس سے مسلمان خواتین مراد ہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ''محصنات'' کے ساتھ ''مؤمنات'' کا لفظ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

اور جملہ ''فمن ماملکت ایمانکم'' سے مراد وہ عورتیں ہیں جو مؤمنین کی ملکیت میں ہوں نہ کہ خود اس شخص کی ملکیت میں کہ جو ان سے نکاح کرنا چاہتا ہے کیونکہ اپنی کنیز سے نکاح کرنا غلط و غیر شرعی ہے، یہاں ملکیت کی نسبت مؤمنین کی طرف دینے میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ جو شخص کسی کنیز سے عقد کرنا چاہتا ہے وہ انہی مؤمنین میں سے ایک ہے اور دینی حوالہ سے ان سے مختلف نہیں بلکہ ان کی مصلحتیں و فوائد ایک ہی ہوتے ہیں لہٰذا اس نسبت سے انہیں ''ایک شخص'' جیسی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ گویا وہ سب ''ایک'' ہیں۔

آیۂ مبارکہ میں ''محصنات''اور''فتیات'' کے ساتھ''مؤمنات'' کے اضافہ سے اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ غیر مؤمنات اہل کتاب اور مشرکہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں۔ بہر حال اس بحث کی تفصیلات سورۂ مائدہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں پیش کی جائیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

خلاصۂ کلام یہ کہ آیۂ مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص مالی طور پر اس قدر مستحکم نہ ہو کہ آزاد مؤمنات میں سے کسی کے ساتھ شادی کر سکے کیونکہ اس کے حق مہر اور نان ونفقہ کا بوجھ اٹھانا اس کے بس میں نہیں تو اسے چاہیے کہ وہ مومنہ کنیزوں میں سے کسی کے ساتھ شادی کرلے تا کہ آزاد مؤمنہ سے شادی کرنے سے آنے والے نا قابل برداشت بوجھ سے بچ سکے، اور شادی نہ کرنے کے نتیجہ میں اس ممکنہ برائی کے ارتکاب سے بھی محفوظ ہو جائے کہ جس سے اس کی بدبختی کی راہیں کھلتی ہوں۔

بنا برایں آیۂ مبارکہ میں نکاح سے مراد، دائمی نکاح ہے، گویا آیۂ مبارکہ اس مطلب کو بیان کرنا چاہتی ہے کہ اگر تمہارے لئے وہ ممکن نہیں تو یہ کرلو، (آزاد مؤمنہ خاتون سے شادی کرنے کی مالی استعداد نہیں رکھتے تو کسی کنیز سے شادی کرلو تا کہ تم پر اخراجات کا زیادہ بوجھ نہ آئے) اسے عربی زبان میں''تنزل''اور فارسی زبان میں''تنازل'' کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک مؤقف، نظریہ، طرزِ عمل کو چھوڑ کر اس سے نیچے آئیں اور اس سے کمتر راہ وروش اختیار کریں، اس مقام پر اس کی تطبیقی صورت یہ ہے کہ اگر آزاد (غیر کنیز) مؤمنہ عورت سے نکاح کرنے سے حق مہر اور دیگر اخراجات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تو اس سے آسان راستہ اختیار کر کے کسی کنیز سے شادی کرلو کہ اس میں اخراجات کم ہوں گے اور تم پر مالی بوجھ بھی نہیں ہوگا، یہاں تنزلی طرزِ بیان اختیار کر کے نکاح کی صرف ایک قسم یعنی دائمی نکاح ہی کو ملحوظ قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ عرف عام میں اس سے صرف وہی مراد لیا جاتا ہے اور جو شخص نکاح کی بات کرے تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ دائمی نکاح مراد لے رہا ہے کیونکہ اسی سے''گھر'' بنانے، اولاد پیدا کرنے اور نسل کا سلسلہ قائم کرنے کا ہدف پورا ہوتا ہے کہ جو شخص ان امور کا ارادہ رکھتا ہو تو دائمی نکاح ہی اس کا مقصود قرار پاتا ہے جبکہ جائز نکاح کی دوسری قسم یعنی متعہ کا جواز اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی آسانی کا ایک دینی حکم ہے تا کہ اس طرح برائی کا راستہ روکا جائے اور معاشرہ سے اخلاقی برائی کی بیخ کنی ہو۔

بنا برایں زیر نظر آیۂ مبارکہ میں جو طرزِ بیان اختیار کیا گیا ہے اس میں موضوع کے معروف ومشہور معنی اور عمومی اذہان سے مانوس مصداق ہی کو ملحوظ قرار دیا گیا ہے کہ احکام کے بیان میں قرآنی طرزِ عمل ہی ایسا ہے کہ جب کوئی حکم بیان کرنا مقصود ہو تو اس میں وہی معنی ملحوظ ہوتا ہے جو عرف عام میں شہرت رکھتا ہو تا کہ مخاطبین اس کے مرادی معنی کی تطبیق میں کسی دشواری کا شکار نہ ہوں، اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۵

○ ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ''

(پس جو شخص اس مہینہ میں موجود ہو اس پر روزہ رکھنا واجب ہے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے)

اس آیت میں روزہ نہ رکھ سکنے کی وجہ بیماری اور سفر میں ہونا ہی ذکر کیا گیا ہے جبکہ ان کے علاوہ بھی وجوہات ہیں جو روزہ رکھنے میں مانع ہوتی ہیں۔

سورۂ نساء، آیت: ۴۲

○ ''وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا''

(اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی پاخانہ کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو اور پانی تمہیں میسر نہ آئے تو پاک گرد سے تیمم کرلو)

اس میں تیمم کے جواز کی جن وجوہات کو ذکر کیا گیا ہے وہی عام طور پر معمول ہوتی ہیں جبکہ ان کے علاوہ دیگر وجوہات بھی قابل تصور ہیں جو تیمم کے جواز کا سبب بنتی ہیں (مثلاً پانی موجود ہو لیکن اس کا استعمال نقصان دہ ہو، وغیرہ) لیکن آیت میں صرف چار وجوہ واسباب ذکر کئے گئے ہیں کیونکہ عام طور پر یہی امور معمول ہیں، دیگر عوامل بہت کم ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ دیگر آیات الاحکام میں بھی یہی اصول ملحوظ ہے اور دینی دستورات کا بیان اس پر مبنی ہے۔

ایک تحقیقی بحث: مذکورہ بالا مطالب اس نظریہ پر مبنی ہیں کہ آیۂ مبارکہ میں مذکور لفظ ''نکاح'' سے دائمی نکاح مراد لیا جائے، جبکہ یہ نظریہ درست نہیں اور بالفرض کہ اسے درست مانا جائے تب بھی سابقہ آیت میں اس سے ''صرف'' دائمی نکاح مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اس میں تنزل کے ساتھ ساتھ معنی کے حوالہ سے وسعت بھی ملحوظ ہے کہ جس میں دائمی وغیر دائمی دونوں قسم کے نکاح شامل ہوتے ہیں اور جملہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ'' میں غیر دائمی نکاح ملحوظ نہیں جیسا کہ بعض حضرات نے گمان کیا ہے کیونکہ یہ تنزل اور معنی کے حوالہ سے وسعت دونوں جانب (منزل عنه اور منزل الیه) پر محیط ہے کہ جس کا ثبوت اسی آیۂ مبارکہ کے ان الفاظ میں موجود ہے: ''فمن لم یجد منکم طولاً ....'' (پس جو شخص تم میں سے مالی استطاعت نہ رکھتا ہو) اس کے علاوہ یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ آیت کے الفاظ سے نکاح کی دونوں قسموں (دائمی وغیر دائمی) کو مراد و ملحوظ قرار دینے میں کوئی حرج نہیں، اس سلسلہ میں مزید تفصیل آیت کے دیگر جملوں میں پیش ہوگی۔

(مؤلف اس بیان میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جملہ ''اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ'' میں لفظ ''نکاح'' میں دونوں نکاح (دائمی اور متعہ) شامل ہیں لیکن اس کے باوجود یہاں مراد کی تعین کے حوالہ سے صرف دائمی نکاح مقصود ہے، لہٰذا جملہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ'' میں متعہ کا بیان مقصود نہیں کیونکہ اسے جملہ ''وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ ....'' میں بیان کر دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود جملہ ''اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ'' میں دونوں قسم کے نکاح مراد لینے میں بھی کوئی حرج نہیں)۔

ایمان اور طبقاتی امتیازات کا حوالہ!

○ ''وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ''

(اور اللہ تمہارے ایمان کو بہتر جانتا ہے، تم ایک دوسرے ہی سے ہو)

اس جملے میں ایک نہایت اہم اور دلچسپ موضوع کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ تمہارے ایمان کو بہتر جانتا ہے۔ اس سے پہلے نکاح کے حکم میں دو مرتبہ ایمان کی صفت ذکر کی گئی ہے:

(۱) ''اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ''

(۲) ''مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ''

تو چونکہ یہاں ''ایمان'' کو صفتی شرط کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو مؤمنہ ہوں جبکہ ''ایمان'' ایک ایسی قلبی و باطنی صفت ہے جس سے آگاہی اور اس کی حقیقت کا علم ہونا ظاہری اسباب کے ذریعے ممکن نہیں لہٰذا یہ تصور و گمان ہوسکتا تھا کہ اس طرح کی باطنی صفت کا ادراک چونکہ ممکن نہیں تو اسے حکم یعنی جواز نکاح کی شرط کیوں قرار دیا گیا، اس سے لازم آئے گا کہ ایک محال یا دشوار ترین چیز کا حکم دیا گیا ہے اور جواز نکاح کو اس سے وابستہ قرار دے کر مکلفین کو سختی میں مبتلا کر دیا گیا ہے، اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے خداوند عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے مومن بندوں کے ایمان سے بخوبی آگاہ ہے، تو یہ فرمان دراصل ایک طرح سے کنایۃً اس مطلب کو بیان کرتا ہے کہ یہ خدا ہی ہے جو ایمان کی حقیقت سے آگاہی رکھتا ہے ورنہ تم ظاہری اسباب کے مطابق عمل کرنے پر مامور ہو مثلاً کسی کا شہادتین (توحید و رسالت کی گواہی) زبان پر لانا، مسلمانوں کے گروہ میں شامل و شمار ہونا اور عام دینی فرائض ادا کرنا ہی اس کے اہل ایمان ہونے کا ثبوت ہے، گویا یہی چیزیں ایمان کی علامت ہیں اور ''ایمان'' کی شناخت کا معیار باطن نہیں بلکہ ظاہر ہے، باطن صرف خدا جانتا ہے کوئی بندہ نہیں جانتا۔

دوسری طرف آیۂ مبارکہ میں مالی طور پر ان غیر مستحکم مکلفین کو کہ جو شادی کے بھاری اخراجات اور اس کے بعد کی سخت مالی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر ہوں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کنیزوں کے ساتھ شادی کر لیں تو اس سے دلوں میں یہ منفی تاثر پیدا ہوسکتا تھا کہ عملی طور پر کنیزوں کے ساتھ شادی کرنا نقص و خامی ہے اور عام لوگ غلاموں اور کنیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے اور انہیں ایک طرح سے ذلت و پستی کا حامل سمجھیں گے کہ ان کے ساتھ معاشرت و میل جول بالخصوص شادی کرنے کو اپنے لئے عیب قرار دیں گے جبکہ شادی کرنا ایک حوالہ سے زندگی کی شراکت اور گوشت پوست وخون کا امتزاج ہے لہٰذا اس تصور اور منفی خیال کو سرے ہی سے ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ ذکر فرمائے: ''بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ'' (تمہارے بعض، بعض سے ہیں۔ تم ایک دوسرے سے ہو) ان الفاظ سے ایک کھلی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

جس سے مذکورہ بالا غلط خیال اور منفی سوچ خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور یہ نا قابل انکار حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ غلام و کنیز بھی اسی طرح انسان ہیں جس طرح آزاد افراد انسان ہیں اور انسان ہونے کے حوالہ سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا بلکہ دونوں تمام انسانی صفات سے بہرہ ور ہیں اور ان کے درمیان صرف ان معدودے چند احکام کے حوالہ سے فرق ہے جو انسانی معاشرہ کی سعادت کے پیش نظر مقرر کئے گئے ہیں اور اس طرح کے فرق کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں، اللہ کے نزدیک جو چیز عزت و شرف کا حقیقی معیار ہے وہ صرف تقویٰ ہے، لہٰذا اہل ایمان حضرات کو اس طرح بے بنیاد خیالات و وہمیات پر کوئی توجہ نہیں دینی چاہیے کہ جو انہیں ان کی سعادت و فلاح کے ضامن حقائق و معارف سے دور کر دیں کیونکہ سیدھی راہ سے ذرا بھر الگ ہونا اگرچہ شروع میں معمولی و ناچیز لگتا ہے لیکن رفتہ رفتہ انسان کو ہدایت کے راستہ سے دور کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اسے ہلاکت و تباہی کے گہرے کھڈ میں ڈال دیتا ہے۔

اس بیان سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ آیۂ مبارکہ کی ابتداء میں جو ترتیب قرار دی گئی ہے اور حکم کو مشروط اور تنزلی صورت میں ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں: ''وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' تو اس میں اظہار و بیان کے عام رائج انداز کو ملحوظ و معمول قرار دیا گیا ہے، اس میں اہل ایمان کو اسی ترتیب کی لازمی عملداری پر مامور نہیں کیا گیا کہ جو لوگ آزاد خاتون کے ساتھ شادی کرنے کی مالی استطاعت نہیں رکھتے وہ کسی کنیز سے شادی کرلیں، بلکہ لوگوں میں رائج معمول کے سلسلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ اگر وہ آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تو وہ کسی طرح سے مالی پریشانی کا شکار ہونے کی بجائے کنیزوں سے شادی کر سکتے ہیں کیونکہ وہ سب ہی انسان ہونے کے ناطے یکساں ہیں اور ایک ہی سلسلۂ وجودی کی طرف ان کی بازگشت ہوتی ہے ''بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ''۔

مذکورہ بالا مطالب سے اس مفسر کے قول کا بطلان بھی واضح ہو گیا ہے جس نے آیت کے ذیلی جملہ ''وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ'' کی بابت کہا ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر تم صبر کرلو اور شادی ہی نہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے، یعنی کنیزوں سے شادی کرنا اگرچہ وہ پاکدامن ہی کیوں نہ ہوں ذلت، اہانت و چھوٹا پن ہے لہٰذا ان سے شادی نہ کرنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے، یہ قول اس لئے غلط و نادرست ہے کہ جملہ ''بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ'' قطعاً اس کی نفی کرتا ہے۔

بعض اہم دستورات کا بیان

○ ''فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ''

(پس تم ان سے ان کے اہل کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو اور انہیں ان کے حق مہر خوشی خوشی دے دو، وہ پاکدامن ہوں بدکار نہ ہوں اور نہ ہی چھپ کر دوستیاں کرنے والیاں)

یہاں لفظ ''مُحْصَنٰتٍ'' سے مراد عفیف و پاکدامن عورتیں ہیں، کیونکہ شادی شدہ عورتوں سے نکاح نہیں ہوسکتا (اس لفظ سے یہاں شادی شدہ عورتیں مراد لینا درست نہیں)۔

لفظ ''مُسٰفِحٰتٍ'' اور ''مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ'' کے تقابلی حوالہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے معانی میں فرق ہے اور اسی وجہ سے کسی نے کہا ہے کہ ''سفاح'' سے مراد کھلے عام زنا اور ''دوست بنانے'' سے مراد چھپ کر زنا کرنا ہے، اور عربوں کی تاریخ گواہ ہے کہ ان کے ہاں ''دوست بنانا'' عام تھا یہاں تک کہ آزاد عورتوں اور کنیزوں میں بھی یہ عادت رائج تھی اور اس حوالہ سے کسی کو مورد مذمت وملامت قرار نہیں دیا جاتا تھا البتہ آزاد عورت کے ساتھ کھلم کھلا زنا کرنے کو مذموم سمجھا جاتا تھا۔

جملہ ''فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ'' سے مراد لوگوں کو کنیزوں سے ان کے مالکوں کی اجازت کے ساتھ شادی کرنے کی راہ دکھانا ہے کیونکہ ان کے امور ان کے مالکوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور وہی ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کے مجاز ہوتے ہیں ان کے علاوہ کسی کو ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ اس جملے میں کنیزوں کے مالکوں کو لفظ ''اھل'' سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ سابقہ جملہ ''بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ'' کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی عملداری کا ایک نمونہ ہے کیونکہ کنیز بھی اپنے مالک کے گھر والوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کا مالک ہی اس کا مختار ہوتا ہے کہ جسے ''اھل'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور جملہ ''وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' سے مراد یہ ہے کہ ان کا حق مہر پورا ادا کیا جائے اور انہیں دینے سے مراد ان کے مالکوں کو دینا ہے، اور لفظ ''بِالْمَعْرُوْفِ'' ذکر کر کے یہ نصیحت کی گئی ہے کہ اس کی مقدار کم نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی ادائیگی میں پس و پیش سے کام لیا جائے کہ جس سے اذیت و آزار کا پہلو نکلتا ہو۔

برائی کی سزا کا حکم

○ ''فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ''

(پس جب وہ پاکدامن ہوں، لیکن اگر وہ بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان کی سزا محصنات کی سزا سے آدھی ہے)

لفظ ''اُحْصِنَّ'' میں ہمزہ پر پیش کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی صیغہ مفعول کی صورت میں اور زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی فعل معلوم کی صورت میں، ہماری نظر میں دوسری قرائت زیادہ بہتر ہے۔

آیہ مبارکہ میں ''اِحصان'' سے مراد اگر ان کا شادی شدہ ہونا ہو تو اسے حکم کی شرط قرار دینا اس حوالہ سے ہوگا کہ برائی کے ارتکاب سے پہلے ان کی شادی ہوئی ہو، کیونکہ کنیز اگر زنا کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا (حد) آزاد عورت کی سزا

سے آدھی ہے خواہ شادی شدہ ہو یا نہ ہو، اور اس کا شادی شدہ ہونا اس کی حدّ (سزا) میں اضافہ کا باعث نہ ہوگا، (یہ حکم اس حوالہ سے ہے کہ "احصن" کے ہمزہ کو مضموم یعنی پیش کے ساتھ پڑھا جائے)۔

اگر یہاں "احصان" سے مراد ان کا دائرہ اسلام میں آکر خود کو محفوظ کر لینا ہو۔ جیسا کہ کہا گیا ہے اور ہمزہ پر زبر کے ساتھ اس کی قرائت سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ تو اس کا معنیٰ واضح ہو جاتا ہے اور کسی اضافی مطلب کی مؤید کے طور پر ضرورت باقی نہیں رہتی، اور آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر کوئی کنیز زنا کی مرتکب ہو تو اس پر آزاد عورت کی حد سے آدھی حدّ جاری ہوگی خواہ وہ شادی شدہ ہو یا نہ ہو۔

یہاں حدّ (سزا) سے رجم یعنی سنگسار کرنا مراد نہیں بلکہ کوڑے مارنا مراد ہے کیونکہ سنگساری کی سزا کا آدھا ہونا ممکن نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت میں لفظ "محصنات" سے مراد آزاد خواتین ہیں نہ کہ وہ شادی شدہ خواتین جن کا تذکرہ ابتداء آیت میں ہوا، اور "الْمُحْصَنٰتِ" پر الف ولام، عہد کا ہے یعنی اس سے انہی محصنات کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے جو ابتداء آیت میں مذکور ہیں نہ کہ وہ "محصنات" جو ماقبل آیت میں ذکر ہوئی ہیں کیونکہ ماقبل آیت میں جن "محصنات" کا تذکرہ فرمایا ہے ان سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں کہ جن کے بارے میں کہا گیا کہ ان سے شادی کرنا حرام ہے جبکہ زیر بحث آیت میں "محصنات" سے مراد آزاد عورتیں ہیں (جو کنیزیں نہ ہوں) کہ جن کے حوالہ سے کہا گیا کہ اگر ان (آزاد عورتوں) سے شادی کرنے کی مالی استعداد نہ رکھتے ہو تو کنیزوں سے شادی کرلو، اس بناء پر آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر مؤمنہ کنیزیں برائی یعنی زنا کی مرتکب ہوں تو ان پر غیر شادی شدہ آزاد مومنات کی حدّ کا نصف جاری ہوگا یعنی پچاس کوڑے۔

ایک امکانی پہلو

لفظ "احصان" کے حوالہ سے یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں اس سے مراد پاکدامنی والا احصان ہو، اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس دور میں کنیزوں کو آزادیٔ عمل حاصل نہ تھی کہ جو کام ان کا دل چاہے وہ انجام دے سکیں کیونکہ وہ اپنے مالکوں کے تابع فرمان ہوتی تھیں، خاص طور پر فحشاء وزنا کے ارتکاب میں ان کے مالک ہی انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتے تھے یعنی اگر کوئی کنیز زنا کا ارتکاب کرتی تو دراصل وہ اس کے مالک کی طرف سے اس پر جبراً حکم ہوتا تھا کہ وہ ان کی جسم فروشی کے ذریعے مال کماتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں صریح قرآنی حکم موجود ہے جس سے ان کنیزوں کو مالکوں کی طرف سے برائی پر مجبور کیا جاتا تھا جبکہ وہ خود ایسا نہ کرنا چاہتی تھیں، آیت کے الفاظ ملاحظہ ہوں کہ جن میں اس طرزِ عمل اور مالکوں کو کنیزوں کی جسم فروشی سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

سورۂ نور، آیت: ۳۳

○ ''وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا''

(اورتم اپنی کنیزوں کو برائی پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہیں)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اگر کوئی کنیز زنا کی عادی ہوتی تھی اور اسے ذریعہ معاش بناتی تھی تو وہ اس کی اپنی مرضی سے نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کے مالک کے حکم پر ہوتا تھا اور اسے اس سلسلہ میں انکار کا کوئی حق ہی حاصل نہ ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی مؤمنہ کنیز کو اس کا مالک اس برائی پر مجبور نہ کرتا تو وہ خود اس کا ارتکاب نہ کرتی تھی بلکہ تقوائے اسلامی اور عفت ایمان پر قائم رہتے ہوئے اپنا دامن داغدار نہ ہونے دیتی، لیکن اس کے باوجود اگر وہ زنا کی مرتکب ہوتی تو اس کی سزا (حدّ) آزاد عورت کی سزا سے آدھی ہوتی، چنانچہ اس مطلب کا بیان ان الفاظ میں ہوا: ''فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ.....الخ'' (پس اگر وہ اسلام لانے کی وجہ سے اپنے آپ کو پاکدامن رکھے لیکن اس کے باوجود زنا کی مرتکب ہو جائے تو اس پر آزاد عورت کی حدّ کا نصف جاری ہوگا)۔

ایک اصولی بحث

آیۂ مبارکہ میں ذکر ہوا ہے کہ اگر وہ پاکدامنی اختیار کریں اور پھر بھی اگر وہ زنا کی مرتکب ہوں تو ان پر آزاد عورت کی حدّ کا آدھا یعنی پچاس کوڑے جاری ہوں گے، تو اس میں شرط یہ رکھی گئی ہے کہ اگر وہ پاکدامنی اختیار کریں، تو بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ اگر وہ خود پاکدامنی اختیار نہ کریں تو ان کے مالک انہیں برائی پر مجبور کر سکتے ہیں، (اسے علم اصول کی اصطلاح میں مفہوم شرط کہا جاتا ہے جس کا حجت ہونا مسلم ہے) لیکن اس موضوع کی بابت جو مطالب ذکر ہو چکے ہیں ان کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں آیۂ مبارکہ میں اس طرح کا مفہوم ہی نہیں پایا جاتا کہ اس کی حجت ہونے یا نہ ہونے کی بات کی جائے کیونکہ اگر کنیزیں خود پاکدامنی اختیار بھی نہ کریں تب بھی اپنے مالکوں کی طرف سے ایسا کرنے پر مجبور کی جاتی تھیں اور ان کے احکامات پر عمل کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارۂ کار ہی باقی نہ ہوتا تھا، لہٰذا زیر بحث آیت میں مفہوم ہی نہیں بنتا کہ جس کی حجیت وعدم حجیت پر بحث کی جائے، اور یہی حال سورۂ نور کی آیت ۳۳ کا ہے کہ اس میں بھی مفہوم نہیں بنتا کہ جس میں یوں ارشاد ہوا: ''وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا'' (تم اپنی کنیزوں کو برائی کے ارتکاب پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامنی اختیار کرنا چاہتی ہوں) تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر وہ خود پاکدامنی اختیار نہ کرنا چاہیں اور اپنی رضا ورغبت کے ساتھ برائی کا ارتکاب کریں تو اس صورت میں انہیں مجبور کرنے کا موضوع ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے (مزید غور کریں)۔

گناہ کے ارتکاب کا اندیشہ

○ ''ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ''

(یہ نصیحت تم میں سے اس شخص کے لئے ہے جسے گناہ کے ارتکاب کا اندیشہ لاحق ہو)

لفظ ''عنت'' کا معنی جہد و سختی، شدت و ہلاکت ہے، یہاں گویا اس سے مراد زنا ہے جس کا ارتکاب غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے سختی و دشواری میں مبتلا ہونے کے نتیجہ میں ہوتا ہے کہ انسان جنسی شہوت کے دباؤ میں اس کی طرف بڑھتا ہے اور اسی میں انسان کی ہلاکت و تباہی ہوتی ہے، اور چونکہ زنا میں یہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں لہٰذا اسے ''عنت'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور ضمیر ''ذٰلِكَ'' کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے کنیزوں کے ساتھ شادی کرنے کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جن کا تذکرہ اس آیت میں لفظ ''فتیات'' کے ساتھ ہوا ہے، بنا برایں جملہ ''اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ'' کا معنی یہ ہوگا: ''ان تصبروا عن نکاح الاماء او عن الزنا خیر لکم'' (اگر تم کنیزوں سے شادی کرنے یا زنا کے ارتکاب سے صبر کرلو) یعنی باز رہو اور اپنے آپ کو روکے رکھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے کنیزوں سے شادی کرنے کے واجب ہونے یا مطلق نکاح (خواہ کنیزوں سے ہو یا آزاد عورتوں سے) کے واجب ہونے کی طرف اشارہ ہوا ہو کہ اس سے آیت کے سیاق کو ان دونوں میں سے کسی ایک کی دلیل قرار دیا جاسکے، واللہ اعلم

بہرحال صبر یعنی اپنے آپ کو روک لینا دونوں صورتوں میں بہتر ہے اور وہ اس طرح کہ اگر اس سے مراد کنیزوں سے شادی کرنے سے اپنے آپ کو روکنا ہو تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس میں ان کے مالکوں کے خود پر اور ان کی اولاد پر حقوق ہیں کہ جو فقہ میں تفصیل سے مذکور ہیں، ظاہر ہے کہ کنیزوں سے شادی کرنے والوں پر ان حقوق کی پاسداری لازم ہوگی کہ جس کے تناظر میں کنیزوں سے شادی کرنے سے اپنے آپ کو روکنا بہتر قرار دیا گیا ہے، اور اگر صبر یعنی اپنے آپ کو روکنے سے مراد زنا کے ارتکاب سے روکنا ہو تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس سے تہذیب نفس ہوتی ہے اور انسان کے وجود میں تقویٰ کی پاکیزہ صفت راسخ ہوجاتی ہے کیونکہ جب کوئی شخص اپنی نفسانی خواہش کے برخلاف پختہ ارادہ کے ساتھ زنا کے ارتکاب سے دوری اختیار کرتا ہے خواہ شادی کی ہو یا نہ کی ہو تو اس کی لوحِ نفس پر تقویٰ کی باطنی صفت ثبت ہوجاتی ہے۔ اور ''وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'' خداوند عالم معاف کردینے والا، نہایت مہربان ہے، وہ اپنی مغفرت و بخشش کے ساتھ اپنے متقی بندوں کے نفوس کو برائی کے ناپاک آثار سے پاک کردیتا ہے اور انہیں اپنی رحمت سے سرفراز فرماتا ہے۔

احکام کے بیان کا حوالہ

○ ''یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ''
(اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے واضح کرے)

اس جملے میں سابقہ تین آیتوں میں مذکور احکام کی غرض و غایت اور ان پر عمل کرنے کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد کی طرف اشارہ و وضاحت ہوئی ہے، لہٰذا ''یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں اپنے دین کے احکام و دستورات میں پائی جانے والی ان حکمتوں و فوائد کو بیان کرے جو تمہاری دنیا و آخرت کو سنوارتی ہیں اور ان معارف و اسرار کو واضح کرے جو ان احکام کے قرار دینے میں موجود ہیں، بنابرایں فعل مضارع ''یبین'' کا معمول (وہ چیز جس کا بیان مقصود ہے) لفظوں میں ذکر نہیں کیا گیا تا کہ اس کے جلیل القدر اور عظیم الشان ہونے سے آگاہی دلائی جاسکے، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں جملے: ''یبین لکم'' اور ''یَھۡدِیَکُمۡ'' کا معمول، جملہ ''سُنَنَ الَّذِیۡنَ'' ہو اور دونوں جملوں میں اس حوالہ سے کوئی واضح فیصلہ نہ ہوسکتا ہو۔

بیانِ احکام کی حکمتوں کا حوالہ

○ ''وَیَھۡدِیَکُمۡ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ''
(اور تمہیں ان لوگوں کے طرزِ عمل کی ہدایت کرے جو تم سے پہلے تھے)

اس جملہ میں مقصود یہ ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ تمہیں گذشتہ لوگوں کے طرز ہائے زندگی سے آگاہی دلائے، گذشتہ لوگوں سے مراد انبیاء اور نیک و صالح امتیں و اقوام ہیں کہ جنہوں نے دنیاوی زندگی کو اللہ کی رضا و خوشنودی کے مطابق گزارا اور اس کے نتیجہ میں دنیا و آخرت کی سعادت و خوش بختی سے بہرہ ور ہوئے۔

یہاں ان کے طرز ہائے زندگی (السنن) سے مراد ان کے بعض اعمال ہیں نہ کہ تمام اعمال اور ان کی تمام خصوصیات و تفصیلات، لہٰذا کوئی شخص یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ ان کے بعض اعمال اور طرزِ زندگی کو انہی آیات کے ذریعے منسوخ کیا گیا مثلاً بہن بھائیوں کی شادیاں، دو بہنوں کو یکجا عقد نکاح میں رکھنا، کہ سابقہ امتوں میں یہ اعمال رائج تھے، اور

روایات میں ان کے وقوع پذیر ہونے کے حوالے بھی پائے جاتے ہیں۔

جملہ ''وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' (اور تمہیں گذشتہ لوگوں کے طرز زندگی سے آگاہی دلائے) کی بابت ایک قول یہ بھی ہے کہ اس میں سابقہ تمام امتوں کے طرز ہائے زندگی سے آگاہی دلانا مراد ہے خواہ وہ حق پر تھیں یا باطل پر، بنا برایں آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں سابقہ تمام امتوں کے طریقہ ہائے زندگی کے بارے میں آگاہی دلائیں خواہ وہ امتیں حق پر تھیں یا باطل پر، تاکہ تم ان کے حالات سے بخوبی مطلع ہو جاؤ اور حق والوں کے طرز ہائے زندگی کو اپنالو اور باطل طرز ہائے زندگی کو چھوڑ دو۔

اگرچہ اس معنی میں بظاہر کوئی حرج نہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ''ہدایت'' کا یہ معنی مراد نہیں بلکہ جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں ایصال الی الحق یا ارادۂ حق مراد ہے مثلاً:

سورۂ قصص، آیت: ۵۶

- ''اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ''

(آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے)۔

سورۂ الدھر، آیت: ۳

- ''اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝''

(بے شک ہم نے اسے راستہ کی ہدایت کر دی ہے، یا وہ شکر گزار ہو یا کفران کرے)

لہٰذا مذکورہ بالا معنی کے حوالہ سے قرآنی بیانات اس حقیقت کی نشاندھی کرتے ہیں کہ جہاں اس طرح کا معنی مقصود ہو وہاں 'تبیین'' اور قصص وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، لفظ ''ہدایت'' استعمال نہیں کیا جاتا۔

البتہ یہاں ایک مطلب قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر جملہ: ''لِيُبَيِّنَ لَكُمْ'' اور جملہ ''وَ يَهْدِيَكُمْ'' دونوں کو جملہ ''سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' اور جملہ ''يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ'' کا عامل اور ان دوسے مربوط قرار دیا جائے اور پھر آیت کا معنی یوں کیا جائے کہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے گذشتہ لوگوں کے طرز ہائے عمل کو بیان و واضح کرے اور ان طریقہ ہائے زندگی میں سے جو چیز حق ہے تمہیں اس سے آگاہی دلائے اور ان طرزِ ہائے عمل میں سے جو باطل و نادرست تھے کہ جن میں تم گھر گئے تھے ان کی بابت تمہیں معاف کر کے تمہاری توبہ قبول کرلے، تو شاید مذکورہ بالا قول کی تاویل ہو سکے اور اسے قرین صحت قرار دیا جا سکے کیونکہ سابقہ آیات میں گذشتہ لوگوں کے طرز ہائے زندگی اور ان میں سے صحیح و غلط کو بیان کیا جا چکا ہے اور ان کے باطل طرز ہائے عمل سے توبہ کرنے کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے۔

توبہ کا بیان

○ ''وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ''

(اور وہ تمہاری توبہ قبول کرے (تمہیں معاف کردے) اور اللہ دانا و حکمت والا ہے)۔

یہاں دوبارہ توبہ کا تذکرہ ہوا ہے، گویا اس سے اس مطلب کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ جملہ ''وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا'' سابقہ آیت کے تین جملوں میں سے صرف آخری جملہ کے تقابل میں ہے کیونکہ اگر جملہ ''وَيُرِيدُ الَّذِينَ........الخ'' دوبارہ ذکر نہ کیا جاتا بلکہ سابقہ آیت کے ساتھ مربوط قرار دیا جاتا تو یہ کہنا درست ہوتا کہ اس کا تقابل سابقہ آیت کے تمام فقروں سے ہے اور پھر معنیٰ آیت قطعی طور پر بے فائدہ ہو جاتا۔

یعنی جملہ ''وَاللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ'' کا دوبارہ یہاں ذکر کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ جملہ ''وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ'' کی بازگشت آیت کے تمام جملوں کی طرف نہیں بلکہ صرف آخری جملے کی طرف ہے۔

جملہ ''أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا'' میں ''میل عظیم'' سے ان آیات مبارکہ میں ذکر کئے گئے احکام کی عملی بے حرمتی مراد ہے، یعنی خواہشات کے پیروکار لوگ چاہتے ہیں کہ تم احکام الٰہی کی حدود کو پھلانگو اور جو عورتیں تم پر حرام کی گئی ہیں ان کے ساتھ شادیاں کرو اور نسب وسبب کے ذریعے قائم ہونے والے رشتوں کو بے معنی قرار دو، زنا کو جائز سمجھو اور اللہ تعالیٰ نے نکاح و ازدواجی تعلق کی جو مضبوط سنت قائم کی ہے اسے اختیار نہ کرو۔

انسان کی تخلیقی کمزوری اور خدائے مہربان

○ ''يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا''

(اللہ چاہتا ہے کہ تم پر نرمی و آسانی کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے)

انسان کے کمزور پیدا کئے جانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے وجود میں ایسی شہوانی قوتیں قرار دی ہیں جو ہمیشہ اسے اپنی چاہتوں کی تکمیل کی طرف کھینچتی ہیں اور اسے ان سے آلودہ ہونے پر برانگیختہ کرتی رہتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے انسان پر احسان فرمایا کہ اس کے لئے ان شہوانی قوتوں کو مہار کرنے کی راہ بنا دی اور وہ یوں کہ نکاح کا قانون بنا کر انسان کی

نفسانی جنسی خواہشات کو درست سمت میں قرار دینے اور اس حوالہ سے ہر طرح کی دشواری کا سدِّ باب کرنے کا سامان کر دیا چنانچہ ارشاد ہوا ''وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِکُمْ'' (اور اس کے علاوہ تمہارے لئے حلال قرار دیا گیا ہے) کہ اس میں نکاح اور کنیز کی ملکیت ملحوظ و مقصود ہیں، اس طرح خداوند عالم نے انسان کو گذشتہ زمانوں کے لوگوں کے طرز ہائے عمل سے آگاہی دلائی اور پھر اس کے لئے جنسی شہوانی قوتوں کو قابو میں رکھنے کے لئے آسان راستہ کھول دیا یعنی نکاح متعہ کا قانون بنا دیا کیونکہ اس طرح وہ دائمی نکاح میں پیش آنے والی مالی مشکلات و دیگر بھاری ذمہ داریوں سے بچ سکتا ہے کہ جو حق مہر اور نان و نفقہ وغیرہ کی صورت میں اس پر عائد ہوتی ہیں۔

خداوند عالم کی طرف سے تخفیف اور آسانی پیدا کرنے کے حوالہ سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے ضرورت کے وقت کنیزوں سے نکاح کرنے کا جواز مراد ہے، کہ جنسی قوتوں پر قابو پانے اور ان کی شدت سے مغلوب ہو کر کسی ناجائز عمل کے ارتکاب سے بچنے کا آسان ترین راستہ یہی ہے۔

لیکن اس قول کی عدم صحت کے لئے یہی کافی ہے کہ ضرورت کے وقت کنیزوں سے نکاح کرنا لوگوں کے درمیان قبل از اسلام بھی کراہت و ناپسندیدگی اور مذموم سمجھے جانے کے باوجود رائج و عام تھا، اور ان آیات مبارکہ میں جو نئی بات کی گئی ہے وہ یہ کہ اس کراہت و مذموم ہونے کی نفی اس بیان کے ساتھ کی گئی ہے کہ کنیز بھی آزاد عورت کی طرح انسان ہے اس حوالہ سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں اور صرف کنیز ہونا مصاحبت و معاشرت کی اہلیت کو ختم نہیں کر سکتا۔

ان آیات میں ضمیر ''کم'' سے بظاہر اسی امت کے مؤمنین مراد ہیں کہ جن سے خطاب کیا گیا ہے اور ''یُخَفِّفَ'' میں تخفیف و آسانی پیدا کرنے سے مراد بھی اسی امت پر آسانی ہے، آسانی و تخفیف سے مراد وہی معنی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ بنا بر ایں آسانی و تخفیف کی جو وجہ ذکر کی گئی ہے یعنی ''وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا'' (اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے) تو یہ بات تمام امتوں میں پائی جاتی ہے یعنی تمام افراد بنی نوع بشر میں قدر مشترک ہے خواہ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو یا وہ امتیں جو اس سے پہلے تھیں، جبکہ اس میں صرف امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں تخفیف و آسانی پیدا کرنے کی عام وجہ بیان کرنے اور سابقہ امتوں میں ایسا ہونے میں مانع امور کے بارے میں سکوت اختیار کرنے کا انداز اپنایا گیا ہے تو گویا یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے آسانی پیدا کی کیونکہ نوع انسانی میں تخلیقی طور پر جو کمزوری پائی جاتی ہے وہ تخفیف و آسانی کی متقاضی ہے بشرطیکہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ و مانع نہ ہو لیکن دیگر امتوں میں چونکہ تخفیف و آسانی پیدا کرنے کے موانع موجود تھے لہٰذا وہ اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے یہاں تک کہ تمہاری باری آگئی اور تم توبۂ الٰہی کے مستحق قرار پائے تو خدا کی رحمت تم پر سایہ فگن ہوگئی اور اس کے آثار تم میں ظہور پذیر ہوگئے لہٰذا اب اس سبب یعنی تخلیقی کمزوری کی لحاظ داری کا وقت آگیا اور تمہارے بارے میں تخفیف و آسانی کا خدائی حکم صادر ہوگیا جبکہ سابقہ اُمتیں اس سے محروم تھیں جیسا کہ قرآن مجید میں اس حوالہ سے مذکور ہے:

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۸٦

- ''رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا.........''

(اے ہمارے پروردگار، تو ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلی امتوں پر ڈالا تھا)۔

سورۂ حج، آیت: ۷۸

- ''هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ.........''

(اس نے تمہیں چن لیا اور تم پر دین میں کوئی سختی قرار نہیں دی)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخفیف و آسانی پیدا کرنے کی جو عمومی وجہ (انسان کی تخلیقی کمزوری) بیان کی گئی ہے اس میں اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت میں نوع انسانی کی تمام نعمتیں مکمل کر دیں اور ان نعمتوں کے آثار بھی ظاہر ہو گئے۔

روایات پر ایک نظر

رضاعی رشتہ کا حکم

''عن النبی (ص): ان الله حرم من الرضاعة ما حرم من النسب وعنه (ص): الرضاع لحمة كلحمة النسب''

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، خداوند عالم نے رضاعت سے وہی کچھ حرام قرار دیا ہے جو نسب سے حرام قرار دیا، اور انہی حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: رضاعت، نسب ہی کی طرح قرابتداری و خونی رشتہ ہے) (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۳۵)

رضاعت کی تعداد

تفسیر ''درمنثور'' ہی میں ہے کہ مالک اور عبدالرزاق نے عائشہ سے روایت کی ہے کہ قرآن مجید میں رضاعت میں دس بار دودھ پلائی ملحوظ و مقرر تھی پھر ان میں سے پانچ دفعہ کا حکم آنے سے وہ منسوخ ہو گئیں، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت ہوئی تو وہ اسی طرح قرآن مجید میں پڑھی جاتی تھیں۔

مؤلفؒ: اسی کتاب میں اسی روایت کے ہم معنی دیگر روایات بھی مختلف اسناد سے ذکر ہوئی ہیں لیکن وہ سب تحریف پر مبنی ہونے اور کتاب اللہ سے متصادم ومخالف ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول اور مسترد کی جاتی ہیں۔

نکاح کی حرمت کا تقابلی حکم

اسی کتاب یعنی تفسیر ''درمنثور'' میں ایک روایت ذکر کی گئی ہے کہ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور بیہقی نے اپنے کتاب ''السنن'' میں دو اسناد سے یعنی عمرو بن شعیب کے حوالہ سے کہ اس نے اپنے والد اور اپنے دادا کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت رسول خداﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اذا نکح الرجل المرأة فلا یحل له ان یتزوج امها دخل بالابنة اولم یدخل، واذا تزوج الام فلم یدخل بها ثم طلقها فان شاء تزوج الابنة'' (جب کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرے تو اس کی ماں سے شادی کرنا حرام ہے خواہ اس کے ساتھ مباشرت وہمبستری کی ہو یا نہ کی ہو، اور اگر ماں سے شادی کرے مگر مباشرت سے پہلے اسے طلاق دے دے تو اس کی بیٹی سے شادی کرسکتا ہے (تفسیر ''درمنثور'' ج ۲ ص ۱۳۵)

مذکورہ بالا مطلب شیعہ اسناد سے آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہے اور وہی ان کا مذہب وعقیدہ ہے جو کہ کتاب اللہ ہی سے مستفاد ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں پہلے بیان ہو چکا ہے، البتہ اہل سنت کے بعض اسناد سے ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا: ''ان ام الزوجة لا باس بنکاحها قبل الدخول بالبنت، وانها بمنزلة الربیبة، وان الربیبة اذا لم تکن فی حجر زوجها لم تحرم علیه نکاحها'' (بیوی کی ماں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کی بیٹی سے مباشرت نہ ہوئی ہو، اور وہ ربیبہ (پروردہ) کی طرح ہے، اور اگر ربیبہ اپنی ماں کے شوہر کی آغوش میں نہ ہو تو اس سے شادی کرنا حرام نہیں) لیکن اس طرح کی باتیں مذہب آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے منافی ہیں اور جو روایات شیعہ اسناد سے آئمہ معصومینؑ سے منقول ہیں وہ ان مطالب کو رد کرتی ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کا فرمان

کتاب فروع کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے منصور بن حازم کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص ان کی خدمت میں آیا اور یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص نے کسی عورت سے شادی کی اور اس سے مباشرت نہ ہوئی تھی کہ وہ فوت ہوگئی، کیا اس کی ماں سے شادی کرسکتا ہے؟ امامؑ نے جواب دیا کہ ہم میں سے ایک شخص نے ایسا ہی کیا اور اس کوئی حرج نہیں منصور نے کہا کہ میں نے عرض کی کہ میں آپ پر قربان

جاؤں، شیعہ تو صرف امیر المومنین علی علیہ السلام کے فیصلوں پر فخر کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں امیر المومنینؑ نے اس شمخی عورت کے بارے میں کہ جس کی بابت ابن مسعود نے فتویٰ دیا تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اور پھر وہ شخص امام علیؑ کی خدمت میں آیا اور آپؑ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا: اس نے ایسی بات کہاں سے لی ہے؟ اس شخص نے کہا کہ انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے اسے لیا ہے: ''وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ '' (اور تمہاری وہ پروردہ بچیاں کہ جو تمہاری ان بیویوں کی گودوں میں پلی ہوں جن سے تم نے مباشرت کی ہو، لیکن اگر ابھی تم نے ان سے مباشرت نہ کی ہو تو ان سے شادی کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں) یہ سن کر امام علیؑ نے ارشاد فرمایا: وہ استثنائی مسئلہ ہے، جبکہ یہ مرسلہ ہے کہ جس میں کوئی شرط نہیں قرار دی گئی، یعنی ربیبہ سے شادی کا حرام ہونا اس کی ماں سے مباشرت ہونے پر موقوف ہے کہ اگر اس سے مباشرت نہ ہوئی ہو تو ربیبہ سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ بیوی کی ماں سے شادی کرنا مطلقاً حرام ہے خواہ اس کی بیٹی سے مباشرت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو، تب امام جعفر صادقؑ نے اس شخص سے فرمایا کہ کیا تو نے سنا نہیں ہے کہ یہ (منصور) امام علیؑ سے کیا روایت بیان کرتا ہے؟ منصور نے کہا کہ جب میں وہاں سے اٹھا تو مجھے سخت ندامت ہوئی اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں نے یہ کیا گستاخی کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا کہ ہم میں سے ایک نے ایسا عمل کیا اور اس میں اس نے کوئی حرج نہ پایا اور میں نے کہا کہ امام علیؑ نے تو یوں فیصلہ کیا تھا، میرا اس طرح بات کرنا صحیح نہ تھا کیونکہ جب امامؑ نے مسئلہ واضح کر دیا تھا تو مجھے امام علیؑ کے فیصلے کا حوالہ دینا نامناسب تھا، چنانچہ بعد میں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے عرض کیا کہ مولا! میں آپ پر قربان جاؤں، اس دن اس شخص کے سوال پر میں نے جو کچھ کہا تھا وہ میری غلطی تھی اور مجھ سے لغزش سرزد ہوئی، اس کی بابت آپؑ کا فرمان کیا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: اے بزرگوار! ایک طرف تو آپ مجھے بتاتے ہیں کہ امام علیؑ نے اس مسئلہ میں یوں فیصلہ کیا اور پھر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کی رائے کیا ہے؟ (فروع کافی جلد ۵ صفحہ ۴۲۲)

مذکورہ بالا روایت کے تناظر میں اب امام علیؑ کے فیصلہ کی کہانی سنیں کہ آپؑ نے ابن مسعود کے فتویٰ کی بابت کیا قضاوت کی کہ تفسیر ''درمنثور'' میں بیہقی کی کتاب السنن وغیرہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ قبیلۂ بنی شمخ سے ایک شخص نے کسی خاتون سے شادی کی اور ابھی اس کے ساتھ مباشرت نہ کی تھی کہ اس کی ماں اسے پسند آ گئی، وہ ابن مسعود کے پاس آیا اور ان سے اس سلسلہ میں شرعی حکم دریافت کیا تو ابن مسعود نے اسے حکم دیا کہ پہلے اپنی بیوی کو طلاق دو پھر اس کی ماں سے شادی کرلو، چنانچہ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور اس سے بچے بھی پیدا ہوئے، پھر ابن مسعود مدینہ آئے اور ان سے کہا گیا کہ آپ کا فتویٰ درست نہیں تھا، تو جب وہ کوفہ واپس آئے تو اس شخص کو بلایا اور اس سے کہا کہ تیری بیوی تجھ پر حرام ہے، اس سے جدا ہو جا (طلاق دے دے) تو اس شخص نے ابن مسعود کے حکم پر اسے طلاق دے دی، اس روایت میں کہیں بھی امام علیؑ کا حوالہ مذکور نہیں بلکہ اتنا ہی بیان کیا گیا ہے کہ ابن مسعود سے صحابہ کرام نے پوچھا یا ابن مسعود نے صحابہ سے پوچھا یا بعض روایات

میں عمر نے ابن مسعود سے پوچھا یا ابن مسعود نے عمر سے پوچھا، بعض روایات میں ہے کہ اسے بتایا گیا کہ آپ نے جو فتویٰ دیا ہے وہ صحیح نہیں، اور مباشرت کی شرط ربیبہ کے بارے میں ہے بیوی کی ماں کے بارے میں کوئی شرط نہیں بلکہ وہ مطلقاً حرام ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر ''در منثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۳۵)

ربیبہ سے شادی کا حکم

کتاب ''الاستبصار'' میں مؤلف نے اپنے اسناد سے اسحاق بن عمار کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جعفر نے اپنے والد کے حوالہ سے کہا کہ حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''الربائب علیکم حرام مع الامهات اللاتی دخلتم بهن فی الحجور وغیر الحجور سواء، ولا امهات مبهمات دخل بالبنات ام لم یدخل فحرموا ابهموا ما ابهم الله'' ''تمہاری پروردہ بیٹیاں تم پر حرام ہیں اگر تم نے ان کی ماؤں کے ساتھ مباشرت کی ہو، خواہ وہ تمہاری آغوش میں ہوں یا نہ ہوں، لیکن بیوی کی مائیں مبہم ہیں خواہ اُن کی بیٹیوں کے ساتھ مباشرت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو وہ ہر حال میں حرام ہیں، جس چیز کو خداوند عالم نے مبہم قرار دیا ہے تم بھی اسے مبہم قرار دو، (یہاں مبہم سے مراد ان کی حرمت ہے) (الاستبصار جلد ۳ صفحہ ۱۵۶)

بعض روایات میں حضرت علی علیہ السلام سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ربیبہ سے نکاح کرنے کی حرمت ان کا آغوش میں ہونا (پرورش پانا) شرط ہے، لیکن آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول روایات اس کی نفی کرتی ہیں جو کہ آیۂ مبارکہ سے مستفاد معنی کے عین مطابق ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

روایت میں لفظ ''مبهمات'' ذکر ہوا ہے جو کہ لغوی حوالہ سے ''بهمة'' سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کا ایک رنگ ہونا ہے کہ جس میں کوئی دوسرا رنگ ملا ہوا نہ ہو، اور اس کا رنگ مختلف نہ ہو، یعنی ایک ہی رنگ والی چیز، جن عورتوں سے نکاح حرام ہے انہیں ''مبهمات'' کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ ان سے نکاح کی حرمت غیر مشروط ہے کہ اس میں کسی طرح سے حلیت کی گنجائش نہیں پائی جاتی، اور وہ عورتیں یہ ہیں: مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھپھیاں، خالائیں، بھائی کی بیٹیاں (بھتیجیاں) بہن کی بیٹیاں (بھانجیاں) رضاعی عورت والی، بیویوں کی مائیں، بیٹوں کی بیویاں (بہوویں)۔

امام محمد باقرؑ کا واضح بیان

کتاب الاستبصار میں مؤلف نے اپنے اسناد سے زرارہ کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے اس شخص کے بارے میں پوچھا کہ جس نے اپنی کنیز سے مباشرت کی ہو، کیا وہ اس کی بیٹی

سے شادی کرسکتا ہے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا، نہیں، اس پر یہ آیت صادق آتی ہے: ''وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىْ فِىْ حُجُوْرِكُمْ'' (اور تم پر تمہاری وہ پروردہ بیٹیاں حرام ہیں جو تمہاری آغوش میں ہوں) (الاستبصار۔جلد ۳ صفحہ ۱۶۰)

ابن الکواء کے سوال پر امام علیؑ کا جواب

تفسیر العیاشی میں ابوعون سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے ابوصالح الحنفی سے سنا کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک دن اعلان فرمایا کہ مجھ سے پوچھو (سلونی) تو ابن الکواء نے کہا: ''اخبرنی عن بنت الاخ من الرضاعة وعن المملو کتین لاختین'' مجھے رضائی بھتیجی کے بارے میں بتائیں کہ حلال ہے یا حرام؟ اور دو کنیز بہنوں کے بارے میں کہ ایک ہی ساتھ انہیں عقد میں رکھا جاسکتا ہے؟ تو امام علیؑ نے ارشاد فرمایا: ''انك لذاهب فى التيه. سل عما يعنيك او ينفعك'' تو ہمیشہ ایسی عجیب وغریب باتوں میں لگا رہتا ہے، وہ بات پوچھ جو تجھ سے تعلق رکھتی ہو یا تیرے لئے فائدہ مند ہو، ابن الکواء نے کہا: ہم آپ سے وہی بات پوچھتے ہیں جو نہیں جانتے اور جو کچھ جانتے ہیں وہ نہیں پوچھتے (انما نسألك عما لا نعلم واما ما نعلم فلا نسألك عنه) اس وقت امامؑ نے فرمایا: جہاں تک دو کنیز بہنوں کے یکجا عقد میں رکھنے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ایک آیت سے حلیت اور ایک آیت سے حرمت ثابت ہوتی ہے لہٰذا میں نہ تو اسے حلال قرار دیتا ہوں اور نہ ہی حرام، اور نہ ہی میں ایسا کرتا ہوں اور نہ میرے اہل بیت میں کوئی شخص ایسا کرتا ہے (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۳۲)

کتاب ''التہذیب'' میں مؤلف نے اپنے اسناد سے معمر بن یحییٰ بن سالم کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم نے امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام سے ان مسائل کے بارے میں دریافت کیا جو امیر المومنین علیہ السلام کے حوالہ سے لوگ بیان کرتے ہیں کہ جن میں آنجنابؑ نے لوگوں کو کوئی امر ونہی نہیں کیا یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم یا کسی کام کے کرنے کی ممانعت نہیں فرمائی بلکہ صرف اپنے اور اپنی اولاد کے لئے احکام ذکر کئے ہیں، تو ان کی بابت اصل حقیقت کیا ہے اور ہمیں ان کے حوالہ سے کیا کرنا چاہیے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: وہ احکام ایسے ہیں جو ایک آیت نے حلال کئے اور دوسری آیت نے انہیں حرام قرار دیا، ہم نے عرض کی کہ آیا ان میں سے پہلی آیت کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ سمجھا جائے گا یا دونوں محکمات میں سے ہیں کہ دونوں پر عمل کرنا ضروری ہے؟ امامؑ نے فرمایا: امیر المؤمنینؑ نے ان میں اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو امر ونہی کر کے لوگوں کے لئے صورتحال واضح کر دی ہے، ہم نے پوچھا کہ امیر المومنینؑ نے وہ احکام صریح طور پر لوگوں کے لئے بیان کیوں نہیں کئے؟ امامؑ نے جواب دیا کہ انہیں یہ اندیشہ لاحق تھا کہ لوگ ان کی اطاعت نہ کریں گے، اگر امیر المومنینؑ کے پاؤں مضبوط ہوتے (اقتدار واختیار کامل ان کے ہاتھ میں ہوتا) تو وہ کتاب اللہ کے تمام احکام نافذ کر دیتے اور حق کی بالادستی کو یقینی بنانے میں ہر حوالہ سے اقدام فرماتے (التہذیب جلد ۷ ص ۲۶۳)

معمر بن یحییٰ بن بسام نے امام محمد باقرؑ سے حضرت امیر المومنینؑ کی جس روایت کے بارے میں پوچھا وہ اہل سنت کے اسناد سے بیان کی جانے والی وہی روایت ہے کہ جسے تفسیر ''در منثور'' میں بیہقی اور دیگر کے حوالہ سے حضرت امیر المومنینؑ کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ جس میں امامؑ نے دو کنیز بہنوں کو ایک ہی عقد میں اکٹھا رکھنے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ایسا کرنے کو ایک آیت نے حلال جبکہ دوسری آیت نے حرام قرار دیا ہے اور میں اس سلسلہ میں نہ کوئی امر کرتا ہوں اور نہ ہی کوئی نہی صادر کرتا ہوں البتہ میں خود اور میرے اہل بیتؑ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کرتا (تفسیر ''در منثور'' ج ۲ ص ۱۳۶)

اسی کتاب (تفسیر ''در منثور'') میں قبیضہ بن ذویب سے منقول ہے کہ ایک شخص نے حضرت امیر المومنینؑ سے اس مسئلہ کی بابت پوچھا تو آپؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''لو کان الی من الامر شیئ ثم وجدت احداً فعل ذلك لجعلته نکالاً'' اگر اقتدار میرے ہاتھ میں ہوتا اور مجھے معلوم ہو جاتا کہ کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے سخت سزا دیتا۔

کتاب ''التھذیب'' میں مؤلف نے اپنے اسناد سے عبداللہ بن سنان کی روایت ذکر کی ہے، انہوں نے کہا میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے سنا، آپؑ نے ارشاد فرمایا: ''اذا کانت عند الانسان الاختان المملوکتان فنکح احداھما ثم بداله فی الثانیة فلیس ینبغی له ان ینکح الاخری حتی تخرج الاولی من ملکه یھبھا اویبیعھا. فان وھبھا لولده یجزیه'' جب کسی شخص کے پاس دو کنیز بہنیں ہوں اور وہ ان میں سے ایک کے ساتھ نکاح کرے، پھر وہ دوسری کی رغبت کرنے لگے تو اس کے لئے دوسری سے نکاح کرنا جائز نہیں جب تک پہلی کو اپنی ملکیت سے خارج نہ کرلے خواہ کسی کو ھبہ کر دے یا اسے بیچ دے، اگر اسے اپنے بیٹے کو ہبہ کرے تب بھی کافی ہے۔ (تہذیب الاحکام جلد ۷، ص ۲۸۸)

(مذکورہ بالا روایات میں سے بعض کا متن قابل بحث ہے اور سند کے حوالہ سے بھی زیادہ قوی نہیں لہٰذا ان کی بابت اصولِ روایت ملحوظ ہوں گے)۔

محمد بن مسلم کی روایت

کتاب کافی اور تفسیر العیاشی میں محمد بن مسلم سے روایت مذکور ہے انہوں نے کہا میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت مبارکہ کے بارے میں پوچھا، ''والمحصنات من النسآء الا ماملکت ایمانکم'' امامؑ نے ارشاد فرمایا: ھو ان یأمر الرجل عبده وتحته امته فیقول له: اعتزل امرأتك ولا تقربھا ثم یحبسھا عنه حتی تحیض ثم یمسھا فاذا حاضت بعد مسه ایاھا ردّھا علیه بغیر نکاح، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے اس غلام کو حکم دے کہ اس کی کنیز جس کی بیوی ہو کہ اس سے علیحدگی اختیار کرلے اور اس سے نزدیکی نہ کرے، پھر اس کنیز کو اس سے جدا کر کے حیض آنے تک روکے رکھے اور جب وہ پاک ہو جائے تو خود اس سے نزدیکی کرے اور اگر چاہے کہ دوبارہ اسے اپنے غلام

کو واپس کر دے تو جب وہ حیض آنے کے بعد پاک ہو جائے تو اسے غلام کو واپس کر سکتا ہے اور دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۳۲)

(اس روایت کی سند و متن دونوں قابلِ بحث ہیں)۔

ابوبصیر کی روایت

ابن مسکان نے ابوبصیر سے روایت کی ہے انہوں نے حضرت امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام میں سے ایک امام سے آیۂ مبارکہ "وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: هن ذوات الازواج الا ما ملكت ايمانكم ان كنت زوجت امتك غلامك نزعتها منه ان شئت. اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر دار عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے، سوائے ان عورتوں کے جو تمہاری ملکیت میں ہوں (کنیزیں) کہ اگر تم نے اپنی کسی کنیز کی شادی اپنے غلام سے کر دی تو جب چاہو اسے اس سے علیحدہ کر دو، امامؑ کا فرمان سن کر میں نے عرض کیا: اگر اس نے اپنی کنیز کی شادی اپنے غلام کے علاوہ کسی دوسرے سے کی ہو تو کیا حکم ہے؟ امامؑ نے فرمایا: "ليس له ان ينزع حتى تباع. فان باعها صار بضعها فى يد غيره. فان شاء المشترى فرق وان شاء اقر" اس صورت میں وہ اس کنیز کو اس کے شوہر سے علیحدہ نہیں کر سکتا، سوائے اس صورت کے کہ وہ کنیز اپنے آپ کو بیچ دے تو وہ خریدار کی ملکیت ہو جائے گی اور وہی اس کی ناموس کا اختیار رکھنے والا ہوگا کہ اگر وہ (خریدار) چاہے تو اپنی کنیز کو کسی دوسرے کے غلام کے اختیار میں دے دے کہ وہ اس سے نکاح و مباشرت کرے تو یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے اور اگر چاہے تو ان کے درمیان جدائی کر دے، انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دے (تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۲۳۳)

تفسیر "درمنثور" کی دو روایتیں

(۱) تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ احمد، ابوداؤد نے اور ترمذی نے روایت کو حسن قرار دیتے ہوئے اور ابن ماجہ نے فیروز دیلمی کے بارے میں بیان کیا کہ جب وہ اسلام لایا تو اس وقت دو کنیز بہنیں اس کے عقد میں تھیں، حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ ان دو میں سے ایک کو جسے چاہو طلاق دے دو۔

(۲) ابن عبدالبر نے کتاب "استذکار" میں ایاس بن عامر کا بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے علی بن ابی طالبؑ سے پوچھا کہ میرے پاس دو بہنیں میری کنیزی میں ہیں، اس نے ان میں سے ایک سے مباشرت کی اور اس سے میری

اولاد پیدا ہوئی، پھر دوسری کی طرف میری رغبت ہوگئی، اب میں کیا کروں، آنجنابؑ نے ارشاد فرمایا: جس کے ساتھ مباشرت کی ہے اور اس سے اولاد پیدا ہوئی ہے اسے آزاد کردو، اس کے بعد دوسری سے مباشرت کرو، پھر امامؑ نے اپنے بیان کی تکمیل میں ارشاد فرمایا: انه یحرم علیك مما ملکت یمینك ما یحرم علیك فی کتاب الله من الحرائر الا العدد (او قال: الا الاربع) و یحرم علیك من الرضاع ما یحرم علیك فی کتاب الله من النسب. کنیزوں میں سے بھی وہی تم پر حرام ہیں جو کتاب اللہ میں آزاد عورتیں تم پر حرام کی گئی ہیں سوائے تعداد کے (یا امامؑ نے فرمایا: سوائے چار عدد کے) آزاد یعنی غیر کنیز عورتوں میں سے چار سے زیادہ سے شادی جائز نہیں جبکہ کنیزوں میں تعداد کی شرط نہیں پائی جاتی کہ ایک ہی وقت میں چار سے زیادہ کنیزیں ہو سکتی ہیں اور ان سے مباشرت جائز ہے، اور رضاعت کی بنیاد پر بھی وہی عورتیں تم پر حرام ہیں جو قرآن مجید میں نسب کی بنیاد پر تم پر حرام ہیں۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۳۶)

تفسیر ''درمنثور'' میں یہی روایت دیگر اسناد سے بھی ذکر کی گئی ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابو ہریرہ سے منقول ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لا یجمع بین المرأة و عمتها ولا بین المرأة و خالتها'' کسی عورت اور اس کی پھپھی کو یکجا عقد میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ ہی کسی عورت اور اس کی خالہ کو یکجا عقد میں رکھا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا دو کتب کے علاوہ اہل سنت کی دیگر اسناد سے بھی یہ مطلب منقول ہے، لیکن آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایت میں اس کے برعکس مطلب ذکر ہوا ہے اور قرآن مجید سے بھی آئمہؑ کے بیانات کی تصدیق ہوئی ہے۔

جنگ حنین کا واقعہ

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ طیالسی، عبدالرزاق، فریابی، ابن ابی شیبہ، احمد، عبد بن حمید، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابویعلیٰ، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طحاوی، ابن حیان نے اور بیہقی نے اپنی کتاب السنن میں ابو سعید خدری کا یہ بیان ذکر کیا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ حنین کے دن ایک لشکر ''اوطاس'' کی طرف روانہ کیا، سپاہِ اسلام نے ان سے خوب جنگ کی اور ان پر غلبہ پالیا، ان کے اسیروں میں کچھ عورتیں بھی تھیں، تو ان میں سے جو عورتیں شادی شدہ تھیں ان سے مباشرت کرنے کے حوالہ سے بعض صحابہ کرام تشویش میں مبتلا ہوگئے اور پس و پیش کرنے لگے، کہ آیا شادی

شدہ کنیزوں کے ساتھ مباشرت کریں یا نہ کریں۔ کیونکہ وہ مشرک مردوں کی بیویاں تھیں، تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ '' (اور شادی شدہ عورتیں حرام ہیں سوائے ان عورتوں کے کہ جو تمہاری ملکیت میں آجائیں......) یعنی سوائے ان عورتوں کے کہ جو مال غنیمت میں تمہیں مل جائیں، تو ہم نے ان سے مباشرت تمہاری لئے حلال قرار دی ہے (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۱۳۷)

مذکورہ بالا مطلب طبرانی نے ابن عباس کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔

آیت کے شان نزول سے متعلق ایک روایت

تفسیر ''درمنثور'' ہی میں مذکور ہے کہ عبد بن حمید نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ سورۂ نساء کی یہ آیت ''وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ '' ایک عورت کے بارے میں نازل ہوئی جس کا نام ''**معاذہ**'' تھا اور وہ قبیلۂ بنی سدوس کے سردار جس کا نام شجاع بن حارث تھا، کی بیوی تھی، اس کی ایک سوکن بھی تھی کہ جس نے شجاع کے لئے بہت بیٹے پیدا کئے تھے، ایک مرتبہ شجاع اپنے اہل وعیال کے لئے رزق وروزی کی خاطر سفر پر گیا، اس دوران معاذہ کا چچازاد بھائی معاذہ کے پاس آیا تو معاذہ نے اس سے کہا کہ مجھے میرے گھر والوں کے پاس لے چلو کیونکہ شجاع کے پاس میرے لئے بہتری نہیں ہے، چنانچہ اس کے چچازاد بھائی نے اسے اپنے ساتھ لے لیا اور اسے گھر والوں کے پاس لے جانے لگا۔ راستہ میں شجاع سے ملاقات ہوگئی، اس نے اسے اس شخص کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا، اسے سخت ناگوار گزرا تو وہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول اور افضل العرب! میں رجب کے مہینہ میں گھر سے روانہ ہوا تاکہ اپنے اہل وعیال کے لئے رزق وروزی کا سامان کروں، اس دوران وہ گھر سے بھاگ گئی اور گناہ میں آلودہ ہوگئی، یقیناً عورت ایک شر ہے جس پر چاہے غلبہ کر لیتی ہے اور اسے اپنے دام میں گھیر لیتی ہے، اس نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ آسودہ حال ہے تو اس کے ساتھ ہوگئی، واضح ہے کہ دونوں کا کوئی مقصد ہے، حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ معاملہ مجھ پہ چھوڑ دو، اب یہ میری ذمہ داری ہے، (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ) اگر اس شخص نے اس عورت کے کپڑے اتارے ہوں تو اسے سنگسار کر دو ورنہ اس شیخ کو اس کی بیوی پلٹا دو، تو شجاع کا بیٹا مالک کہ جو معاذہ کی سوکن کا بیٹا تھا وہ نکل پڑا اور اسے تلاش کرنے لگا، بالآخر اس نے اسے ڈھونڈ لیا اور اسے گھر لے آیا (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۱۳۹)

وضاحت: ہم کئی بار یہ مطلب بیان کر چکے ہیں کہ اس طرح کے واقعات کہ جو آیات کے شانِ نزول کے طور پر ذکر کئے جاتے ہیں اور بالخصوص وہ واقعات جو آیات کے بعض حصوں اور اجزاء سے تعلق رکھتے ہیں وہ راویوں کی طرف سے آیات کی تطبیق کے طور پر ہیں آیات کے حقیقی شان نزول نہیں۔

امام صادقؑ کا ارشاد گرامی

کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیۂ مبارکہ ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ'' کے بارے میں پوچھا گیا تو امامؑ نے فرمایا: ''ھن ذوات الازواج'' اس سے مراد شوہر دار عورتیں ہیں، پوچھا گیا کہ اس آیت میں کون سی عورتیں مراد ہیں: ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ'' سورۂ مائدہ، آیت ۵، امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد پاکدامن عورتیں ہیں۔

اس روایت کو تفسیر العیاشی میں بھی امام صادقؑ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیۂ مبارکہ ''وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا'' کی بابت مذکور ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص تم میں سے مالدار نہ ہو، مؤلف نے کہا کہ یہ معنی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے (مجمع البیان، جلد ۳ صفحہ ۳۳)

عصر حاضر میں شرعی حکم

کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: ''لا ینبغی ان یتزوج الحر المملوکۃ الیوم، انما کان ذلک حیث قال اللہ عزوجل "وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا" والطول المھر، ومھر الحرۃ الیوم مھر الامۃ او اقل'' اس زمانہ میں مناسب نہیں کہ آزاد مرد کنیز کے ساتھ شادی کرے، یہ اس دور کی بات ہے جب خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: جو شخص تم میں سے ''طول'' کی استطاعت نہ رکھتا ہو، طول سے مراد مہر ہے، موجودہ زمانہ میں آزاد عورت کا حق مہر کنیز کے حق مہر کے برابر یا اس سے کم ہے (فروع کافی، جلد ۵، ص ۳۶۰)

مالدار ہونا ''طول'' کا ایک مصداق ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اور روایت سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ کنیز سے شادی کرنا موجودہ دور میں مکروہ ہے اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

کنیز سے نکاح کرنے کی شرط

کتاب التہذیب میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابو العباس بقباق کا بیان ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا کسی شخص کو روا ہے کہ وہ کسی کنیز سے اس کے اہل کی اجازت کے بغیر نکاح کرے؟ (یتزوج الرجل الامۃ بغیر علم اھلھا؟) امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''ھو زنا'' وہ زنا ہے۔ خداوند عالم کا فرمان ہے:

''فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ'' ''تم ان سے ان کے اہل کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو (تہذیب، جلد ۷۔ص ۳۴۸)

اسی کتاب میں مؤلف نے اپنے اسناد سے احمد بن محمد بن ابی نصر سے روایت ذکر کی ہے، انہوں نے کہا: میں نے امام رضا علیہ السلام سے پوچھا: یتمتع بالامة باذن اهلها؟ کیا یہ جائز ہے کہ کوئی شخص کسی کنیز سے اس کے اہل کی اجازت کے ساتھ تمتع کرے؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: نعم، ان الله عزوجل یقول، فانکحوهن باذن اهلهن، ہاں، خداوند عالم کا ارشاد ہے: تم ان سے ان کے اہل کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو۔

کنیزوں کے ''احصان'' کا معنیٰ

تفسیر العیاشی میں محمد بن مسلم کی روایت مذکور ہے، انہوں نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ میں سے ایک امام سے کنیزوں کے ''احصان'' کے بارے میں خداوند عالم کے اس فرمان کا مطلب پوچھا: ''فَاِذَآ اُحۡصِنَّ'' تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے مباشرت کی گئی ہو، انہوں نے کہا کہ پھر میں نے پوچھا، اگر ان کے ساتھ مباشرت نہ ہوئی ہو تو ان پر کوئی حدّ جاری نہ ہوگی؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ہاں۔

اسی کتاب میں حریز کا بیان مذکور ہے کہ میں نے امامؑ سے پوچھا کہ ''محصن'' کسے کہتے ہیں؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اپنی نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ کچھ ہو جو اسے دوسروں سے بے نیاز کر دے (یعنی بیوی یا کنیز) (تفسیر العیاشی جلد اول ص ۲۳۵)

امام علیؑ کا فیصلہ

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے محمد بین قیس کی روایت ذکر کی ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: حضرت امیر المومنین نے غلاموں اور کنیزوں کے بارے میں قضاوت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی بھی زنا کا ارتکاب کرے تو اسے پچاس کوڑے مارو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر ہو یا نصرانی ہو، اسے سنگسار یا شہر بدر نہیں کیا جائے گا۔ (فروع کافی، جلد ۷ ص ۲۳۸)

اسی کتاب میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابوبکر حضرمی کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ذکر کیا ہے جس میں امامؑ نے اس غلام کے بارے میں حکم صادر فرمایا جس نے ایک آزاد شخص کی طرف زنا کی نسبت دی تھی (فقہ میں کسی کی طرف زنا کی نسبت دینے کو ''قذف'' کہتے ہیں) کہ اسے اسی (۸۰) کوڑے مارے جائیں، یہ حقوق الناس

میں سے ہے، لیکن جو چیز حقوق اللہ میں سے ہو اس کی حد غلام کے لئے آزاد کی نصف حد کے برابر ہے، میں نے عرض کی کہ کون سی چیز حقوق اللہ میں سے ہے؟

امامؑ نے فرمایا: جب زنا کرے یا شراب نوشی کرے، یہ اعمال ایسے ہیں کہ جن کی سزا حقوق اللہ میں سے ہے کہ ان کے مرتکب غلام کو آزاد شخص کی سزا (حد) کا نصف ہے (فروع کافی، ج ۱ ص ۲۳۷ حدیث ۱۹)

کتاب تہذیب میں مؤلف نے اپنے اسناد سے برید العجلی کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اس کنیز کے بارے میں ارشاد فرمایا جس نے زنا کا ارتکاب کیا تھا کہ اس کی سزا آزاد عورت کی حد کا نصف ہے، خواہ وہ شوہر دار ہو یا نہ ہو۔ (تہذیب، جلد ۱۰ صفحہ ۲۷ حدیث ۸۲)

ابن عباس کی روایت

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن جریر نے ابن عباس سے روایت کی کہ انہوں نے کہا کہ ''مُسٰفِحٰتٍ'' سے مراد وہ عورتیں ہیں جو کھلم کھلا زنا کی مرتکب ہوں، اور دوستیاں بناتی پھریں، ایک دوست بنانے والی عورت کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ بھی ''مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ'' میں شامل ہے، اس کے بعد ابن عباس نے مزید کہا کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ کھلم کھلا زنا کے ارتکاب کو حرام اور چھپ کر زنا کرنے کو حلال قرار دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کھلم کھلا زنا کا ارتکاب پستی و گھٹیا پن ہے لیکن چھپ کر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر حکم صادر فرمایا: ''وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ'' (برے کاموں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ ظاہر بظاہر ہوں یا چھپ چھپ کر کئے جائیں) تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۱۴۲)

مذکورہ بالا مطالب پر مشتمل روایات کثرت سے وارد ہوئی ہیں، ہم نے ان میں چند بطور نمونہ ذکر کی ہیں۔

روایات پر ایک اور نظر

متعہ کا قرآنی حکم

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابو بصیر کی روایت ذکر کی ہے انہوں نے کہا میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے متعہ کے بارے میں پوچھا تو امامؑ نے فرمایا: اس کی بابت قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ

فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً ‌ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا تَرٰضَيۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِيۡضَةِ ‘‘(پس تم جو اس طرح ان سے متعہ کرو تو ان کا واجب حق ادا کرو، اور واجب حق کے بعد جو آپس میں رضایت کے ساتھ طے کرو اس میں کوئی حرج نہیں) (فروع کافی، جلد ۵، ص ۴۴۸)

اسی کتاب میں مؤلفؒ نے اپنے اسناد سے ابن ابی عمیر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے سنا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ متعہ کے بارے میں قرآنی حکم یوں نازل ہوا: ’’فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً ‌ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا تَرٰضَيۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِيۡضَةِ ‘‘(تم جس قدر عورتوں سے ایک مقررہ مدت تک استمتاع کرو (متعہ کرو، جنسی فائدہ اٹھاؤ) تو واجب ہے کہ ان کی اجرت دو (فروع کافی۔ ج ۵، ص ۴۴۹)

اس قرائت کے بارے میں تفسیر العیاشی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی مذکور ہے اور علماء اہل سنت نے بھی ابی بن کعب اور عبداللہ بن عباس سے روایات ذکر کی ہیں کہ عنقریب پیش کی جائیں گی، شاید اس طرح کی روایات سے مقصود یہ ہو کہ آیت کا مرادی معنی یہ ہے نہ یہ کہ آیت ہی ان الفاظ میں نازل ہوئی ہے۔

امام محمد باقرؑ کا دوٹوک جواب

زرارہ سے منقول ہے کہ عبداللہ بن عمیر لیثی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور امامؑ سے پوچھا: ’’ماتقول فی متعة النسآء؟‘‘ آپ عورتوں سے متعہ کرنے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: ’’احلها الله فی کتابه وعلی لسان نبیه فهی حلال الی یوم القیامة‘‘ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی کتاب میں اور اپنے نبی کی زبانی، حلال قرار دیا ہے لہٰذا وہ قیامت تک حلال ہے، اس نے کہا: ’’یا اباجعفر: مثلك یقول هذا وقد حرمها عمر ونهی عنها؟‘‘ اے ابوجعفر! آپ جیسے حضرات تو یہی کہتے ہیں جبکہ عمر نے اسے حرام قرار دیا اور اس کی ممانعت کی؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: ’’وان کان فعل‘‘ اس نے حرام کیا تو کیا ہوا، عبداللہ لیثی نے کہا: ’’انی اعیذك بالله من ذلك ان تحل شیئاً حرمه عمر‘‘ میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ اس چیز کو حلال قرار دیں جسے عمر نے حرام کیا ہو، یہ سن کر امام محمد باقر علیہ السلام نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیتے ارشاد فرمایا: ’’فانت علیٰ قول صاحبك وانا علی قول رسول الله (ص) فهلم الاعنك ان القول ما قال رسول الله (ص) وان الباطل ما قال صاحبك‘‘ تو پھر تم اپنے دوست کے عقیدہ پر رہو اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر قائم ہوں، اب آؤ، میں تمہارے ساتھ ملاعنہ (مباہلہ) کرتا ہوں کہ جو کچھ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہی حق ہے اور جو کچھ تمہارے دوست نے کہا وہ باطل ہے، تب عبداللہ بن عمیر لیثی نے گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ: ’’ایسرك ان نسائك وبناتك واخواتك وبنات عمك یفعلن؟‘‘ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی خواتین، آپ کی بیٹیاں، آپ کی بہنیں اور آپ کی چچازاد بہنیں ایسا کریں؟ فاعرض عنه ابو

جعفر (ع) حین ذکر نسائہ وبنات عمہ جب عبداللہ نے امامؑ کی خواتین اور چچازاد بہنوں کا حوالہ دیا تو امام محمد باقرؑ نے اس سے منہ پھیر لیا (فروع کافی، جلد پنجم، صفحہ ۴۴۹ حدیث ۴)

اسی کتاب یعنی فروع کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے مزید دو روایتیں ذکر کی ہیں جن میں سے ایک میں ابو مریم کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر ذکر ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''المتعة نزل بها القرآن وجرت بها السنة من رسول الله (ص) ''متعہ کے بارے میں قرآن مجید میں حکم نازل ہوا ہے اور اسی پر سنت نبوی ﷺ بھی جاری ہوئی۔

دوسری روایت میں مؤلف نے اپنے اسناد سے عبدالرحمٰن بن ابی عبداللہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ابوحنیفہ سے سنا کہ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے متعہ کے بارے میں پوچھ رہے تھے تو امامؑ نے ان سے پوچھا: ''ای المتعتین تسأل؟'' ''آپ کس متعہ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ (متعة النسآء کے بارے میں یا متعة الحج کے بارے میں) ابوحنیفہ نے کہا: سألتك عن متعة الحج فانبئني عن متعة النسآء احق هي؟ (میرا سوال متعة الحج کے بارے میں تھا لیکن اب مجھے متعة النسآء کے بارے میں بتائیں کہ آیا وہ صحیح ہے؟) اس پر امامؑ نے ارشاد فرمایا: ''سبحان الله اما قرأت كتاب الله عزوجل "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً"، سبحان اللہ کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: تم جس قدر ان سے جنسی فائدہ اٹھاؤ تو انہیں ان کے حق مہر فریضہ کے طور پر ادا کرو، یہ سن کر ابوحنیفہ نے کہا: ''والله كأنها اية لم اقرأها قط'' خدا کی قسم، گویا یہی آیت میں نے کبھی نہیں پڑھی (کتاب فروع کافی، جلد ۵ ص ۴۴۹ حدیث ۶)

دو واضح ارشادات

تفسیر العیاشی میں محمد بن مسلم سے روایت ذکر کی گئی ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے بیان کیا کہ جابر بن عبداللہ نے حضرت رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بتایا کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ہمراہ جب جنگ کے لئے جاتے تھے تو آپ ﷺ نے ساتھیوں کے لئے متعہ کو حلال قرار دیا اور پھر کبھی اسے حرام نہیں کیا (انهم غزوا معه فاحل لهم المتعة ولم يحرمها) اور حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے: ''لولا ما سبقني به ابن الخطاب - یعنی عمر - ما زنى الا شقي'' اگر خطاب کا بیٹا، یعنی عمر - مجھ سے پہلے مسند خلافت پر نہ بیٹھتا تو کسی بد بخت کے علاوہ کوئی شخص زنا کا مرتکب نہ ہوتا، اور ابن عباس آیۂ مبارکہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً'' کی تفسیر میں کہا کرتے تھے: ''وهؤلاء يكفرون بها ورسول الله (ص) احلها ولم يحرمها'' یہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جبکہ رسول خدا ﷺ نے اسے حلال

قرار دیا اور کبھی اس کی ممانعت نہیں کی۔ (تفسیر العیاشی جلد اول، صفحہ ۲۳۳)

اسی کتاب میں ابوبصیر سے منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے متعہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی: "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ" اس میں آخری فقرہ سے مراد یہ ہے کہ اگر متعہ کی مدت ختم ہوجائے تو تم دونوں میں سے جو چاہے وہ اس میں اضافہ کرسکتا ہے (لا بأس بان تزیدھا و تزیدك اذا انقطع الاجل فیما بینکما) اگر عورت، اس مدت میں اضافہ پر راضی ہو تو مرد یوں کہے گا: "استحللتك باجل اخر" (میں تجھے اپنے لئے دوسری مدت تک حلال کرتا ہوں) اس بناء پر وہ عورت تیرے علاوہ کسی کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک اپنی عدت پوری نہ کرلے، اس کی عدت دو دفعہ حیض آنا ہے (ولا تحل یغیرك حتی تنقضی عدتھا وعدتھا حیضتین) (تفسیر العیاشی، جلد اول، ص ۲۳۳، حدیث ۸۶)

تفسیر "البرھان" میں ہے کہ شیبانی نے آیہ مبارکہ "وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ" کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی ذکر کیا کہ انہوں نے فرمایا: "ھو ان یزیدھا فی الاجرۃ وتزیدہٗ فی الاجل" اس سے مراد یہ ہے کہ مرد اجرت میں اور عورت مدت میں اضافہ کرسکتی ہے (تفسیر "البرھان" جلد اول صفحہ ۳۶۱ ج ۱۳)

عبداللہ بن عباس کا بیان

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ ابن ابی حاتم نے ابن عباس کا یہ بیان ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے کہا: ابتداء اسلام میں متعۃ النساء پر عمل ہوتا تھا، کوئی شخص کسی شہر میں جاتا تھا اور اس کے ہمرہ کوئی نہ ہوتا جو اس کے امور انجام دے اور اس کے مال و متاع کی حفاظت کرے، تو وہ کسی خاتون سے شادی کرلیتا تھا کہ جب تک اسے اس کے متعلقہ امور کی انجام دہی و اموال کی حفاظت کے لئے ضرورت ہو وہ اس کے ساتھ رہے، جناب ابن عباس جب آیت کی تلاوت اس طرح کرتے "فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی" تو کہا کرتے تھے کہ اسے جملہ "مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ" نے منسوخ کردیا، اور عورت کا "محصنہ" (شوہر دار ہونا) مرد کے اختیار میں ہوتا تھا کہ جب تک چاہے اسے اپنے عقد میں رکھے اور جب چاہے اسے طلاق دے (تفسیر "درمنثور" جلد دوم، صفحہ ۱۳۹)

قرائت کا اختلاف

حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب "مستدرک" میں اپنے اسناد سے ابونضرہ سے روایت ذکر کی ہے جس میں اس نے کہا

کہ میں نے ابن عباس کے سامنے یہ آیت تلاوت کی ''فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً'' تو ابن عباس نے اس کی تلاوت یوں کی: ''فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی'' اس پر میں نے کہا کہ ہم تو اسے اس طرح نہیں پڑھتے، ابن عباس نے کہا: ''والله لا نزلها الله كذالك'' خدا کی قسم، اللہ نے اسے اسی طرح نازل فرمایا ہے۔ (کتاب المستدرک جلد ۲ صفحہ ۳۰۵)

اس روایت کو سیوطی نے ابن عباس اور عبد بن حمید، ابن جیر اور ابن انباری کے حوالہ سے المصاحف میں ذکر کیا ہے اور تفسیر ''درمنثور'' میں عبد بن حمید اور ابن جریر کے حوالہ سے قتادہ کی روایت مذکور ہے کہ ابی بن کعب کی قرائت میں یہ آیت اسی طرح ہے: ''فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمّی'' (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۴۰)

ابتداء اسلام میں متعہ کا عمل

کتاب صحیح ترمذی میں محمد بن کعب کے حوالہ سے ابن عباس کا قول مذکور ہے انہوں نے کہا کہ ابتدائے اسلام میں متعہ معمول تھا، جب کوئی شخص کسی ایسی جگہ جاتا جہاں کوئی اس کا جاننے والا نہ ہوتا اور وہ وہاں کے طرز و معمولات زندگی کے بارے میں بالکل ناآگاہ ہوتا تو وہ جب تک وہاں قیام کرتا اتنی مدت کے لئے کسی خاتون سے شادی کر لیتا تاکہ اس طرح اس کا مال و متاع بھی محفوظ رہے اور اس کے متعلقہ امور بخوبی انجام پذیر ہوسکیں، یہ سلسلہ اس آیت کے نزول تک جاری رہا: ''الا علی ازواجهم او ما ملكت ايمانهم'' (سوائے ان کی بیویوں کے یا ان کی کنیزوں کے) لہٰذا ان دو کے علاوہ ہر خاتون حرام ہے۔ (ترمذی ج ۳ ص ۴۳۰)

اس بیان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ متعہ والی آیت مکہ میں منسوخ ہوئی کیونکہ یہ آیت مکی آیات میں سے ہے (اسی سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ روایات درست نہیں)۔

مستدرک میں ایک روایت عبداللہ بن ابی ملیکہ سے منقول ہے جس میں ان کا کہنا ہے کہ میں نے عائشہ سے متعۃ النسآء کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے، اس کے بعد انہوں نے یہ آیت تلاوت کی: ''وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَيۡرُ مَلُوۡمِيۡنَ ۚ'' (اور وہ اپنی شرمگاہوں کو بچا کر رکھتے ہیں سوائے اپنی ازواج کے یا اپنی کنیزوں کے کہ اس میں ان پر ملامت نہیں کی جاتی) اس کے بعد کہا کہ جو شخص اس سے تجاوز کرے جسے خدا نے اس کے رشتہ ازواج میں قرار دیا یا اس کی ملکیت بنایا تو وہ گناہ کا مرتکب ہوا، اس نے عدوان و سرکشی کی ''فَمَنِ ابۡتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ'' (تو جو اس کے علاوہ کچھ چاہے تو ایسے لوگ ہی سرکشی کرنے والے ہیں) (المستدرک، ج ۲ ص، ۳۰۵)

تفسیر ''درمنثور'' کی سات روایتیں

پہلی روایت: ابوداؤد نے اپنی کتاب ناسخ میں اور ابن منذر اور نحاس نے عطا کے حوالہ سے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے آیۂ مبارکہ: ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً'' کے بارے میں کہا کہ یہ آیت ان تین آیتوں کے ذریعے منسوخ ہوگئی: (۱) ''يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ'' (اے نبی، جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت تک طلاق دو، (۲) ''وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ'' (اور طلاق شدہ عورتیں اپنے آپ کو تین دفعہ پاک ہونے تک روکے رکھیں) (۳) ''وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِن نِّسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ'' (اور تمہاری وہ عورتیں جو حیض آنے سے مایوس ہو جائیں تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔)

دوسری روایت: ابوداؤد نے اپنی کتاب ناسخ میں اور ابن منذر، نحاس اور بیہقی نے سعید بن مسیب سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ''نسخت اٰية الميراث المتعة'' میراث والی آیت نے متعہ والی آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔

تیسری روایت: عبدالرزاق، ابن منذر اور بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: المتعة منسوخة نسخها الطلاق والصدقة والعدة والميراث متعہ والی آیت منسوخ ہوگئی ہے، اسے طلاق، صدقہ، عدت اور میراث والی آیات نے منسوخ کیا ہے۔

چوتھی روایت: عبدالرزاق اور ابن منذر نے امام علیؑ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: نسخ رمضان كل صوم، ونسخت الزكاة كل صدقة، ونسخ المتعة الطلاق والعدّة والميراث، ونسخت الضحية كل ذبيحة، ماہ رمضان کے روزوں نے ہر دوسرے روزہ کو منسوخ کیا، زکات والی آیت نے ہر صدقہ کو منسوخ کیا، متعہ والی آیت کو طلاق، عدت اور میراث والی آیات نے منسوخ کیا اور قربانی والی آیت نے ہر دوسری قربانی کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔

پانچویں روایت: عبدالرزاق، احمد اور مسلم نے سبرۂ جہنی سے روایت ذکر کی ہے انہوں نے کہا: حضرت رسول خدا ﷺ نے فتح مکہ والے سال ہمیں متعہ کی اجازت دی، میں اپنی قوم کے ایک شخص کے ساتھ مدینہ سے باہر گیا، میں اپنے ساتھی سے زیادہ خوبصورت تھا اور وہ تقریباً بدصورت تھا ہم دونوں کے پاس چادریں تھیں، میری چادر پرانی تھی جبکہ میرے چچا زاد کی چادر نئی تھی، چلتے چلتے جب ہم مکہ کی پہاڑیوں کے قریب پہنچے تو وہاں ایک نہایت خوبصورت نوجوان لڑکی کو دیکھا جو حسین و پرکشش تھی، ہم نے اس سے کہا کہ کیا تو ہم میں سے کسی سے متعہ کرنا پسند کرو گی؟ اس نے پوچھا کہ تم مجھے کیا دو گے؟ ہم دونوں نے اپنی چادریں پھیلا دیں۔ کہ ہم یہی دے سکتے ہیں، اس نے ہم دونوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا، تو میرے ساتھی نے اس سے کہا کہ میرے ساتھی کی چادر پرانی جبکہ میری چادر نئی و دلکش ہے، اس نے کہا کہ اس کی چادر بھی ٹھیک ہے،

بہر حال اس نے میرے ساتھ متعہ کرلیا اور میں نے اس کے ساتھ مباشرت کی، ابھی ہم مکہ سے باہر نہ نکلے تھے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے متعہ کی حرمت کا حکم صادر ہو گیا۔

چھٹی روایت: مالک، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ امام علی بن ابی طالبؑ نے بیان کیا: "ان رسول الله (ص) نهى عن متعة النسآء يوم خيبر. وعن اكل لحوم الحمر الانسية" حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر والے دن متعۃ النسآء سے منع فرمایا اور گھریلو پالتو گدھوں کے گوشت سے بھی ممانعت کی۔

ساتویں روایت: ابن ابی شیبہ، احمد اور مسلم نے مسلمہؓ بن اکوع سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: "رخص لنا رسول الله (ص) فی متعة النسآء عام اوطاس ثلاثة ايام ثم نهى عنها بعدها" حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اوطاس والے سال تین دن ہمیں متعہ کرنے کی اجازت دی، پھر اس کے بعد اس سے منع کر دیا۔

یہ روایتیں تفسیر "درمنثور" جلد دوم ص ۱۴۰ اور ۱۴۱ پر درج ہیں اور ان کے عناوین یہ ہیں: "جملة من الاخبار الدالة على نسخ اٰية المتعة بالكتاب وبالسنة"

سبرہؓ کی روایت پر تبصرہ

ابن عربی نے صحیح ترمذی کی شرح جلد ۵ ص ۵۰ پر لکھا ہے کہ اسماعیل نے اپنے والد کے حوالہ سے زہری کا قول بیان کیا کہ انہوں نے کہا سبرہؓ کا کہنا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن متعہ سے منع فرمایا، ابوداؤد نے یہ روایت ذکر کرنے کے بعد کہا کہ اس حدیث کو عبدالعزیز بن عمر بن عبدالعزیز نے سبرہ کے بیٹے ربیع کے حوالہ سے اپنے والد کا قول بیان کیا کہ انہوں نے کہا یہ واقعہ حجۃ الوداع میں احرام سے باہر آنے کے بعد ہوا اور متعہ کا حکم مقررہ مدت سے مشروط تھا، لیکن حسنؓ نے کہا کہ یہ بات عمرۃ القضاء میں ہوئی۔

اسی کتاب میں اسی صفحہ پر زہریؓ سے روایت مذکور ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ تبوک میں متعہ سے منع فرمایا۔ (شرح ترمذی، ابن عربی جلد ۵، ص ۵۰)

مذکورہ بالا روایات میں جیسا کہ آپ خود ملاحظہ کر رہے ہیں اس سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ متعہ کی ممانعت کا حکم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کب صادر فرمایا؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ہجرت سے پہلے ممنوع ہوا، بعض کہتے ہیں کہ ہجرت کے بعد نکاح وطلاق اور عدت ومیراث کی آیات کے ذریعے منسوخ ہوا، بعض نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خیبر کے دن

اس کی ممانعت کی یا عمرۃ القضاء کے وقت یا اوطاس والے سال یا جنگ تبوک والے سال یا حجۃ الوداع کے بعد اس سے منع کیا، اسی وجہ سے ان روایات کو درست قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان سے مجموعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان تمام مواقع پر متعہ سے ممانعت کی اور ان میں سے ہر روایت سے اس کی ممانعت کا حکم ثابت ہوتا ہے، لیکن ان میں بعض راوی حضرات ایسے ہیں کہ جن کی جلیل القدر شخصیات سے بعید ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے متعہ کی ممانعت کے حکم سے بے خبر ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ آنحضرت ﷺ کے ہمراہ ہوتے تھے اور انہیں آنحضرت ﷺ کے ہر چھوٹے بڑے حکم و فرمان اور آپ ﷺ کی سیرت کے عملی اقدامات کا علم تھا۔

حضرت علیؑ کے بیانات کا حوالہ

(۱) بیہقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا: حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے متعہ سے منع فرمایا، اور وہ اس شخص کے لئے جائز تھا جو شادی (عقد دائم) کرنے سے قاصر ہوتا تھا، لہٰذا جوں ہی نکاح وطلاق اور شوہر و بیوی کے درمیان عدت و میراث کی آیات نازل ہوئیں تو متعہ والی آیت منسوخ ہوگئی (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۴۰)

(۲) نحاسؔ نے امام علی بن ابی طالبؑ سے روایت ذکر کی ہے کہ آپؑ نے ابن عباس سے فرمایا: انك رجل تائه، ان رسول الله (ص) نهى عن المتعة. آپ بھی سرگرداں آدمی ہیں، حضرت رسول اللہ ﷺ نے تو متعہ سے منع فرمایا ہے ("درمنثور" جلد دوم، ص ۱۴۱)

حضرت ابوذر کی روایت

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ بیہقی نے جناب ابوذر کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: انما احلت لاصحاب رسول الله (ص) المتعة ثلاثة ايام ثم نهى عنه رسول الله (ص) صرف تین دنوں تک متعہ صحابہ کرام کے لئے حلال کیا گیا تھا پھر حضرت رسول خدا ﷺ نے اس سے منع فرمادیا۔

ابوحمزہ کی روایت

صحیح بخاری میں ابوحمزہ کی روایت مذکور ہے، انہوں نے کہا کہ ابن عباس سے متعۃ النسآء کے بارے میں پوچھا گیا

تو انہوں نے اس کی اجازت دی، اس پر ان کے ایک آزاد کردہ غلام نے پوچھا کہ آیا یہ حکم اس بناء پر نہ تھا کہ عورتیں کم تھیں اور مرد سخت تکلیف میں رہتے تھے؟ ابن عباس نے کہا: ہاں، (کتاب صحیح بخاری، جلد ۷ صفحہ ۱۶)

بیہقی کا بیان

بیہقی نے عمر کے ایک خطاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں متعہ کے ممنوع ہونے کی بابت کہا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ متعہ کرتے رہتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے، اگر کسی ایسے شخص کو میرے پاس لایا گیا جس نے متعہ کیا ہو تو میں اسے سنگسار کروں گا۔

سبرہ کا بیان

ابن ابی شیبہ احمد اور مسلم نے سبرہ کی روایت ذکر کی ہے، اس نے کہا: میں نے رسول خدا ﷺ کو دیکھا کہ رکن و باب کعبہ کے درمیان کھڑے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے: "ایها الناس، انی کنت اذنت لکم فی الاستمتاع الا وان الله حرمها الی یوم القیامة. فمن کان عندہ منهن شیئ فلیخل سبیله ولا تأخذوا مما اتیتموهن شیئًا" اے لوگو! میں نے ہی تمہیں متعہ کرنے کی اجازت دی تھی، یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لئے حرام قرار دیا ہے، لہٰذا جس کے پاس متعہ والی عورت ہو وہ اسے چھوڑ دے اور جو کچھ اسے دے چکے ہو وہ واپس نہ لو۔

ابن ابی شیبہ کی روایت

ابن ابی شیبہ نے حسنؔ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: والله ما کانت المتعة الا ثلاثة ایام اذن لهم رسول الله (ص) فیها ما کانت قبل ذالك ولا بعد، خدا کی قسم! متعہ صرف تین دنوں کے لئے تھا کہ جن میں حضرت رسول خدا ﷺ نے اس کی اجازت دی، نہ اس سے پہلے روا تھا اور نہ ہی اس کے بعد، مذکورہ بالا تینوں روایات تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱ پر مذکور ہیں۔

مجاہد کا بیان

تفسیر طبری میں آیہ مبارکہ "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ......" کی تفسیر میں مجاہد کا بیان مذکور ہے کہ اس سے مراد نکاح متعہ ہے۔

اسی کتاب میں آیہ مبارکہ کی بابت سدی کا بیان مذکور ہے کہ یہ متعہ کے بارے میں ہے اور وہ یوں ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے معین مدت کی شرط کے ساتھ نکاح کرے اور جب مدت ختم ہو جائے تو اس کے بعد اس شخص کا اس پر کوئی حق نہیں ہوگا، اور وہ اس کے لئے نامحرم ہو جائے گی، اس عورت پر واجب ہے کہ اپنے رحم کو پاک کرے (یعنی عدت میں بیٹھے) ان کے درمیان وراثت بھی نہیں یعنی وہ ایک دوسرے سے وراثت نہیں پائیں گے (تفسیر طبری، جلد ۵، ص ۹)

متعہ کے جواز پر ابن مسعود کا بیان

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے اور تفسیر "درمنثور" میں عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ ابن مسعود نے بیان کیا کہ ہم حضرت رسول خدا ﷺ کے ہمراہ جنگ پر جاتے تھے اور ہمارے ساتھ ہماری بیویاں نہیں ہوتی تھیں تو ہم نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی: الا نستخصی؟ کیا ہم اپنے آپ کو خصی (نامرد) کر سکتے ہیں؟ فنهانا عن ذالك ورخص لنا ان نتزوج المرأة بالثوب الى اجل، آنحضرت ﷺ نے ہمیں ایسا کرنے سے منع فرمایا اور ہمیں اجازت دی کہ ہم کسی عورت سے ایک لباس حق مہر قرار دے کر مقررہ مدت تک شادی کر لیں، یہ کہہ کر عبداللہ بن عباس نے یہ آیت تلاوت کی: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ" (اے ایمان والو، ان پاک چیزوں کو کیوں حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں) (صحیح بخاری، ج ۷ ص ۴)، (صحیح مسلم ج ۹ ص ۱۸۲) (درمنثور ج ۲ ص ۱۴۰)

تفسیر "درمنثور" میں ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ نافع نے کہا: "ان ابن عمر سئل عن المتعة فقال: حرام، فقيل له: ان ابن عباس يفتي بها، قال: فهلا ترمرم بها في زمان عمر، ابن عمر سے متعہ کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ حرام ہے، اس سے کہا گیا کہ ابن عباس تو اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، اس نے کہا اگر ایسا ہے تو انہوں نے عمر کے زمانہ میں اس کا اظہار کیوں نہ کیا ("درمنثور" جلد ۲ ص ۱۴۱)

ابن عباس کی روایات

(۱) ابن منذر، طبرانی اور بیہقی نے سعید بن جبیر کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا میں نے ابن عباس سے کہا

کہ آپ نے یہ کیا کردیا ہے آپ کے فتویٰ کو لوگوں نے ہر طرف جا کر اس قدر عام کردیا ہے کہ شاعروں نے اس کے بارے میں اشعار کہے ہیں، ابن عباس نے پوچھا: انہوں نے کیا شعر کہے ہیں؟ میں نے یہ اشعار سنائے جو شعراء نے ان کے بارے میں کہے تھے:

اقول للشیخ لما طال مجلسہٗ یا صاح ھل لک فی فتیا ابن عباس

ھل لک فی رخصۃ الاطراف اٰنسۃ تکون مثواک حتی مصدر الناس

(میں نے اس محترم شخصیت سے پوچھا کہ جس کی مجلس طولانی ہوگئی تھی، آپ ابن عباس کے فتویٰ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں) کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ آپ کے شاگردوں کی واپسی تک آپ کسی سے جنسی لذت اُٹھاتے رہیں اور وہ آپ کا دل بہلائے رکھے)

یہ سن کر ابن عباس نے کہا: انا للہ وانا الیہ راجعون، خدا کی قسم، میں نے ایسا فتویٰ نہیں دیا اور نہ ہی میرے فتوے سے میرا مقصود یہ تھا، اور میں نے اسے مضطر شخص کے علاوہ کسی کے لئے حلال قرار نہیں دیا اور اس کی بابت اسی صورت میں حلال ہونے کا فتوا دیا ہے جو صورتحال مردہ کا گوشت، خون اور خنزیر کا گوشت خداوند عالم نے حلال قرار دیا۔

(۲) ابن منذر نے شرید کے آزاد کردہ غلام، عمار سے روایت ذکر کی ہے اس نے کہا کہ میں نے ابن عباس سے متعہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ زنا ہے یا نکاح ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا: یہ نہ زنا ہے اور نہ ہی نکاح، تو میں نے پوچھا کہ اگر نہ زنا ہے اور نہ نکاح، تو پھر کیا ہے؟ انہوں نے کہا: وہ متعہ ہے کہ خود خداوند عالم نے اسے ''متعہ'' سے موسوم فرمایا ہے۔ میں نے پوچھا: کیا اس میں عدت بھی ہے؟ ابن عباس نے کہا: اس کی عدت ایک دفعہ حیض آنا ہے، میں نے پوچھا: کیا وہ ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا: نہیں۔

(۳) عبدالرزاق اور ابن المنذر نے عطاء کے حوالہ سے بیان کیا کہ ابن عباس نے کہا: خدا، عمر پر رحم کرے، متعہ تو اللہ کی طرف سے امتِ محمد یہ صلی اللہ علیہ وآلہ پر ایک رحمت تھی، اگر عمر نے اس سے منع نہ کیا ہوتا تو سوائے کسی شقی و بد بخت انسان کے کوئی بھی زنا کے ارتکاب کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا، یہ حکم وہی ہے جو سورۂ نساء میں اس طرح مذکور ہے: ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ'' یعنی فلاں مدت تک اور اس قدر حق مہر کے ساتھ، اور اس میں دونوں کے درمیان وراثت بھی نہیں، اگر وہ مدت ختم ہونے کے بعد اسے مزید بڑھانا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں اور اگر جدا ہونا چاہیں تب بھی درست ہے اور ان کے درمیان نکاح نہیں، عطاء نے کہا کہ اس نے ابن عباس سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ وہ اب بھی متعہ کو حلال سمجھتے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں روایتیں تفسیر ''در منثور'' ج ۲ ص ۱۴۱ میں مذکور ہیں۔

امام علیؑ کے فرمان سے استناد

تفسیر طبری میں ہے اور تفسیر ''درمنثور'' میں عبدالرزاق کے حوالہ سے اور ابوداؤد نے اپنی کتاب ناسخ میں حکم سے روایت ذکر کی ہے کہ ان سے آیۂ مبارکہ: ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ'' کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ منسوخ ہوگئی ہے یا نہیں؟ اُنہوں نے جواب دیا: نہیں، اور امام علیؑ نے فرمایا ہے: لولا ان عمر نھیٰ عن المتعۃ ما زنی الا شقی، اگر عمر نے متعہ سے منع نہ کیا ہوتا تو کسی شقی و بدبخت شخص کے سوا کوئی بھی زنا کا مرتکب نہ ہوتا۔ (تفسیر طبری، جلد ۵ ص ۹، تفسیر ''درمنثور'' ج ۲ ص ۱۴۰)

جابر انصاری کا صریح بیان

کتاب صحیح مسلم میں جابر ابن عبداللہ انصاری کے حوالہ سے منقول ہے اُنہوں نے کہا: کنا نستمتع بالقبضۃ من التمر والدقیق الایام علی عھد رسول اللہ (ص) وابی بکر حتی نھی عنہ عمر فی شان عمرو بن حریث، ہم عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر کے دور میں چند کھجوریں اور تھوڑا سا آٹا دے کر متعہ کرلیا کرتے تھے مگر عمرو بن حریث کے واقعہ کے بعد عمر نے اسے ممنوع کردیا۔ (صحیح مسلم، ج ۹ صفحہ ۱۸۳)

یہ روایت ابن اثیر کی کتاب ''جامع الاصول'' ابن قیم کی کتاب ''زاد المعاد'' ابن حجر کی کتاب ''فتح الباری'' اور متقی کی کتاب ''کنز العمال'' کے حوالہ سے بھی منقول ہے، (ملاحظہ ہو، جامع الاصول جلد ۱۶ ص ۱۳۵، زاد المعاد ج ۲ ص ۲۰۵، فتح الباری ج ۶ ص ۱۶۶، کنزل العمال ج ۱۶ ص ۵۲۳)

عروہ بن زبیر کی روایت

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ مالک اور عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ خولہ بنت حکیم نے عمر بن خطاب کو خبر دی کہ ربیعہ بن امیہ نے ایک عورت سے متعہ کیا ہے اور وہ اس سے حاملہ ہوگئی ہے، یہ سن کر عمر بن خطاب نے سخت غصہ میں آکر اپنی رداء کھینچتے ہوئے کہا: ''ھٰذہ المتعۃ ولو کنت تقدمت فیھا لرجمت'' یہی متعہ ہے، اگر تو پہلے مجھے مطلع کرتی تو میں اسے سنگسار کردیتا۔ (تفسیر ''درمنثور'' ج ۲ صفحہ ۱۸۰)

یہی واقعہ شافعی سے کتاب ''الام'' کے حوالہ سے اور بیہقی سے سنن کبریٰ کے حوالہ سے منقول ہے۔

فرمان نبوی ﷺ کی عملی نافرمانی

کتاب کنز العمال میں سلیمان بن یسار کے حوالہ سے ام عبداللہ بنت خیثمہ کی روایت مذکور ہے کہ شامؔ سے ایک شخص مدینہ آیا اور اس کے گھر قیام پذیر ہوا، اس نے کہا عالم تجرد (غیر شادی شدہ ہونا) مجھ پر سخت گراں ہو گیا ہے، آپ میرے لئے کوئی خاتون تلاش کریں جس کے ساتھ متعہ کروں۔ ام عبداللہ نے کہا کہ میں نے اسے ایک خاتون کا بتایا تو اس نے اس سے رابطہ کر کے اس سے طے کر لیا اور چند عادل افراد کو اس پر گواہ بنایا، وہ اس عورت کے ساتھ اس وقت تک رہا جب تک خدا نے چاہا، یہاں تک کہ وہ مدینہ سے واپس چلا گیا، اس واقعہ کی اطلاع عمر بن خطاب کو دی گئی تو اس نے مجھے بلوایا اور مجھ سے پوچھا کہ جو کچھ مجھے بتایا گیا ہے کیا وہ صحیح ہے؟ میں نے کہا: ہاں، درست ہے، عمر نے کہا جب وہ یہاں آئے تو مجھے اطلاع دینا، جب وہ شامی شخص آیا تو میں نے عمر کو اطلاع دی، عمر نے کسی کو بھیج کر اسے بلوایا اور اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا اور کس چیز نے تجھے ایسا کرنے کی ترغیب دلائی؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے عہد نبوی ﷺ میں متعہ کیا تو انہوں نے اس سے منع نہیں کیا، آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد ابو بکر کے دور میں متعہ کرتا تھا انہوں نے بھی ہمیں اس سے نہیں روکا، اور ان کی وفات کے بعد آپ کے دور میں بھی متعہ کرتا رہا آپ نے کبھی اس سے منع نہیں کیا۔ تو اب کیا ہوا ہے کہ اس سے منع کر رہے ہیں؟ عمر نے کہا: مجھے اس ذات کی قسم، جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم میرے منع کرنے سے آگاہ ہونے کے باوجود ایسا کرتے تو میں تمہیں سنگسار کرتا، لوگوں کو واضح کر دو تا کہ نکاح اور زنا کے درمیان فرق معلوم ہو جائے۔ (کنز العمال، جلد ۱۶، صفحہ ۵۲۲)

صحیح مسلم اور مسند احمد میں عطاءؔ سے مروی ہے، اُنہوں نے کہا کہ جابر بن عبداللہ عمرہ کی ادائیگی سے واپس آئے تو ہم ان سے ملنے ان کے گھر گئے، لوگ ان سے سوالات کر رہے تھے، یہاں تک کہ متعہ کے بارے میں گفتگو ہونے لگی تو جابر نے کہا: استمتعنا علی عهد رسول الله (ص) وابی بکر و عمر، ہم رسول خدا ﷺ کے زمانہ میں اور ابو بکر و عمر کے دور خلافت میں متعہ کیا کرتے تھے (احمدؔ کی روایت میں یہ الفاظ مذکور ہیں: حتی اذا کان فی آخر خلافة عمر، یہ سلسلہ عمر کی خلافت کے آخری ایام تک جاری رہا) (صحیح مسلم، جلد ۹ صفحہ ۱۸۳، مسند احمد جلد ۳ ص ۳۸۰)

کتاب السنن، بیہقی کے حوالہ سے منقول ہے کہ نافع نے کہا: عبداللہ بن عمر سے متعہ النسآء کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ حرام ہے، اگر عمر بن خطاب کو کسی کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ اس نے ایسا کیا ہے اور وہ پکڑا جاتا تو وہ اسے سنگسار کرتے تھے۔ (سنن بیہقی، جلد دوم، صفحہ ۲۰۶)

کتاب مرآۃ الزمان، تالیف ابن جوزی کے حوالہ سے منقول ہے کہ عمر کہا کرتے تھے: والله لا اوتی برجل اباح

المتعة الا رجمته، خدا کی قسم، اگر کسی ایسے شخص کو میرے پاس لائیں جو متعہ کو جائز سمجھتا ہو تو میں اسے سنگسار کروں گا۔

ابن رشید کی کتاب ہدایۃ المجتہد میں جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت مذکور ہے، انہوں نے کہا: تمتعنا علی عھد رسول اللہ (ص) وابی بکر و نصفًا من خلافة عمر ثم نهیٰ عنها عمر الناس، ہم رسول خداؐ کے زمانہ میں اور ابوبکر کے دور میں اور عمر کی خلافت کے نصف دور میں متعہ کیا کرتے تھے، پھر عمر نے لوگوں کو اس سے منع کر دیا۔ (ہدایۃ المجتہد، جلد دوم، ص ۶۳)

سلمہ بن امیہ کا واقعہ

کتاب ''الاصابۃ'' میں ہے ابن کلبی نے بیان کیا کہ سلمہ بن امیہ بن خلف جمعی نے حکیم بن امیہ بن اوقص اسلمی کی آزاد کردہ کنیز سلمیٰ سے متعہ کیا، اس سے ایک بچہ پیدا ہوا، مگر سلمہ نے بچے کا انکار کر دیا یعنی اسے اپنا بچہ نہ مانا، معاملہ عمر کے پاس آیا تو عمر نے متعہ کی ممانعت کر دی۔ (الاصابۃ، جلد دوم، ص ۶۳)

عروہ اور ابن عباس کا مکالمہ

کتاب 'زاد المعاد' میں ایوبؒ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ عروہ نے ابن عباس سے کہا: ''الا تتقی اللہ، ترخص فی المتعة'' کیا آپ اللہ سے نہیں ڈرتے کہ متعہ کی اجازت دیتے ہو اور اس کے جواز کا فتویٰ صادر کرتے ہو؟ ابن عباس نے برجستہ جواب دیا: سل امك یا عریة، اے عریہ! اپنی ماں سے پوچھ لو، (عروہ کو عریہ کہنے سے اس کے چھوٹے پن کی طرف اشارہ مقصود ہے یعنی اے عروہ بچے!) عروہ نے کہا: اما ابو بکر و عمر فلم یفعلا، ابوبکر و عمر نے تو ایسا نہیں کیا، ابن عباس نے جواب دیا: واللہ ما ارا کم منتهین حتی یعذبکم اللہ، نحدثکم عن النبی (ص) وتحدثونا عن ابی بکر و عمر، خدا کی قسم، تم لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے جب تک اللہ تم پر عذاب نازل نہ کرے، ہم رسول خداؐ کا فرمان تمہیں سناتے ہیں اور تم ابوبکر و عمر کی بات کرتے ہو (زاد المعاد، جلد اول، صفحہ ۲۵۷)

یاد رہے کہ عروہ کی ماں اسماء بنت ابی بکر تھیں۔ زبیر بن عوام نے ان سے متعہ کیا، اس سے عبداللہ بن زبیر پیدا ہوا، اور عروہ بھی اس کا بیٹا تھا۔

کتاب المحاضرات میں راغبؒ نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن زبیر نے عبداللہ بن عباس کو مورد ملامت قرار دیا کہ وہ کیوں متعہ کو حلال قرار دیتے ہیں، ابن عباس نے جواب دیا کہ اپنی ماں سے پوچھو کہ اس نے کس طرح تیرے باپ سے

ازدواجی رشتہ قائم کیا؟ عبداللہ بن زبیر نے اپنی والدہ سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے تجھے متعہ ہی میں جنا ہے۔

ابن عباس کا عملی استدلال

کتاب صحیح مسلم میں مسلم القری سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابن عباس سے متعہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اس کی اجازت دیتے ہوئے اسے جائز قرار دیا جبکہ عبداللہ بن زبیر اس سے منع کرتے تھے، ابن عباس نے اپنے بیان کی تصدیق کے لئے کہا کہ یہ ابن زبیر کی ماں موجود ہے، یہ بتا رہی ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے اس کی اجازت دی، آپ جائیں اور اس سے خود ہی پوچھ لیں، مسلم القریٰ نے کہا کہ ہم ابن زبیر کی والدہ کے پاس گئے تو وہاں ایک جسیم نابینا بیٹھی تھی، اس نے بتایا کہ حضرت رسول خدا ﷺ متعہ کرنے کی اجازت دیتے تھے (صحیح مسلم اور بحوالہ سند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۳۴۸)

روایت کے سیاق وسباق اور شاہد الحال سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس میں متعۃ النساء کے بارے میں سوال تھا، دیگر روایات میں بھی اس روایت کے حوالہ سے یہی بیان کیا گیا ہے۔

جابر انصاری کا واضح بیان

کتاب صحیح مسلم میں ابونضرہ سے روایت مذکور ہے، انہوں نے کہا کہ میں جابر بن عبداللہ انصاری کے پاس موجود تھا کہ ایک شخص وہاں آیا اور اس نے کہا: ابن عباس اور ابن زبیر متعۃ النساء اور متعۃ الحج دونوں کی بابت آپس میں اختلاف رکھتے ہیں، جابر نے کہا کہ ہم نے عہد نبوی ﷺ میں وہ دونوں انجام دیئے ہیں، پھر عمر نے ہمیں اس سے منع کیا تو اس کے بعد ہم نے وہ انجام نہیں دیئے (صحیح مسلم، جلد ۸ ص ۲۳۳)

اس روایت کے حوالہ سے منقول ہے کہ بیہقی نے بھی اسے اپنی کتاب ''السنن'' میں ذکر کیا ہے اور یہ مطلب صحیح مسلم میں تین مقامات پر مختلف الفاظ او عبارتوں کے ساتھ مذکور ہے، ان میں سے بعض میں اس طرح ذکر ہوا ہے: ''**فلما قام عمر قال: ان الله کان یحل لرسوله ما شاء بما شاء، فاتموا الحج والعمرة کما امر الله وانتهوا عن نکاح هٰذه النسآء الا واتی برجل نکح امرأة الی اجل الا رجمته**'' جابر نے کہا کہ جب عمر نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لئے جو کچھ چاہا اور جتنا چاہا حلال کیا، پس تم حج وعمرہ کو اسی طرح ادا کرو جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے اور ان عورتوں سے نکاح کرنے سے باز رہو، میرے پاس کسی ایسے شخص کو لایا گیا جس نے مقررہ مدت تک

نکاح کیا ہو تو میں اسے سنگسار کروں گا۔

یہ مطلب بیہقی نے اپنی کتاب السنن میں، جصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں، متقی نے اپنی کتاب ''کنز العمال'' میں سیوطی نے تفسیر ''درمنثور'' میں، رازی نے اپنی تفسیر میں اور طیالسی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: سنن بیہقی، جلد ۲ ص ۲۰۶، احکام القرآن جلد دوم ص ۱۴۷، کنز العمال جلد ۱۶ صفحہ ۵۲۱ تفسیر ''درمنثور'' جلد اول صفحہ ۲۱۶، تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۱۰ ص ۵۱، مسند طیالسی ص ۲۸ طبع مصر)

متعہ کی ممنوعیت کا اعلان

تفسیر قرطبیؒ میں عمر سے منقول ہے کہ انہوں نے متعہ کی ممنوعیت کا اعلان ان لفظوں میں کیا: ''متعتان کانتا علی عهد رسول الله (ص) وانا انهی عنهما واعاقب علیهما: متعة الحج ومتعة النسآء'' عہد نبوی ﷺ میں دو متعے حلال تھے کہ میں ان کی ممانعت کرتا ہوں اور ان پر سزا دوں گا: ایک متعۃ الحج اور دوسرا متعۃ النسآء (تفسیر قرطبی، جلد دوم، صفحہ ۳۹۲)

یہ اعلان تقریباً تمام مورخین و محدثین کے نزدیک مسلم ہے کہ عمر نے ایک خطبہ میں خود ہی کیا، اہل تحقیق و تفسیر نے اسے ایک مسلم الثبوت حقیقت کے طور پر ذکر کیا ہے کہ جس کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا، مثلاً تفسیر فخر الدین رازی، البیان والتبیین، زاد المعاد، احکام القرآن، طبری، ابن عساکر اور دیگر کتب میں یہ مطلب ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب ''المستبین'' میں طبری نے عمر کا یہ بیان ذکر کیا ہے کہ: ثلاث کن علی عهد رسول الله (ص) انا محرمهن ومعاقب علیهن: متعة الحج، ومتعة النسآء، وحی علی خیر العمل فی الاذان۔ عہد نبوی ﷺ میں تین چیزیں حلال تھیں کہ میں وہ حرام قرار دیتا ہوں اور ان پر سزا دوں گا، ایک متعۃ الحج، دوسرا متعۃ النسآء، اور تیسری اذان میں حی علیٰ خیر العمل۔

طبری کی تفصیلی روایت

طبریؒ نے عمر ابن سوادہ کی روایت ذکر کی ہے کہ اس نے کہا: میں نے عمر کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی تو انہوں نے سبحان اللہ اور اس کے ساتھ ایک سورہ پڑھا، پھر نماز ختم کردی تو میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا، انہوں نے مجھ سے پوچھا: کیا تمہیں کوئی کام ہے؟ میں نے کہا: ہاں مجھے ایک کام ہے، انہوں نے کہا کہ میرے ساتھ چلو، میں ان کے ساتھ چل پڑا، وہ

ایک گھر کے اندر پہلے داخل ہو گئے، اور پھر مجھے اندر آنے کی اجازت دی، جب میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ عمر ایک تخت پر بیٹھے ہیں اور ان کے اوپر کوئی چیز نہیں، میں نے کہا: مجھے آپ کو ایک نصیحت کرنی ہے، عمر نے کہا: میں نصیحت کرنے والے کو صبح و شام مرحبا کہتا ہوں، میں نے کہا: آپ کی قوم آپ میں چار عیب پاتی ہے اور ان کی بابت آپ کی مذمت کرتی ہے، یہ سن کر عمر نے اپنی ٹھوڑی اپنے تازیانہ پر رکھی اور اس کا نچلا حصہ اپنی ران پر رکھا اور پھر مجھ سے کہا: بتاؤ، وہ چار چیزیں کیا ہیں؟ میں نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے حج کے مہینوں میں عمرہ کو حرام قرار دیا ہے جبکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہیں کیا اور نہ ہی ابوبکر نے ایسا کیا، اور وہ تو حلال ہے، عمر نے کہا: وہ حلال ہے؟ اگر لوگ حج کے مہینوں میں عمرہ انجام دیں تو اسے حج کے بدلے میں کافی سمجھیں گے، اس صورت میں خانہ خدا انڈے کے اس بیرونی چھلکے کی طرح ہو جائے گا جس کا بچہ اس سے باہر آ گیا ہو، یعنی مکہ میں کوئی بھی حج کرنے والا باقی نہ رہے گا، جبکہ حج اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، میں نے صحیح سمجھا ہے اور جو کچھ میں نے کہا وہی درست ہے۔ میں نے کہا دوسری بات یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے متعۃ النسآء کو حرام قرار دیا ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حلال و جائز تھا، ہم ایک مٹھی (مال) دے کر متعہ کرتے تھے اور پھر تین دنوں کے بعد جدا ہو جاتے تھے، عمر نے کہا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ضرورت کے تحت ایک دور میں حلال قرار دیا تھا، پھر لوگوں کو دوبارہ آسانی حاصل ہو گئی (اس وقت عقد دائم کے لئے عورتیں میسر نہ آتی تھیں پھر اس سلسلہ میں آسانی پیدا ہو گئی اور دائمی عقد کرنے میں کوئی مشکل و دشواری پیش نہ آتی تھی) تو اس کے بعد میں نے کسی بھی مسلمان کو متعہ کرتے نہیں دیکھا اور کسی نے دوبارہ اسے انجام نہیں دیا، اب اگر کوئی چاہے تو ایک مٹھی (مال) دے کر نکاح کرلے اور پھر تین دنوں کے بعد طلاق دے کر جدا ہو جائے، میں نے جو کچھ سمجھا اور کہا ہے وہ درست ہے۔ میں نے کہا کہ تیسری بات یہ ہے کہ آپ حاملہ کنیز کو وضع حمل کے بعد ہی آزاد کر دیتے ہیں جبکہ ابھی اس کے مالک نے اسے آزاد نہیں کیا ہوتا، عمر نے جواب دیا کہ میں ایک احترام کے ساتھ دوسرا احترام ساتھ ملا دیتا ہوں۔ یعنی اس کنیز کے بچے کی وجہ سے اسے بھی آزاد کر دیتا ہوں کیونکہ اس کا بچہ آزاد ہے۔ میں اس کام میں نیکی و اچھائی کے علاوہ کچھ نہیں جانتا، اور میں اللہ سے طلب مغفرت کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ چوتھی بات یہ ہے کہ آپ رعایا سے اچھا سلوک نہیں کرتے، اور ان پر سختی کرتے ہیں، یہ سن کر عمر نے چھڑی اٹھائی اور اُس پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے غرور کے ساتھ یہ کہا: میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ساتھی ہوں، جنگ قرقرۃ الکدر میں وہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ خدا کی قسم، میں لوگوں کو اس قدر آزادی دیتا ہوں کہ وہ جی بھر کر زندگی سے لطف اٹھائیں اور میں انہیں اس قدر عطا کرتا ہوں کہ وہ سیر ہو جائیں، اگر کوئی شخص راستہ سے ہٹ جائے تو واپس راستہ پر لے آتا ہوں، زیادتی اور حد سے تجاوز کرنے والے کو سیدھا کر دیتا ہوں اور جتنی مجھ میں طاقت ہے اسے سبق سکھاتا ہوں، میں اپنے موقف پر قائم رہتا ہوں، دشمن کو رام کر لیتا ہوں اور دور جانے والے کو نزدیک کرتا ہوں میں ڈانٹ ڈپٹ زیادہ کرتا ہوں اور مارتا کم ہوں، چھڑی تو دکھاتا ہوں مگر ہاتھ سے کام لینے پر اکتفا کرتا ہوں، اگر ایسا نہ کروں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور مجھے ان سے کوئی کام نہیں

اور ان سے کوئی تعلق نہیں، جب یہ گفتگو معاویہ کو معلوم ہوئی تو اس نے کہا، خدا کی قسم، وہ اپنی رعایا کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتے تھے۔

اس روایت کو ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ابن قتیبہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔

روایات کے بارے میں تحقیقی نظریہ

یہ سب وہ روایات ہیں جو متعۃ النسآء کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اہل فکر ونظر اور ارباب بحث و تحقیق خود ان روایات کے الفاظ وعبارات کا ملاحظہ کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان میں کس قدر اختلاف اور ایک دوسرے کی نفی کے پہلو پائے جاتے ہیں، کسی محقق کو ان روایات میں مذکور مطالب سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ عمر بن خطاب نے اپنے زمانۂ خلافت میں متعہ کو حرام قرار دیا اور اس سے منع کیا اور ان کے ایسا حکم صادر کرنے کی وجہ عمرو بن حریث اور ربیعہ بن امیہ بن خلف الجمحی وغیرہ کے واقعات ہیں، اور جہاں تک متعہ کے حکم پر مشتمل آیت کے منسوخ ہونے کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے نہ تو کوئی قرآنی آیت اور نہ ہی سنت وحدیث اسے ثابت کرتی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ہم نے جو مطالب ذکر کئے ہیں ان کی روشنی میں متعہ کی حرمت کے بارے میں پیش کئے گئے استدلال میں کوئی وزن نہیں بلکہ وہ بے نتیجہ ہے، اس سے بھی بالاتر یہ کہ ان روایات میں سے بعض ایسی ہیں جو دوسری بعض کی نفی کرتی ہیں اور ان کی عبارتوں میں تضاد پایا جاتا ہے، ان روایات سے جو بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا وہ یہ ہے کہ عمر بن خطاب نے ہی اس سے روکا اور اس کی ممانعت پر عملی طور پر ڈٹ گئے۔ یہ ہے پہلی بات، دوسری بات یہ کہ متعہ، عہد نبوی میں آنحضرت ﷺ ہی کی طرف سے جائز قرار پایا تھا اور اس پر عمل بھی ہوتا تھا خواہ اسے پہلے سے جاری عمل کا تصدیقی تسلسل کہا جائے یا خود مستقل اسلامی قانون کہا جائے، بہر حال اس پر صحابۂ کرام میں سے ایسی شخصیات کا عمل کرنا ثابت ہے جن کے بارے میں زنا وبدکاری کا گمان ہی نہیں ہوسکتا مثلاً جابر بن عبداللہ انصاری، عبداللہ بن مسعود، زبیر بن عوام، اسماء بنت ابی بکر کہ جنہوں نے زبیر سے عبداللہ کو جنم دیا، تیسری بات یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین میں سے بعض حضرات متعہ کو جائز سمجھتے تھے مثلاً عبداللہ ابن مسعود! جابر بن عبداللہ انصاری، عمرو بن حریث اور ان کے علاوہ دیگر حضرات اور تابعین میں سے مجاہد، سدی، سعید بن جبیر وغیرہ۔

یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ روایات میں جو شدید اختلاف پایا جاتا ہے وہی اس بات کا سبب ہوا ہے کہ عامۃ المسلمین کے علماء متعہ کے اصل جواز اور حرمت کی بابت اختلاف رائے رکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض اسے جائز سمجھتے ہیں اور بعض اسے ناجائز سمجھتے ہیں، اور پھر جو حضرات اس کی حرمت کے قائل ہیں وہ اس کی حرمت کی کیفیت کے حوالہ سے آپس میں اختلاف

رائے رکھتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں عجیب وغریب اقوال وآراء سامنے آئی ہیں یہاں تک کہ پندرہ اقوال ذکر ہوئے ہیں۔

بہرحال اس موضوع کی بابت مختلف پہلوؤں سے بحث ہوسکتی ہے مگر ہم یہاں ان تمام جہات کو زیر بحث لانے کی بجائے صرف بعض امور پر نظر ڈالتے ہیں کہ جن کا تعلق تفسیر سے ہے، ان جہات میں سے ایک کلامی واعتقادی حوالہ سے بحث ہے کہ جو فریقین شیعہ وسنی کے درمیان ہوتی ہے، دوسری بحث فقہی حوالہ سے ہے کہ فرعی وعملی طور پر اس مسئلہ میں جواز وحرمت میں سے کون سا حکم صحیح ہے؟ تیسری بحث تفسیر کے حوالہ سے ہے کہ آیۂ مبارکہ: ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً'' سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اس میں نکاح متعہ کی مستقل شرعی قانون گزاری کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں؟ اور جب اس آیت سے متعہ کا جواز ثابت ہوگیا تو کیا وہ حکم دیگر آیات مثلاً آیۂ مؤمنون اور نکاح، تحریم، طلاق، عدت اور میراث کی آیات کے ذریعے منسوخ ہوگیا ہے یا نہیں؟ اور اگر آیات کے ذریعے اس کا منسوخ ہونا ثابت نہ ہو تو کیا سنت نبوی وآنحضرت ﷺ کے فرامین واحادیث میں سے کسی کے ذریعے اس کا منسوخ ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ اور جب اس کا جواز ثابت ہوگیا تو کیا وہ اسلام کا ہی تدوین شدہ مستقل قانون ہے یا پہلے سے موجود اور معاشرے میں رائج عمل کی تصدیق اور تسلسلی تائید ہے کہ جسے اصطلاح میں ''امضاء'' کہا جاتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ پہلے سے موجود عمل ہی کو برقرار رکھتے ہوئے اسے شرعی حیثیت دے دی گئی اور اسے جاری رکھنے کی اجازت دی گئی تو اس طرح کے مسائل متعہ کے موضوع میں زیر بحث آتے ہیں۔

ان مسائل میں سے ہم تیسری قسم کو اس کتاب میں زیر بحث لائیں گے کیونکہ اس کا تعلق تفسیر سے ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں ہم سابق الذکر مطالب میں خلاصہ کے طور پر مربوطہ امور بیان کر چکے ہیں اور اب یہاں اس میں اضافہ کرتے ہوئے مزید وضاحت کے ساتھ موضوع سے متعلق بنیادی امور ذکر کرتے ہیں اور ان مطالب واقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے حقیقت الامر کی وضاحت کرتے ہیں جو نکاح متعہ کی شرعی حیثیت کے حوالے سے آیت مبارکہ کی دلالت کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں اور ان میں ہمارے سابق الذکر مطالب کی نفی ہوئی ہے۔

تفصیلات ملاحظہ ہوں: جن حضرات نے آیۂ مبارکہ سے متعہ کے جواز کا انکار کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ آیت صرف دائمی نکاح میں حق مہر کے پورا پورا ادا کرنے کے تاکیدی بیان پر مشتمل ہے، اس سے اس کے علاوہ کچھ نہیں ثابت ہوتا جبکہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اس آیت میں ''استمتاع'' سے مراد نکاح متعہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے مقررہ مدت مثلاً ایک دن، ایک ہفتہ یا ایک مہینہ تک نکاح کرے، اور وہ اس مسئلہ میں ایک شاذ قرائت سے استدلال کرتے ہیں جو ابی، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے منسوب ہے اور اس کے علاوہ متعہ سے مربوط کچھ روایات وواقعات بھی پیش کرتے ہیں، جبکہ وہ جس قرائت کا حوالہ دیتے ہیں یعنی مذکورہ حضرات نے آیت کو اس طرح پڑھا، تو وہ شاذ ہے کہ جسے قبول نہیں کیا جاسکتا اور اس کا ''قرآن'' ہونا ثابت نہیں ہے، اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اگر اس طرح کے مسائل وموضوعات

میں پیش کی جانے والی روایت صحیح بھی ہو تب بھی وہ ''خبر واحد'' کے زمرے میں آتی ہے (اس طرح کے موضوعات میں خبر ''واحد'' حجت قرار نہیں پاتی) لہٰذا جو کچھ اس میں اضافہ ہوا ہے وہ تفسیر کے باب میں آتا ہے کہ جو بیان کرنے والے کا نتیجہ فہم و فکر ہے، اور کسی صحابی کے ذاتی فہم و فکر کو دین میں حجت اور قابل قبول امر قرار نہیں دیا جا سکتا بالخصوص اس صورت میں کہ جب بیان کا اسلوب و ترتیب اس سے مطابقت نہ رکھتا ہو بلکہ اس کی نفی کرتا ہو، یہی صورت حال زیر بحث موضوع میں پائی جاتی ہے اور وہ یوں کہ جو شخص نکاح متعہ کرتا ہے وہ زنا سے بچنے کے لئے اور اپنے آپ کو پاک دامن کہلانے و بنانے کے لئے ایسا نہیں کرتا بلکہ اس کا پہلا ارادہ ہی بدکاری کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس سے قطع نظر اگر اس عمل میں کسی حوالہ سے مرد کے لئے پاکدامنی کا پہلو موجود بھی ہو کہ جس کی بناء پر وہ اس دوران زنا و بدکاری سے محفوظ رہتا ہے لیکن عورت کے لئے کسی طرح سے پاکدامنی نہیں پائی جاتی، کیونکہ وہ ایک مدت کے لئے اپنے آپ کو مرد کے اختیار میں دے دیتی ہے اور جب بھی ایسا کرے تو اس کا حال ایک زنا کار عورت جیسا ہو جائے گا اور وہ اس طرح ہو جائے گی جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

کرۃ حذفت بصوالجۃ فتلقاھا رجل رجل

وہ فٹ بال ہے جس سے کھیلنے کے لئے لاٹھیوں کی ضرورت نہیں رہی کہ اب ایک کے بعد دوسرے مرد کے ہاتھ میں آجاتی ہے

یہ ہے متعہ کے مخالف شخص کا بیان، اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ اس کا یہ کہنا کہ شیعہ متعہ کی آیت کی قرائت ابن مسعود وغیرہ سے منسوب قرائت پر مبنی قرار دے کر متعہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں، قطعاً درست نہیں کیونکہ شیعوں کے بیانات کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ انہوں نے اس قرائت سے قطعی دلیل کے طور پر استدلال نہیں کیا، اور وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ شاذ قرائتوں کو حجت ہی نہیں سمجھتے خواہ وہ شاذ قرائتیں ان کے اپنے آئمہ ہی سے منسوب کیوں نہ ہوں، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی قرائت سے استدلال کریں جسے وہ حجت نہ سمجھتے ہوں اور وہ بھی اس کے سامنے استدلال کریں جو اسے حجت نہ سمجھتا ہو؟ یہ مضحکہ خیز بات ہے (یعنی شاذ قرائت کو اہل سنت بھی حجت نہیں مانتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ شیعہ اسی قرائت کے ذریعے ان کے سامنے متعہ کے جواز پر استدلال کریں) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعوں نے ان صحابہ کے قول سے استدلال کیا ہے جنہوں نے آیت کی قرائت اس طرح کی ہے، ان کی قرائت سے استدلال نہیں کیا بلکہ ان کے قول سے استدلال کیا ہے کہ وہ بھی متعہ کو جائز سمجھتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ اس آیت سے مراد متعہ ہے، خواہ ان کے قول کو اصطلاحی قرائت کا نام دیں یا تفسیر قرار دیں، دونوں صورتوں میں مقصود یہ ہے کہ انہوں نے آیت کے الفاظ سے یہی سمجھا ہے۔

یہ استدلال دو حوالوں سے شیعہ نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے: پہلا یہ کہ جو بات شیعہ کہتے ہیں وہی ان صحابہ نے کی ہے، اور وہ حضرات یعنی صحابہ و تابعین جنہوں نے ایسا کیا ہے وہ کثیر تعداد میں ہیں، جو شخص اس سلسلہ میں مزید اطمینان حاصل کرنا چاہے وہ ان کے بیانات کا مطالعہ کر کے حقیقت الامر سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ دوسرا حوالہ یہ ہے کہ آیۂ مبارکہ متعہ کے جواز پر دلالت

کرتی ہے چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان صحابہ نے بھی اس کی قرائت اسی طرح کی ہے جس طرح شیعہ کرتے ہیں اور ان سے جو روایات مذکور ہیں ان میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ وہ آیت سے نکاح متعہ ہی مراد لیتے ہیں لیکن اسے منسوخ سمجھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر وہ اس سے نکاح متعہ مراد نہ لیں تو اس کے منسوخ ہونے کا اظہار و دعویٰ بھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کے منسوخ ہونے سے متعلق کوئی روایت پیش کر سکتے ہیں کہ جو بہت زیادہ ہیں اور ان میں سے بعض ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، بنا برایں شیعہ ان روایات سے اسی طرح استفادہ کرتے ہیں، جس طرح مذکورہ بالا شاذ قرائت سے استفادہ کرتے ہیں۔

اور اس سے اپنے مطلوب و مقصود کی صحت کو یقینی ثابت کرتے ہیں لیکن وہ نہ تو شاذ قرائت کو حجت سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس کے منسوخ ہونے کو قرین صحت قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ ان سب سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس قرائت کے قائل حضرات اور راویوں کے بیانات میں اس حقیقت کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ وہ آیۂ مبارکہ سے نکاح متعہ کے ثبوت کو یقینی سمجھتے ہیں۔

اور جہاں تک اس کی اس بات کا تعلق ہے کہ صحابی کا قول اس طرح کے امور و مسائل میں حجت قرار نہیں پاتا بالخصوص کہ اسلوب کلام سے اس کی نفی ہوتی ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لفظ ''مسافحہ'' سے اس کا لغوی معنی مراد لیا ہے یعنی پانی بہانا اور ڈالنا و انڈیلنا، (منی کا رحم میں ڈالنا) اور پھر اسے ایسا کرنے والے کی نیت و ارادہ پر موتوف قرار دیا ہے کہ وہ اس سے کیا ارادہ رکھتا ہے، اس بناء پر اس نے کہا ہے کہ اگر وہ شخص ایسا کرنے میں صرف اپنی جنسی خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہو تو وہ سفاح یعنی زنا ہے نکاح نہیں ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے غفلت میں ہے کہ ''نکاح'' بھی لغت میں اسی عمل یعنی ہمبستری کا نام ہے، چنانچہ لغت کی مشہور کتاب ''لسان العرب'' میں ازہری نے یوں لکھا ہے: اصل النکاح فی کلام العرب الوطء، کلام عرب میں نکاح بمعنی وطی یعنی ہمبستری و جماع اور مباشرت ہے، اس بناء پر ''نکاح'' بھی ''سفاح'' یعنی زنا قرار پائے گا اور اس کے نتیجہ میں نکاح اور سفاح کے درمیان فرق کرنا مشکل ہوگا جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل میں ہیں۔

اس کے علاوہ یہ کہنا کہ صرف جنسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے متعہ کرنا زنا کہلاتا ہے تو اس معیار پر دائمی نکاح بھی زنا کہلائے گا کہ اگر اس میں جنسی خواہش کی تکمیل اور شہوت کو پورا کرنا مقصود ہو تو دونوں میں فرق نہ رہے گا، کیا کوئی مسلمان اس طرح کا فتوا دے سکتا ہے؟ اگر وہ یہ کہے کہ دائمی نکاح اور عارضی و موقت نکاح میں فرق ہے اور وہ یہ کہ دائمی نکاح اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس سے پاکدامنی اور افزائش نسل مقصود ہوتی ہے اور گھرانہ و خاندان کی تشکیل مطلوب واقع ہوتی ہے جبکہ مؤقت و عارضی نکاح میں ایسا نہیں ہوتا، تو اس کا یہ کہنا ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ جو فوائد و مقاصد دائمی نکاح میں ملحوظ ہوتے ہیں وہ سب مؤقت نکاح میں بھی ملحوظ قرار پا سکتے ہیں مثلاً پاکدامنی اور اپنے آپ کو زنا و بدکاری سے بچانا، سلسلہ نسب میں اختلال نہ آنے دینا، افزائشِ نسل و اولاد اور گھرانہ کی تشکیل، البتہ ان دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ مؤقت نکاح میں امت کے لئے آسانی و نرمی قرار دی گئی ہے کہ اس کے ذریعے وہ شخص اپنے آپ کو برائی سے بچا لیتا ہے جو غربت و ناداری

یا زوجہ کا نان ونفقہ ادا نہ کر سکنے یا سفر میں ہونے یا دیگر عوامل ووجوہات کی بناء پر دائمی نکاح نہ کر سکتا ہو۔

اسی طرح مؤقت نکاح کے جن آثار و مقاصد کی وجہ سے اس نے اسے زنا قرار دیا ہے مثلاً شہوت پرستی، جنسی خواہش کی تکمیل وغیرہ، تو وہ سب دائمی نکاح میں بھی جائز ہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ دائمی نکاح گھرانہ وخاندان کی تشکیل اور افزائش نسل کے لئے قرار دیا گیا ہے جبکہ نکاح متعہ میں نقصانات ہی نقصانات ہیں، ایک غلط و بے بنیاد دعویٰ ہے کہ جس کا نادرست ہونا کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔

اور اگر وہ یہ کہے کہ نکاح متعہ چونکہ ''سفاح'' زنا ہے لہٰذا وہ دائمی نکاح کے مقابل میں زنا کہلائے گا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''سفاح'' کا جو معنیٰ اس نے کیا ہے وہ زنا اور دائمی نکاح دونوں میں پایا جاتا ہے بالخصوص جب اس کا معنیٰ جماع و مباشرت (عورت کے رحم میں منی ڈالنا) ہو۔

اور اس کا یہ کہنا کہ ''ہر متعہ میں مرد کے لئے پاکدامنی اور برائی و بدکاری سے بچنے کا ایک پہلو پایا جاتا ہے تو وہ عورت کے لئے نہیں ہے'' نہایت عجیب وغریب بات ہے، کاش ہم اس سے پوچھ سکتے کہ نکاح متعہ میں مرد اور عورت کے درمیان اس حوالہ سے کیا فرق ہے جس کی بناء پر مرد اس عمل میں پاکدامنی کا قصد کر سکتا ہے جبکہ عورت ایسا نہیں کر سکتی؟ یعنی مرد تو متعہ کر کے اپنی پاکدامنی کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے آپ کو زنا و بدکاری سے بچا سکتا ہے مگر عورت ایسا نہیں کر سکتی؟ کیا یہ فضول اور بے معنی بات نہیں؟

اور جہاں تک اس شعر کا تعلق ہے جو اس نے اپنے استدلال میں پیش کیا ہے تو نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک علمی وحقیقی بحث میں کہ جس کا تعلق دینی حقائق کے ادراک سے ہے اور اس میں مقصود یہ ہے کہ اس حقیقت کو سمجھیں جس کے اہم آثار انسان کی دُنیاوی اور اُخروی زندگی میں پائے جاتے ہیں، ایک شعر کو دلیل کے طور پر پیش کیا جائے اور اس مطلوبہ حقیقت کی حیثیت اس قدر گرا دی جائی کہ اس کی بابت شعروں سے استدلال ہو، بہر حال متعہ خواہ حلال ہو یا حرام، اسے شعروں کے ذریعے زیر بحث لانا نہایت افسوس ناک اور تحقیق کے حوالہ سے نہایت کمزور طریقہ ہے، اشعار عام طور پر خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، شعر گوئی میں عام طور پر حق سے زیادہ باطل اور ہدایت سے زیادہ گمراہی کا پہلو پایا جاتا ہے، اس سے قطع نظر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس نے شعر سے استدلال کرنا ہی تھا تو جو روایات اس حوالہ سے ذکر ہوئی ہیں اور بالخصوص عمر کے قول والی روایت کہ جسے طبری نے ذکر کیا ہے اس کے ذیل میں یہ شعر یا کوئی دوسرا شعر کیوں پیش نہیں کیا کہ جس میں اس نے کہا: ''اب جس کا جی چاہے وہ جائے اور ایک مٹھی (گندم وغیرہ) دے کر متعہ کرلے اور پھر تین دن کے بعد طلاق دے دے'' (فالآن من شاء نکح بقبضة وفارق عن ثلاث بطلاق) تو اس کا اس طرح شعر وغیرہ سے استدلال کرنا اللہ اور رسول ﷺ کے فرمان پر اعتراض اور اس کی اہانت نہیں؟ کیونکہ خدا اور رسول ﷺ نے اس نکاح کو حلال وجائز قرار دیا اور

اس کی عملی تصدیق آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ کو معلوم تھا اور اس کی اطلاع بھی آپ ﷺ تک پہنچتی تھی کہ مسلمان نکاح متعہ انجام دیتے ہیں، یہ وہ حقیقت ہے جس میں کسی کو کوئی شک نہیں۔

عہد نبوی ﷺ میں متعہ کے حوالہ سے جو بیان ہوا ہے اس کی بابت ممکن ہے وہ یہ کہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس وقت متعہ کی جو اجازت دی وہ حالات کے تناظر میں تھی کیونکہ اس وقت عام مسلمان مالی طور پر نہایت کمزور تھے اور اپنی ضروریات زندگی پوری نہ کر سکتے تھے بلکہ شدید ترین تنگدستی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے، دوسری طرف جنگوں کا بازار گرم تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر والوں اور اہل وعیال سے دور ہوتے تھے چنانچہ سابق الذکر روایات میں اس حوالہ سے مربوط مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اگر ابتداء اسلام میں لوگوں کے درمیان متعہ کے عام ہونے اور ''نکاح متعہ'' اور ''استمتاع'' کے نام سے اس کی عام شہرت کو تسلیم کریں تو پھر آیہ مبارکہ کے اطلاق سے اس کے جواز کا اعتراف کرنا ناگذیر ہے اور چونکہ کسی آیت یا روایت سے اس کا منسوخ ہونا ثابت نہیں لہٰذا اس کے باوجود اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا جواز ختم کر دیا گیا، ایک طرح سے آیت کی دلالت میں بلا دلیل تاویل کرنے کے برابر ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اسے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر جائز قرار دیا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس کی ضرورت تھی لیکن سوال یہ ہے کہ آیا وہ ضرورت عہد نبوی ﷺ میں آنحضرت ﷺ کے بعد کے دور بالخصوص خلفاء کے زمانے سے بھی زیادہ شدید تھی؟ کیونکہ خلفاء کے زمانے میں مسلمانوں کے لشکر ہزاروں ولاکھوں افراد پر مشتمل تھے جو مشرق ومغرب میں سفر کرتے تھے، تو اس حوالہ سے عمر کی خلافت کے اوائل اور اواخر کے ایام میں کیا فرق تھا کہ اوائل کے ایام میں ضرورت موجود تھی اور اواخر میں نہ تھی؟ اوائل میں فقر وتنگدستی تھی اور اواخر میں نہ تھی؟ اوائل میں جنگیں تھیں اور اواخر میں نہ تھیں؟ اوائل میں دوسرے علاقوں میں سفر کرنا ہوتا تھا اور اواخر میں نہیں؟ اس کے علاوہ وہ دیگر عوامل جو اوائل کے ایام میں متعہ کے جواز کے لئے تھے وہ اواخر کے ایام میں نہیں تھے؟ اور پھر یہ کہ ضرورت، ضرورت ہی ہوتی ہے خواہ جس دور میں ہو، اگر ہم موجودہ دور اور عہد نبوی ﷺ کا موازنہ کریں کہ جس میں متعہ کے جواز کی بابت کسی کو شک نہیں اور پہلی و دوسری خلافتوں کے اوائل بلکہ پہلی خلافت میں پورے دور میں اور دوسری خلافت کے پہلے آدھے حصہ میں اس کا جواز یقینی طور پر ثابت ہے تو کیا موجودہ دور اس سے زیادہ سخت نہیں، جبکہ پورا عالم اسلام فقر وتنگدستی اور مالی طور پر نہایت شدید بحران کا شکار ہے اور استعماری حکومتوں و مسلمان ممالک پر حاکم فرعون صفت جابر حکمرانوں نے مسلمانوں کا خون تک چوس لیا ہے اور ان کے خداداد ذخائر کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ان کے خشک وتر پر قابض ہو چکے ہیں کہ اب ملت اسلامیہ مالی طور پر شدید ترین صورتحال سے دوچار ہے، اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں شہوت پرستی کا بازار گرم ہے اور استعماری طاقتوں نے اخلاقی

برائیوں اور جنسی اعمال کو اس قدر خوبصورت اور پُرکشش انداز میں پیش کر دیا ہے کہ مسلمان انہی میں اپنے شب و روز بسر کر رہے ہیں بلکہ ذرائع ابلاغ سے ان برائیوں کی کھلی دعوت دی جا رہی ہے اور روز بروز اس میں تیزی آ رہی ہے، یہاں تک کہ اس تباہ کن صورتحال نے پوری دنیا اور بنی نوع انسان کی اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور معاشرے کے مختلف طبقوں میں بدکاری کا ایک جال بچھا ہوا ہے جس میں نوجوان طبقہ، طالب علم، فوجی اور کارخانوں میں کام کرنے والے عام مزدور بھی شامل ہیں کہ جو عالم انسانیت کے اہم ترین عناصر اور معاشرے کے بنیادی ارکان شمار ہوتے ہیں۔

اس صورتحال کے پیش نظر کسی کو اس حقیقت میں شک نہیں اور نہ ہی شک کی گنجائش پائی جاتی ہے کہ جس ''ضرورت'' نے لوگوں کو زنا، لواط اور دیگر شہوانی اعمال کی طرف کھینچا ہے اور ان برائیوں کی گندی وادی میں دھکیل دیا ہے وہ ان کا مالی طور پر نادار و تنگدست ہونا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ گھر کے اخراجات کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے اور وہ مجبور ہو کر ایسے عارضی کام کاج کو اختیار کرتے ہیں جس کے باعث وہ نہ تو کہیں مستقل ٹھکانہ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی دائمی نکاح کر کے اس کی متعلقہ ذمہ داریوں کو ادا کر سکتے ہیں چنانچہ نوجوان پردیس میں جا کر علم حاصل کرتے ہیں اور وطن سے دور جا کر کام کرنے والے حضرات مالی بوجھ برداشت نہیں کر سکتے، تو اس تمام تر صورتحال کے باوجود سوال پیدا ہوتا ہے کہ صدرِ اسلام میں جبکہ اس طرح کی شدید ترین صورتحال نہ تھی بلکہ اس سے کہیں کمتر اور قابل برداشت تھی، متعہ کو حلال قرار دیا گیا تھا اور معاشرتی حوالہ سے اس کی انجام دہی کو جائز قرار دے کر اسے حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ سمجھا جاتا تھا لیکن عصر حاضر میں جبکہ وہ حالات شدید ترین صورت اختیار کر چکے ہیں اور اخلاقی بُرائیوں نے پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، تو اس کے جواز میں کیا رکاوٹ ہے؟

ان تمام مسائل کے علاوہ مذکورہ دانشور نے اپنے مؤقف کی تائید میں قرآنی حوالہ سے استدلال پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ متعہ قرآنی بیانات سے متصادم ہے اور اس میں کلام اللہ کے محکم اصولوں کی نفی کا پہلو پایا جاتا ہے مثلاً مؤمنین کی صفات میں یوں مذکور ہے:

○ ''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝'' (سورۂ مومنون آیات ۵ تا ۷)

(وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے سامنے یا اپنی کنیزوں کے سامنے، کہ اس پر ان کی ملامت و مذمت نہیں پس جو شخص اس کے علاوہ کچھ چاہے تو ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں)

یعنی ایسا کرنے والے اللہ کے حلال کئے ہوئے کو چھوڑ کر اس چیز کی طرف بڑھنے والے ہیں جسے اللہ نے ان کے لئے حرام قرار دیا ہے۔ اور یہ آیات اس آیت سے متصادم نہیں جس کی تفسیر ہم کر رہے ہیں یعنی ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ'' بلکہ وہ اسی کے ہم معنی ہیں لہٰذا نسخ کا مورد ہی نہیں بنتا، اور متعہ والی عورت تو زوجہ ہی نہیں کہ جس کے وہ حقوق ہوں جو شوہر پر بیوی کے ہوتے

ہیں اور شوہر بیوی کے حقوق دینے پر مامور ہے جیسا کہ خداوند عالم نے اس سلسلہ میں واضح ارشاد فرمایا ہے: ''وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ'' جبکہ خود شیعہ فقہاء سے منقول ہے کہ وہ متعہ والی عورت کو زوجہ والے حقوق اور اس سے مربوط احکام میں شامل نہیں سمجھتے، اور اسے ان چار بیویوں میں شمار ہی نہیں کرتے جن کا یکجا نکاح میں رکھنا مرد کے لئے جائز و حلال قرار دیا گیا ہے کہ اگر ان کے درمیان عدل کر سکتا ہو اور کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو تو اسے ایک ہی وقت میں چار شادیاں کرنے یعنی چار بیویاں رکھنے کا حق حاصل ہے بلکہ شیعہ حضرات مرد کو حق دیتے ہیں اور اس کے لئے جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ جس قدر چاہے عورتوں سے متعہ کرے اور وہ متعہ کرنے والے شخص کو اگر وہ زنا کا مرتکب ہو سنگسار کرنے کے قائل بھی نہیں کیونکہ اسے ''محصن'' یعنی شادی شدہ نہیں سمجھتے اور وہ یقینی طور پر کہتے ہیں کہ متعہ کرنے والا شخص ''مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ'' کے زمرے میں نہیں آتا، تو یہ سب کچھ شیعوں کا واضح و صریح تناقض ہے، یہاں تک کہ بعض مفسرین نے ان کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں متعہ والی عورت نہ تو میراث میں حصہ پاتی ہے نہ اس کا نان و نفقہ مرد پر واجب ہے، نہ ہی طلاق اور نہ ہی عدت ہے، بلکہ بیوی کے اس طرح کے حقوق و احکام اس کے لئے نہیں، بہر حال قرآن مجید سے متعہ کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ آیت کہ جسے متعہ کے جواز پر پیش کیا جاتا ہے اس کی دلیل یا دلیل کے مشابہ ہے۔

یہ ہے اس مفسر کا متعہ کے بارے میں قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہوئے اس کے عدم جواز پر کھلا بیان اب اس کا جواب ملاحظہ ہو:

اس کا یہ کہنا کہ متعہ قرآنی احکام کے منافی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ مومنون کی آیات ''الَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ......'' میں صرف بیویوں کے بارے میں حکم ہے جبکہ متعہ والی عورت بیوی نہیں ہوتی لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آیات متعہ کے جواز میں مانع ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ جملہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ......'' کا متعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک اس کی اس بات کا تعلق ہے کہ یہ آیات متعہ کو حرام قرار دیتی ہے تو اس میں اس نے غور ہی نہیں کیا یا پھر جان بوجھ کر اس حقیقت سے چشم پوشی کی کہ یہ آیات مکی ہیں جبکہ متعہ ہجرت کے بعد بھی فی الجملہ معمول تھا، تو کیا حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متعہ کو جائز قرار دے کر قرآن کے حرام کردہ عمل کو حلال قرار دیتے تھے؟ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول و فرمان قرآن کی نص اور صریح بیان کے مطابق یقیناً حجت ہے، اس سے خود قرآن میں ہی تناقص پیدا ہو جائے گا یا یہ کہ متعہ کو جائز قرار دینا اس کی حرمت پر دلالت کرنے والی آیات ''وَالَّذِينَ هُمْ........'' کو منسوخ کرتا ہے؟ اور منسوخ کرنے کے بعد دوبارہ قرآن مجید نے یا خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی ممانعت کر دی؟ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سورۂ مومنوں کی آیات مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گئیں اور منسوخ ہونے کے بعد دوبارہ محکم ہو گئیں، اس طرح کی بات کوئی بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی آج تک کسی مسلمان نے ایسا کہا بلکہ ایسا کہنا ممکن ہی نہیں۔ یہی بات اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ متعہ والی عورت بھی زوجہ ہے اور متعہ نکاح ہے

اوراس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیات متعہ کے شادی ہونے پر دلالت کرتی ہیں ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے متعہ کے جائز قرار دیئے جانے سے یہ آیات منسوخ قرار پائیں، بنابرایں یہ بات ثابت ہوئی کہ سورۂ مومنون کی آیات بھی متعہ کے جواز پر دلالت کرتی ہیں نہ یہ کہ اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہوں۔

اس مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ سورۂ مومنون اور سورۂ معارج کی آیات مبارکہ "وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ ...." دیگر آیات کی نسبت متعہ کی حلیت و جواز کی قوی ترین دلیل ہیں کیونکہ تمام علماء اسلام اس پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ یہ آیات، محکمات میں سے ہیں کہ جو منسوخ نہیں ہوئیں اور مکی ہیں، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے متعہ کا جائز قرار دیا جانا مسلم الثبوت اور دین کی ناقابل انکار حقیقتوں میں سے ہے۔ اگر متعہ والی عورت زوجہ نہ ہوتی تو متعہ جائز قرار دینا ان آیات کو منسوخ کر دیتا جبکہ وہ منسوخ نہیں ہوئیں، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ متعہ کرنا شرعی طور پر زوجیت ہی ہے، تو جب آیات سے اس کے تشریع و جواز ثابت ہو گیا تو یہ ادّعاء خود بخود غلط ہو جائے گا کہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا کیونکہ یہ ادّعاء آیات کے منافی ہے اور اس سے آیات کا منسوخ ہونا تسلیم کرنا پڑے گا جبکہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ آیات منسوخ نہیں ہوئیں اور ان کے منسوخ نہ ہونے پر تمام علماء اسلام متفق ہیں اور سب کی ایک ہی رائے ہے۔ بہر حال اس مفسر کے بیان کے بالکل برعکس، حقیقت یہ ہے کہ متعہ والی عورت زوجہ ہوتی ہے اور متعہ نکاح ہے، متعہ کے نکاح ہونے کی بابت یہی دلیل کافی ہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں جو روایات ذکر کی ہیں ان سب میں صحابہ کرام اور تابعین نے اسے نکاح قرار دیتے ہوئے اس کی بابت "نکاحِ متعہ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں یہاں تک کہ ان روایات میں بھی اسے "نکاح" کہا گیا ہے جن میں عمر بن خطاب کی زبانی اس کی ممانعت مذکور ہے مثلاً وہ روایت جو بیہقی نے حضرت عمر کے خطبہ کے حوالہ سے ذکر کی ہے اور وہ روایت جو مسلم نے ابونضرہ کے اسناد سے ذکر کی ہے کہ جس میں ان الفاظ سے اس کے بارے میں کہا گیا ہے: ان عورتوں سے نکاح کرنے سے باز رہیں، اور کنز العمال کی روایت میں سلیمان بن یسار۔ کے حوالہ سے یوں مذکور ہے: "لوگوں کو واضح طور پر بتاؤ تا کہ نکاح اور زنا میں فرق معلوم ہو سکے" تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ متعہ نکاح ہے زنا نہیں، چنانچہ اس کے بارے میں وضاحت کرنے کے الفاظ "بینوا" سے ہمارے مطلوب کا اثبات ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ متعہ کا نکاح ہونا اور متعہ والی عورت کا زوجہ ہونا قرآنی اصطلاح و استعمال میں اور صدر اول کے مسلمانوں یعنی صحابہ و تابعین کی زبانوں پر عام ہونا ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے، اور لفظ "نکاح" اور لفظ "تزویج" (ازدواج و شادی) کا دائمی نکاح کے لئے مخصوص ہو جانا عمر کی طرف سے متعہ کی نہی و ممانعت اور اس کے بعد لوگوں کے درمیان اس عمل کے ختم ہو کر رہ جانے کے نتیجہ میں ہوا کہ پھر یہ دو لفظ دائمی نکاح کے سوا کسی مورد میں استعمال نہ ہو سکے بلکہ جب

بھی وہ استعمال ہوئے یا ہوتے ہیں ان سے دائمی نکاح ہی سمجھا گیا اور سمجھا جاتا ہے جیسا کہ دیگر شرعی حقائق کا حال ہے۔ مثلاً لفظ ''صلوٰۃ'' جو کہ لغت میں دعا کے لئے بنایا گیا تھا مگر شرعی اصطلاح میں اس قدر عام ہوا کہ اب اس سے لغوی معنی کی بجائے صرف شرعی اصطلاحی معنیٰ ہی سمجھا جاتا ہے کہ اس صورتحال کو علمی زبان میں ''تبادر'' کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی لفظ کے استعمال سے اس کا مخصوص معنیٰ سمجھا جائے اور فوراً ذہن اسی کی طرف متوجہ ہو جائے۔

اس بیان سے اس مفسر کا یہ کہنا بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ شیعہ متعہ والی عورت کو زوجہ کے حقوق و احکام اور متعلقہ امور سے محروم کرتے ہیں، اس سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ زوجہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟ جہاں تک قرآنی اصطلاح میں زوجہ کے اطلاق کا تعلق ہے تو شیعہ اس میں دائمی نکاح اور متعہ میں فرق قرار نہیں دیتے بلکہ کسی استثناء کے بغیر اس کے حقوق اسے عطا کرتے ہیں، اور جہاں تک اہل دین کے نزدیک ''بیوی'' کے مفہوم کا تعلق ہے تو ہم جس طرح پہلے بیان کر چکے ہیں کہ شیعہ متعہ والی عورت کے لئے ان مخصوص احکام کے قائل نہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں، کیونکہ شیعہ روایات و احادیث کی پیروی کرتے ہیں اور ان میں ان امور کی بابت وضاحت کے ساتھ احکام بیان کئے گئے ہیں جن میں بعض مخصوص ہیں اور بعض مستثنیٰ ہیں لہٰذا اس میں ضروری ہے کہ احادیث کے مطابق عمل کیا جائے اپنے قیاس پر عمل کرنا درست نہیں۔

اور اس مفسّر کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ شیعوں کے نزدیک متعہ کرنے والا شخص اگر زنا کا مرتکب ہو تو اس پر ''مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ'' کا اطلاق صحیح نہ ہونا صریح تناقض ہے۔ اس سلسلے میں ہم اس جملے کی تفسیر میں پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس کے ظاہری الفاظ چونکہ ملک الیمین کے لئے بھی ہیں لہٰذا اس کے حوالہ سے یہاں ''مُحْصِنِيْنَ'' میں ''احصان'' سے مراد عفت و پاکدامنی ہے شادی شدہ ہونا مراد نہیں، اور اگر بالفرض اس سے احصان الازدواج یعنی شادی شدہ ہی مقصود ہو تو آیت مبارکہ کا اطلاق نکاح متعہ پر بھی ہوتا ہے، اور متعہ والے شخص کو زنا کے ارتکاب پر سنگسار نہ کیا جانا جبکہ سنگسار کرنا قرآنی حکم بھی نہیں۔ سنت و حدیث کے مطابق ہے کیونکہ سنت و حدیث میں یہی بیان ہوا ہے یا یہ کہ سنگسار کے عمومی حکم میں استثناء پایا جاتا ہے جیسا کہ زوجیت کے دیگر احکام میں استثناء کا ثبوت سنت و حدیث کے ذریعے ہوا ہے مثلاً وراثت، نان و نفقہ، طلاق اور تعددِ ازواج، تو ان تمام امور کی دلیل قرآنی آیات کی بجائے سنت و حدیث ہے جو کہ احکام کی ادلہ میں سے ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ احکام پر مشتمل آیات مبارکہ میں اگر اجمال اور عدم وضوح ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آیات اصل تشریع اور دستور العمل کو بیان کرتی ہیں اور اس دستور العمل پر سنت و حدیث میں جو شرائط و قیود ذکر ہوئی ہیں وہ آیات کی توضیح اور ان میں مذکور احکام کی تشریح کے طور پر ہیں عمومی حکم کی تخصیص و تقیید کے لئے نہیں ہوتیں، ہاں اگر کسی مورد میں عموم و اطلاق پایا جاتا ہو تو سنت و حدیث کے بیانات تخصیص و تقیید کا کام کرتے ہیں تو اسے تناقض اور دو دلیلوں یعنی قرآن و سنت کا ایک دوسرے سے ٹکرانا نہیں کہا جاسکتا، بہرحال اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے علم اصول الفقہ کی طرف رجوع

کیا جاسکتا ہے کہ جس میں تخصیص وتقیید اور تناقض وتعارض وغیرہ کے بارے میں بنیادی اصول وقواعد مذکور ہیں۔

اور اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ آیات مبارکہ یعنی میراث، طلاق اور نفقہ کے احکام پر مشتمل آیات دیگر آیات الاحکام کی طرح تخصیص وتقیید سے خالی ومبرّا نہیں بلکہ ان میں تخصیص وتقیید کی گنجائش موجو ہوتی ہے جیسا کہ مرتد ہوجانے والی عورت کی وراثت وطلاق، کسی عیب کے ظاہر ہوجانے کے باعث طلاق اور فسخ العقد کا جواز اور عورت کے ناشزہ و نافرمان وگستاخ ہوجانے کی صورت میں نفقہ کا عدم وجوب، یہ سب احکام تخصیص وتقیید ہی کی صورتیں ہیں، تو جب احکام میں ایسا ہوتا اور ہوسکتا ہے تو متعہ کے ذریعے سنگسار کے حکم کی تخصیص بھی ہوسکتی ہے جو کہ ہوئی ہے، بنابرایں جن بیانات میں نکاح متعہ کی بابت میراث وطلاق اور نفقہ کے استثنائی احکام مذکور ہیں وہ تخصیص وتقیید ہی پر مبنی ہیں، جہاں تک ''تزویج'' ''نکاح'' اور ''احصان'' کے الفاظ کا تعلق ہے کہ اس طرح کے الفاظ دائمی نکاح ہی کے لئے استعمال ہوتے ہیں تو وہ حقیقت متشرعہ یعنی اہل دین کی مخصوص اصطلاحات ہیں حقیقت شرعیہ یعنی خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے متعین الفاظ نہیں ہیں لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں اور اس سے کوئی خرابی پیدا ہی نہیں ہوتی مثلاً اگر کوئی فقیہ یہ کہے کہ شادی شدہ شخص اگر زنا کا مرتکب ہو تو اسے سنگسار کرنا واجب ہے اور اگر اس کی زوجہ متعہ والی ہو (دائمی نکاح نہ ہو) تو اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ ''محصن'' نہیں یعنی دائمی نکاح والی زوجہ والا نہیں، تو اس میں کوئی حرج لازم نہیں آتا کیونکہ اس فقیہ کا ''احصان'' سے مراد دائمی نکاح ہے کہ جس کے آثار واحکام میں سنگسار کا حکم ہے، اس سے اس قرآنی اصطلاح کی نفی نہیں ہوتی جس میں ''احصان'' دائمی وموقت دونوں میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے مخصوص احکام بھی ہوں۔

اس مفسر کی یہ بات سراسر بہتان ہے کہ جس میں اس نے کہا کہ بعض شیعوں کی طرف سے منقول ہے کہ وہ متعہ میں عدت کے قائل نہیں۔ ہماری کتب حدیث وفقہ میں کثرت کے ساتھ روایات مذکور ہیں اور اس سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث احکام سے بھری پڑی ہیں کہ متعہ والی عورت کی عدّت دو مرتبہ حیض کا آنا ہے چنانچہ سابقہ مباحث میں اس سلسلہ کی بعض روایات ذکر کی جاچکی ہیں جو حضرات آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں۔

اس نے کہا: متعہ کے بارے میں جو احادیث وروایات وارد ہوئی ہیں ان سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ بعض جنگوں میں اپنے اصحاب کو اس کی اجازت دیتے تھے پھر آپ ﷺ نے انہیں اس سے منع کردیا، پھر ایک یا دو بار اس کی اجازت دی اور پھر ہمیشہ کے لئے اس کی ممانعت فرمادی۔ اور آپ ﷺ نے اس کی اجازت اس بناء پر دی کہ آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ بعض صحابہ کے لئے زنا سے اجتناب کرنا دشوار ہے کیونکہ وہ اپنی بیویوں سے دور ہیں، گویا متعہ، دو گناہوں اور نقیصان دہ اعمال میں سے خفیف تر اور کمتر کے ارتکاب کی ایک صورت ہے کیونکہ جب کوئی شخص کسی بے شوہر عورت سے مؤقت وعارضی نکاح کرے اور معینہ مدت تک اس کے ساتھ رہے تو یہ کسی خاتون سے زنا کرنے سے تو

یقیناً کمتر ہے کہ اگر اسے ایسا نہ کرنے دیا جائے تو وہ ہر روز کسی عورت سے زنا کرتا رہے گا اور جو عورت اس کی دسترس میں آئے گی وہ اس سے برائی کرنے سے باز نہ آئے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا یہ کہنا کہ حضور ﷺ نے بعض جنگوں میں متعہ کی اجازت دی، پھر اس سے منع کیا، پھر ایک یا دو بار اس کی اجازت دی اور پھر ہمیشہ کے لئے اس کی ممانعت فرما دی، تو یہ ساری باتیں سابق الذکر روایات سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتیں، آپ خود ان روایات کا مطالعہ کریں کہ جن میں سے اکثر ذکر ہو چکی ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مجموعی طور پر وہ روایات اس مفسر کے بیانات کی نفی وتکذیب کرتی ہیں بلکہ اگر علمی طور پر ان روایات میں پائے جانے والے بعض مختلف حوالوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جمعی تجزیہ کیا جائے تو اس سے اس مفسّر کے ہر لفظ وہر حرف کی عدم صحت سامنے آجائے گی۔

اس مفسّر نے اپنے مؤقف کو درست ثابت کرنے میں ایک بار پھر یہ کہا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ صرف ایک یا دو بار متعہ کی اجازت دی گئی جو کہ زنا سے ہمیشہ کی ممانعت کا تدریجی طریقہ تھا اور یہ اسی طرح سے تھا جیسے شراب کو تدریجی طور پر حرام کیا گیا، اور یہ دونوں بُرائیاں یعنی زنا وشرابخوری زمانہ جاہلیت میں عام تھیں البتہ زنا صرف کنیزوں میں عام تھا آزاد یعنی وہ عورتیں جو کنیزیں نہیں تھیں وہ زنا سے اجتناب کرتی تھیں۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس کا یہ کہنا کہ متعہ زنا سے تدریجی ممانعت کا ایک انداز تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ متعہ کو وہ لوگ زنا کی ایک قسم سمجھتے تھے اور زمانہ جاہلیت میں وہ زنا کی صورت میں عام تھا کہ جسے حضور ﷺ نے زنا سے تدریجی طور پر منع کرنے کے لئے جائز اور پھر حرام اور پھر جائز اور پھر ہمیشہ کے لئے حرام قرار دیا تا کہ لوگ آسانی سے زنا کی حرمت کا حکم قبول کر لیں، گویا آنحضرت ﷺ نے متعہ کے علاوہ زنا کی دیگر اقسام کو ممنوع کیا اور صرف متعہ کے زنا کو باقی رکھا کہ جس کی اجازت دی اور پھر اس کی ممانعت کی پھر اجازت دی یہاں تک کہ اس سے ہمیشہ کی ممانعت کی راہ ہموار ہو گئی تو آنحضرت ﷺ نے اسے ابدی حرام قرار دے دیا۔

آپ ملاحظہ کریں کہ ان بیانات میں شریعت اسلامیہ کے احکام کی کس طرح تضحیک کی گئی اور اسے کھیل تماشہ بنا دیا گیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس مقدس شریعت کے ذریعے لوگوں کے نفوس کی تطہیر و پاکیزگی اور امت محمدیہ ﷺ پر اپنی نعمتوں کے پورا کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ لوگ اعلیٰ وعمدہ زندگی بسر کر سکیں۔

اس مفسّر کے بیان کا تفصیلی جواب یہ ہے کہ اس پر چار طرح سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

پہلا اعتراض:۔ اس سے آنحضرت ﷺ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، پھر اجازت دی، پھر منع فرمایا، پھر اجازت دی اور پھر ہمیشہ کے لئے منع فرما دیا، اگر بالفرض سورۂ معارج اور سورۂ مومنون کی آیات "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ......." کو متعہ کی حرمت کی دلیل مان بھی لیں، جیسا کہ اس مفسّر نے اس

پر اصرار اور بہت زور دیا ہے تب بھی اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے متعہ کی اجازت دے کر آیات کو منسوخ کیا، پھر اس سے منع کر کے اس نسخ کو منسوخ کیا اور آیات کو محکم کر دیا، پھر اجازت دے کر آیات کو دوبارہ منسوخ کیا اور پھر منع کر کے آیات کو "محکم" کیا، پھر اسے منسوخ کر کے آیات کو منسوخ کیا، کیا یہ سب کچھ کتاب اللہ کے ساتھ کھیل تماشہ کرنا اور اس کا مذاق اڑانا نہیں؟ اس طرح کی نسبت اس ہستی کی طرف دینا جو کلام خدا کے اسرار و رموز کی امین اور کائنات کے لئے ہادیٔ اعظم ہیں ان کی توہین نہیں؟ اس کے علاوہ یہ کہ مذکورہ آیات مکی ہیں اور وہ مدنی آیات کو کس طرح منسوخ کر سکتی ہیں۔

دوسرا اعتراض:۔ جن آیات میں زنا کی حرمت مذکور ہے وہ نہایت واضح الفاظ پر مشتمل ہیں ان میں تدریجی انداز کا شائبہ و اشارہ تک نہیں پایا جاتا، ملاحظہ ہو:

- سورۂ اسراء، آیت: ۳۲

"وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝"

(اور تم زنا کے نزدیک نہ جاؤ کہ وہ برائی اور بہت برا راستہ ہے)۔

یہ مکی آیات میں سے ہے اور برائیوں سے ممانعت کے حکم پر مشتمل آیات کے درمیان واقع ہے۔

- سورۂ انعام، آیت: ۱۵۱

"قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ .... وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ"

(کہہ دیجئے، آؤ تا کہ میں تمہارے سامنے بیان کروں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے......اور تم برائیوں کے قریب نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوں)۔

اس آیت میں لفظ "اَلْفَوَاحِشَ" ذکر ہوا ہے جو "فاحشة" کی جمع کا صیغہ ہے اور اس پر الف و لام استغراق اور عمومیت کا معنیٰ دیتا ہے کیونکہ یہ لفظ نہی کے سیاق میں آیا ہے لہٰذا اس سے ہر برائی و زنا مراد ہے، اور یہ آیت بھی مکی ہے۔

- سورۂ اعراف، آیت: ۳۳

"قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ"

(کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے فواحش و برائیوں کو حرام قرار دیا ہے خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی ہوں)

یہ آیت بھی مکی ہے۔

- سورۂ مومنون، آیات: ۵ تا ۷، سورۂ معارج، آیت: ۳۱

"وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝"

(اور وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے یا ان عورتوں کے جو ان کی ملکیت ہوں (کنیزیں) کہ وہ اس میں موردِ ملامت قرار نہیں پاتے، پس جو شخص اس کے علاوہ کچھ چاہے تو ایسے لوگ عدوان کرنے والے ہیں۔

یہ دونوں سورتیں (المؤمنون، المعارج) مکی ہیں، اور اس مفسر کے بقول ان میں بھی متعہ کو زنا کی دیگر اقسام کی طرح حرام قرار دیا گیا ہے۔

تو یہ وہ آیات ہیں جن میں زنا کی ممانعت ہوئی ہے اور فاحشہ یعنی برائی کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ تمام آیات مکی ہیں اور ان میں زنا کی حرمت صریح الفاظ میں مذکور ہے، تو ان میں حرمت کا تدریجی بیان اور ممانعت کا تدریجی انداز کہاں پایا جاتا ہے؟ کیا وہ مفسّر یہ کہنا چاہتا ہے جیسا کہ اس کے مؤقف اور سورۂ مومنون کی آیات کو متعہ کی حرمت کی دلیل سمجھنے سے ظاہر بلکہ اس کا لازمی نتیجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعہ سے سختی کے ساتھ منع فرمایا مگر حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے اسے عملی طور پر تدریجاً حرام قرار دیا یعنی بار بار اجازت دے کر اسے ہمیشہ حرام قرار دینے کی راہ ہموار کی تا کہ لوگ اس حکم کو ماننے پر تیار ہوں گویا حضور ﷺ نے خدا کے حکم کے نفاذ میں عملی طور پر سستی سے کام لیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس عملی سستی کے انداز پر سختی برتی ہے اور آنحضرت ﷺ کو اس حوالہ سے سخت فرمان جاری کیا ہے، ملاحظہ ہو:

○ سورۂ اسریٰ، آیت: ۷۳ تا ۷۵

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

(اگر وہ کوشش کریں کہ آپ کو اس چیز سے روگرداں کریں جو ہم نے آپ پر وحی کی ہے تا کہ آپ اس کے علاوہ کی ہم پر افتراء و تہمت لگا دیں تو وہ تب آپ کو دوست بنا لیں گے ○ اگر ہم آپ کو ثابت قدم و پائدار نہ بناتے تو ممکن تھا آپ قدرے ان پر بھروسہ کر لیتے ○ اگر آپ ایسا کرتے تو ہم آپ کو زندگی و موت کی تلخیاں چکھا دیتے، پھر آپ ہمارے خلاف کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے)۔

تیسرا اعتراض:۔ آنحضرت ﷺ کی طرف متعہ کے بار بار جائز و حلال کرنے اور اس کے انجام دینے کی اجازت دینے کی جو نسبت دی گئی ہے وہ کس بناء پر تھی؟ اگر وہ اس کے شرعی طور پر حلال نہ ہونے کے باوجود تھی جبکہ آپ لوگ متعہ کو زنا و برائی و بدکاری سمجھتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے اگر اسے خود اپنی طرف سے حلال کیا اور اس کی اجازت دی تو وہ حضور ﷺ کی طرف سے خدا کی نافرمانی قرار پائے گی جبکہ آنحضرت ﷺ خدائی عصمت کے ساتھ معصوم ہیں اور ان سے خدا کی نافرمانی کا تصور ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر وہ خدائی حکم تھا اور آپ ﷺ نے خدا کے حکم پر اس کی

اجازت دی تو آپ لوگوں کے عقیدہ کے مطابق کہ متعہ زنا و بدکاری ہے یہ لازم آئے گا کہ خدا نے خود ایک بدکاری کا حکم دیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس احتمال وامکان کو رد کرتے ہوئے اپنے نبی ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے صریح الفاظ میں یوں ارشاد فرمایا:

○ سورۂ اعراف، آیت: ۲۸

"قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ........"

(کہہ دیجئے کہ اللہ برائی وبدکاری کا حکم نہیں دیتا)

اور اگر آنحضرت ﷺ کا متعہ کی اجازت دینا اسے شرعی طور پر حلال قرار دینے کی بناء پر تھا تو اسے زنا و بدکاری قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے جائز قرار دیا جانے والا عمل ہے اور مضبوط بنیادوں پر مخصوص و معین شرائط کے ساتھ استوار ہے کہ دائمی نکاح کی طرح اس میں بھی نسبی رشتوں کی پاسداری ملحوظ ہوتی ہے اور جن عورتوں سے دائمی نکاح حرام ہے ان سے متعہ بھی نہیں ہوسکتا، اس کے ساتھ ساتھ اس میں دائمی نکاح کی طرح حق مہر واجب ہے اور عدت ضروری ہے تا کہ اولاد ہونے کی صورت میں نسبی اختلاط پیدا نہ ہونے پائے اور نسب کی نسبتوں میں اختلال وبدنظمی کی صورت نہ بنے، اس کے باوجود اسے "بدکاری" سے موسوم کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جبکہ شریعت اسلامیہ میں "بدکاری" صرف اس عمل کو کہتے ہیں جسے معاشرہ برائی قرار دیتا ہو کیونکہ اس طرح کے عمل میں کہ جسے معاشرتی برائی قرار دیا جاتا ہو عمومی مصلحتوں اور معاشرتی اقدار کی نفی ہوتی ہے اور اس سے معاشرتی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں، جبکہ زیر نظر موضوع میں ایسی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔

چوتھا اعتراض:۔ متعہ کو زمانہ جاہلیت میں زنا کی ایک قسم کے طور پر مروجہ رسم و عادت قرار دینا تاریخ میں من گھڑت اضافہ اور ایسا بے بنیاد دعویٰ وسفید جھوٹ ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کیونکہ کتب تاریخ میں اس کی بابت کوئی حوالہ ونشان موجود نہیں بلکہ متعہ اسلام کا قائم کردہ قانون وحکم ہے کہ زمانہ جاہلیت میں موجود و معمول ہی نہ تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُمت محمدیہ ﷺ کے لئے آسانی کی غرض سے یہ حکم صادر ہوا ہے تا کہ اس طرح لوگ اپنی طبعی ضرورت کو پورا کرسکیں اور زنا و دیگر برائیوں کے معاشرہ میں پھیلنے سے بچ سکیں، کاش کہ امت اسلامیہ اس سنت الٰہیہ کے قائم و باقی رکھنے کی توفیق پاتی تو اسلامی حکومتیں زنا اور دیگر فواحش و برائیوں کی بابت جس طرح بے پرواہی وچشم پوشی سے کام لیتی ہیں اس طرح نہ ہوتا کہ جس کے نتیجہ میں وہ تدریجی طور پر قانونی دائرہ میں آگئیں اور پھر دنیا میں اخلاقی فساد وتباہی ہی تباہی پھیل گئی۔

اور اس مفسر کا یہ کہنا کہ وہ دو برائیاں زمانہ جاہلیت میں عام رائج تھیں لیکن زنا صرف کنیزوں میں عام تھا آزاد عورتوں میں عام نہ تھا، اس قول میں "دو برائیوں" سے بظاہر اس کی مراد زنا اور شراب خوری ہے کہ وہ دو بُرائیاں زمانہ جاہلیت میں عام تھیں، یہ بات درست ہے البتہ زنا کا آزاد وغیر کنیز عورتوں کی بجائے کنیزوں میں عام ہونا درست نہیں اور اس کی کوئی

دلیل ہمارے پاس موجود نہیں جس کی بناء پر ایسا کہا جا سکے کیونکہ مختلف تاریخی شواہد سے اس کی نفی ہوتی ہے مثلاً وہ اشعار جو اس سلسلے میں کہے گئے ہیں، اور ابن عباس کی روایت میں یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ زنا کو اگر علانیہ طور پر انجام نہ دیا جائے تو برا نہیں سمجھتے تھے۔

ہمارے مؤقف کی صحت اور اس مفسر کے بیان کی عدم صحت کی ایک دلیل زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا حقیقی بیٹوں اور منہ بولے بیٹوں کے حوالہ سے آپس میں نزاع و جھگڑا کرنا ہے کیونکہ اس طرح کے دعوے برائے نام نہ ہوتے تھے اور نہ ہی ان نسبتوں کو معمولی سمجھا جاتا تھا بلکہ وہ اسے خاص اہمیت دیتے تھے اور ان کے طاقتور افراد ان نسبتوں سے اپنی افرادی قوت و عددی کثرت کا اظہار کرتے تھے اور وہ ان نسبتوں کی صحت کا استناد آزاد و غیر کنیز عورتوں بلکہ شادی شدہ عورتوں سے اپنے زنا کے ارتکاب سے کرتے تھے یعنی وہ کہتے تھے کہ یہ ان کا بیٹا ہے کیونکہ انہوں نے فلاں عورت (کنیز یا شادی شدہ) سے زنا کیا تھا اور اس سے یہ بچہ پیدا ہوا لہٰذا یہ ان کا حقیقی بیٹا ہے (گویا جہالت اس حد تک تھی کہ کسی شادی شدہ عورت سے زنا کے ارتکاب پر مباہات کرتے تھے اور اس سے جنم لینے والے بچے کو اپنی اولاد کہنے پر فخر کرتے تھے) اور جہاں تک کنیزوں کا تعلق ہے تو ان کے بڑے لوگ ان سے نزدیکی کرنے کو اپنے لئے عیب سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ جنسی روابط قائم کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے، اور وہ اپنی کنیزوں سے صرف یہ کام لیتے تھے کہ انہیں دوسروں کے پاس بھیج کر ان سے بدکاری کروانے سے مال کماتے تھے یعنی جنسی کاروبار کرتے تھے اور کنیزوں کو اس کاروبار میں استعمال کرتے تھے جس سے انہیں خوب مال ملتا تھا، چنانچہ اس کا ثبوت تاریخ وسیرت کی کتب میں مذکور ان واقعات سے ملتا ہے جن میں بچوں کی نسبتی نسبتوں والحاق کے تذکرے ہوئے ہیں مثلاً معاویہ بن ابی سفیان کا زیاد بن ربیہ کے بارے میں اسے اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دینا، کہ اس مطلب اور اپنے دعوے پر معاویہ نے کئی گواہ بھی پیش کئے جنہوں نے اس دعوے کی صحت کی گواہی دی (معاویہ نے دعویٰ کیا کہ زیاد بن ربیہ اس کا بھائی ہے کیونکہ اس کے باپ یعنی ابوسفیان نے زیاد کی ماں سے زنا کیا تھا جس سے زیاد پیدا ہوا تھا لہٰذا وہ باپ کی طرف سے اس کا بھائی بنتا ہے) یہ اور اس کے علاوہ دیگر متعدد واقعات تاریخ کی کتب میں درج ہیں کہ جن میں زنا سے پیدا ہونے والے بچوں کو اپنے ساتھ ملحق کرنے کے دعوے کئے گئے ہیں۔

یہاں ایک مطلب قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر زمانۂ جاہلیت میں آزاد یعنی غیر کنیز عورتوں کے درمیان زنا کے عام نہ ہونے پر ھند جگر خوار کی اس بات سے استشہاد و استناد کیا جائے کہ جو اس نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کرنے کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کی تھی کہ کیا آزاد عورت بھی زنا کر سکتی ہے؟ (وھل الحرۃ تزنی؟) تو شاید اس مفسر کی بات درست ثابت ہو جاتی لیکن اگر ھند کے بارے میں حسان بن ثابت کے اشعار کا مطالعہ کیا جائے اور ان میں اچھی طرح غور کیا جائے کہ جن میں اس نے جنگ بدر اور جنگ احد کے بعد ھند کے بارے میں اس کی بدکاریوں سے پردہ اُٹھایا ہے تو غلط فہمی دور ہو جائے گی

اور حقیقت حال کھل کر سامنے آجائے گی، لہٰذا ھند کے بیان پر زیادہ تبصرہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس مفسّر نے جو احادیث ذکر کی ہیں ان کے معانی کی بابت مزید چھان بین اور خود اس کی اپنی نظر میں ان کے درمیان پائے جانے والے تناقضات کو دور کرنے کی غرض سے متعہ کے حوالہ سے اہل سنت کے عقیدہ کا خلاصہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ اہل سنت کے پاس متعہ کی حرمت پر تین دلیلیں موجود ہیں: پہلی دلیل یہ ہے کہ اس کی حلیت خواہ ان قرآنی آیات مبارکہ کے الفاظ سے صریح اور ''نص'' کی صورت میں ثابت نہ بھی ہو لیکن ان کے ظواہر کے منافی ہے جن میں نکاح، طلاق اور عدت کے احکام بیان کئے گئے ہیں، دوسری دلیل یہ ہے کہ ایسی روایات موجود ہیں جو اس کی قیامت تک ابدی حرمت کو ثابت کرتی ہیں اور تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر نے اس سے منع کیا اور اس کی ممانعت کا اعلان و اظہار برسر منبر کیا اور وہاں موجود صحابۂ کرام میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا بلکہ سب نے ان کی تصدیق و تائید کی اور صحابۂ کرام کبھی کسی غلط بات پر خاموش نہیں رہتے تھے بلکہ اگر حضرت عمر سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو وہ انہیں اس سے روک دیتے تھے، اس کے علاوہ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ حضرت عمر کا متعہ سے منع کرنا خود ان کے اپنے اجتہاد پر مبنی نہ تھا بلکہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس کی ممانعت کے مسلم الثبوت ہونے کی بناء پر تھا اور ان کا یہ کہنا کہ میں متعہ کو حرام قرار دیتا ہوں تو درحقیقت وہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرام کردہ عمل کو لوگوں کے سامنے اپنی زبان میں بیان کرنے کا ایک انداز تھا یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا عملی نفاذ تھا، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ شافعی نے نبیذ یعنی کشمش کی شراب کو حرام قرار دیا ہے جبکہ ابوحنیفہ نے اسے حلال قرار دیا۔

یہ ہے اس مفسر کے بیان و دلائل کا خلاصہ، جہاں تک اس کی پہلی اور دوسری دلیلوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہم حقیقت الامر کا واضح الفاظ میں اظہار کر چکے ہیں کہ اب اس حوالہ سے مزید مطالب پیش کرنے کی ضرورت نہیں، اب رہی تیسری دلیل کہ جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمر نے متعہ کو حرام قرار دیا اور اس کا اعلان صحابہ کے سامنے کیا مگر کسی نے ان پر اعتراض نہ کیا بلکہ خاموش رہے، تو اس کی بابت عرض یہ ہے کہ حضرت عمر نے متعہ کو اپنے اجتہاد کی بناء پر حرام کیا ہو یا اس مفسر کے بقول حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرام کردہ عمل کو بیان کیا ہو، اور صحابہ کا حضرت عمر کے اعلان پر خاموش رہنا خواہ ان سے ڈر اور ان کی طرف سے مخالفت کرنے والے کو سزا دینے کی دھمکی کے خوف سے ہو یا حضرت عمر کی ہاں میں ہاں ملانے کے طور پر ہو یا اس وجہ سے ہو کہ ان حالات میں اگر وہ انکار کرتے تو لوگ ان کی بات نہ مانتے جیسا کہ امام علیؑ اور جابر، ابن مسعود اور ابن عباس کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے، ان تمام صورتوں کے باوجود حضرت عمر کا متعہ کو حرام قرار دینا اور قسم کھا کر یہ کہنا کہ جو شخص ایسا کرے گا وہ اسے سنگسار کریں گے، اس سے آیۂ مبارکہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ ......'' کی متعہ کے حلال ہونے پر واضح دلالت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ حلیت اپنے مقام پر باقی ہے اور کوئی آیت و روایت اس کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کی متعہ کی حلیت پر دلالت اس قدر مضبوط و یقینی ہے کہ اس میں کسی طرح سے شک و شبہ کی گنجائش موجود نہیں۔

ان تمام واضح وصریح بیانات وحقائق کے باوجود بعض مؤلفین کا یہ کہنا تعجب وحیرت کا باعث ہے کہ متعہ زمانۂ جاہلیت کی رسم تھی اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں کہ جس کی بابت کسی بحث کی ضرورت ہو کہ آیا وہ حلال تھا یا نہیں؟ اور اگر حلال تھا تو کس طرح حرام ہوا؟ او یہ کہ قرآن وسنت سے اس کا منسوخ ہونا ثابت ہے یا نہیں؟ بلکہ متعہ کے بارے میں مسلمانوں کو علم ہی نہ تھا اور اس کی بابت کچھ نہ جانتے تھے، صرف شیعہ کتب میں اس کے بارے میں مطالب ذکر ہوئے ورنہ کوئی شخص اس کی بابت کچھ بھی نہ جانتا تھا۔

افسوس ہے کہ اس مؤلف نے قرآن، حدیث، امت کا اجماع اور تاریخ سب کو پس پشت ڈال دیا اور سب سے روگردانی کر لی، اور مسلمانوں کے اقوال اور اس مسئلہ میں امت کے بزرگوں کے بیانات کو نظر انداز کر کے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی حالانکہ یہ ایک مسلم الثبوت امر ہے کہ متعہ، عہد نبوی ﷺ میں رائج تھا اور عمر نے اپنے دور حکومت میں اس کی ممانعت کی اور ممانعت کے حکم پر عملداری کو سختی سے یقینی بنایا، صرف یہی نہیں بلکہ حضرت عمر نے متعہ کی ممانعت پر یہ دلیل قائم کی کہ اس کی حلیت کی آیت، دیگر آیات کے ذریعے منسوخ ہوگئی ہے یا یہ کہ خود نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرما دیا تھا، اور پھر صحابۂ کرام کی کثیر تعداد نے حضرت عمر کی مخالفت کی، ان کے علاوہ تابعین میں سے حجاز ویمن اور دیگر ممالک کے فقہاء نے حضرت عمر کے بیان کو مسترد کر دیا، یہاں تک کہ ابن جریج جیسے بزرگ محدث بلکہ امام الحدیث نے اس سلسلہ میں (عمر مخالفت میں) سخت مؤقف اختیار کیا اور متعہ کے حکم کی عملی تائید کی اور خود ستر عورتوں سے متعہ کیا (ملاحظہ ہو، کتاب تہذیب التہذیب، احوال ابن جریج، کتاب میزان الاعتدال) اور مالک نے بھی یہی مؤقف اختیار کیا جو کہ اہل سنت کی چار فقہ میں سے ایک فقہ کے امام ہیں۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیلات جاننے کے لئے فقہ وعلم الکلام کی کتب کا مطالعہ کریں جو قدماء و متاخرین بلکہ عصر حاضر کے جید ونامور محققین واساتذۂ فن نے لکھی ہیں اور ان میں متعہ کے حوالہ سے واضح اقوال وآراء اور بحث کی مختلف متعلقہ جہات پر اظہار رائے ہوا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اسلام اس موضوع کی بابت بخوبی علم رکھتے تھے اور یہ ایک خالص اسلامی دستور العمل تھا، اس کا زمانۂ جاہلیت سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود متاخرین اہل تفسیر حضرات نے آیۂ مبارکہ "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ" کی متعہ کی حلیّت پر دلالت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس سے دائمی نکاح مراد لیا ہے۔ جو کہ ان کی طرف سے تفسیر بالرائے ہے۔ انہوں نے اپنے بیانات میں اس مطلب پر زور دیا کہ متعہ کی سنت خود حضور ﷺ نے قائم کی پھر آنحضرت ﷺ کی حدیث کے ذریعے وہ سنت منسوخ ہوگئی، ان متاخرین نے ایک بار پھر متعہ کے بارے میں اپنے مؤقف کو درست ثابت کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ متعہ زمانۂ جاہلیت میں زنا کی ایک قسم تھا کہ جسے حضرت رسول خدا ﷺ نے ایک دو بار جائز قرار دیا اور بالآخر اسے ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا۔ یہاں تک کہ اس مفسر نے کہ جس کے بیانات پر ہم تبصرہ کر رہے ہیں متعہ کو زمانۂ جاہلیت کے زنا سے موسوم کر کے اسے اسلام سے قطعی بے ربط قرار دیتے

ہوئے اسے صرف شیعہ کتب کا موضوع قرار دے دیا، اب معلوم نہیں متعہ کے حوالہ سے مستقبل میں کیا رائے قائم کی جائے گی اور اس اسلامی دستور العمل کے بارے میں کیا کچھ کہا جائے گا۔

متعہ کے حوالہ سے جو عجیب وغریب بیانات سامنے آئے ہیں ان میں ایک قول زجاج کا ہے جس میں اس نے آیۂ مبارکہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ'' کے ذیل میں پیش کیا اور وہ یہ کہ اس آیت کے بارے میں لوگوں نے نہایت سنگین غلطی کی اور عربی لغت سے جہالت کی وجہ سے غلط معنی کرنے لگے کہ انہوں نے جملہ ''فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ'' سے متعہ مراد لے لیا جبکہ تمام اہل علم کا متعہ کی حرمت پر اجماع ہے اور ''استمتاع'' کا معنیٰ نکاح ہے۔

زجاج کا یہ بیان کس قدر عجیب ہے، میں حیران ہوں کہ اس کی کس بات کا جواب دوں اور اس کی کس غلطی و غلط فہمی کا ازالہ و اصلاح کروں، کیا میں اس کی اس بات کا جواب دوں کہ جس میں اس نے ابن عباس اور ابی جیسے حضرات کو عربی لغت سے جاہل قرار دیا ہے؟ یا اس بات کا جواب دوں کہ جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ متعہ کی حرمت کا فتویٰ دینے والا ہر شخص عالم ہے اور تمام علماء کا متعہ کی حرمت پر اجماع و اتفاق رائے ہے؟ یا اس بات کا جواب دوں کہ وہ اپنے آپ کو عربی زبان کا ماہر سمجھتے ہوئے استمتاع سے نکاح مراد لیتا ہے؟ زجاج کے بیان وتفسیر پر تبصرہ کرنا وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں۔

ایک علمی بحث

سلسلۂ نسب یا نسبی رابطہ یعنی وہ تعلق جس کی بناء پر کوئی شخص دوسرے انسان سے ولادت میں اشتراک اور ایک ہی رحم میں اکٹھا ہونے یعنی ایک ہی ماں یا ماں باپ دونوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مرتبط و منسوب ہوتا ہے وہی دراصل طبیعی و فطری اور تکوینی و وجودی رابطہ ہے جو خاندانوں اور قبیلوں کو تشکیل دیتا ہے اور خون کی آمیزشوں کے نتیجہ میں جنم لینے والی صفتوں کے انتقالی و استقراری سلسلہ کو یقینی بناتا ہے، وہی رابطہ ان آداب و رسوم کا سرچشمہ ہے جو قوموں کے باہمی امتزاج اور دیگر مؤثر علل واسباب کے یکجا ہونے سے وجود میں آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانی معاشرے خواہ وہ ترقی یافتہ ہوں یا پسماندہ وغیر ترقی یافتہ ہوں سب کے سب اسی طبعی وفطری رابطہ کی عملی پاسداری کے نتیجہ میں وجود میں آتے ہیں یعنی معاشرتی زندگی میں اپنائے جانے والے آداب و رسوم میں فی الجملہ اسی رابطہ کی عملی پاسداری کی اثر گزاری نظر آتی ہے مثلاً نکاح، میراث اور دیگر اصولوں وقوانین اور احکام وغیرہ میں اسی رابطہ کی اثر گزاری وعملداری پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود افرادِ بشر ہمیشہ اس نسبی رابطہ میں کمی وبیشی کرتے رہتے ہیں

اور اپنے معاشرے کے مخصوص حالات سے جنم دینے والے امور کی خاص مصلحتوں کے پیش نظر اس رابطہ میں توسیع و تحدید کرتے ہیں جیسا کہ آپ سابقہ مباحث میں سُن چکے ہیں کہ اکثر سابقہ امتیں عورت کے لئے قانونی قرابت کے قائل ہی نہ تھے جبکہ منہ بولے بیٹے کے لئے قانونی قرابت و حقوق کے قائل تھے یعنی کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا حقیقی بیٹا قرار دے دیتے تھے۔ اسی طرح اسلام کافر حربی اور مسلمان کے درمیان قرابت کی نفی کرتا ہے اور حقیقی بیٹے ہی کو بیٹا قرار دیتا ہے کہ جس کے لئے مخصوص حقوق معین ہیں۔

جہاں تک اسلام کے عائلی قوانین کا تعلق ہے تو ان میں عورت کو قرابت کا حامل قرار دیا گیا ہے اور اسے اموال میں کامل شراکت اور ارادہ وعمل میں مکمل آزادی عطا کی گئی ہے جیسا کہ اس کی تفصیلات سابقہ مباحث میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں، اسی بناء پر اسلامی قانون میں بیٹا اور بیٹی دونوں ایک ہی درجہ میں قرار دیئے گئے ہیں اور دونوں قرابت ونسبی رشتہ میں یکساں رتبہ میں ہیں، اسی طرح باپ اور ماں، بھائی اور بہن، دادا اور دادی، نانا اور نانی، چچا اور چچی، ماموں اور ممانی دونوں کو یکجا قرار دیا گیا ہے، یہی صورتحال کہ جو بیٹوں کی اولاد میں ہے بعینہٖ بیٹیوں کی اولاد میں بھی پائی جاتی ہے چنانچہ بیٹی کا بیٹا بھی اسی طرح بیٹا قرار پاتا ہے جس طرح بیٹے کا بیٹا، بیٹا ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے یعنی بیٹی کی اولاد کی اولاد، بیٹے کی اولاد کی اولاد کی طرح ایک ہی حوالہ ونسبت کی حامل ہوتی ہے، یعنی جس طرح بیٹے کی اولاد کو دادا سے نسبی نسبت کے حوالہ سے اولاد کہا جاتا ہے اسی طرح بیٹی کی اولاد کو وہی درجہ حاصل ہوتا ہے اس بناء پر بیٹے کی بیٹی اور بیٹی کی بیٹی میں فرق نہیں رہتا بلکہ دونوں ہی دادا اور نانا سے نسبت کے حوالہ سے اس کی بیٹیاں کہلاتی ہیں، یہی معیار و اصول نکاح و میراث میں جاری ہوتا ہے۔ چنانچہ نکاح و میراث کے احکام میں ہمرنگی پائی جاتی ہے مثلاً جس طرح بیٹی سے نکاح حرام ہے اسی طرح بیٹی کی بیٹی اور پھر اس کی بیٹی و بیٹیوں سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے، اور میراث میں جس طرح بیٹا اور بیٹی پہلے طبقہ میں حصہ پاتے ہیں اسی طرح دوسرے طبقہ میں ان کی اولاد حصہ دار ہوتی ہے اور سابقہ بیانات میں ذکر ہو چکا ہے کہ آیہ تحریم یعنی ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ'' بھی اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے قدماء و محققین نے اس طرح کے مسائل میں نہایت بے توجہی و کوتاہی سے کام لیا ہے جبکہ یہ اور اس طرح کے دیگر مسائل معاشرتی و حقوقی حیثیت رکھتے ہیں مگر ان حضرات نے ان مسائل کو لغت کی بنیاد پر مورد نظر قرار دیا اور الفاظ کے معنی کا تعین لغت کی کتابوں سے کر کے مطمئن ہو گئے البتہ کبھی لغت میں مختلف معانی کے باعث ان میں شدید ترین اختلاف پیدا ہو جاتا تھا چنانچہ لفظ ''ابن'' کے معنی میں شدید اختلاف پایا جاتا تھا کہ اسے کس معنی کے لئے بنایا گیا ہے تو کچھ لوگ اسے صرف حقیقی بیٹے کے لئے قرار دیتے تھے اور کچھ لوگ اس میں وسعت کے قائل تھے اور بیٹے کی اولاد پر بھی اس کا اطلاق درست سمجھتے تھے، جبکہ وہ سب غلطی پر تھے، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض علماء کا کہنا ہے کہ لغت میں بنوت یعنی بیٹا ہونے کا معنیٰ حقیقی بیٹے اور اس کی اولاد ہے کہ اس میں بیٹی کی اولاد شامل نہیں

بلکہ وہ اپنے باپ یعنی بیٹی کے شوہر کی طرف منسوب ہوگی اپنے نانا کی اولاد نہیں کہلائے گی، اہل عرب بیٹی کی اولاد، کو نانا کی اولاد نہیں کہتے، اور جہاں تک حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کا حسنین شریفین علیہما السلام کو اپنے بیٹے کہنے کا تعلق ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے یہ الفاظ استعمال کئے: "ابنای ھذان اما مان قاما او قعدا" میرے یہ دو بیٹے دونوں امام ہیں خواہ وہ قیام کریں یا بیٹھ جائیں، تو یہ شرف و اعزاز کے طور پر ہے، اس مفسر نے اس مقام پر اس شعر کا حوالہ دیا جس میں شاعر نے بیٹوں کے بارے میں اس طرح کہا:

بنونا بنو ابنائنا وبناتنا بنوھن ابناء الرجال الاباعد

(ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہی ہمارے بیٹے ہیں اور ہماری بیٹیوں کے بیٹے دور کے مردوں کے بیٹے ہیں)

اسی طرح ایک شعر یہ ہے:

وانما امھات الناس اوعیۃ مستودعا وللانساب آباء

(مائیں، نسل انسانی کے لئے ظرف کی حیثیت رکھتی ہیں کہ جن میں کچھ رکھا جاتا ہے جبکہ سلسلہ نسب آباء سے مربوط ہوتا ہے)

میرے خیال میں اس شخص نے بحث کا راستہ ہی گم کر دیا ہے اور موضوع کی بابت خلط ملط کر لیا ہے، اس نے گمان کر لیا کہ شاید یہ لغوی بحث ہے کہ الفاظ کے معانی کا تعین لغت سے کیا جائے تو کافی ہے چنانچہ اس نے یہ گمان کر لیا کہ عربوں نے لفظ "ابن" (بیٹا) کو اس معنی کے لئے وضع کیا ہے جس میں بیٹی کا بیٹا بھی شامل ہے تو اس سے نتیجہ بحث یکسر تبدیل ہو جاتا ہے، اس نے اس حقیقت سے غفلت کی کہ عربوں کے علاوہ دیگر مختلف انسانی معاشروں میں جو اصول وقوانین اور احکام پائے جاتے ہیں وہ لغت کے تابع نہیں اور ان معاشروں میں "ابوت" (باپ ہونا) اور "بنوّت" (بیٹا ہونا) لغت میں مذکور معانی کی بناء پر قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ وہ معاشرہ کی اصل بنیاد اور اس میں رائج اصولوں کے تابع ہوتا ہے چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معاشرتی رسوم وآثار میں بھی تبدیلی آجاتی ہے جبکہ لغت اپنی اسی حالت پر باقی ہوتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بحث معاشرتی یا اس سے مربوط امور کی ہے اس کا لفظی ولغوی حوالہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور جہاں اس کے شعر سے استناد کا تعلق ہے تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حقائق کے بازار میں اشعار کی کوئی وقعت وحیثیت نہیں ہوتی۔ کیونکہ عام طور پر اشعار خیالی آرائش اور فرضی وتصوراتی نقشہ سازی کے سوا کچھ نہیں ہوتے لہٰذا کسی شاعر کی لغو یا نہ تک بندیوں اور خیالیوں وفرضیوں کو دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا بالخصوص ان امور میں کہ جن کا تعلق کلام اللہ سے ہو کہ وہ خود یعنی کلام الٰہی فیصلہ کن اور حرف آخر ہے اور بے معنی و بے مقصد کلام نہیں (قول فصل وما ھو بھزل)۔

اور جہاں تک بیٹوں کا اجداد (نانا) کی بجائے آباء (باپ) سے ملحق ہونے کا تعلق ہے تو وہ بھی لفظی ولغوی مسئلہ نہیں لہٰذا نسب کے فروعات میں سے شمار نہیں ہوتا کہ جس کی بناء پر بیٹا اور بیٹی کا نسبی تعلق باپ ہی سے ہو اور ماں سے منقطع ہو جائے

بلکہ اس کا سبب اور بنیادی وجہ مرد کا گھر کے امور کا ذمہ دار ہونا ہے کہ جس میں نان ونفقہ اور اولاد کی تربیت وغیرہ شامل ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ماں کا اپنی اولاد سے خواہ بیٹے ہوں یا بیٹیاں ہوں، نسبی رابطہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح باپ کا ہوتا ہے اور اسلامی احکام میں اس نسبی رابطہ وتعلق کے واضح آثار میں سے میراث اور نکاح کی حرمت ہے، البتہ اس مقام پر دیگر احکام ومسائل بھی ہیں کہ جو مخصوص معیاروں پر مبنی ہیں مثلاً اولاد کا الحاق وانتساب، نفقہ کا وجوب، خمس میں سادات کا مخصوص حصہ (سہم سادات) تو ان میں سے ہر ایک کا مخصوص معیار ہے اور اسی معیار کے ساتھ اس کے خاص احکام مقرر ہیں۔

دوسری علمی بحث

نکاح واز دواج معاشرتی زندگی کی ایک ایسی سنت وعملی رسم ہے جو ہر دور میں ہر معاشرہ میں خواہ وہ معاشرہ جیسا بھی ہو قائم ورائج تھی اور ہمارے پاس تاریخ کے جو مضبوط حوالے ہیں ان کی روشنی میں اب تک یہ سنت وسلسلہ قائم اور عملی طور پر رائج ونافذ ہے، یہی بذاتِ خود اس کے فطری اصول ہونے کی ایک دلیل ہے۔

اس کے علاوہ نکاح واز دواج کے فطری حقیقت ہونے کی ایک قوی ترین دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو جسمانی طور پر توالد اور تناسل کے آلات کی ترکیبی تخلیق سے نوازا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں ہم نے بارہا مربوطہ مطالب ذکر کئے ہیں اور تخلیقی ترکیب اور ترکیبی تخلیق کی خصوصیات پر علمی مباحث میں بنیادی امور بیان کئے ہیں کہ جن سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ دونوں صنفوں میں جنسی حوالہ سے ایک دوسرے کی طرف رغبت کا پہلو یکساں پایا جاتا ہے جبکہ خواتین میں رضاعت یعنی دودھ پلانے اور اولاد کو ماں کی مامتا سے نوازنے کے لئے مخصوص جسمانی وسائل عطا کئے گئے ہیں تاکہ جسمانی و تربیتی تقاضوں کی صحیح طور پر تکمیل ہو سکے، اس کے ساتھ ساتھ کچھ انسانی غرائز اور طبعی تقاضے ایسے ہیں جو اولاد سے محبت کے جذبات کو جنم دیتے ہیں اور اس طبع الوجودی حقیقت سے ہم آہنگ ہیں کہ انسان کی بقاء اس کی بقائے نسل سے وابستہ ہے، اس کے علاوہ دونوں صنفوں یعنی مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی تسکین کا سبب وذریعہ سمجھتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ مالکیت و اختصاص کی اصل حقیقت کے اعتقادی وعملی احترام کی بنیاد پر وراثت کی حقیقت وقانونی حیثیت کا عملی احترام کرتے ہیں اور پھر نوع بشر کے لئے ان تمام مقاصد کے حصول اور تخلیقی تقاضوں کی تکمیل کے لئے خاندان اور گھرانہ کی تشکیل ایک مسلم و ناقابل انکار حقیقت قرار پاتی ہے، بنابرایں جو معاشرے ان فطری اصولوں اور طبع الوجودی احکام کی فی الجملہ عملی پاسداری کرتے ہیں وہ نکاح واز دواجی تعلق کی تشریعی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتے بلکہ اس کا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ مرد اور عورت کے

درمیان وجودی و جنسی حوالہ سے ایسا مربوط و منظم اور اصولی وقانونی سلسلہ قائم ہونا چاہیے جس سے نسبی رابطے مستحکم ہوں اور ان میں کوئی خلل نہ آنے پائے کیونکہ معاشرے میں زنا و بدکاری کے عام ہونے سے نسبی سلسلے بھی متاثر ہوتے ہیں اور جسمانی صحت کا نظام بھی خراب ہو جاتا ہے کہ جس سے بچنے کی تدابیر جدید علوم کی بنیاد پر ہو رہی ہیں لیکن اس سب کچھ کے باوجود ازدواجی تعلق کی قانونی صورت گری کے ضروری ہونے کا انکار نہیں ہو سکتا چنانچہ تمام اقوام عالم نکاح و ازدواجی قوانین کی ضرورت اور ان کی عملی پاسداری کو یقینی بنانے پر متفق ہیں اور بعض مخصوص احکام کے علاوہ اصل ازدواجی اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں خواہ ایک مرد کے لئے ایک ہی عورت اور ایک عورت کے لئے ایک ہی مرد کے اختصاص کے قائل ہوں یا ایک مرد کے لئے ایک سے زیادہ عورتیں یا ایک عورت کے لئے ایک سے زیادہ مردوں یا دونوں صنفوں میں ایک دوسرے کے لئے ایک سے زیادہ کو جائز و درست سمجھتے ہوں اس میں ان کی قومی وملی روایات دخیل ہوتی ہیں لیکن وہ نکاح و ازدواجی رشتہ کے قیام کو مرد اور عورت دونوں کی زندگی کی بنیادی ضرورت قرار دیتے ہیں اور اسے نسل انسانی کی بقاء کا ضامن سمجھتے ہیں، لہٰذا یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ زنا و بدکاری کہ جو سلسلہ نسب کے منقطع ہو جانے اور خاندان کی تشکیل کے نظام کو درہم و برہم کر دینے کا سبب ہے اس سے انسانی فطرت متنفر ہے اور وہ اس کی جگہ نکاح کے اصول کی عملی پاسداری کا حکم دیتی ہے، انسانی فطرت سلیمہ کا یہ فیصلہ ابتدائے آفرینش سے اب تک یکساں صورت میں موجود ہے اور یہ ایک مستحکم و پختہ اصول ہے کہ جس کے واضح آثار مختلف اقوام اور گوناگوں معاشرں میں ظاہر ہوتے ہیں بلکہ وہ اقوام بھی اسے تسلیم کرتی ہیں جو مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلق اور جنسی ملاپ میں مکمل آزادی کے قائل اور اس پر عمل پیرا ہیں چنانچہ وہ اس پدر مادر آزادی کے خطرناک و وحشت ناک آثار سے اس قدر خوفزدہ ہو چکے ہیں کہ اب خاندانیت کے تحفظ اور سلسلۂ نسب کو بچانے کے لئے فی الجملہ قوانین وضع کرنے لگے ہیں تا کہ نسلوں کا باہمی ارتباط نسبی شناخت کی بنیاد پر استوار ہو۔

انسان اگرچہ فطری طور پر نکاح کی بنیادی حقیقت پر یقین رکھتا ہے اور جنسی تعلق کے ایک مضبوط نظام و اصول پر مبنی ہونے کو تسلیم کرتا ہے لیکن اُس کے باوجود اس کی طبع الوجود اسے ان اصولوں کی عملی پاسداری کی پابند نہیں کرتی اور اسے محرم و نامحرم کے درمیان فرق نہیں کرنے دیتی بلکہ وہ اپنی شہوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کسی بھی اقدام سے اجتناب نہیں کرتا یہاں تک کہ مرد ماں، بہن، بیٹی اور اُن کے علاوہ دیگر نسبی قرابتوں کا لحاظ بھی نہیں کرتا اور نہ ہی عورت اپنے باپ، بھائی اور بیٹے سے جنسی تعلق قائم کرنے کو عار سمجھتی ہے اور یہ سب کچھ اس کی شہوانی طبع کی کارستانیاں ہیں کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتے، چنانچہ اس کا ثبوت تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے اور مستند حوالوں سے یہ مطلب واضح ہو چکا ہے کہ ترقی یافتہ اور پسماندہ دونوں طرح کی اقوام کے درمیان ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے شادی کرنا عام رائج تھا اور وہ اسے ننگ و عار نہیں سمجھتے تھے، بلکہ موجودہ دور میں بھی تہذیب و تمدن کی رسیا قوموں میں زنا و بدکاری کا سلسلہ اس قدر عام ہے کہ بھائی، بہن اور باپ

بیٹی کے درمیان جنسی تعلق معمول کا حصہ بن چکا ہے اور وہ اپنے آپ کو مہذب و متمدن معاشرہ کے افراد سمجھتے ہیں تو ایسا ہونا دراصل ان کی شہوت پرستی میں حد سے گزر جانے کی واضح علامت ہے کہ ان کی شہوانی قوتیں انہیں اپنا مغلوب ومحکوم کئے ہوئے ہیں، اور اگر ان اقوام میں کچھ ایسی بھی ہیں جو مذکورہ بالا نسبی قرابتوں کی عملی پاسداری کرتے ہوئے ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے شادیاں نہیں کرتے تو یہ ان کی قومی و ملی روایات کی وجہ سے ہے نہ یہ کہ وہ فطری اصول کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا کرتے ہیں، بلکہ یہ ان کے موروثی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

اگر آپ اسلام کے عائلی قوانین اور دُنیا کے دیگر قوانین کا موازنہ کریں اور ان کا منصفانہ جائزہ لیں تو آپ کو بخوبی معلوم ہوجائے گا کہ اسلام نے سلسلۂ نسب کے تحفظ اور انسانی فطرت کی پاکیزہ اقدار کی پاسداری میں تمام احتیاطی تدابیر کا دیگر تمام نظاموں اور قوانین کے مقابلے میں زیادہ لحاظ رکھتا ہے اور اسلامی عائلی احکام میں نسبی قرابتوں کا تحفظ اور نکاح کے اصولوں کی پاسداری کی جس قدر مضبوط انداز میں ضمانت پائی جاتی ہے اس سے معاشرہ میں زنا و بدکاری کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں۔

اسلام کے عائلی قوانین میں سلسلۂ نسب کی اعلیٰ و پاکیزہ اقدار کے تحفظ کا جو بالواسطہ اصول ملحوظ ہے وہ شادی شدہ عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرنے کا حرام ہونا ہے، اسلام نے شادی شدہ عورت سے کسی بھی غیر مرد سے جنسی رابطہ کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے، اسی سے ایک عورت کا ایک سے زیادہ مردوں سے ایک ہی وقت میں شادی کرنے کے ممنوع ہونے کا راز بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس سے نسب کا سلسلہ خراب ہوتا ہے اور یہ معلوم ہونا ممکن نہیں رہتا کہ کون کس کا باپ ہے اور کون کس کا بیٹا ہے، کون کس کا بھائی ہے اور کون کس کی بہن ہے، یہی فلسفہ و حکمت طلاق کی عدت میں ملحوظ ہے کہ عورت کو تین مرتبہ حیض آنے تک دوسری شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ نسبی نسبتوں کے نظام میں خرابی پیدا نہ ہونے پائے اور اس کے علاوہ جن عورتوں سے شادی کرنا حرام قرار دیا گیا ہے کہ جو چودہ ہیں اور قرآن مجید میں ان کا واضح شماری ذکر موجود ہے ان سے شادی کی ممنوعیت کا فلسفہ زنا و بدکاری کی روک تھام کی غرض سے ہے کیونکہ انسان اپنے خاندانی معاشرہ کا فرد ہونے کی بناء پر مذکورہ چودہ صنفوں سے زیادہ ارتباط رکھتا ہے، اس کا میل جول ان اصناف سے دیگر عورتوں کی نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے بلکہ ان سے براہ راست بول چال اور آمد و رفت کا سلسلہ بہت وسیع ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں ذہنی توجہ اور طبعی جھکاؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ حیوانی جذبات اور شہوانی احساسات ابھرنے لگتے ہیں کہ پھر انسان اپنے اوپر قابو پانے میں ناکام ہوجاتا ہے اور اس کی طبعی حالت اسے لذتوں کے حصول کی طرف کھینچتی ہے اور وہ اپنی صدائے شہوت پر لاشعوری طور پر لبیک کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ظاہر ہے کہ ہر وقت دریا میں غوطہ زنی کرنے والا کبھی اس کی طوفانی موجوں میں غرق بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا ضروری تھا کہ مذکورہ بالا چودہ اصناف سے زنا کی حرمت کے بیان پر اکتفاء نہ کیا جائے کیونکہ ہمیشہ کے رابطوں اور نفسانی وسوسوں کی بار بار طغیانیوں کے باعث انسان کو ایک بار زنا سے منع کرنے کا حکم دینا کافی نہیں بلکہ ان اصناف سے ہمیشہ کی حرمت کا بیان ضروری تھا تاکہ اس دینی تربیتی اصول کی بناء پر دلوں میں ان اصناف سے جنسی تعلق قائم کرنے کی بابت قطعی مایوسی ثبت ہوجائے اور

ان کے ساتھ نکاح کرنے کا خیال وتصور ہی پیدا نہ ہوسکے اور ان سے مباشرت کرنے کے جذبات کا قلع وقمع ہوجائے، چنانچہ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ کتنے مسلمان ایسے ہیں جو تمام تر برائیوں و بدکاریوں میں گھرے ہونے اور ہر طرح کے گناہ کے مرتکب ہونے کے باوجود اپنی محرم خواتین سے بدکاری کے ارتکاب کا سوچ بھی نہیں سکتے اور اپنی ماؤں بہنوں کی عزت و ناموس کی بے حرمتی کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اگر اسلام کی اعلیٰ اقدار نہ ہوتیں اور اسلامی عائلی قوانین وتربیتی دستورات نہ ہوتے تو دنیا میں کوئی گھر زنا اور اس جیسی دیگر برائیوں سے محفوظ نہ ہوتا۔

محرم عورتوں سے شادی کی ممانعت کے ساتھ ساتھ اسلام نے ان کے علاوہ دیگر نامحرم عورتوں سے زنا کے سد باب کے لئے پردہ کے واجب ہونے اور مردوں وعورتوں کی باہمی آمیزش واکٹھا ہونے کی ممانعت کا حکم دیا تاکہ بدکاری کے تمام اسباب کی روک تھام ہوسکے، اگر یہ حکم نہ ہوتو زنا سے ممانعت کا حکم نتیجہ بخش ثابت نہ ہوتا اور کسی شخص کو اس نہایت گندے و پلید عمل سے روکنا بے اثر ہوجاتا، بنابرایں زنا و بدکاری کی ممانعت کے تناظر میں کسی مرد کا کسی عورت سے جنسی ملاپ دو بنیادوں پر قابل تصور ہے، جس عورت سے مباشرت مقصود ہو اگر وہ شوہر دار ہو تو اسلام نے اس سے شادی کرنا قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے اور اگر وہ ان چودہ اصناف میں سے ہو تو وہ ہمیشہ کے لئے حرام کی گئی ہیں کہ کوئی مسلمان ایک بار بھی ان سے نزدیکی نہیں کرسکتا، گویا اسلام نے اپنے پیروکاروں کو جنسی ملاپ کے حوالہ سے ان دوصورتوں کی بابت ان کے حرام ہونے کا جو حکم دیا اس کی بناء پر ہر مسلمان کا اعتقادی اصول متعین ہوجاتا ہے اور وہ اس اصول کی عملی پاسداری کرتے ہوئے اپنی نظریں ان محرمات کی طرف اٹھاتا ہی نہیں اور نہ ہی ان عورتوں سے جنسی ملاپ کا تصور اس کے دل ودماغ میں پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ اس طرح کے خیالات کا خوگر ہونا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت مغربی اقوام کی موجودہ صورتحال میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ دین مسیحیت کے تمام پیروکار زنا کو حرام سمجھنے اور ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کو زنا سے قریب تر برائی قرار دینے کے باوجود مردوں اور عورتوں کی باہمی آمیزش واختلاط اور یکجا ہونے کو روا جانتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں زنا و بدکاری ان کے درمیان اس قدر عام ہوچکی ہے کہ ان کے ایک ہزار میں سے ایک شخص بھی اس بیماری سے محفوظ نہیں، اور ہزار افراد میں سے ایک شخص بھی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص اس کا حقیقی بیٹا اور اسی کی صلب سے ہے، یہ نہایت وحشت ناک بیماری اس قدر پھیلی کہ شہوانی جذبات نے ان کے مردوں کو اپنی محرم خواتین یعنی بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں سے جنسی ملاپ سے باز نہ رکھا اور پھر یہ وحشیانہ سلسلہ مردوں اور بچوں کے درمیان جنسی ملاپ کی صورت میں (ہم جنس بازی) اور پھر خود نوجوانوں کے درمیان عام ہوگیا، یہاں تک اس غیر فطری سلسلہ کی وسعت نے صنفِ نازک کی زندگی سیاہ کردی اور جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ نوع بشر کے لئے سکون وقرار کا باعث ہو اور ایسی نعمت بنایا جس سے نسل انسانی کی بقاء اور زندگی کی خوشیاں حاصل ہوں اسے غیر فطری وغیر انسانی خواہشات کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا اور اس سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مادی فوائد کے حصول کے لئے آلۂ کار بنا دیا گیا بلکہ اسے ہر اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا جس سے انسان کی انفرادی ومعاشرتی زندگی

کا نظام درہم برہم ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی زندگی خیالی آرزوؤں و بے مقصد تمناؤں کی آماجگاہ اور حقیقی معنی میں لہو لعب کا مرکز بن گئی اور پھٹے ہوئے لباس کا سوراخ، خود لباس سے بڑا ہو گیا، (اس ضرب المثل کا مطلب یہ ہے کہ لہو ولعب اور بیہودہ آرزوئیں اس قدر زیادہ ہو گئیں کہ زندگی کا دورانیہ ان کی تکمیل نہیں کر سکتا)۔

تو یہ وہ حقیقت ہے جسے اسلام نے نکاح کے باب میں اصل واساس قرار دیتے ہوئے محرمات کے احکام وضع کئے اور واضح کیا کہ کون سی عورت سے نکاح جائز اور کون سی عورت سے نکاح حرام ہے، تاہم سابق الذکر مطالب سے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف پاکدامن عورتوں سے نکاح کرنے کو جائز وحلال قرار دیا اور اس سے مربوط احکام بیان فرمائے، اور اس فرمان خداوندی کا اثر خاندانی معاشرہ میں زنا و بدکاری کی روک تھام کے حوالہ سے اسی طرح ہے جیسے حجاب کا حکم ہے کہ جس سے خاندانی معاشرہ میں زنا و بدکاری کا سدّ باب ہوتا ہے، اور ہم نے پہلے اس حکمت کے ارشاداتی بیان کے حوالہ سے آیۂ مبارکہ "وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ......" سے مستفاد معانی کا تذکرہ کیا ہے اور عین ممکن ہے کہ اسی مطلب کا اشارہ آیاتِ تحریم کے آخری الفاظ میں بھی ہوا جس میں ارشاد الٰہی ہے: "یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا" (اللہ چاہتا ہے کہ تم پر آسانی کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے) سورۂ نساء، آیت: ۲۸۔

حقیقت یہ ہے کہ جن چودہ عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے ان سے جنسی ملاپ کرنے کی ممانعت کا حکم قطعی اور نہایت مستحکم ہے کہ اس حکم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسان کے کندھوں سے ان عورتوں سے جنسی ملاپ نہ کرنے پر صبر کرنے کا سنگین بوجھ ختم کر دیا اور ان سے مباشرت کی ہر ممکنہ صورت کا سدِّ باب کر دیا کیونکہ نفسانی خواہشات اور شہوانی جذبات کے حوالہ سے انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے، چنانچہ خداوند عالم نے صنفِ نازک کی فریب کاریوں کی بابت ارشاد فرمایا: "اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ" "تم عورتوں کی چالیں بہت بڑی ہیں (سورۂ یوسف، آیت ۲۸)

میدانی حقائق اور عملی شواہد اس حقیقت سے آگاہی دلاتے ہیں کہ یہ نہایت صبر آزما مقام ہے کہ کوئی شخص ایک یا دو عورتوں ہی سے زندگی بھر معاشرت کرے اور اس کی خلوت وجلوت کے لمحات صرف انہی کے ساتھ گزریں اور اُنہی کے ساتھ شب وروز بسر کرے، اس کی نظریں اور کان انہی کے لطیف اشاروں و بیانات واظہارات سے مانوس ہوں مگر اس کے باوجود وہ قریبی عورتیں کہ جن کے ساتھ قرابت کے حوالہ سے فطری انس ومحبت کا رشتہ ہو ان سے مقاربت کرنے اور ان کی لطافت سخن کی سحر انگیزی کے باوجود ان سے مباشرت کرنے سے باز رہے اور اپنے آپ پر قابو پائے یہ نہایت صبر کا مقام ہے۔ کیونکہ انسانی طبع الوجود کی دو ہی ضرورتیں ہیں، ایک غذا اور دوسری نکاح، ان کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ انہی کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے ہے، چنانچہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من تزوج احرز نصف دینہ فلیتق اللہ فی النصف الآخر" "جو شخص شادی کرے گویا اس نے اپنا آدھا دین بچا لیا، تو اسے چاہیے دوسرے آدھے حصہ میں تقوائے الٰہی اختیار کرے (وسائل الشیعہ، کتاب النکاح)

آیات ۲۹ تا ۳۰

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾

○ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾

ترجمہ

○ ''اے ایمان والو! اپنے اموال آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ، سوائے اس کے کہ باہمی رضایت کے ساتھ تجارت ہو، ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر نہایت مہربان ہے۔''

(۲۹)

○ ''اور جو شخص عداوت وظلم کرتے ہوئے ایسا کرے تو ہم بہت جلد اسے آگ میں جلا دیں گے اور یہ کام اللہ کے لئے نہایت آسان ہے''

(۳۰)

تفسیر و بیان

اس آیت میں ماقبل آیات سے ایک طرح کی مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا ان آیات سے اتصال و پیوستگی اور ہمرنگی و ہم آہنگی کا ثبوت ملتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس آیت میں ایک دوسرے کے اموال ناجائز طور پر کھانے کی ممانعت کا حکم ہے جبکہ سابقہ آیات میں عورتوں کے حق مہر کی رقوم ناجائز طور پر اور زیادتی کرتے ہوئے کھانے کی ممانعت کا حکم مذکور تھا، تو اس بناء پر اس آیت میں خاص حکم سے عام وعمومی حکم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سابقہ آیات میں صرف خواتین کے حق مہر کے بارے میں اس کے ناجائز طور پر کھانے سے ممانعت مذکور تھی جو کہ خاص حکم تھا جبکہ اس آیت میں ہر طرح کے اموال کی ناجائز طور پر کھانے سے ممانعت مذکور ہے جو کہ عام وعمومی حکم ہے اور اسے علمی اصطلاح میں ''الانتقال من الخصوص الی العموم'' کہا جاتا ہے۔

عمومی حکم کا بیان

○ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ''

(اے ایمان والو! تم اپنے اموال آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ باہمی رضایت کے ساتھ تجارت ہو)۔

لفظ ''الاکل'' کا معنی مشہور ومعروف ہے یعنی ''کھانا'' اور وہ عام طور پر کسی چیز کو لقمہ کی صورت میں چبانے اور نگلنے وغیرہ کے ذریعے پیٹ میں ڈالنے کو کہتے ہیں، اور چونکہ اس میں تسلط وقابو پانے اور کسی چیز کو ختم کر دینے کا معنی پایا جاتا ہے لہٰذا اس کی بابت یوں کہا جاتا ہے: ''اکلت النار الحطب'' (آگ نے ایندھن کو کھالیا) اس میں ایندھن کے آگ کے

ذریعے ختم ہو جانے کو ''اکل'' یعنی کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح کھانے اور چبانے دنگل لینے سے غذا ختم ونابود ہو جاتی ہے اسی طرح آگ ایندھن کو جلا کر ختم ونابود کر دیتی ہے، اسی طرح یوں کہا جاتا ہے: ''اکل فلان المال'' فلاں شخص نے مال کھا لیا، یعنی اس پر تسلط پا کر اسے استعمال کر لیا، اس میں بنیادی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر کسی چیز میں بھی تصرف کرنا جسمانی غذائی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے ہوتا ہے کیونکہ اسی سے انسان کی بقاء وابستہ ہے اور غذا کے ذریعے انسان اپنی زندگی کا نظام قائم رکھتا ہے، اسی مناسبت سے اشیاء میں تصرف کرنے کو ''اکل'' یعنی کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے البتہ ہر تصرف کو ''اکل'' یعنی کھانا نہیں کہا جاتا بلکہ صرف اسی تصرف کو ''اکل'' یعنی کھا جانا کہتے ہیں جو کسی چیز پر کامل اختیار وتسلط پر مبنی ہو کہ اس پر کسی دوسرے شخص کا تسلط واختیار ختم ہو جائے مثلاً اس مال کو اپنی ملکیت قرار دے دیا جائے کہ اس میں کوئی دوسرا شخص ملکیت کا حق نہ رکھتا ہو، گویا اس مال میں اس طرح کا تصرف کیا جائے کہ جس طرح حقیقی مالک تصرف کرتا ہے اور اسے استعمال میں لا کر اسے ختم کر ڈالتا ہے اور وہ ایسے ہے جیسے غذا کھانے والا شخص غذا کھا کر یعنی اسے اپنے کامل اختیار کے ساتھ اپنے استعمال میں لا کر ختم کر دیتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس نے غذا کو کھا لیا، مال پر کامل اختیار وتسلط کے ساتھ اسے استعمال میں لانا بھی ''اکل'' یعنی کھانا کہلاتا ہے۔

لفظ ''باطل'' سے وہ عمل مراد ہے جو کسی صحیح عقلائی غرض پر مبنی نہ ہو۔

لفظ ''تجارۃ'' سے مراد کسی مال وسرمایہ کو اس سے فائدہ لینے اور مال میں اضافہ کرنے کی غرض سے استعمال میں لانا ہے، یہ معنی راغب اصفہانی نے المفردات میں لکھا ہے اور کہا ہے کہ عربی زبان میں اس لفظ کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ ایسا نہیں جس میں حرف تا کے بعد حرف جیم اکٹھا آیا ہو، (تج)، اس بناء پر تجارت کا معنی خرید وفروخت اور لین دین ہوگا۔

اور آیت میں جملہ ''لَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ'' کو لفظ ''بَيْنَكُمْ'' کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا گیا ہے جو کہ کسی مال کے گرد جمع ہو جانے اور مال کے لوگوں کے درمیان قرار پانے کو ظاہر کرتا ہے تو اس میں اشارۃً یا دلالۃً اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ آیۂ مبارکہ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (ناجائز طریقے سے مال کھانے) سے ممانعت کا حکم مذکور ہے (اور ان تمام معاملات ولین کی نہی کی گئی ہے جو فاسد معاشرہ میں رائج وعام ہیں کہ جن کی وجہ سے مالی ملکیت کی منتقلی شرعی طور پر باطل و ناجائز قرار دی گئی ہے مثلاً سودی معاملات، دھوکہ والے معاملات، جوا وغیرہ تو عین ممکن تھا کہ یہ خیال ذہنوں میں پیدا ہو کہ ہر معاملہ ولین دین معاشرہ کی تباہی و بربادی اور لوگوں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے، لہٰذا اس خیال وتصور کو ختم کرنے کے لئے استثنائی جملوں کے ذریعے یہ بیان کیا گیا کہ ایک طرز کا معاملہ ولین دین ایسا بھی موجود ہے جو معاشرہ کو مالی بحرانوں اور اقتصادی ومعاشی بدحالی سے نکال کر استحکام وتحفظ عطا کر سکتا ہے اور وہ عبارت ہے اس تجارت سے جو باہمی رضایت پر مبنی ہو اور صحیح اصولوں پر استوار ہو کہ جس سے معاشرہ کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، اس آیت میں جو استثناء مذکور ہے وہ اسی استثناء کی

طرح ہے جو درج ذیل آیۂ مبارکہ میں ذکر ہوا ہے:

سورۂ شعراء، آیت: ۸۸-۸۹

○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾

(اس دن کوئی مال اور اولاد فائدہ نہ دے گی سوائے اس شخص کے کہ جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کے پاس آئے)

اس آیت میں قیامت کے دن مال و اولاد کا بے فائدہ ہونا مذکور ہے تو عین ممکن تھا کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ قیامت کے دن کوئی شخص کامیابی و نجات نہیں پائے گا کیونکہ عام طور پر مال و اولاد ہی فائدہ مند ہوتے ہیں تو جب وہ دونوں بے اثر ہوں تو نا امیدی کے سوا کچھ نہیں بچتا، لہٰذا اس کا جواب اس طرح دیا گیا کہ مال و اولاد کے علاوہ بھی ایک چیز ایسی ہے جو قیامت کے دن فائدہ ہی فائدہ دے گی اور وہ یہ ہے کہ انسان قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں آئے، وہ مالی و مادی اشیاء میں سے نہیں بلکہ قلب سلیم ہے۔

یہی وہ حوالہ ہے جس کی بناء پر ہم نے آیۂ مبارکہ میں مذکور استثناء کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، اور اسے استثناء منقطع قرار دینا ہی آیت مبارکہ کے سیاق سے زیادہ مطابقت کا حامل ہے، یہی حال لفظ "بِالْبَاطِلِ" کے حوالہ سے ہے کہ اس میں بھی ہمارا نظریہ یہی ہے کہ وہ کلام میں اصلی و احترازی تقیید کا معنی دیتا ہے اور یہ بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۸ میں ارشاد ہوا:

○ "وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ ...."

(اور تم آپس میں ایک دوسرے کے اموال باطل و ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ ہی انہیں حکام کے پاس اس غرض سے لے جاؤ کہ لوگوں کے اموال میں سے کچھ کھا سکو........)

بنا برایں آیۂ مبارکہ سے ان صحیح و جائز معاملات کی تخصیص ثابت نہیں ہوتی جو تجارت کے علاوہ دیگر ذرائع سے ملکیت اور اموال میں تصرف کے اختیار کا سبب بنتے ہیں مثلاً ہبہ، مصالحہ، جعالہ، مہر قرار دینا، میراث ان جیسے دیگر امور۔

بعض آراء اور ان کے جوابات

ایک رائے: بعض مفسرین نے ہمارے نظریہ کے برعکس یہ رائے پیش کی ہے کہ آیۂ مبارکہ میں جو استثناء مذکور ہے وہ منفصل نہیں بلکہ متصل ہے اور لفظ "بِالْبَاطِلِ" سے اصلی و احترازی تقیید ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ قید توضیحی ہے اور اسے اس لئے یہاں ذکر کیا گیا ہے کہ بیان ہو سکے کہ مستثنیٰ کے نکل جانے اور نہی کا تعلق ختم ہو جانے کے بعد کلام میں مستثنیٰ منہ کی صورتحال کیا رہ جاتی ہے؟ لہٰذا کلام کو یوں فرض کیا جائے گا: لا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل الا ان تكون تجارة عن

تراض منکم فانکم ان اکلتموھا من غیر طریق التجارۃ کان اکلاً بالباطل منھیًا عنه کقولك: لا تضرب الیتیم ظلمًا الا تادیبًا'' تم اپنے اموال آپس میں نہ کھاؤ مگر یہ کہ باہمی رضایت کے ساتھ تجارت ولین دین کر کے، کہ اگر تم نے تجارت کے علاوہ ایک دوسرے کے اموال کھائے تو وہ ناجائز وممنوع طریقہ سے کھانا ہو جائے گا اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے آپ کسی سے کہیں کہ یتیم کو ظلم کرتے ہوئے نہ مارو سوائے اس کے کہ اسے ادب سکھانے کے لئے ہو (یعنی اسے نصیحت وتربیت کی غرض سے اس کی غلطی پر اسے مارنا روا ہے) اس طرح کا استعمال اگرچہ عرف عام میں صحیح ودرست قرار دیا جاتا ہے لیکن ہمارے سابقہ ذکر کئے گئے مطالب کی روشنی میں آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیہ مبارکہ کے سیاق سے استثناء کا منقطع ہونا ہی زیادہ مناسب ہے۔

دوسری رائے:۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیہ مبارکہ میں ''لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ'' سے مراد یہ ہے کہ اپنے اموال کو ان موارد میں خرچ نہ کرو جن میں مال خرچ کرنا اللہ کو پسند نہیں، اور ''إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ'' میں تجارت سے مراد یہ ہے کہ اپنے اموال وہاں خرچ کرو جن میں خدا کی رضا وخوشنودی ہو۔

تیسری رائے:۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ آیہ مبارکہ مطلق طور پر کسی کے مال کو بغیر عوض کے کھانے سے منع کرتی ہے چنانچہ صدرِ اسلام میں ایسا ہوتا تھا کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کوئی مسلمان کسی کے ہاں کھانا بھی نہیں کھاتا تھا کیونکہ آیہ مبارکہ میں صرف تجارت کے ذریعے مال کھانے کی اجازت دی گئی تھی، لہٰذا اس حکم کو سورۂ نور کی آیت ۶۱ کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا کہ جس میں یوں ارشاد ہوا ہے:

○ ''وَلَا عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا۟ مِنۢ بُيُوتِكُمْ .... أَن تَأْكُلُوا۟ جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا''

(تم پر کوئی حرج نہیں کہ اپنے گھروں سے ...... اکٹھے یا الگ الگ ہو کر کھاؤ)۔

اس طرح کے نظریات اور آراء کے بارے میں یہ حقیقت واضح ہے کہ آیہ مبارکہ سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی۔

چوتھی رائے:۔ بعض مفسرین نے آیہ مبارکہ کی تفسیر میں عجیب وغریب مطالب پیش کئے ہیں اور انہوں نے ''إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ'' کو استثنائے متصل ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر لفظ ''بِالْبَاطِلِ'' کو کلام میں ''قید احترازی'' کے طور پر ذکر کیا ہے چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یہاں ''باطل'' سے مراد مناسب ومساوی معاوضہ دیئے بغیر کوئی مال ہتھیا لینا ہے لہٰذا مستثنیٰ منہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی کا مال ناجائز طور پر اور معاوضہ کے بغیر لینا حرام ہے اور پھر اس سے تجارت کو مستثنیٰ کیا گیا جبکہ اس کے اکثر مصادیق باطل وناجائز طریقوں سے خالی نہیں ہوتے کیونکہ معاوضہ کا صد در صد اس طرح ہونا کہ اصل مال کی حقیقی قیمت کے عین مطابق ہو اگر نا ممکن نہ ہو تو نہایت دشوار ومشکل ترین ضرور ہے، بنا برایں استثناء سے عوض ومعوض یعنی اصل مال اور اس کی قیمت ومعاوضہ کے مکمل طور پر برابر نہ ہونے میں مسامحہ ونظر اندازی سے کام لینا مراد ہے، اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ تاجر اپنے مال کو اس طرح سجاتا ہے اور اس کی تعریف ایسے الفاظ میں کرتا ہے کہ خریدار کا

دل اس چیز کو خریدنے میں موم ہو جاتا ہے کہ وہ اسے خریدے بغیر نہیں رہتا جبکہ اس میں کوئی ملاوٹ، دھوکہ وفریب بھی نہیں ہوتا لہٰذا شریعت اسلامیہ میں اگر کوئی معاملہ ملاوٹ، دھوکہ وفریب سے خالی ہو تو اس میں تاجر کا اپنے مال کی تعریف وتزئین کرنا معاملہ کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ اس کے ایسا کرنے کو نظر انداز کیا جاتا ہے کہ اسے مسامحہ سے تعبیر کہا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں اس طرح سے معاملہ کرنا درست نہیں بلکہ "باطل" وناجائز کا مصداق ہے لیکن شریعت نے اسے مسامحۃً اور لوگوں کی آسانی کے لئے جائز قرار دیا ہے کہ اگر شریعت اسلامیہ میں اسے حلال وجائز قرار نہ دیا جاتا اور "اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ" کے ذریعے مستثنیٰ نہ کیا جاتا تو کوئی اہل دین تجارت کی طرف توجہ ہی نہ کرتا کہ جس کے نتیجہ میں دینی معاشرہ درہم برہم ہو جاتا۔

اس مفسر کی مذکورہ بالا رائے کا نادرست ہونا ہمارے سابق الذکر بیانات کی روشنی میں ظاہر وآشکار ہو جاتا ہے کیونکہ لفظ "باطل" کا معنی جیسا کہ اہل لغت کے ہاں معروف ہے وہ چیز ہے جس سے مطلوبہ اثر ونتیجہ حاصل نہ ہو سکے، یہاں زیر بحث موضوع میں بیع وتجارت کا مطلوبہ نتیجہ دو اموال اور ان کی ملکیت کی تبدیلی ہے تاکہ لین دین کرنے والے دونوں مالک ایک دوسرے کے مال کے مالک بن کر اس میں اپنی مرضی سے تصرف کر کے اپنی مطلوبہ ضرورت پوری کر سکیں اور ہر شخص معاملہ میں تعادل برقرار رکھتے ہوئے اپنا مقصود پا سکے، اور یہ تعادل دو طرح سے حاصل ہوتا ہے: ایک یہ کہ دونوں جانب سے قیمتوں میں برابری پائی جائے اور دوسرا یہ کہ دونوں میں کمی وبیشی کی تلافی کسی دوسری وجہ سے ہو جائے مثلاً معاملہ کرنے والے کی خاص رغبت یا مال کے ہاتھ سے چلے جانے کا خوف یا کوئی ایسی وجہ جو کمی کو پورا کر دے، تو ان صورتوں میں لین دین کرنے والے فریقین میں سے ہر ایک کی رضایت کا پتہ چلتا ہے اور جب دونوں اس معاملہ پر راضی ہوں تو معاملہ کو ہرگز باطل وناجائز اور نادرست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ قرآنی بیانات میں اس کے اسلوب سخن سے آشنا حضرات کو اس حقیقت میں کسی طرح کا شک لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ ناممکن ہے کہ قرآن کسی چیز یا کام کو باطل امور میں شمار کرے اور پھر اس کی انجام دہی کا حکم دے اور اس کی طرف رغبت دلائے، خداوند عالم نے قرآن مجید کی توصیف میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

○ "يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ"

(وہ حق اور سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے)

تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ حق کی طرف ہدایت ورہنمائی کرنے والا باطل کی طرف لے جائے؟

اس مفسر کی مذکورہ بالا رائے اور تاویل وتوجیہ کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ انسان فطری طور پر اپنی احتیاجات وضرورتوں سے آگاہ ہے اور اس آگاہی کی بناء پر فطرتاً اپنے اموال میں لین دین کی ضرورت سے بھی آگاہی رکھتا ہے اور پھر فطرت نے اسے اس حق کی طرف اس کی ہدایت ورہنمائی کر دی ہے کہ وہ معاملات ولین دین میں برابری وتوازن برقرار رکھے، لیکن اس

کے باوجود معاملہ کی کوئی ایسی صورت ہی نہ ہو جس میں باطل و ناجائز کی آمیختگی کے بغیر وہ جائز و درست معاملہ انجام ہی نہ دے سکے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ فطرت انسان کو ایسے کام کی راہ دکھائے جو اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ناکافی ہو بلکہ صرف بعض ضرورتوں کو پورا کر سکے؟ اور یہ بھی کیونکر ممکن ہے کہ فطرت انسان کو باطل کی راہ دکھائے اور اس پر چلنے کی رہنمائی کرے جبکہ فطرت ہی تو ہے جو انسان کو حق کی راہ پر لاتی ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو انسان باطل و گمراہی کی راہ پر چل پڑتا ہے، گویا حق کی راہ کی رہنمائی فطرت کی طرف سے ہوتی ہے اور جو شخص باطل کی راہ اپناتا ہے گویا اسے حق کی ہدایت حاصل نہیں ہوئی یا اس نے فطرت کی رہنمائی سے کچھ حاصل نہیں کیا۔

پانچویں رائے:۔ بعض مفسرین نے مذکورہ بالا رائے سے بھی زیادہ عجیب و غریب قول پیش کیا ہے اور اپنے توجیہی بیان میں یہ کہا ہے کہ اس استثنائے منقطع میں اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ دنیا کی ہر تجارت و معاملات سب باطل ہیں کیونکہ دنیا کو تو ثبات و بقاء ہی حاصل نہیں لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی عقلمند اس میں سرگرم عمل نہ ہو بلکہ اس کی بجائے اُخروی ٹھکانہ کی طرف توجہ کرے جو کہ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

یہ رائے غلط ہے، اور اگر اسے قرین صحت بھی قرار دیا جائے تب بھی وہ استثنائے متصل سے مربوط نکتہ ہوگا نہ کہ استثنائے منقطع سے! اس کے علاوہ یہ کہ اس طرح کے معنوی حقائق دیگر آیات میں مذکور ہیں مثلاً:۔

سورۂ عنکبوت، آیت: ۶۴

○ "وَمَاهٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ"

(اور یہ دُنیاوی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ نہیں اور آخرت کا ٹھکانہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے)

سورۂ نحل، آیت: ۹۶

○ "مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَاعِنْدَاللّٰهِ بَاقٍ"

(جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے)

سورۂ جمعہ، آیت: ۱۱

○ "قُلْ مَاعِنْدَاللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ"

(کہہ دیجئے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لہو و لعب اور تجارت سے بہتر ہے)

لیکن ہمارے زیر بحث موضوع میں اگر اس مفسر کا مذکورہ بالا نکتہ درست قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خداوند عالم نے باطل کو جائز قرار دیا ہے جبکہ قرآن مجید کی عظمت و شان اس سے بالاتر ہے کہ باطل کو کسی بھی صورت میں جائز قرار دے، یہ ممکن ہی نہیں۔

قتل کی ممانعت

○ ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ''
(اور تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو)

اس جملہ کے ظاہری الفاظ سے کسی انسان کے اپنے آپ کو قتل کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے لیکن جب اس جملہ کو اس تناظر میں دیکھیں کہ یہ ''لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ'' (تم اپنے اموال آپس میں باطل و ناجائز طور پر نہ کھاؤ) کے ساتھ ذکر ہوا ہے کہ جس میں بظاہر تمام مؤمنین کو ایک جان قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ تم اپنے اموال یعنی ایک دوسرے کے اموال کو ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ تو ممکن ہے اس میں بھی مؤمنین کی اکائی اور ان سب کے اموال کی طرح کا حکم مقصود ہو، یا یہ کہ ''انفس'' سے مراد دینی معاشرہ کے تمام افراد مقصود ہوں کہ وہ سب ایک جان ''نفس واحدہ'' ہیں اور ایک کی جان دوسرے کی جان ہے تو اس طرح کے معاشرہ میں کسی انسان کی جان خود اس کی اپنی جان اور دوسرے شخص کی جان بھی اس کی جان ہوتی ہے لہٰذا اگر کوئی شخص خود اپنے آپ کو قتل کرے یا کسی دوسرے شخص کو قتل کرے تو گویا اس نے خود اپنے آپ کو قتل کیا، اس بناء پر یہ جملہ یعنی ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' (اور تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو) مطلق قرار پائے گا کہ جس میں کسی شخص کا خود اپنے آپ کو قتل کرنا (خودکشی) اور اپنے علاوہ کسی دوسرے مؤمن کو قتل کرنا دونوں شامل ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کے ذیلی جملہ ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا'' سے یہ سمجھا جائے کہ اپنے آپ کو قتل کرنے کی ممانعت سے مراد یہ ہو کہ کوئی انسان اپنے آپ کو ان خطرات سے دوچار نہ کرے جو اس کے قتل کا سبب بنیں اور اپنی تباہی کے اسباب فراہم نہ کرے کہ جو اس کے قتل پر منتہی ہوں، اور یہ بات اس لئے بھی قرین قیاس لگتی ہے کہ اپنے آپ کو قتل کرنے کی ممانعت کے حکم کو ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا'' (بے شک، اللہ تم پر نہایت مہربان ہے) سے مربوط قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم بنی نوع انسان پر اللہ کی رحمت و خاص عنایت کی بناء پر ہے۔ یعنی اس کی رحمت اس کی متقاضی ہے کہ بنی نوع انسان خود اپنے آپ کو قتل نہ کریں اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں اور نہ ہی کوئی ایسا کام کریں جو ان کی ہلاکت و قتل کئے جانے کا سبب بنے، اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اس طرح کا معنوی ارتباط یعنی حکم کو اس طرح سے معلل کرنا اس کے اطلاقی معنی پر دلالت کرتا ہے کہ آیت کے معنی میں وسعت پائی جاتی ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ انسان کا اپنے آپ کو قتل کرنا ممنوع ہے بلکہ ایسے کام کرنا بھی ممنوع ہے جو اس کے قتل کئے جانے کا سبب بنیں، اس مناسبت کے حوالہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جملہ ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا'' صرف جملہ ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' ہی سے مربوط ہے اور اسی کی علت و حقیقی وجہ پر مبنی ہے۔

ظلم وزیادتی اور تجاوز کرنے والا شخص

○ ''وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا.......''

(اور جو شخص تجاوز وظلم کرتے ہوئے ایسا کرے)

''عدوان'' ہر طرح کے تجاوز اور حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں خواہ وہ حد سے بڑھنا کسی جائز و نیک کام میں ہو یا ناجائز وممنوع عمل میں ہو، دونوں کی بابت قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۳

○ ''فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ''

(کوئی حد سے بڑھ جانا (زیادتی) صحیح نہیں سوائے ظالموں پر)

اس میں ظالموں پر عدوان کے روا ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

سورۂ مائدہ، آیت: ۲

○ ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''

(اور تم نیکی واحسان پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ وعدوان پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)

اس میں عدوان پر معاونت کے ممنوع ہونے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ ''عدوان'' مورد کے حوالہ سے ''ظلم'' سے وسیع تر معنی رکھتا ہے، لہٰذا آیت میں اس کا معنی ان حدود سے تجاوز کرنا کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے معین کردی ہیں۔

جملہ ''فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا'' میں ''نصلی'' باب افعال سے ہے اور ''اصلاء بالنار'' کا معنی آگ سے جلانا ہے۔ اور چونکہ آیت میں حرف ''ذٰلِكَ'' آیا ہے (وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا) اور ایسا کرنا اللہ کے لئے آسان ہے۔ لہٰذا اسلوب بیان میں عام مؤمنین سے خطاب (يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا.........) کو چھوڑ کر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دے کر ارشاد ہوا: ''وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا'' اس سے اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا کہ مؤمنوں میں سے جو شخص ایسا کرے (کسی کا مال ناجائز طریقہ سے کھائے اور اپنے آپ کو قتل کرے) جبکہ وہ سب ایک جان ہیں ''نفس واحدہ'' ہیں اور نفس واحدہ یعنی ایک جان کے لئے روا نہیں کہ اپنے آپ کو ہلاک کردے، تو وہ حقیقی معنوں میں مؤمنین میں سے نہیں، لہٰذا یہاں ایسا کرنے والے کی سزا کے بارے میں تمام مؤمنوں کو مخاطب قرار نہیں دیا گیا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے

مؤمنوں اور غیر مؤمنوں کے بارے میں آگاہ کیا گیا چنانچہ عمومی صورت میں حکم بیان کرتے ہوئے یوں کہا گیا: ''وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا'' جو شخص ایسا کرے زیادتی اور ظلم کی بناء پر، تو ہم بہت جلد اسے آگ میں جلادیں گے، اگر مؤمنین کو مخاطب قرار دکر حکم بیان کیا جاتا تو یوں کہا جاتا: ''ومن یفعل ذلك منکم'' (ور جو شخص تم میں سے ایسا کرے) جبکہ اس طرح نہیں کہا گیا۔

اور آیہ مبارکہ کا ذیلی جملہ ''وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا'' سے اس مطلب کی تائید ہوتی ہے کہ حرف ''ذٰلِكَ'' کا مشار الیہ ''لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' (اپنے آپ کو قتل نہ کرو) ہے یعنی حرف ''ذٰلِكَ'' (وہ) سے مراد اپنے آپ کو قتل کرنا ہے کہ جو شخص وہ کام کرے یعنی اپنے آپ کو قتل کرے تو ہم بہت جلد اسے آگ میں جلائیں گے۔ البتہ یہ بات اس صورت میں درست ہے جب جملہ ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا'' کو صرف اسی حکم یعنی اپنے آپ کو قتل کرنے کی ممانعت سے مربوط قرار دیا جائے اور اسی کی علت و وجہ مانا جائے کیونکہ اس طرح دونوں آیتوں کے ذیلی جملوں میں کامل مناسبت قرار پائے گی اور وہ اس طرح کہ آیۂ مبارکہ کا ظاہر یہ ہے کہ خداوند عالم تمہیں اپنے آپ کو قتل کرنے سے اس لئے منع کرتا ہے کہ وہ تم پر نہایت مہربان ہے ورنہ اس کے لئے اس شخص کو سزا دینا آسان ہے جو اپنے آپ کو قتل کرے یا کسی انسان کو قتل کرے کہ وہ اسے آگ میں جلادے، ایسا کرنا خدا کے لئے مشکل نہیں، بنابراین اگر پہلی آیت میں حکم کی علت یعنی خدا کا مہربان ہونا اور دوسری آیت میں سزا کی دھمکی، دونوں ہی کو پہلی آیت کے دو جملوں یعنی ''لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ'' (تم اپنے اموال ناجائز طور پر نہ کھاؤ) اور ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' (اور تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو) سے مربوط قرار دیا جائے تو اس میں کوئی حرج لازم نہیں آتا۔

ایک غلط فہمی

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان دو آیتوں میں جو تعلیل و تہدید وارد ہوئی ہے (حکم کی علت بیان کی گئی اور زیادتی کی صورت میں سزا کی دھمکی ذکر ہوئی ہے) ان دونوں کا یا صرف تہدید یعنی سزا کی دھمکی کا تعلق ان تمام ممنوعہ کاموں سے ہے جو اس سورۂ مبارکہ میں شروع سے اس آیت تک مذکور ہیں، اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حرف ''ذٰلِكَ'' ان تمام ممنوعہ اعمال کی طرف اشارہ کے لئے ہے جو آیت ۱۹ (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا.........) سے یہاں تک (آیت ۳۰ تک) مذکور ہیں، کیونکہ ان تمام ممنوعہ اعمال کی سزا ان آیات میں کہیں بھی بیان نہیں کی گئی۔

لیکن ان اقوال کی صحت کسی دلیل سے ثابت نہیں۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

سوال:۔ پہلی آیت میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا" (خدا تم پر نہایت مہربان ہے) اس میں سیاق کلام، غائب پر مبنی ہے جبکہ دوسری آیت میں یہ سیاق غائب سے متکلم مع الغیر میں تبدیل ہوا اور یوں ارشاد ہوا: "فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا" (ہم بہت جلد اسے آگ میں جلائیں گے) ایسا کیوں ہوا؟

جواب:۔ یہ تبدیلی ضمیر "ذٰلِكَ" سے مربوط ہے کہ اس میں عام مومنین سے خطاب کو حضرت رسول خدا ﷺ سے خطاب میں تبدیل کر دیا گیا اور پھر دوبارہ غائب کا انداز اپنا لیا گیا اور کہا گیا: "وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا" کہ اس میں اس کی علت کی طرف اشارہ مقصود ہے یعنی یہ کام اس کے لئے آسان ہے کیونکہ وہ اللہ ہے۔ "عزاسمہ"

روایات پر ایک نظر

باطل سے کیا مراد ہے؟

تفسیر "مجمع البیان" میں آیہ مبارکہ میں مذکور لفظ "بِالْبَاطِلِ" کے بارے میں دو قول ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد سود، جوا، ناپ تول میں کمی اور ظلم ہے، مرحوم طبرسی نے اس کی سند کے بارے میں کہا کہ یہ قول حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ہے۔ (تفسیر "مجمع البیان" جلد دوم صفحہ ۸۱)

کتاب نہج البیان میں حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ اس میں "باطل" سے جوا، رشوت، سود اور جھوٹی قسمیں مراد ہے۔

تفسیر العیاشی میں اسباط بن سالم سے منقول ہے، انہوں نے کہا کہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ وہاں ایک شخص آ گیا اور اس نے امام علیہ السلام سے عرض کی کہ مجھے آگاہ فرمائیں کہ اس آیہ مبارکہ میں "باطل" سے کیا مراد ہے "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" امامؑ نے ارشاد فرمایا: "عنی بذلک القمار" خداوند عالم نے اس سے قمار یعنی جوا مراد لیا ہے، اور جہاں تک جملہ "وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ" کا تعلق ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ

کوئی مسلمان اکیلا ہی مشرکوں پر حملہ کرے کہ ان کے گھروں میں داخل ہو جائے اور ان پر دھاوا بول دے جس سے خود مارا جائے، تو ایسا کرنے سے خداوند عالم نے انہیں منع فرمایا ہے۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول ص ۲۳۵)

مؤلف، آیہ مبارکہ میں ''اکل بالباطل'' یعنی باطل و ناجائز طریقہ سے مال کھانے کی ممانعت کا حکم عام ہے یعنی اس میں تمام باطل و ناجائز طریقوں سے مال کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور جوا وغیرہ کا ذکر ان طریقوں کے مصادیق کے طور پر ہوا ہے۔ یعنی جوا اور سود وغیرہ میں سے ہر ایک اس کا مصداق ہے۔ اسی طرح قتل النفس (وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ) کے بارے میں بھی جو کچھ مذکورہ بالا روایت میں مذکور ہے وہ بھی اس کے ایک مصداق کے طور پر ہے اور اس سے آیت میں عمومیت ملحوظ ہے تخصیص مقصود نہیں۔

جبیرہ کے متعلق فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تفسیر العیاشی میں اسحاق بن عبداللہ بن محمد بن علی بن الحسین سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: مجھے حسن بن زید نے اپنے پدر بزرگوار کے حوالہ سے بتایا ہے کہ امام علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا کہ میں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جبائر (وہ پٹیاں جو ہاتھ یا پاؤں کی ٹوٹی ہوئی جگہوں پر باندھی جاتی ہیں) کے بارے میں پوچھا کہ جس شخص کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہو وہ کس طرح وضو کرے؟ اور کس طرح غسل کرے کہ اگر اس پر جنابت کا غسل واجب ہو جائے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **یجزیہ المسح بالماء علیھا فی الجنابۃ والوضوء** اتنا ہی کافی ہے کہ اس پر غسل یا وضو کی تری سے مسح کیا جائے، امام علیؑ نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اگر موسم سخت ٹھنڈا ہو اور وہ پانی استعمال کرنے سے ڈرتا ہو تو اس صورت میں کیا کرے؟ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا'' (تم اپنے آپ کو نہ مارو، بے شک اللہ تم پر نہایت مہربان ہے)۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول صفہ ۲۳۶)

قتل عمدی کی سزا

کتاب ''من لایحضرہ الفقیہ'' میں مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''من قتل نفسہ متعمداً فھو فی نار جھنم خالداً فیھا'' جو شخص اپنے آپ کو عمداً قتل کرے وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ جلتا رہے گا، اس کے بعد امام نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا

وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا ۝ ''(اور تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر نہایت مہربان ہے، اور جو شخص ظلم و زیادتی کرتے ہوئے ایسا کرے تو ہم بہت جلد اسے آگ میں جلائیں گے اور ایسا کرنا اللہ کے لئے آسان ہے
(کتاب ''من لایحضرہ الفقیہ جلد ۳ صفحہ ۳۷۴)

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ روایات میں آیہ مبارکہ ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ...... '' کے معنی کی بابت عمومیت و وسعت مذکور ہے اور ہم نے بھی یہی بیان کیا ہے اور آیت کے الفاظ سے یہی استفادہ کیا ہے، مذکورہ معنی کی بابت دیگر روایات بھی موجود ہیں۔

خرید و فروخت میں باہمی رضایت

تفسیر ''در منثور'' میں ابن ماجہ اور ابن منذر کے حوالہ سے ابن عباس کا بیان مذکور ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''انما البیع عن تراض'' بیع یعنی خرید و فروخت صرف وہی صحیح ہے جو باہمی رضایت پر مبنی ہو (جس میں دونوں فریق راضی ہوں کہ کوئی جبر و اکراہ نہ ہو) (تفسیر ''در منثور'' جلد ۲ ص ۱۴۴)

اسی تفسیر (در منثور) میں ابن جریر سے منقول ہے کہ جناب ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک شخص سے معاملہ کیا یعنی خرید و فروخت کی، تو اس سے فرمایا: اختر، اسے اختیار کرو، یعنی اس پر اپنی رضایت دو، اس شخص نے کہا: قد اخترت، میں نے اختیار کر لیا یعنی میں راضی ہوں، اس وقت حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ھکذا البیع یہی بیع ہے یعنی خرید و فروخت اور معاملہ کی صحیح صورت یہی ہے۔ (''اختر'' سے مراد یہ ہے کہ معاملہ کی بقا و عدم بقا میں سے کسی ایک کو اختیار کریں)۔

اسی تفسیر (در منثور) میں بخاری، ترمذی اور نسائی کے حوالہ سے ابن عمر سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: البیعان بالخیار مالم یتفرقا اویقول احدھما للآخر: اختر، خرید و فروخت کرنے والے دونوں فریق جب تک ایک دوسرے سے الگ نہ ہوئے ہوں انہیں معاملہ ختم کرنے کا اختیار ہے، یا ان میں سے ایک، دوسرے سے کہے کہ اختیار کر لیں۔

یہ دونوں روایتیں جلد اول صفحہ ۱۴۴ پر مذکور ہیں۔ یاد رہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی قدر: ''البیعان بالخیار مالم یفترقا'' شیعہ احادیث میں آئمہ اطہار علیہم السلام کے اسناد سے مذکور ہے اور حدیث کے آخری الفاظ ''او یقول احدھا للآخر: اختر'' دراصل باہمی رضایت کے اظہار کو یقینی بنانے کے لئے ہیں۔

آیت ۳۱

○ اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ﴿۳۱﴾

ترجمہ

○ ''اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور تمہیں عزت والا مقام عطا کریں گے۔''

(۳۱)

تفسیر و بیان

یہ آیۂ مبارکہ ماقبل آیات سے بے ربط نہیں کیونکہ اس سے ماقبل آیاتِ مبارکہ میں بھی کبیرہ گناہوں کا تذکرہ ہوا ہے۔

عمومی حکم کا بیان

○ ''اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ..........''

(اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرو جن سے تمہیں روکا گیا ہے........)

''اجتناب'' کا لفظی اشتقاق ''جنب'' سے ہے جس کا معنی پہلو ہے، یعنی انسان کا جسمانی پہلو، اس سے استعارۂ فعل بنایا گیا ہے، اس کی مناسبت یہ ہے کہ انسان جب کسی چیز کو چاہتا ہے تو اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہے اور اس کے سامنے ہوتا ہے اور جب کسی چیز کو ناپسند کرتا ہے اور اس سے روگردانی کرتا ہے تو اپنا پہلو اس کی طرف کر لیتا ہے اور اس سے دوری اختیار کرتا ہے لہٰذا اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ اس نے اس سے اجتناب کیا یعنی اسے چھوڑ دیا، مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ لفظ ''اجتناب'' لفظ ''ترک'' سے زیادہ بلیغ ہے یعنی اس سے دوری کا معنی بہتر طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ لفظ اجتناب کے لفظی اشتقاق میں اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ ملحوظ نہیں کیونکہ یہ اسی مناسبت کے حوالہ سے استعارۂ تشکیل پایا ہے۔ چنانچہ اسی باب سے دیگر الفاظ کا اشتقاق واطلاق ہوا ہے مثلاً ''جانب'' (پہلو، طرف)، ''جنبیہ'' (وہ جانور جو اپنے مالک کے پہلو بہ پہلو اور اس سے الگ ہو کر چلتا ہے جیسے گائے، اونٹ وغیرہ) ''اجنبی'' (بیگانہ) تو ان الفاظ میں بھی یہی مناسبت ملحوظ ہے۔

''نُكَفِّرۡ'' باب تفعیل سے جمع متکلم کا صیغہ ہے، تکفیر کا لفظی اشتقاق ''کفر'' سے ہے اور عربی زبان میں لفظ ''کفر'' کا معنی ''ستر'' یعنی چھپانا ہے۔ البتہ قرآن مجید میں یہ لفظ گناہوں سے درگزر کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

''الکبائر'' یہ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''کبیرۃ'' ہے۔ یہاں آیۂ مبارکہ میں یہ لفظ وصف کی صورت میں

موصوف کی جگہ ذکر ہوا ہے، اس طرح اصل جملہ یوں فرض کیا جائے گا: ''ان تجتنبوا معاص کبیرہ'' (اگر تم کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرو)، تو ''کَبَآئِرَ'' یعنی بڑے کا تعلق ''معاصی'' (گناہوں) سے ہے لہٰذا ترجمہ یوں ہوگا کہ اگر تم بڑے گناہوں سے دوری اختیار کرو، چنانچہ اس کے ساتھ ''مَاتُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ'' کے الفاظ اسی مطلب کی طرف لطیف و بلیغ اشاراتی بیان کی صورت میں ہیں ''کبر'' یعنی بڑا ہونا ایک اضافی و نسبتی امر ہے اور وہ ''صغر'' یعنی چھوٹا ہونا سے تقابلی مقایسہ و موازنہ کی بناء پر ہی سمجھا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس کا سمجھا جانا یا وقوع پذیر ہونا ممکن نہیں، اسی حوالہ سے شریعت اسلامیہ میں دیگر گناہوں کی ممانعت کا پتہ چلتا ہے کہ جو ''صغیرہ'' ہیں یعنی کچھ گناہ ایسے بھی ہیں جو صغیرہ ہیں اور ان سے منع کیا گیا ہے اور ان کے مقابلے میں کچھ گناہ کبیرہ ہیں جن سے روکا گیا ہے، یہ بات جملہ ''کَبَآئِرَ مَاتُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ'' سے سمجھی جاتی ہے، بنابر ایں آیۂ مبارکہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گناہ و معاصی دو قسم کے ہیں: صغیرہ و کبیرہ، اور دوسری بات یہ ہے کہ آیہ مبارکہ میں ''سیئات'' سے مراد صغیرہ گناہ ہیں کیونکہ وہ کبیرہ گناہوں (کَبَآئِرَ) کے تقابلی مقام میں مذکور ہیں۔

ہاں، معصیت و نافرمانی خواہ جیسی بھی ہو وہ بڑی اور امر عظیم ہے کیونکہ اس کا ارتکاب وہ انسان کرتا ہے جو ضعیف و کمزور مخلوق ہے جبکہ جس کی نافرمانی کرتا ہے وہ خدائے بزرگ و برتر اور عظمت و کبریائی والا ہے کہ جس کی نافرمانی و حکم عدولی اسے زیب نہیں دیتی، اور گناہوں کی تقسیم کبیرہ و صغیرہ ہونے کے حوالہ سے انسان اور اس کے پروردگار کے درمیان مخلوق و خالق اور رب و مربوب کے تناظر میں ہے، ایک معصیت اور دوسری معصیت کے حوالہ سے نہیں ہے لہٰذا اس میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی کہ معصیت ایک حوالہ سے کبیرہ ہو اور بعض معاصی دوسرے حوالہ سے صغیرہ ہوں، اس میں کوئی حرج لازم نہیں آتا۔

کسی معصیت و گناہ کا کبیرہ ہونا اس بناء پر ہوتا ہے کہ اس کے ارتکاب سے شدید ممانعت کی گئی ہو یعنی جب اس کا موازنہ اس کے علاوہ کسی دوسرے اس فعل سے کیا جائے جس کا ارتکاب ممنوع ہو تو اس میں سے جس کی ممانعت شدید تر ہو وہ کبیرہ کہلاتا ہے چنانچہ اسی آیۂ مبارکہ میں جملہ ''مَاتُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ'' اسی مطلب کی طرف اشارہ یا دلالت کرتا ہے، اور کسی فعل کی شدید ممانعت کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ اس کے بیان میں سخت لہجہ اختیار کیا گیا ہو یا اس کے ارتکاب پر دوزخ کی آگ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہو یا اس طرح کے دیگر امور کے ذریعے اس کی ممانعت میں شدت کا اظہار ہو۔

عزت والا مقام

○ ''وَّنُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا''

(اور ہم تمہیں عزت والے مقام میں داخل کریں گے)

لفظ "مدخل" (م پر پیش اور خ پر زبر کے ساتھ اسم مکان ہے اور یہاں اس سے مراد بہشت یا قرب الٰہی کی منزلت ہے، اگرچہ ان دونوں کی بازگشت ایک ہی معنی کی طرف ہوتی ہے۔

گناہوں کے کبیرہ وصغیرہ ہونے اور خطاؤں کے درگزر کئے جانے کا بیان!

اس میں کوئی شک نہیں کہ زیر نظر آیہ مبارکہ "اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ......" میں اس بات کا ثبوت پایا جاتا ہے کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں۔ صغیرہ و کبیرہ، کہ ان دونوں کا جامع لفظ "سیئات" ہے چنانچہ گناہوں کے دو قسموں میں تقسیم ہونے کا ثبوت درج ذیل آیت میں بھی پایا جاتا ہے۔

سورۂ کہف، آیت: ۴۹

○ "وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ فَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُشۡفِقِيۡنَ مِمَّا فِيۡهِ وَيَقُوۡلُوۡنَ يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰٮهَا"

(اور نامہ اعمال رکھا جائے گا تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ ان کا حال نہایت برا ہوگا وہ وحشت زدہ ہوں گے اور کہیں گے ہائے ہم مارے گئے، یہ کتاب کیا ہے کہ نہ صغیرہ کو چھوڑتی ہے اور نہ ہی کبیرہ کو اس نے سب کو شمار کر دیا ہے)

اس آیت میں مجرموں کا وحشت زدہ ہونا اس وجہ سے ہوگا کہ وہ اپنے نامۂ اعمال میں مذکور گناہوں سے آگاہ ہوں گے کہ ان میں ان کے چھوٹے بڑے تمام اعمال لکھے گئے ہوں گے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں ایک صغیرہ گناہ اور دوسری کبیرہ گناہ۔

اب رہا لفظ "سیئات"، تو یہ جمع کا صیغہ ہے، اس کا مفرد "سیئۃ" ہے، تو اس کے الفاظ و حروف اور صیغہ و ہیئت ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا معنی ایسا واقعہ یا عمل ہے کہ جس میں پستی و برائی پائی جاتی ہے، شاید اسی وجہ سے اس کا اطلاق ان امور و مصائب پر ہوتا ہے جو انسان کو بدحال اور تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں، اس کی قرآنی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سورۂ نساء، آیت: ۷۹

○ "وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ"

(اور تجھے جو کام تکلیف دے وہ تیری اپنی طرف سے ہے)

سورۂ رعد، آیت: ۶

○ "وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالسَّيِّئَةِ"

(اور وہ آپ پر جلد ہی تکلیف و سختی کے آنے کے خواہاں ہیں)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ "سیئۃ" کا اطلاق گناہوں کے نتائج و آثار پر ہوتا ہے خواہ وہ دنیوی ہوں یا اخروی ہوں، اس سلسلہ میں درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ نحل، آیت: ۳۴

○ "فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا"

(تو ان کے برے اعمال کے نتائج ان پر ٹوٹ پڑے)

سورۂ زمر، آیت: ۵۱

○ "سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا"

(بہت جلد انہیں ان کے برے اعمال کے آثار ان پر آ پڑیں گے)

اصل و حقیقت کی بناء پر اس اطلاق کی بازگشت سابق الذکر معنی کی طرف ہوتی ہے، اور خود معصیت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:۔

سورۂ شوریٰ، آیت: ۴۰

○ "وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا"

(ہر گناہ و معصیت کی سزا، اسی جیسی مصیبت ہے)

لفظ "سیئۃ" بمعنی معصیت کا اطلاق مطلق معاصی و گناہوں پر بھی ہوتا ہے خواہ وہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ ہوں ملاحظہ ہو:

سورۂ جاثیہ، آیت: ۲۱

○ "اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾"

(کیا ان لوگوں نے کہ جنہوں نے گناہوں کے ارتکاب کی جسارت کی ہے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا قرار دیں گے، جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے، کہ ان کا جینا اور مرنا برابر ہیں، انہوں نے بہت برا سوچا ہے /فیصلہ کیا ہے)

اس آیت میں اور اس کی مشابہ آیات میں لفظ "سیئات" کا اطلاق، ہر معصیت و گناہ پر ہوا ہے خواہ وہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ہو۔

اور صغیرہ گناہوں پر اس کا اطلاق، زیر بحث آیت مبارکہ ہی سے ثابت ہے کہ جس میں ارشاد خداوندی ہوا: "اِنْ

تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ .... ''(اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تم سے تمہاری ''سیئآت'' سے درگزر کریں گے)اس آیت میں ''کبائر'' کا تقابل ''سیئآت'' سے ہوا ہے کہ کبائر سے اجتناب ''سیئآت'' سے درگزر کئے جانے کا سبب ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کبائر سے اجتناب کے بعد صغیرہ گناہ ہی باقی رہ جاتے ہیں جن سے درگزر کا وعدہ ہوا ہے کہ جنہیں ''سیئآت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال، اس آیہ مبارکہ میں گناہوں کا دو قسم میں تقسیم ہونا (صغیرہ و کبیرہ) ایک دوسرے ہی سے موازنہ ومقایسہ کی بناء پر ثابت ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں پایا جاتا، یعنی یہی آیت دلالت کرتی ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں: (۱) کبیرہ (۲) صغیرہ، کیونکہ اس آیت میں کبائر اور سیآت کا تقابلی تذکرہ ہوا ہے اور کبائر سے دوری اختیار کرنے سے سیآت یعنی صغائر سے درگزر کرنے کا وعدہ ہوا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی ہر طرح کے شک وشبہ سے خالی ہے کہ یہ آیہ مبارکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک احسان کی طرف توجہ دلاتی ہے اور اہل ایمان کی سماعتوں کو ایک خاص عنایت الٰہیہ سے بہرہ مند کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر وہ بعض گناہوں سے دوری اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کے بعض دیگر گناہوں سے درگزر کرے گا۔ (یعنی کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنا صغیرہ گناہوں کی بخشش کا سبب ہوتا ہے)اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صغیرہ گناہوں کے ارتکاب کی ترغیب دلائی گئی ہے یا ان کی انجام دہی کی جرأت دلائی گئی ہے، ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، اگر چہ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے ممانعت وارد ہوئی ہے اور صغیرہ گناہوں کو صغیرہ سمجھتے ہوئے ان کے ارتکاب کو معمولی سمجھا جاتا ہے جو کہ درست نہیں بلکہ اسے صغیرہ سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب کرنا اسے کبیرہ میں بدل دیتا ہے کیونکہ اس میں سرکشی کا پہلو کارفرما ہو جاتا ہے اور اسے مولا کی نافرمانی کی جرأت دلاتا ہے جو کہ گناہِ کبیرہ ہی نہیں بلکہ اکبر الکبائر یعنی بہت بڑا گناہ کہا جائے گا، لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ اس آیت میں لوگوں کو صغیرہ گناہوں کی معافی کا کہہ کر ان کے ارتکاب کی جرأت دلائی گئی ہے، آیت مبارکہ سے اس طرح کی بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی، بلکہ اس میں نفسانی طور پر کمزور پیدا کئے گئے انسان کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اپنی تخلیقی کمزوری وجہالت کی وجہ سے اگر صغیرہ گناہوں کا مرتکب ہو جائے تو اسے اس کی معافی اس طرح مل سکتی ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کرے بلکہ ان سے دوری اختیار کرے، یعنی جہالت اور نفسانی خواہشات کے غلبہ کے نتیجہ میں انجام پانے والے صغیرہ گناہوں کی معافی کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرنے سے ممکن ہو سکتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے مؤمن بندوں پر احسان ہے، بنابرایں اس آیت میں جو بنیاد ملحوظ ہے وہ توبہ والی آیت ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو توبہ کے ذریعہ گناہوں کی بخشش کی بشارت دی ہے اور کہا ہے کہ وہ توبہ کی راہ اپنائیں تو ان کے گناہوں کی معافی کا دروازہ کھل جائے گا چنانچہ اس طرح ارشاد الٰہی ہوا:۔

سورۂ زمر، آیت: ۵۳ - ۵۴

○ ''قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ''

(کہہ دیجئے، اے میرے وہ بندو کہ جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے کہ وہ ہے ہی معاف کردینے والا، نہایت مہربان، اور تم اپنے پروردگار کی طرف توبہ کے ساتھ پلٹ آؤ)۔

اس آیت مبارکہ میں گناہوں کی بخشش کا وعدہ کرتے ہوئے توبہ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے بلکہ توبہ کرنے کا ارشادی حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس آیت کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں لوگوں کو گناہ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور اسی وجہ سے انہیں توبہ کا دروازہ کھٹکھٹانے کا کہا گیا ہے کہ وہ کسی خوف وخطرہ کے بغیر گناہ کرتے رہیں اور پھر توبہ کرلیں تو انہیں معافی مل جائے گی (ایسا ہرگز نہیں) بلکہ توبہ کرنے کی دعوت دے کر انہیں گناہوں سے باز رہنے کی راہ پر لایا گیا اور وہ اس طرح کے بیانات کے ذریعے ناامید دلوں میں رحمت خداوندی کی روح پھونکی گئی ہے اور انہیں نئی زندگی دلائی گئی ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آیۂ مبارکہ کبیرہ گناہوں سے آگاہ ہونے سے منع نہیں کرتی، یعنی اس سے یہ مراد نہیں کہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کے خوف سے تمام گناہوں سے اجتناب کریں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ چونکہ تم کبیرہ گناہوں کی درست پہچان نہیں رکھتے لہٰذا ہر گناہ سے دوری اختیار کرو، اس طرح کا معنی مراد لینا بعید ہے، بلکہ آیت مبارکہ کے لب ولہجہ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس میں جن لوگوں کو مخاطب قرار دیا گیا ہے وہ کبائر سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں اور انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جن گناہوں کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے وہ کس قدر تباہ کن ہیں یا کم از کم یہ کہ اس آیت سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اس میں کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرنے کے حکم کے ذریعے ان سے آگاہی حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ بندگانِ خدا ان سے پورے طور پر بچ کر رہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے علاوہ دیگر گناہوں کے بارے میں بھی بے پرواہی سے کام نہ لیں، کیونکہ جس طرح آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ صغیرہ گناہوں کی بابت بے پروائی خود ایک بڑا گناہ اور تباہ کن عمل ہے۔

اس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ جب کوئی شخص کبیرہ گناہوں سے آگاہ ہوجائے اور انہیں بخوبی پہچان لے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ وہ ممنوعہ اعمال ہیں کہ ان سے درگزر کئے جانے کی بات ان کے ارتکاب کی شدت سے چشم پوشی کا سبب نہیں بن سکتی سوائے اس کے کہ ان سے سخت ندامت و پشیمانی اور توبۂ نصوح ہو، قلبی طور پر ان سے نفرت اور عملی طور پر ان سے دوری اختیاری کرنے کا پختہ ارادہ ہو، اسی حد تک ان کے بارے میں آگاہ ہونا انسان کو ان سے آگاہی دلانے اور ان کے

ارتکاب سے روگردانی کرنے کا سبب بنتا ہے۔

اور جہاں تک شفاعت کا تعلق ہے تو وہ برحق ہے، اس میں کوئی شک نہیں جیسا کہ آپ سابقہ ذکر شدہ مطالب سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ شفاعت اس شخص کو ہرگز فائدہ نہیں دے گی جو خداوند عالم کے احکام و دستورات کا مذاق اُڑائے اور انہیں بے توجہی و نہایت بے اہمیتی کی نظر سے دیکھے اور توبہ و ندامت کا استہزاء کرے، بنا بر ایں گناہ و معصیت کا شفاعت کے سہارے پر ارتکاب کرنا در حقیقت اللہ تعالیٰ کے احکام کو کوئی اہمیت نہ دینے اور ان کی بابت عملی بے اعتنائی برتنے کا دوسرا نام ہے جو کہ خود ایک بہت بڑا گناہ اور شفاعت کا راستہ روکنے کا یقینی سبب ہے۔ یعنی جو شخص اوامر الٰہی کی خلاف ورزی میں اس قدر جری ہو وہ شفاعت نہیں پا سکتا۔

انہی مطالب سے ہمارے سابقہ بیانات کی وضاحت ہوتی ہے کہ کسی گناہ کا بڑا ہونا اس سے ممانعت کی شدت ہی سے معلوم ہو جاتا ہے، یعنی جس گناہ سے بار بار منع کرنے اور اس کے ارتکاب پر شدید عذاب و سزا کا تذکرہ ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کبیرہ گناہ ہے۔

کبیرہ گناہوں کے بارے میں مفسرین کی آراء

کبیرہ گناہوں کے بارے میں اب تک جو مطالب ذکر کئے گئے ہیں ان سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ کبیرہ گناہوں کے معانی کی بابت مفسرین کی آراء بہت زیادہ ہیں، ذیل میں ان آراء میں سے چند ذکر کی جاتی ہیں:

پہلی رائے:۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ کبیرہ گناہ وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اخروی سزا (عذاب) مقرر فرمایا ہے اور دنیا میں بھی اس کی سزا (حد) معین کر دی ہے۔

یہ رائے درست نہیں کیونکہ روایات میں وارد ہوا ہے کہ صغیرہ گناہ کا بار بار ارتکاب کرنا بہت بڑا گناہ ہے، چنانچہ فریقین (شیعہ و سنی) کی کتب میں مذکور ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: ''**لا کبیرة مع الاستغفار، ولا صغیرة مع الاصرار**'' (استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں رہتا، اور بار بار انجام دینے سے کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا)۔ کتاب من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۴ ص ۱ (۱، تفسیر در منثور ج ۲، ص ۱۴۶) لہٰذا اس روایت کے مطابق بار بار انجام دینے سے کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا بلکہ وہ کبیرہ بن جاتا ہے، حالانکہ اس کے بارے میں کوئی دنیوی سزا (حد) مقرر نہیں کی گی، اسی طرح کفار کی حکمرانی اور سود کھانا اگرچہ دونوں ہی کبیرہ گناہوں میں سے ہیں لیکن ان کے بارے میں قرآن مجید میں سخت ممانعت کے ذکر کے باوجود ان کی کوئی دنیاوی سزا (حد) متعین و مذکور نہیں۔

دوسری رائے:۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کبیرہ گناہ اسے کہتے ہیں جس کے بارے میں خداوند عالم نے قرآن مجید میں دوزخ کی آگ سزا بیان کی ہے، بعض حضرات نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ کبیرہ گناہ اسے کہتے ہیں جس کی سزا قرآن وسنت دونوں میں دوزخ کی آگ ذکر کی گئی ہے (یعنی قرآن کے ساتھ سنت کا لفظ بھی مذکور ہے)۔

لیکن یہ رائے بھی صحیح نہیں کیونکہ اس کے برعکس صورت کلی طور پر ثابت نہیں، یعنی ایسا نہیں کہ جس گناہ پر قرآن و سنت میں دوزخ کی آگ کی سزا مذکور نہیں وہ کبیرہ نہیں بلکہ صغیر ہے، ایسا ہرگز نہیں۔

تیسری رائے:۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ کبیرہ گناہ سے مراد وہ عمل ہے جس کا ارتکاب دین کی بابت بے اعتنائی وعدم اہمیت کی بناء پر ہو، امام الحرمین نے اس رائے کو اختیار کیا ہے اور فخر الدین رازی نے بھی اسے پسند کیا ہے۔

لیکن یہ رائے قرین صحت نہیں کیونکہ یہ تو کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ کا مخصوص معنیٰ وعنوان ہے یعنی سرکشی وحد سے تجاوز کرنا، اس کے علاوہ دیگر متعدد گناہ ایسے ہیں جو کبیرہ ہیں لیکن ان پر یہ عنوان صادق نہیں آتا مثلاً یتیم کا مال کھانا، محرم کے ساتھ بدکاری کرنا، کسی مؤمن کو ناحق قتل کرنا۔

چوتھی رائے:۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ کبیرہ گناہ سے مراد یہ ہے کہ جو گناہ مستقل طور پر یعنی گناہ ہونے کی حیثیت میں حرام قرار دیا گیا ہو وہ کبیرہ کہلاتا ہے اس میں اس کے آثار وغیرہ کا کوئی دخل نہیں۔

یہ قول اگرچہ تیسری رائے کے بالمقابل واقع ہوا ہے لیکن یہ بھی درست نہیں کیونکہ سرکشی واحکام الٰہی کی بابت بے پرواہی اور اس طرح کے اعمال کبیرہ گناہ ہیں جبکہ یہ ایسے عنوانات ہیں جو کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے گناہ پر آئیں تو اسے کبیرہ بنا دیتے ہیں اور اس کے مرتکب کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔

پانچویں رائے:۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ کبیرہ گناہ وہ ہے جس کے بارے میں سورۂ نساء کی پہلی آیت سے تیس آیات تک سب ہی بیان کرتی ہوں، گویا اس قول کے مطابق کبیرہ گناہ صرف اسے کہتے ہیں جن کا اشارہ سابقہ آیات میں ہوا ہے یعنی آیۂ مبارکہ "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ" میں "کبائر" سے مراد وہ گناہ ہیں جو سابقہ آیات میں ذکر کئے گئے ہیں مثلاً قطع رحمی، یتیم کا مال کھانا، بدکاری وغیرہ۔

لیکن اس قول کی عدم صحت کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ آیت کے اطلاق کے منافی ہے، یعنی آیت مطلق ہے اس میں کسی مخصوص عمل کے کبیرہ ہونے کا بیان مقصود نہیں، بلکہ اس میں ان تمام کبائر کا ذکر ہے جن سے منع کیا گیا ہے۔

چھٹی رائے:۔ بعض حضرات کا کہنا ہے (اس قول کی نسبت ابن عباس کی طرف دی گئی ہے) کہ ہر وہ عمل جس کے انجام دینے سے خداوند عالم نے منع فرمایا ہے وہ گناہ کبیرہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ممنوع کئے ہوئے کام کو انجام دینا اس کی مخالفت اور اس کے اوامر کی نافرمانی سے عبارت ہے جو کہ بہت بڑا گناہ ہے۔

لیکن اس قول میں خامی یہ ہے جیسا کہ آپ قارئین کرام سابق الذکر مطالب میں آگاہ ہو چکے ہیں کہ گناہوں کا دو قسموں میں تقسیم ہونا ان میں سے بعض کے دوسرے بعض کے ساتھ موازنہ کی بنیاد پر ہے جبکہ مذکورہ بالا رائے میں ان کی تقسیم اس بناء پر ہوئی ہے کہ ان کا مرتکب شخص عبد ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہ جو ہر چیز کا رب ہے نافرمانی کرتا ہے، ممکن ہے یہ رائے اس لئے بھی پسند اور قبول کی جائے کہ آیت میں لفظ ''کبآئر'' کے ساتھ جملہ ''مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ'' ذکر ہوا ہے جو کہ ادبی حوالہ سے حرف ''مَا'' بیانیہ پر مشتمل ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کبائر وہ گناہ ہیں جن سے تمہیں روکا گیا ہے، یعنی حرف ''مَا''، کبائر کا مرادی معنیٰ بیان کرتا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اس طرح آیت کے معنی کی برگشت اس بیان کی طرف ہوگی: ''اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ'' (اگر تمام گناہوں سے دوری اختیار کرو تو ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے) تو جب تمام گناہوں سے اجتناب ہو تو کوئی سیئہ (برائی وخطا) باقی ہی نہ رہے گی کہ جس سے درگزر کرنے کی ضرورت پڑے، اور اگر یہ کہا جائے کہ اس میں ان لوگوں کو مخاطب قرار دیا گیا ہے جو آیت کے نزول سے پہلے کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے یعنی حرف ''مَا'' کی اضافت بیانیہ ہو اور کہا جائے کہ اس میں مؤمنین کے وہ گناہ مقصود ہیں جن کا ارتکاب انہوں نے آیت مبارکہ کے نزول سے پہلے کیا اور انہی گناہوں سے درگزر کرنے کا اظہار ہوا ہے، تو اس طرح آیت مبارکہ میں پہلے اور بعد میں آنے والے لوگ شامل نہ ہوں گے بلکہ وہ صرف انہی افراد کے ساتھ مختص ہو جائے گی جو آیت کے نزول کے وقت موجود تھے، تو اس طرح آیت کی عمومیت ختم ہو جائے گی جو کہ اس کے ظاہر سے ثابت ہوتی ہے اور اگر آیت کی عمومیت اپنے مقام پر باقی ہو تب بھی اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم تمام گناہوں سے اجتناب کرنے کا عزم و پختہ ارادہ بھی کر لو اور ان سے عملی طور پر اجتناب بھی کرو تو ہم اس سے پہلے والے تمہارے گناہوں وخطاؤں سے درگزر کریں گے۔ لیکن یہ معنیٰ بہت ہی نادر ہے کہ جس کا مصداق اور عملی مورد بہت کم ہے بلکہ وجود ہی نہیں رکھتا کہ اس پر آیت کی عمومیت بار ہو ہی نہیں سکتی، یعنی کلام الٰہی سے یہ معنی مراد لیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ نوع انسانی عمومی طور پر سیئہ وخطاء اور غلطیوں سے پاک نہیں سوائے ان ہستیوں کے کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت وعصمت کی خصوصیت عطا کی ہو۔ (غور کریں)

ساتویں رائے:۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ گناہ صغیرہ اسے کہتے ہیں کہ جس کا عذاب اس کے ثواب سے کم ہو اور کبیرہ گناہ اسے کہتے ہیں جس کا عذاب اس کے ثواب سے زیادہ ہو۔ اس قول کی نسبت فرقۂ معتزلہ کی طرف دی گئی ہے۔

لیکن یہ رائے درست نہیں کیونکہ یہ ایسا معنیٰ ہے جو اس آیۂ مبارکہ اور کسی بھی قرآنی آیت سے ثابت نہیں ہوتا، البتہ قرآنی آیات سے بعض گناہوں کے حبط ہونے کا ثبوت ملتا ہے نہ کہ تمام گناہوں کے ختم ہونے کا، یہ بات خواہ ان حضرات کے نظریہ کے مطابق ہو یا نہ ہو، اعمال کے حبط ہونے کے بارے میں تفصیلی مطالب المیزان کی دوسری جلد میں تفصیلی طور پر ذکر کئے جا چکے ہیں۔

اس قول ونظریہ والے حضرات (فرقۂ معتزلہ) نے یہ بھی کہا ہے کہ خداوند عالم پر واجب ولازم ہے کہ کبیرہ گناہوں

سے اجتناب کرنے والوں کی خطائیں (سیئات) اور صغیرہ گناہوں سے درگزر فرمائے کیونکہ ان پر ان کا مواخذہ کرنا صحیح نہیں، لیکن ان کی اس بات کی تصدیق آیہ مبارکہ سے بالکل نہیں ہوتی۔

آٹھویں رائے:۔ بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ کسی بھی معصیت و گناہ کا بڑا اور چھوٹا ہونا ان اعتباری نسبتوں کے حوالہ سے معین ہوتا ہے جو اس کے ارتکاب میں دخیل اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں لہٰذا جس معصیت کا امر ربوبی کی اہانت و مذاق اُڑانے یا اس کی بابت بے پرواہی و بے اہمیتی کی بنیاد پر ارتکاب کیا جائے وہ کبیرہ ہے، اور بعینہ اسی معصیت کا ارتکاب اگر غیض و غضب سے مغلوب ہو کر یا خوف طاری ہونے کے نتیجہ میں یا شہوت کے حملوں کی زد میں آ کر کیا جائے تو وہ صغیرہ ہے جسے اس شرط پر معاف کیا جا سکتا ہے کہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے دوری اختیار کی جائے۔

اور مذکورہ بالا تمام عنوانات یعنی خداوند عالم کے اوامر واحکام کے بارے میں بے اعتنائی سے کام لینا، انہیں اہمیت کی نظر سے نہ دیکھنا بلکہ ان کا مذاق اڑانا اور ان پر نہایت بے توجہی روا رکھنا، تو ان سب کا جامع عناد اور اللہ پر زیادتی و ناروا سلوک کرنا ہے، لہٰذا خلاصۃ القول کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ گناہ کہ شریعت اسلامیہ میں جس کے ارتکاب سے ممانعت وارد ہوئی ہو اگر اسے عناد اور زیادتی کرتے ہوئے انجام دیا جائے تو وہ کبیرہ ہے ورنہ صغیرہ ہوگا کہ جو اس شرط پر قابل معافی ہے کہ عناد و دشمنی اور زیادتی کرنے سے اجتناب برتا جائے۔

اس قول کی وضاحتی تاویل کرتے ہوئے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہر برے کام اور ہر وہ کام جس کی بابت خداوند عالم نے منع فرمایا ہے خواہ وہ کوئی ایک کبیرہ ہو یا سب کبائر ہوں، یا صغیرہ ہو یا تمام صغائر ہوں، اور خواہ ہر گناہ میں سے سب سے بڑا گناہ ہو اس کے ارتکاب میں خداوند عالم کے اوامر ونواہی کی بابت بے اعتنائی اور فرائض وواجبات کی بے حرمتی و بے احترامی ہی بنیادی وجہ ہوتی ہے اور بار بار گناہ کا مرتکب شخص درحقیقت احکام خداوندی کی عملی بے حرمتی کا مجرم کہلاتا ہے اور اسے کسی بھی صورت میں اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کا احترام کرنے والا اور ان کی بابت اہمیت کی نظر رکھنے والا نہیں کہا جا سکتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ" یعنی اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے اجتناب برتو جن سے تمہیں روکا گیا ہے۔ وہ کبائر جن میں ہر وہ چیز شامل ہے جس سے تمہیں روکا گیا ہے۔ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ، تو ہم تمہاری غلطیوں وبرائیوں سے درگزر کریں گے، یعنی ہم تمہارے صغیرہ گناہوں کو معاف کر دیں گے اور ان پر تمہارا مواخذہ نہ کریں گے۔

لیکن یہ بیان اور وضاحتی تاویل درست نہیں کیونکہ کسی معصیت و گناہ کا ارتکاب سرکشی اور خدا کی نافرمانی کی بناء پر ہونا ہر گناہ کے اسی بناء پر سرزد ہونے کا سبب نہیں کہلا سکتا ورنہ بعض وہ گناہ جو اس وجہ سے سرزد نہیں ہوتے وہ کبیرہ نہیں قرار پائیں گے، مثلاً محرم عورت سے بدکاری، اجنبی عورت پر نظر ڈالنے کی نسبت کبیرہ نہیں کہلائے گی۔ اور نفس محترمہ یعنی کسی انسان کو از روئے ظلم قتل کرنا کسی کو ضرب لگانے کی نسبت کبیرہ نہیں کہلائے گا جبکہ وہ دونوں ہی کبیرہ ہیں۔ خواہ ان پر کوئی چھاپ لگے

یا نہ لگے،، البتہ اگر ان تباہ کن عنوانات میں سے کوئی بھی ان پر آئے تو اس میں ممانعت شدید ہو جائے گی اور نافرمانی میں اضافہ ہو جائے گا اور گناہ بہت بڑا کہلائے گا، چنانچہ جوزنا و بدکاری کا عمل نفسانی خواہش اور شہوت و جہالت کے غالب آنے کی وجہ سے سرزد ہو وہ اس زنا کی طرح نہیں جو زنا کو جائز قرار دیتے ہوئے انجام دیا جائے، دونوں میں فرق ہے۔

بنابرایں اگر آیۂ مبارکہ کا معنیٰ یہ کریں کہ "ان تجتنبوا فی کل معصیة کبائرها نکفر عنکم صغائرها" یعنی اگر تم ہر گناہ میں اس کے کبائر سے اجتناب کرو تو ہم اس کے صغائر تمہیں معاف کردیں گے۔تو یہ معنی نہایت ہی بے قیمت ہوگا اور اسے کسی بھی صورت میں آیۂ مبارکہ "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ" کا مرادی معنیٰ قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ اس کا سیاق اس طرح کا معنی مراد لینے سے مطابقت نہیں رکھتا اور جو شخص بھی کلام کے اسلوب سے معمولی سا انس بھی رکھتا ہو وہ اس حوالہ سے ناآگاہی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

نویں رائے:۔ امام غزالی کا بیان ہے کہ جسے فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں منتخبات کتاب الاحیاء (احیاء العلوم) کے حوالہ سے ذکر کیا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تمام اقوال کو سامنے رکھ کر ایک جامع نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ یہ کہ جب گناہوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کبیرہ ہیں اور بعض صغیرہ ہیں جیسے محرم سے زنا کرنا، اجنبی عورت کی طرف نگاہ کرنے کی نسبت سے کبیرہ ہے، اگرچہ بعض گناہ ایسے ہیں کہ بعض خطرناک عنوانات کے ان پر آنے کی وجہ سے کبیرہ قرار پاتے ہیں جیسے صغیرہ گناہوں کا بار بار ارتکاب کرنا کہ اس سے صغیرہ گناہ بھی کبیرہ ہو جاتے ہیں جبکہ پہلے خود اس طرح نہیں ہوتے، اسی سے واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی عمل اور مجرمانہ فعل کا دوسرے مشابہ فعل سے موازنہ کریں تو ان میں سے کوئی صغیرہ ہوگا اور کوئی کبیرہ ہوگا، اس بناء پر گناہوں کی دو قسمیں قرار پائیں گی، ایک صغائر، دوسرے کبائر، پھر وہ اس تقسیم کے ساتھ ساتھ دو قسموں میں تقسیم ہوں گے اور وہ اس طرح کہ گناہ کے آثار اور اس کے اجر و ثواب کو ضائع کردینے کی نسبت کو دیکھا جائے گا کہ آیا وہ اپنی اثر گزاری میں غالب ہے یا کم ہے، اگر وہ غالب نہیں تو وہ گناہ اسی حد تک زوال پذیر ہو جائے گا جتنا اس کی ثواب سے تقابلی نسبت ہوگی، کیونکہ ہر اطاعتی عمل انسان کے نفس میں اچھی تاثیر رکھتا ہے کہ جس سے اس کا مقام بلند ہو جاتا ہے اور اسے گناہ کی گندگی و جہالت کی تاریکی سے نجات عطا کرتا ہے، یہ بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے گناہ و معصیت نفس کو آلودہ کردیتی ہے کہ جس سے اس کا مقام گر جاتا ہے اور اسے خداوند عالم سے دور کر کے جہالت کی تاریکی میں ڈال دیتی ہے۔

بنابرایں جب کوئی انسان کسی معصیت کا ارتکاب کرے جبکہ اس سے پہلے اس نے اپنے لئے کسی اطاعتی عمل کے ذریعے نور اور صفائے قلب حاصل کرلی ہو تو یقیناً معصیت کی تاریکی اور اطاعت کی روشنی میں تصادم ہوگا کہ اگر معصیت کی تاریکی اور گناہ کا عذاب اطاعت کے نور پر غالب آگیا اور اس پر چھا گیا تو اسے حبط و ضائع کردے گا لہٰذا وہ معصیت کبیرہ گناہ کہلائے گی، اور اگر اطاعت اپنے نور و درخشندگی کے ساتھ غالب آگئی تو وہ جہالت کی ظلمت و تاریکی اور گناہ کی گندگی و

پلیدی کو اتنی مقدار میں دھودے گی ان دونوں کے درمیان موازنہ کی نسبت پائی جائے گی اور جس قدر اطاعت کا نور باقی ہو گا وہ اس شخص کی لوح نفس پر اپنا اثر چھوڑ دے گا اور اپنی درخشندگی سے اسے گھیر لے گا، یہی ہے تحابط یعنی اعمال کے آثار کا چھٹ جانا، اور وہ بعینہ صغیرہ گناہوں کی معافی اور کبیرہ گناہوں و خطاؤں سے درگزر کرنے کا معنی ہے۔ تو اس طرح کے گناہوں کو صغیرہ گناہ کہا جائے گا۔ اور جہاں تک نیکی (حسنة) اور برائی (سیئة) کا ثواب و عذاب کے حوالہ سے برابر ہونے کا تعلق ہے تو وہ بظاہر عقلی طور پر درست معلوم ہوتا ہے (ہر نیکی پر ثواب و جزا اور ہر برائی پر عذاب و سزا برابر مقرر کی گئی ہے) اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کا وجود فرض کریں جس نے نہ تو کوئی اطاعتی عمل انجام دیا ہو اور نہ ہی کوئی گناہ کیا ہو کہ جس کے نتیجہ میں نہ تو نور اس کے دل میں آیا ہو اور نہ ہی ظلمت اس پر چھائی ہو لیکن اس طرح کے شخص کے وجود کا تصور کرنا آیہ مبارکہ "فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ" (ایک گروہ بہشت میں جائے گا اور ایک فریق دوزخ کی آگ میں جلے گا) کے سراسر منافی ہے (یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص نہ بہشتی ہو اور نہ دوزخی ہو)۔ یہ ہے غزالی کے بیان کا خلاصہ۔

فخر الدین رازی نے غزالی کا بیان ذکر کرنے کے بعد اس نظریہ کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ نظریہ معتزلہ کے مذہب کے اصولوں پر مبنی ہے کہ جسے ہم غلط و باطل قرار دیتے ہیں، لیکن تفسیر المنار کے مؤلف نے غزالی اور رازی دونوں کے بیانات ذکر کرنے کے بعد رازی کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے یوں کہا ہے: اگر قرآن مجید میں گناہوں کے دو قسموں میں تقسیم ہونے کا ذکر سرکشی وغیرہ کے بغیر صراحتاً موجود ہو تو کیا یہ بات معقول ہے کہ ابن عباس اس کا انکار کریں؟ ہرگز نہیں، بلکہ عبدالرزاق نے ابن عباس سے روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے کسی کے اس سوال پر کہ آیا کبیرہ گناہ سات ہیں یہ جواب دیا کہ وہ ستر کے قریب ہیں، اور ابن جبیر نے روایت کی ہے کہ ابن عباس نے کہا کہ کبیرہ گناہ سات سو کے لگ بھگ ہیں، اور گناہوں کے دو قسموں یعنی صغیرہ و کبیرہ میں تقسیم ہونے کے انکار کی نسبت اشعری فرقہ کی طرف دی گئی ہے، تو جن لوگوں نے گناہوں کے صغیرہ و کبیرہ میں تقسیم ہونے کا انکار کیا ہے گویا وہ فرقہ معتزلہ کی مخالفت میں ایسا کہتے ہیں خواہ تاویل کی صورت میں کیوں نہ ہو یعنی عین ممکن ہے کہ ان کے بیانات سے بظاہر یہ ثابت نہ ہوتا ہو لیکن ان کے بیانات کی تاویلی صورت اسی کو ظاہر کرتی ہے جیسا کہ ابن فورک کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اشعری فرقہ کے نظریہ کو درست قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ تمام گناہ اور خدا کی معصیت و نافرمانی کے اعمال کبیرہ ہیں اور اگر بعض گناہوں کو صغیرہ اور بعض کو کبیرہ کہا جاتا ہے تو اضافتی عنوان سے ہے، اور معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، صغیرہ و کبیرہ، لیکن یہ درست نہیں (یہاں تک ابن فورک کا بیان تمام ہوا)، اس نے آیت کی تاویل اس طرح کی ہے جو ذہن سے بہت دور ہے۔

تو کیا آیات و احادیث کی صرف اسی بناء پر تاویل درست ہے کہ معتزلہ کی مخالفت مقصود ہے خواہ وہ اپنی کسی بات میں صحیح بھی ہوں؟

بہرحال اس پر حیرت بھی نہیں ہے کیونکہ مذہبی تعصب ہی وہ خطرناک بلا ہے جس کے نتیجہ میں کئی بزرگ علماء اپنے

آپ کو اور اپنی قوم کو اپنے علم وفہم سے فائدہ پہنچانے سے محروم ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی کتابوں کو ایسے مطالب سے بھر دیا ہے جو مسلمانوں میں فتنہ انگیزی کا سبب بنے ہیں اور دینی حقائق کی بابت بحث وجدال کر کے اپنی قوتیں ضائع کر دی ہیں، ابھی آپ دیکھیں کہ رازی نے غزالی کے حوالہ سے کیا لکھا ہے اور اس مذہبی تعصب کی بناء پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے، تب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ رازی اور غزالی کے درمیان کتنا فرق ہے، رازی کہاں اور غزالی کہاں؟ معاویہ کہاں اور علیؑ کہاں؟ (یہاں تک تفسیر المنار کے مؤلف کا بیان تمام ہوا) مؤلف المنار نے اپنے بیان کے آخر میں غزالی ورازی کے درمیان ہونے والی اس جدالی بحث کی طرف اشارہ کیا ہے جسے ہم بیان کر چکے ہیں۔

بہر حال غزالی نے جو کچھ بیان کیا ہے اگر چہ کسی حد تک وہ درست ہے لیکن بعض حوالوں سے اس میں بھی خامیاں پائی جاتی ہیں مثلاً:۔

(۱) غزالی نے گناہوں کے صغیرہ وکبیرہ میں تقسیم ہونے کو ثواب وعقاب کے زیادہ وکم ہونے کی بناء پر قرار دیا ہے جو کہ ان کے اس بیان سے دائمی مطابقت نہیں رکھتا جو ابتدائے بحث میں اصل گناہوں ومعصیتوں کے بارے میں انہوں نے دیا، کیونکہ اکثر وہ کبیرہ گناہ کہ جن کا کبیرہ ہونا مسلم الثبوت ہے ممکن ہے ان کے انجام دینے والا ایسے ثواب کا حامل ہو جو ان گناہوں پر غالب آ جائے، اسی طرح کوئی ایسی معصیت وصغیرہ گناہ فرض کیا جائے کہ جس کے انجام دینے والے کے باطن میں موجود اس ثواب وجزاء عمل صالح سے سامنا ہو جو اس صغیرہ گناہ سے بھی چھوٹا اور نہایت کم ہو، تو اس طرح صغیرہ وکبیرہ میں مذکورہ دونوں تقسیموں کے حوالہ سے فرق پیدا ہو جائے گا چنانچہ پہلی تقسیم کی بناء پر بعض گناہ صغیرہ ہوں گے جبکہ وہی گناہ دوسری تقسیم کی بنیاد پر کبیرہ ہوں گے اور بعض گناہ اس کے برعکس ہوں گے یعنی پہلی تقسیم کی بناء پر کبیرہ جبکہ دوسری تقسیم کی بناء پر صغیرہ ہیں لہٰذا ان دو تقسیموں کے درمیان کلی مطابقت نہیں پائی جاتی۔

(۲) دینی ظواہر وبیانات یعنی قرآن وسنت کے مطابق گناہوں ومعصیتوں کے درمیان ایک دوسرے سے تصادم اگر چہ فی الجملہ ــــ بعض حوالوں سے ــــ ثابت ہے لیکن ہمیشہ اور کلی طور پر ثابت نہیں۔ کتاب وسنت سے کون سی دلیل ہے جو گناہوں کے عقاب اور اطاعات کے ثواب کے درمیان کلی طور پر تزایل وتحابط کو ثابت کرتی ہے؟ (تزایل وتحابط سے مراد یہ ہے کہ ثواب وعقاب کے تقابل میں شدت وضعف کی بناء پر ایک دوسرے کو ختم کرنے کا موجب ہو یعنی ایک دوسرے کو سرے ہی سے ختم کر دے) اس طرح کی ٹوٹ پھوٹ کی کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں۔

اور غزالی نے جو تفصیل ذکر کی ہے کہ لوحِ نفس پر کچھ پاکیزہ نورانی صورتیں ثبت ہوتی ہیں اور اسی طرح کچھ ظلماتی ناپاک صورتیں بنتی ہیں اور وہ دونوں اگر چہ اکثر ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کو مٹانے ومحو کرنے کا سبب بنتی ہیں لیکن ہمیشہ اور کلی طور پر ایسا نہیں ہوتا بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر فضیلت ورزیلت اپنے اپنے مقام پر باقی رہتی

ہے اور گویا وہ ایک دوسرے کی بقاء کا معاہدہ کر لیتی ہیں اور نفس یعنی لوح دل کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہیں کہ گویا ایک حصہ فضیلتوں سے مخصوص ہو جاتا ہے اور دوسرا حصہ رذیلتوں سے مخصوص ہو جاتا ہے یعنی نیکی و بدی دونوں ہی موجود ہوتی ہیں چنانچہ آپ ایک مسلمان کو دیکھتے ہیں کہ وہ سود کھاتا ہے اور لوگوں کے اموال ہڑپ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا اور جس پر ظلم کرتا ہے اس کی فریاد پر ہرگز کان نہیں دھرتا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے خلوص کا اظہار کرنے میں مصروف ہوتا ہے یعنی عبادت کی ادائیگی اور دعاؤں و مستحبات کی انجام دہی اس کا معمول ہوتا ہے، تو اس طرح کی حالت کو عصر حاضر کے علماء علم النفس دہری شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں یعنی متعدد و مختلف صفات و اعمال کے ٹکراؤ کے باوجود ان کو یکجا کرنا، اس کی عملی صورت یوں ہوتی ہے کہ مختلف نفسانی خواہشیں ایک دوسری سے ٹکراتی ہیں اور اس ٹکراؤ اور تصادم میں بعض دوسری بعض پر غالب آ جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں انسان باطنی طور پر نہایت عذاب میں مبتلا ہوتا ہے اور بالآخر وہ دونوں حالتیں لوحِ نفس پر نقش ہو جاتی ہیں کہ ان کے یکجا ہونے کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے ان دونوں کے درمیان مصالحت و معاہدہ طے پا گیا ہے کہ دونوں ہی اکٹھی رہیں گی لیکن عملی طور پر جب ایک حرکت میں ہو تو دوسری اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے اور اسے اپنا کام کرنے دیتی ہے اور جب دوسری حرکت میں آتی ہے تو پہلی پیچھے ہٹ جاتی ہے اور اسے اہتمام کرنے دیتی ہے جیسا کہ آپ نے مذکورہ بالا مثال میں ملاحظہ کیا ہے کہ ایک مسلمان سود بھی کھاتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے۔ تو جب وہ سود خوری کرتا ہے تو برائی والی صفت اپنا کام کر رہی ہوتی ہے اور جب وہ نماز پڑھتا ہے تو نیکی والی صفت اپنا کام کرتی ہے، ان میں سے کوئی کسی دوسری کا راستہ نہیں روکتی۔

(۳) غزالی کے بیان میں تیسری خامی یہ ہے کہ ان کے بیان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ صغیرہ گناہوں کی بخشش و درگزر کرنے میں کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے کی شرط بے معنی ہو جائے گی جبکہ قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ صغیرہ گناہوں سے درگزر کئے جانے کی شرط یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے لیکن غزالی کا کہنا ہے کہ جو شخص کبیرہ انجام نہیں دے سکتا اس کے صغیرہ گناہوں سے درگزر کیا جائے گا حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ جو شخص کبیرہ گناہ اس لئے انجام نہیں دیتا کہ وہ ان کے انجام دینے کی طاقت اور خواہش و رغبت رکھنے کے باوجود اس سے دوری اختیار کرتا ہے بلکہ اس لئے انجام نہیں دیتا کہ وہ ان کی انجام دہی کی طاقت ہی نہیں رکھتا اور ان کا ارتکاب اس کے بس میں ہی نہیں تو ایسے شخص کی خطائیں اس کی عبادات اطاعتی اعمال کی وجہ ہی سے ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ ثواب اس کے کئے کے عذاب پر غالب آ جاتا ہے کہ یہی بات سیئات سے درگزر کرنے سے عبارت ہے، لہٰذا اس کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنا ہی اس کی خطاؤں یعنی صغیرہ گناہوں سے درگزر کئے جانے کا سبب بنتا ہے، تو اس کے بعد اسے یہ کہنا کہ اگر تو کبیرہ گناہوں سے اجتناب برتے تو ہم تیری خطاؤں سے درگزر کریں گے بے معنی و بے مقصد ہوگا۔

غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں یہ لکھا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرنا تب صغیرہ گناہوں سے درگزر کئے جانے کا سبب بنتا ہے جب ان کو طاقت وقدرت رکھنے کے باوجود انجام نہ دیا جائے جیسا کہ وہ شخص جو کسی خاتون سے بدکاری کرنے پر قادر ہو اور اس کام میں کوئی چیز اسے آڑے نہ آئے لیکن وہ اپنی نفسانی خواہش پر قابو پائے اور اس کے ساتھ برا فعل انجام نہ دے بلکہ صرف اس پر نظر کرنے یا اسے چھونے پر اکتفاء کرے، تو اس کا ایسا کرنا یعنی بدکاری پر قادر ہونے کے باوجود اس سے باز رہنا اس کے باطن کا جہاد ہے اور نفس سے جنگ ہے کہ جو نگاہ کرنے یا چھونے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے یہی معنی ہے خطاؤں اور صغیرہ گناہوں سے درگزر کئے جانے کا، یعنی جب اس نے تمام تر طاقت کے باوجود اپنے نفس پر قابو پا کر بدکاری سے اجتناب کیا تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہ یعنی نگاہ کرنے یا چھونے کی خطا سے درگزر کرے گا۔ ''نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ'' کا معنی بھی یہی ہے لیکن اگر وہ شخص نامرد ہو اور مجامعت پر قادر ہی نہ ہو یا کوئی ایسا مانع ورکاوٹ سامنے آجائے جس کی وجہ سے بدکاری کی انجام دہی اس کے بس میں نہ رہے یا پھر یہ کہ آخرت کے عذاب کا خوف اس پر اس قدر چھا جائے کہ وہ برا فعل انجام دے ہی نہ سکے تو اس طرح کی صورتحال کسی صغیرہ گناہ سے درگزر کا سبب نہیں بن سکتی، بنابرایں جو شخص طبعاً شراب خوری کی طرف رغبت ہی نہ رکھتا ہو، اگر اسے شراب نوشی کی اجازت بھی دے دی جائے تب بھی وہ شراب نوشی کا مرتکب نہیں ہوگا تو ایسے شخص کا کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنا اُن صغیرہ گناہوں سے درگزر کئے جانے کا سبب نہیں بن سکتا جو شراب نوشی کی محفل کے لازمی حصے شمار ہوتے ہیں مثلاً گانا بجانا اور رقص وغیرہ، البتہ جو شخص طبعی طور پر شراب خوری کی طرف رغبت رکھتا ہو اور ناچ گانے کا بھی دلدادہ ہو لیکن اپنے نفس سے جہاد کرتے ہوئے شرابخوری سے اجتناب کرے اور ناچ گانے سے بھی دوری اختیار کرے تو اس کا ایسا کرنا عین ممکن ہے کہ اس کے دل پر چھائی ہوئی اس تاریکی کو محو کردے جو گانا سننے کے نتیجہ میں آگئی تھی، بہر حال یہ سب اُخروی احکام ہیں کہ قیامت کے دن ان کا حساب وکتاب ہوگا (غزالی کا بیان یہاں تک تمام ہوا)۔ ملاحظہ ہو: کتاب احیاء العلوم، حصہ ۱۲ ص ۱۷۷

غزالی نے اسی کتاب میں ایک مقام پر یوں لکھا ہے: جو ظلمت وتاریکی دل پر چھا جائے وہ ہرگز دور نہیں ہوسکتی، اسے صرف وہی نور محو کرسکتا ہے جو اس کے عین مدمقابل نیکی سے پیدا ہو، متضاد امور یعنی نیکی وبدی میں ایک دوسرے سے تناسب کا حامل ہونا ضروری ہے لہٰذا یہ بات ضروری ہے کہ ہر برائی کو اسی نیکی کے ذریعے محو کیا جائے جو اس کی جنس ہی سے ہو مگر اس کے مدمقابل مقام (اس کی ''ضد'') ہو مثلاً سفیدی، سیاہی کے ذریعے ہی زائل ہوتی ہے حرارت وبرودت یعنی گرمی و سردی کے ذریعے زائل نہیں ہوتی (کیونکہ سفیدی اور سیاہی ''رنگ'' ہونے کے حوالہ سے ایک ہی جنس سے ہیں لیکن گرمی و سردی رنگ کی جنس سے نہیں بلکہ وہ دونوں ایک جنس سے ہیں لہٰذا سردی، گرمی سے زائل ہوتی ہے اور گرمی، سردی سے زائل ہوتی ہے) اور یہی تدریج وتحقیق کسی چیز کے محو ہونے میں لطیف حقیقت کا نام ہے، گناہوں کے حوالہ سے بھی صورتحال یہی ہے

کہ جس پر مکمل بھروسہ ہوسکتا ہے اور اسی سے اصل مقصود کا حصول امکان پذیر ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے ایک سے زیادہ عبادات کو اپنایا جائے اگرچہ ایک عبادت بھی اس مقصد کے حصول میں مؤثر واقع ہوتی ہے لیکن ایک سے زیادہ کی اثر گزاری کا دائرہ وسیع ہے (یہاں تک غزالی کا بیان تمام ہوا)۔ ملاحظہ ہو: کتاب احیاء العلوم ج ا ص ۲۰۰

قارئین کرام نے ملاحظہ کیا کہ غزالی کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنا ہی صغیرہ گناہوں کے ختم ہونے کا سبب ہے جبکہ ان کے اس بیان کا لازمی نتیجہ یہ بنتا ہے کہ اجتناب اور دوری اختیار کرنا ضروری نہیں بلکہ گناہ کا سرزد نہ ہونا کافی ہے خواہ اس پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے کیوں نہ ہو۔

اس باب میں جو جامع بیان ممکن ہے وہ یہ کہ آیات کریمہ کے ظواہر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حسنات و سیّآت یعنی نیکیوں و برائیوں کا ایک دوسرے کی کاٹ چھانٹ کرنا فی الجملہ مسلم الثبوت ہے کہ جس کا انکار نہیں ہوسکتا لیکن یہ کہنا بلا دلیل ہے کہ ہر نیکی، ہر برائی کو اور ہر برائی، ہر نیکی کی کانٹ چھانٹ یا پورے طور پر اس کے محو کرنے کا باعث بنتی ہے، البتہ اخلاق اور نفسانی صفات و کیفیات سے اس طرح کے امور کا ثبوت مل جاتا ہے کہ وہ ان قرآنی حقائق کے سمجھنے میں بہترین مددگار ثابت ہوسکتے ہیں جن کا تعلق ثواب وعقاب کے باب سے ہے۔

اور جہاں تک کبیرہ وصغیرہ گناہوں کا تعلق ہے تو جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ آیت مبارکہ کے ظاہر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نسبت وموازنہ کی بنیاد پر کبیرہ وصغیرہ کہلاتے ہیں مثلاً کسی انسان کو بے جرم و بے خطا اور از راہ ظلم قتل کر دینا گناہ ہے، اور کسی نامحرم خاتون پر نگاہ کرنا بھی گناہ ہے لیکن پہلا گناہ دوسرے گناہ کی نسبت سے کبیرہ ہے، اسی طرح سرکشی و نافرمانی کی بناء پر اور خدا کے حرام کو حلال قرار دیتے ہوئے شراب نوشی کرنا گناہ ہے اور اپنی نفسانی خواہش کو پورا کرتے ہوئے شراب پینا بھی گناہ ہے لیکن پہلی صورت میں دوسری صورت کی نسبت اسے کبیرہ کہا جائے گا لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ کلی طور پر یہ مسئلہ اعمال کے حبط کئے جانے اور خطاؤں سے درگزر کئے جانے سے مربوط ہے یعنی ایسا نہیں کہ گناہوں سے کلی طور پر نیکیوں کے ثواب ضائع ہو جاتے ہیں یا نیکیوں سے کلی طور پر گناہوں کی سیاہی ڈھل جاتی ہے۔

اس کے علاوہ آیۂ مبارکہ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے تو وہ اس کی تمام خطاؤں سے درگزر کرے گا خواہ سابقہ خطائیں ہوں یا آئندہ ہونے والی ہوں کیونکہ آیۂ شریفہ میں اطلاق پایا جاتا ہے یعنی کسی زمانہ سے مخصوص خطائیں مقصود نہیں جن سے درگزر کرنے کا وعدہ ہوا ہے لہٰذا ظاہر الاطلاق میں دونوں زمانوں کی خطائیں شامل ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ ومعلوم ہے کہ یہاں اجتناب اور دوری اختیار کرنے سے مراد یہ ہے کہ جس قدر ممکن ہو اجتناب کریں یعنی ہر مؤمن جس قدر اس کے امکان میں ہو کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرے اور اس کا دوری اختیار کرنا ایسا ہو کہ اس کی بابت یہ کہا جاسکے کہ اس نے کبیرہ گناہوں کو چھوڑ دیا ہے اور ان سے

اجتناب اختیار کرلیا ہے نہ یہ کہ ہر کبیرہ سے اجتناب اختیار کرنا اسے ترک کرنے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ جو شخص کبیرہ گناہوں کے وسیع سلسلہ میں معمولی توجہ والتفات سے کام لے تو وہ اس حقیقت کا ادراک کرسکتا ہے کہ کائنات میں کوئی ایک شخص بھی نہ ملے گا جو تمام کبیرہ گناہوں کی طرف رغبت رکھتا ہو اور ان سب کے انجام دینے پر بھی قادر ہو، اور اگر بالفرض کوئی ایسا شخص موجود بھی ہو تو اس کا وجود اس قدر نادر ہوگا کہ گویا وہ ہے ہی نہیں، یعنی اس کا وجود، نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اگر اس معنی ومطلب پر آیۂ مبارکہ کی تفسیر کریں تو طبع سلیم وفکر مستقیم اسے ہرگز پسند نہیں کرے گی۔ لہٰذا یہ کہنا ناگزیر ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص جس قدر بھی کبیرہ گناہ انجام دے سکتا ہو اور اس کا نفس بھی اسے اس کی طرف راغب کرلے اور وہ اس کے ارتکاب پر قادر بھی ہو لیکن اس کے باوجود وہ اسے کبیرہ گناہ سمجھتے ہوئے اس سے دوری اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا خواہ وہ خطائیں ان گناہوں کی جنس سے ہی ہوں یا نہ ہوں۔

ایک اہم نکتہ

آیۂ مبارکہ میں کبیرہ گناہوں سے اجتناب کا نتیجہ خطاؤں اور صغیرہ گناہوں سے درگزر کیا جانا مذکور ہے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے درگزر کئے جانے سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب اختیار کرنا خود ایک اطاعتی عمل ہے کہ جو خطاؤں کی معافی کا سبب بنتا ہے جس طرح سے توبہ گناہوں کی معافی دلانے والا عمل ہے یا یہ کہ جب کوئی شخص کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کرے گا تو صغیرہ گناہوں کی انجام دہی میں آزاد ہے اور جس صغیرہ گناہ کا ارتکاب کرے وہ اس کی نیکیوں کے باعث خود بخود ختم ہو جائے گا کیونکہ نیکیوں کا ایک اثر صغیرہ گناہوں کی معافی ہے کیونکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: ''اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ'' سورۂ ہود، آیت ۱۱۴، اس حوالہ سے اس قدر جاننا کافی ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تم سے تمہاری خطائیں معاف کردیں گے (اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ) اس سے بظاہر صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرنا، خطاؤں سے درگزر کئے جانے میں دخیل ومؤثر ہے نہ یہ کہ صرف وہی اس کی وجہ ہوا سے علمی زبان میں علت تامہ کہتے ہیں۔ ورنہ یوں کہا جاتا ہے کہ اطاعتی اعمال، خطاؤں سے درگزر کئے جانے کا سبب بنتے ہیں (ان الطاعات یکفّرن السیّئات) جیسا کہ سورہ ہود کی مذکورہ بالا آیت میں ارشاد ہوا: ''اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ'' (نیکیاں، غلطیوں وخطاؤں کو لے جاتی ہیں، دور کردیتی ہیں، ختم کردیتی ہیں)۔ یا یوں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صغیرہ گناہوں کو خواہ وہ جس قدر بھی ہوں معاف کردیتا ہے، تو اس صورت میں اس مطلب کو جملہ شرطیہ کی صورت میں بیان کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو تو ہم تمہارے صغیرہ گناہ (خطائیں) معاف کردیں گے۔

ایک سرسری سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کسی گناہ کے صغیرہ یا کبیرہ ہونے کا کس طرح علم ہو؟ اور ہم کسی گناہ کو کبیرہ اور کسی کو صغیرہ سے کس طرح موسوم کر سکتے ہیں؟

اس کا جواب ابتدائے بحث میں دیا جا چکا ہے کہ کسی گناہ کے کبیرہ ہونے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس کے بارے میں شدید ممانعت وارد ہوئی ہو یا اس کے ارتکاب پر دوزخ کی آگ کی سزا کا خوف دلایا گیا ہو یا اس طرح کے دیگر امور کے ذریعے اس کی شدت ثابت ہو خواہ قرآنی آیات میں ہو یا سنت و احادیث میں ہو، لیکن ایسا نہیں کہ صرف قرآنی آیات ہی میں اس کا ثبوت ملے کیونکہ اس طرح کے حصر کی دلیل موجود نہیں کہ جو صرف انہی گناہوں کو کبیرہ سے موسوم کرنے کی تحدید کرے جن کا تذکرہ قرآنی آیات میں ہوا ہے۔

روایات پر ایک نظر

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی قدر

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

○ ''الکبائر التی اوجبها الله علیها النار''

(کبیرہ گناہ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام دینے والے کے لئے دوزخ کی آگ مقرر فرمائی ہے)

(کتاب اصول کافی ج ۲ ص ۲۷۶)

امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان

کبیرہ گناہوں کے بارے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

○ ''کل ما اوعد الله علیه النار''

(ہر وہ عمل جس پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ کی سزا مقرر کی ہے وہ کبیرہ گناہ ہے)

(کتاب من لا یحضرہ الفقیہ، ج ۳ ص ۳۷۳، تفسیر العیاشی ج ۱ ص ۲۳۹)

سات کبیرہ گناہوں کا تذکرہ

کتاب ثواب الاعمال میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''من اجتنب ما اوعد الله علیه النار اذا کان مؤمنا کفر الله عنه سیئاته ویدخله مدخلاً کریمًا والکبائر السبع الموجبات: قتل النفس الحرام، وعقوق الوالدین، واکل الربا، والتعرب بعد الهجرة، وقذف المحصنة واکل مال الیتیم والفرار من الزحف''

(جو شخص اس عمل سے اجتناب کرے جس کے انجام دینے پر اللہ نے دوزخ کی آگ کی سزا مقرر فرمائی ہے تو اگر وہ شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو تو اللہ اس کی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا اور اسے نہایت پاکیزہ مقام میں جگہ دے گا، جو سات گناہ دوزخ کی آگ کا سبب بنتے ہیں وہ یہ ہیں: (۱) کسی بے گناہ انسان کو قتل کرنا (۲) والدین جنہیں عاق کردیں (۳) سود خوری (۴) اسلام لانے کے بعد دوبارہ کفر اختیار کرنا (۵) کسی پاکدامن عورت پر زنا کا الزام لگانا (۶) یتیم کا مال کھانا (۷) میدانِ جنگ سے فرار کرنا) (کتاب ثواب الاعمال، ص ۱۵۸)

مؤلفؒ: شیعہ و سنی کتب میں جو روایات ذکر ہوئی ہیں ان میں کبیرہ گناہوں کی تعداد بہت زیادہ مذکور ہے۔ اس بحث میں ہم ان میں سے چند کا تذکرہ کریں گے، بعض روایات میں سات کبیرہ گناہوں میں شرک باللہ کو بھی ان میں سے ایک ذکر کیا گیا ہے سوائے مذکورہ بالا روایت کے، شاید امامؑ نے اس لئے اسے ان کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا کیونکہ وہ سب سے بڑا گناہ کبیرہ ہے شاید امامؑ کا جملہ ''اذا کان مؤمنًا'' اسی نکتہ کی طرف اشارہ کے طور پر ہو، کہ اس کا ذکر الگ اور مستقل طور پر کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اکبر الکبائر ہے)

امام جعفر صادقؑ کے بیان میں کبیرہ گناہوں کی تفصیل

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ عبدالعظیم بن عبداللہ حسنی نے امام ابوجعفر محمد بن علیؑ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنے پدر بزرگوار امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا میرے پدر عالی قدر امام موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہ السلام نے کہا کہ عمرو بن عبید بصری میرے والد امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس آئے اور امامؑ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے بعد بیٹھ گئے اور اس آیت کی تلاوت کی۔

''اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ''

(جو لوگ کبیرہ گناہوں اور فواحش و برائیوں سے اجتناب کرتے ہیں)

یہ پڑھ کر وہ خاموش ہو گئے تو ابو عبد اللہ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا کہ آپ کیوں خاموش ہو گئے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کی کہ میں چاہتا ہوں پہلے "کبیرہ گناہوں سے آگاہی حاصل کرلوں کہ اللہ کی کتاب میں کون سے اعمال کو کبیرہ گناہ کہا گیا ہے، تو امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں اے عمرو! (اس کے بعد امامؑ نے کبیرہ گناہوں کا تفصیلی تذکرہ شروع فرمایا)۔

(۱) اکبر الکبائر الشرك بالله لقول الله عزوجل: "ان الله لا یغفر ان یشرك به"

سب سے بڑا کبیرہ گناہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا ہے، اس حوالہ سے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے۔ بے شک اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے۔

اور یہ آیت کریمہ کہ جس میں خداوند عالم نے سورۂ مائدہ، آیت: ۷۲ میں ارشاد فرمایا:

○ "اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ"

(اور جو شخص کسی کو اللہ کے ساتھ شریک قرار دے تو اللہ اس پر بہشت حرام قرار دیتا ہے اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے)

(۲) خداوند عالم کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے کے بعد دوسرا بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ اس کی رحمت سے مایوس و ناامید ہوں۔ اس حوالہ سے سورۂ یوسف، آیت: ۸۷، ارشاد الٰہی ہے۔

○ "اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ"

(اور اللہ کی رحمت سے کوئی ناامید نہیں ہوتا سوائے کافر لوگوں کے)

(۳) اس کے بعد کبیرہ گناہ یہ ہے کہ اللہ کے مکر (عادلانہ تدبیر) سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں، اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے۔

○ "فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ" (سورۂ اعراف، آیت: ۹۹)

(اور اللہ کے مکر سے کوئی اپنے پاس کو محفوظ نہیں سمجھتا سوائے نقصان اُٹھانے والے لوگوں کے)

(۴) ایک کبیرہ گناہ یہ ہے کہ والدین عاق کر دیں، اللہ تعالیٰ نے والدین کے عاق کئے ہوئے شخص کو جبار وشقی (بدبخت) قرار دیا ہے:

○ "وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا" (سورۂ مریم، آیت: ۳۲)

(خدا نے مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے اور اس نے مجھے ظالم و بدبخت نہیں بنایا)

(۵) ایک کبیرہ گناہ کسی بے گناہ شخص کو قتل کرتا ہے (اسے قتل نفس محترمہ کہا جاتا ہے یعنی اس شخص کو قتل کرنا کہ جسے اللہ تعالیٰ نے حرمت والا قرار دیا ہے کہ اس پر کوئی ایسا جرم عائد نہیں ہوتا جس کی سزا قتل ہو) اس کی بابت یوں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

○ "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا" (سورۂ نساء، آیت: ۹۳)

(اور جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے وہ ہمیشہ اس میں رہے گا)۔

(۶) ایک کبیرہ گناہ نیک و پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا ہے، اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

○ ''اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۪ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ''

(جولوگ پاکدامن مومنہ خواتین پر کہ جو ہر چیز سے بے خبر ہوں بدکاری کی تہمت لگائیں وہ دنیا و آخرت میں ملعون ہیں اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب مقرر ہے)(سورۂ نور، آیت:۲۳)

(۷) یتیم کا مال کھانا، اس کبیرہ گناہ کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

○ ''اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا''(سورۂ نساء، آیت:۱۰)

(جولوگ ظلم وزیادتی کرتے ہوئے یتیموں کے اموال کھاتے ہیں..........)

(۸) ایک کبیرہ گناہ جنگ سے فرار کرنا ہے، اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

○ ''وَ مَنۡ یُّوَلِّہِمۡ یَوۡمَئِذٍ دُبُرَہٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ مَاۡوٰىہُ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ''(سورۂ انفال، آیت:۱۶)

(اور جو شخص دشمن کو پشت دکھائے کہ نہ تو وہ کوئی جنگی حیلہ کر رہا ہو اور نہ ہی کسی دستہ میں شامل ہو کر اس کی مدد کرنے کی غرض سے ایسا کر رہا ہو تو وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے جو کہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے)

(۹) سود خوری کبیرہ گناہ ہے، اس کی بابت ارشاد الٰہی ہے:

○ ''اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ''(سورۂ بقرہ، آیت:۲۷۵)

(جولوگ سود کھاتے ہیں وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھتے مگر اس شخص کی طرح کہ جسے شیطان نے چھو کر بدحواس کر دیا ہو)

سود خوری کے بارے میں ایک ارشاد یوں ہے:

○ ''فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ''(سورۂ بقرہ، آیت:۲۷۹)

(اگر پھر بھی تم اس کام سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنے کا اعلان کر دو)

(۱۰) جادو، اس کے گناہ کبیرہ ہونے کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

''وَ لَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰىہُ مَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ''(سورۂ بقرہ، آیت:۱۰۲)

(وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جس نے اسے (جادو) کو خریدا (عمل کیا) کہ آخرت میں اسے کچھ نہ ملے گا)۔

(۱۱) ایک گناہ کبیرہ، زنا و بدکاری ہے، اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہے:

○ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفۡ لَہُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ یَخۡلُدۡ فِیۡہٖ مُہَانًا ﴿۶۹﴾ (سورۂ فرقان: آیات ۶۸-۶۹)

(اور جو شخص اس (زنا) کا ارتکاب کرے وہ گناہ کے عذاب سے دوچار ہوگا اور قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھ جائے گا، وہ ذلت کے ساتھ اس میں ہمیشہ مبتلا رہے گا)۔

(۱۲) جھوٹی قسم کھانا، اس کے کبیرہ گناہ ہونے کی بابت ارشاد ہوا:

○ ''اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَ اَیۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ'' (سورۂ آل عمران، آیت: ۷۷)

(جولوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا)

(۱۳) غلول، یعنی اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

''وَ مَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ'' (سورۂ آل عمرآن، آیت: ۱۶۱)

(اور جو شخص ملاوٹ کرے وہ قیامت کے دن اس چیز کے ساتھ آئے گا جو اس نے ملاوٹ کی)

(۱۴) واجب زکات ادا نہ کرنا، اس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے۔

○ ''یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡهَا فِیۡ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِهَا جِبَاهُهُمۡ وَ جُنُوۡبُهُمۡ وَ ظُهُوۡرُهُمۡ ....'' (سورۂ توبہ، آیت: ۳۵)

(جس دن اسے دوزخ کی آگ کے شعلے اپنی لپیٹ میں لیں گے تو اسی مال سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں پر داغ لگائے جائیں گے)

(۱۵) جھوٹی گواہی دینا اور گواہی کو چھپانا، اس کے کبیرہ گناہ ہونے کی بابت ارشاد الٰہی اس طرح ہوا:

○ ''وَ مَنۡ یَّکۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ''

(اور جو اسے چھپائے اس کا دل گنہگار ہے)

(۱۶) شراب خوری، اللہ تعالیٰ نے اسے بت پرستی کے برابر قرار دیا ہے۔

(۱۷) جان بوجھ کر نماز ترک کرنا۔

(۱۸) ہر اس عمل کو ترک کرنا جس کا انجام دینا اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دیا ہے، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص عمداً نماز نہ پڑھے تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائرہ حاکمیت سے باہر نکل گیا۔

(۱۹) عہد کو توڑنا اور قطع رحمی کرنا، اس کی بابت ارشاد الٰہی ہے:

○ ''اُولٰٓئِکَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ'' (سورۂ رعد، آیت: ۲۵)

(انہی کے لئے لعنت ہے اور انہی کے لئے برا ٹھکانہ ہے)

امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا کہ جب عمرو بن عبید نے یہ سب کچھ سنا تو وہ امام جعفر صادقؑ کی محفل سے باہر آکر زار و قطار رو رہا تھا اور اُس کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے: هلك من قال برأيه ونازعكم فی الفضل والعلم (ہلاک و تباہ ہو گیا وہ شخص جس نے اپنی رائے کی بناء پر فتویٰ دیا اور آپ حضرات (اہل بیتؑ) سے فضل وعلم میں نزاع و مقابلہ کیا (تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۸۴)

مؤلفؒ: اسی مطلب پر مشتمل مذکورہ بالا روایت سے قریب تر ایک روایت اہل سنت کی کتب میں ابن عباس کے حوالہ سے منقول ہے، اس روایت سے دو اہم مطالب واضح ہیں:

(۱) کبیرہ گناہ اسے کہتے ہیں جس کے ارتکاب سے سخت منع کیا گیا ہو اور وہ اس طرح کہ بار بار اس سے ممانعت وارد ہوئی ہو اور نہایت سختی کے ساتھ اس کی انجام دہی سے روکا گیا ہو، یا یہ کہ اس کے ارتکاب پر دوزخ کی آگ کی سزا سے ڈرایا گیا ہو، خواہ وہ ممانعت قرآن مجید میں مذکور ہو یا سنت وارشادات نبوی ﷺ میں وارد ہوئی ہو جیسا کہ امامؑ کے مذکورہ بیان میں گناہانِ کبیرہ کی بابت استدلال میں اسی کا حوالہ موجود ہے، اسی سے اس حدیث میں مذکورہ مطلب کی تصدیق واضح طور پر معلوم ہوجاتی ہے جو اصول کافی سے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جس میں اس طرح مذکور ہے: ''ان الکبیرۃ ما اوجب اللہ علیھا النار'' (کبیرہ گناہ وہ ہے جس کے انجام دینے پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ مقرر فرمائی ہے) اور اس مطلب کی بھی تصدیق معلوم ہوتی ہے جو کتاب من لایحضرہ الفقیہ اور تفسیر العیاشی میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جس میں اس طرح مذکور ہے: ان الکبیرۃ ما اوعد اللہ علیھا النار (کبیرہ گناہ وہ ہے جس پر اللہ نے دوزخ کی آگ کی سزا سے ڈرایا ہے)، لہٰذا اس کے ارتکاب پر دوزخ کی آگ کی سزا مقرر کرنے اور اس سے ڈرانے سے، اس کا کلام الٰہی میں یا حدیث نبوی ﷺ میں صریح و واضح الفاظ میں بیان کیا جانا یا اشارۃً بیان ہونا دونوں مراد ہیں۔

میرے خیال میں جو حدیث ابن عباس کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے اس میں بھی یہی معنی مقصود ہے یعنی وہ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ سے ڈرایا جانا صریح لفظوں میں ہو یا اشارۃً ہو دونوں طرح سے قرآن یا حدیث سے ثابت ہے، چنانچہ اس کی تصدیقی گواہی تفسیر طبری جلد ۵ ص ۲۷ پر ابن عباس کے حوالہ سے مذکور روایت سے ہوتی ہے جس میں اس طرح آیا ہے کہ کبیرہ گناہ سے مراد ہر وہ عمل ہے جس کی سزا اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ یا اپنا غضب یا لعنت یا عذاب مقرر کی ہو (الکبائر کل ذنب ختمہ اللہ بنار او غضب او لعنۃ او عذاب) اسی طرح جو روایت ابن عباس کے حوالہ سے تفسیر طبری اور دیگر کتب میں مذکور ہے اس میں یہ الفاظ درج ہیں: ''کل ما نھی اللہ عنہ فھو کبیرۃ'' (ہر وہ کام جس سے خداوند عالم نے منع فرمایا ہے وہ کبیرہ ہے) کہ یہ الفاظ کبیرہ گناہ کے معنی میں دیگر روایات سے مختلف و برعکس نہیں بلکہ اسی مطلب سے آگاہی دلاتے ہیں سب کے سب گناہ اس حوالہ سے کبیرہ ہیں کہ ان کا ارتکاب انسان کرتا ہے کہ جس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مقابلے میں نہایت حقیر ہے، گویا انسان کی حقارت و ناچیزی اور رب العالمین کی عظمت و بزرگی کے تقابلی تناظر میں دیکھیں تو معلوم و ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ کبیرہ ہے یعنی اس کے کبیرہ ہونے میں یہی کافی ہے کہ اس سے رب کائنات نے منع کیا ہے۔

(۲) بعض روایات میں کہ جو ذکر ہو چکی ہیں یا بعد میں ذکر ہوں گی کبیرہ گناہوں کی تعداد بیان کی گئی ہے کہ آٹھ ہیں یا نو ہیں جیسا کہ اہل سنت کی کتب میں بعض احادیث نبویہؐ کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے۔ یا بیس ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں مذکور ہے یا ستر ہیں۔ جیسا کہ دیگر روایات میں مذکور ہے۔ تو یہ سب کچھ گناہوں کے کبیرہ ہونے کے درجات کی بناء پر ہے اور نافرمانی کی شدت کے حوالہ سے ہے جیسا کہ اس روایت میں کبیرہ گناہوں کی تعداد بیان کرتے ہوئے امامؑ کا ارشاد گرامی منقول ہے جس میں آپؑ نے فرمایا: ''واکبر الکبائر الشرك باللہ'' اور سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔

ایک حدیث نبوی ﷺ سے استدلال و استشہاد

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ابی حاتم نے ابو ہریرہ کی روایت ذکر کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اجتنبوا السبع الموبقات'' (سات تباہ کن کاموں سے اجتناب کرو) اصحاب نے پوچھا: ''وماهن یارسول الله (ص)؟'' وہ کون سی چیزیں ہیں اے اللہ کے رسول ﷺ! تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: الشرك بالله، وقتل النفس التي حرم الله الا بالحق، والسحر واكل الربا واكل مال اليتيم والتولي يوم الزحف وقذف المحصنات الغافلات المؤمنات، وہ سات کام ہیں: (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا (۲) کسی بے گناہ شخص کو قتل کرنا (۳) جادو (۴) سود کھانا (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) جنگ کے دن دشمن کو پشت دکھانا (فرار کرنا) (۷) نیک و پاکدامن اور سادہ لوح مومنہ عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگانا (تفسیر ''درمنثور'' ج ۲ ص ۱۴۶)

اسی کتاب میں مذکور ہے کہ ابن حیان اور ابن مردویہ نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنے والد محمد سے اور اپنے دادا عمرو بن حزم کے اسناد سے بیان کیا کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے اہل یمن کے نام ایک خط لکھا جس میں واجبات، مستحبات اور دیات کی تفصیلات واحکام مرقوم تھے اور اسے عمرو بن حزم کے ہاتھوں روانہ فرمایا، عمرو بن حزم نے کہا کہ اس خط میں لکھا ہوا تھا ''ان اكبر الكبائر عند الله يوم القيامة'' کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا شمار ہوگا، اس کے بعد کسی انسان کو ناحق قتل کرنا، میدانِ جنگ سے فرار کرنا، والدین کی طرف سے عاق ہونا، پاکدامن عورت پر زنا کاری کی تہمت لگانا، جادو سیکھنا، سود کھانا اور یتیم کا مال کھانا ہے (بحوالہ تفسیر ''درمنثور'' ج ۲ ص ۱۴۶)

اسی تفسیر میں مذکور ہے کہ عبداللہ بن احمد نے کتاب ''زوائد الزہد'' میں انس کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت رسول خدا ﷺ سے سنا ہے کہ آنحضرت ﷺ فرما رہے تھے: ''الا ان شفاعتي لاهل الكبائر من امتي ثم تلا هذه الآية: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ .... '' یاد رکھو کہ میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں گے، یہ کہہ کر حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: ''اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے دوری اختیار کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے ....'' (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۱۴۵)

آیات ۳۲ تا ۳۵

وَ لَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبُوۡا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبۡنَ ؕ وَ سۡئَلُوا اللّٰہَ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۳۲﴾

وَ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَکَ الۡوَالِدٰنِ وَ الۡاَقۡرَبُوۡنَ ؕ وَ الَّذِیۡنَ عَقَدَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَاٰتُوۡہُمۡ نَصِیۡبَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدًا ﴿۳۳﴾

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ وَّ بِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ وَ الّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَہُنَّ فَعِظُوۡہُنَّ وَ اہۡجُرُوۡہُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَ اضۡرِبُوۡہُنَّ ۚ فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡہِنَّ سَبِیۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا ﴿۳۴﴾

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِہِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہٖ وَ حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہَا ۚ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیۡنَہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ

○ ''اور تم ان چیزوں کی خواہش دل میں نہ لایا کرو جن کی وجہ سے اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری عطا کی ہے، مردوں کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ کسب کریں اور عورتوں کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ کسب کریں، اللہ سے اس کا فضل مانگو، یقیناً اللہ ہر چیز سے بخوبی آگاہ ہے''

(۳۲)

○ ''اور ہم نے سب کے لئے حقدار مقرر کئے ہیں جو والدین اور قرابتداروں کے ترکہ سے حصہ پاتے ہیں، اور جن لوگوں نے تم سے معاہدے کئے انہیں ان کا حصہ دے دو، یقیناً اللہ ہر چیز پر مطلع ہے۔''

(۳۳)

○ ''مرد عورتوں کے امور کے ذمہ دار ہیں کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک دوسرے کو اضافہ عطا کیا ہے اور یہ کہ مرد، اپنے اموال میں سے ضروری اخراجات پورے کرتے ہیں، پس نیک و صالح عورتیں اطاعت گزار ہیں، شوہر کی عدم موجودگی میں اللہ کی عنایت کے ساتھ اس کی عزت و مال کی حفاظت کرتی ہیں، تو جن عورتوں سے سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں نصیحت کرو اور انہیں بستروں پر تنہا چھوڑ دو اور انہیں ضرب کرو پس اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو تم انہیں ستانے کا بہانہ تلاش نہ کرو، یقیناً اللہ ہی بڑائی و بزرگی والا ہے۔''

(۳۴)

○ ''اگر تمہیں شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی و جھگڑے کا اندیشہ ہو تو دونوں کے خاندانوں کی طرف سے ایک ایک شخص مقرر کرو جو ان کا تصفیہ کروائے کہ اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں تو اللہ ان کے درمیان اصلاح کی راہ ہموار کر دے گا، یقیناً اللہ بہت آگاہ و باخبر ہے۔''

(۳۵)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ کا تعلق ان سابق الذکر آیات سے ہے جن میں میراث اور نکاح کے احکام بیان کئے گئے ہیں، یہ آیات ان احکام کی تاکید پر مشتمل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض وہ احکام بھی معلوم ہوتے ہیں جن سے ان مشکلات کا عملی حل سامنے آتا ہے جو عام طور پر مردوں اور عورتوں کے درمیان ازدواجی زندگی میں درپیش ہوتی ہیں۔

بیجا آرزوؤں کی ممانعت

○ ''وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ''

(اور تم اس چیز کی تمنا نہ کرو جو اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت کے طور پر عطا فرمائی ہے)۔

''تمنا'' سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص یوں کہے: کاش فلاں کام ایسا ہوتا، یا کاش فلاں چیز میرے پاس ہوتی۔ اس طرح کے الفاظ کو ''تمنا'' سے موسوم کرنا الفاظ کو معانی کا لباس پہنانے کے باب سے ہے، یا یہ کہ الفاظ کو معانی کی صفات سے موصوف کرنے کے طور پر ہے کیونکہ ''تمنا'' کا تعلق دل سے ہوتا ہے کہ جب دل کسی چیز کو پسند کرتا ہے جبکہ اس کا حصول مشکل یا مشکل کی طرح ہوتا ہے تو اس کے بارے میں اس طرح کی حالت پیدا ہو جاتی ہے خواہ اس حالت کا اظہار لفظوں میں کرے یا نہ کرے۔

آیت مبارکہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس ''تمنا'' سے نہی کی گئی ہے جس کا تعلق ان چیزوں اور فضیلتوں و اضافوں سے ہے جو لوگوں کے درمیان قطعی صورت میں پائی جاتی ہوں، یعنی ان چیزوں کے حصول کی تمنا سے روکا گیا ہے جو بعض مردوں اور عورتوں کو دوسروں پر برتری دلاتی ہیں کہ اس طرح کی تمنا نہ کی جائے اور جو نعمتیں دوسروں کو حاصل

ہوں ان کی آرزؤں کا اسیر ہونے سے روگردانی کی جائے، اور اس کی بجائے ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی آرزو کی جائے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں اور اللہ سے ان کے عطا کئے جانے کی درخواست و دعا کی جائے اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت مبارکہ میں "ما فضل اللہ بہ" سے مراد وہ خصوصیات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان دو صنفوں یعنی مردوں اور عورتوں میں سے ہر ایک کو عطا فرمائی ہیں اور ان کے لئے مخصوص احکام مقرر فرمائے ہیں مثلاً مردوں کو عورتوں پر اضافی خصوصیت یہ عطا کی کہ انہیں ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ ازواج کا حق دیا اور میراث میں ان کا حصہ عورتوں سے زیادہ مقرر فرمایا، اور عورتوں کو یہ اضافی خصوصیت عطا فرمائی کہ مردوں پر واجب کر دیا کہ انہیں حق مہر دیں اور ان کا نان ونفقہ اور بنیادی اخراجات پورے کریں۔

بنا برایں اس آیۂ مبارکہ میں ان مخصوص کئے گئے امور کی تمنا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، اور اس ممانعت کا بنیادی مقصد وفلسفہ یہ ہے کہ ان کے درمیان جھگڑا و فساد کی بیخ کنی ہو کیونکہ ہر انسان کا دل اس طرح کی خصوصیات سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہے کیونکہ تخلیقی طور پر اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے جذبات انسانی وجود میں ودیعت فرمائے ہیں تا کہ کاشانۂ انسانیت میں رونقیں پیدا ہوں۔ چنانچہ سب سے پہلے ان خصوصیات سے بہرہ ور ہونے کی آرزو دل میں موجزن ہوتی ہے اور جب وہ بار بار پیدا ہوتو باطنی حسد میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ اس حد تک پختہ ہو جاتی ہے کہ دل کی چار دیواری سے نکل کر عملی میدان تک پہنچ جاتی ہے اور انسان اپنی وجودی قوتیں اس پر مرکوز کر دیتا ہے، پھر اگر یہی کیفیت وسعت اختیار کر لے اور ہر شخص اس کا شکار ہو جائے تو یقیناً اس کا نتیجہ روئے زمین پر فتنہ وفساد اور خانہ و کاشانہ اور نسلوں کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آیت مبارکہ میں جو نہی وارد ہوئی ہے وہ ارشادی و ناصحانہ طور پر ہے کہ اس کی مصلحت کی بازگشت اس سے مربوطہ مقررہ احکام کی عملی پاسداری کی طرف ہوتی ہے لہٰذا ممانعت کا یہ حکم "مولا کے فرمان" کے طور پر نہیں کہ جس کی خلاف ورزی پر عقاب وعذاب ہوتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

عین ممکن ہے کہ اس مقام پر ایک سوال پیدا ہو کہ آیت میں فضیلت و برتری عطا کرنے کی نسبت خداوند عالم کی طرف کیوں دی گئی ہے اور یہ کیوں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر برتری عطا کی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں دو چیزیں ملحوظ ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کو خدائی اوامر و فیصلوں کے سامنے خضوع و سر تسلیم خم کرنے کی

صفت اختیار کرنے کی ترغیب دلائی جائے کہ اللہ پر ایمان رکھنے کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ وہ جو حکم دے یا فیصلہ کرے اس پر کسی طرح سے بھی چون و چرا کئے بغیر اسے تسلیم کریں، دوسری بات یہ کہ جس شخص کو فضیلت و برتری سے نوازا گیا ہے اس سے محبت کا جذبہ ابھارا جائے تا کہ یہ احساس اجاگر ہو کہ جسے برتری دی گئی ہے وہ انہی میں سے ایک ہے ان کا بیگانہ نہیں۔

ہر شخص کا حصہ، اس کے کئے کے برابر

○ ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ''

(مردوں کے لئے اتنا ہی حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتیں کے لئے اتنا حصہ ہے جو وہ کمائیں)

مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے کتاب ''المفردات'' صفحہ ۴۳۰ پر لکھا ہے کہ لفظ ''اکتساب'' (یعنی کسب کرنا، کمانا) اس فائدہ حاصل کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس سے انسان اپنے لئے استفادہ کرتا ہے، جبکہ لفظ ''کسب'' کا معنی عمومیت رکھتا ہے یعنی خواہ اپنے استفادہ کے لئے کوئی چیز حاصل کرے یا کسی دوسرے کے استفادہ کے لئے حاصل کرے۔

بنابرایں ''تمنا'' کے حوالہ سے ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ یہ جملہ اسی سابقہ نہی پر مبنی ہے اور اسی کی علت و سبب کے بیان پر مشتمل ہے، یعنی یہ کہ تم اس طرح کی تمنا و آرزو دل میں نہ لاؤ کیونکہ جو فضیلت و خصوصیت کسی کو عطا کی گئی ہے وہ اس کی حیثیت کے مطابق دی گئی ہے کہ جو اسے تخلیقی طور پر حاصل ہے یا اس کے کئے کے آثار میں سے ہے چنانچہ اس کی مثال یوں ہے کہ مردوں کو ایک ہی وقت میں چار عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے جبکہ عورتوں پر ایسا کرنا حرام قرار دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرتی حوالہ سے مردوں کی حیثیت عورتوں سے مختلف ہے اور ان کے درمیان اس حوالہ سے جو فرق پایا جاتا ہے اس کے تناظر میں مردوں کو یہ حق دیا گیا اور اس اضافی خصوصیت سے نوازا گیا ہے لیکن خواتین کو یہ حق نہیں دیا گیا، اسی طرح وراثت میں مردوں کو عورتوں کا دگنا حصہ دینے کا فلسفہ بھی یہی ہے، اس کی مانند خواتین کو مرد کے حصہ کا نصف دیا جانا اور ان کے نفقہ و اخراجات کی ذمہ داری مردوں پر قرار دیا جانا اور ان کے لئے حق مہر کا اختصاص، یہ سب کچھ ان کی معاشرتی حیثیت کے حوالہ سے ہے، اسی طرح ان دونوں (مردوں اور عورتوں) میں سے جو بھی کوئی مال بذریعہ تجارت یا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل کرے وہ اسی سے مختص ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنے

بندوں پر کسی طرح سے ظلم وزیادتی نہیں کرتا۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''اکتساب'' سے مراد کسی چیز کا اپنے آپ سے مختص ومخصوص کرنا ہے خواہ وہ کوئی اختیاری عمل انجام دینے سے ہو مثلاً صنعت وحرفت کے ذریعے ہو یا کسی دوسرے سبب سے ہو لیکن اس کا نتیجہ انسان کا کسی خصوصیت کا حامل ہونا ہو جائے مثلاً کسی کا مرد ہونا یا عورت ہونا اس کے کسی اختیاری عمل کا نتیجہ نہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی مخصوص برتری کی بنیاد پر خاص حصہ وحیثیت پانے کا سبب بنتا ہے۔ یعنی مرد کا مرد ہونا اور عورت کا عورت ہونا ان کے لئے مخصوص حصہ کا موجب قرار پاتا ہے۔

کسب واکتساب کی معنوی حقیقت

اگرچہ اہل لغت نے ''کسب'' اور ''اکتساب'' کے بارے میں لکھا ہے کہ دونوں الفاظ انہی موارد سے مخصوص ہیں جن میں انسان کسی اختیاری عمل کے ذریعے کچھ حاصل کرتا ہے جیسے طلب وغیرہ، لیکن انہوں نے مزید تفصیل ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''کسب'' کا معنی جمع کرنا ہے اور جہاں تک ''اکتساب'' کا تعلق ہے تو اس کے حوالہ سے یہ کہنا جائز ہے کہ ''اکتسب فلان بجمالہ الشھرۃ'' فلاں شخص نے اپنے جمال کی وجہ سے شہرت حاصل کی، اس میں اکتساب کا لفظ غیر اختیاری صفت کی بابت استعمال ہوا، بعض مفسرین کرام نے زیر نظر آیت مبارکہ میں لفظ ''اکتساب'' کی اسی معنی میں تفسیر کی ہے۔ اور یہ بات بعید نہیں کہ آیت مبارکہ میں سے یہ لفظ اسی معنی میں تشبیہ واستعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہو۔ یعنی حقیقی کی بجائے مجازی طور پر استعمال ہوا ہو۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آیۂ مبارکہ میں لفظ ''اکتساب'' (مِّمَّا اكْتَسَبُوْا .... مِّمَّا اكْتَسَبْنَ) سے مراد وہ چیز ہو جو انسان اپنے عمل سے حاصل کرے اور اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہو کہ مردوں کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ اپنے کام کاج سے مال حاصل کریں اور عورتوں کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ خود کام کر کے کمائیں اور جس تمنا کی ممانعت کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہو کہ تم اس مال کی تمنا نہ کرو جو لوگوں کے پاس ان کے کمائے کا نتیجہ ہے جو انہوں نے صنعت وحرفہ کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ اگرچہ یہ معنی اپنے طور پر درست ہے لیکن اس سے آیت کے معنی کا دائرہ تنگ ہو جائے گا اور اس کا پہلی آیات سے کہ جن میں میراث اور نکاح کا تذکرہ ہوا ہے ربط ختم ہو جائے گا۔

بہر حال سابق الذکر معنی کی بناء پر آیت سے مراد یہ ہوگا کہ تم اس مالی وغیر مالی برتری وامتیازی خصوصیت کی تمنا کے اسیر نہ بنو کہ جو اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں یعنی مردوں اور عورتوں سے مختص کی ہیں کہ ان کے ذریعے تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر برتری عطا فرمائی ہے۔ یعنی مرد یہ تمنا نہ کریں کہ جو امتیازات عورتوں کو دیئے گئے ہیں وہ ہمیں عطا کئے جائیں اور عورتیں یہ تمنا نہ کریں کہ جو امتیازات مردوں کو دیئے گئے ہیں وہ ہمیں دیئے جائیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا ان امتیازات سے نوازا جانا ان خصوصیات کی بناء پر ہے جو اسے تخلیقی طور پر انسانی معاشرہ میں حاصل ہوئی ہیں یا اس نے اپنے اختیاری عمل یعنی کام کاج اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ حاصل کی ہیں لہٰذا اس سے اس کا حصہ مخصوص ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ان میں سے ہر ایک اپنا وہی حصہ پائے گا جو اس نے حاصل کیا، جس کا اکتساب کیا۔

اللہ سے اس کی عنایت طلب کرو

○ ''وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ''

(اور اللہ سے مانگو اس کا فضل وعنایت)

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز کوئی، کسی کو عطا کرتا ہے وہ دینے والے کی ضرورت سے زائد ہوتی ہے کہ جس کی اسے احتیاج نہیں ہوتی، اسی وجہ سے اسے ''فضل'' یعنی زائد و اضافہ کہا جاتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان چیزوں کی طرف توجہ ورغبت کرنے سے منع کیا ہے جو دوسروں کے پاس ہوں اور وہ اس فضل و اضافہ کے حامل ہوں، اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہے کہ زندگی میں امتیازات کی چاہت بلکہ دوسروں سے زیادہ ان کا حامل ہونا اور ہر ایک سے بڑھ کر ان امتیازات سے بہرہ ور ہونا انسانی فطرت میں شامل ہے کہ جو کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بابت لوگوں کی توجہات اپنی طرف موڑ دیں اور انہیں اپنی عنایات وفضل کی طرف راغب کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ اس چیز سے روگردانی کریں جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور صرف اسی کی بارگاہ کا رخ کریں اور اسی سے اس کا فضل وعنایت طلب کریں کیونکہ فضل وکرم صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہے جس نے ہر فضل والے کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے لہٰذا وہ تمہیں وہ کچھ دے سکتا ہے جس سے تم دوسروں سے زائد کے حامل بن سکتے ہو اور دوسروں پر ان چیزوں میں اضافہ کی بناء پر فخر ومباہات کر سکتے ہو جو ان کے پاس ہیں اور تم ان کی طرف رغبت رکھتے ہو اور یہ تمنا کرتے ہو کہ وہ تمہیں عطا کی جائیں۔

ایک اہم ترین نکتہ

خداوند عالم نے لوگوں کو اس کے فضل طلب کرنے کے حکم میں کسی خاص چیز کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اسے مبہم رکھا اور صرف یہی حکم دیا کہ تم پر لازم ہے کہ اللہ سے اس کا فضل طلب کرو اور اسے حرف ''من'' کے ساتھ ذکر کر دیا: ''من فضلہٖ'' (اس کے فضل سے) تو اس میں دو امور ملحوظ ہیں:

(۱) خداوند عالم سے دعا کرنے اور اس کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرنے کے آداب سکھائے جائیں کیونکہ انسان جو کہ اپنے حقیقی خیر وشر سے آگاہ ہی نہیں رکھتا اور اسے معلوم ہی نہیں کہ کون سی چیز اس کے لئے مفید اور کون سی چیز نقصان دہ ہے لہٰذا جب وہ اپنے پروردگار سے جو کہ اپنی مخلوق کی بابت بخوبی جانتا ہے کہ کون سی چیز اس کے لئے مفید اور کون سی مضر ہے اور وہ ہر چیز پر قادر بھی ہے کوئی چیز طلب کرے تو صرف اپنے لئے ''خیر'' مانگے اور جس چیز میں اس کے لئے بہتری ہو وہ مانگے، اور اس چیز کو معین و مشخص نہ کرے اور نہ ہی اس کے حصول کا راستہ متعین کرے بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے کیونکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ اپنی مخصوص حاجت کی طرف اپنی تمام تر توجہات مبذول کر کے اسے ہی خداوند عالم سے طلب کرتے ہیں مثلاً مال، اولاد، جاہ ومقام ومنزلت، صحت وتندرستی وغیرہ، اور وہ اسی مخصوص شے کے لئے اپنی دعاؤں میں عاجزانہ اصرار کرتے ہیں کہ انہیں صرف وہی چاہیے اور اس کے سوا کچھ نہیں لیکن جب ان کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور انہیں ان کا مطلوب ومقصود عطا کر دیا جاتا ہے تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسی میں ان کی تباہی اور زندگی میں ناکامی کے اسباب تھے۔

(۲) اس مطلب کی طرف اشارہ ہو جائے کہ وہ جو کچھ مانگیں وہ اس مصلحت خداوندی سے متصادم نہ ہو جو اس نے اس ''فضل'' میں تخلیقی وتکوینی طور پر یا تشریعی واحکام کی صورت میں مقرر فرمائی ہے، لہٰذا واجب ہے کہ وہ اس ''فضل'' میں سے تھوڑا سا ہی طلب کریں جو اس نے دوسروں کے لئے مختص فرما دیا ہے لیکن اگر مرد حضرات وہ سارے کا سارا ''فضل'' اپنے لئے طلب کریں جو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے مختص کر دیا ہے یا اس کے برعکس عورتیں اس سارے کے سارے ''فضل'' کا سوال کریں جو اللہ تعالیٰ نے مردوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور خدا ان کا طلب کردہ ''فضل'' انہیں عطا بھی کر دے تو اس سے اس کی حکمت ومصلحت ختم ہو کر رہ جائے گی اور اس نے جو احکام وقوانین مقرر فرمائے ہیں وہ سب بے اثر وبے نتیجہ ہو جائیں گے (مزید غور کریں)۔

بنا بر ایں مناسب یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے اور اپنی مطلوبہ چیز کے بارے میں نہایت ناچارگی کا

شکار ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ سے وہ چیز نہ مانگے جو دوسرے لوگوں کے پاس ہے کہ خدا اُن سے لے کر اسے عطا کرے بلکہ رب العزت کی بارگاہ میں اس کے ہی خزانہ غیب سے عطا کئے جانے کا سوال کرے اور اس کے ساتھ ساتھ جب اس کے خزانہ غیب سے طلب کرے تو اس کے حصول کا طریقہ اسے نہ بتائے کیونکہ وہ خود بہتر جانتا ہے کہ اپنے بندے کی حاجت کس طرح پوری کرے اور اگر اس طرح دعا مانگے تو زیادہ بہتر ہے کہ خدایا تو اپنے خزانہ غیب سے مجھے وہ کچھ عطا فرما جو تو خود جانتا ہے کہ یہ میرے لئے خیر و بہتر ہے۔

آیت مبارکہ کے آخر میں خداوند عالم کا ارشاد گرامی: "اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا" (بے شک، اللہ ہر شے سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے) دراصل ابتدائے آیت میں جس چیز کی نہی کی گئی ہے اس کی علت وسبب کے طور پر ہے، یعنی یہ کہ تم اس چیز کی تمنا و آرزو نہ کرو جو اللہ نے اپنے فضل سے کسی کو عطا فرمائی ہے کیونکہ اللہ ہر چیز سے بخوبی آگاہ ہے کہ وہ مصلحت و بہتری کے راستہ سے ناآگاہ نہیں اور نہ ہی اس کا حکم و فیصلہ بیجا ہوتا ہے۔

ایک قرآنی حقیقت کا بیان

زندگی کی پاکیزہ لذتوں سے استفادہ کرنے میں افرادِ بشر کے درمیان طبیعتوں اور صلاحیتوں کا مختلف ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کی بازگشت تخلیقی وتکوینی فطری اصولوں کی طرف ہوتی ہے کہ جس کی اثر گزاری کا زندگی کے مختلف مراحل و درجات میں ظاہر ہونا ناگذیر ہے چنانچہ اس کا ثبوت انسانی معاشروں میں عہد قدیم سے اب تک عملی طور پر واضح و معلوم ہے۔

تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ طاقتور افراد ہمیشہ کمزور لوگوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھتے تھے اور کسی بھی اصول و ضابطہ کے بغیر انہیں اپنی خواہشات اور نفسانی چاہتوں کی تکمیل میں استعمال کرتے تھے، اور ان کمزور افراد کے لئے طاقتور افراد کی فرمانبرداری کے سوا کوئی چارۂ کار ہی باقی نہ ہوتا تھا بلکہ انہیں ان کی ہر خواہش کو پورا کرنے اور ان کی ہر بات پر بلاچون وچرا لبیک کہنے کی تاکید کی جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود کہ وہ ان کی اطاعت و فرماں برداری میں ہر لحہ آمادہ باش رہتے تھے اور ان کی خواہشات کی تکمیل میں کوئی کمی نہ کرتے تھے ان کے دلوں میں طاقتور افراد کے بارے میں غیظ و غضب اور کینہ کی آگ شعلہ ور رہتی تھی اور وہ اسی حالت میں ان سے چھٹکارا پانے کے انتظار میں وقت شماری کرتے تھے، یہ طرزِ عمل جو کہ ابتداء میں ایک طرح کی اشرافی روش تھی لیکن رفتہ رفتہ بادشاہت وملوکیت اور آمریت و امپراطوری میں تبدیل ہوگئی۔

بالآخر ایک وقت وہ آیا کہ اس روش اور غیر انسانی طرز عمل کی بیخ کنی کے لئے نوع انسانی حرکت میں آگئی اور پھر

یکے بعد دیگرے نہضت وقیام کا آغاز ہوا تا کہ حکمرانوں کو ان دستور العمل ہائے مقررہ اور قوانین کی عملی پاسداری کا پابند بنایا جائے جو انسانی معاشرہ کی بہتری وبھلائی اور سعادت کے لئے وضع کئے گئے ہیں چنانچہ اس کے نتیجہ میں شخصی حکمرانی کی بے بنیاد آمرانہ روش کا خاتمہ ہوگیا اور استبدادی نظام ہائے حاکمیت بظاہر ختم ہو گئے کہ جس سے لوگوں کے درمیان پایا جانے والا طبقاتی اختلاف اس طرح دور ہو گیا کہ پھر ان میں یہ تقسیم باقی نہ رہی کہ ایک حاکم اور دوسرا محکوم، ایک آمر اور دوسرا مامور، ایک آقا اور دوسرا غلام، ایک مطلق العنان بادشاہ اور دوسرا بے اختیار رعایا، یہ طبقاتی تقسیم بندی ختم ہوگئی لیکن اس کے باوجود فساد کی اصل جڑیں باقی رہیں اور ان میں روز بروز اضافہ وشدت پیدا ہوتی گئی، ہر جگہ دوسری جگہ سے اور ہر علاقہ دوسرے سے مختلف صورت میں طبقاتی تقسیم کا شکار رہا چنانچہ مال ودولت کی بنیاد پر نوع انسانی کی تقسیم بندی پختہ تر ہوگئی کہ بعض افراد کے پاس کثیر مال وثروت جبکہ بعض یکسر محرومیت کا شکار ہو گئے اور ان کے درمیان فاصلے اس قدر بڑھ گئے کہ جن کے پاس کثیر مال و دولت تھی وہ اسے استعمال میں لا کر اپنی مرفہ زندگی سے لطف اندوز ہونے ہی کو اپنا مقصد قرار دینے لگے اور جو محروم ونادار تھے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ وہ ثروت مندوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور ان کے مظالم کے خلاف قیام کریں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تیسری راہ نکل آئی یعنی اشتراکیت وکمیونزم، کہ جس میں شخصی مالکیت کی نفی ہوئی اور سرمایہ داری کا سرے سے خاتمہ کردیا گیا ہر چیز ہر شخص کی ملکیت کا اصول حاکم ہوا اور اس میں یہ طے پایا کہ معاشرہ کے ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ اپنے کمائے ہوئے مال سے اور اپنے ذاتی کمالات سے کسب کی ہوئی ثروت سے بھرپور استفادہ کرے۔ تا کہ اس طرح دولتمندی کے حوالہ سے طبقاتی فرق ختم ہو جائے، لیکن اس نظام کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں وہ سرمایہ دارانہ نظام سے کہیں زیادہ خطرناک تھیں یعنی شخصی آزادی کا بطلان اور فردی اختیار کی نفی، جو کہ فطرت انسانی سے قطعی متصادم ہے اور تخلیقی اصولوں سے اس کی تصدیق وتائید نہیں ہوتی بلکہ فطرت سلیمہ اس کو رد کرتی ہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان اس نظام کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرے جو طبع وجودی اور فطرت وتکوین سے متصادم ہو۔

اس کے علاوہ یہ کہ اشتراکی نظام کے نفاذ سے خرابیوں کی جڑیں مزید مضبوط ہوگئیں کیونکہ طبعِ انسانی ہی ایسی ہے کہ وہ صرف اسی عمل کی طرف راغب ہوتی ہے جس میں دوسروں سے امتیاز اور سبقت کا پہلو پایا جاتا ہو اور ترقی وبرتری کی امید موجود ہو لیکن اگر اس طرح کے امتیازات میں سے کچھ بھی نہ ہو تو کوئی شخص کچھ کرنے کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا اور جب ہر شخص اسی سوچ کے ساتھ کچھ بھی کرنے سے ہاتھ اُٹھالے تو اُس کا نتیجہ پوری انسانیت کی تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس بناء پر اشتراکیوں نے اس مشکل کا حل اس طرح نکالنے کی کوشش کی کہ ان امتیازات کا رخ غیر مادی اعزازی اہداف ومقاصد کی طرف موڑ دیں تا کہ امتیازات بھی برقرار رہیں اور دولت وثروت کی بناء پر طبقاتی اختلاف بھی باقی نہ رہے۔ لیکن اس کے باوجود وہی سابقہ صورتحال وجود میں آگئی اور سرمایہ داری کی سنگین کیفیت ایک دوسرے چہرے میں ظاہر ہونے لگی کیونکہ معاملہ

دو حال سے باہر نہ تھا: ایک یہ کہ انسان اس چیز کے سامنے سرخم کرلے جس پر اسے یقین وعقیدہ ہی نہیں دوسرا یہ کہ ان اعزازی و خیالی امتیازات پر یقین وعقیدہ قائم کرلے، جبکہ دونوں صورتوں میں علمی حقیقت وجود پذیر نہیں ہوسکتی بلکہ ان امتیازات کا حال مادی امتیازات جیسا یا اس سے بھی بدتر ہے۔

اب ڈیموکریسی نے اس مشکل صورتحال سے چھٹکارا پانے کے لئے جو راہیں نکالیں کہ جن سے اشتراکیت کی خرابیاں دور ہوسکیں وہ یہ تھیں کہ انہوں نے ابلاغ عامہ کے ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے اعلانی وتشہیری عمل کو وسعت دی اور دوسرا یہ کہ نہایت بھاری ٹیکس لگادیئے جن سے تجارت اور کام کاج کرنے والے افراد اس سے حاصل ہونے والے فوائد کے بہت بڑے حصہ سے محروم ہوگئے اس کے باوجود اصل مشکل حل نہ ہوسکی اور جو خرابیاں ڈیموکریسی کے مخالفین کے ہاں پائی جاتی تھیں وہ ڈیموکریسی والوں سے بھی دور نہ ہوسکیں اور نہ ہی حاصلہ فوائد کا بیشتر حصہ بیت المال میں منتقل ہونے سے عیش پرستوں کی بے راہ رویوں اور مظالم کا سد باب ہوا بلکہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر ممکن طریقہ اپنانے لگے اور بیت المال پر تسلط واختیار کی بناء پر اسے اپنی چاہتوں اور من پسند کاموں میں لانے کی ہر روش اپنانے لگے کیونکہ جس طرح کسی مال کا اصل مالک اس سے استفادہ کرتا ہے اسی طرح یا اس سے بھی زیادہ وسعت کے ساتھ اس مال پر مسلط اور مختار شخص اس سے استفادہ کرتا ہے، بیت المال کی بابت یہی ہوا اور ہوتا ہے کہ اس پر مسلط ومختار افراد یعنی حکمران اسے اپنے مقاصد کی تکمیل میں استعمال کرتے ہیں اور ڈیموکریسی میں ایسا ہی ہوا اور ہوتا ہے۔ لہٰذا ڈیموکریسی کے حامیوں سے مشکل حل ہوسکی اور نہ ہی اشتراکیوں کے ذریعے خرابیاں دور ہوسکیں اور صورتحال وہی ہوگئی جس کے حوالہ سے کہا جاتا ہے کہ جب درخت ہی جل گیا تو پھل کیا اگے گا، اس صورتحال کے وجود میں آنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بنی نوع بشر نے جس چیز کو اپنی زندگی کا مقصد اور اپنے معاشرہ کا مطلوب بنالیا یعنی مادی زندگی سے لطف اندوز ہونا وہ انہیں تباہی و بربادی کی طرف کھینچ رہا ہے اور اسے جس رنگ میں بھی تبدیل کیا جائے اور جس قالب میں ڈھالا جائے اس کی اثر گزاری میں کوئی فرق نہیں آسکتا، اس کی حیثیت مقناطیس کی اس سوئی جیسی ہے جو پلٹ پلٹ کر اپنی اصل کی طرف پہنچ جاتی ہے۔

اب اسلام کے اعلیٰ وارفع نظام پر نگاہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے مقدس دین میں معاشرتی زندگی کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے نہایت ٹھوس اصول وضع کئے گئے ہیں، سب سے پہلے تو اسلام نے بنی نوع انسان کو ان تمام امور میں آزادی عطا کی جو مقتضائے فطرت ہیں، اس کے بعد ثروت مندوں اور ناداروں کے درمیان ایسے ارتباطی خطوط مقرر کردیئے جن پر چل کر اُن دونوں کے درمیان پیدا ہونے والی دوریاں ختم ہوجائیں، اور وہ اس طرح کہ ایک طرف ٹیکسوں اور اس طرح کے دیگر مالی ذرائع میں حصہ مقرر کر کے ان ناداروں کی زندگی کا معیار بلند کیا اور دوسری طرف مالداروں کو اسراف وفضول خرچی سے منع کر کے مال ودولت کی بیجا نمائش سے اس لئے روکا کہ وہ معاشرہ کی متوسط زندگی کے دائرہ سے باہر نہ ہوجائیں اور اپنی درمیانہ روش کے ساتھ توحید کی اعتقادی بنیاد پر اور اعلیٰ اخلاق کی عملداری کو یقینی بناتے

ہوئے مادی امور سے وابستگی کے تمام بندھنوں کو توڑ کر تقویٰ کی پاکیزہ صفت اختیار کریں اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل کی جستجو کریں۔اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد حق تعالیٰ ہوا: ''وَسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ'' (اور تم اللہ سے اس کا فضل طلب کرو)، اور سورۂ حجرات، آیت ۱۳ میں اس طرح ارشاد ہوا: ''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ'' (بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو) اور سورۂ ذاریات، آیت ۵۰ میں یوں ارشاد ہوا: ''فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ'' (پس تم اللہ کی طرف چلے جاؤ) اس سلسلہ میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ لوگوں کا اللہ کی طرف چلے جانے اور اسی کی طرف رخ کر لینے کا اصولی نتیجہ و اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ حقیقی اسباب کی طرف اپنی توجہات مرکوز کریں کہ جن سے اُن کے امور زندگانی درست سمت میں قائم رہیں کہ نہ تو حد سے زیادہ مال کمانے میں اپنی توانائیاں صرف کریں اور نہ ہی حقیقی سعادت کے حصول کی بابت کوششیں کرنے میں سستی و کوتاہی سے کام لیں، بنابرایں جو شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام سستی و بیکاری کی راہ پر لگانے والا دین ہے کہ جو لوگوں کو انسانی زندگی کے حقیقی مقاصد سے دور کر دیتا ہے وہ جاہل ہے اور اسلام کی حقیقت اور اس کے تابندہ حقیقی اصولوں سے آگاہی نہیں رکھتا۔

یہ ہے اس قرآنی حقیقت کا خلاصہ کہ جس کی بابت ہم نے یہاں کچھ مطالب ذکر کئے ہیں اور اس موضوع کی بابت دیگر تفصیلی مربوطہ مطالب اس تفسیر میں مختلف مقامات پر پیش کئے گئے ہیں۔

اولیائے وراثت کا تذکرہ

○ ''وَلِکُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ''

(اور ہم نے ہر ایک کے لئے اولیائے وراثت قرار دیئے اس میں سے جو والدین اور قریبی چھوڑ جائیں)

آیت میں لفظ ''مَوَالِیَ'' ذکر ہوا ہے، یہ لفظ ''مولیٰ'' سے جمع کا صیغہ ہے اور ''مولیٰ'' سے مراد ولی و سرپرست ہے، اگرچہ یہ لفظ اپنے بعض مصادیق (ولایت و سرپرستی) میں زیادہ استعمال ہوتا ہے مثلاً غلام کے مالک کو ''مولیٰ'' کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی اپنے غلام پر سرپرستی ''ولایت'' کا واضح ترین مصداق ہے، اور مددگار کو ''مولیٰ'' کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جس کا مددگار ہوتا ہے ایک طرح سے اس کی سرپرستی کرتا ہے، اور چچازاد کو ''مولیٰ'' اس مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کرنے میں دوسروں سے زیادہ حقدار ہوتا ہے اور یہ بھی بعید نہیں کہ لفظ ''مولیٰ'' اصل میں مصدر میمی یا اسم مکان ہو اور اس سے وہ شخص مراد ہو جو کسی مناسبت سے ''ولایت'' و سرپرستی کا حامل ہو جس طرح سے ہم لفظ ''حکومت'' اور محکمہ سے حاکم مراد لیتے ہیں۔

لفظ ''عقد'' (گرہ ڈالنا) بمقابل لفظ ''حل'' (گرہ کھولنا) ہے، لفظ ''یمین'' (دایاں) بمقابل لفظ ''یسار'' (بایاں) ہے اور لفظ ''یمین'' سے مراد قسم بھی ہے اور اس کے دیگر معانی بھی ہیں۔

یہ آیۂ مبارکہ اپنی ماقبل آیت: ''وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ'' کے ساتھ ایک ہی سیاق کی حامل ہے اور اس میں وصیت کے بعض احکام کا ذکر ہونا کہ ہر حصہ دار کو اس کا مقررہ حصہ ملے گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے والدین اور اقرباء کے ترکہ میں اولیائے وراثت قرار دیئے ہیں، اس مطلب کی تائید کرتا ہے کہ آیۂ مبارکہ: ''وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا..... '' اپنی ماقبل آیت کے ساتھ مل کر میراث کی آیات میں مذکور احکام و دستورات کا خلاصہ ہے اور ایک ایسی اجمالی وصیت ہے جس میں تمام تفصیلی احکام مذکور ہیں جیسا کہ میراث والی آیات سے پہلے ارشاد ہوا: ''لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ'' کہ اس میں وراثت کے شرعی احکام کا اجمالی تذکرہ ہے، گویا وہ میراث کے باب میں ایک قاعدۂ کلیہ کی طرح سے ہے کہ میراث کے احکام کی تفصیلات کی بازگشت اسی کی طرف ہوتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسی قاعدہ کلیہ پر کہ جس میں وراثت پانے والوں اور وراثت دینے والوں کا اجمالی ذکر ہے ان تفصیلی احکام کی تطبیق ہو جو میراث والی آیات میں ذکر کئے گئے ہیں، لہٰذا لفظ ''مَوَالِيَ'' سے وہ تمام وارث مراد ہیں جو اس میں مذکور ہیں یعنی اولاد، والدین، بھائی بہنیں اور ان کے علاوہ دیگر ورثہ۔

اور آیت مبارکہ میں جن تین اصناف کا تذکرہ ہوا ہے یعنی ''الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ'' ان سے مراد وہی تین اصناف ہیں جن کا تذکرہ میراث والی آیات میں ہوا ہے یعنی، والدین، اقرباء اور زوجین، لہٰذا جملہ ''الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ'' زوج اور زوجہ پر منطبق ہوتا ہے۔

بنا برایں لفظ ''وَلِكُلٍّ'' سے مراد یہ ہے: ''ولکل واحد منکم ذکراً او انثیٰ، جعلنا موالی ای اولیاء فی الوراثة یرثون ما ترکتم من المال'' (اور تم میں سے ہر ایک کے لئے، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم نے موالی قرار دیئے ہیں یعنی وراثت میں حقدار بنائے ہیں جو اس مال میں سے وراثت پائیں گے جو تم چھوڑ کر جاؤ)۔ اور جملہ ''مِمَّا تَرَكَ'' میں حرف ''من'' ابتداء کا معنی دیتا ہے اور ''من، ما'' (جار و مجرور) کا تعلق ''مَوَالِيَ'' سے ہے، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ یہاں جس ولایت کا تذکرہ ہوا ہے اس کا تعلق مال سے ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق ایک محذوف جملہ سے ہو یعنی ''یرثون'' یا ''یؤتون مما ترك'' کہ وہ ''وارث ہوں گے''، یا ''انہیں اس ترکہ سے حصہ دیا جائے گا، اور ''ما ترك'' (جو وہ چھوڑیں) سے مراد وہ مال ہے جو مرنے والا/والی چھوڑے، کہ وہ مورث کہلاتے ہیں، یعنی والدین، اقرباء (نسبی طور پر) زوج و زوجہ (سببی طور پر)۔

اور آیۂ مبارکہ میں جملہ ''الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ'' کا اطلاق زوجہ اور زوج پر ہوا ہے تو یہ کنایۃ ہے کیونکہ

عربوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جب کوئی معاملہ یا معاہدہ کرتے تھے تو ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے تھے جس سے اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہوتا تھا کہ وہ جس بات پر ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کررہے ہیں اس پر ان کے درمیان معاملہ یا معاہدہ طے پا گیا ہے۔ بنابرایں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ کہ جن سے تم نے آپس میں عقد کے ذریعے رشتہ ازدواج قائم کیا ہے۔

حقدار کو اس کا حق دینے کا حکم

○ ''فَاٰتُوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ''
(تو انہیں ان کا حصہ دے دو)

اس میں ضمیر ''هُمۡ'' کی بازگشت لفظ ''الموالی'' کی طرف ہوتی ہے اور لفظ ''نصیب'' سے مراد میراث کے وہی حصے ہیں جو آیات الارث میں ذکر کئے گئے ہیں، اور ابتدائے جملہ میں حرف فا (فَاٰتُوۡهُمۡ) سے اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ جملہ پہلے جملہ کے (وَلِكُلٍّ جَعَلۡنَا مَوَالِىَ) کے نتیجہ کے طور پر ہے، اور آخر میں اس حکم کی تاکید مزید کے لئے ارشاد ہوا: ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا'' (یقیناً خدا ہر چیز پر گواہ ہے)۔

اور اس آیت کا جو معنی ہم نے ذکر کیا ہے وہ ان تمام معانی سے زیادہ مناسب اور اذہان و افکار سے قریب تر ہے جو دیگر مفسرین نے ذکر کئے ہیں، دیگر مفسرین نے جو معانی ذکر کئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

(۱) ''مَوَالِىَ'' سے مراد ورثہ نہیں بلکہ وہ رشتہ دار مراد ہیں جو وراثت نہیں پاتے۔

لیکن اس معنی کی کوئی دلیل الفاظ میں نہیں پائی جاتی جبکہ اس کے برعکس ورثہ مراد لینے کی دلیل آیت کے الفاظ میں موجود ہے۔

(۲) حرف ''من'' ـــــ ''مِمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ'' میں ـــــ بیانیہ ہے اور حرف ''ما'' سے مراد ورثہ اور اولیاء میت ہیں، بنابرایں آیت کا معنی یوں ہوگا: ''ولکل منکم جعلنا اولیاء یرثونه وھم الذین ترکھم وخلفھم الوالدان والاقربون'' اور تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے اولیاء قرار دیئے جو اس کے وارث ہوں اور وہ وہی افراد ہیں جنہیں والدین اور قریبیوں نے اپنے بعد چھوڑا ہے۔

(۳) ''الَّذِيۡنَ عَقَدَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ'' سے مراد وہ حلیف ہیں جو آپس میں قسم کے ذریعے معاہدہ کرتے ہیں، کیونکہ

زمانۂ جاہلیت میں رسم تھی کہ دو افراد ایک دوسرے سے برادری کا عقد قائم کرتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے: میرا خون تیرا خون، میری جنگ تیری جنگ، میری صلح تیری صلح، میری میراث تیری میراث، تو میرا ضامن میں تیرا ضامن (اگر تو جرم کا مرتکب ہو تو میں اسکا جرمانہ ادا کروں گا اور اگر میں جرم کروں تو اس کا جرمانہ ادا کرے گا)۔ اس طرح کے معاہدہ کے نتیجہ میں ایک شخص کے مرنے کے بعد دوسرے شخص کو اس کے ترکہ سے چھٹا حصہ ملتا تھا۔

اس قول کی بناء پر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ جملہ اپنے ماقبل جملہ سے کٹا ہوا ہے لہٰذا اس کا معنی یوں ہے: "والحلفاء اٰتوھم سدسھم" (حلیفوں کو اُن کا چھٹا حصہ دے دو) اور پھر یہ حکم آیت: "وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ" کے ذریعے منسوخ ہو گیا۔

(۴) جملہ "اٰتوھم نصیبھم" سے مراد یہ ہے کہ ان کی مدد کرو، ان کے جرائم پر عائد جرمانے ادا کرو اور بوقت ضرورت ان کا ساتھ دو، اس جملہ کا میراث سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا آیت میں نسخ کا حوالہ ہرگز نہیں پایا جاتا۔

(۵) ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے درمیان مدینہ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مواخات و بھائی چارہ قائم فرمایا تھا کہ وہ شروع میں ایک دوسرے سے میراث میں حصہ پاتے تھے لیکن جب میراث کی مخصوص آیات نازل ہوئیں تو اُن کے درمیان وراثت کا سلسلہ منسوخ ہو گیا۔

(۶) ان سے مراد وہ منہ بولے بیٹے ہیں جنہیں زمانہ جاہلیت میں رسمی طور پر بیٹے بنا لیا جاتا تھا اور پھر انہیں حقیقی بیٹوں کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ پھر اسلام میں اُن کے بارے میں حکم صادر کیا گیا کہ ان کے لئے میراث میں وصیت کریں چنانچہ اسی سلسلہ میں ارشاد ہوا: "فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ" تو اس سے مراد یہ ہے کہ منہ بولے بیٹوں کو اُن کا حق ادا کرو۔

لیکن کسی بھی محقق و مفکر پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مذکورہ بالا تمام آراء و معانی ایسے ہیں جن کی تصدیق و تائید نہ تو آیت کے سیاق سے ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے الفاظ سے ہوتی ہے، لہٰذا ہم نے ان کے بارے میں مزید بحث کرنے اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا تذکرہ کرنے سے اجتناب کیا ہے۔

مردوں پر عورتوں کے امور کی ذمہ داری کا بیان

○ "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ"

(مرد عورتوں کے امور کے ذمہ دار ہیں، بہ سبب اس کے کہ اللہ نے ان کے بعض کو دوسرے بعض پر برتری عطا کی اور بہ سبب اس کے کہ وہ اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں)

لفظ "قیم" کا معنی وہ شخص ہے جو کسی دوسرے کے امور کا ذمہ دار ہو، متولی و منتظم اور امور کا نگران، لفظ "قوام" اور "قیام" اسی سے مبالغہ کے طور پر آتا ہے۔

جملہ "بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" سے مراد فکر و تعقل کی وہ اضافی طاقتیں ہیں جو طبعی و تخلیقی طور پر مردوں کو عورتوں کی نسبت زیادہ عطا کی گئی ہیں جن کی بنیاد پر وہ سخت ترین اعمال کی انجام دہی پر قادر ہوتے ہیں کیونکہ عورتوں کی زندگی احساسات و عواطف کی حامل ہوتی ہے جو نزاکت و لطافت پر مبنی ہوتی ہے، اور "بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ" سے مراد وہ اموال ہیں جو وہ عورتوں کے حق مہر اور نان و نفقہ میں خرچ کرتے ہیں۔

آیہ مبارکہ میں "مردوں کا عورتوں کے امور کا ذمہ دار ہونا" عمومی صورت میں ذکر کیا گیا ہے کہ جو صرف زوج و زوجہ تک محدود نہیں کہ جس کی بناء پر کہا جائے کہ شوہر ہی ہیں جو اپنی بیویوں کے امور کے ذمہ دار ہیں بلکہ یہ حکم عام ہے اور اس کا تعلق مردوں اور عورتوں میں سے دونوں کی نوع سے ہے اور اس میں دونوں کی زندگیوں سے مربوط تمام امور ملحوظ ہیں، چنانچہ وہ عمومی جہات کہ جن پر معاشرتی زندگی کا دارومدار ہے، مثلاً حکومت و قضاوت، تو ان میں فکر و تعقل کی جو قوت درکار ہوتی ہے وہ طبعی و وجودی طور پر مردوں میں عورتوں کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے، اسی طرح میدانِ جنگ میں جسمانی و عقلانی دونوں طاقتوں کا عملی مظاہرہ مطلوب ہوتا ہے جو عورتوں کے مقابلے میں مرد زیادہ انجام دے سکتے ہیں۔ اس بناء پر جملہ "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" میں حکم کا دائرہ وسیع ہے، لیکن جہاں تک اس کے بعد والے جملوں کا تعلق ہے یعنی "فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ" کو جن میں بظاہر شوہر اور بیوی کے اختصار صات مذکور و ملحوظ ہیں۔ کہ ان کی تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی، تو وہ اس وسیع و عمومی حکم کی ایک فرع کی حیثیت میں ہیں اور ایک کلی کی نسبت جزئی کی طرح سے ہیں کہ جو اسی حکم کی شاخیں و ثمرات ہیں۔ لہٰذا ان کی وجہ سے کلی حکم کا اطلاق مقید نہیں ہوگا۔

نیک و صالح ازواج کا تذکرہ

○ "فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ"

(تو نیک بیویاں، اطاعت گزار ہیں، غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں کہ جس طرح اللہ نے حفاظت کی)

یہاں "صالحات" میں "صلاح" سے اس کا لغوی معنی مراد ہے جسے کسی شخص کی لیاقت و صلاحیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

"قانتات" میں قنوت سے مراد اطاعت و فرماں برداری میں ہمیشگی ہے۔ اور چونکہ صالحات کے مقابلے میں ناشزات مذکور ہیں "وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ" (وہ عورتیں کہ تمہیں جن کی طرف سے سرکشی و نافرمانی کا اندیشہ ہو) لہٰذا اس

سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں صالحات سے نیک و صالح بیویاں مراد ہیں اور یہ حکم انہی عورتوں سے تعلق رکھتا ہے جو کسی کی زوجیت میں ہوں نہ کہ ہر عورت سے، یعنی بیویوں کی بابت ان کے صالح ہونے کا بیان ہے۔ اور جملہ ''قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ'' میں دراصل حکم کو وصف کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اطاعت و حفاظت کریں، تو یہ حکم زوجیت و گھریلو معاشرت سے مربوط ہے لیکن اس کے باوجود اس کی وسعت و عدم وسعت اس کی اصل بنیاد یعنی مرد کی عورت کے امور کی ذمہ داری سے وابستہ ہے جو کہ شوہر کا اپنی بیوی کے امور کا ذمہ دار ہونا ہے لہٰذا عورت پر اپنے شوہر کی تابعداری ضروری ہے اور ان تمام امور میں حفاظت و خیالداری اور عملی پاسداری ضروری ہے جس کا تعلق ان کی ازواجی زندگی سے تعلق رکھنے والے امور سے ہو۔

اس مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح معاشرتی زندگی میں مردوں کا عورتوں کے امور کا ذمہ دار ہونا اور ان مشترکہ جہات میں اپنی توانائیوں کو بروئے کار لانا جو دونوں کی ذمہ داریوں میں شامل ہوں مردوں میں فکر و تعقل اور جسمانی قوت میں اضافہ پر موقوف ہے یعنی حکومتی امور، قضاوت اور جنگی اعمال کہ ان میں انہیں وجودی برتری کی بنیاد پر قیمومت و سرپرستی حاصل ہے اور وہ ان امور میں اپنی قوتیں اور صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس طرح اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے پر مامور ہیں کہ اس سے عورتوں کے فکری و ارادی استقلال اور شخصی عملی آزادی کی راہ میں رکاوٹ نہ آنے پائے بلکہ صنف نازک کو اپنی فردی آزادی اظہار و عمل سے استفادہ کرتے ہوئے ایسی روش اختیار کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور اس حوالہ سے مردوں کو ایسی روش اختیار کرنی چاہیے جس سے عورتوں کے حقوق پر ضرب نہ لگے اور نہ ہی ان کے امور میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہونے پائے سوائے ان امور میں جو شرعاً جائز نہیں، لہٰذا خواتین جو اچھے کام اپنے لئے انجام دیں ان میں مردوں پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، اسی طرح شوہر کی اپنی بیوی پر قیمومت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس کی آزادی اظہار و عمل کے انسانی حق سے استفادہ کا راستہ روکے اور اسے اس کے شخصی و معاشرتی حقوق کے تحفظ و پاسداری میں مانع ہو کر اسے ان امور میں مربوطہ وسائل سے کام نہ لینے دے، بلکہ اس کے قیمومت و سرپرستی یا ذمہ داری سے مراد یہ ہے کہ چونکہ اس پر اس سے جسمانی استفادہ کرنے کے اپنے حق کو استعمال کرنے کی وجہ سے اس کے ضروری اخراجات کا بوجھ اٹھانا واجب ہے اور وہ اس سلسلہ میں لازمی انفاق کرتا ہے لہٰذا عورت پر واجب ہے کہ اس کے ساتھ ہم آہنگی کرے اور اس کے اس حق میں اس کی ہاں میں ہاں ملائے یعنی جسمانی استفادہ و استمتاع کی بابت اس کی مرضی کے مطابق عمل کرے اور جب وہ موجود نہ ہو تو اس کی جسمانی امانت میں خیانت نہ کرے اور کسی غیر کو اس کے بستر پر نہ لائے، بلکہ جسمانی استفادہ کا جو حق اس کے شوہر کو حاصل ہے اس میں اس کے علاوہ کسی کو حقدار نہ بنائے، اسی طرح اس نے جو مال اس کے ہاتھ میں دیا اور اسے گھریلو ضروریات کے پورا کرنے کے لئے اس کے اختیار میں قرار دیا ہو اس میں امانت داری سے کام لے اور کسی طرح سے مالی خیانت کی مرتکب نہ ہو۔

بنا برایں جملہ ''فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ'' سے مراد یہ ہے کہ انہیں چاہیے کہ اپنے لئے صلاح و نیکی کی روش اپنائیں کہ

جب وہ صالحات ہوں گی تو لامحالہ قانتات بھی ہوں گی یعنی ان پر واجب ہو جائے گا کہ وہ اپنے شوہروں کی تابعداری اور جسمانی استفادہ و استمتاع سے مربوط تمام امور میں ان کی اطاعت اور ہاں میں ہاں ملائیں اور ان کے غیاب میں ان سے متعلقہ تمام حقوق کی حفاظت و پاسداری اور امانت داری کا ثبوت دیں۔

اور جہاں تک جملہ "بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ" کا تعلق ہے تو بظاہر اس میں حرف "ما" مصدریہ ہے اور حرف "باء" بمعنی آلہ و سبب ہے اسی طرح جملہ کا معنی یہ ہے صالح بیویاں اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے والی ہیں ان کے غیب و پوشیدہ امور کی حفاظت کرنے والی ہیں بہ سبب اس حفاظت کے کہ جو خدا نے ان کے حقوق کی کی ہے (جو حقوق اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے قرار دیئے ہیں ان کی حفاظت و پاسداری کرنے والی ہیں) کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے لئے قیمومت (امور کی ذمہ داری) واجب فرمائی ہے اور عورتوں پر اطاعت و فرماں برداری اور شوہروں کی عدم موجودگی میں ان کے حقوق کی حفاظت و پاسداری کا فریضہ عائد کیا ہے۔

ممکن ہے کہ یہاں حرف "باء" تقابل کے معنی میں ہو، اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: خواتین پر واجب ہے اطاعت کرنا اور اپنے شوہروں کے حقوق کی حفاظت کرنا، بمقابل اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان (عورتوں) کے حقوق کی حفاظت فرمائی ہے اور انسانی معاشرہ میں ان کی عظمت رفتہ بحال کی ہے اور مردوں پر ان کا مہر اور نفقہ واجب کیا ہے۔

لیکن پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔

البتہ مذکورہ بالا مطالب کے علاوہ آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں دیگر معانی بھی ذکر کئے گئے ہیں کہ ہم نے وہ یہاں ذکر نہیں کئے کیونکہ آیۂ مبارکہ کے الفاظ سے ان میں سے کسی کی کوئی تائید نہیں ہوتی۔

سرکش و نافرمان بیویاں

○ "وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ"

(وہ عورتیں کہ تم جن سے سرکشی کا اندیشہ رکھو تو انہیں نصیحت کرو)۔

"نُشُوْزَ" کا معنی عصیان و نافرمانی اور اطاعت سے سرکشی و غرور ہے اور "نُشُوْزَ" کے خوف سے مراد یہ ہے کہ اس کی نشانیاں بتدریج ظاہر ہونے لگیں (عملی طور پر اس کے آثار دکھائی دینے لگیں)۔

اور جملہ "فَعِظُوْهُنَّ" پر حرف "فا" جو کہ اصطلاح میں فاء تفریع کہلاتا ہے (جس کا اُردو زبان میں ترجمہ "پس" ہے) اس کا تعلق "نُشُوْزَ" کے خوف و اندیشہ سے ہے نہ کہ خود نشوز سے، کیونکہ آیت میں مذکورہ تین طریقہ ہائے علاج و تنبیہ میں سے

نصیحت کرنا اس مقام سے زیادہ موزوں ہے، یا یہ کہ خوفِ نشوز یعنی اندیشہ سرکشی کا سد باب پہلے مرحلہ میں نصیحت کرنے ہی سے ممکن ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وعظ ونصیحت کرنا جس طرح اصل سرکشی وعصیان کے ارتکاب کے وقت مؤثر ہوتا ہے اسی طرح عصیان وسرکشی کی علامات وآثار کے سامنے آتے وقت بھی اس کی عملداری کا دور شروع ہوجاتا ہے۔

نشوز وسرکشی کا اندیشہ لاحق ہونے پر تین طریقہ ہائے علاج واصلاح آیۂ مبارکہ میں ان الفاظ میں مذکور ہیں: ''فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ'' ان تینوں کے ساتھ ساتھ اور ان میں حرف ''واؤ'' کے ذریعے عطف کرتے ہوئے یکے بعد از دیگرے ذکر کرنے میں ان کے تدریجی امور ہونے کی طرف اشارہ مقصود ہے یعنی پہلے مرحلہ میں موعظہ ونصیحت، اگر وہ نتیجہ بخش ثابت نہ ہو تو ہجرت، ورنہ ضرب، اور ان امور کا تدریجی ہونا ان کے طبعی طور پر اثر گزاری کے حوالہ سے ہے کہ ان میں سے بعض، دوسرے بعض کی نسبت شدت وضعف رکھتے ہیں چنانچہ اس کا ثبوت کلام میں اختیار کی گئی ترتیب سے ملتا ہے لہٰذا اُن کا مرحلہ وار ہونا حرف واؤ سے نہیں بلکہ بیانی ترتیب اور ترتیبی بیان سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اور جملہ ''وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ'' میں بظاہر اس مطلب کا بیان مقصود ہے کہ مضاجعت اور بستر پر یکجا ہوتے ہوئے بھی دوری اختیار کریں مثلاً پیٹھ کر کے سوئیں اور ملاعبت وجسمانی ملاپ وغیرہ نہ کریں، اگرچہ اس طرح کے بیان سے ایک بستر پر یکجا ہونے کو ترک کرنا بھی مراد لیا جاسکتا ہے لیکن وہ بعید نظر آتا ہے۔ البتہ پہلے معنی کی تائید لفظ ''الْمَضَاجِعِ'' بہ صیغہ جمع لانے سے ہوسکتی ہے کیونکہ اگر دوسرا معنیٰ مراد ہو تو لفظ ''مضاجع'' ذکر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ مفرد کا صیغہ ''مضجع'' ہی کافی تھا۔

اطاعت کی صورت میں حکم

○ ''فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا'' ....

(پس اگر وہ تمہاری فرماں برداری کریں تو تم انہیں ایذاء دینے کی راہ نہ ڈھونڈو.........)

اس جملہ میں مقصود یہ ہے کہ اگر تمہاری ازواج تمہاری فرماں برداری کریں (تمہاری بات مان لیں اور تمہاری ہاں میں ہاں ملائیں) تو تم انہیں اذیت وآزار دینے کے لئے کوئی بہانہ جوئی مت کرو، اس کے بعد آیت مبارکہ کے الفاظ یہ ہیں: ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا'' بے شک، اللہ بلند وبرتر اور بزرگ ہے، اس میں شوہروں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اُن کے پروردگار کا مقام بلند وبڑا ہے لہٰذا وہ اپنی ازواج کی بابت مغرور نہ ہوں اور اس فریب میں مبتلا نہ ہوں کہ اُنہیں اپنی بیویوں پر جسمانی قوت وتوانائی کے حامل ہونے کی وجہ سے اُن پر ظلم وزیادتی کریں اور ان پر اپنی بڑائی جتاتے پھریں۔

اختلاف دور کرنے کا خدائی اصول

○ ''وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا''

(اور اگر تمہیں ان کے درمیان دشمنی کا اندیشہ ہو تو مقرر کرو.........)

لفظ ''شِقَاقَ'' کا معنی جدائی و دشمنی ہے، اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان جدائی و دشمنی پیدا ہونے کی امکانی صورت میں یہ حل قرار دیا ہے کہ ایک فیصل (حَکَم) مرد کے خاندان کی طرف سے اور ایک فیصل، عورت کے خاندان کی طرف سے ان کے درمیان پیدا ہونے والی صورت حال کی درستگی کا اہتمام کریں اور دونوں جانب سے فیصل مقرر کرنے کے نتیجہ میں کسی طرح کی جانبداری و زیادتی کا پہلو باقی نہ رہے گا اور مسئلہ کے حل کی بہتر راہ نکلنے کی امید پیدا ہوگی۔

جملہ ''اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیۡنَهُمَا'' (اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں تو اللہ ان کے درمیان مصالحت کی راہ ہموار کر دے گا) سے مراد یہ ہے کہ اگر میاں بیوی دونوں ہی اصلاح و بہتری کے خواہاں ہوں اور اختلاف ونزاع کا خاتمہ چاہیں تو اللہ تعالیٰ دونوں خاندانوں کی طرف سے مقرر کئے گئے دو فیصلہ کرنے والے افراد کے ذریعے باہمی اتفاق کی راہ ہموار کر دے گا کیونکہ جب دونوں فریق اپنا اختیار اپنے پسندیدہ شخص کے سپرد کر کے اسی کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیں گے تو یقیناً ان کا ایسا کرنا باہمی مصالحت کا سبب ہوگا۔

اب رہا یہ سوال کہ جب دونوں کے درمیان مصالحت کو یقینی بنانے میں فریقین کی طرف سے مقرر کردہ افراد کی عملداری کو ترقی ہوتی ہے تو اس کی نسبت خداوند عالم کی طرف کیوں دی گئی اور یہ کیوں کہا گیا: ''یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیۡنَهُمَا'' (اللہ ان کے درمیان اتفاق کی راہ ہموار کر دے گا)؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں کی مصالحت ان کے اپنے ارادہ اور فیصلہ کرنے والے افراد کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کے نتیجہ میں یقینی ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہی وہ حقیقی سبب ہے جو اسباب کو ان کے مسببات سے ملاتا ہے اور وہی ہے جو ہر حقدار کو اس کا حق عطا کرتا ہے، لہٰذا حقیقی معنی میں اسی کی عطا و عنایت سے مصالحت کا عمل نتیجہ بخش ثابت ہوتا ہے چنانچہ مناسبت کے حوالہ سے کلام کی تکمیل اس جملہ سے ہوئی: ''اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا'' (بے شک اللہ بخوبی آگاہ و باخبر ہے)۔

مردوں کی عورتوں پر قیمومت کا بیان

یہ ایک واضح و روشن حقیقت ہے کہ قرآن مجید نے انسانی عقل سلیم کی تقویت اور اسے نفسانی خواہشات اور ان کی

پیروی کرنے پر ترجیح دینے کو بنیادی اہمیت دی، اور جذبات واحساسات کی سنگین وشدید ترین صورت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے عقل سلیم کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کرنے اور اس عظیم خدائی نعمت کو ضائع ہونے سے بچانے کی بھرپور تاکید کی ہے، اس قرآنی حقیقت کے اثبات پر کسی خاص آیت سے استدلال پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ قرآنی آیات اس سلسلہ میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان سے مقصود کا ثبوت واضح وصریح طور پر بھی ملتا ہے اور اشارہ وکنایہ کے طور پر بھی موجود ہے بلکہ ہر زبان وبیان میں اس کی پختہ دلیلیں پائی جاتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود اس مقدس کتاب الٰہی میں پاک و پاکیزہ جذبات کو نظرانداز نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان کے ان نہایت اہم "خوبصورت آثار" کی اہمیت سے بے توجہی سے کام لیا گیا ہے جن سے بنی نوع انسان کی فردی وشخصی تربیت اور اجتماعی، ومعاشرتی استحکام وابستہ ہے، چنانچہ اس حوالہ سے درج ذیل آیات قابل توجہ ہیں:

سورۂ فتح، آیت: ۲۹

○ "اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ"

(وہ کافروں پر سخت اور آپس میں نہایت مہربان ہیں)

اس آیت میں مؤمنین کی دو پسندیدہ صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کافروں پر سخت ہیں یعنی اُن کے ساتھ سخت برتاؤ کرتے ہیں، اور دوسری یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نرم ومہرباں ہیں۔

سورۂ روم، آیت: ۳۱

○ "لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً"

(تاکہ تم ان سے سکون پاؤ، اور اس نے تمہارے درمیان مودت ونرمی ومہربانی قرار دی ہے)

اس آیت میں زوج اور زوجہ کے درمیان محبت والفت کا رشتہ قرار دیئے جانے کے ساتھ ساتھ زوجہ کو زوج کے لئے وجہ تسکین قرار دیا گیا ہے۔

سورۂ اعراف، آیت ۳۲

○ "قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ"

(کہہ دیجئے کہ کس نے اس خدائی زینت کو حرام قرار دیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کی ہے اور پاکیزہ رزق کو)

البتہ قرآن مجید نے عقل اور جذبات کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی عملداری کو درست سمت میں رکھنے کا یہ طریقہ واصول وضع کر دیا کہ ان جذبات واحساسات اور خواہشات کی پیروی کی صحیح صورت عقل

کے فیصلوں وتقاضوں کی تکمیل و پیروی سے وابستہ ہوگی۔

سابق الذکر مباحث میں یہ مطلب بیان ہو چکا ہے کہ اسلام کے تمام احکام کی بنیاد عقل پر استوار ہے چنانچہ ان تمام اعمال و احوال اور عادات کو ممنوع وحرام قرار دیا گیا ہے جو عقل کے منافی اور معاشرتی زندگی کے امور کو درہم و برہم کردینے کا سبب بنتے ہیں، مثلاً شراب خوری، جوابازی، دھوکہ وفریب پر مبنی معاملات ولین دین، جھوٹ، بہتان، الزام تراشی اور غیبت وغیرہ، تو دین اسلام میں ان سب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور ہر اہل فکر ونظر اس حقیقت سے بخوبی آگاہ وملتفت ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیے۔ تمام اہم و بنیادی امور اور معاشرتی زندگی کے عمومی مسائل کہ جن کی تدبیر عقلی قوت کی عملداری پر موقوف ہے اور ان میں جذبات و احساسات اور نفسانی خواہشات کے غلبہ سے اجتناب ضروری ہے مثلاً حکومت داری، قضاوت وجنگی وعسکری اعمال، تو ان میں ایسے افراد پر ذمہ داری عائد کی جائے جو عقلی قوت میں اضافہ کے حامل ہونے کی بنیاد پر ممتاز ہوں اور عواطف وجذبات سے مغلوب نہ ہونے پائیں، واضح ہے کہ یہ صفت مردوں ہی میں پائی جاتی ہے خواتین میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ خواتین میں مردوں کی نسبت جذبات واحساسات اور عواطف کا غلبہ وشدت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی حوالہ سے قرآن مجید میں ارشاد ہوا: ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ'' اور جہاں تک سنت وسیرت نبوی ﷺ کا تعلق ہے تو ان میں بھی اسی حقیقت کی تصدیق کے ثبوت موجود ہیں۔ کیونکہ سنت نبوی ﷺ قرآنی بیانات کی ترجمان ہے اور حضور ﷺ کی عملی سیرت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں جو نظام نافذ فرمایا اس میں کسی خاتون کو کسی قوم پر حکمرانی کا منصب عطا نہیں کیا اور نہ ہی قضاوت کی ذمہ داری سونپی، اس کے ساتھ ساتھ کسی خاتون کو میدانِ جنگ میں بلا کر دشمن سے لڑنے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن اس کے علاوہ دیگر معاشرتی امور مثلاً تعلیم وتعلم، تجارت ولین دین، بیمارداری، علاج وطبابت وغیرہ کہ جن میں عواطف واحساسات مانع ورکاوٹ نہیں بنتے ان میں صنف نازک کے لئے کوئی ممانعت وارد نہیں ہوئی بلکہ اس طرح کے کاموں میں خواتین کی عملداری کی مثالیں سنت نبوی ﷺ میں کثرت سے موجود ہیں، اور قرآن مجید کی آیات مبارکہ بھی خواتین کے لئے اس طرح کے اعمال کی عدم ممانعت بلکہ اجازت کے ثبوت سے خالی نہیں کیونکہ اس اجازت وعدم ممانعت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شخصی آزادی کا حق استعمال کرتے ہوئے وہ زندگی کے متعدد اُمور میں استقلالی طور پر کام کرسکتی ہیں لہٰذا اس بناء پر یہ بات بے معنی ہوگی کہ انہیں ایک طرف تو مردوں کی حاکمیت کے دائرہ سے باہر کیا جائے اور انہیں مالکانہ حقوق سے نوازا جائے اور دوسری طرف انہیں اپنی مملوکہ چیزوں میں اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے سے منع کردیا جائے، اسی طرح یہ بات بھی بے معنی ہے کہ اُنہیں عدالت میں دعویٰ دائر کرنے یا گواہی دینے کا حق تو دیا جائے اور پھر قاضی یا حاکم کے سامنے پیش ہونے سے منع کردیا جائے۔ یہی بات دیگر حقوق وغیرہ کی بابت ہے۔

البتہ بیویوں کی استقلال و آزادی کے حقوق کا دائرہ اس حد تک وسعت رکھتا ہے کہ اس سے شوہروں کے حقوق پامال نہ ہوں، چنانچہ اسی بناء پر شوہر کی موجودگی میں بیوی پر اس کی اطاعت اور اس کی عدم موجودگی کے دوران اس کی عزت و ناموس اور مال کی حفاظت اس پر لازم قرار دی گئی ہے، اس حوالہ سے بیوی کو اپنے ان جائز حقوق سے بھی دستبرداری ضروری قرار دی گئی جن کی وجہ سے شوہر کے حقوق پامال ہوتے ہوں، تاکہ دونوں کی حیثیتوں و حقوق کے تحفظ کا مسئلہ عادلانہ طور پر حل ہو سکے۔

روایات پر ایک نظر

امام جعفرؑ صادق کا فرمان

تفسیر مجمع البیان میں آیۂ مبارکہ "وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ.........." کے ذیل میں مرقوم ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی یہ بات نہ کہے کہ اے کاش، فلاں نعمت یا خوبصورت عورت کہ جو فلاں کی بیوی ہے مجھے مل جاتی! کیونکہ اس طرح کہنا حسد قرار پائے گا، البتہ یہ کہنا جائز ہے: اے اللہ، مجھے بھی اس طرح کی نعمت یا خوبصورت عورت عطا فرما، (اللھم اعطنی مثل ھٰذا)

اس کے بعد مؤلف تفسیر مجمع البیان نے لکھا ہے کہ یہ بات حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول روایت میں مذکور ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان، جلد ۲، ص ۸۷)

تفسیر العیاشی میں بھی اسی مضمون پر مشتمل ایک روایت امام جعفر صادقؑ کے حوالہ سے منقول ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی، جلد اول ص ۲۳۹)

تفسیر برہان کی روایت

آیۂ مبارکہ: "ذٰلك فضل الله یوتیه من یشاء من عبادہ" اور آیۂ مبارکہ "وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ" کی تفسیر میں ابن شہر آشوب کے حوالہ سے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی منقول ہے کہ یہ دونوں آیتیں حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئیں۔ (تفسیر البرہان، جلد اوّل، ص ۳۶۶)

مذکورہ بالا ارشاد گرامی ایک مصداقی تطبیق کے طور پر ہے۔

خدا سے اس کے فضل کی درخواست کا حکم

کتاب کافی میں اور تفسیر قمی میں ابراہیم بن ابی البلاد کے حوالہ سے ان کے والد سے منقول ہے کہ حضرت امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

لیس من نفس الا وقد فرض اللہ لھا رزقھا حلالاً یاتیھا فی عافیة وعرض لھا بالحرام من وجه اُخر فان ھی تناولت شیئاً من الحرام قاصھا به من الحلال الذی فرض لھا وعند اللہ سواھما فضل کثیر، وھو قول اللہ عزوجل: وَاسْئَلُوا اللہَ مِنْ فَضْلِهٖ۔

دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس کا حلال رزق اللہ تعالیٰ نے مقرر نہ کیا ہو کہ جو اسے عافیت و آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہی رزق اسے از راہِ حرام پیش کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اسے لے لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اسی مقدار میں حلال رزق سے کم کر دیتا ہے جو اس نے اس کے لئے مقرر کیا ہوتا ہے، البتہ اللہ کے پاس ان دو اموال کے علاوہ کثیر فضل موجود ہے کہ جس کے بارے میں اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''تم اللہ سے اس کے فضل سے عطا کئے جانے کی درخواست کرو۔'' (کتاب فروع کافی، جلد پنجم، ص:۸۰)

اس روایت کو تفسیر العیاشی میں اسماعیل بن کثیر کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے اور اس کا سلسلہ سند حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک منتہی کیا ہے۔ اسی مضمون پر مشتمل ایک روایت ابو ہذیل کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے اور اس سے قریب المعنیٰ ایک روایت تفسیر قمی میں حسین بن مسلم کے حوالہ سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۳۹ و ۲۴۰)

یاد رہے کہ سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۲ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ رزق کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کا رزق معین کر دیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ رزق کی دو قسمیں ہیں، ایک حلال اور دوسری حرام، ان مطالب کا تفصیلی تذکرہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں ہو چکا ہے قارئین کرام ان مطالب سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے مربوطہ مقام کی طرف رجوع کریں۔

ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

صحیح ترمذی میں ابن مسعود کے حوالہ سے مرقوم ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سلوا اللہ من فضله فان اللہ یحب ان یسأل'' (تم اللہ سے اس کا فضل طلب کرو، کہ اللہ کو یہ پسند ہے کہ اُس سے مانگا جائے)۔

سب سے افضل عبادت

تفسیر ''درمنثور'' میں ابن جریر کے حوالہ سے حکیم بن جبیر کا بیان منقول ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ایک شخص نے (جس کا نام انہوں نے ذکر نہیں کیا) حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

○ ''سلوا اللہ من فضلہ فان اللہ یحب ان یسأل، وان من افضل العبادۃ انتظار الفرج''

(تم اللہ سے اس کا فضل مانگو، کہ اللہ کو پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے، اور بیشک بہترین عبادت ظہور کا انتظار ہے)۔

(تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲۔ص ۱۴۹)

اولوالارحام کا اشاراتی بیان

شیخ طوسیؒ نے کتاب التہذیب میں اپنے اسناد سے زرارہ کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا، امامؑ نے فرمایا خداوند عالم نے آیہ مبارکہ ''وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ'' میں ''مَوَالِيَ'' سے اولوا الارحام (قرابتدار) مراد لئے ہیں اور خدا نے اولیائے نعمت مراد نہیں لئے لہٰذا اس سے مرادمیت کے قریبی ترین رشتہ دار ہیں کہ وہی میراث میں دوسرں سے زیادہ حقدار ہیں۔ (کتاب التہذیب، جلد نہم، ص ۲۶۸)

شیخ طوسیؒ نے اسی کتاب میں اپنے اسناد سے ابراہیم بن محرز کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا میں امام ابوجعفرؑ کی خدمت میں موجود تھا کہ وہاں ایک شخص نے آنجنابؑ سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ ''تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے'' تو اس کی کیا حیثیت ہے؟ امامؑ نے جواب دیا، یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ اس کا اختیار خود اس کے ہاتھ میں ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ'' (مرد عورتوں پر قیمومت رکھتے ہیں۔ یعنی ان کے امور کے ذمہ دار ہیں) اس شخص کی بات کی کوئی حیثیت نہیں۔ (التہذیب جلد ہشتم، ص ۸۸)

فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فرمانِ خدا؟

تفسیر ''درمنثور'' میں منقول ہے کہ ابن ابی حاتم نے اشعث بن عبدالملک کے حوالہ سے جس کا بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا ایک عورت نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اپنے شوہر کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قصاص کیا جائے، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ'' لہٰذا وہ عورت

قصاص کئے بغیر واپس چلی گئی (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، ص ۱۵۱)

تفسیر ''درمنثور'' میں یہی روایت دیگر اسناد سے بھی ذکر کی گئی ہے جس میں حضور ﷺ کا وہی بیان مذکور ہے۔ ان میں سے بعض روایات میں یوں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اردت امراً واراد الله غیرهٔ'' میں نے کچھ چاہا اور خدا نے کچھ اور چاہا۔ ممکن ہے وہ عورت ناشزہ ہو، ورنہ آیت کے ذیلی جملہ میں یوں بیان ہوا ہے: ''فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا'' (پس اگر وہ تمہاری فرماں برداری کریں تو تم ان پر زیادتی کرنے کا راستہ تلاش نہ کرو) جس سے روایت میں مذکور مطالب کی نفی ہوتی ہے۔

ان روایات کے ظواہر میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قصاص کیا جائے'' تو یہ ایک مسئلہ کے جواب میں شرعی حکم کا بیان ہے نہ یہ کہ کسی ایسے مقدمہ میں سنایا جانے والا فیصلہ ہے کہ جس میں دعویٰ کے دونوں فریق حاضر نہ تھے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کے بیان کردہ حکم وقانون کو درست قرار دینے کے لئے آیت نازل ہوئی ہو، جبکہ ایسا ہونا حضور ﷺ کی عصمت کے منافی ہے (جو کہ کسی صورت میں صحیح نہیں) اور آیت کو ناسخ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ نسخ وہاں قابل تصور ہے جہاں منسوخ کئے جانے والے حکم پر عمل ہو چکا ہو جبکہ ابھی قصاص پر عمل ہی نہ ہوا تھا تو نسخ کیونکر قابل تصور ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے بعض احکام میں تبدیلی یا اسے منسوخ کیا ہے یا بعض احکام ابتدائی طور پر صادر فرمائے ہیں لیکن یہ ان احکام کی بابت ہوا ہے جو آنحضرت ﷺ نے معاشرہ کے والی وحاکم کے طور پر صادر فرمائے نہ کہ ان احکام میں جو آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے لئے قانونی صورت میں قرار دیئے اور صادر فرمائے کیونکہ اگر ان احکام میں تبدیلی یا نسخ ہو تو اس سے آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں غلطی قرار دیئے جانے اور آپ ﷺ کے صادر شدہ احکام کے نادرست قرار دیئے جانے کی صورت پیدا ہو جائے گی جو کہ ہرگز صحیح نہیں آنحضرت ﷺ کے احکامات کا تخطئہ باطل ونادرست ہے۔ (اور یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ حضور ﷺ کا فرمان، خدا کے فرمان سے مختلف ہو اور حضور ﷺ یہ فرمائیں کہ میں نے کچھ چاہا مگر خدا نے کچھ اور چاہا، ایسا ہونا ہرگز ہرگز درست نہیں کیونکہ آپ ﷺ صرف وہی کہتے ہیں جو اللہ کہتا ہے اور وہی کچھ چاہتے ہیں جو اللہ چاہتا ہے۔ م)

قانتات سے کیا مراد ہے؟

تفسیر قمی میں ابو الجارود کی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد مطیعات یعنی اطاعت گزار خواتین ہیں (تفسیر قمی، جلد اول، صفحہ ۱۳۷)

امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر ''مجمع البیان'' میں آیۂ مبارکہ: ''فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ.........'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے ارشاد فرمایا کہ بستر میں ہجر یعنی چھوڑ دینے سے مراد یہ ہے کہ بستر پر ان کی طرف پیٹھ کر کے لیٹیں۔

اور ''وَاضْرِبُوهُنَّ'' میں ''ضرب'' یعنی مارنے کا معنی بیان کرتے ہوئے امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ اس سے مراد مسواک سے مارنا ہے۔ (تفسیر ''مجمع البیان'' جلد دوم، صفحہ ۹۵)

(اگر ضرب کا معنیٰ مارنا ہی مراد ہو تو امام محمد باقرؑ کے فرمان کے مطابق مسواک سے مارنا ایک طرح سے ناراضگی کے اظہار کی علامت کے طور پر ہوگا۔ م)

عادلانہ خدائی فیصلہ

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابوبصیر کی روایت ذکر کی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ ''فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا'' کی تفسیر میں فرمایا: الحکمان یشترطان ان شاء افرقا وان شاء جمعا فان فرقا فجائز وان جمعا فجائز۔ میاں بیوی دونوں کی طرف سے مقرر کردہ دو فیصلہ کرنے والے افراد ان دونوں (شوہر و بیوی) کے ساتھ شرط قرار دیں کہ وہ جو بھی فیصلہ کریں گے وہ اسے قبول کریں گے۔ اگر وہ فیصلہ کریں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرلیں اور اگر وہ دونوں کے اکٹھا رہنے کا فیصلہ کریں تو وہ ان کے فیصلہ پر عمل کرتے ہوئے اکٹھے رہیں گے۔ (کتاب فروع کافی، جلد ششم، صفحہ ۱۴۶)

یہی مطلب اور اس سے قریب المعنیٰ روایت اسی کتاب (فروع کافی) اور تفسیر العیاشی میں دیگر اسناد سے منقول ہے۔

امیر المومنینؑ کا فیصلہ

تفسیر العیاشی میں ابن مسلم کی روایت مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے ایک خاتون کے بارے میں فیصلہ کیا جس نے ایک شخص سے شادی کی اور اس شخص

نے اس خاتون اور اس کے خاندان والوں سے شرط رکھی کہ اگر اس نے دوسری شادی کی اور اس سے علیحدگی اختیار کرلی یا کسی کو اپنی کنیزی میں لے لیا تو وہ خود کو طلاق یافتہ سمجھے، امامؑ نے اپنے فیصلہ میں فرمایا: تمہاری شرط سے پہلے ہی خدا نے شرط قرار دے دی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی شرط کو پورا کرے اور اگر چاہے تو اسے طلاق نہ دے اور اس کی موجودگی میں دوسری شادی کرلے یا کسی کو اپنی کنیزی میں لے لے اور اگر وہ یعنی پہلی زوجہ اس کے راستہ میں کھڑی ہو تو اس سے اپنی بے رغبتی ظاہر کرے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے: ''فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ'' (تم نکاح کرو عورتوں میں سے ان سے جو تمہیں بھلی لگیں دو دو، تین تین، اور چار چار) اور ارشاد ہوا: ''وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۖ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا'' (اور وہ عورتیں کہ تمہیں جن کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو تو انہیں نصیحت کرو اور انہیں ان کے بستروں پر بے رغبتی کا مظاہرہ کرو، اور انہیں مارو، پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو اُن سے بدلہ لینے کی راہ تلاش نہ کرو، یقیناً اللہ بہ ہی بڑا اور بزرگ تر ہے) اور ارشاد ہوا: ''احل لکم مما ملکت ایمانکم'' (اور تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں وہ عورتیں جو تمہاری کنیزی میں تمہاری ملکیت قرار پائیں)۔ (تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۴۰)

ایک سبق آموز واقعہ

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ بیہقی نے اسماء بنت یزید انصاری کی روایت ذکر کی ہے کہ وہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی جبکہ حضور ﷺ اپنے اصحاب کے درمیان تشریف فرما تھے، اس خاتون نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، میں خواتین کی نمائندگی میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں، میری جان آپ ﷺ پر قربان جائے اے اللہ کے رسول ﷺ! مشرق و مغرب میں رہنے والی جو عورت بھی میرا آپ ﷺ کی خدمت میں آنا سنے گی وہ بھی وہی کچھ کہے گی جو میں عرض کرنے آئی ہوں، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو برحق مبعوث فرمایا اور آپ ﷺ تمام مردوں اور عورتوں کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، ہم سب مرد اور عورتیں آپ پر ایمان لائے ہیں اور آپ ﷺ کے معبود پر ایمان لائے ہیں جس نے آپ ﷺ کو بھیجا ہے، ہم عورتیں گھر کی چار دیواری میں اپنے شوہروں کے ماتحت قرار دی گئی ہیں، ہم خانہ داری میں مصروف رہتی ہیں اور گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں اور آپ مردوں کی جنسی خواہشات کو پورا کرتی ہیں اور آپ (مردوں) سے اولاد کی حاملہ ہونے کی ذمہ داری نبھاتی ہیں، اور آپ سب مرد حضرات کو ہم پر کئی امور میں برتری دی گئی ہے مثلاً جمعہ و جماعات، مریضوں کی تیمارداری، جنازوں میں شریک ہونا، بار بار حج پر جانا، ان تمام اعمال سے افضل یہ کہ اللہ کی راہ

میں جہاد کرنا وغیرہ، اور جب آپ مردوں میں سے کوئی شخص حج یا عمرہ کے لئے جائے یا میدان جہاد کو نکلے تو ہم آپ لوگوں کے اموال کی حفاظت کرتی ہیں آپ کے کپڑے بناتی ہیں آپ کے اموال کو سنبھالتی ہیں ۔ بعض روایات میں ''اموال'' کی بجائے ''اولاد'' مذکور ہے، یعنی ہم آپ کی اولاد کی تربیت کے امور انجام دیتی ہیں، تو اس سب کچھ کے باوجود کیا ہم آپ مردوں کے ساتھ اجر وثواب میں شریک نہیں ہیں اے اللہ کے رسول ﷺ! اس وقت آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: کیا تم لوگوں نے اس خاتون کے سوال سے بہتر کوئی دینی بات اب تک سنی ہے؟ اصحاب نے عرض کی اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی عورت اس طرح کے اظہارات پیش کرے گی، اس وقت آنحضرت ﷺ اس خاتون کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے ارشاد فرمایا: اے خاتون، آپ واپس چلی جائیں اور تمام خواتین سے کہ جو اس طرح کی بات پوچھیں کہہ دیں کہ تم میں سے کسی بھی خاتون کا بہترین شوہر داری کرنا اور اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اس کی ہاں میں ہاں ملانا ان تمام امور واعمال کے برابر درجہ رکھتا ہے جو آپ نے مردوں کے حوالہ سے ذکر کئے ہیں، یہ سن کر وہ خاتون واپس چلی گئی جبکہ فرط مسرت سے اس کی زبان پر تہلیل وتکبیر کی آواز تھی، یعنی وہ لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر پڑھتی جا رہی تھی اور اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی (تفسیر ''در منثور'' جلد دوم، صفحہ ۱۵۳)

اس مضمون پر مشتمل کثیر روایات کتب حدیث میں شیعہ وسنی محدثین نے اپنے راویوں کے اسناد سے ذکر کی ہیں، اور ان میں سے سب سے زیادہ خوبصورت روایت وہ ہے جو کافی میں ابو ابراہیم حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: ''جهاد المرأة حسن التبعّل ''عورت کا جہاد، بہترین شوہر داری ہے، (ملاحظہ ہو: کتاب فروع کافی، جلد پنجم، صفحہ ۵۰۷) اس مطلب پر مشتمل جامع ترین الفاظ وہ ہیں جو نہج البلاغہ میں مذکور ہیں کہ ان میں خواتین کے بارے میں شریعت اسلامیہ میں مقررہ احکام کی بنیادی حقیقتیں بیان ہوئی ہیں (ملاحظہ ہو: نہج البلاغہ، صفحہ ۴۰۵) اس مطلب کو کتاب کافی میں، بحوالہ عبداللہ بن کثیر امام جعفر صادقؑ کے حوالہ سے امام علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا گیا ہے، (ملاحظہ ہو: کتاب فروع کافی، جلد پنجم، صفحہ ۵۱۰) اسی طرح کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے اصبغ بن نباتہ کے حوالہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے کہ امامؑ نے اپنے فرزند کے نام ایک مکتوب میں یوں تحریر فرمایا:

''المرأة ريحانة وليست بقهرمانة ''عورت پھول ہے پہلوان نہیں۔

اسی حوالہ سے ایک روایت آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انما المرأة لعبة من اتخذها فلا يضيعها ''عورت کھلونا ہے، جسے مل جائے وہ اسے ہاتھ سے نہ جانے دے۔ آنحضرت ﷺ اس مرد پر تعجب کا اظہار کرتے تھے جو عورت کو مارتا ہے اور پھر انہی ہاتھوں سے اس کے ساتھ معانقہ کرتا ہے۔

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابو مریم کی ایک روایت ذکر کی ہے جس میں امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام کا

بیان منقول ہے کہ انہوں نے کہا: قال رسول اللہ (ص) ایضرب احد کم المرأة ثم یظل معانقھا ؟ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی زوجہ کو مارے اور پھر انہی ہاتھوں سے اسے گلے لگائے، یعنی جن ہاتھوں سے اسے گلے لگاتا ہے تو پھر انہی ہاتھوں سے اسے کس طرح مارنے کی جرأت کرتا ہے۔

بہرحال روایات میں اس طرح کے بیانات کثرت کے ساتھ موجود ہیں اوران کے معانی میں غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام کا عورت کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟

خیر، اب ہم واپس اس موضوع کی طرف جاتے ہیں جو اسماء بنت یزید انصاری کے قصہ میں ملحوظ تھا، اگر اس میں اور اس سے مشابہ ان احادیث میں غور کریں جن میں خواتین کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دینی مسائل میں گفتگو کرنا اور خواتین کے مختلف حقوق کی بابت اسلامی احکام وآراء سے آگاہی حاصل کرنا مذکور ہے تو واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اُنہیں حجاب کے ساتھ اپنے امورِ خانہ داری کی بھرپور انجام دہی اور زندگی کے دیگر مسائل میں اپنی توانائیاں بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ اپنے مربوطہ مسائل کے حل کے لئے حاکم کے پاس جانا ہرگز ممنوع نہیں اور نہ ہی انہیں اس سے روکا گیا ہے کہ وہ اپنی نجی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کریں، بلکہ انہیں اس سلسلہ میں بھرپور آزادی حاصل ہے چنانچہ اسی آزادی فکر ونظر اور حریت عقیدہ واظہار سے متعلق مربوطہ مطالب ہم نے سورۂ آل عمران کی آخری آیات مبارکہ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ ذکر کئے ہیں۔

تین اہم نکات

اسماء انصاری کے قصہ اور اس سے مشابہ قصوں پر مشتمل احادیث سے تین اہم نکات معلوم ہوتے ہیں:

(۱) دین اسلام میں عورت کی زندگی میں پسندیدہ ترین عمل یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ امور خانہ داری اور اولاد کی تربیت کی ذمہ داریاں سنبھالے، یہ عمل اگرچہ واجب نہیں بلکہ مستحب ہے لیکن اس کی بابت اس قدر تاکیدات وارد ہوئی ہیں کہ اب تک اسے بقاء حاصل ہے کیونکہ دینی ماحول کا بنیادی تقاضہ ہی یہ ہے کہ زندگی کے امور اسی طرح انجام پذیر ہوں اور چونکہ عملی طور پر مسلمانوں کے معاشرہ میں جو چیزیں زیادہ توجہات کا مرکز بنتی ہیں وہ یہ ہیں، تقویٰ، رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش، دنیا کی لذتوں پر آخرت کے ثواب کو ترجیح دینا، خواتین کی نیک اخلاقی تربیت پر خصوصی توجہ مثلاً ان کی عفت و پاکدامنی، حیاء و محبت اولاد اور امور خانہ داری کی انجام دہی، لہٰذا ان امور میں ان کا مصروف وسرگرم عمل ہونا اوران پاکیزہ عواطف واحساسات

کی قوتوں کی عملداری کو یقینی بنانے پر اپنی توجہات مرکوز کرنا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے وجود میں ودیعت فرمائی ہیں، انہیں دیگر امور کی طرف توجہ کرنے سے مانع ہوتا ہے اور وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ کام نہیں کر پاتیں اور جن امور میں اللہ تعالیٰ نے انہیں باہم کام کرنے کی اجازت دی ہے ان میں بھی وہ شامل نہیں ہو سکتیں، اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب تک ان کے ہاں یہ طریقہ وطرزِ عمل اپنی اصل شکل میں صدیوں تک باقی رہا یہاں تک کہ مغربی ثقافتی یلغار نے آزادیٔ نسواں کے نام پر معاشرہ میں جو چمک دمک دکھائی اس کے نتیجہ میں خواتین اس کی اسیر ہو گئیں اور مسلمان معاشرہ اس کی زد میں آ گیا کہ پھر اہل اسلام لاشعوری طور پر اس سے وابستہ اور اس کے دلدادہ ہو گئے کہ البتہ انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس سے کس قدر ان کی اخلاقی قدریں پامال ہوئی ہیں اور زندگی تباہی کے کنارے جا پہنچی ہے، اسی مطلب کو قرآن مجید نے واضح لفظوں میں بیان کر دیا ہے کہ اگر اہل قریٰ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو خداوند عالم آسمان سے ان پر اپنی برکتیں نازل کرتا اور پھر وہ زمین و آسمان کی نعمتوں سے استفادہ کرتے لیکن انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا جس کے نتیجہ میں خود ہی مبتلا ہو گئے۔

(۲) اسلامی نظام حیات میں یہ بات واجب و لازمی ہے کہ خواتین جنگ و جہاد اور قضاوت کے امور انجام نہ دیں۔

(۳) اسلام میں جن اعمال سے عورتوں کو دور رہنے کا حکم دیا گیا ان کی تلافی نہایت عمدہ صورتوں کے ذریعے کی گئی کہ جس سے ان کی عزت و ناموس کی خاطر خواہ پاسداری یقینی ہو گئی چنانچہ اگر انہیں اللہ کی راہ میں جہاد اور میدانِ جنگ میں جانے کی فضیلت سے محروم کیا گیا تو اس کی جگہ دیگر وہ فضیلتیں عطا کر کے انہیں اعزاز بخشا گیا جو حقیقی معنی میں فضیلتیں ہیں مثلاً نیک شوہرداری کو ان کا جہاد قرار دیا گیا، اگرچہ ان فضیلتوں کو ہمارے اس فاسد معاشرہ میں کہ جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں کسی اہمیت کا حامل نہیں سمجھا جاتا لیکن اسلام نے جس زندگی کا تصور ہمیں دیا ہے کہ جس میں حقیقی اقدار کو حاکم قرار دیا گیا ہے اور ان انسانی فضیلتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اس میں ان امور کی قدر و منزلت بہت بلند ہے اور ان فضیلتوں کو ان کا صحیح مقام دیا گیا ہے کہ جو شخص جس قدر ان اقدار کو اپنائے اور خدائی پسندیدہ فضیلتوں کو اپنی عملی زندگی میں جگہ دے اتنا ہی اسے بلند مقام حاصل ہو گا چنانچہ جو شخص جس قدر انسانی خدمات انجام دے گا اس کے مطابق مقام و منزلت پائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر نیک عمل کی اثر گزاری کے درجات معین کر دیئے ہیں لہٰذا خدائی معیار کی بنیاد پر ہر عمل اپنی مخصوص حیثیت کے ساتھ اپنا اثر رکھتا ہے کہ اس سے مشابہ عمل کی اثر گزاری کی حیثیت یکساں ہو جاتی ہے مثلاً میدانِ جنگ میں شہادت کا درجہ پانا اور اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ دینا اپنی تمام تر عظمت کے باوجود عورت کے نیک شوہرداری کے عمل کے برابر ہے اس سے برتر نہیں، اسی طرح وہ مرد جو حکومت داری اور معاشرتی امور کی ذمہ داری کے فرائض انجام دیتا ہے اور قضاوت کی مسند پر بیٹھ کر فیصلے کرتا ہے وہ نیک شوہرداری کرنے والی خاتون سے برتری نہیں رکھتا کیونکہ حکومت داری و

قضاوت دو ایسے منصب ہیں کہ جو شخص ان کا حامل ہوتا ہے اگر وہ ان میں حق کے مطابق عمل کرے اور حقدار کو اس کا حق دلائے تب بھی تمام تر ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے اور وہ اس کا بوجھ اپنے اوپر لیتا ہے کہ جس سے ہر لحہ خطرات سے دوچار ہوتا ہے اور دنیا و آخرت میں جوابدہ قرار پاتا ہے کیونکہ ہر آن یہ خطرہ اس کے سامنے رہتا ہے کہ کہیں کسی مظلوم کا حق ضائع نہ وہ جائے اور کوئی بیچارہ کہ سوائے رب العالمین کے اس کا کوئی سہارا نہیں اپنے حق سے محروم نہ ہو جائے۔ ان ربك لبالمرصاد، تیرا رب گھات میں ہے۔ جب صورتحال اس طرح کی ہے تو پھر ان مناصب اور ذمہ داریوں کے حامل مردوں کو ان پر کیا برتری حاصل ہے جنہیں ان امور و اعمال سے روکا گیا ہے اور ان کے لئے دیگر امور و اعمال کی راہیں کھولی گئی ہیں کہ اگر وہ ان راہوں پر چلیں تو دُنیا و آخرت کی بھلائی ان کا مقدر بن سکتی ہے۔

بنابر ایں یہ منصب و ذمہ داریاں اور عہدے اسی صورت میں سربلندی کا موجب بن سکتے ہیں جب ان کے حامل افراد ان کو قبول کر کے ایثار کا ثبوت دیں یعنی یہ ذمہ داریاں پوری کرنے کو تیار ہوں کیونکہ ان میں جوابدہی کا سامنا ہے، لہٰذا کسی کا ان ذمہ داریوں کو قبول کرنا اس کی طرف سے معاشرہ کے افراد کے امور کا بوجھ اپنے کندھوں پر لینا ہے جو کہ بہت بڑا ایثار و قربانی ہے اور چونکہ معاشرہ میں مختلف امور و اعمال انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے مربوط ہوتے ہیں لہٰذا ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے والوں میں برتری و بڑائی کے سلسلے نہیں پائے جاتے بلکہ ہر شخص اپنے متعلقہ امور میں عملداری کا جوابدہ ہوتا ہے، انسانی معاشروں میں مختلف اعمال کی مختلف حیثیتوں کے حوالہ سے ان کے ذمہ دار افراد کی حیثیتوں کا تعین خود بخود ہو جاتا ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ جو مرد رضائے الٰہی کے حصول کے لئے تمام تر خطرات کے باوجود میدانِ جنگ کو جاتا ہے اور اس میں نہایت سخت و سنگین حالات کا سامنا کرتا ہے کہ دوسری جانب وہ عورت جو گھریلو امور اور تربیت اولاد کی بھاری بھرکم ذمہ داری سنبھالتی ہے دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کی حدود میں مخصوص حیثیتیں رکھتے ہیں لہٰذا ان کے درمیان تقابلی بحث ہو ہی نہیں سکتی بلکہ ہر شخص کو اس کے عمل کے تناظر میں دیکھا جائے گا اور اس معیار کے مطابق اس کی حیثیت کا تعین ہوگا جو اس نے اپنے عمل میں ملحوظ رکھی، مثلاً جو شخص میدانِ جنگ میں جاتا ہے یا حاکم حکومت داری کے امور کی ذمہ داری سنبھالتا ہے یا قاضی قضاوت کا بوجھ اُٹھاتا ہے تو ان کے اعمال ان کے اپنے معیاروں کے مطابق انجام پاتے ہیں چنانچہ جو شخص ان اعمال کو اللہ کی رضا کے لئے انجام دیتا ہے اس کے اعمال کا معیار حقیقی معنی میں چونکہ بلند ہوتا ہے لہٰذا اس کی حیثیت و منزلت بھی بلند ہوتی ہے اور اس کے لئے اعمال کی انجام دہی یا میدان جنگ میں شہید ہونا ایک عظیم اعزاز قرار پاتا ہے جبکہ اللہ کی رضا و خوشنودی کو خاطر میں نہ لانے والا شخص جب میدانِ جنگ میں جاتا ہے اور اس کی نگاہ میں یہ ہوتا ہے کہ وہ مارا جائے گا تو اس کا نام وطن کی خاطر جان قربان کرنے والوں کی فہرست میں لکھا جائے گا اور وہ اسے اپنے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہے حالانکہ یہ اس کی

موہوم سوچ اور بیہودہ اعزاز کے حصول کی تمنا ہے کیونکہ وہ تو موت کو فنا سمجھتا ہے تو پھر کس چیز پر ناز کرتا ہے؟ وہ نابود ہو کر اپنے اعزاز سے کیونکر لطف اندوز ہو گا؟ اسی طرح کی سوچ بے بنیاد معیار پر مبنی ہے اسی طرح کوئی فلمی ستارہ، سینماؤں کے آسمانوں پر اپنی چمک دکھاتا ہے کہ جس سے دیکھنے والے شائقین کی نظروں میں اس کا مقام کسی حکمران و سربراہ مملکت سے کم نہیں ہوتا جبکہ اس کا کام حقیقی معنی میں عورت کے مقام و منزلت کو پست ترین حد تک لے جانے کا سبب ہوتا ہے اور اس کی عزت و ناموس کو متاع کوچہ و بازار سے زیادہ کسی قیمت کا حامل نہیں رہنے دیتا بلکہ اس قدر پست ہوتا ہے کہ اس پر اسے سخت ترین سزا دی جاسکتی ہے، بنا بر ایں ہر عمل اپنے معیار کے مطابق مقام و حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور اسے اسی کے تناظر میں اہمیت ملتی ہے چنانچہ اچھائیاں برائیاں اور اعزازات کی بابت بھی یہی صورتحال ہے کہ ایک کام کسی معاشرہ میں اچھا سمجھا جاتا ہے جبکہ دوسرے معاشرے میں وہی کام برا قرار پاتا ہے، بعض معاشرے بعض نہایت ناچیز و معمولی کام کو بہت بڑا اور غیر معمولی سمجھتے ہیں لہٰذا عین ممکن ہے کہ ہم مسلمان کہ جو مغرب زدہ تہذیب و تمدن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں کسی ایسے کام کو جسے اسلام اچھا اور عظیم قرار دیتا ہے حقیر و ناچیز سمجھیں، اور جن امور و اعمال کو اسلام برا و پست قرار دیتا ہے اسے عظیم اور اچھا سمجھیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صدر اسلام میں جس معاشرہ اور مدینہ فاضلہ کی تشکیل دی گئی وہ تقویٰ و پرہیز گاری اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے پر مبنی تھا جس میں حقیقی معیاروں کی عملداری مطلوب تھی۔

آیات ۳۶ تا ۴۲

- وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ﴿۳۶﴾
- الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ۚ
- وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾
- وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَھُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِــيْمًا ﴿۳۹﴾
- اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْھَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾
- فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ۭ
- يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

ترجمہ

○ ''اور تم اللہ ہی کی پرستش کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہ دو، اور والدین کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کرو اور قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں، نزدیکی ہمسایوں، دور والے ہمسایوں، ہم نشینوں اور مسافروں کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کرو، اور ان کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کرو جو تمہاری ملکیت میں ہیں (غلام و کنیز) یقیناً اللہ کسی ایسے کو پسند نہیں کرتا جو اکڑنے والا، متکبر ہو''

(۳۶)

○ ''وہ لوگ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کرنے کی راہ پر لگاتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کیا ہے اسے چھپاتے ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت آمیز عذاب مقرر کر رکھا ہے۔''

(۳۷)

○ ''اور وہ لوگ اپنے اموال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اور شیطان جس کا ہم نشین بن جائے تو وہ بہت برا ہم نشین ہے۔''

(۳۸)

○ ''انہیں کیا ہو جائے گا اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئیں اور جو رزق اللہ نے انہیں عطا کیا ہے اس میں اسے انفاق کریں، اور اللہ ان سے بخوبی آگاہ ہے۔''

(۳۹)

○ ''اللہ تو ذرہ بھر کسی پر ظلم نہیں کرے گا، اگر ایک نیکی ہوگی تو وہ اسے کئی گنا کردے گا اور اپنی طرف سے عظیم اجر عطا کرے گا۔''

(۴۰)

○ ''اس وقت کیا صورتحال ہوگی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لے آئیں گے اور آپ کو ان سب پر گواہی کے لئے پیش کریں گے۔''

(۴۱)

○ ''اس دن کافروں اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کا ارتکاب کرنے والوں کی خواہش ہوگی کہ کاش وہ زمین کے ساتھ یکساں ہوجاتے، اور وہ اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہ کرسکیں گے۔''

(۴۲)

تفسیر و بیان

ان سات آیات مبارکہ میں نیکی و احسان کرنے اور خدا کی راہ میں انفاق کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور اس پر اجر و جزا کا خوبصورت وعدہ بھی کیا گیا ہے، اسی طرح نیکی و احسان نہ کرنے اور خدا کی راہ میں انفاق نہ کرنے کی مذمت کی گئی ہے خواہ انفاق نہ کرنے کی وجہ بخل ہو یا خدا کی رضا کی بجائے ریاکاری کی غرض سے انفاق کیا جائے، دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ خدا کی راہ میں انفاق نہیں ہوا۔

خدا کی پرستش کا امر اور شرک سے نہی

○ ''وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا''

(اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو)۔

حقیقی توحید یہی ہے کہ صرف اللہ کی پرستش کی جائے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہ دیا جائے، البتہ اس جملہ میں عملی توحید مراد ہے جو کہ نیک اعمال بجالانے سے عبارت ہے، اور انہی اعمال میں سے ایک یہ ہے کہ دوسروں پر احسان کیا جائے، آیت مبارکہ میں جس احسان کا ذکر ہوا ہے، اس سے مراد وہ پاکیزہ عمل ہے جس میں رضائے خداوندی کا حصول اور آخرت کا ثواب ملحوظ و مقصود ہو اور کسی قسم کی نفسانی خواہش کی پیروی کا دخل نہ ہو اور اپنے عمل میں اپنی خواہش کی پیروی کو خدا کا شریک نہ بنایا جائے۔

آیات مبارکہ سے عملی توحید کا مقصود ہونا اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ جملہ ''وَاعْبُدُوا اللّٰهَ'' کے بعد ''وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ

شَيْئًا" کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں اور پھر اسی مطلب کی تعلیل اس جملہ سے ہوئی: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا" (اللہ کسی اکڑنے والے، متکبر کو پسند نہیں کرتا) اس جملے "مُخْتَالًا فَخُوْرًا" کی بابت روایات میں مذکور ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے مال میں بخل سے کام لیتا ہے اور اگر انفاق کرتا ہے تو لوگوں کے دکھاوے کے لئے کرتا ہے، ایسے لوگ درحقیقت اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور اس کی یکتائی پر ایمان کے ساتھ اس کی عبادت نہیں کرتے۔

اس کے بعد یوں ارشاد ہوا: "وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا" (انہیں کیا ہو جائے گا اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں اور انفاق کریں) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا شرک دراصل ان کا آخرت پر ایمان نہ لانا ہے، یعنی ریاکار اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اپنی ریاکاری کے ذریعے اللہ کے ساتھ شرک کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔

اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہے:۔

○ سورۂ ص، آیت: ۲۶

"وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝" (اور آپ خواہشوں کی پیروی نہ کریں ورنہ وہ آپ کو اللہ کی راہ سے دور کر دے گی، جو لوگ اللہ کی راہ سے دور کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب مقرر ہے کیونکہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے)۔

اس آیت میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ خواہشوں کی پیروی کرنا گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ اور ہر شرک گمراہی ہے اور خواہشوں کی پیروی کا سبب یوم الحساب کو بھول جانا ہے۔

ایک آیت میں یوں ارشاد الٰہی ہوا:

○ سورۂ جاثیہ، آیت: ۲۳

"اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ"

(کیا تو نے اسے دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور خدا نے جانتے ہوئے اسے راہ سے دور کر دیا ہے؟)

اس آیت مبارکہ کے ذریعے خداوند عالم نے واضح فرمایا کہ نفسانی خواہشات کی پیروی کرنا دراصل ان کی عبادت و پرستش کرنے اور خدا کے ساتھ شریک قرار دینے سے عبارت ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عملی توحید سے مراد یہ ہے کہ انسان صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لئے عمل کرے اور یوم الحساب کی یاد تازہ رکھے کہ جو ثواب و عقاب کے ظاہر ہونے کا دن ہے، اور اس کے مقابلے میں عملی شرک یہ ہے کہ آخرت کے دن کی یاد دل سے بھلا دے کہ اگر وہ اس پر ایمان رکھتا تو اسے ہرگز نہ بھلاتا، اور

ثواب کے حصول کے لئے عمل کرنے کی بجائے کسی مالی فائدہ یا اپنی دولت کی چمک دمک ظاہر کرنے یا لوگوں سے اپنی تعریف کروانے کی غرض سے عمل کرے تو گویا ایسا شخص اپنے پروردگار کے مقابلے میں اپنی نفسانی خواہش کو مقدم و مقصود قرار دیتا ہے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔

لہٰذا اللہ کی عبادت اور عبادت میں اخلاص سے مراد یہ ہے کہ ہر عمل اس کی خوشنودی و رضا کے حصول کی غرض سے اور اس کی بارگاہ سے اجر و ثواب حاصل کرنے کے لئے انجام دیا جائے اور نفسانی خواہشوں کی تکمیل کو ہرگز ملحوظ و مدنظر قرار نہ دیا جائے۔

والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم

"وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا.......... أَيْمَانُكُمْ"

(اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کریں..........)

اس میں لفظ "إِحْسَانًا" بظاہر مفعول مطلق ہے جس کا فعل لفظوں میں مذکور نہیں، گویا اصل میں عبارت اس طرح ہے: "واحسنوا بالوالدین احسانًا" (اور تم والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو جس طرح نیک سلوک کرنے کا حق ہے)۔ عربی ادب میں لفظ احسان حرف بٓ اور حرف الیٰ دونوں کے ساتھ متعدّی ہو کر استعمال ہوتا ہے لہٰذا دونوں طرح سے یوں کہا جاتا ہے: "احسنت بہ، احسنت الیہ" (میں نے اس کے ساتھ احسان و نیکی کی، میں نے اس کی طرف احسان و نیکی کی) اور جملہ "وَبِذِي الْقُرْبَىٰ" اور اس کے بعد والے الفاظ کا عطف "الْوَالِدَيْنِ" کی طرف ہے۔ یعنی احسان کرو والدین کے ساتھ، اور قرابتداروں کے ساتھ، اور یتیموں کے ساتھ، اور مسکینوں کے ساتھ........ الخ۔

"ذوالقربیٰ" سے مراد قرابت دار ہیں۔

"الْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ" اور "الْجَارِ ذِي الْجُنُبِ" چونکہ ایک دوسرے کے ساتھ اور یکے بعد دیگرے ذکر ہوئے ہیں لہٰذا ان میں سے پہلے کا معنیٰ نزدیکی ہمسایہ اور دوسرے کا معنیٰ دور والا ہمسایہ ہے کیونکہ دونوں میں لفظ "الجار" یعنی ہمسایہ ذکر ہوا ہے لہٰذا "ذِي الْقُرْبَىٰ" سے قریبی ہمسایہ ہوگا کہ جو گھر سے نزدیک رہتا ہو اور "ذِي الْجُنُبِ" سے دور والا ہمسایہ ہوگا کہ جس کا گھر دور ہو۔ چنانچہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چالیس ذراع تک ہمسائیگی کی حد قرار دی ہے، اور ایک روایت میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چالیس گھروں تک ہمسائیگی قرار دی ہے، شاید ان دو روایتوں میں سے پہلی روایت قریبی ہمسایہ اور دوسری روایت دور والے ہمسایہ کے بارے میں ہو۔

''الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ'' سے مراد وہ شخص ہے جو پہلو میں بیٹھتا ہو، (ہم نشین) مفہومی طور پر سفر کے ساتھی اور دیوار با دیوار رہنے والے شخص پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

''ابْنِ السَّبِیْلِ'' سے مراد وہ شخص ہے جو سفر کی حالت میں نادار ہو گیا ہو، لفظی طور پر اس کا معنیٰ ''راستہ کا بیٹا'' ہے، اسے اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ راستہ میں ہے گویا کوئی ایسا نہیں جس کی طرف اس کی نسبی نسبت دی جاسکے لہٰذا اسے راستہ کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ اب جہاں تک اس کے نادار ہونے کا تعلق ہے کہ اس کے پاس زادراہ اور سفر کے اخراجات نہیں تو یہ بات لفظ ''ابْنِ السَّبِیْلِ'' کے مفہوم سے خارج ہے یعنی اس لفظ سے اس کا نادار ہونا نہیں سمجھا جاتا۔

''وَمَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ'' سے مراد زرخرید غلام اور کنیز ہے کیونکہ انہیں بھی ان لوگوں کی فہرست میں ذکر کیا گیا ہے جن پر احسان کئے جانے کا حکم دیا گیا ہے، یہاں یہ اہم نکتہ قابلِ ذکر و لائق توجہ ہے کہ عام طور پر زرخرید غلاموں اور کنیزوں کے بارے میں یہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں یعنی ''مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ'' یعنی اس میں لفظ ''من'' ذوی العقول (انسانوں) کے لئے اور لفظ ''مَا'' غیر ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں چونکہ افراد کی ملکیت کا مسئلہ ہے لہٰذا انسانیت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے لفظ ''من'' کی بجائے لفظ ''مَا'' استعمال ہوتا ہے، واللہ العالم۔

خود پرستی و تکبر کی مذمت

○ ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۳۶''
(یقیناً اللہ تعالیٰ خود پرست و متکبر کرنے والے شخص کو پسند نہیں کرتا)

لفظ ''مختال'' کا معنیٰ مغرور و متکبر، اپنے آپ میں گم، خود پرست اور صرف اپنے خیالات کی دنیا میں سرمست شخص ہے، اسی مناسبت سے گھوڑے کو ''خیل'' کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے چلنے میں سرمستی کا شکار ہوتا ہے اور غرور کے ساتھ چلتا ہے۔

لفظ ''فخور'' کا معنیٰ زیادہ فخر کرنے والا ہے۔

یہ دو صفتیں یعنی اپنے آپ میں سرمست و متکبر اور زیادہ فخر کرنا دراصل مال و جاہ و جلال کی محبت میں اسیر ہونے سے تعلق رکھتی ہیں، یعنی جو شخص دنیا کی دولت اور جاہ و سلطنت کا فریفتہ ہو وہی غرور و تکبر اور زیادہ فخر کرنے کی عادت کا شکار ہوتا ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کسی مغرور و متکبر کو پسند نہیں کرتا کیونکہ ایسے شخص کا دل غیر اللہ سے وابستہ ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کے بارے میں خود ہی وضاحت فرما دی کہ وہ ''یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ

فَضْلِهٖ........" (بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے اسے چھپاتے ہیں) اور "وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ" (وہ اپنے اموال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہی ہیں جو ان دو بری صفتوں کا شکار ہوتے ہیں یعنی خود پسندی و تکبر اور فخر کرنے ہی میں لگے رہنا، تو پہلی صفت والوں کے دل مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں اور دوسری صفت والے جاہ و جلال کے اسیر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں یعنی مال و دولت اور جاہ و جلال میں ایک طرح کی لازم و ملزوم جیسی وابستگی ہوتی ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ آیت مُبارکہ میں بخل کرنے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپانے کا تذکرہ بعد میں ہوا اور خود پسندی و تکبر کا ذکر پہلے ہوا ہے جبکہ طبع الکلام اس بات کی مُتقاضی تھی کہ پہلے بخل اور نعماتِ الٰہی کو چھپانے کا ذکر ہوتا اور بعد میں خود پسندی و تکبر کا تذکرہ ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس انداز اختیار فرما کر اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خُدا کا ایسے افراد کو پسند نہ کرنا ان کے خود پسند و متکبر ہونے کی وجہ سے ہے، جو کہ ان اعمال کے ارتکاب کے بنیادی اسباب ہیں۔

بخل کی مذمت

○ "اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ......."
(اور وہ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں)

اس جملے میں ان کے اپنے بخل جیسے قبیح فعل کا ارتکاب کرنے کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دینے کا ذکر ہوا ہے تو یہاں دوسروں کے بخل کا حکم دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی فاسد سیرت و کردار کے ذریعے گویا لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں خواہ لفظی طور پر کہیں یا زبان سے تو خاموش رہیں اور ان کا عمل ہی ایسا ہے کہ کہا جا سکتا ہے وہ لوگوں کو بخل کے ارتکاب کا حکم یا ترغیب دلاتے ہیں کیونکہ ان کے مالدار دولتمند افراد ہونے کی وجہ سے لوگ ان کا قرب حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں اور اپنی لالچی طبیعتوں کی وجہ سے ان کے سامنے اظہارِ عجز و خضوع کرتے ہیں لہٰذا ان افراد کا ہر فعل ان کے قول کی طرح اپنا اثر ظاہر کرتا ہے خواہ بخل کرنے کے حوالہ سے ہو یا اللہ کی راہ میں انفاق سے روکنے کے حوالہ سے ہو، اور جہاں ان کے نعمات الٰہی کو چھپانے کا تعلق ہے تو اس سے مُراد یہ ہے کہ جہاں انفاق اور خرچ کرنے کا موقع ہوتا ہے اور لوگ ان سے سوال کرتے ہیں تو وہ اپنے نادار ہونے کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں لوگوں کی طرف سے سوال کرنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور دوسری جانب وہ اس بات سے بھی ڈرتے ہیں کہ اگر کسی کو نہ دیں تو کہیں کوئی انہیں نقصان نہ پہنچائے اور ان کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہو، اس کے علاوہ اگر لوگوں سے یہ نہ کہیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے تو عین ممکن ہے کہ لوگ ان کے

اموال لوٹ نہ لیں، گویا جان و مال کے خطرہ کی وجہ سے وہ اپنے فقر و ناداری کا جھوٹا اظہار کرتے ہیں، تو یہ بات اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو چھپانے کا دوسرا نام ہے۔

اور ''وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا'' میں ''کافروں'' سے مُراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی ان نعمتوں کو چُھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں عطا فرمائی ہیں، تو یہاں ''کفر'' سے اس کا لغوی معنیٰ مقصود ہے یعنی چھپانا، چنانچہ عام اصطلاح میں جسے کافر کہا جاتا ہے اس میں بھی یہی معنیٰ ملحوظ ہے یعنی حق کا انکار کرتے ہوئے اسے چھپانے والا۔

ریاکاری کرنے والوں کا تذکرہ

○ ''وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ.........الخ''

(اور وہ اپنے اموال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں.......)

اس میں ریاکاری کرنے کے عمل کا تذکرہ ہوا ہے کہ وہ اپنے اموال اللہ کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لئے خرچ نہیں کرتے بلکہ لوگوں کے دکھاوے کی غرض سے خرچ کرتے ہیں، آیت مبارکہ میں یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ انفاق میں ریاکاری، یا ہر کام میں ریاکاری، اللہ کے ساتھ شرک سے عبارت ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص اللہ پر ایمان ہی نہیں رکھتا کیونکہ وہ اپنے عمل سے لوگوں کو ملحوظ خاطر قرار دیتا ہے اور انہی سے اپنے کئے کی تعریف چاہتا ہے اور اس کا ایسا کرنا عمل کے حوالہ سے بھی شرک ہے کیونکہ ریاکار اپنے عمل سے آخرت کا ثواب بھی نہیں چاہتا بلکہ اس کی نظر صرف اور صرف دُنیاوی نتائج و فوائد پر مرکوز ہوتی ہے، اسی بناء پر ریاکار کو شیطان کا ساتھی قرار دیا گیا ہے جو کہ نہایت بُرا ساتھی ہے۔

اظہارِ افسوس و حیرت

○ ''وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا.........''

(اور انہیں کیا ہوتا کہ اگر وہ ایمان لے آتے......)

یہ جملہ سوالیہ ہے جو کہ افسوس و حیرت دونوں کے اظہار کے لئے ہے۔ آیۂ مبارکہ سے اس مطلب کا ثبوت ملتا ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق سے منہ موڑنا اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر حقیقی ایمان نہ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے اگرچہ ظاہر بظاہر ایمان کا دعویٰ ہوتا ہے۔

خدا کا بخوبی آگاہ ہونا

○ ''وَ کَانَ اللّٰہُ بِھِمۡ عَلِیۡمًا''

(اور اللہ ان سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے)

یہ جملہ بعد والی آیت میں ذکر کئے جانے والے مطالب کی تمہید کے طور پر ہے، اگرچہ معنی کے حوالہ سے یہ جملہ، حالیہ بنتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے: حالانکہ خدا ان سے بخوبی آگاہ ہے۔

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا

○ ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ''

(اللہ ہرگز کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا)

لفظ ''مِثۡقَالَ'' وزن کے معنی میں ہے۔

لفظ ''ذَرَّۃٍ'' کا معنی سرخ رنگ کی سب سے چھوٹی چیونٹی ہے۔ یا اس کا معنی ہوا میں اڑتا ہوا غبار ہے جو ہمیشہ نہایت چھوٹا سا دکھائی دیتا ہے، یہاں لفظ ''مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ'' عبارت میں مفعول مطلق کا قائم مقام ہے، بنا بر ایں عبارت کو اس طرح فرض کریں تو معنی واضح ہو جاتا ہے: ''ان اللہ لا یظلم ظلمًا یعدل مثقال ذرۃ وزنًا'' خدا ہرگز ظلم نہیں کرتا خواہ وہ ظلم ایک ذرہ کے برابر وزن کیوں نہ رکھتا ہو۔ (ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا)

نیکی کا دگنا صلہ

○ ''وَاِنۡ تَکُ حَسَنَۃً......''

(اور اگر وہ نیکی ہو......)

لفظ ''حَسَنَةً'' پیش کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے ''حسنةٌ'' اور زبر کے ساتھ بھی پڑھایا گیا ہے ''حسنةً'' پہلی قرائت کی بناء پر ''تَكُ'' میں حرف ''کان'' تامہ ہوگا اور دوسری قرائت کی بناء پر حرف ''کان'' ناقصہ ہوگا اور اس صورت میں اس کا اسم اور خبر فرض کر کے عبارت یوں قرار پائے گی: ''وان تکن المثقال حسنة لضاعفها'' کہ اگر وہ مثقال، حسنہ و نیکی ہو تو خدا اسے دُگنا کردے گا، اور یہاں ضمیر مؤنث ''تَكُ'' لانے کی وجہ یا تو ''کان'' کا اسم کہ جو حقیقت میں اس فعل مؤنث کا فاعل ہے اس نے اپنے مضاف الیہ یعنی ''ذَرَّةٍ'' سے صیغۂ تانیث حاصل کیا ہے۔

آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت سابقہ استفہامی جملہ (وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا........) کے سبب کو بیان کرنے کے مقام میں ہے، لہٰذا اسے فہم المعنی کی غرض سے یوں فرض کرنا ہوگا: ''ومن الاسف علیهم ان لم یؤمنوا ولم ینفقوا فانهم لو اٰمنوا وانفقوا والله علیم بهم لم یکن الله لیظلمهم فی مثقال ذرة انفقهوا بالاهمال وترك الجزاء، وان تك حسنة یضاعفها'' ان پر افسوس ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے اور انفاق نہیں کیا، کیونکہ اگر وہ ایمان لاتے اور انفاق کرتے کہ اللہ ان سے بخوبی آگاہ ہے تو ان پر ہرگز ذرہ برابر ظلم نہ کرتا اگر انہوں نے انفاق کیا ہوتا، اللہ ان کے عمل کو بے نتیجہ نہ چھوڑتا اور انہیں جزاء سے محروم نہ کرتا، بلکہ اگر ان کا انفاق حسنہ ہوتا تو خدا اسے دگنا کردیتا (واللہ اعلم)

گواہی کا حوالہ

○ ''فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ........''

(تو اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لے آئیں گے......)

اعمال پر گواہی کے حوالہ سے بعض مربوطہ مطالب ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ ''لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'' کی تفسیر میں ذکر کئے ہیں، آپ المیزان جلد اول میں مربوطہ مقام پر ان مطالب سے آگاہ ہوسکتے ہیں، اس موضوع سے مربوط بعض دیگر مطالب عنقریب اس کے موزوں مقام پر ذکر کئے جائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کرنے والے

○ ''يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ ....''

(اس دن وہ لوگ کہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی.......)

اس جملے میں کہا گیا ہے کہ جنہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی، تو اس سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان فرامین کی نافرمانی مراد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولایت وحاکمیت الٰہیہ کی بنیاد پر صادر فرمائے، اس سے احکام شریعت میں خدا کی نافرمانی مراد نہیں۔

جملہ ''لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ'' موت سے کنایہ کے طور پر ہے یعنی نابود ہو جانا، یہ اسی طرح ہے جیسے درج ذیل آیت میں مذکور ہے:

سورۂ نباء، آیت: ۴۰

○ ''وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا''

(اور کافر کہے گا اے کاش، میں خاک ہوتا)

کافروں کا اظہارِ افسوس

○ ''وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴿۴۲﴾''

(اور وہ اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہ کرتے)

آیت کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ ''يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' پر عطف ہے، اس عطف سے یہ فائدہ مطلوب ومقصود ہے کہ کافروں کی طرف سے موت کی تمنا کرنے کا سبب واضح ہو سکے اور وہ یہ کہ قیامت کے دن جب وہ اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو ان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ ومخفی نہ ہوگی کیونکہ ان کے تمام اعمال خُدا کے سامنے حاضر ہوں گے اور ان کے اعضاء بدن ان کے خلاف گواہی دیں گے، اس کے ساتھ ساتھ انبیاء وملائکہ بھی ان کے خلاف گواہی دیں گے، ان تمام گواہوں کے اوپر اللہ تعالیٰ ان پر محیط ہوگا تو اس وقت وہ چاہیں گے کہ اے کاش وہ موجود ہی نہ ہوتے، اور وہ اپنے اعمال اور قبیح افعال اپنی آنکھوں کے سامنے مشاہدہ کریں گے تو اپنے آپ سے کہیں گے کہ اے کاش، وہ کوئی بات اللہ سے نہ چھپاتے۔

اس مقام پر ایک نکتہ قابل ذکر ولائق توجہ ہے کہ سورۂ مجادلہ آیت ۱۸ میں یوں مذکور ہے: ''يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ'' (اس دن اللہ ان سب کو قبروں سے اُٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے اسی طرح قسمیں کھائیں گے جس طرح وہ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں) تو انشاء اللہ اس موضوع کے بارے میں عنقریب واضح طور پر بیان کیا جائے گا کہ ان کا ایسا کرنا ان کے اسی جھوٹ بولنے کی پختہ عادت کی وجہ سے ہوگا جو انہوں نے دُنیاوی زندگی میں اپنے باطن میں راسخ کر لی نہ یہ کہ اللہ سے کچھ چھپانے کی غرض سے ہے کیونکہ اس دن ان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔

روایات پر ایک نظر

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علیؑ

آیۂ مبارکہ "وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا" کی تفسیر میں سلام الجعفی سے منقول ہے کہ امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا، اور ابان بن تغلب سے منقول ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (اس میں والدین سے مراد یہ دو ہستیاں ہیں)۔ (تفسیر العیاشی اور مناقب ابن شہر آشوب)

تفسیر العیاشی میں مؤلف نے مذکورہ بالا روایت ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسی روایت کے مانند ابن جبلہ سے منقول ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ "میں اور علی اس امت کے دو باپ ہیں" (انا وعلی ابوا ھذہ الامۃ)

اور تفسیر البرہان میں بحرانی نے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ روایت کتاب الفائق میں بھی مذکور ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر البرہان جلد اول صفحہ ۳۶۹)

نجاشی نے یہ مطلب ابوبصیر کے حوالہ سے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے ذکر کیا ہے، اور ابن شہر آشوب نے بھی امام محمد باقرؑ سے بحوالہ ابان ذکر کیا ہے، اس روایت کا مضمون، باطنِ قرآن کے اس معنی سے مطابقت بلکہ اس کا حصہ ہے جسے ہم نے المیزان کی تیسری جلد میں محکم و متشابہ کی بحث کے ضمن میں تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد گرامی قدر کی روشنی میں یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ چونکہ باپ یا والد انسان کے بشری وجود میں آنے کا سرچشمہ اور اس کی تربیت کرنے والا ہوتا ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کا معلم اور اس کے کمالات کا سرچشمہ اس کا باپ ہے تو اس بناء پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علیؑ ہر اس مؤمن کے لئے باپ کہلانے کا زیادہ حق رکھتے ہیں جس نے ان سے ہدایت حاصل کی اور ان کے علوم و معارف کے مقدس انوار سے بہرہ ور ہوا، اس حوالہ سے ان کا مقام و مرتبہ اس جسمانی باپ سے کہیں زیادہ بلکہ قابل قیاس ہی نہیں کہ جس کی حیثیت جسمانی وجود اور اس کی نشو و نما کا سرچشمہ ہونے سے زیادہ کچھ نہیں جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و وصیؑ اس کی انسانیت و سربلندی اور اخروی سعادت کا سرچشمہ ہیں لہٰذا وہ حقیقی معنی میں باپ ہیں، بنا بر ایں جن آیات مبارکہ میں اولاد کو والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس میں حقیقی و باطنی حوالہ سے یہ دو ہستیاں بھی شامل ہیں اگرچہ ان کا شمار ظاہری جسمانی باپ کے طور پر نہیں ہوتا۔

اور تفسیر العیاشی میں ابو صالح کے حوالہ سے ابو العباس کا بیان منقول ہے کہ انہوں نے "الْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ

الْجُنُبِ'' کی تفسیر میں کہا کہ ان سے مراد وہ ہمسایہ ہے جس کے ساتھ آپ کی قرابتداری نہ ہو اور ''الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ'' سے مراد سفر کا ساتھی ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی، جلد اول صفحہ ۲۴۱)

اس روایت میں ''الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی'' اور ''الْجَارِ الْجُنُبِ'' دونوں سے وہ ہمسایہ مراد لیا گیا ہے جو قرابتدار نہ ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی بازگشت صرف ''الْجَارِ الْجُنُبِ'' کی طرف ہو، اور اس روایت میں ''الْجَارِ الْجُنُبِ'' سے ہمسفر مراد لینا شاید اس کے ایک مصداق کو بیان کرنے کے طور پر ہو۔

قیامت کے دن کا حال

مسعدہ بن صدقہ سے روایت منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے جد بزرگوار کے حوالہ سے بیان فرمایا کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے قیامت کے دن اور اس کی وحشت ناک حالت بیان کرتے ہوئے اپنے ایک خطبہ میں یوں ارشاد فرمایا: ''ختم علی الافواہ فلا تکلم، وتکلمت الایدی، وشھدت الارجل، وانطقت الجلود بما عملوا فلا یکتمون اللہ حدیثاً'' (اس دن منہ پر مہریں لگا دی جائیں گی تو وہ بول نہیں سکیں گے، اور ہاتھ بولیں گے، پاؤں گواہی دیں گے، جسم کا چمڑا بول کر بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ انجام دیا، لہٰذا وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ پائیں گے (ملاحظہ ہو: تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۴۲)

دو اہم اور قابلِ توجہ مطالب

زیر بحث آیات مبارکہ کے حوالہ سے دو اہم ترین مطالب قابلِ توجہ ہیں: (۱) اہل سنت کی کثیر روایات میں بیان ہوا ہے کہ یہ آیات یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اگرچہ اس مطلب کی تائید وتصدیق آیات کے ذیل میں مذکورہ ان مطالب کی تائید وتصدیق آیات کے ذیل میں مذکورہ ان مطالب سے ہوتی ہے جن میں اہل کتاب کی بری عادات کی نشاندہی کی گئی ہے مثلاً ان کا بخل اور مال کا لالچ و دولت کا جمع کرنا، اسی طرح مؤمنین کے دلوں میں وسوسے ڈالنا اور انہیں اللہ کی راہ میں انفاق کرنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا اور انہیں ذلیل و رسوا کرنا، اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوامر و ارشادات کو غلط و نادرست قرار دینے کی مذموم سازشیں کرنا وغیرہ، لیکن اس سب کچھ کے باوجود ان روایات سے صرف ان آیات کا یہودیوں پر منطبق ہونا ثابت ہوتا ہے نہ یہ کہ یہ آیات الٰہی ان کے بارے میں نازل ہوئی ہوں، البتہ یہ بات عام

طور پر آیات کے اسبابِ نزول کے بارے میں وارد ہونے والی روایات میں پائی جاتی ہے کہ وہ حقیقت میں شان نزول کی بجائے موضوع کی تطبیق کے موارد کی نشاندہی کرتی ہیں اصل شانِ نزول کے بیان پر مبنی نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے ہم نے ان روایات کی کثرت کے باوجود انہیں یہاں ذکر نہیں کیا۔

(۲) حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے والدین، قرابتداروں، یتیموں اور آیت میں مذکور دیگر افراد کے ساتھ نیکی واحسان کرنے کے بارے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں وہ مشہور و معروف ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر زیادہ ہیں کہ شمار کرنے سے بالاتر ہیں، اسی وجہ سے ہم نے ان سب کو یہاں ذکر کرنے سے چشم پوشی کی کیونکہ ان میں سے ہر روایت قرآن مجید کے کسی موضوع سے مخصوص ہے لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا کہ ان روایات کو ان کے مخصوص مقام پر ہی ذکر کیا جائے۔

آیت ۴۳

○ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳

ترجمہ

○ ''اے ایمان والو، تم نشہ کی حالت میں نماز کے نزدیک بھی نہ جاؤ جب تک کہ تمہیں علم نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اور نہ ہی جنب کی حالت میں ___ نماز کے قریب جاؤ ___ سوائے اس کے کہ وہاں سے گزر رہے ہو، یہاں تک کہ غسل کرلو، اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے بیویوں سے ملاپ کیا ہو اور تمہیں پانی مُیسر نہ آئے تو تم پاک گرد سے تیمم کرلو اور اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو، یقیناً اللہ درگزر کرنے والا، معاف کرنے والا ہے۔''

(۴۳)

تفسیر و بیان

اس سے پہلے سورۂ بقرہ آیت ۲۱۹ ''يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ'' (آپ سے شراب اور جوا کے بارے میں پوچھتے ہیں) کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ پانچ قسم کی آیات میں شراب کے حوالے سے بات ہوئی ہے کہ اگر ان پانچ قسم کی آیات مبارکہ کو ایک دوسری کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت (۴۳) ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى'' سورۂ نحل کی آیت ۶۷ ''تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا'' (تم اس سے شراب اور اچھا رزق حاصل کرتے ہو) اور سورۂ اعراف کی آیت ۳۳ ''قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ'' (کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے تمام برائیوں کو خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوں اور گناہ کو حرام قرار دیا ہے) کے بعد نازل ہوئی اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ ''يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ؗ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا'' (آپ سے شراب اور جوا کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فوائد ہیں جبکہ ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑا ہے) اور سورۂ مائدہ کی آیت ۹۰ ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ'' (اے ایمان والو، شراب، جوا، غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنے کے لئے مخصوص کئے گئے بت، فال نکالنے کے تیر رجس و گندگی ہے اور شیطانی اعمال ہیں ان سے دوری اختیاری کرو) سے پہلے نازل ہوئی، اور یہ آیت (یعنی سورۂ مائدہ آیت ۹۰) شراب کے بارے میں نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔

البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری ذکر کردہ ترتیب کے علاوہ دوسری ترتیب سے آیات کا نزول ہوا ہو اور وہ یوں کہ پہلے سورۂ نحل کی آیت، پھر سورۂ اعراف کی آیت، پھر سورۂ نساء کی آیت اور پھر سورۂ مائدہ کی آیت نازل ہوئی ہو جن میں شراب کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اس بناء پر شراب نوشی کی قطعی و یقینی حرمت کا حکم اس ترتیب سے مختلف ہوگا جو سابقاً ہم نے ذکر کی ہے اور وہ اس طرح سے کہ جونہی سورۂ اعراف میں وارد ہوئی اس میں تفسیر و وضاحت مذکور نہیں، پھر جونہی سورۂ بقرہ میں وارد ہوئی وہ مزید قطعی صورت میں تھی لیکن مسلمان اس سے اجتناب برتنے میں پس و پیش کرتے تھے لہٰذا سورۂ نساء میں اس کی بابت نماز کے حوالہ سے حکم نازل ہوا کہ جب تم نشہ میں ہو تو نماز کے نزدیک بھی نہ جاؤ، گویا اس میں مزید سختی و پختگی کے ساتھ

اس قبیح عمل سے ممانعت کا حکم صادر ہوا اور پھر سورۂ مائدہ میں صرف نماز ہی نہیں بلکہ تمام حالات میں اس سے ممانعت کا حکم صادر ہوا تا کہ وہ یہ گمان نہ کرنے لگیں کہ نماز کے علاوہ دیگر حالات میں شراب خوری ممنوع نہیں۔ لیکن اگر قارئین کرام بخوبی غور کریں اور آیات کے مضامین و مندرجات کے بارے میں تدبر کریں تو وہ سابقہ ترتیب کو ہی ترجیح دیں گے اور یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سورۂ بقرہ میں شراب نوشی کی حرمت کے صریح حکم کے بعد دوبارہ صرف نماز کی حالت میں اس کی ممانعت کا حکم ذکر کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، لہٰذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت (سورۂ نساء ۴۳) سورۂ بقرہ کی آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے ممانعت تھکن و شدید بے حالی کی حالت میں نماز پڑھنے کے بارے میں ہے تو یہ دوسری بات ہے کہ جسے بعض روایات میں ذکر کیا گیا ہے اور عنقریب وہ پیش کی جائیں گی۔

ایک علمی وموضوعی بحث

زیر نظر آیۂ مبارکہ کے حوالہ سے جو مطالب اب تک ذکر کئے گئے ہیں اُن کے تناظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت کا محل وقوع ایسا ہے کہ اس سے ماقبل آیات اور مابعد آیات کے مضامین وموضوعات پر غور کریں تو اس کی بابت یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جملہ معترضہ کے طور پر ہے، البتہ یہاں ایک احتمال یہ بھی دیا گیا ہے جس سے اس آیت کے جملہ معترضہ ہونے کی صحت واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ عین ممکن ہے کہ چند آیات جو ایک ہی سیاق کی حامل ہوں اور ایک دوسری سے ملی جلی اور باہم وابستگی و پیوستگی رکھتی ہوں وہ تدریجی صورت میں یعنی یکے بعد دیگرے چند ہی دنوں میں نازل ہوئی ہوں اور انہی ایام میں کسی دوسرے حکم کی ضرورت سامنے آئی ہو کہ جس کے لئے کوئی نئی آیت یا آیات نازل کی جائیں، پھر جب ان آیات پر نگاہ کریں کہ جو ایک ہی سیاق کی حامل ہوں تو نئی آیت ایک جملہ معترضہ کے طور پر سامنے آئے کہ جس سے ممکنہ تو ہم دور ہو یا درپیش ضرورت پوری ہو، اس کی مثال درج آیت میں ملاحظہ ہو:

سورۂ قیامۃ، آیات ۱۴ تا ۲۰:

○ ''بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ﴿۱۵﴾ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴿۱۹﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾''

(بلکہ انسان خود اپنے آپ سے بخوبی آگاہ ہے، خواہ وہ بہانے تراشتا رہے، آپ اس کی بابت جلدی کرتے ہوئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، یقیناً اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارا ہی کام ہے، پس جب ہم اسے پڑھ لیں تو آپ اسے پڑھنے کا کام کریں، پھر اس کا بیان ہمارا کام ہے، نہیں، بلکہ تم لوگ دُنیاوی زندگی ہی کو پسند کرتے ہو)

بنا برایں اب آیۂ زیر نظر کے اپنی ماقبل اور مابعد آیتوں سے ربط ووابستگی کی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآنِ مجید تدریجاً نازل ہوا ہے لہٰذا اس طرح کے ربط ووابستگی کو صرف انہی سورتوں میں پاسکیں گے جو دفعتاً نازل ہوئیں یا جن کی آیات ایک دوسری سے پیوستگی کی واضح علامات کی حامل ہیں، ان کے علاوہ دیگر آیات اور سورتوں میں باہمی موضوعی ارتباط سے آگاہی کے حصول کے لئے اپنی توانائیاں بروئے کار لانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جانے کا حکم

○ ''یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْالَاتَقْرَبُواالصَّلٰوۃَوَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْامَاتَقُوْلُوْنَ''
(اے ایمان والو، نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو)۔

اس آیت میں لفظ ''الصَّلٰوۃَ'' سے مراد مسجد ہے، اس کا ثبوت یہ جملہ ہے: ''وَلَاجُنُبًااِلَّاعَابِرِیْ سَبِیْلٍ'' (اور نہ ہی جنابت کی حالت میں، سوائے اس کے کہ راستہ عبور کر رہے ہو) یہاں لفظ ''صلوٰۃ'' (نماز) سے مجازاً مسجد مراد ہونے کا ثبوت یہ جملہ ہے: ''حَتّٰی تَعْلَمُوْامَاتَقُوْلُوْنَ'' (تا کہ تمہیں معلوم ہو کہ کیا کہہ رہے ہو) کیونکہ اگر یوں کہا جاتا: ''لَاتَقْرَبُواالصَّلٰوۃَوَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی'' (اور تم نشہ کی حالت میں مسجد کے نزدیک نہ جاؤ) تو اس کے لئے یہ الفاظ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی: ''حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ'' (تا کہ تمہیں معلوم ہو کہ کیا کہہ رہے ہو) البتہ ممکن ہے کہ ان الفاظ سے کوئی دوسرا معنیٰ مقصود ہو جو کہ متکلم کا مقصود نہ ہو جبکہ مقصود یہ ہے کہ اس مطلب کی طرف توجہات مبذول کروائی جائیں کہ اے اہل ایمان، تم نماز کی حالت میں اپنے پروردگار کے حضور اس کی عظمت و کبریائی کے سامنے حاضر ہوتے ہو اور تم رب العالمین سے محوِ گفتگو ہوتے ہو لہٰذا تمہیں زیب نہیں دیتا کہ تم نشہ کی حالت میں ہو اور شراب کی گندگی و پلیدی سے اپنی عقلوں کو کھو دو کہ پھر تمہیں معلوم ہی نہ ہو کہ کیا کہہ رہے ہو، تو یہ بات اس کی متقاضی ہے کہ یہ کہا جائے کہ تم نماز کے نزدیک نہ جاؤ جبکہ تم نشہ کی حالت میں ہو، لیکن عام طور پر چونکہ نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کی جاتی ہے۔ نماز کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا سنت ہے۔ اور مقصود یہ بھی تھا کہ جب شخص کے مسجد میں داخل ہونے کے احکام بیان ہوں لہٰذا مختصر جملے میں اس طرح ارشاد ہوا: تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔

بنا برایں جملہ ''حَتّٰی تَعْلَمُوْامَاتَقُوْلُوْنَ'' (تا کہ تم جان لو کہ کیا کہہ رہے ہو) دراصل شراب خوری کی ممانعت کے حکم کی وجہ کے بیان پر مشتمل ہے کہ وہ نماز پڑھنے تک باقی ہو تو تمہیں اس حال میں نماز کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے یعنی ہم نے تمہیں شراب خوری سے اس لئے منع کیا ہے کہ تمہیں نماز معلوم رہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو، لہٰذا جملہ ''حَتّٰی تَعْلَمُوْامَاتَقُوْلُوْنَ''

(تا کہ تمہیں معلوم ہو کہ کیا کہہ رہے ہو، نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کے سبب و وجہ کو بیان کرتا ہے نہ کہ حکم کی حد کا تعین کرتا ہے یعنی اس سے مراد یہ نہیں کہ تم اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک نشہ میں ہو اور جب تک تمہیں معلوم نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو لیکن جب تمہیں معلوم ہو کہ کیا کہہ رہے ہو تو کوئی حرج نہیں، بلکہ اصل شراب خوری کے حرام ہونے کی وجہ کو بیان کرتا ہے، اور جملہ "وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ " تا آخر آیت، کے بارے میں تفصیلی بیان سورۂ مائدہ کی آیت ۶ (یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ........) کی تفسیر میں پیش ہوگا۔

روایات پر ایک نظر

تفسیر العیاشی کی ایک روایت

محمد بن فضل نے ابوالحسن علیہ السلام سے روایت کی ہے آپؑ نے آیہ مبارکہ "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: یہ آیت شراب کی حرمت کا حکم صادر ہونے سے پہلے نازل ہوئی (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۴۲)

اس روایت کے بارے میں موزوں یہ ہے کہ اس میں شراب کے حرام کئے جانے سے اس کی تحریم کی وضاحت مراد لی جائے ورنہ اس کا معتبر ہونا مخدوش ہو جائے گا کیونکہ اس سے کتاب اللہ کی صریح مخالفت ثابت ہوگی اور وہ اس طرح کہ سورۂ اعراف میں صریح الفاظ میں شراب کی حرمت اس کے گناہ ہونے کے طور پر بیان ہوئی ہے اور سورۂ بقرہ میں واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے کہ شراب میں بہت بڑا گناہ ہے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت کا حکم ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں نازل ہوا کیونکہ سورۂ اعراف کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا جبکہ زیر نظر آیت یعنی سورۂ نساء ۴۳ کے بارے میں سب کی متفقہ رائے ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس روایت کے مانند متعدد روایات اہل سنت کے اسناد سے وارد ہوئی ہیں جن میں صریح طور پر مذکور ہے کہ یہ آیت شراب کی حرمت کے حکم سے پہلے نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس روایت میں یہ مطلب ملحوظ ہو کہ سستی و بے حالی کے ساتھ نماز نہ پڑھو۔

امام محمد باقرؑ کا فرمان

زرارہ نے امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ سستی و کاہلی، بے خیالی و بدحالی اور شکم سیری کی حالت میں نماز نہ پڑھو کیونکہ اس سے نفاق میں مبتلا ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو مستی و بے حالی میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، مستی و بیحالی سے یہاں مراد نیند کا غلبہ طاری ہونا ہے (بحوالہ تفسیر العیاشی ج ۱، ص ۲۴۳)

اس روایت میں امامؑ نے فرمایا کہ ان حالتوں میں نماز پڑھنے سے نفاق میں مبتلا ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں ایمان والوں سے خطاب ہوا ہے (یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ....) لہٰذا اس میں مذکور حکم کی نافرمانی و سرکشی کرنے والا مؤمن نہیں ہوسکتا بلکہ منافق ہے، کیونکہ کوئی مؤمن فرمان خداوندی کی مخالفت نہیں کرتا، اور روایت میں مستی و بے حالی سے مراد نیند کا غلبہ لیا گیا ہے جو کہ عین ممکن ہے امامؑ کی بجائے خود راوی کا بیان ہو اور یہ بھی ممکن ہے امامؑ ہی کا بیان ہو کہ جو آیت کی باطنی تفسیر قرار پائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستی و بیحالی سے مراد نیند ہی ہو تو اس صورت میں آیت کی ظاہری تفسیر قرار پائے گی۔ البتہ دیگر روایات میں مستی سے مراد نیند ہی لیا گیا ہے جیسا کہ تفسیر العیاشی میں حلبی کے حوالہ سے دو روایتیں ذکر کی گئی ہیں اور کلینی نے کافی میں زید شحام کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ کا فرمان ذکر کیا ہے، اور ایک روایت میں اپنے اسناد سے زرارہ کے حوالہ سے امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: کتاب فروع کافی جلد سوم صفحہ ۱۷ وصفحہ ۲۹۹) اور صحیح بخاری میں بھی یہی بات انس کے حوالہ سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے مذکور ہے۔

آیات ۴۴ تا ۵۸

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿۴۴﴾

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿۴۵﴾

مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا
لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَقْوَمَ
وَلَٰكِنْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۴۶﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ
أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿۴۷﴾

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا
عَظِيمًا ﴿۴۸﴾

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿۴۹﴾

انْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُبِينًا ﴿۵۰﴾

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا
هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿۵۱﴾

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَنْ يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿۵۲﴾

○ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ۝٥٣

○ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا ۝٥٤

○ فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ۝٥٥

○ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝٥٦

○ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ۝٥٧

○ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝٥٨

ترجمہ

O "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے کہ وہ گمراہی خرید رہے ہیں اور وہ تم لوگوں کو راہ سے گمراہ کرنے کے خواہاں ہیں"

(۴۴)

O "اور اللہ تم لوگوں کے دشمنوں سے بخوبی آگاہ ہے اور اللہ ہی سرپرستی میں کافی ہے اور اللہ ہی مدد کرنے میں کافی ہے"

(۴۵)

O "یہودیوں میں سے کچھ لوگ کلام کو اس کی اصل جگہوں سے تبدیل کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور نافرمانی کی، اور تو سن، تو سننے والا تو نہیں اور ہماری طرف توجہ کر، (وہ یہ الفاظ) زبان درازی اور دین میں طعن کرتے ہوئے کہتے ہیں، اگر وہ یوں کہتے کہ ہم نے سنا اور تسلیم کر لیا ہے اور تو سن اور ہمیں مہلت دے تو ان کے لئے بہتر اور زیادہ مضبوط بات تھی، لیکن ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت کی، وہ ایمان لانے والے نہیں سوائے کچھ لوگوں کے"

(۴۶)

O "اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی ہے، تم ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا ہے وہ اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں پھر انہیں ان کے پیچھے کی طرف پھیر دیں، ہم انہیں اسی طرح لعنت کریں جس طرح ہم نے ہفتہ کے دن والوں پر لعنت کی تھی، اور اللہ کا کام پورا ہو کر ہی رہتا ہے"

(۴۷)

O ''اللہ ہرگز یہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے، اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے تو یقیناً وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا''

(۴۸)

O ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاک گردانتے ہیں، بلکہ اللہ ہی ہے جو جسے چاہتا ہے پاک قرار دیتا ہے، اور لوگوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کیا جائے گا''

(۴۹)

O ''دیکھئے وہ کس طرح اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور یہی بہت واضح گناہ کے ارتکاب میں کافی ہے۔''

(۵۰)

O ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جن لوگوں کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے وہ بت اور شیطان پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ان لوگوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں جو ایمان لائے ہیں''

(۵۱)

O ''انہی لوگوں پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے تو آپ اس کا کوئی مددگار نہ پائیں گے''

(۵۲)

○ ''کیاان کے پاس اقتدار میں حصہ ہے کہ اس صورت میں وہ لوگوں کورتی بھر کچھ نہ دیتے''
(۵۳)

○ ''یا یہ کہ وہ لوگوں سے اس چیز کی بابت حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہے، ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب وحکمت عطا کی ہے اور اُنہیں عظیم حکمرانی سے نوازا ہے''
(۵۴)

○ ''ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور بعض اس سے دور دور رہے تو دوزخ کی آگ ہی جلانے میں کافی ہے''
(۵۴)

○ ''جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ہم بہت جلد انہیں جہنم کی آگ میں جلائیں گے تو جب اُن کی کھالیں جل جائیں تو ہم ان کی کھالوں کی جگہ دوسری کھالیں بنا دیں گے تا کہ وہ عذاب میں مبتلا رہیں، یقیناً اللہ طاقتور اور دانا ہے''
(۵۶)

○ ''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے تو ہم عنقریب اُنہیں ان باغات میں لے جائیں گے، ان کیلئے اُن باغات میں پاکیزہ بیویاں ہوں اور ہم اُنہیں گھنے سایہ میں رکھیں گے''
(۵۷)

○ ''یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے اہل کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، اللہ تمہیں بہتر چیز کی نصیحت کرتا ہے، یقیناً اللہ خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے''
(۵۸)

تفسیر و بیان

ان آیات مبارکہ میں اہل کتاب کے حالات، ان کے مظالم اور دین الٰہی میں ان کی طرف سے خیانتوں کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں، البتہ اہلِ کتاب میں سے یہودیوں پر ان مطالب کی تطبیق واضح طور پر ہوتی ہے، یہ تمام آیات ایک ہی سیاق و انداز بیان کی حامل اور ایک دوسری سے پیوستہ و متصل ہیں، اور ان میں سے آخری آیت ''اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا...... '' کے بارے میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورۂ مبارکہ (نساء) کی آیت ۱۷۶ ''یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ'' کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ بھی مکہ میں نازل ہوئی، یعنی ان دو آیتوں کو پورے سورۂ مبارکہ کی دیگر تمام آیات جو کہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں ان میں سب سے استثناء کے ساتھ مکی آیات میں شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے۔ لیکن آیت کے ظاہر سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ماقبل آیات مبارکہ سے ہے اور اسی طرح آیت ۱۷۶ کا تعلق بھی اپنی ماقبل آیات سے ہے کیونکہ اس میں میراث کے بارے میں سوال و استفتاء کا تذکرہ ہے اور میراث کے احکام مدینہ منورہ میں صادر ہوئے۔

اور آیۂ مبارکہ ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ '' کے حوالہ سے یہ مطلب قابل توجہ و لائق بیان ہے کہ اسی سورۂ مبارکہ کی آیات ۳۶ تا ۴۲ کی تفسیر میں ذکر ہو چکا ہے کہ یہ آیت انہی آیات سے بعض جہات میں مرتبط ہے اور وہاں آپ قارئین کام اس مطلب سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ وہ آیات یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔

بہر حال ان آیات سے اس مطلب کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مؤمنین سے اپنی قلبی محبت کا اظہار کرتے تھے اور ان کے لئے خیر خواہانہ اظہارات کرتے تھے اور اس طرح انہیں فریب و دھوکہ دیتے تھے، وہ مؤمنین کو بخل کرنے اور اللہ کی راہ میں انفاق نہ کرنے کی ترغیب دلاتے تھے تاکہ اس طرح ان کی ان کوششوں کو بے نتیجہ و بے

اثر کردیں جو وہ اپنی کامیابی وسعادت اور ترقی وسربلندی کے لئے کرتے ہیں، اس بناء پر ضروری ہے کہ ان آیات کا نزول یہودیوں سے مربوط قرار دیا جائے یا ان لوگوں سے مربوط قرار دیا جائے جو یہودیوں کے اس طرزِ عمل کو اپناتے ہیں کہ جس میں ان کا مقصد ایمان والوں کو حق کی راہ سے منحرف کرنا اور اپنی پیروی کی راہ پر چلانا ہے تا کہ وہ بھی یہودیوں کی روش اختیار کریں اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر زندگی کا سفر طے کریں کہ جس طرح وہ بخل سے کام لیتے ہیں اسی طرح اہل ایمان بھی بخل سے کام لیں اور جس طرح وہ حق سے دور ہیں اسی طرح ایمان والے بھی حق سے دوری اختیار کریں۔

تو یہی وہ مطلب ہے جو آیۂ مبارکہ ''وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ وَاللهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ.........'' سے سمجھا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں دونوں آیتوں (۴۴، ۴۵) کا معنیٰ ــــ واللہ اعلم ــــ یہ ہے کہ یہاں ہم جو کچھ تمہارے لئے بیان کر رہے ہیں وہ ہمارے ان سابق الذکر مطالب کی تصدیق وتائید کے طور پر ہے جو غرور وتکبر، فخر، بخل اور ریاکاری کے ذریعے، اللہ کی راہ میں انفاق نہ کرنے والے شخص کے متعلق تھے، یعنی وہ اپنے اموال خدا کی رضاو خوشنودی کے حصول کی بجائے ریاکاری کے لئے خرچ کرتا ہے اور پھر تکبر و بڑائی کے ساتھ ساتھ بخل کا مرتکب ہوتا ہے، تو آپ خود ملاحظہ کر رہے ہیں کہ یہود کہ جنہیں کتاب الٰہی میں سے تھوڑا سا حصہ دیا گیا ہے۔ نہ کہ ساری کتاب کا علم کہ وہ جس طرح دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ گمراہی کو ہدایت کے مقابلے میں خریدتے ہیں اور وہ تمہیں بھی اسی طرح حق کے راستہ سے گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ ان کا طرزِ عمل یوں ہے کہ وہ تم سے نہایت خنداں پیشانی سے ملتے ہیں اور تمہارے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہیں، تمہارے خیر خواہ ہونے کی صورت ظاہر کرتے ہیں اور تم سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں جس طرح کوئی صمیمی دوست قلبی جذبات واحساسات کا حامل اور مخلص و مددگار ہو، وہ تمہارے سامنے ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ممکن ہے تمہیں پسند آئیں اور تمہارے دل ان سے خوش ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہاری گمراہی کے سوا کوئی مقصود نہیں رکھتے اور وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود حق کی راہ سے دور ہوئے ہیں تمہیں بھی گمراہ کریں اور حق سے دور کر دیں، حق تو یہ ہے کہ اللہ تمہارے دشمنوں کو خود تم سے زیادہ جانتا ہے۔ وہ تمہارے دشمن ہیں لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی ظاہری روش کے ذریعے تمہیں دھوکہ دے دیں، تم ان کے نقشِ قدم پر چلنے سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو اور ان کی دلفریب باتوں میں نہ آؤ اور نہ ہی ان کے بیہودہ و بے بنیاد اظہارات سے متاثر ہوں، جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ کس قدر تمہارے دوست و خیر خواہ اور مددگار ہیں۔ تمہیں ان کی جھوٹی دوستی کی ضرورت ہی نہیں اور نہ ہی ان کی مدد کے تم محتاج ہو، تمہاری سرپرستی کے لئے خدا کی ولایت کافی ہے اور وہی تمہارا حقیقی مددگار ہے۔ تو جب اللہ تمہارا ولی وسرپرست اور مددگار ہے تو تمہیں ان کی سرپرستی و مدد کی کیا ضرورت ہے؟

یہودیوں کی طرف سے تحریف کا ارتکاب

○ "مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ .... فِي الدِّيْنِ"

(یہودیوں میں سے وہ ہیں جو کلمات کو ان کے اصل مقامات سے تحریف کرتے ہیں......)

ایک لطیف ادبی بحث

اس آیت میں حرف "مِنَ" بیانیہ ہے، اس سے سابقہ آیت میں مذکور "الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ" یا "بِاَعْدَآئِكُمْ" کا بیان و وضاحت مقصود ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ جملہ "مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا" جملہ خبریہ ہے جس کا مبتداء محذوف ہے اور وہ مبتداء جملہ "يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ" (کلمات میں تحریف کرتے ہیں) کے موصوف افراد ہیں۔ لہٰذا فہم المعنٰی کے لئے آیت کے الفاظ کو اس طرح فرض کریں گے: "من الذین ھادوا قوم یحرفون" (یہودیوں میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو تحریف کرتے ہیں) یا "من الذین ھادوا من یحرفون" (یہودیوں میں سے وہ کہ جو تحریف کرتے ہیں)، چنانچہ اہل ادب کا کہنا ہے کہ موصوف کا حذف کرنا، کلامِ عرب میں عام رائج ہے، مثلاً مشہور شاعر ذوالرمہ کا یہ شعر:

فظلوا ومنهم دمعهٗ سابق له

وآخر يشني دمعه العين بالمهل

(ان کی حالت یہ ہوگئی کہ ان میں سے بعض افراد غم کی شدت کی وجہ سے اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے)۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے ان افراد کے بارے میں اس طرح ارشاد فرمایا کہ وہ کلمات کو ان کی اصل جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔ تحریف کرتے ہیں____ تحریف سے مراد یا تو یہ ہے کہ وہ کلمات کو جا بجا کر دیتے ہیں یعنی مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرتے ہیں اور ان میں کمی واضافہ یا سرے سے ختم کر دیتے ہیں جیسا کہ اس طرح کے امور کی نسبت موجودہ تورات کی طرف دی جاتی ہے۔ یا یہ کہ تورات میں جو باتیں حضرت موسیٰؑ اور دیگر انبیاءؑ کے بارے میں مذکور ہیں ان کی تفسیر ان کے اصل حقیقی معانی کے علاوہ کرتے ہیں جیسا کہ اُنہوں نے تورات میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ذکر ہونے والی بشارتوں میں تاویلیں کی ہیں اور جس طرح اُنہوں نے اس سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تورات میں مذکور بشارتوں کی تاویلیں کیں اور کہا کہ جس کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ابھی تک آیا ہی نہیں بلکہ وہ اس کی آمد کے منتظر ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کلمات کی تحریف سے مراد وہ بات ہو جو اس کے بعد کلامِ الٰہی میں مذکور ہے: "وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" (اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی) اس بناء پر یہ جملے "يُحَرِّفُوْنَ" پر عطف ہوں گے اور کلمات کو ان کے

مقامات سے تحریف کرنے سے مُراد الفاظ کو ان کے اس مقام سے ہٹا کر جہاں انہیں قرار دینا چاہیے غیر مقام میں قرار دینا ہوگا، مثلاً جو شخص کہے "سَمِعْنَا" (ہم نے سنا) تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے بعد کہے: "وَاَطَعْنَا" (اور ہم نے اطاعت کی) نہ کہ یوں کہے: "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" (ہم نے سنا اور نافرمانی کی)، یا یہ کہ "سَمِعْنَا" (ہم نے سنا) کے الفاظ کو مذاق وطنز کے طور پر کہے، اسی طرح جب کسی سے کہا جائے: "اسمع" (سن) تو مناسب یہ ہے کہ وہ جواب میں یوں کہے: "اسمعک اللّٰہ"، (اللہ تجھے سننے والا قرار دے) نہ یہ کہ یوں کہے: "اسمع غیر مسمع" (سن کہ خدا تجھے سننے والا نہ بنائے)، چنانچہ یہودیوں کی لغت میں "راعنا" بمعنیٰ "اسمع غیر مسمع" آتا ہے۔

اور جملہ "بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ" میں "لَیّ" کا اصل معنیٰ گرہ ڈالنا، موڑنا و پھیرنا ہے، یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی زبانوں کو پھیر کر اس طرح بات کرتے ہیں جس سے باطل کو حق کی صورت میں ظاہر کریں، اپنی غلط بات کو صحیح طور پر پیش کریں، اور اہانت وبجرمتی کو ادب واحترام کے قالب میں ڈھال دیں، چنانچہ جب مؤمنین حضرت پیغمبر اسلام ﷺ سے ہمکلام ہوتے تھے تو یہ الفاظ استعمال کرتے تھے: راعنا یارسول اللہ! اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہماری طرف نظر عنایت فرمائیں اور ہمارے عرائض سماعت فرمائیں۔ اجازت دیں کہ ہم آپ کی خدمت میں کچھ عرض کریں، تو یہودیوں نے اس سے غلط فائدہ اٹھالیا کیونکہ اس طرح کے الفاظ (راعنا) کی زبان ومحاورہ میں اہانت وبجرمتی کے مقام پر استعمال ہوتے تھے لہٰذا وہ جب آنحضرت ﷺ سے بات کرتے تو یہی الفاظ استعمال کرتے اور یوں کہتے تھے: راعنا، اور اس سے وہی معنی مراد لیتے تھے جو ان کے اپنے ہاں رائج تھے جو کہ توہین پر مبنی ہوتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی عظمت ومنزلت کے سراسر منافی تھے، تو ان کے ایسا کرنے پر اُن کی مذمت کی گئی اور یوں کہا گیا: "يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ" (اور وہ الفاظ کو ان کے اصل مقامات سے پھیر دیتے ہیں) اور پھر اس کی وضاحت میں یوں ارشاد ہوا: "وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" اور پھر اس کی وضاحت کے لئے عطف تفسیر کے طور پر یہ الفاظ اضافہ کئے: "وَّرَاعِنَا" پھر فرمایا کہ ان کا ایسا کہنا دراصل ان کی طرف سے زبان پھیر کر بات کرنے اور دین میں طعنہ زنی کرنے کی غرض سے ہے: "لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ" یہاں زبان کی کجی اور دین میں طعن وطنز کو الفاظ میں مصدر کو حال کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے کہ فہم المعنیٰ کے لئے یوں فرض کیا جائے گا: "لاوین بالسنتہم وطاعنین فی الدین" (وہ اپنی زبانوں کو پھیرتے ہیں اور دین میں طعنہ زنی وطنز کرتے ہیں)۔

ناصحانہ ارشاد

○ "وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ"

(اگر وہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی تو ان کے لئے بہتر اور مضبوط بات ہوتی)

ان الفاظ میں دینی ادب اور حق کے سامنے خضوع کرنے کا ناصحانہ ارشاد ہے اور ان کی اس بات سے بہتر اور زیادہ مضبوط ہے جو وہ کرتے ہیں ـــــ جبکہ ان کی بات زبان کی کجی اور دین میں طنز کے مذموم عمل پر مبنی ہے کہ جس میں نہ خیر ہے اور نہ ہی کوئی مضبوط پہلو ہے، تو یہ ناصحانہ ارشاد درحقیقت موازنہ کے طور پر ہے یعنی ان الفاظ میں کہ جو حق وحقیقت پر مبنی ہیں اور ان کے الفاظ میں کہ جو ان کے گمان کے مطابق حق پر مبنی ہیں بہت فرق ہے اور وہ یہ کہ ان الفاظ میں خیر وقوت ہے جبکہ ان کے الفاظ میں نہ خیر ہے اور نہ ہی کوئی مضبوط پہلو ہے۔ تو گویا حقیقی اثر اور اس اثر کے درمیان موازنہ ہے جسے حقیقی اثر سمجھ لیا گیا ہے جبکہ وہ حقیقی وحق پر مبنی اثر نہیں۔ اس بناء پر آیت کا معنٰی یہ ہے کہ اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی تو اس میں اُن کے لئے خیر وبہتری اور اس سے کہیں زیادہ مضبوطی پائی جاتی ہے جس کا وہ اپنے تئیں گمان کرتے ہیں کہ جس میں زبان کی کجی اور طعن وطنز کے سوا کچھ نہیں۔ بنابرایں اس آیت میں جس مطلب کا بیان مقصود ہے اس کی مثال درج ذیل آیۂ مبارکہ میں پائی جاتی ہے:

○ سورۂ جمعہ، آیت: ۱۱

"وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَیْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىٕمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ۝"

(اور جب وہ تجارت یا لہو ولعب کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف لپک جاتے ہیں اور آپ کو تنہا کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لہو ولعب اور تجارت سے بہتر ہے، اور اللہ بہتر رزق دینے والا ہے)۔

یہودیوں پر اللہ کی لعنت

○ "وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا"

(لیکن اللہ، ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کرتا ہے، مگر وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم)

اس جملے میں مسلمانوں کو یہودیوں کے بارے میں آگاہ کر کے بتایا گیا ہے کہ وہ ان سے امید نہ رکھیں کہ وہ یوں کہیں گے: "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" (ہم نے سنا اور اطاعت کی)، کیونکہ اس طرح کے الفاظ ایمانی کلمات ہیں جبکہ وہ ملعون ہیں انہیں ایمان کی توفیق حاصل نہیں ہو سکتی، اسی وجہ سے یوں کہا گیا: "وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا" (اور اگر وہ ایسا کہیں)، اس جملے میں جو

انداز اختیار کیا گیا (وَلَوْ اَنَّهُمْ) اس سے اس آرزو کے پورے ہونے کا ناممکن ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اور جملہ ''بِكُفْرِهِمْ'' میں حرف ''ب'' بظاہر سبب ووجہ کا معنیٰ دیتا ہے، یعنی ان کے کفر کی وجہ سے خدا ان پر لعنت کرتا ہے کیونکہ کفر، ایمان کے ذریعے زائل ہوسکتا ہے اور وہ (کفر بحیثیت کفر) ایسا نہیں کہ لعنت کا باعث ہو کہ جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قطعی طور پر ایمان کا راستہ بند کر دے، بلکہ ان کا کفر جیسا کہ سورہ کے آخر میں اس کی مزید وضاحت خداوند عالم نے فرمادی ہے۔ ایسا ہے کہ اس کے سبب اللہ نے ان پر لعنت کی لیکن وہ لعنت ایسی نہیں کہ اس سے ان کے ایمان لانے کا راستہ کلّی طور پر بند ہوجائے، اسی وجہ سے ان کے بہت کم افراد کے ایمان لانے کا اشارۃً ذکر ہوا ہے۔

اور جملہ ''فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا'' کی تفسیر میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ لفظ ''قَلِيْلًا'' کلام میں حال ہے لہٰذا فہم المعنیٰ کے لئے یوں فرض کرنا ہوگا: ''فلا یؤمنون الّا وھم قلیل'' (وہ ایمان نہیں لاتے مگر اس حال میں کہ وہ بہت کم ہیں) ایک قول یہ ہے کہ ''قَلِيْلًا'' ایک محذوف موصوف کی صفت ہے، اس بناء پر فہم المعنیٰ کے لئے عبارت کو یوں فرض کرنا ہو گا: ''فلا یؤمنون الّا ایماناً قلیلاً'' (پس وہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑا سا ایمان) تو یہ قول بھی پہلے قول کی طرح ہے کہ اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا لیکن اس صورت میں ضروری ہوگا کہ اس میں ایمان کی کمی کا لفظ اضافہ کیا جائے، تو یہ موصوف کے متعلق کا وصف ہوگا نہ کہ خود موصوف کا وصف! اسے اصطلاح میں ''وصفِ بحال المتعلق'' کہا جاتا ہے، یعنی ایسا ایمان کہ جس کے ایمان والے کم ہیں۔''

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ یہاں ایمان کے کم ہونے کا ذکر ایمان کے کامل ہونے کے مقابلے میں ہے اور ''فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا'' کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اس قدر کم ایمان لاتے ہیں کہ جو قابلِ اعتناء ہی نہیں کیونکہ وہ نہ تو اس ایمان والے کے عمل کی اصلاح کرتا ہے اور نہ ہی اس کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور نہ اس کی عقل کو اس قدر ترقی دیتا ہے لیکن اس مفسّر کا نظریہ قرین صحت نہیں کیونکہ ایمان کی توصیفی تقسیم اس کے قائم ودائم ہونے اور عارضی وزوال پذیر ہونے، اسی طرح کامل اور ناقص ہونے کے طور پر مختلف درجات ومراتب کے حوالہ سے ہوتی ہے لیکن جہاں تک قلت وکثرت کا تعلق ہے تو ایمان کی توصیف ان دو کے حوالہ سے نہیں ہوتی اور قرآن مجید جو کہ سب سے بڑا فصیح وبلیغ کلام ہے اس میں اس طرح کی توصیفی تقسیم کا ذکر کیونکر ممکن ہے؟

اس کے علاوہ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ آیتِ مُبارکہ میں جس ایمان کا ذکر ہے اس سے مراد یا تو حقیقی قلبی ایمان ہے جو کہ نفاق کے مقابل میں ہے یا ایمان کی ظاہری صورت ہے کہ جسے اسلام کہا جاتا ہے، اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ایمان سے جو بھی معنیٰ مُراد لیں اس پر لفظ اسلام کا اطلاق درست ہے اور یہ بات قرآنی آیاتِ مُبارکہ میں صریح الفاظ میں مذکور ہے، مثلاً:

○ سورۂ نساء، آیت ۹۴:

''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا''

(اور جو شخص تمہیں سلام کہے اسے یہ نہ کہو کہ تو مؤمن نہیں ہے)

اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان میں سے جن کو مستثنیٰ کیا ان کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا: ''وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ'' (لیکن اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی) جبکہ اس میں ظاہری ایمان اور اسلام کے نہایت کم درجات ہی کافی تھے کہ جو ان کے زبانی اظہار اور ان کلمات کے زبان پر لانے سے حاصل ہو سکتے تھے: ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور اطاعت کی) یقیناً جو شخص ان کلمات کا زبانی اظہار و ظاہری اقرار کرے وہ دیگر مسلمانوں جیسا ہوتا ہے۔

اور مذکورہ بالا نظریہ پیش کرنے والے مفسّر کو ایک غلط فہمی ہوئی کہ جس کی بناء پر انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا وہ یہ تھی کہ انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ اللہ کی لعنت کا اثر دائمی ہے کہ جس میں بعض افراد کے ایمان لانے کے باوجود کوئی فرق نہیں آتا یعنی اگر کسی قوم و گروہ پر خدا لعنت کرے تو اس گروہ میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا لہٰذا اس مفسّر نے ''اِلَّا قَلِيْلًا'' سے یہ سمجھا کہ کم ہونا ایمان کی صفت کے طور پر مذکور ہے اور کم ایمان قابلِ اعتناء نہیں ہوتا ورنہ خداوند عالم یوں نہ فرماتا: ''لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ'' (اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی) جبکہ اس مفسّر نے اصل معنیٰ سے غفلت سے کام لیا اور غور نہیں کیا اس طرح کے مخاطباتی الفاظ اور وہ جملے جو مذمت و تنبیہ و سرزنش پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان میں عمومیت کا انداز پایا جاتا ہے وہ سب قوم و گروہ اور معاشرہ بحیثیت معاشرہ سے خطاب ہوتا ہے اس معاشرہ کے بعض افراد سے نہیں ہوتا۔ بنا بر ایں آیاتِ مُبارکہ میں لعنت و غضب اور دیگر تنبیہات اور سرزنشوں و مؤاخذوں کا تعلق یہودی معاشرہ سے بہ حیثیت معاشرہ کے ہے کہ جس کی تکوین و تشکیل ہی اس طرح ہوئی ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور نہ ہی سعادت و فلاح کی راہ پر چلتے ہیں،، چنانچہ میدانی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اب تک اسی طرح سے ہیں اور قیامت تک ایسے ہی رہیں گے۔

اور ''اِلَّا قَلِيْلًا'' کے ذریعے جو استثناء ہوا ہے وہ بعض افراد سے مربوط ہے، اور یہ مطلب واضح ہے کہ جو عمومی حکم معاشرہ کے بارے میں ہو اس سے بعض افراد کا استثناء اس حکم کو ختم نہیں کرتا۔

اس استثناء کے حوالہ سے ایک سوال سامنے آتا ہے کہ جب یہ بات واضح ہے کہ یہودی معاشرہ ہی ایسا ہے کہ قیامت تک اپنی اسی حالت پر باقی رہے گا اور وہ لوگ ہرگز ایمان و سعادت کی راہ اختیار نہیں کریں گے تو ان میں سے بعض افراد کے مستثنیٰ قرار دیئے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ افراد بھی اپنے طور پر ایک معاشرہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جملہ ''فَلَا يُؤْمِنُوْنَ'' (وہ ایمان نہیں لاتے) میں بظاہر تمام افراد سے ایمان لانے کی نفی ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ نفی، ان کے معاشرہ سے بہ حیثیت معاشرہ کے ہوئی ہے اور ممکن تھا کہ اس معاشرہ کے ہر ہر فرد کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایمان نہ لائے گا لہٰذا جملہ ''اِلَّا قَلِيْلًا'' کے ذریعے ان کے بعض افراد کے ایمان لانے کی گنجائش کو ذکر کر دیا گیا، لہٰذا اس آیۂ مبارکہ میں درج ذیل آیۂ شریفہ کی طرح استثنائی مطالب ذکر کئے گئے ہیں:

سورۂ نساء، آیت:۶۶

○ ''وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِیَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْهُمْ''

(اور اگر ہم ان پر واجب قرار دیں کہ تم اپنے آپ کو قتل کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو وہ اس پر عمل نہیں کریں گے سوائے ان میں سے چند افراد کے)

اہل کتاب کو ایمان لانے کا حکم

○ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا..........''

(اے وہ لوگو کہ جنہیں کتاب دی گئی ہے ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا.......)

لفظ ''طمس'' کا معنٰی کسی چیز کے اثر و نشان کو محو کرنا اور مٹا دینا ہے، لفظ ''وجہ'' کا معنٰی وہ چیز ہے جو آپ کے سامنے اور ظاہر و نمایاں ہو، اور انسان کی بابت اس سے مراد اس کے سر کا وہ حصہ ہے جو آمنے سامنے قرار پاتا ہے کہ جو دیکھنے والے کے لئے ظاہر و نمایاں ہوتا ہے اور چونکہ عام طور پر لباس وغیرہ کی وجہ سے جسم کا دیگر حصہ چھپا ہوا ہوتا ہے لہٰذا چہرہ جو کہ سامنے و نمایاں ہوتا ہے اسے ہی مراد لیا جاتا ہے، اور یہ لفظ جس طرح حسّی و مادی امور میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح غیر حسّی و معنوی امور میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

لفظ ''ادبار'' جمع کا صیغہ ہے، اس کا مفرد ''دبر'' ہے۔ دال اور بَ پر پیش کے ساتھ، اس کا معنٰی پیٹھ پیچھے کا حصہ ہے۔

''اَصْحٰبَ السَّبْتِ'' سے مراد یہودیوں کی ایک قوم ہے جو سبت یعنی بروز ہفتہ، اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کرتے تھے تو اللہ نے ان پر لعنت کی اور انہیں مسخ کر دیا (ان کی صورتیں بگاڑ دیں) ان کے بارے میں درج ذیل آیتوں میں مربوطہ مطالب ذکر کئے گئے ہیں:

○ سورۂ اعراف، آیت: ۱۶۳

''وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ یَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّیَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِیْهِمْ''

(ان سے اس بستی کے بارے میں پوچھیے جو دریا کے کنارے پر واقع تھی اور وہ ہفتہ کے دن خدا کی مقررہ حدود سے تجاوز کرتے تھے کہ جب ان کی مچھلیاں ان کے پاس آجاتی تھیں کہ ہفتہ کے دن وہ ان کا شکار کرتے تھے اور جس ہفتہ کے دن وہ شکار نہیں کرتے تھے تو وہ نہیں آتی تھیں)۔

O سورۂ بقرہ، آیت: ۶۵-۶۶

"وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا"

(اور تم ان کو بخوبی جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن احکام الٰہی کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تو ہم نے ان سے کہا کہ تم بندر بن جاؤ ذلت وپستی کے حامل، تو ہم نے اسے ان کے پہلوں اور آئندہ آنے والوں کے لئے سزا و درسِ عبرت قرار دیا)۔

قارئین کرام! جس طرح آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ سابقہ آیات تمام یہودیوں یا ان میں سے ایک گروہ کے بارے میں ان کے حالات کے تذکرہ پر مشتمل تھیں اور بات یہاں تک پہنچی کہ ان کی طرف سے اللہ ورسول اللہ ﷺ سے خیانت کے ارتکاب اور دین کی نہایت نیک وصالح تعلیمات میں خرابیاں پیدا کرنے کے نتیجہ میں وہ سب اللہ کی لعنت کا شکار ہو گئے اور ایمان لانے کی توفیق سے محروم ہوئے سوائے چند افراد کے، لہٰذا ان سب کو مخاطب کر کے بات کی گئی اور ان الفاظ میں ان سے خطاب ہوا: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ" (اے وہ لوگو، کہ جنہیں کتاب دی گئی) تو اللہ نے انہیں ایمان لانے کی دعوت دی اور اس کتاب کو ماننے کا کہا جو اس نے ان کے لئے نازل کی کہ جو اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے انہیں سرکشی وتکبر اختیار کرنے کی صورت میں اپنی طرف سے سخت ناراضگی وسزا کی وعید بھی دی اور وہ سزا طمس یعنی اُن کے محو ونابود ہونے یا لعنت کی صورت میں ہوگی کہ یہ سزا ہمیشہ ان کو گھیرے رکھے گی۔ چنانچہ اسی کا ذکر ان الفاظ میں ہوا: "مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا" یہاں "طمس الوجوہ" (چہروں کو) مٹا دینے، پھیر دینے سے مراد ان کا ان سمتوں سے پھیر دینا ہے جن کی طرف بشر کی توجہات مبذول ہوتی ہیں اور ان کے ذریعے زندگی کی سعادت مندی اور متوقع آرزوؤں کی تکمیل مقصود ہوتی ہے لہٰذا اس سے چہروں کا ختم کر دینا اور ان کے آثار کا کلی طور پر محو کر دینا مراد نہیں بلکہ ان کا ان سمتوں سے پھیر دینا مقصود ہے جو ان کی سعادت کی ضمانت بن سکتی ہیں کہ وہ ان کی بجائے اُن کے مقابل سمتوں کی طرف متوجہ ورواں دواں ہیں گویا ان کے چہروں کو ان کی پشتوں کی طرف پھیر دینے کا بیان اس مطلب سے استعارہ کے طور پر ہے کہ وہ اپنے اس فطری راستہ کے برعکس راہ پر چلنے لگیں کہ جس پر ان کی وجودی تخلیق کا نظام قائم ہے اور جب ایسا ہوگا کہ ان کے رخ پشت کی طرف مڑ جائیں گے تو نتیجتاً ان کی توجہات ان کے فطری اہداف کی بجائے ان کے متعاکس امور کی طرف ہوں گی اور وہ اُلٹی جانب رواں دواں ہوں گے، گویا جس قدر آگے بڑھیں گے وہ آگے کی بجائے پیچھے کی طرف جائیں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح چلنے والا شخص اگر چہ اپنی طبعی وفطری بنیادوں پر اسی طرف اپنی توجہات رکھتا ہے جو اس کے لئے خیر وسعادت ہو۔ جس طرف بھی رخ کرے اور اسے اپنی زندگی کے لئے خیر وسعادت اور اپنے دین ودنیا کی بھلائی سمجھے لیکن وہ اس کے لئے شر اور فساد کے سوا کچھ نہ ہوگا اور جس قدر آگے بڑھتا جائے اتنا ہی اس کے پیچھے کی طرف

جانے میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا کہ وہ کبھی فلاح و کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگا۔

اور آیت مبارکہ میں ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت کا حوالہ اصحاب السبت (ہفتہ کے دن والے لوگوں) پر لعنت کے ساتھ دیا گیا تو اس سے بظاہر ان کا مسخ ہو جانا مقصود ہے جیسا کہ سابق الذکر آیات میں ان کا بندروں کی صورت میں مسخ ہو جانا مذکور ہے۔

بنا برایں حرف ''اَوْ'' (اَوْنَلْعَنَھُمْ) اپنے اصل معنیٰ میں ہے یعنی ''یا'' کہ جب دو چیزوں میں سے ایک مقصود ہو تو یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے کہ یا یہ ہے اور یا وہ! یعنی اگر وہ ایمان نہ لائے تو یا ہم انہیں طمس کریں گے یا لعنت کریں گے اور ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ پہلی سزا کا نتیجہ ان کے مقاصد و اغراض کا تبدیل ہو جانا ہے جبکہ ان کی اصل بشری حیثیت و تشخص میں تبدیلی پیدا نہیں ہوگی، لیکن دوسری سزا میں ان کے مقاصد کی تبدیلی ان کی انسانی صورت وحقیقت میں بندر جیسی حیوانی تبدیلی کی صورت میں ہو جائے گی، لہٰذا یہ مطلب واضح ہوا کہ اگر وہ اللہ کے فرامین کی پیروی کرنے سے تمرد و سرکشی کا مظاہرہ کریں جو کہ وہ یقیناً کریں گے جیسا کہ آیت کے اختتامی جملوں سے ثابت ہوتا ہے تو انہیں ان دو سزاؤں میں سے ایک کا سامنا کرنا پڑے گا: یا طمس الوجوہ ــــــ چہروں کا پھر جانا ــــــ یا لعنت کہ جس طرح اصحاب السبت اس کا شکار ہوئے، تو آیت مبارکہ میں اس مطلب کا ثبوتی اشارہ موجود ہے کہ وہ سزا ان سب کے لئے نہیں کیونکہ ارشاد ہوا: ''مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّطۡمِسَ وُجُوۡهًا'' (اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو پھیر دیں) اس میں لفظ ''وُجُوۡهًا'' جمع کا صیغہ ہے جو نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے، اگر یہاں وہ سب لوگ مراد ہوتے تو نکرہ کی بجائے معرفہ (الوجوہ) ذکر ہوتا لیکن جمع کا نکرہ کی صورت میں لانا اور ان افراد کا عدم تعیّن ایک نکتہ کا حامل ہے اور وہ یہ کہ یہ مقام چونکہ وعید اور خوف دلانے کا مقام تھا کہ جس میں ایک گروہ کو اس شر سے متنبہ کرنا مقصود تھا جو ان کے بعض افراد کو لاحق ہونا تھا لہٰذا ان افراد کا مبہم و غیر واضح ہونا ہی انذار اور ڈرانے کے ہدف کو پورا کر سکتا تھا کہ جن پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے کیونکہ ان کی نشانیاں بیان کر کے ان کے بارے میں متعین صورت میں نہ بتانا اس مقصد کے پیش نظر تھا کہ جو بھی اس طرح کا عمل کرے گا وہ اسی سزا کا مستحق قرار پائے گا اور اسی کا شکار ہوگا کہ اس نہایت سخت عذاب سے ہرگز نہ بچ سکے گا، اس طرح پوری قوم کو پیغام ملا کہ ان کا جو فرد بھی سرکشی اور خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا وہ اپنے آپ کو اللہ کی طرف سے اس طرح کے عذاب سے محفوظ نہ سمجھے، تو اس طرح کا انداز بیان ڈرانے دھمکانے اور خوف دلانے کے مقام میں عام طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔

ایک علمی وادبی نکتہ

آیۂ مبارکہ میں ارشاد ہوا: ''اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ'' (یا ہم ان پر لعنت کریں)، یہاں ضمیر ''ھم'' جو کہ ذوی العقول کے لئے

استعمال کی جاتی ہے اسے ''وُجُوْهًا'' کی طرف لوٹایا گیا ہے، تو اس سے بظاہر اشارۃً یا صراحۃً، افراد مراد لئے گئے ہیں کہ وہ اپنے مقاصد کی طرف رُخ کرتے ہیں، بنا برایں اس رائے یا احتمال وخیال کا نادرست ہونا واضح ہو جاتا ہے جس میں بعض مُفسّرین نے کہا ہے کہ طمس الوجوہ اور ان کے پھیرنے یا ختم کر دینے اور ان کے پیچھے کی طرف موڑ دینے سے ان کے چہروں کو ان کی پُشت کی طرف پھیر دینا مراد ہے، جبکہ اس رائے کے مقابلے میں وہ خیال زیادہ مضبوط نظر آتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ چہروں کو پیچھے کی طرف پھیر دینے سے نفوس وافکار کو درستی واستقامت اور حقائق وواقعیات کے ادراک کی درست سمت سے کجی وفکری انحطاط وپستی کی طرف لے جانا مراد ہے کہ جس کے نتیجہ میں حق کا مشاہدہ کرنے کے باوجود اس سے منہ موڑنے اور اس سے نفرتی دوری اختیار کرنا اور باطل کو دیکھ کر اس کی طرف جھکنا اور اس کا گرویدہ ہونا ہے۔ تو ایسا ہونا در اصل اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور سزا کی ایک عملی صورت ہے، چنانچہ اس کی ایک مثال درج ذیل آیت میں موجود ہے:

○ سورۂ انعام، آیت: ۱۱۰

''وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝''

(اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو پھیر دیتے ہیں جس طرح کہ وہ پہلی مرتبہ ایمان نہ لائے اور ہم انہیں اُن کی سرکشی میں چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ سرگرداں رہتے ہیں)

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ بات واضح ہوئی کہ آیت مُبارکہ میں طمس الوجوہ (نطمس وجوهًا) سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں کی کیفیات پر اثر گزاری کے ذریعے ان کی طبیعتوں میں حق کی پیروی اور باطل سے دوری اختیار کرنے کے جذبات کو باطل پرستی اور حق سے دوری اختیار کرنے میں تبدیل کرنا ہے کہ وہ اللہ اور اس کی آیات پر ایمان لانے سے اجتناب کرتے ہیں جیسا کہ ابتدائے آیت میں اس مطلب کا ثبوت ان الفاظ میں ملتا ہے: ''اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا.........الخ''

اسی طرح یہ بھی واضح ہوا کہ ''لعن'' سے مراد ''مسخ'' کرنا ہے۔

لیکن دیگر مفسرین نے اس سلسلہ میں جو آراء پیش کی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) طمس سے مراد چہروں کو پُشت کی طرف پھیر دینا ہے، اور یہ آخر الزمان یا قیامت کے دن ہوگا۔

لیکن یہ رائے درست نہیں کیونکہ جملہ ''اَوْ نَلْعَنَهُمْ'' اس کی نفی کرتا ہے کہ اس کی بابت تفصیلی مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

(۲) طمس سے مراد دُنیا میں رسوائی ہے کہ وہ ہمیشہ ذلت ورسوائی سے دوچار ہوں گے اور وہ اس طرح کہ وہ جس کام سے اپنی سعادت مندی کا ہدف حاصل کرنا چاہیں گے اسے اللہ تعالیٰ ان کے لئے ایک سیراب کی طرح بنا دے گا کہ جس میں ان کے لئے کوئی خیر وبھتری نہ ہوگی اور وہ اپنا مطلوب نہ پا سکیں گے۔

یہ رائے اگرچہ بظاہر بعید نہیں دکھائی دیتی لیکن ابتدائے آیت کے الفاظ اس کی نفی کرتے ہیں جیسا کہ اس کی بابت مربوطہ مطالب ذکر ہو چکے ہیں۔

(۳) طمس سے مراد یہ ہے کہ انہیں جلا وطن کر دیا جائے گا اور دوبارہ اس جگہ پلٹا دیا جائے گا جہاں سے وہ نکلے تھے، وہ لوگ حجاز سے شام اور فلسطین کی طرف نکالے گئے اور وہاں سے آئے تھے۔

لیکن یہ رائے بھی قرینِ صحت نہیں کیونکہ آیت کے ابتدائی جملے اور اس کا سیاق اس کے علاوہ دیگر مطالب کی تصدیق کرتا ہے جیسا کہ قارئین کرام اس سے آگاہ ہو چکے ہیں۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں یہ کہا جائے کہ اس سے مراد ان کے دلوں کو پھیر دینا اور ان کے باطنی چہروں کو حق سے باطل کی طرف موڑ دینا ہے کہ وہ اللہ اور اس کی آیات پر ایمان لانے کی توفیق ہی نہیں پا سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ دین حق ہی وہ راستہ ہے کہ کوئی انسان اس پر چلے بغیر اور اس کو درست اپنائے بغیر اپنی دُنیاوی زندگی کی سعادتمندی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا اور جو شخص اس سے منہ موڑے اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے:

سورۂ روم، آیت: ۴۱

○ ''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا ....''

(میدانوں و دریاؤں میں فساد پھیل گیا بہ سبب اس کے کہ جو لوگوں نے کام کئے تا کہ خدا انہیں ان کے کئے کا مزا چکھا دے.........)

سورۂ اعراف، آیت: ۹۶

○ ''لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم''

(اگر اہل قریٰ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے، لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے پکڑ لیا)

بنا برایں دینی حقائق و معارف سے ان کے رخ موڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انہیں دنیاوی زندگی کی تمام سعادتوں کی راہوں سے دور کر دیا گیا ہے کیونکہ جو شخص دینی سعادت سے محروم ہو وہ دنیاوی سعادت سے بھی محروم ہوتا ہے کہ نہ تو اطمینان و سکون سے بہرہ ور ہوتا ہے اور نہ ہی فکری استقلال اور امن و امان کی نعمت اسے حاصل ہوتی ہے، بلکہ وہ زندگی کی ہر حقیقی خوشی سے محروم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی کوشش نتیجہ بخش ثابت نہیں ہوتی سوائے اس مقدار عمل کے کہ جو اس کے معاشرہ میں انجام پذیر ہو۔ لہٰذا اس بناء پر آیۂ مبارکہ کی بابت جو آراء پیش کی گئی ہیں ان میں سب یا اکثر کی صحت و درستی کی راہ نکل سکتی ہے۔

خدائی فیصلے کے حتمی نتائج

○ ''وَ كَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا''
(اور اللہ کا ہر فیصلہ واقع ہونے والا ہے)

اس جملے میں اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تنبیہ کی ہے اور سرکشی و نافرمانی کرنے والوں کو اپنے عذاب کا خوف دلایا ہے وہ حتمی و یقینی امر ہے، جیسا کہ واقع ہوا بھی ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہودیوں میں لعنت و عذاب، اور ان کے درمیان قیامت تک باہمی عداوت و کینہ پیدا کرنے کی صورت میں سزا کا ذکر کیا ہے وہ دنیا میں بھی واقع ہو چکی ہے۔ اس آیت کے علاوہ دیگر آیاتِ مبارکہ میں بھی ان کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے وہ بھی عملی طور پر سامنے آچکا ہے۔

شرک باللہ: نا قابلِ معافی گناہ

○ ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ''
(اللہ ہرگز یہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے)

آیت مبارکہ کے ظاہر السیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سابقہ آیت ''اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّطۡمِسَ....... '' میں مذکورہ حکم کی علت و وجہ کو بیان کیا گیا ہے لہٰذا اس کا معنٰی یوں ہوگا کہ اگر تم اس پر ایمان نہ لائے تو تم مشرک قرار پاؤ گے اور اللہ اس بات کو بالکل معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے ورنہ تم اس کے غضب و ناراضگی اور سزا و عقاب کے حقدار بن جاؤ گے کہ وہ تمہارے چہروں کو تمہارے پیچھے کی طرف پھیر دے گا یا تم پر لعنت کرے گا، تو معاف نہ کرنے کا نتیجہ شرک کے دُنیاوی آثار یہی دو ہیں یعنی طمس الوجوہ یا لعنت۔
یہ مطلب اس فرق کو واضح کرتا ہے جو اسی زیر نظر آیۂ مبارکہ اور درج ذیل آیت کے درمیان پایا جاتا ہے:
سورۂ نساء، آیت: ۱۱۶

○ ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿۱۱۶﴾''

(خدا اس گناہ کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ ـــــ اس سے کمتر ـــــ جس سے چاہے اسے معاف کر دیتا ہے)

کیونکہ زیر نظر آیۂ مبارکہ (۴۸) شرک کے دنیاوی آثار سے خوف دلاتی ہے جبکہ آیت ۱۱۶ اخروی آثار سے ڈراتی ہے، البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ لفظی حوالہ سے دونوں آیتوں میں اطلاق پایا جاتا ہے کہ جس سے ان دونوں میں دنیاوی اور اخروی آثار شامل ہیں لیکن مورد پر منطبق ہونے کے حوالہ سے ان میں فرق پایا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک (۴۸) دنیوی اور دوسری (۱۱۶) اخروی آثار کی نشاندہی کرتی ہے۔

شرک کی عدم معافی کا راز

آیۂ مبارکہ میں شرک کے گناہ کی عدم معافی کے حوالہ سے یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ خداوند کا کسی کو معاف کرنا اور نہ کرنا حکمت سے خالی نہیں بلکہ اس میں مخصوص غرض وحکمت پائی جاتی ہے کیونکہ وہ عزیز وحکیم اور غالب و دانا ہے اس کا کوئی کام اور فیصلہ حکمت وراز سے خالی نہیں ہوتا، ان دونوں حوالوں سے آیت میں مذکورہ عدم معافی اور معافی کی حکمت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ شرک کا گناہ اس لئے معاف نہیں کرتا کہ تخلیق جو کہ سراپا رحمت ہے اس کی اصل واساس مخلوق کی عبدیت و عبودیت اور خداوند عالم کی الوہیت وربوبیت پر قائم ہے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ ذاریات، آیت:۵۶

○ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾"

(اور میں نے جن وانس کو پیدا نہیں کیا مگر صرف اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں)

ظاہر ہے کہ شرک اور عبودیت یکجا نہیں ہو سکتے، اور جہاں تک شرک کے علاوہ دیگر گناہوں کی معافی کے امکان کا تعلق ہے تو وہ شفاعت کی وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کو شفاعت کرنے کا حق عطا فرمایا ہے یعنی انبیاء، اولیاء، ملائکہ اور اس کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ، تو ان کی شفاعت کے ذریعے گناہوں سے معافی ممکن ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی تذکرہ اس کتاب کی پہلی جلد میں شفاعت کی بحث کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

شرک اور توبہ

یہ ایک قرآنی حقیقت ہے کہ توبہ سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں خواہ شرک ہو یا کوئی دوسرا گناہ، لیکن زیر نظر آیۂ

مبارکہ میں توبہ کا کوئی حوالہ مذکور نہیں کیونکہ یہ مقام اس سے موزونیت نہیں رکھتا، آیۂ مبارکہ شرک وعدم ایمان کے بارے میں ہے اور عدم ایمان کے ساتھ توبہ بے معنیٰ ہے، ارشاد حق تعالیٰ ہے:

○ سورۂ زمر، آیت: ۵۴

''قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ''

(کہہ دیجئے کہ اے میرے وہ بندو، کہ جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے، یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے، اور تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آؤ)۔

کفر اور شرک

آیۂ مبارکہ میں جس شرک کا ذکر ہوا ہے اس سے اس کا وہ معنیٰ مراد ہے جس میں یقیناً کفر بھی شامل ہے، کیونکہ کافر کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا لہٰذا وہ بھی مشرک کی طرح ہے کہ جس کا گناہ معاف نہیں ہوگا۔ اگرچہ اسے ''مشرک'' کے نام سے موسوم نہیں کیا جاتا، یعنی قرآنی اصطلاح میں اہل کتاب کو ''مشرک'' سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ ان کا قرآن اور جو کچھ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے اس کا انکار کرنا ان کی طرف سے کفر ہی ہے اس سلسلہ میں مزید تفصیل جاننے کے لئے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۱ کی تفسیر کا مطالعہ کریں جس میں اس موضوع سے مربوطہ مطالب مذکور ہیں۔ کیونکہ جب اہل کتاب قرآن پر ایمان نہ لائیں جو کہ تورات وانجیل کی تصدیق کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خُدا پر ایمان نہیں لائے اور وہ جو عقیدہ رکھتے ہیں اس کی بناء پر خدا کے ساتھ شرک کے مرتکب قرار پائیں گے اور خداوند عالم ان کے اس عمل کو ہرگز پسند وقبول نہیں کرتا چنانچہ جو شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا ہو لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرے تو گویا اس نے اللہ کا انکار کیا اور اللہ کے ساتھ حضرت موسیٰ کو شریک بنایا، شاید جملہ ''اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ'' میں یہی نکتہ ملحوظ ومقصود ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے (یعنی حضرت موسیٰ کو مان کر حضرت عیسیٰ کو نہ ماننا دراصل خدا کے ساتھ شرک کے مترادف ہے) اسی وجہ سے خُداوندِ عالم نے یہ نہیں فرمایا: ''ان اللہ لا یغفر المشرك، او المشركين'' کہ خُدا مشرک یا مشرکین کو معاف نہیں کرتا۔

خُدا کی مشیت

آیۂ مبارکہ میں گناہوں کی معافی کو "لِمَنۡ يَّشَآءُ" کے الفاظ کے ساتھ مقید کر کے اس ممکنہ گمان وخیال کی نفی کی گئی ہے کہ خُدا کے فیصلوں میں کسی کا عمل دخل ہے کہ جس کی وجہ سے اس پر گنہگاروں کو معاف کرنا واجب ولازمی ہے۔ کیونکہ اس سے خدا کا کسی کے ہاتھوں محکوم ومغلوب ہونا ثابت ہوتا ہے جو کہ کسی صورت میں درست نہیں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وابستہ امور کی بابت قرآنِ مجید میں کثیر آیات موجود ہیں کہ جن میں سب یا بیشتر اسی ممکنہ خیال کی نفی کی غرض سے ہیں جو ہم نے ذکر کی ہے مثلاً:

سورۂ ہود، آیت: ۱۰۸

○ "خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيۡرَ مَجۡذُوۡذٍ"

(وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ آسمان وزمین موجود ہیں، سوائے اس کے کہ تیرا پروردگار چاہے اور یہ ختم نہ ہونے والا عطیہ ہے)

اس کے ساتھ ساتھ احکام کی تشریع وقانون گزاری کی حکمت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر گناہگار کا گناہ معاف نہ کیا جائے یعنی گناہوں کی معافی کا کھلا میدان گناہگاروں کے ہاتھوں میں نہ دیا جائے ورنہ امر ونہی صادر کرنے اور خُدائی تربیت کا نظام سرے ہی سے ختم ہو کر رہ جائے گا، اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیۂ مُبارکہ میں ارشادِ الٰہی ہوا: "لِمَنۡ يَّشَآءُ" (وہ جسے چاہے) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر گناہ میں اس کے مرتکب کو معاف نہ کیا جائے ورنہ اس گناہ سے نہی کرنا بے نتیجہ ہو جائے گا۔ یہ بات ان آیات مبارکہ سے منافات نہیں رکھتی جن میں مغفرت اور گناہوں کی معافی کے اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے کیونکہ زیرِ نظر آیت میں معافی کے وقوع پذیر ہونے کی بات ہے اس کے بارے میں وعدہ کرنے کی بات نہیں ہے جبکہ مغفرت کے اسباب کے تذکرہ پر مبنی آیات میں مغفرت کے وعدہ کا حوالہ ہے اور ان میں مغفرت کا علی الاطلاق ذکر ہوا ہے یعنی کسی خاص گناہ کی معافی مذکور نہیں بلکہ عام ومطلق صورت میں اس کے اسباب کے تذکرہ کے ضمن میں اسے بیان کیا گیا ہے، اور بعض گناہ ایسے ہیں کہ ان کے مرتکب ہرگز قابلِ معافی نہیں مثلاً شرک وغیرہ، اسی لئے مغفرت کو مطلق صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

بنابراین آیۂ مبارکہ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ شرک کے گناہ کو معاف نہیں کرتا خواہ اس کا مرتکب کافر ہو یا مشرک ہو جبکہ اس کے علاوہ دیگر گناہوں کی بخشش کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت یا عملِ صالح کی وجہ سے ممکن ہے۔

اور یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی صورت میں گناہوں کی معافی پر مجبور نہیں کہ گناہ خواہ جیسا بھی ہو وہ یقیناً اسے معاف کر دے گا، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ یہ سب کچھ اس کی حکمت پر منحصر ہے کہ اگر چاہے تو معاف کر دے اور اگر اس کی حکمت مغفرت کی مُتقاضی نہ ہو تو معاف نہیں کرے گا۔

تزکیۂ نفس کا حوالہ

''اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ........''

(کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو اپنے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں.......)

مشہور لغت دان راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ لفظ ''زکاۃ'' دراصل اس نُمو یعنی بڑھنے اور اضافہ کے معنیٰ میں آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والی برکت سے ہو، اور جہاں تک انسان کے تزکیۂ نفس کا تعلق ہے تو اس کی دو قسمیں ہیں: ایک فعلی ہے کہ جو نہایت پسندیدہ ہے اور دوسری قولی، پہلی قسم کی طرف جملہ ''قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی'' کے الفاظ سے اظہار ہوا ہے اور دوسری قسم وہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے بارے میں اس کے عادل ہونے کی تصدیق کرے البتہ اس کی یہ صورت مذموم ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کے عادل ہونے کا اظہار کرتا ہے چنانچہ اس طرح تزکیۂ نفس سے خداوندِ عالم نے منع فرمایا ہے: ''لا تزکوا انفسھم'' (تم اپنے آپ کا تزکیۂ نفس نہ کرو) اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح نہی فرمانا دراصل اس بات کی اخلاقی تعلیم ہے کہ عقل و شریعت دونوں ہی انسان کے اپنے آپ کی تعریف و ستائش کرنے کے عمل کو قبیح و برا سمجھتے ہیں۔ اسی حوالہ سے کہا گیا ہے کہ ایک دانا سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی چیز ہے جو حق ہونے کے باوجود مستحسن نہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ وہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کی مدح کرے (یہاں تک راغب کا بیان تمام ہوا) ملاحظہ ہو: کتاب المفردات، صفحہ ۲۱۴)

چونکہ یہ آیت اہلِ کتاب کے تذکرہ پر مبنی مطالب کے ضمن میں آئی ہے تو اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اپنے آپ کی مدح و تعریف کرنے والوں سے مراد وہی اہل کتاب یا ان میں سے بعض افراد ہیں، چنانچہ اس کی تائید و تصدیق ان آیات مبارکہ سے ہوتی ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اظہارات ذکر کئے ہیں مثلاً:

سورۂ مائدہ، آیت: ۱۸

- ''نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ''

(ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں)

سورۂ بقرہ، آیت: ۸۰

- ''لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً''

(ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن)

سورۂ جمعہ، آیت: ۶

- ''قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ هَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّكُمۡ اَوۡلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ.........''

(کہہ دیجئے کہ اے یہودیو، اگر تم گمان کرتے ہو کہ تم ہی اللہ کے اولیاء ہو اور کوئی نہیں......)

اس میں ان کے اولیاء اللہ ہونے کے گمان کا تذکرہ ہے۔

بہرحال اس آیت میں یہودیوں کے بارے میں کنایۃً ذکر ہوا ہے اور اس آیت میں سابق الذکر آیات میں مذکور ان مطالب کی تصدیق پائی جاتی ہے جن میں یہودیوں کی طرف سے غرور و تکبر اور حق کو قبول اور اس کی پیروی سے سرتابی کے ساتھ ساتھ آیاتِ الٰہی پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے لعنت کا مستحق ہونے کا تذکرہ ہوا ہے، تو یہ سب ان کے خود پسندی کا شکار ہونے اور خودستائی کے رسیا ہونے کا نتیجہ ہے۔

تزکیہ: خدائی کام

○ ''بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا''

(بلکہ اللہ ہی تزکیہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے، اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہیں کیا جائے گا)۔

اس جملے میں ''بل'' کے ذریعے سابق الذکر مطلب سے اعراض و روگردانی کا اظہار مقصود ہے یعنی ان کے از خود تزکیۂ نفس کرنے کے عمل کی رد میں اس عمل کی حقیقت سے آگاہی دلائی گئی ہے کہ یہ کام ربوبیت کی صفات میں سے ہے جو کہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے، اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اگرچہ یہ ممکن ہے کہ وہ فضیلتوں اور کمالات سے متصف ہو اور گونا گوں عظمتوں اور معنوی و روحانی رفعتوں کا حامل ہو جائے لیکن اس کا ان کمالات و رفعتوں پر گھمنڈ کرنا اور صرف انہی کا سہارا لے کر اپنے امورِ زندگی کے تمام سلسلے چلانا اپنے آپ کو ہر ایک سے بے نیاز اور ہر لحاظ سے استقلالی حیثیت کا حامل سمجھنے کی وجہ سے ہوتا ہے جبکہ اس طرح کا کامل استقلال و بے نیازی، الوہیت اور رب العالمین کے شریک ہونے کے ادّعاء کی ایک صورت ہے، حالانکہ یہ انسان کہاں کہ جو سراپا فقر ہے کہ اپنے لئے کسی نفع و نقصان اور زندگی و موت کا کوئی اختیار ہی نہیں رکھتا، اور اللہ تعالیٰ سے بے نیازی اور خیر و فضیلت سے بہرہ ور ہونے میں اس سے مستقل حیثیت کا حامل ہونا کہاں؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی ذات میں اور اپنی ذات سے متعلق تمام امور میں بلکہ ان تمام خیر و عظمتوں اور ان کے تمام اسباب میں اللہ تعالیٰ کا مملوک اور اس کی کامل ملکیت ہے، تو جب اس کا حال یہ ہے تو پھر اس کے پاس باقی رہتا ہی کیا ہے؟

بنا بر ایں یہی خود فریبی و خودنمائی اور خود پسندی کہ جو انسان کو خودستائی کی راہ پر لا کھڑا کرتی ہے اخلاقی پست ترین صفات کی اصل و اساس اور بنیاد ہے اور چونکہ یہی خود پسند و خودنما انسان اپنی زندگی میں دوسرے ہمنوع افراد سے ربط و ارتباط

کے بغیر اپنا سفرِ حیات طے نہیں کرسکتا لہٰذا اس کی اس پست ترین صفت سے دوسری پست صفت جنم لیتی ہے کہ جسے تکبر کہتے ہیں کہ جو اسے دوسروں پر بڑائی کے احساس میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو سب سے بلند و برتر سمجھتے ہوئے خدا کے بندوں کو اپنی بندگی کے بندھنوں کا اسیر قرار دینے لگتا ہے کہ ان پر ہر طرح کا ظلم و جور اور ناحق جبر و زیادتی روا رکھتے ہوئے احکام و دستورات خداوندی کی عملی بے حرمتی اور لوگوں کی جان و مال و ناموس پر دست درازی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب کوئی فرد اس بری صفت و بیماری میں مبتلا ہو جائے لیکن اگر یہی مرض کسی فرد کی بجائے معاشرہ و قوم کو شکار کرلے تو اس صورت میں نوع انسانی کی تباہی و بربادی اور روئے زمین پر فتنہ و فساد کا برپا ہونا یقینی ہو جاتا ہے، اسی مطلب کو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس بیان کا حوالہ دے کر ذکر فرمایا کہ انہوں نے کہا: ''لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ'' (اُمیّوں ـــــ غیر یہودیوں ـــــ کو ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں) سورۂ آل عمران، آیت: ۷۵۔

مذکورہ بالا مطالب کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ خودستائی کرتے ہوئے اپنے لئے کسی کمال و فضیلت اور برتری کو اپنی زبان پر لائے خواہ اپنے بیان میں سچا ہو یا جھوٹا ہو۔ کیونکہ وہ اپنے لئے استقلالی طور پر اس فضیلت کا مالک نہیں بلکہ یہ تو خداوند قدوس ہے جو ہر اس چیز کا مالک ہے جو اس بندے کی ملکیت ہے اور وہی ہے جو جسے چاہے اور جس طرح چاہے فضل و کمال عطا کرتا ہے، اسی کو یہ حق و اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہے عملی طور پر بلندی و سربلندی سے نوازتے ہوئے کمالات و نعمتوں سے مالا مال کرے اور قولی طور پر اس کا تزکیہ کرتے ہوئے اس کا ذکر اس طرح سے کرے کہ اس شخص کی تعریف و مدح ہو اور اس کی کمالی صفات کا اظہار ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاءؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

سورۂ آل عمران، آیت: ۳۳۔

○ ''إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا''

(بے شک اللہ نے آدم اور نوح کو چن لیا)

اس میں حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کا قولی تزکیہ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ادریسؑ کے بارے میں فرمایا:

سورۂ مریم، آیت: ۴۱

○ ''إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا''

(بے شک وہ نہایت سچا، نبی تھا)

حضرت یعقوبؑ کے بارے میں ارشاد ہوا:

سورۂ یوسف، آیت: ۶۸

- ''وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ''

(اور جو ہم نے اسے تعلیم کیا اس کی وجہ سے وہ صاحب علم ہے)

حضرت یوسفؑ کے بارے میں فرمایا:

سورۂ یوسف، آیت: ۲۴

- ''اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ''

(وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے)

حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہوا:

سورۂ مریم، آیت: ۵۱

- ''اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا''

(وہ مخلص تھا اور پیغمبر، نبی تھا)

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

سورۂ آل عمران، آیت: ۴۵

- ''وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ''

(دنیا و آخرت میں عزت و احترام والا اور مقربین میں سے!)

حضرت سلیمانؑ اور حضرت ایوبؑ کے بارے میں فرمایا:

سورۂ ص، آیت: ۳۰، ۴۴

- ''نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗ اَوَّابٌ''

(بہت اچھا بندہ ہے، اور وہ بہت ہم سے رجوع و روابط رکھتا ہے)۔

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان کی نسبت سے ارشاد فرمایا:

سورۂ اعراف، آیت: ۱۹۶

- ''اِنَّ وَلِيِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ''

(یقیناً میرا ولی اللہ ہے کہ جس نے کتاب نازل کی اور وہ صالحین کا سرپرست ہے)

سورۂ قلم، آیت: ۴

○ ''وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ''

(اور آپ بہت بلند اخلاق کی منزل پر فائز ہیں)

اور متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں مختلف آیات میں ارشادات الٰہی موجود ہیں مثلاً سورۂ انعام، سورۂ مریم، سورۂ انبیاء، سورۂ صافات، سورۂ ص اور ان کے علاوہ دیگر متعدد سورتیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تزکیہ و ستائش اور مدحت ______ حقیقی معنی میں ______ خدائی کام ہے اور اسی کا مخصوص حق ہے کہ جس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں کیونکہ جو تعریفیں اس کے علاوہ کوئی کرے یا وہ سراپا ظلم ہے خواہ تعریف کرنے والے کی طرف سے ہو اور خواہ جس کی تعریف کی گئی ہو، دونوں کی نسبت ظلم ہے جبکہ خداوند عالم کی طرف سے ہونے والی تعریف حق و عدل کے سوا کچھ نہیں کہ جس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط، اسی لئے آیت کے ذیل میں ارشاد ہوا: ''بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ'' (بلکہ اللہ تزکیہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے) تو یہ جملہ ''وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا'' کی اصل وجہ کے بیان پر مشتمل ہے۔

مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف تزکیۂ کی جو نسبت دی گئی ہے اگرچہ وہ مطلق ہے کہ اس میں کوئی قید و شرط مذکور نہیں لہٰذا اس میں ہر طرح کا تزکیہ شامل ہے یعنی تزکیہ فعلی و عملی اور تزکیۂ قولی و لسانی، لیکن مورد کے حوالہ سے اس کا انطباق تزکیۂ قولی پر ہوتا ہے۔ اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر و لائق توجہ ہے کہ غیر اللہ کا تزکیہ اس لئے ظلم کہلاتا ہے کہ وہ اگر اس چیز کی تعریف و ستائش اور مدح و ثنا کرے کہ جس کی خداوند عالم نے تعریف نہ کی ہو تو گویا اس نے خود اپنے لئے استقلال کا نظریہ قائم کر لیا اور دوسری جانب عین ممکن ہے کہ حد سے تجاوز کرے یا حد سے کم ہو دونوں صورتوں میں ناروا ہے کیونکہ وہ حقیقت سے آگاہ ہی نہیں رکھتا جبکہ اللہ تعالیٰ جس چیز کی تعریف و ثناء کرے وہ اس کی حد و حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے لہٰذا اس کی بات حق و عدل پر مبنی ہوگی۔

ہر طرح کے ظلم کی نفی

○ ''وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا''

(اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہیں ہوگا)

لفظ ''فتیل'' بروزن ''فعیل'' (صفت مشتبہ کا صیغہ) بمعنی اسم مفعول ہے اور اس کا مصدر ''فتل'' ہے جس کا معنٰی بٹنا، پھیرنا، موڑنا ہے۔ فتیل یعنی بٹا ہوا، مروڑا ہوا۔

بعض اہل ادب کا کہنا ہے کہ اس سے مراد کھجور کی گھٹلی کے شگاف کی باریک بتی ہے، ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد گھٹلی کے اندر باریک دھاگہ ہے اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات سے وارد ہوا ہے کہ اس سے کھجور کی گھٹلی پر موجود ایک باریک سا نقطہ مراد ہے، اور لفظ ''نقیر'' اس باریک نقطہ کو کہتے ہیں جو گھٹلی کی جلد پر ہوتا ہے اور ''قطمیر'' گھٹلی کی جلد کا نام ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتیل اس میل کو کہتے ہیں جو آپ کی دو انگلیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑنے سے نکلتا ہے۔

بہر حال یہ لفظ کسی چیز کے ناچیز و نہایت معمولی ہونے سے عبارت ہے کہ جسے قابل توجہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔

اس آیۂ مبارکہ سے دو مطالب واضح ہوتے ہیں:

(۱) فضیلت و کمال کے حامل کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے کمالات پر اتراتا پھرے اور خود ستائی میں مبتلا ہو، ہمیشہ اپنی تعریف ہی میں لگا رہے اور اپنے فضائل ہی بیان کرتا رہے۔ کیونکہ یہ کام اللہ تعالیٰ سے مخصوص و مختص ہے۔ وہ ہر فضیلت و کمال کی اصل حقیقت سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے اور اس کی حدود کو بھی جانتا ہے، اس کے علاوہ کسی کو حقیقی علم حاصل نہیں، اور آیۂ مبارکہ کے ظاہری الفاظ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے کہ وہ جسے قابل تعریف سمجھے اس کی تعریف کرے اور اللہ کے علاوہ دوسروں کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ کسی کی تعریف کرنے میں اس تعریف کے علاوہ یا اس سے زیادہ تعریف کریں جو اللہ نے کی، بلکہ صرف اسی حد تک تعریف کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے کسی کی کی ہے اور اسی فضیلت کو بیان کیا جائے جو خدا نے اسے عطا کی ہے۔ خدا کی عطا کردہ فضیلت کا ذکر کر کے اسی حد تک اس کی تعریف کرنا روا ہے اس سے زیادہ نہیں، اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ فضیلتیں صرف وہی ہیں جن کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے کی اور انہیں فضیلتیں قرار دیا، انہی فضیلتوں و کمالات کا تذکرہ اور انہی کی نسبت سے کسی کی تعریف کرنا ہی جائز و درست ہے اس سے زیادہ ہرگز نہیں، لہٰذا ان کے علاوہ کوئی فضیلت، فضیلت نہیں کہلا سکتی اور نہ ہی کوئی کمال، کمال ہونے سے متصف ہو سکتا ہے، فضیلت و کمال صرف وہی ہے جسے دین میں فضیلت و کمال کہا گیا ہو، جس چیز کو دین فضیلت و کمال قرار نہ دے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور نہ ہی اسے کمال سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ لوگ فضائل و کمالات اور ان کے آثار کی نفی کریں اور ان کی بابت بے احترامی کا مظاہرہ کریں، یا کسی باکمال و بافضیلت شخص کے کمال و فضیلت کا انکار کریں اور اس کی تعظیم و احترام میں کوتاہی سے کام لیں کیونکہ فضائل و کمالات کا مقام بلند ہے اور وہ شعائر اللہ یعنی اللہ کی نشانیاں ہیں کہ جن کی قدردانی و احترام ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ حج، آیت: ۳۲

○ ''وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ''

(اور جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے)

بنابرایں ہر جاہل پر فرض ہے کہ وہ عالم کے سامنے خضوع وفروتنی کرے اور اس کا احترام وقدردانی کرے کہ اسی کو حق کی پیروی کہتے ہیں۔ چنانچہ عالم وجاہل کے حوالہ سے خداوندِ عالم نے واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا:

سورۂ زمر، آیت:۹

○ ''هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ''

(کیا برابر ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے)۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ جہاں جاہل کو عالم کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں عالم کے لئے بھی سزاوار نہیں اور اسے حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے علم پر اتراتا پھرے اور اپنی تعریف ہی میں لگا رہے۔ خودستائی کرے اور اس طرح لوگوں سے احترام کی توقع کرے، یہ بات تمام حقیقی انسانی کمالات وفضائل میں یکساں ہے۔ یعنی جو شخص ان کمالات کا حامل ہو لوگ اس کی عزت واحترام کریں اور اس کی قدر کریں لیکن خود اسے حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی تعریفیں کرتا رہے۔

(۲) ہمارے بعض محققین نے لکھا ہے جو کہ انہوں نے اہلِ مغرب کے نظریہ ہی کی پیروی میں اس طرح کی رائے کا اظہار کیا ہے کہ انسانی فضیلتوں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان صرف اپنے آپ پر بھروسہ کرے، یعنی کامل خوداعتمادی (خود پرستی) جبکہ یہ بات دینی اقدار واصولوں میں سے ہرگز نہیں اور نہ ہی قرآنی ذوق سے اس کی تائید ہوتی ہے، بلکہ اس حوالہ سے قرآن مجید صرف اور صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے اور اس کی بندگی پر فخر کرنے کو فضیلت قرار دیتا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

سورۂ آل عمران، آیت:۱۷۳

○ ''الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ''

(اہل ایمان وہ ہیں کہ لوگوں نے جب انہیں بتایا کہ کافر تمہارے مقابلے میں جمع ہو گئے ہیں تو ان سے اپنے آپ کو بچاؤ، تو ان کا ایمان مزید بڑھ گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے لئے خدا کافی ہے اور وہ بہترین سہارا ہے)

سورۂ بقرہ، آیت:۱۶۵

○ ''أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا''

(ہر طاقت اللہ ہی کے پاس ہے)۔

سورۂ یونس، آیت:۶۵

○ ''إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا''

(ہر عزت، اللہ ہی کے لئے ہے)۔

اس کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔

خدا پر افتر پردازی

○ ''اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ''

(دیکھئے، وہ کس طرح اللہ پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں......)

اس آیت میں یہودیوں کی افترا پردازی کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ دیکھیں وہ کس کس طرح سے جھوٹے الزامات اور بے بنیاد نسبتیں دیتے ہیں اور خودستائی کرتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے، اللہ کے دوست اور اللہ کے اولیاء قرار دیتے ہیں، جبکہ یہ سب کچھ جھوٹ والزام اور اللہ پر افترا پردارزی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعزازات ان کے لئے قرار ہی نہیں دیئے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اصل خودستائی ہی افتراء ہے خواہ بات سچی ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ اس کا تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔ اور وہ اللہ کے ساتھ شرک کی ایک صورت ہے جبکہ کوئی بھی اللہ کا شریک نہیں، خداوند عالم نے واضح لفظوں میں اپنے شریک کی نفی کی ہے:

○ سورۂ اسراء، آیت: ۱۱۱

''وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ''

(اور کوئی اس کے ساتھ ملک میں (اقتدار واختیار) میں شریک نہیں)

افتراء علی اللہ کے حوالہ سے اس کے بدترین گناہ ہونے کی بابت ان الفاظ میں ارشاد ہوا: ''وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا'' کہ بس یہی کام بہت بڑا گناہ ہونے میں کافی ہے، یعنی خودستائی وافتراء اس قدر بڑا گناہ ہے کہ اگر اس کے علاوہ کوئی گناہ نہ بھی ہوتب بھی یہی اپنے حوالہ سے کافی ہے۔

یہاں ایک سوال ممکن ہے اور وہ یہ کہ آیت مبارکہ میں لفظ ''اثم'' استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ اس مذموم فعل کے لئے ہے جو انسان کو نیکیوں اور اچھائیوں واچھے اعمال کی انجام دہی میں رکاوٹ بنے اور نیکیوں تک رسائی کی کوششوں کو کمزور کر دے، تو اس کی بجائے گناہ کے معنیٰ کے لئے دیگر الفاظ کیوں ذکر نہیں کئے گئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اسی لفظ کا استعمال ہی موزوں تھا کیونکہ یہ مقام ہی اس کا متقاضی ہے، چونکہ اس میں خدا کے ساتھ شریک قرار دینے کا حوالہ ہے اور شرک ہی کے فروعات کی عملداری ہے جو کہ نزولِ رحمت کی راہ میں رکاوٹ ہے، یہی حال کفر والے شرک کا ہے کہ وہ مغفرت کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے جیسا کہ آیۂ مبارکہ میں ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ'' (اللہ ہرگز یہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے) کے بعد یوں مذکور ہے: ''وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا'' (اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا اس نے افتراء پردازی کی جو کہ بہت واضح گناہ ہے، کھلی کھلی نافرمانی ہے)۔

اہل کتاب کی بات

○ ''اَلَمْ تَرَاِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ''

(کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب سے کچھ حصہ دیا گیا، وہ جبت وطاغوت پر ایمان لائے)

لفظ ''جبت'' اور ''جبس'' کا معنٰی ہر وہ چیز ہے جس میں خیر واچھائی نہ ہو، ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی خدا کی بجائے عبادت کی جائے۔

لفظ ''طاغوت'' دراصل لفظ ''طغیان'' کی طرح مصدر ہے لیکن اکثر اسے فاعل کے معنٰی میں استعمال کیا جاتا ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا معنٰی ہر وہ معبود ہے کہ خدا کے علاوہ جس کی پوجا کی جاتی ہو۔

اس آیۂ مبارکہ میں ایک واقعہ سے آگاہی دلائی گئی ہے جس میں بعض اہل کتاب نے کافروں کے حق میں اور مؤمنوں کے خلاف فیصلہ دیا اور کہا کہ مشرکین، مؤمنین سے زیادہ ہدایت یافتہ اور ان کا راستہ، مؤمنوں کے راستہ سے زیادہ ہدایت کی منزل سے قریب تر ہے، حالانکہ مؤمنین کے پاس اس دین توحید ویکتا پرستی کے سوا کچھ نہ تھا کہ جو قرآنِ مجید میں نازل کیا گیا ہے جو کہ اس چیز کی تصدیق کرتا ہے جو ان (اہل کتاب) کے پاس ہے جبکہ مشرکین کے پاس ''جبت'' و ''طاغوت'' پر ایمان کے سوا کچھ بھی نہ تھا، تو ان کا یہ فیصلہ ان کی طرف سے مشرکین کے برحق ہونے کے اعتراف کی ایک صورت تھی اور وہ یہ کہ مشرکین کو حق کی نعمت حاصل ہے جبکہ وہ جبت وطاغوت پر ایمان کے سوا کچھ نہ تھا کہ جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف دی اور پھر انہیں ان الفاظ میں مورد لعنت قرار دیا: ''اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ........الخ'' (یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے)۔

یہ بات اس آیۂ مبارکہ کے شانِ نزول میں وارد ہونے والی ان روایات کی تصدیق کرتی ہے جن میں مذکور ہے کہ مکہ کے مشرکین نے اہل کتاب سے درخواست کی کہ وہ ان کے اور مومنوں کے درمیان اس دین کے بارے میں جاری نزاع کا فیصلہ کریں کہ ہم میں سے کون حق پر ہے اور کس کا دین ومسلک صحیح ہے؟ تو اہل کتاب نے مؤمنین کے مقابلے میں مشرکین کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا کہ مشرکین جس راہ پر ہیں وہ مؤمنین کی راہ سے زیادہ ہدایت کے قریب ہے۔ عنقریب ''روایات پر ایک نظر'' میں مربوطہ روایت ذکر کی جائے گی۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ آیت مبارکہ میں اہل کتاب کے حوالہ سے یوں کہا گیا ہے: ''الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ'' (وہ لوگ کہ جنہیں کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا) تاکہ ان الفاظ سے ان کی مذمت وسرزنش کی شدت کا اظہار ہو

کیونکہ ان کا جبت و طاغوت پر ایمان لانا جبکہ وہ کتاب اللہ کا علم رکھتے ہیں کہ اس میں جبت و طاغوت پر ایمان لانے کے بارے میں کیا مذکور ہے، نہایت شرمناک اور ذلت بخش ہے۔

اقتدار و اختیار کا مذمتی حوالہ

○ "اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ......... تا "نَقِيْرًا........"
(یا ان کے لئے اقتدار و اختیار میں کوئی حصہ ہے........)

ایک ادبی بحث

لفظ "نقیر" بروزن "فعیل" (صفت مشبہ) اسم مفعول کے معنٰی میں ہے یعنی "منقور" اس سے مراد وہ نہایت چھوٹی و کم مقدار والی چیز ہے جسے پرندہ اپنی چونچ کے ذریعے زمین سے اُٹھاتا ہے، اس کا دوسرا معنٰی جملہ "وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا" کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔

حرف "اَمْ" (اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ) کے بارے میں اہل نظر کا قول ہے کہ اس مقام پر یہ منقطعہ ہے یعنی یہاں "بل" (بلکہ) کے معنٰی میں ہے، اس بناء پر آیت کا معنٰی یوں ہوگا: "بل الهم نصيب من الملك" بلکہ، کیا ان کا اقتدار و اختیار میں کوئی حصہ ہے؟ اس طرح کا سوال استفہام انکاری کہلاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کوئی حق و حصہ حاصل نہیں ہے۔

بعض اہل النظر کہتے ہیں کہ حرف "اَمْ" (اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ) اس مقام پر منقطعہ نہیں بلکہ متصلہ ہے یعنی "یا" کے معنٰی میں ہے (یا ان کا اقتدار میں کوئی حصہ ہے؟) اس بناء پر آیت کے فہم المعنٰی کے لئے یوں فرض کیا جائے گا: "اهم اولیٰ بالنبوة ام لهم نصيب من الملك" (کیا وہ نبوت کے زیادہ حقدار ہیں یا اقتدار میں ان کا کوئی حصہ ہے؟) لیکن اس رائے کو رد کرتے ہوئے یوں کہا گیا ہے کہ کلام میں ہمزہ کا حذف کرنا شعری ضرورت کی بناء پر ہوتا ہے یعنی جب کوئی شاعر اپنے اشعار کے وزن و قافیہ کو درست کرنا چاہے تو ہمزہ کو حذف کر دیتا ہے جبکہ قرآنِ مجید میں اس طرح کی ضرورت موجود نہیں۔

البتہ ہماری نظر میں یہاں حرف "اَمْ" متصلہ ہے اور ظاہر الآیہ سے اسی کا ثبوت ملتا ہے، اور اس کی جو شق حذف

ہوئی ہے اس کا ثبوت جملہ ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ '' ہے، بنا برایں آیت کے فہم المعنیٰ کے لئے یوں فرض کرنا ہوگا: ''الهم كل ما حكموا به من حكم ام لهم نصيب من الملك ام يحسدون الناس '' (کیا انہیں یہ حق حاصل ہے کہ جو چاہیں حکم صادر کر دیں، یا اقتدار میں سے ان کا کوئی حصہ ہے، یا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں؟)۔

اگر یہ معنیٰ مراد لیا جائے تو کلام کی تمام شقیں درست ہو جائیں گی اور ان کی ترتیب سالم رہے گی بلکہ پورا کلام اپنے اصل رخ پر رہے گا۔

لفظ ''ملك'' سے مراد، مادی و معنوی دونوں امور پر اقتدار و اختیار ہے۔ لہٰذا اس میں نبوت، ولایت، ہدایت، جان و مال کی ملکیت سب شامل ہیں کیونکہ سابقہ و لاحقہ تمام جملوں سے بظاہر اسی کا ثبوت ملتا ہے اور وہ اس طرح کہ سابقہ آیت میں اس مطلب کی اشارہ تھا کہ اہلِ کتاب مدعی ہیں کہ وہی مؤمنین کے بارے میں فیصلہ کرنے اور ان پر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں اور یہ بات فضائل و کمالات پر اقتدار و اختیار جیسی ہے، اور آیۂ مبارکہ کا ذیلی جملہ ''فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا'' مادیات پر اختیار و ملکیت کا کلی یا جزوی اختیار ثابت کرتا ہے لہٰذا ان کی ملکیت و اقتدار اور اختیار سے مراد یہ ہے کہ اس کا دائرہ مادیات و معنویات دونوں کو اپنی وسعت میں لئے ہوئے ہے جس کے نتیجہ میں آیۂ مبارکہ کا معنیٰ یہ ہوگا: ''ام لهم نصيب من الملك الذى انعم الله به على نبيه بالنبوة والولاية والهداية ونحوه، ولو كان لهم ذلك لم يؤتوا الناس اقل القليل الذى لا يعتد به لبخلهم وسوء سريرتهم '' (کیا ان اہل کتاب کا اس اقتدار میں کوئی حصہ ہے جو اللہ نے اپنے نبی کو نبوت، ولایت، ہدایت اور ان جیسے مناصب کی صورت میں عطا کیا ہے؟ اگر ان کے پاس اس طرح کا اختیار و اقتدار ہوتا تو وہ لوگوں کو وہ کمترین و معمولی ترین چیز بھی نہ دیتے جو قابلِ توجہ ہی نہیں ہوتی کیونکہ وہ نہایت بخیل اور بدباطن ہیں)۔ اس حوالہ سے یہ آیۂ مبارکہ درج ذیل آیۂ کریمہ کے ہم معنیٰ قرار پاتی ہے:۔

سورۂ اسراء، آیت: ۱۰۰

○ ''قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ''

(کہہ دیجئے کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک بنو تو تم انفاق اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ روک لوگے)

حسد کے حوالہ سے مذمتی اظہار

○ ''اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ''

(یا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس چیز کے بارے میں جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کی ہے)

یہ ان تینوں شقوں میں سے آخری شق ہے جو آیۂ مبارکہ میں مذکور ہیں اور اس میں یہودیوں کے اس فیصلے کا جواب ہے جو انہوں نے مؤمنین کے خلاف مشرکین کے حق میں دیا کہ ان (مشرکین) کا راستہ، مؤمنوں کے راستہ سے زیادہ ہدایت سے قریب تر اور بہتر ہے۔

یہاں آیۂ مبارکہ میں لفظ ''النَّاس'' سے مراد۔ جیسا کہ آیت کے سیاق سے ثابت ہوتا ہے۔ مؤمنین ہیں اور ''بما اتاھم اللہ من فضلہ'' (جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کیا) سے مراد نبوت، کتاب اور دینی معارف ہیں۔ البتہ آیت کے ذیلی جملہ ''فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا'' (ہم نے آل ابراہیم کو کتاب وحکمت عطا کی اور انہیں عظیم اقتدار سے نوازا) سے ثابت ہوتا ہے کہ آل ابراہیم سے مراد حضرت رسول خدا محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور اس آیۂ مبارکہ میں آنحضرت ﷺ کے علاوہ عام لوگوں کو اللہ کی عنایت وفضل سے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے تو وہ آنحضرت ﷺ کے سبب ووسیلہ سے ہے اور آپ ﷺ ہی کی برکات عالیہ کا حصہ ہے۔ اور ہم سورۂ آل عمران کی آیت ۳۳ ''اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ .... الخ'' کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ اس میں آل ابراہیمؑ سے حضور ختمی مرتبت ﷺ اور آپ ﷺ کی آل مراد ہے۔

ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ ایک فرد پر جمع کا لفظ کیوں استعمال ہوا یعنی لفظ ''النَّاس'' جو کہ جمع کا معنیٰ دیتا ہے (لوگ) اسے مفرد کے لئے کیوں ذکر کیا گیا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے استعمال واطلاق میں کوئی حرج نہیں کیونکہ کنایۃً اس طرح کا استعمال روا ہے، اس کی مثال عام محاوروں میں پائی جاتی ہے کہ جب کوئی شخص آپ سے بدتمیزی کرے اور آپ کو اذیت دینے کے درپے ہو تو آپ اسے کہتے ہیں: ''لا تتعرض للناس'' لوگوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرو ''ومالك والناس'' تجھے لوگوں سے کیا غرض؟ تو اس میں لوگوں سے مراد کہنے والا ایک شخص ہوتا ہے اور آپ اپنے آپ کو مقصود قرار دے کر گویا یوں کہہ رہے ہوتے ہیں کہ مجھ سے مت الجھو، مجھے مت چھیڑو۔

آل ابراہیم کا حوالہ

○ ''فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ....''

(ہم نے آل ابراہیم کو کتاب وحکمت عطا کی ہے........)

اس جملے میں اہل کتاب کو ان کے مقاصد کے حصول میں ناکامی ومایوسی کا شکار ہونے کی عملی صورت سے آگاہی

دلائی گئی ہے کہ وہ مؤمنین سے جس وجہ سے حسد کرتے ہیں اس میں انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوگی اوران کی یہ امید ہرگز پوری نہیں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو جونعمت عطا فرمائی اور جس طرح اپنے فضل وعنایت سے نوازا وہ ان سے واپس لے لے اور انہیں اس سے محروم کردے، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مزید نعمتوں سے نوازا ہے اور انہیں اپنے فضل وکرم اور عنایات ورحمت کے خزانے عطا کئے ہیں لہٰذا اہلِ کتاب ان مؤمنین پر اللہ کی عنایات دیکھ کر غیض وغضب کی آگ میں جل جائیں کہ انہیں ان کا حسد ہرگز کوئی فائدہ نہ دے گا۔

ان مطالب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں آلِ ابراہیم سے یا تو حضرت پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کی آل مراد ہے جو حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہیں۔ یا سارے آل ابراہیمؑ مراد ہیں خواہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہوں یا حضرت اسحاقؑ کی نسل سے ہوں، دونوں صورتوں میں حضرت پیغمبر اسلام ﷺ ان میں شامل ہیں جو کہ یہودیوں کے حسد کا اصل نشانہ ہیں۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اس میں بنی اسرائیل شامل نہیں یعنی یہاں آل ابراہیم سے مراد بنی اسرائیل نہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوتو سارا بیان ہی بے معنی ہوجائے گا اور وہ اس طرح کہ یہودیوں کو ان کے حسد کرنے اور مؤمنین بالخصوص حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ کھلی دشمنی رکھنے کی وجہ سے مذمت وسرزنش اور لعنت کا مستحق قرار دیا گیا تو انہیں کتاب وحکمت عطا کئے جانے اور فضل وعنایت سے نوازنے کا تذکرہ کرکے ان کی تعریف وتحسین کیونکر ممکن ہے؟

اس کے علاوہ یہ مطلب بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جس کا اشارہ ہم پہلے کرچکے ہیں کہ جملہ ''فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِیۡمَ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت میں لفظ ''النَّاسَ'' کہ جن سے یہودیوں نے حسد کیا اس سے مراد صرف حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات ہے تمام مؤمنین کہ جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے، مراد نہیں کیونکہ وہ سب آلِ ابراہیم نہیں تھے، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے جو لوگ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے وہ دوسرے عام ایمان والوں کی طرح ہیں ایمان لانے کی نسبت سے انہیں دوسروں پر برتری حاصل نہیں کہ صرف اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ مورد ستائش قرار دے، صرف ایمان لانے اور حضور ﷺ کا اتباع کرنے کی وجہ سے وہ آیت مُبارکہ میں مذکور آلِ ابراہیم میں سے قرار نہیں پاسکتے، چنانچہ اس کی مثال درج ذیل آیہ مبارکہ میں موجود ہے:

○ سورۂ آلِ عمران، آیت: ۶۸:

''اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا''

(بیشک، ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے...)

اس آیت میں ''الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا'' (وہ لوگ جو ایمان لائے) کو آل ابراہیم سے موسوم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ زیادہ حقدار ہونا (قریب تر ہونا) آل وذریت میں سے ہونے سے مختلف ہے، اور آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے ابراہیم کی

پیروی کی، تو انہیں آلِ ابراہیم ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا، بنابراین آلِ ابراہیم سے صرف حضرت پیغمبر اسلام ﷺ یا آنحضرت ﷺ اور ان کی آل اور حضرت اسماعیل جو آنحضرت ﷺ کے جد بزرگوار ہیں اور ان کے ہمتا مراد ہیں۔

عظیم منصب کا عطیہ

○ ''وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا''

(اور ہم نے انہیں عظیم اقتدار عطا کیا)

سابق الذکر مطالب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ آیت کا سیاق اس بات کا مُتقاضی ہے کہ یہاں ''مُلك'' سے مراد اس کا وسیع معنیٰ ہو کہ جس میں نبوت، لوگوں کی ہدایت وارشاد کے امور پر حقیقی ولایت واختیار شامل ہے، چنانچہ اس کی تائید و تصدیق اس مطلب سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیاوی اقتدار کو اس وقت تک کوئی اہمیت واحترام نہیں دیتا جب تک اس کا سلسلہ کسی معنوی فضیلت ودینی اعزاز وکمال پر مُنتہی نہ ہو، اس کے علاوہ یہ بات بھی اس مطلب کی تائید وتصدیق کرتی ہے کہ خُداوند عالم نے آلِ ابراہیم کو اپنے فضل وعنایت سے جو نعمتیں عطا کیں ان میں نبوت وولایت کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف کتاب و حکمت کا ذکر کیا: ''فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡـكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ'' (ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب وحکمت عطا کی)، بنابراین اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہاں ''وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا'' (اور ہم نے اُنہیں عظیم اقتدار عطا کیا) کے اطلاق میں نبوت وولایت شامل ہیں۔

ایمان لانے والے اور منہ موڑنے والے

○ ''فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡهُ''

(ان میں سے بعض اس پر ایمان لائے اور بعض نے اس سے منہ موڑ لیا)

لفظ ''صَدّ'' کا معنیٰ منہ موڑنا، روگردانی کرنا اور راستہ روکنا ہے۔ یہاں ایمان کا تقابل صَدّ یعنی راہ روکنے سے ہوا ہے کیونکہ یہودی کتابِ خدا اور آنحضرت ﷺ پر ایمان نہ لانے پر اکتفاء نہ کرتے تھے بلکہ ان کی بھرپور کوشش ہوتی تھی کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکیں اور اللہ نے جو کتاب نازل فرمائی اس پر ایمان لانے سے باز رکھیں۔ البتہ لفظ ''صَدّ''

گا ہے بمعنیٰ اعراض یعنی روگردانی آتا ہے، اس صورت میں تقابلی تذکرہ کسی اضافی مطلب یا تاویل وغیرہ کی ضرورت کے بغیر درست قرار پائے گا۔

جہنم کی سزا

○ ''وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا''

(اور جہنم کی آگ ہی جلانے کے لئے کافی ہے)

اس جملہ میں یہودیوں کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا گیا ہے کیونکہ اُنہوں نے کتاب اللہ پر ایمان لانے سے منہ موڑا اور دوسروں کو اس سے منع کیا، اور حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایمان لانے کے خلاف فتنہ کی آگ بھڑکائی۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو دوزخ کی آگ کے شعلوں کی سزا سے متنبہ کیا اور اسے ان کے لئے کافی قرار دینے کو ان الفاظ سے وابستہ کر کے بیان فرمایا: ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا.........الخ'' (جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ہم بہت جلد انہیں دوزخ کی آگ میں جلائیں گے.......) اور اس کے فوراً بعد یوں ارشاد فرمایا: ''والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سندخلهم جنّات تجری من تحتها الانهار خالدین فیها ابداً......الخ'' (اور جو لوگ ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ انجام دیئے تو بہت جلد ہم انہیں ان باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے.......الخ) ان دونوں فریقوں کا تقابلی تذکرہ اس لئے کیا کہ ان کے درمیان فرق واضح ہو جائے کہ ان میں سے ایمان لانے والا کون ہے اور ایمان سے روگردانی کرنے والا کون ہے؟ اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ یہ دونوں اخروی زندگی کی سعادت و شقاوت کی دو مختلف جہتوں و سمتوں میں ہیں۔ ایک گروہ ان باغات میں ہوگا جن میں گھنے درختوں کے سایے انہیں نصیب ہوں گے جبکہ دوسرا گروہ دوزخ کی آگ کے شعلوں کی زد میں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے)۔

اس طرح دونوں آیتوں کے معانی واضح ہو گئے۔

ادائے امانت و عدل کا حکم

○ ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ''

(اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب تم فیصلہ کرو........)

اس آیۂ مبارکہ کا دوسرا فقرہ یعنی "وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ" (جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو) اپنی ماقبل آیات سے واضح ارتباط رکھتا ہے کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی طرف سے مشرکین کے حق میں اس فیصلہ کا تذکرہ کیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ وہ مومنین سے زیادہ ہدایت کی راہ پر ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنے بیان کی ابتداء میں فرمایا کہ انہیں کتاب میں سے حصہ دیا گیا ہے، اور کتاب میں آیات اور معارف الٰہیہ کی وضاحت و تفصیلی بیانات ہیں جو کہ ایسی امانتیں ہیں جن کے بارے میں ان سے عہد و پیمان لیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کی جائیں اور انہیں ان کے اہل لوگوں سے نہ چھپایا جائے۔ تو ان قرائن و شواہد سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہاں امانتوں سے مراد مالی و غیر مالی دونوں امانتیں ہیں اور غیر مالی امانتوں میں وہ علوم و معارف اور برحق امور ہیں کہ جن کے حاملین پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ انہیں اہل افراد تک پہنچائیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جب یہودیوں نے ان خدائی امانتوں میں خیانت کی جو ان کے سپرد کی گئی تھیں کہ جن میں توحید کے حقائق اور نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں شامل ہیں اور انہوں نے ان کا کتمان کیا، ان پر پردہ ڈالا اور جس وقت ان کا اظہار لازمی تھا انہوں نے ان کے اظہار سے اجتناب کیا، پھر اس پر اکتفاء و قناعت نہ کی بلکہ اپنے فیصلہ پر عملی طور پر ڈٹ گئے اور مشرکین و مومنین کے درمیان فتنہ انگیزی کی آگ شعلہ ور کردی اور وثنیت و بت پرستی کو توحیدی دین پر فوقیت و برتری کے اپنے فیصلہ میں حد سے بڑھ گئے۔ یہاں تک کہ ان کی طرف سے اس طرح کی عملی خیانت کے نتیجہ میں وہ اللہ کی لعنت کے حقدار قرار پائے اور انہیں دوزخ کی جلتی ہوئی آگ کے عذاب کی سزا سنائی گئی، تو جب صورتحال یہاں تک پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خطاب و بیان کا انداز بدل دیا اور انہیں مخاطب کرنے کے بجائے غائب کے صیغوں میں مطالب بیان کئے اور لوگوں کی امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کرنے اور فیصلوں میں عدل اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ" (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو)۔

بنا براین ادائے امانت اور فیصلہ میں عدل قائم کرنے کا جو وسیع معنیٰ ہم نے ذکر کیا ہے وہ آیت مبارکہ کے سیاق ہی کی بنیاد پر ہے جیسا کہ آپ قارئین کرام اس سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں۔ لہٰذا اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ لفظ امانت اور حکم (فیصلہ) سے عام طور پر ان کے مالی و مادی موارد مراد لئے جاتے ہیں یعنی امانت میں مالی امانتداری اور حکم و فیصلہ میں مادی امور میں تنازعات کے فیصلے مراد ہوتے ہیں، کیونکہ آیت مُبارکہ کے مضمون سے شرعی حکم کے تناظر میں یہ معنی و مطلب سامنے آتا ہے کہ مالی امانت کو اس کے مالک کو واپس کرنا واجب ہے اور قاضی کے عدل سے بھی مالی امور میں تنازع کے وقت شرعی فیصلہ کرنا ہی سمجھا جاتا ہے، البتہ شرعی احکام جب مطلق صورت میں صادر ہوں تو انہیں فقہی فرعی احکام کے موضوعات میں سے کسی موضوع کے ساتھ مقید نہیں کیا جا سکتا بلکہ قرآنِ مجید میں جب امانت کی واپسی کا واجب و لازم ہونا بیان ہو اور فیصلہ میں

عدل قائم رکھنا واجب قرار دیا جائے اور ان دونوں احکام کو مطلق اور کسی قید و شرط سے خالی بیان کیا جائے تو اسے فقہ میں صرف مالی امانت کی واپسی اور مالی تنازعات سے مربوط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یعنی قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا جائے کہ امانت کی واپسی واجب ہے اور فیصلہ کرنے میں عدل قائم کرنا واجب ہے تو اس میں ہر فقہی موضوع سے اس کا موزوں و مناسب حکم سمجھا جائے گا، اسی طرح تمام اصول و معارف میں یہی عمومی معیار اور وسیع اصول ملحوظ ہوگا۔

روایات پر ایک نظر

ابن عباس کی ایک روایت

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن اسحاق و ابن جریر اور ابن منذر و ابن ابی حاتم نے بیان کیا اور بیہقی نے کتاب دلائل میں جناب ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

''کان رفاعة بن زید بن تابوت من عظماء الیهود اذا کلم رسول الله (ص) لوی لسانهٗ، وقال: ارعنا سمعك یا محمد حتی نفهمك، ثم طعن فی الاسلام وعابهٗ فانزل الله فیه: اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ...... تا......... فَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا''

(رفاعہ بن زید بن تابوت یہودیوں کا ایک بڑا عالم تھا اور جب حضرت رسول خدا ﷺ بات کرتے تو وہ اپنی زبان مروڑ کر مذاق اُڑاتے ہوئے کہتا: کان کھول کر سن اے محمد، تا کہ ہم تجھے اپنی بات سمجھا سکیں، پھر وہ اسلام کے خلاف زبان درازی کرنے لگتا اور دین الٰہی کی عیب گوئی کرتا تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے کہ وہ گمراہی کو خریدتے ہیں..... تا..... پس وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم)

اسی تفسیر میں ایک روایت ابن جریر اور ابن ابی حاتم کے اسناد سے ذکر کی گئی ہے کہ سدیؔ نے کہا کہ آیہ مبارکہ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ.......... الخ'' مالک بن صیف اور رفاعہ بن زید بن تابوت کہ جو قبیلہ بنی قینقاع سے تھا کے بارے میں نازل ہوئی۔

اسی تفسیر میں مذکور ہے کہ ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے، اور بیہقی میں کتاب دلائل میں ابن

عباس کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے یہودیوں کے بعض بزرگ علماء سے گفتگو فرمائی جن میں عبداللہ بن سوریا اور کعب بن اسد شامل تھے، آنحضرت ﷺ نے اُن سے فرمایا: یامعشر الیهود، اتقوا الله واسلموا، فو الله انکم لتعلمون ان الذی جئتکم به لحق (اے گروہِ یہود! خدا سے ڈرو اور اسلام قبول کرو، قسم بخدا، تم بخوبی آگاہ ہو کہ میں جو کچھ تمہارے پاس لایا ہوں وہ حق ہے) اُنہوں نے آنحضرت ﷺ کے جواب میں یوں کہا: ''ما نعرف ذلك یا محمد'' (ہم اسے نہیں جانتے اے محمد) اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ''یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا'' (اے وہ لوگو کہ جنہیں کتاب دی گئی ہے تم اس پر ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے.........الخ) (ملاحظہ ہو: تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم صفحہ ۱۶۸)

سابق الذکر مطالب و بیانات میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ آیاتِ مُبارکہ اگرچہ اہل کتاب میں سے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کے شان نزول کی بابت جو کچھ ذکر کیا جا چکا ہے اس کی روشنی میں صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ روایات میں ان مطالب کے ایک تطبیقی مورد کی نشاندہی کی گئی ہے جو آیات میں ذکر کئے گئے ہیں جیسا کہ اسبابِ نزول کے بیان پر مشتمل دیگر روایات کا حال ہے۔ واللہ اعلم

سفیانی کے خروج کا تذکرہ

تفسیر برہان میں نعمانی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے اسناد سے جابر کا بیان ذکر کیا ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے ایک طولانی بیان میں سفیانی کے خروج کے بارے میں ارشاد فرمایا:

''وینزل امیر جیش السفیانی البیداء فینادی مناد من السماء: یا بیداء، ابیدی بالقوم فیخسف بهم فلا یفلت منهم الا ثلاثة نفر یحول الله وجوههم الی اقفیتهم، وهم من کلب، وفیهم نزلت هذه الآیة: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَا...........''

(سفیانی کے لشکر کا سردار کھلے میدان میں اُترے گا، اس وقت آسمان سے ایک ندا دینے والا یوں ندا دے گا: اے بیداء، ان لوگوں کو اپنے اندر لے لے (نگل جا) تو بیداء انہیں نگل لے گا سوائے تین افراد کے، کہ خدا ان کے چہروں کو ان کی پشتوں کی طرف موڑ دے گا، وہ باقی رہ جائیں گے، وہ کتے کی طرح ہوں گے۔ انہی کے بارے

میں یہ آیت نازل ہوئی: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ.........'' (تفسیر برہان، جلد اول، صفحہ ۳۷۳)

یہی روایت تفسیر برہان میں شیخ مفید کے حوالہ سے بھی ذکر ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنے اسناد سے جابر کے حوالہ سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا بیان ذکر کیا ہے جس میں سفیانی کا واقعہ درج ہے۔ (بحوالہ مذکورہ بالا)

امام علیؑ کا ارشاد گرامی

کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں شیخ صدوقؒ نے اپنے اسناد سے نویر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اس نے اپنے والد کے حوالہ سے بیان کیا کہ امام علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں جو اس آیت سے زیادہ مجھے پسند ہو: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ'' (اللہ ہرگز یہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے)۔

اسراف و شرک

تفسیر ''درمنثور'' میں ہے کہ ابن جریر نے ابومجاز کے حوالہ سے بیان کیا کہ جب آیۂ مبارکہ ''یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ.........'' نازل ہوئی تو حضرت پیغمبر اسلام ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی، اس وقت ایک شخص کھڑا ہو گیا اور حضور ﷺ سے عرض کی: خداوند عالم شرک کو بھی معاف کر دے گا؟ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے، اس نے دو تین بار یہی سوال کیا، آنحضرت ﷺ نے ہر بار خاموشی اختیار فرمائی تو اس وقت یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ'' (اللہ یہ معاف نہیں کرے گا کہ کوئی اس کے ساتھ شرک کرے اور اس کے علاوہ جسے چاہے معاف کر دے گا)۔ آنحضرت ﷺ کے حکم پر پہلی آیت کو سورۂ زمر میں اور اس آیت کو سورۂ نساء میں شامل کیا گیا۔

اسی طرح ایک روایت اسی تفسیر میں ابن جریر اور ابن ابی حاتم کے اسناد سے ابن عمر کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ''یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ'' (اے میرے وہ بندو کہ جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو) تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا: کیا شرک کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا اے اللہ کے نبی ﷺ؟ آنحضرت ﷺ نے اس بات کو ناپسند کیا، اس وقت یہ آیت اتری: ''اِنَّ

اللہ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ.........." (اللہ شرک کا گناہ معاف نہیں کرے گا)۔ (تفسیر "درمنثور" جلد ۲ صفحہ ۱۶۹)

ہم سابق الذکر مطالب میں بیان کر چکے ہیں کہ سورۂ زمر کی آیت اپنی مابعد آیات کے تناظر میں مغفرت وتوبہ کے بارے میں ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک سمیت تمام گناہ قابل معافی ہیں اور توبہ سے ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے جبکہ سورۂ نساء کی آیت کا اس سے مختلف مورد و مقام ہے لہٰذا ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے کی نفی کا پہلو نہیں پایا جاتا کہ جس کی بناء پر ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جائے یا ایک کو عام اور دوسری کو خاص قرار دیا جائے۔

مجمع البیان کی ایک روایت

تفسیر مجمع البیان میں کلبی کا بیان مذکور ہے کہ یہ آیت (اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ..........) مشرکین یعنی وحشی غلام اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ جب وحشی غلام نے حضرت حمزہ کو شہید کیا تو چونکہ اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کرے گا تو اسے آزاد کر دیا جائے گا لیکن اس وعدہ کو پورا نہ کیا گیا تو وہ اور اس کے ساتھی جب مکہ مکرمہ آئے تو انہیں اپنے کئے پر پشیمانی وندامت ہوئی چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں خط لکھا جس میں مرقوم تھا: اناقد ندمنا علی الذی صنعناہ، ہم نے جو کچھ کیا ہے اس پر نادم و پشیمان ہیں، اور ہمیں اسلام لانے سے کچھ بھی مانع نہیں سوائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہوئی اس بات کے، کہ جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی کی خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کو ناحق قتل کرتے ہیں (وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ) سورۂ فرقان، آیت ۶۸۔ تو ہم نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کی پوجا کی ہے (شرک کا ارتکاب کیا ہے) اور ہم نے ناحق قتل بھی کیا ہے اور زنا و بدکاری کے مرتکب بھی ہوئے ہیں، لہٰذا اگر یہ آیت نہ ہوتی تو ہم ضرور آپ کی پیروی کرتے، تو ان کے جواب میں یہ آیت اتری: "اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا........" (سوائے اس کے کہ جو شخص اپنے کئے سے توبہ کرلے اور عمل صالح بجالائے..........) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حوالہ سے نازل ہونے والی دو آیتیں وحشی اور اس کے ساتھیوں کے پاس بھیجیں، اُنہوں نے وہ آیتیں پڑھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں خط لکھا کہ یہ شرط بہت سخت ہے، ہمیں ڈر ہے کہ عملِ صالح انجام نہ دے پائیں گے اور اس آیت کے اہل نہ ہوں گے، تو یہ آیت نازل ہوئی: "اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ" (اللہ یہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اس کے علاوہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے / کردے گا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت ان کے پاس بھیجی تو انہوں نے اسے پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھجوایا کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہم ان لوگوں میں شامل نہ ہوں گے جن کے بارے میں خدا کی

مشیت ان کی معافی پر ہوگی، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا'' (اے میرے وہ بندو، جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی، تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف کردیتا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کو ان کے پاس بھیجا، جب اُنہوں نے اسے پڑھا تو وہ اور اس کے ساتھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا دائرۂ اسلام میں آنا قبول فرمایا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وحشی سے پوچھا کہ تو نے حمزہؑ کو کس طرح قتل کیا تھا؟ اس نے ساری کیفیت بتائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت رنجیدہ وغمزدہ ہوگئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بہت دکھ ہوا ہے اب تو میرے سامنے نہ آنا، میں تجھے دیکھ نہیں سکتا، چنانچہ وہ شام روانہ ہوگیا اور مرتے دم تک وہیں رہا۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان، جلد دوم، صفحہ ۱۲۲)

اس روایت کو فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کے حوالہ سے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر کبیر، جلد ۱۰ صفحہ ۱۲۵)، اس روایت میں آیات کے حوالہ سے جن موارد کو ذکر کیا گیا ہے ان میں بخوبی غور کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بار بار اس وحشی کے پاس آیات کو بھیجنے کا تذکرہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ روایت جعلی ہے اور اسے جعل کرنے والے نے نہایت چالاکی کے ساتھ کوشش کی کہ اس وحشی اور اس کے ساتھیوں کو خدا کی طرف سے بخشا ہوا ثابت کرے اگرچہ اُنہوں نے ہر طرح کا کبیرہ وصغیرہ گناہ انجام دینے کا اعتراف کیا، یعنی ان کے تمام معاصی وگناہوں (کہ جن میں شرک بھی شامل ہے اور حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق الناس بھی شامل ہیں) کے ارتکاب کے باوجود انہیں معاف کیا گیا، گویا اس سے ہر گنہگار کی معافی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، لہٰذا اس مقصد کے لئے مختلف قرآنی آیات کو یکجا کرکے ان سے استدلال کرتے ہوئے کہیں سے مستثنٰی اور کہیں سے مُستثنیٰ منہ لیا گیا جبکہ ان میں ہر آیت کا اپنا مخصوص مقام ہے کہ جس کا ماقبل اور مابعد ایک دوسرے سے مربوط و پیوستہ ہے بلکہ ان کی پیوستگی وارتباط کی یہ صورت ہے کہ سب ایک ہی سیاق کے حامل ہیں لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا جائے اور ہر ایک سے جدا جدا مطلب ومعنی مراد ومقصود لیا جائے اور ان ٹکڑوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ اس طرح باہم جوڑا جائے جس سے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس وحشی کے درمیان گفتگو اور پیغامات کے سلسلہ کی صورت گری کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے۔

اس روایت کے حوالہ سے بعض مفسرین نے کیا خوب لطیف بیان کیا کہ اسے جعل کرنے والوں نے شاید یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس وحشی کے درمیان باہمی مذاق کا تعلق تھا (معاذ اللہ)۔

بہر حال اس روایت کو جعل کرنے والے نے اس کے سوا کچھ نہیں چاہا کہ اس وحشی کو گناہوں سے معاف کیا ہوا ایسا پاک شخص ثابت کرے کہ اس مغفرت وبخشش کے ساتھ کسی قسم کا گناہ وجرم ضرر رساں نہیں ہوسکتا۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ

حاصل کرنا چاہا کہ گناہ خواہ جس قدر بڑا ہو وہ معاف ہو سکتا ہے بلکہ معاف کر دیا گیا ہے کہ اس پر کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اس طرح کا نظریہ رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو گناہوں و معصیتوں کی سزاؤں سے معاف کر دیا گیا ہے یہ وہی عقیدہ ہے جو نصرانیوں نے پیش کیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز و قبیح تر ہے کیونکہ اُنہوں نے امت کے گناہوں کی معافی کو حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی قربانی کا نتیجہ قرار دیا جبکہ روایت کے جعل کرنے والوں نے اسے وحشی کو خوش کرنے کے لئے جعل کیا۔

اب ذرا اس وحشی کے بارے میں بھی جانیئے کہ وہ کون تھا؟ وہ ابن مطعم کا غلام تھا، اس نے معاویہ کی ماں اور ابو سفیان کی بیوی ہندہ کے ترغیب دلانے پر جنگ احد میں نہایت بے شرمی کے ساتھ حضرت حمزہ کو قتل کیا، پھر وہ مکہ واپس چلا گیا اور جب طائف فتح ہو گیا تو وہ اسلام لایا، تو حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو میرے سامنے ہرگز نہ لانا، اس کے بعد وہ شام چلا گیا اور حمص میں مقیم ہو گیا۔ عمر بن خطاب کی خلافت کے زمانہ میں اسے دربار کا ریکارڈ لکھنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی، لیکن اس کی کثرت سے شراب خوری کی وجہ سے اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا بلکہ اس گناہ کی وجہ سے کئی بار اسے کوڑے بھی مارے گئے یہاں تک عثمان کی خلافت کے زمانہ میں وہ مر گیا، اور اس کی موت کا سبب اس کی کثرت سے شراب نوشی بتایا جاتا ہے۔

ابن عبد البر نے کتاب الاستیعاب میں اپنے اسناد سے ابنِ اسحاق کے حوالہ سے، کہ انہوں نے عبداللہ بن فضل کی سند سے، انہوں نے سلیمان بن یسار کے حوالہ سے، کہ انہوں نے جعفر بن عمرو بن امیر ضمری کے حوالہ سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: میں اور عبداللہ عدی بن خیار ایک سفر پر گئے اور ہمارا گزر حمص سے ہوا کہ جس میں وہ وحشی مقیم تھا، تو ہم نے سوچا کہ اس کے پاس جائیں اور اس سے حضرت حمزہؓ کے قتل کا تفصیلی واقعہ سنیں، راستہ میں ہم سے ایک شخص ملا، تو ہم نے اس سے پوچھا کہ ہم وحشی سے کہاں اور کیسے ملاقات کر سکتے ہیں؟ اس نے کہا کہ وہ تو ہمیشہ شراب کے نشہ میں مست رہتا ہے، جب وہ مستی کی حالت سے باہر ہوتا ہے تو تم اس سے گفتگو کرو گے تو اسے ایک بہترین عرب پاؤ گے کہ جو تم سے بہت اچھی باتیں کرے گا اور جو بات اس سے پوچھو گے اس کا درست جواب دے گا، لیکن اگر اسی مستی کی حالت میں پاؤ گے تو اسے حالتِ غیر میں پاؤ گے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا اور واپس چلے جانا، بہر حال ہم اس کے پاس پہنچے، (تا آخر)، اس روایت میں انہوں نے اپنے اور اس وحشی کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیلات بیان کیں اور ان میں حضرت حمزہؓ کے جنگ احد میں قتل کئے جانے کا واقعہ بھی تھا۔

عہدِ رسالت کی ایک روایت

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ مطرف بن شخیر نے عمر بن خطاب کا بیان ذکر کیا کہ ہم عہد رسالت میں اس طرح کرتے تھے کہ جب ہم میں سے کوئی شخص گناہِ کبیرہ کرتے ہوئے مر جاتا تھا تو ہم گواہی دیتے تھے کہ وہ جہنمی ہے۔ جب یہ

آیت "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" نازل ہوئی تو ہم نے اس طرح کی گواہیاں دینا چھوڑ دیا۔

(ملاحظہ ہو: تفسیر مجمع البیان جلد دوم، صفحہ ۱۲۳)

تفسیر "درمنثور" میں ہے کہ ابن منذر نے معتمر بن سلیمان کے حوالہ سے سلیمان بن عتبہ بارقی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں اسماعیل بن ثوبان نے بتایا کہ میں اپنی مہلک بیماری میں مبتلا ہونے سے پہلے مسجد میں گیا تو وہاں میں نے سنا کہ لوگ یہ آیت پڑھ رہے تھے: "مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا.........." (جو شخص کسی مؤمن کو قتل کرے......) الخ۔

تو مہاجرین وانصار سبھی یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ نے فلاں شخص پر دوزخ واجب کر دی ہے، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" تو سبھی کہنے لگے کہ ماشاء اللہ، اللہ جو چاہے انجام دیتا ہے اور سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ (تفسیر درمنثور۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۶۹)

مذکورہ بالا روایتوں کے قریب المعنٰی بعض روایات ابن عمر کے حوالہ سے متعدد راویوں نے بیان کی ہیں لیکن وہ روایات قرینِ صحت نہیں کیونکہ ہم یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اصحاب اس بات سے ناآگاہ ہوں کہ یہ آیت: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" ان آیات سے زیادہ کسی مطلب کو ثابت کرتی ہو جو شفاعت کی آیات میں مذکور ہے کہ جس کا تفصیلی تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ یا یہ کہ سب کے سب اصحاب اس بات سے غافل ہو گئے ہوں کہ شفاعت والی آیات اکثر مکہ میں نازل ہوئیں مثلاً درج ذیل آیت مبارکہ:

سورۂ زخرف، آیت: ۸۶

○ "وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ"

(اور وہ اللہ کے علاوہ جنہیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کے مالک نہیں، سوائے اس کے کہ جو حق کی گواہی دے جبکہ وہ علم رکھتے ہوں)

اور اس کے مانند شفاعت کی دیگر آیات کہ جو سورۂ یونس، انبیاء، طٰہٰ، سباء، نجم اور مدثر میں موجود ہیں وہ سب مکہ میں نازل ہوئیں اور وہ شفاعت کو واضح طور پر ثابت کرتی ہیں جیسا کہ اس حوالہ سے مربوطہ مطالب بیان ہو چکے ہیں۔ ان آیات میں تمام گناہوں میں شفاعت کی گنجائش کا تذکرہ ہے، البتہ ان میں شفاعت کئے جانے والے شخص کے بارے میں ایک بُنیادی شرط یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ اس دین کا پیروکار ہو جو خُدا کا پسندیدہ ہے یعنی توحید، اور کسی طرح کے شرک کا مرتکب نہ ہو۔ اور خُداوند عالم کہ جو شفاعت قبول کرنے والا ہے اس کی بابت یہ بُنیادی مطلب ملحوظ ہے کہ شفاعت اس کی مشیت پر موقوف ہے بنابرایں آیاتِ شفاعت کا خلاصہ وماحصل یہ ہے کہ ہر گناہ کی مغفرت وبخشش ہوگی بشرطیکہ وہ شرک کا گناہ نہ ہو اور دوسرا یہ کہ خدا کی مشیت اس مغفرت سے تعلق پکڑے۔ یہی بات زیر نظر آیت مبارکہ "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا

دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ" سے سمجھی جاتی ہے۔

یہاں یہ مطلب قابلِ توجہ ہے کہ جن آیات مُبارکہ میں کسی انسان کو ناحق قتل کرنے والے، سود خور اور قطع رحمی کرنے والے کو دوزخ کی سزا کا حقدار قرار دے کر یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے تو ان میں حتمی و نا قابلِ تبدیلی سزا کا بیان مقصود نہیں بلکہ صرف ان لوگوں کو باخبر و متنبہ کرنا اور اس سے بچ کر رہنے کی تاکید مطلوب ہے۔

آیات ملاحظہ ہو:

قاتل کے بارے میں:

سورۂ نساء، آیت ۹۳:

○ "وَمَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیۡهَا"

(اور جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے وہ ہمیشہ اس میں رہے گا)

سود خور کے بارے میں:

○ سورۂ بقرہ، آیت: ۲۷۵

"وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ"

(اور جو شخص سود خوری میں واپس چلا جائے تو وہ اور اس جیسے لوگ جہنمی ہیں کہ ہمیشہ اس میں رہیں گے)

قطع رحمی کرنے والے کے بارے میں:

○ سورۂ رعد، آیت: ۲۵

"اُولٰٓئِکَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ"

(وہی ہیں جن کے لئے لعنت ہے اور انہی کے لئے بُرا ٹھکانہ ہے)

ان آیات میں تین قسم کے گناہوں و جرائم کے مرتکب افراد کے بارے میں اُن کے جہنمی ہونے اور ہمیشہ اس میں رہنے کا بیان ہے، لیکن آیا یہ سزا حتمی ہے کہ جس میں خدا بھی تبدیلی نہیں لا سکتا، اس سلسلہ میں آیات کے الفاظ سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

بہر حال آیۂ مبارکہ "اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِهٖ........" میں شفاعت کی آیات میں مذکور مطالب سے زیادہ کسی مطلب کا ثبوت نہیں پایا جاتا کہ جس کی بناء پر مذکورہ بالا روایت کے جعل کرنے والوں کو موقع مل سکے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت کو جعل کرنے والے ان آیاتِ مبارکہ سے کہ جن میں کبیرہ گناہوں کی سزاؤں کا تذکرہ ہے ان سزاؤں کا حتمی و لازمی ہونا سمجھنے سے ناتوان تھے اس لئے مغفرت والی آیات کے نزول سے پہلے ان گناہوں کے

مرتکب افراد کے دوزخ کی آگ میں جلنے کی کھلی گواہی نہ دے سکے، یعنی وہ ان آیات سے سزاؤں کے حتمی ہونے سے آگاہی حاصل نہ کرسکے کہ اس کی بناء پر کبائر کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں ان کے دوزخ کی آگ میں جلنے کی گواہی دے سکتے۔ اور نہ ہی ان کے توان میں تھا کہ آیہ مبارکہ "اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ........الخ" سے کوئی ایسا مطلب نکال سکیں جو شفاعت والی آیات سے سمجھا نہ جاسکتا تھا کہ جس کی بناء پر وہ یہ کہہ سکیں کہ یہ آیت، کبیرہ گناہوں کی سزاؤں کے بیان پر مشتمل آیات کی تخصیص یا تقیید یا نسخ کا باعث بنتی ہے، چنانچہ اسی مطلب کا اشاراتی ذکر بعض روایات میں موجود ہے کہ جسے تفسیر در منثور میں ابن فریس، ابی یعلی، ابن منذر اور ابن عدی کے حوالہ سے ابن عمر کی نسبت سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کبائر کے مرتکب افراد کے لئے مغفرت کی دعا نہ کرتے تھے یہاں تک کہ ہم نے اپنے نبی ﷺ سے یہ آیت سنی: "اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ" اور آنحضرت ﷺ سے یہ بھی سنا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "انی ادخرت دعوتی شفاعتی لاهل الکبائر من امتی" (میں نے اپنی دعاؤں کو اپنی امت میں سے کبیرہ گناہوں کے مرتکب افراد کی شفاعت کے لئے ذخیرہ کیا ہوا ہے) تو ہم نے اپنی بہت سی باتوں کو اپنے دلوں میں چھپائے رکھا اور پھر بارگاہِ الٰہی میں گناہوں کی معافی اور گنہگاروں کے لئے مغفرت کی دعائیں کرنے لگے۔ (تفسیر "درمنثور" میں جلد دوم، صفحہ ۱۶۹)

بنابرایں اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ مغفرت والی آیت سے سمجھا تھا اسی کی مانند شفاعت والی حدیث سے بھی سمجھا، لیکن ایک سوال پھر بھی اپنی جگہ باقی رہ جاتا ہے کہ انہوں نے شفاعت والی حدیث سے کبائر کی مغفرت کا جواز کس طرح سمجھ لیا، جبکہ یہ مطلب انہیں شفاعت والی ان آیات مُبارکہ سے سمجھ میں نہ آیا جو کثیر تعداد میں مکہ مکرمہ میں عرصہ دراز تک نازل ہوتی رہیں، یہ بات میرے لئے نہایت حیرت انگیز ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟

جابر انصاری کی روایت

تفسیر "درمنثور" میں آیہ مُبارکہ "اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ........تا........سَبِیۡلًا" کی تفسیر میں مذکور ہے کہ بیہقی نے کتاب دلائل میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں جابر بن عبداللہ انصاری کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب حضرت رسول خدا ﷺ کا سلسلہ تبلیغ اپنی وسعت کو پہنچ گیا تو کعب بن اشرف نے اپنے آپ کو تمام امور سے دور کرلیا اور مکہ جاکر اس میں قیام پذیر ہوگیا، وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ میں نہ تو محمد (ص) کے خلاف کسی کی مدد کرتا ہوں اور نہ ہی ان سے جنگ کرتا ہوں، اس سے اہل مکہ میں سے کسی نے پوچھا کہ اے کعب! کیا تیرا دین بہتر ہے یا محمد ﷺ اور اُن کے ساتھیوں کا دین بہتر ہے؟ اس نے جواب دیا کہ تمہارا دین بہتر وقدیمی ہے جبکہ محمد ﷺ کا دین نیا ہے۔ اس وقت یہ آیت

نازل ہوئی: ''اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ '' (تفسیر ''درمنثور'' جلد دوم، صفحہ ۱۷۲)

یاد رہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے شانِ نزول کے بارے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں اور مختلف وجوہ واسباب ذکر کئے گئے ہیں کہ جن میں سے سب سے بہتر وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ تاہم ان تمام روایات میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ سب ایک ہی مطلب کو بیان کرتی ہیں یعنی یہ کہ بعض یہودیوں نے قریش کے مشرکوں کے حق میں اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف فیصلہ دیا کہ مشرکوں کا دین محمد (ص) کے دین سے بہتر ہے۔

امام محمد باقرؑ کے صریح ارشادات

آیۂ مبارکہ ''اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ.........'' کی تفسیر میں تفسیر برہان میں امالی شیخ صدوقؒ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ جابر نے امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر بیان کیا کہ امامؑ نے فرمایا: اس آیت میں ''النَّاسَ'' (لوگوں) سے مراد ہم ہیں۔ (تفسیر البرہان، جلد اول، صفحہ ۳۷۷)

کتاب کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے برید کی روایت ذکر کی ہے کہ امام محمد باقرؑ نے طویل بیان میں آیۂ مبارکہ ''اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ.........'' کی تفسیر کے ضمن میں فرمایا کہ اس میں ''النَّاسَ'' سے مراد ہم ہیں کہ ہم سے حسد کیا گیا، حسد کیا جاتا ہے (نحن الناس محسدون) (اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۲۰۵)

یہی مطلب متعدد اسناد کے ساتھ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہے کہ ان اسناد و روایات کا تذکرہ ہماری تمام کتب حدیث میں موجود ہے مثلاً کافی، تہذیب، معانی بصائر، تفسیر قمی، تفسیر العیاشی وغیرہ)

(ملاحظہ ہو: اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۲۷۳، التہذیب، جلد چہارم صفحہ ۱۳۲، بصائر الدرجات، ج اول۔ ص ۳۵۔ تفسیر قمی ج اول۔ ص ۱۴۰۔ تفسیر العیاشی، جلد اول۔ ص ۲۴۶)

اسی روایت کے معنی میں اہلِ سنت کے اسناد سے ابن مغازلی نے اپنی کتاب المناقب میں رواۃ کے بعض حوالوں کے عدم ذکر کے ساتھ ایک روایت ذکر کی ہے جس میں امام محمد باقر علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی مذکور ہے کہ آیۂ مبارکہ: ''اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ.........'' میں لفظ '''' النَّاسَ '''' سے مراد ہم ہیں، بخدا قسم، (نحن الناس واللہ)

(کتاب مناقب، ابن مغازلی، صفحہ ۲۶۷)

تفسیر ''درمنثور'' میں ابن منذر کے حوالہ سے اور طبرانی نے عطاء کے حوالہ سے ابن عباس کا بیان ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے آیۂ مبارکہ ''اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ '' کی تفسیر میں کہا کہ اس میں لفظ ''النَّاسَ '' سے مراد ہم ہیں دیگر لوگ مراد نہیں۔

اسی تفسیر میں ایک روایت مذکور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہاں لفظ "النَّاس" سے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں، یہ بات عکرمہ، مجاہد، مقاتل اور ابو مالک کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے (ملاحظہ ہو: تفسیر در منثور۔ جلد دوم صفحہ ۱۷۳) اور ہم نے اپنے سابق الذکر بیان میں واضح طور پر کہا ہے کہ آیت مبارکہ کے ظاہر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "النَّاس" سے مراد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ بیت اطہارؑ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیوستہ ہیں۔

تفسیر العیاشی میں ایک روایت حمران کے حوالہ سے مذکور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ "فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اس سے مراد نبوت ہے اور اس میں لفظ "الْحِكْمَةَ" اور "مُّلْكًا عَظِيْمًا" سے لوگوں پر ان کی اطاعت کا واجب ہونا مراد ہے۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۴۸)

امامؑ کے فرمان میں اطاعت سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں پر ان کی فرماں برداری کرنے کا وجوبی و لازمی حکم ہے۔ اس مطلب کے بیان پر کثیر روایات وارد ہوئی ہیں کہ جن میں سے بعض روایات میں اس واجب کی گئی اطاعت و فرمانبرداری سے امامت و خلافت مراد لی گئی ہے جیسا کہ کتاب کافی میں کلینیؒ نے اپنے اسناد سے امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان ذکر کیا ہے۔

تفسیر قمی میں آیۂ مبارکہ "اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا" کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ کا فرمان مذکور ہے کہ اس میں آیات سے مراد حضرت امیر المؤمنین اور آئمہ اطہار علیہم السلام ہیں۔ (تفسیر قمی، جلد اول، صفحہ ۱۴۱)

یہ روایت جری و تطبیق کے طور پر ہے یعنی آیت کا ایک مصداق بتایا گیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا ابن ابی العوجاء کو جواب

کتاب المجالس میں شیخؒ نے اپنے اسناد سے حفص بن غیاث قاضی کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں سید الجعافرہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر تھا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب منصور نے امامؑ کو بلوایا ہوا تھا، تو ابن ابی العوجاء جو کہ ملحد ــــــ دھریہ ــــــ تھا۔ امامؑ کی خدمت میں آیا اور اس نے آنجنابؑ سے پوچھا کہ آپ اس آیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں: "كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ" اس میں کہا گیا ہے کہ جب ان کے بدن کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کی جگہ دوسری کھالیں پیدا کر دیں گے تاکہ وہ عذاب میں مبتلا رہیں، تو جب گناہ کرنے والی کھالیں جل چکی ہوں گی تو ان کی جگہ دوسری کھالوں کا کیا قصور کہ انہیں عذاب کا شکار کیا جائے گا؟ امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: تجھ پر افسوس ہے کہ تو نے سمجھا ہی نہیں، وہ کھالیں وہی کھالیں ہیں اور وہ ان کے علاوہ بھی وہی

ہیں کیونکہ وہ اسی انسان کے بدن کی کھالیں ہیں، ابن ابی العوجاء نے کہا: یہ بات ذرا وضاحت کے ساتھ مجھے سمجھائیں، امامؑ نے فرمایا: کیا تو نے کبھی دیکھا ہے کہ کوئی شخص کوئی اینٹ بنائے اور پھر اسے توڑ دے، پھر اسے دوبارہ گارا بنانے کے لئے اس پر پانی ڈالے اور اس سے پھر اینٹ بنائے اور پہلی اینٹ جیسی اینٹ بنالے تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ پہلی والی اینٹ ہی ہے اور وہ ایک نئی اینٹ بھی ہے۔ یعنی وہ پہلی نہیں مگر پہلی ہے۔ ابن ابی العوجاء نے کہا: ہاں، بالکل صحیح ہے، خدا آپ کے وجود سے لوگوں کو علم کی دولت عطا فرماتا رہے۔ (کتاب الامالی، طوسی، جلد دوم، صفحہ ۱۹۳)

اس روایت کو کتاب الاحتجاج طبرسیؔ میں بھی حفص بن غیاث قاضی کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ سے ذکر کیا گیا ہے، اور تفسیر قمی میں بھی مؤلف نے اسے ذکر کیا ہے کہ لیکن سلسلۂ سند کے تمام راویوں کے نام ذکر نہیں کئے۔ بہرحال اس میں جواب کی حقیقت کی بازگشت اس امر کی طرف ہے کہ جب کئی صورتوں کا مادہ ایک ہو تو ان صورتوں میں جس "موجود" کو ملحوظ ومقصود قرار دیا گیا ہے وہ بھی ایک ہے چنانچہ انسانی بدن اپنے دیگر اجزاء کی طرح اس وقت تک وحدت سے متصف ہوگا جب تک انسان اپنی اصل انسانی حقیقت کا حامل رہے خواہ اس میں جس قدر تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں اور تغیرات کا شکار ہو۔ (یعنی جب تک اسے انسان قرار دیا جائے گا اس کے بدن میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اس کی حقیقت میں تبدیلی نہیں پیدا کرسکتیں)۔

پاک بیویوں کا تذکرہ

کتاب "من لایحضرہ الفقیہ" میں مذکور ہے کہ آیۂ مبارکہ "لَهُمْ فِيهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ" کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: "اَزْوَاجٌ" (بیویوں) سے مراد وہ خواتین ہیں جو حیض ودیگر نجاستوں سے پاک ہیں۔
(من لایحضرہ الفقیہ، جلد اول، صفحہ ۵۰)

ادائے امانت کا خدائی حکم

تفسیر "برھان" میں آیۂ مبارکہ "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا.........." کی تفسیر میں محمد بن ابراہیم نعمانی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے اسناد سے زرارہ کی روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام ابوجعفر محمد بن علی الباقر علیہ السلام سے اس آیۂ مبارکہ کا مطلب پوچھا: "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ" تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: اس میں ادائے امانت سے مراد یہ ہے کہ ایک

امام، اپنے بعد میں آنے والے امام کو امامت کی امانتیں سپرد کردے اور اسے اس سلسلہ میں حق حاصل نہیں کہ اسے اس سے محروم کرے، کیا تو نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو کہ اسی کی خُدا تمہیں تاکید کرتا ہے، تو اے زرارہ! اس آیت میں حکام سے خطاب ہوا ہے۔ (تفسیر ''برہان'' جلد اول، صفحہ ۳۸۰)

اس حدیث کے ابتدائی جملے مُتعدد راویوں کے حوالہ سے آئمۂ اہل بیتؑ سے منقول ہیں اور اس کے ذیلی جملوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امامؑ نے اس آیۂ مُبارکہ کے کُلّی مفہوم کو اس کے ایک مصداق پر منطبق فرمایا ہے یعنی آیۂ مُبارکہ مطلق صورت میں ہر امانت کو اس کے حقدار تک پہنچانے کے حکم پر مُشتمل ہے اور اس کا ایک مصداق وہی ہے جو امامؑ کے ارشاد گرامی قدر میں مذکور ہے۔

اسی معنٰی کا ثبوت اس روایت میں پایا جاتا ہے جو تفسیر ''در منثور'' میں سعید بن منصور، فریابی، ابن جریر، ابن منذر اور ابن حاتم کے حوالہ سے مذکور ہے امام علی بن ابی طالبؑ نے ارشاد فرمایا: ''حق علی الامام ان یحکم بما انزل اللہ وان یؤدی الامانۃ فاذا فعل ذٰلك فحق علی الناس ان یسمعوا لہ وان یطیعوا وان یجیبوا اذا دعوا''

(یہ حق امام پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اسی چیز کے مطابق فیصلہ وحکم صادر کرے جو اللہ نے نازل فرمائی اور امانت کو ادا کرے، تو جب وہ ایسا کرلے تو لوگوں پر لازم وواجب ہے کہ وہ اس کی بات سنیں اور اس کی اطاعت کریں اور جب اُنہیں بلایا جائے تو اس پر لبیک کہیں)۔ (تفسیر ''در منثور'' جلد دوم، صفحہ ۱۷۵)

آیات ۵۹ تا ۷۰

○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹

○ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰

○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱

○ فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲

○ اُولٰۤئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۤ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ۝۶۳

○ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۶۴

○ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵

○ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝۶۶

- وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾
- وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾
- وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾
- ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

ترجمہ

○ "اے اہلِ ایمان، تم اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اولی الامر کی، پس اگر تم کسی چیز میں تنازع کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، ایسا کرنا بہتر اور اچھا نتیجہ بخش ہے"

(۵۹)

○ "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے جو آپ پر نازل ہوئی اور جو آپ سے پہلے نازل ہوئی، وہ چاہتے ہیں اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے جائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسے تسلیم نہ کریں، اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بہت دور گمراہی سے دوچار کردے"

(۶۰)

○ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کی ہے اور رسول کی طرف آؤ، تو آپ دیکھتے ہیں کہ منافقین لوگوں کو آپ کی طرف آنے سے سخت منع کرتے اور رکاوٹیں ڈالتے ہیں"

(۶۱)

○ "پھر ان کا کیا حال ہوتا ہے کہ جب ان پر ان کے اپنے کئے کے نتیجہ میں کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے تو پھر وہ آپ کے پاس آ کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ بہتری نیکی اور باہمی اتفاق کے سوا کچھ نہ چاہتے تھے"

(۶۲)

○ ''یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، لہٰذا ان سے درگزر کرو اور انہیں نصیحت کرو اور ان سے ان کے بارے میں پختہ بات کرو''

(۶۳)

○ ''اور ہم نے جس رسول کو بھیجا وہ صرف اس لئے کہ اللہ کے اذن کے ساتھ اس کی اطاعت کی جائے، اور جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو اگر آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے لئے طلب مغفرت کرتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان پاتے''

(۶۴)

○ ''قسم ہے تیرے پروردگار کی کہ وہ لوگ اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ کو اپنے متنازعہ امور میں فیصلہ کرنے والا قرار نہ دیں اور پھر جو فیصلہ کردیں اس کے بارے میں اپنے دلوں میں تنگی نہ لائیں بلکہ اسے اس طرح تسلیم کریں جس طرح تسلیم کرنے کا حق ہے''

(۶۵)

○ ''اور اگر ہم ان پر فرض کردیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو یا اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے جاؤ تو ان میں سے سوائے چند افراد کے، کوئی بھی ایسا نہ کرتا، اور اگر وہ اس پر عمل کرتے جو انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور اس سے ان کے ایمان میں مزید پختگی آجاتی''

(۶۶)

○ ''اور پھر ہم انہیں اپنی طرف سے عظیم اجر عطا کرتے''

(۶۷)

○ ''اور ہم انہیں صراط مستقیم کی ہدایت کرتے''

(۶۸)

○ ''اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے لوگ قیامت کے دن ان کے ساتھ ہوں گے جنہیں اللہ نے انعامات سے نوازا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک وصالح لوگ، اور ان لوگوں کا ساتھ ہونا بہت اچھا ہے۔''

(۶۹)

○ ''یہ اللہ کی عنایت ہے اور اللہ بخوبی آگاہی رکھنے والا ہے''

(۷۰)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرماتے ہیں ــــــ اپنی ما قبل آیات سے بے ربط نہیں کیونکہ اس سورۂ مبارکہ کی آیات "وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا" ہی سے اس اسلوب بیان کی حامل ہیں کہ گویا ان میں لوگوں کو اللہ کی راہ میں انفاق کرنے اور معاشرہ کے تمام طبقات کے اجتماعی استحکام کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ مؤمنین میں سے ضرورت مند افراد کی دستگیری کا خاطر خواہ اہتمام کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور ان افراد کی مذمت کی گئی ہے جو لوگوں کو اس واجب فریضہ کی ادائیگی میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں، اس کے بعد لوگوں کو اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا عملی ثبوت دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ باہمی اختلافات اور تنازعات کی بیخ کنی پر زور دیتے ہوئے نزاع و اختلاف کی صورت میں اللہ و رسول اللہ ﷺ کے سپرد کرنے کی حتمی ضرورت سے مطلع و آگاہ کیا گیا ہے، آیاتِ مبارکہ میں اسی سلسلۂ ہدایت کو آگے بڑھاتے ہوئے جہاد کے خدائی حکم کی طرف توجہات مبذول کروائی گئی ہیں یا اللہ کی راہ میں کوچ کرنے کے تاکیدی فرمان سے آگاہی دلائی گئی ہے۔ لہٰذا یہ تمام آیاتِ مُبارکہ اہلِ ایمان کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے پر آمادہ کرتی ہیں اور ان کے داخلی امور کی بہتر ترتیب و تنظیم کے نظام کو درست کرتی ہیں جیسا کہ اس مطلب کی طرف اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۴۳ میں اشارہ ہوا: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى .... الخ" (اے اہل ایمان تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ)۔

اطاعت کا صریح حکم

○ "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ"

(اے اہل ایمان، تم اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اولی الامر کی)

اس سے پہلے جن امور کو بیان کیا گیا وہ یہ ہیں: اللہ کی توحید و یکتائی پر ایمان کے ساتھ اس کی عبادت بجالائی جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیا جائے، مؤمنین کے تمام طبقات کے درمیان نیکی و احسان کو رواج بخشا جائے۔ جو لوگ دوسروں کو اس نیک عمل سے روکتے ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ سے شدیداً منع کرتے ہیں ان کا ایسا کرنا مذموم ہے ان امور کو بیان کرنے کے بعد دوبارہ اصل مقصود کی طرف توجہ دلائی گئی اور اسلوبِ سخن میں تبدیلی لا کر سابقہ مذکورہ مطالب سے مربوطہ ان فروعات کو بیان کیا گیا جو اسلامی معاشرہ کی بنیادوں کو مستحکم کرتے ہیں اور وہ اس طرح کہ انہیں باہمی اتحاد و اتفاق کا راستہ اختیار کرنے اور اپنے تمام تنازعات کو ختم کرنے کے لئے اللہ و رسول اللہ ﷺ کی طرف اپنا معاملہ لے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک نہایت اہم نکتہ کا بیان

یہ بات ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آیۂ مبارکہ "اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ......... " اگرچہ اس کا مضمون تمام شرعی احکام و خدائی فرامین کی اساس و بنیاد ہے لیکن وہ دراصل اس مطلب کے مقدمہ و تمہید کے طور پر ہے کہ وہ تنازع کی صورت میں اللہ و رسول اللہ ﷺ کی طرف لے جائیں (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ) کہ یہ جملہ ہمارے زیر بحث جملہ کی فرع ہے، اسی طرح اس کے بعد یکے بعد دیگرے مذکور جملے ہیں کہ جو زیر بحث جملہ کے نتیجہ کی صورت میں ہیں مثلاً: "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ...... الخ" اور "وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ..... " اور "فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ........ الخ"۔

اور یہ بات بھی مسلم اور ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ خُداوندِ عالم کا یہ حکم کہ اس کی اطاعت کریں، اس سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو کچھ حضرت رسولِ خدا ﷺ کے ذریعے خدائی احکام و دستورات ہم تک پہنچے ان کی اطاعت و فرماں برداری اور ان پر عمل کریں، اور جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا تعلق ہے تو ان کی دو حیثیتیں ہیں: ایک تشریعی یعنی قانون گزار ہونے کی حیثیت کہ اس کی بنیاد پر آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کے علاوہ وحی کے ذریعے احکام و دستوراتِ الٰہی کی وہ تفاصیل حاصل کر کے لوگوں تک پہنچائیں اور ان کی وضاحت فرمائی جن کا ذکر قرآن مجید میں اجمالی طور پر ہوا تو ان سے مربوط تمام امور و معارف بیان کر دیئے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: "وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ" سورۂ نحل، آیت: ۴۴ (اور ہم نے تیری طرف ذکر و قرآن نازل کیا تا کہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ لوگوں کو بیان کریں جو ان کے لئے نازل کیا گیا ہے)۔

اور دوسری حیثیت حکمران و والی ہونے کی ہے کہ جس کی بنیاد پر آپ ﷺ وہ احکام صادر فرماتے تھے جو ان کے

حاکم وقاضی اور فرمانروا ہونے کے حوالہ سے لازم وضروری قرار پاتے تھے کہ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا:
"لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ" (تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق حکم وفیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھادی ہے)۔

اور یہ آراء ہیں کہ جن کی بنیاد پر آنحضرت ﷺ ظاہری قوانین قضاوت کے مطابق فیصلے صادر فرماتے تھے اور ان کی بناء پر اہم ترین امور ومعاملات میں اہم اقدامات اُٹھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اقدامات میں آنحضرت ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا چنانچہ ارشاد فرمایا: "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (اور ان سے معاملات میں مشورہ کریں، اور جب کچھ کرنے کا فیصلہ کرلیں تو اللہ پر توکل کریں) تو اس آیت میں اللہ نے لوگوں کو مشاورت میں شریک کرنے اور فیصلہ کرنے میں خود اکیلا اقدام کرنے کا حکم دیا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کے واضح ہونے کے بعد آپ محترم قارئین کرام اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا معنیٰ اور ہے اور اللہ کی اطاعت کا معنیٰ اور ہے اگر چہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اصل میں فرمانروا، قاضی وحاکم اور والی وقانون گزار ہے کہ جس کی اطاعت واجب ہے جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا: "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" (اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے اذن کے ساتھ اس کی اطاعت کی جائے)۔ بنابرایں لوگوں پر واجب ولازم ہے کہ رسول ﷺ کی ہر اس چیز میں اطاعت کریں جو وہ وحی کی تفصیل وتوضیح میں ارشاد فرمائیں اور اسی طرح ہر اس چیز میں اطاعت کریں جو وہ اپنی صوابدید کے مطابق حکم وفیصلہ صادر فرمائیں۔ یہی مطلب۔ واللہ اعلم۔ اس بات کا سبب ہوا ہے کہ آیت مُبارکہ میں اطاعت کرنے کا حکم دوبار مذکور ہے: "اَطِيْعُوا اللّٰهَ" اور مفسرین کا یہ قول قرینِ صحت نہیں کہ یہاں "اَطِيْعُوا" کا دوبارہ ذکر کیا جانا تاکید کے طور پر ہے، کیونکہ اگر یہاں تاکید مقصود ہوتی تو دوبارہ ذکر نہ کرنا ہی زیادہ مضبوط اور قوی تر ہوتا یعنی یوں کہا جاتا: "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ" (اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی) کیونکہ اس سے یہ بات زیادہ ظاہر وواضح ہوتی ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت عین اطاعتِ خُدائے متعال ہے اور وہ دونوں اطاعتیں ایک ہی حقیقت وحیثیت رکھتی ہے، وہ دونوں اطاعتیں حقیقت میں ایک اطاعت ہے۔ اور کسی بات کا دوبارہ ذکر کیا جانا ہر جگہ تاکید کا فائدہ نہیں دیتا۔

اور جہاں تک اولوالامر کا تعلق ہے تو وہ جو بھی ہوں، ان کا وحی میں کوئی حصہ نہیں، بلکہ ان کا کام اپنی صوابدید پر مبنی آراء کا اظہار ہے اور وہ اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح حضرت رسولِ خدا ﷺ اپنی صوابدیدی آراء میں واجب الاطاعت ہیں۔ اسی وجہ سے جب تنازع واختلاف میں رجوع کرنے کے وجوبی حکم کو بیان کیا گیا تو اس میں اولوالامر کا نام ذکر نہیں کیا بلکہ صرف اللہ ورسول ﷺ کا نام لیا گیا: "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" (پس اگر تم کسی چیز میں نزاع کرو تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لئے جاؤ اور اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر

ایمان رکھتے ہو) کیونکہ اس میں جن لوگوں کو رجوع کرنے کا وجوبی حکم دیا گیا ہے وہ اہلِ ایمان ہیں کہ جنہیں ابتدائے آیت میں مخاطب قرار دیا گیا: (یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا) اور تنازع سے مراد لوگوں کا آپس میں تنازع ہے لوگوں کا اولوالامر سے تنازع مُرادنہیں کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ جن اولواالامر کی اطاعت واجب قرار دی گئی ہے ان سے تنازع کی بات کی جائے، لہٰذا اس میں لوگوں کا باہمی نزاع ملحوظ ومدِ نظر ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ اس میں ان کی صوابدیدی آراء کی بابت نزاع ملحوظ نہیں بلکہ متنازع فیہ مسئلہ میں حکم الٰہی کی بابت تنازع ملحوظ ہے چنانچہ اس کا ثبوتی اشارہ ان آیات میں پایا جاتا ہے جن میں اللہ ورسول اللہ ﷺ کے حکم سے روگردانی کر کے طاغوت سے فیصلہ کروانے والوں کی مذمت مذکور ہے، لہٰذا اس میں انہی دینی اصولوں کی طرف رجوع کرنا لازم وواجب ہے جو کتاب وسنت میں مقرر ومذکور ہیں۔ اور کتاب وسنت میں ہر اس شخص کے لئے مضبوط وقوی دلیل موجود ہے جو اِن میں مذکورہ احکام ودستوراتِ الٰہی کے فہم وادراک کی صلاحیت رکھتا ہو، اور جب اولواالامر کہ جس کی اطاعت واجب ولازم قرار دی گئی ہے وہ کتاب وسنت میں مذکور احکام کا معنٰی بیان کرے تو اس کی بات یقینی طور پر حجت ہوگی کیونکہ آیتِ مُبارکہ میں اولواالامر کی اطاعت کے واجب ولازمی ہونے میں کوئی قید وشرط ذکر نہیں ہوئی اور نتیجتاً سب کی بازگشت کتاب وسُنّت کی طرف ہی ہے۔

ان مطالب سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اولواالامر کو کسی نئے حکم وقانون گزاری کا حق واختیار حاصل نہیں اور نہ ہی کتاب وسُنّت میں ثابت کسی حکم کو منسوخ کرنے کا حق حاصِل ہے ورنہ نزاع وتنازع کی صورت میں کتاب وسُنّت اور اللہ و رسول کی طرف رجوع کرنے کا وجوبی حکم بے معنی ہوجائے گا حالانکہ درج ذیل آیت میں اس حوالہ سے واضح بیان موجود ہے:

سورۂ احزاب، آیت: ۳۶

"وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ۝"

(کسی مؤمن اور مؤمنہ کو اللہ ورسول اللہ کے فیصلہ کے بعد اپنے کسی امور میں کوئی اختیار حاصل نہیں، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ واضح گمراہی کا شکار ہوا)۔

بنا برایں اللہ کے فیصلہ سے مراد دراصل احکام ودستور سازی اور قانون گزاری ہے اور رسول اللہ کے فیصلہ سے مراد یا وہی خدائی فیصلہ وقانون گزاری ہے، یا اس کا وسیع تر معنٰی ہے۔ کہ جس میں آنحضرت ﷺ کے صوابدیدی احکام بھی شامل ہیں۔ اور جہاں تک اولواالامر کا تعلق ہے تو انہیں اپنی ولایت کے دائرہ میں اپنی صوابدیدی آراء کا حق حاصل ہے اور وہ خدا و رسولِ خدا ﷺ کے احکام کی بنیاد پر متنازعہ موارد اور عمومی موضوعات میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اولواالامر کو چونکہ قانون گزاری ودستور سازی اور احکام کو منسوخ کرنے میں کوئی حق وامتیاز اور اختیار حاصل نہیں بلکہ صرف اس حد تک اختیار و

حق حاصل ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم صادر فرمایا اسے ہی اپنے فیصلوں و اظہارات اور اقدامات کی بنیاد قرار دیں یعنی کتاب وسنت کو اصل و اساس بنائیں۔ اسی لئے اللہ نے دوبارہ ان کا نام نہیں کیا بلکہ تنازع میں صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لیا: ''فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ '' (اگر تم کسی شئے میں تنازع کرو تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ)۔ بنا برایں اس آیت میں ایک اطاعتِ خدا مذکور ہے اور دوسری رسول اور اولی الامر کی اطاعت مذکور ہے لہٰذا ان دو اطاعتوں کا اس طرح تذکرہ فرمایا: ''أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ '' (تم اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول اور اپنے اولی الامر کی)۔ اللہ کی اطاعت کا حکم مستقل ہے اور رسول و اولی الامر کی اطاعت کا حکم اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔

اطاعتوں کا غیر مشروط حکم

زیر نظر آیۂ مبارکہ میں لفظ ''أَطِيعُوا'' کے ذریعے اللہ و رسول ﷺ کی مطلق یعنی ہر طرح کی شرط و قید سے خالی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے: ''أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ '' (اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کوئی ایسا حکم نہیں دیتے اور نہ ہی کوئی ایسی نہی کرتے ہیں جو اللہ کے حکم سے متصادم و مخالف ہو، کیونکہ اگر آنحضرت ﷺ اللہ کے حکم کے خلاف حکم دیتے تو اس سے ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت میں ٹکراؤ اور تناقض پیدا ہو جاتا، لہٰذا آنحضرت ﷺ کے احکام و دستوزات اور فرامین و ارشادات کا اللہ کے احکام و دستورات سے مکمل طور پر یکساں ہونا ضروری ہے جو کہ آنحضرت ﷺ کی عصمت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی بات بعینہ اولی الامر کی بابت ہے البتہ حضور ﷺ کا معصوم ہونا اس آیت کے علاوہ عقلی و منقولی دلائل سے بھی واضح طور پر ثابت ہے جبکہ اولی الامر کی عصمت کا مسئلہ اس سے قدرے مختلف صورت میں پیش اور ثابت ہوتا ہے کہ جس کی بناء پر ممکن ہے کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جن اولی الامر حضرات کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے ان کا معصوم ہونا ضروری نہیں اور ان کی عصمت اس آیت سے ثابت نہیں ہوتی۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں جو حکم صادر ہوا ہے وہ اُمت کی مصلحت و بہتری کی غرض سے ہے تاکہ اس کے ذریعے اہلِ اسلام کا معاشرہ اختلافات اور باہمی خلفشار و بدامنی سے محفوظ رہے، یہ بات قوموں اور معاشروں میں موجود حکمرانی کے اس نظام سے کچھ بھی مختلف و زائد نہیں جس میں کسی فرد کو لازم الاطاعت قرار دیا جاتا ہے کہ جس کا فیصلہ و حکم نافذ العمل ہوتا ہے جبکہ عوام الناس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے حکم و فیصلہ میں معصیت اور غلطی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جب معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے فیصلہ و حکم میں غلطی اور قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے تو اس کی اطاعت نہیں کی جاتی بلکہ اسے اس کی غلطی سے آگاہ و متنبہ کیا جاتا ہے اور جہاں اس کے حکم و فیصلہ میں صرف غلطی کا امکان پایا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ اس نے

اس کا ارتکاب بھی کیا ہو۔ وہاں اس کا حکم نافذ العمل ہوتا ہے خواہ واقع الامر اور حقیقت میں وہ غلطی ہی پر ہو لیکن اس کی اسی طرح کی غلطی کو درخور اعتناء نہیں سمجھا جاتا کیونکہ معاشرتی وحدت و یک جہتی اور اجتماعی ہم آہنگی واتحاد ایسی عظیم اور اہم مصلحت ومقصد ہے جس سے اس طرح کی ممکنہ غلطیوں وغلط فہمیوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان اولوا الامر کی بابت ہے جن کی اطاعت کو واجب ولازم قرار دیا گیا ہے اور آیت میں ان کے واجب الاطاعت ہونے کا تذکرہ ہوا ہے کہ خدا نے مؤمنین پر ان کی فرمانبرداری لازم قرار دی ہے لہٰذا اگر وہ کتاب وسنت کے مخالف کسی چیز کا حکم دیں تو انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل نہیں اور نہ ہی ان کا اس طرح کا حکم وفیصلہ نافذ العمل ہوگا کیونکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق (خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہو سکتی)۔ اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (شیعہ وسنی) نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے اور اسی سے آیت کا اطلاق، مقید ہو جاتا ہے، اور جہاں تک خطاء وغلطی کا تعلق ہے تو جب اس کا علم ہو جائے تو اس صورت میں حق کی طرف رجوع کیا جائے گا جو کہ کتاب وسنّت سے عبارت ہے لیکن اگر علم ویقین نہ ہو بلکہ صرف امکان و احتمال ہو کہ جو حکم اولوا الامر نے صادر کیا ہے وہ کتاب وسنّت کے مطابق نہیں تو اس امکانی پہلو کی پرواہ نہیں کی جائے گی بلکہ اس کا حکم نافذ العمل ہوگا اور اس کی حیثیت وہی ہوگی جو اس کے عدم خطاء ہونے کے یقین کی ہے، لہٰذا اس طرح کے احکام میں حاکم کی اطاعت وفرمانبرداری واجب ولازمی ہے خواہ وہ واقع الامر اور حقیقت میں کتاب وسنت کے مخالف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ امت کے درمیان وحدت واتحاد کا تحفظ نہایت ضروری ہے کہ اس طرح کی عدم مطابقت اور واقع الامر سے مخالفت کا تدارک وتلافی ہو جاتی ہے، اس طرح کے امور کی بازگشت علم الاصول میں مقررہ ان قواعد کی طرف ہوتی ہے جن کے ظواہر کا حجت ہونا مسلم ہے کہ احکام واقعیہ اپنی حالت پر باقی رہیں اور وہ اس طرح کہ ظاہری اصولوں کا حجت وقابلِ قبول ہونا واقع الامر کی خلاف ورزی کا داغ دھو دیتا ہے۔ (واقع الامر کا علم خدا ہی کو ہے)

بہرحال اولوا الامر کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ غیر معصوم کیوں نہ ہوں اور ان کے بارے میں فسق وخطاء کا احتمال بھی دیا جائے، البتہ اگر وہ فسق کا ارتکاب کریں تو ان کی اطاعت نہ ہوگی اور اگر وہ خطاء کے مرتکب ہوں تو ان کا معاملہ کتاب و سنت کی طرف لوٹایا جائے گا لیکن اگر ان کی خطاء معلوم نہ ہو تو ان کا حکم نافذ العمل اور اُن کی اطاعت واجب ہوگی، لہٰذا واقع الامر میں ان کا حکم اگر کتاب وسنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو وہ نافذ العمل ہوگا البتہ ظاہر بظاہر ان کے خلاف نہ ہو کیونکہ اس میں اسلام ومسلمین کی مصلحت اور اہل اسلام کے درمیان ہم آہنگی و یک جہتی کا تحفظ ملحوظ ہے جو کہ نہایت عظیم مقصد ہے۔

تو یہ ہے وہ خیال جو کسی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے، لیکن قارئین کرام اگر ہمارے سابق الذکر مطالب پر اچھی طرح غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ خیال درست نہیں بلکہ بنیادی طور پر ہی غلط ہے اور وہ اس طرح کہ عین ممکن ہے آیتِ مُبارکہ کے اطلاق کو فسق کے حوالہ سے مقید کیا جائے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان میں واضح طور پر مذکور ہے:

"لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہوسکتی، اور اسی طرح وہ آیات کہ جن میں اسی مطلب کا صریح بیان و تائیدی حوالہ پایا جاتا ہے مثلاً: "اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ" سورۂ اعراف، آیت: ۲۸ (اللہ برائی کا حکم نہیں دیتا) اور دیگر آیات کہ جن میں اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے بلکہ عملی طور پر وقوع پذیر بھی ہوا ہے کہ شرعاً اس طرح کی ظاہری حجت کو تسلیم کیا گیا جیسا کہ وہ وفود جو آنحضرت ﷺ مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے ان پر کسی کو سربراہ بنا کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری واجب و لازمی قرار دیتے تھے، اسی طرح حضور ﷺ نے مختلف علاقوں میں جو والی و فرمانروا مقرر فرمائے مثلاً مکہ، یمن، یا اپنی عدم موجودگی اور کسی جنگ کو جاتے ہوئے مدینہ میں اپنی نمائندگی سپرد کر کے گئے تو ان کی فرمانبرداری واجب و لازمی قرار دی، اور مجتہد کا قول و فتویٰ اس کے مقلد کے لئے لازم العمل قرار دیا گیا ہے، بنا بر ایں ان امور کے تناظر میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے آیت کا اطلاق مقید ہوجاتا ہے۔ لہٰذا کسی مسئلہ کا اپنے طور پر صحیح و درست مسائل میں شمار ہونا اور ہے اور اس کا کسی قرآنی آیت کے ظاہر کا مدلول قرار پانا دوسرا مسئلہ ہے۔

زیر نظر آیۂ مبارکہ اولوا الامر کے واجب الاطاعت ہونے کو ثابت کرتی ہے اور اس میں اس حوالہ سے کوئی قید و شرط بھی مذکور نہیں، اور دیگر قرآنی آیات میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی جس سے زیر نظر آیت کے اطلاق کو مقید کیا جاسکے کہ جس کے نتیجہ میں آیت "اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ" کا معنیٰ اس طرح کیا جاسکے: "اطیعوا اولی الامر منکم فیما لم یأمروا بمعصیة اولم تعلموا بخطأهم فان امروکم بمعصیة فلا طاعة علیکم، وان علمتم خطأهم فقوموهم بالرد الی الکتاب والسنة" (اطاعت کرو اپنے اولوا الامر کی ان چیزوں میں، جہاں وہ تمہیں خدا کی نافرمانی کا حکم نہ دیں، یا یہ کہ تم ان کی خطاء سے آگاہ نہ ہو، لیکن اگر وہ تمہیں معصیت و گناہ کا حکم دیں تو تم پر ان کی اطاعت واجب نہیں، اور اگر تمہیں ان کی خطا معلوم ہوجائے تو انہیں کتاب و سنت کی طرف لے جاؤ)۔ لیکن آیۂ مبارکہ "اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ" کا معنیٰ یہ نہیں۔

اس کے علاوہ یہ مطلب بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی قید و شرط کی وضاحت ان موارد و موضوعات میں نہایت صریح الفاظ میں فرما دی ہے جو اولی الامر کی واجب اطاعت سے کم درجہ رکھتے ہیں مثلاً والدین کے بارے میں اس طرح ارشاد ہوا:

سورۂ عنکبوت، آیت: ۸

○ "وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا"

(اور ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا کہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی و نیک سلوک کرے، اور اگر وہ تجھے اس بات پر زور دیں کہ تو میرے ساتھ اسے شریک قرار دے جس کا تجھے علم ہی نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر)

تو یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ اس طرح کی قید و شرط اس آیت میں مذکور نہ ہو جس میں دین کی نہایت اہم بنیادیں اور بنیادی اصول مذکور ہوں اور وہ بھی ایسا اصول کہ جس پر تمام بنی نوع انسان کی سعادت منحصر ہے۔

ان تمام مطالب سے قطع نظر یہ بات زیرِ نظر آیہ مُبارکہ میں واضح طور پر مطلوبہ حقیقت کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اس میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت مذکور ہے اور ان دونوں کے لئے ایک ہی اطاعتی فرمان صادر ہوا ہے: ''وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ'' (اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اولی الامر کی)۔ تو جہاں تک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ہے تو ان کے حوالہ سے ہرگز قابلِ تصور نہیں کہ وہ کسی معصیت و گناہ کا حکم دیں یا حکم میں خطاء و غلطی کے مرتکب ہوں، اور اگر ایسا ہونا اولی الامر کے بارے میں ممکن یا قابلِ تصور ہوتا تو آیت میں اس کا ذکر ضرور ہوتا اور اس کی بابت قید و شرط ذکر کی جاتی، جبکہ اس طرح کی کوئی قید و شرط مذکور نہیں، تو اس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ آیت مبارکہ ہر طرح کی قید و شرط سے خالی و ماوراء ہے، لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بابت عصمت ملحوظ ہے اسی طرح اولی الامر کی بابت بھی کسی فرق کے بغیر عصمت کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم ہیں اسی طرح اولی الامر کا معصوم ہونا بھی ضروری ہے۔

''امر'' سے کیا مراد ہے؟''

آیہ مُبارکہ میں ''اُولِی الۡاَمۡرِ'' کے الفاظ مذکور ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں ''امر'' سے کیا مراد ہے؟

آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امر سے مراد ان مؤمنین کا ہر دینی و دنیاوی معاملہ ہے جن سے ابتدائے آیت میں ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا'' کے الفاظ میں خطاب ہوا ہے، چنانچہ اس کا تائیدی ثبوت درج ذیل آیتوں میں پایا جاتا ہے:

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۵۹

- ''وَ شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ''
  (اور ان سے ''امر'' میں مشورہ کریں)

سورۂ شوریٰ، آیت: ۳۸

- ''وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ''
  (اور ان کا ''امر'' باہمی مشورت سے انجام پاتا ہے)۔

یہ آیت متقین کی مدح میں نازل ہوئی ہے۔

اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں امر سے مراد حکم ہو کہ جو نہی (ممانعت) کے مقابلے میں آتا ہے، لیکن اس کا قرینِ صحت ہونا بعید نظر آتا ہے۔

ایک نہایت اہم مطلب کا بیان

اس آیۂ مبارکہ میں لفظ ''اُولِي الْاَمْرِ'' کے ساتھ لفظ ''مِنْكُمْ'' ذکر کیا گیا ہے کہ جو کلامی حوالہ سے اسے مقید کرتا ہے کہ جو بظاہر ''ظرفِ مستقر'' کہلاتا ہے جس کا معنٰی ''میں سے ہونا'' ہے، یعنی وہ اولی الامر جو تم میں سے ہیں، اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے درج آیاتِ مبارکہ میں مذکور ہے:

سورۂ جمعہ، آیت: ۲

○ ''هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ''

(وہ کہ جس نے امیّین میں ایک رسول بھیجا انہی میں سے)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۹

○ ''رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ''

(اے ہمارے رب، اور تو ان میں ایک رسول بھیج، انہی میں سے!)

یہ حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی کہ جسے خداوند عالم نے قرآنِ مجید میں ذکر کیا۔

سورۂ اعراف، آیت: ۳۵

○ ''رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ''

(وہ رسول جو تم میں سے ہوں، وہ تمہارے سامنے میری آیتوں کی تلاوت کریں)

ان آیات میں مذکور الفاظ سے وہ قول خود بخود غلط ثابت ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''اُولِي الْاَمْرِ'' کو لفظ ''مِنْكُمْ'' کے ساتھ مقید کر کے ذکر کرنے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اولوا الامر تم ہی میں سے ایک عام شخص ہے جو عام لوگوں ہی میں سے ایک ہے، وہ ہم مؤمنین ہی میں سے ہے اور اسے کسی طرح کی خدائی عصمت حاصل نہیں۔

اولوالامر کی مصداقی بحث

اولوالامر کے حوالہ سے ایک مصداقی بحث یہ ہے کہ یہ لفظ جو کہ اسم جمع کا صیغہ ہے اس سے اہلِ اسلام میں سے وہ چند افراد مراد ہیں جو امر یعنی حکمرانی واقتدار کے حامل بنتے ہیں اس حوالہ سے اس میں کوئی شک نہیں پایا جاتا، لیکن ابتدائے نظر میں یہ احتمال سامنے آتا ہے کہ اس سے مراد وہ ہستیاں ہیں جو فرداً فرداً اور یکے بعد دیگرے مسندِ اقتدار پر بیٹھ کر واجب الاطاعت قرار پاتے ہیں کہ لفظوں میں ان سب کو واجب الاطاعت ہونے سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس سے جامع معنٰی مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ ہم اپنے عام استعمالات میں، کہتے ہیں: صل فرائضك، اطع سادتك و كبراء قومك، اپنی فریضہ نمازیں ادا کر، اپنے سرداروں اور اپنی قوم کے بزرگوں کی اطاعت کر، تو اس میں فرائض، سادۃ اور کبراء سب ہی جمع کے صیغے ہیں۔

اس بحث میں ایک عجیب بات فخر الدین رازی نے لکھی ہے اور وہ یہ کہ اگر ''اُولِی الْاَمْرِ'' سے ایک فرد جو کہ معصوم ہو، مراد لیا جائے تو اس سے جمع کے صیغہ کو مفرد کے لئے استعمال کیا جانا تسلیم کرنا پڑے گا جو کہ ظاہر کے خلاف ہے اور عام طور پر ایسا نہیں ہوتا (لفظ جمع استعمال کر کے اس سے مفرد مراد لینا معمول نہیں) تفسیر کبیر، جلد ۱۰ صفحہ ۱۴۶۔

رازی کی مذکور بالا بات پر تعجب ہے کہ انہوں نے کس طرح ایسا لکھ دیا اور اس حقیقت سے غافل ہوئے کہ لفظ جمع کا مفرد کیلئے استعمال ہونا لغت میں عام معمول ہے اور قرآنِ مجید اس طرح کے استعمال سے بھرا ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ قلم، آیت: ۸

○ ''فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸''

(جھوٹ بولنے والوں کی اطاعت نہ کر)

سورۂ فرقان، آیت: ۵۲

○ ''فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ''

(کافروں کی اطاعت نہ کرو)

سورۂ احزاب، آیت: ۶۷

○ ''اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا''

(ہم نے اپنے آقاؤں اور اپنے بزرگوں کی اطاعت کی)

سورۂ شعراء، آیت: ۱۵۱

○ ''وَلَا تُطِيْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ''

(اور اسراف کرنے والوں کے امر کی اطاعت نہ کرو)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۳۸

○ ''حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ''

(نمازوں کی حفاظت کرو۔ پابندی کے ساتھ ادا کرو)

سورۂ حجر، آیت: ۸۸

○ ''وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ''

(اور مؤمنین کے لئے اپنا پہلو جھکا دے)۔

یہ اور اس طرح کے متعدد موارد موجود ہیں جن میں لفظ جمع استعمال کر کے اس سے مفرد مراد لیا گیا ہے کہ جن میں بعض موارد ایسے ہیں جہاں اثبات اور بعض میں نفی، بعض میں خبر اور بعض میں انشاء ہے، لہٰذا رازی کی بات درست نہیں، البتہ جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ لفظ جمع سے مفرد مراد لینا درست نہیں اور ظاہر و معمول کے خلاف ہے تو اس میں انہیں غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح کا استعمال اس صورت میں ظاہر و معمول کے خلاف ہے کہ جب لفظ جمع استعمال کر کے اس کے افراد میں سے کسی ایک فرد کا بالخصوص اور متعین صورت میں ارادہ کیا جائے۔ لیکن اگر مطلوبہ بات جمع کے لئے ہو کہ جو متعدد افراد کے حوالہ سے متعدد احکام میں تقسیم ہو سکے تو اسے خلاف معمول نہیں کہا جاتا، مثلاً اگر کوئی کہے: ''اکرم علماء بلدك'' (اپنے شہر کے علماء کا احترام کر) تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ ہر عالم کا احترام کر، اِس عالم کا، اُس عالم کا، سب کا احترام ضروری ہے، اس میں خاص علماء مراد نہیں لئے جاتے۔

اولوا الامر کا عرفی مصداق؟

اولوا الامر کی مصداقی بحث میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ آیۂ مبارکہ میں اولوا الامر سے جو واجب الاطاعت لوگ مراد لئے گئے ہیں وہ جمع بحیثیت جمع ہو یعنی مجموعہ کی صورت میں ہو یعنی ایک مجموعہ مراد ہو کہ جس کا ہر فرد اولوا الامر کہلائے اور وہ لوگوں میں خاص مقام رکھتا ہو کہ جس کی بات قابلِ عمل اور ان کے امور میں مؤثر ہو، جیسا کہ لشکر کے سرداروں، وفود کے سربراہوں، علماء اور ارکانِ حکومت و سردارانِ قوم میں ہوتا ہے، بلکہ تفسیر المنار کے بقول اس سے مراد وہ اہلِ حل وعقد یعنی با اختیار افراد ہیں جن پر عوام کو اعتماد ہو مثلاً علماء، فوج کے سپہ سالار اور عمومی مسائل و مقاصد کے ذمہ دار حضرات مثلاً تجارت، صنعت و زراعت وغیرہ اعمال کے ماہرین، اسی طرح کارخانوں اور پارٹیوں کے سربراہ و انچارج حضرات، قابلِ عزت جرائد کے مدیران اور رؤسائے تحریر وغیرہ۔

بنابرایں اولی الامر سے اہل حل وعقد مراد لینے کا معنیٰ یہی ہے یعنی امت کے سرکردہ افراد کا مجموعہ مرکب، لیکن بات وہیں پر آکر رکتی ہے کہ آیا یہ معنی آیہ مُبارکہ کے تمام پہلوؤں پر منطبق ہوتا ہے یا نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ آیہ مُبارکہ جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں۔ اولوا الامر کی عصمت پر دلالت کرتی ہے، چنانچہ مذکورہ بالا نظریہ کے قائل مفسرین بھی اس آیت کو اولوا الامر کی عصمت کی دلیل ہونے کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ہم اس نظریہ کے قائل حضرات سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے جن حضرات کی مثالیں دیں کہ ان کا فرمان نافذ العمل ہوتا ہے کیا ان میں سے ہر شخص معصوم ہوتا ہے جبکہ آپ آیت مبارکہ کو اولوا الامر کے معصوم ہونے کی دلیل بھی مانتے ہیں، کیا مجموعہ، انہی افراد کا نام نہیں؟

اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے کیونکہ ان میں سے کسی کے معصوم ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں ہوسکتا، کیونکہ تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ امت اسلامیہ نے ایک دن بھی ایسا نہیں دیکھا جس میں تمام اہل حل وعقد اور اربابِ اقتدار سب ہی معصوم ہوں اور وہ امت کی سرپرستی کریں۔ اس کی کوئی مثال موجود نہیں جبکہ یہ بات محال و ناممکن ہے کہ خُداوند عالم مخلوق کو کسی ایسی چیز کا حکم دے جس کا کوئی مصداق ہی وجود نہ رکھتا ہو۔

یا ان کے معصوم ہونے کو اس معنی میں لیں کہ عصمت جو کہ حقیقی صفت ہے وہ ہیئت حاکمہ کی صفت ہے اور وہ اسی طرح اس کے ساتھ ہے جس طرح کسی بھی موصوف کے ساتھ کوئی صفت قائم ہوتی ہے خواہ اس مجموعہ و ہیئت سے شرک و معصیت کا ارتکاب اسی طرح ممکن ہو جس طرح معاشرہ کے دیگر افراد سے ممکن ہوتا ہے لہٰذا ان میں سے کوئی فرد معین ممکن ہے کہ اپنی رائے میں خطا و غلطی پر ہو اور گمراہی و گناہ کی دعوت دینے والا ہو جبکہ ہیئت حاکمہ ایسی نہیں کیونکہ اس کی عصمت ثابت ہوتی ہے اور وہ اپنی اس عصمت کی بنیاد پر گمراہی و معصیت کی مرتکب نہیں ہوتی۔

لیکن یہ معنیٰ مراد لینا بھی محال ہے کیونکہ ایک فرضی واعتباری اور غیر حقیقی چیز کا کسی حقیقی صفت سے متصف ہونا ممکن نہیں، ہیئت حاکمہ ایک اعتباری چیز ہے جبکہ عصمت ایک حقیقی صفت ہے اور معاشرہ میں حقیقی وجود افراد کو حاصل ہوتا ہے ہیئت حاکمہ کو حقیقی وجود حاصل نہیں ہوتا، ہیئت حاکمہ کا معصوم وغیر معصوم ہونا مفروضہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہاں اولوا الامر کی عصمت کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ اس میں نہ تو ہیئت حاکمہ کی عصمت اس کے افراد کی صفت ہے اور نہ ہی خود ہیئت حاکمہ کی، بلکہ حقیقت میں وہ اس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ہیئت حاکمہ کو اس سے محفوظ رکھتا ہے کہ وہ معصیت و گناہ کا حکم صادر کرے یا کوئی غلط رائے قائم کرے یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے ''خبر متواتر'' کا جھوٹ سے محفوظ ہونا ہے کہ اس میں نہ تو تمام خبر دینے والے عصمت کی صفت سے متصف ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی اجتماعی

صورت اس کی حامل ہوتی ہے بلکہ اس کی حقیقت اس طرح سے ہے کہ اس میں عادتاً جھوٹ ممکن نہیں ہوتا، یعنی جب سب افراد ایک ہی بات بیان کریں اور ایک ہی واقعہ کی خبر دیں تو اس میں جھوٹ کا امکان ختم ہو جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خبر کو کہ جو اس کیفیت کی حامل ہو غلطی کا شکار ہونے اور جھوٹ سے دوچار ہونے سے محفوظ کرتا ہے، بنا بر ایں اولوالامر کی رائے بھی ''خبر متواتر'' (جب کثرت سے لوگ بیان کرنے والے افراد، فرداً فرداً اور اپنی اجتماعی صورت و ہیئت کے ساتھ عصمت کی صفت کے حامل نہیں ہوتے، بلکہ وہ رائے، خبر متواتر کی طرح جھوٹ اور غلطی سے منزہ ہوتی ہے) لہٰذا اولی الامر کی بابت بھی عصمت کا یہی معنیٰ مراد لینا چاہیے، اور آیت سے بھی اس سے زیادہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی رائے غلط نہیں ہوتی بلکہ درست ہوتی ہے اور کتاب وسنت سے مطابقت رکھتی ہے، اس کا ایسا ہونا دراصل اس امت پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ اس کی تصدیق وتائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا تجتمع امتی علی خطاء'' (میری امت غلطی پر اکٹھی نہیں ہوگی)۔

(بحوالہ کتاب سنن ابن ماجہ، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰۳)

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت اگر بالفرض صحیح ہو تب بھی ہمارے موضوع سے قطعی بے ربط ہے۔ اس میں امت کا خطا پر اکٹھا نہ ہونا بیان کیا گیا ہے اہل حل وعقد اور ارباب اقتدار کا خطا و غلطی پر اکٹھا نہ ہونا مذکور نہیں، ''امت'' کا معنیٰ اور ہے اور ''اہل حل وعقد'' کا معنیٰ اور ہے اور کوئی دلیل ایسی موجود نہیں ہے کہ یہاں پہلے لفظ (امت) سے دوسرا لفظ (اہل حل وعقد) مراد لیا جانا ثابت کرے، اور دوسری بات یہ کہ حدیث میں امت کے خطا و غلطی پر اکٹھا ہونے کی نفی کی گئی ہے نہ یہ کہ اصل خطا و غلطی کی ہی پوری امت سے نفی کی گئی ہو، ان دونوں میں فرق ہے، یعنی نفی الخطاء عن اجتماع الامہ کا معنیٰ نفی الاجتماع علی الخطاء نہیں، حدیث میں نفی الاجتماع علی الخطاء ملحوظ و مقصود ہے نفی الخطاء عن اجتماع الامہ مقصود و مراد نہیں۔

حدیث کے الفاظ سے جو معنیٰ سامنے آتا ہے اس کی برگشت اس بات کی طرف ہے کہ کسی مسئلہ میں خطا و غلطی کا واقع ہونا پوری امت کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتا، بلکہ ہمیشہ صورتحال یہ رہے گی کہ ان میں کوئی حق پر ضرور ہوگا خواہ ساری امت حق پر ہو یا کچھ افراد حق پر ہوں، اور وہ کچھ افراد خواہ ایک ہی معصوم ہو، تو یہ معنیٰ ان آیات وروایات سے مطابقت رکھتا ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ دین اسلام اور ملت حق کبھی روئے زمین سے ختم نہیں ہوگی بلکہ قیامت تک باقی رہے گی۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ انعام، آیت: ۸۹

○ ''فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ''

(اگر یہ لوگ دعوتِ اسلام کو نہیں مانتے تو ہم نے اس کے لئے دوسری قوم مقرر کی ہے جو ہرگز اس کا انکار نہیں کرے گی)

سورۂ زخرف، آیت: ۲۸

○ ''وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ''

(اور خدا نے اسے اسی کی نسل میں ہمیشہ باقی رہنے والا کلمہ قرار دیا)

سورۂ حجر، آیت: ۹

○ ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ''

(ہم ہی نے ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

سورۂ فصلت، آیت: ۴۱۔۴۲

○ ''وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ''

(اور وہ مضبوط کتاب ہے کہ نہ تو باطل اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے)

ان آیات کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں یہی مطلب مذکور ہے۔

یہ بات امتِ محمدیہ ﷺ سے مختص بھی نہیں بلکہ صحیح روایات سے اس کے برعکس ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ان روایات میں جو مختلف و متعدد اسناد سے آنحضرت ﷺ کا فرمان مذکور ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی (۷۱) فرقوں میں اور نصاریٰ (۷۲) فرقوں میں بٹ جائیں گے اور مسلمان (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے لیکن ایک فرقہ کے علاوہ باقی سب ہلاک ہو جائیں گے، یہ روایت ہم نے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳: ''وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا'' کی تفسیر میں ''روایات پر ایک نظر'' میں ذکر کی ہے۔

بہر حال روایت کے متن و مضمون پر کوئی کلام نہیں، اگر اس کی سند صحیح ہو تب بھی وہ ہمارے زیر نظر موضوع سے کوئی ربط نہیں رکھتی، بلکہ بحث اس میں ہے کہ اگر ''أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ'' سے مراد اہل حل وعقد اور ارباب اقتدار ہوں تو اس صورت میں ان کے معصوم ہونے سے کیا مراد ہے؟ یعنی اگر اولوا الامر سے مراد اربابِ اقتدار ہوں تو ان سب کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے جبکہ نہ تو کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ ہی ایسا ہوگا۔

وہ کیا سبب ہے جس کی بناء پر امتِ مسلمہ کے ارباب اقتدار کو ان کی آراء میں معصوم قرار دیا جائے؟ وہ افراد کہ جنہیں اہلِ حل وعقد کہا جاتا ہے کہ جو لوگوں کے امور میں ان کی سرپرستی کرتے ہیں اور ان کے مسائل حل کرنے میں ضروری اقدامات اٹھاتے ہیں وہ صرف امتِ مسلمہ ہی سے مختص نہیں بلکہ ہر امت میں موجود ہوتے ہیں خواہ وہ بڑی امت ہو یا چھوٹی امت ہو، بلکہ قبیلوں و خاندانوں میں بھی ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو سربراہ و سردار کہلاتے ہیں اور وہ لوگوں کے اجتماعی و معاشرتی امور و مسائل کو حل کرتے ہیں کہ ان کی بات معاشرے میں سنی جاتی ہے اور ان کا حکم و فیصلہ نافذ العمل ہوتا ہے۔

چنانچہ آپ تاریخ کا مطالعہ کریں اور اس کی ورق گردانی کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ زمانۂ قدیم سے عصر حاضر تک جس قدر حوادث و واقعات رونما ہوئے ہیں ان میں وہاں کے اہلِ حلّ وعقد اور ارباب اختیار نے اپنی صوابدید پر نہایت اہم اور بنیادی فیصلے صادر کئے اور اپنے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے اقدامات بھی کئے، البتہ ان کے فیصلے درست بھی ثابت ہوئے اور غلط بھی ثابت ہوئے، لیکن ان کے فیصلوں میں جہاں غلطیاں ہوئیں وہ اجتماعی فیصلوں کی بجائے انفرادی موارد میں زیادہ تھیں، البتہ اجتماعی فیصلے ایسے نہیں کہ ان میں خطاء وغلطی کا امکان ہی نہ ہو بلکہ تاریخ اور مشاہدات اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ اہلِ حلّ وعقد اور اربابِ اختیار نے اجتماعی فیصلوں میں غلطیاں کیں اور اپنی تمام تر قوتوں وصلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے باوجود درست سمت میں فیصلے نہ کر سکے، ان حقائق و موارد کی مثالیں نہایت شہرت سے تاریخ میں موجود ہیں۔

بنا برایں اگر صرف مسلمانوں کے اہل حلّ وعقد اور ارباب اختیار واقتدار کے فیصلے خطاء وغلطی سے مبرّاء ومنزّہ ہوں تو اس کی وجہ تمام اسباب کی عملداری نہیں بلکہ خارق العادت معجزہ کی اثر گزاری کہلائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ امتیاز عطا فرمایا اور اس خصوصیت سے نوازا ہے جس سے ان کا معاشرتی استحکام یقینی ہو اور ان کی عظمت کا تحفظ ہو اور ان کی انفرادی و اجتماعی صلاح و بہتری پر آنچ نہ آسکے، گویا وہ ایک خدائی سبب ومعجزہ ہے جو قرآنِ مجید سے پیوستہ ہے اور اس وقت تک زندہ و باقی رہے گا جب تک قرآن زندہ و باقی ہے۔ اس کا مقام و مرتبہ عملی حوالہ سے اسی طرح کا ہے جو قرآن مجید کا علمی حوالہ سے ہے۔ تو ضروری تھا کہ قرآنِ مجید اس کی حدود اور اس کے دائرہ کی وسعت کو بیان کرتا اور اللہ تعالیٰ اس حوالہ سے اسی طرح مخلوق پر احسان کرتا جس طرح اس نے قرآنِ مجید نازل فرما کر اور حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرما کر احسان فرمایا ہے، اور ان اولی الامر، اہل حلّ وعقد کو ان کے فرائض اور معاشرتی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا جس طرح سے اس نے اپنے نبی ﷺ کو آگاہ فرمایا، اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ ان کے بارے میں اپنی امت کو آگاہ فرماتے بالخصوص اپنے ان اصحابِ کرام کو آگاہ فرماتے کہ جو آنحضرت ﷺ کے بعد اہل حل وعقد اور اربابِ اختیار بنے اور امت کی حکمرانی اپنے ہاتھوں میں لی، تو ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ ان حضرات کے بارے میں کہ جنہیں ''اولوا الامر'' سے موسوم کیا گیا ہے ان کی حقیقت اور حدود و اختیارات سے واضح طور پر آگاہ فرماتے اور اس بات کی وضاحت کرتے کہ ایک ہی ہیئت حاکمہ پورے عالم اسلام کے لئے ہوگی یا ہر مسلمان قوم وخطہ میں الگ الگ اولی الامر ہوں گے جو لوگوں کی جانوں، اموال اور ناموس سے متعلق حاکمانہ فیصلے کریں گے۔

اس طرح صدرِ اسلام کے کلمہ گو اور بالخصوص صحابۂ کرام اس سلسلہ میں خاص اہمیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ سے پوچھتے اور آپس میں بحث وگفتگو کرتے، جبکہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے ایسی چیزوں کے بارے میں پوچھا کہ جن کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں اور اس نہایت اہم مسئلہ کے مقابلے میں قابلِ قیاس ہی نہیں، مثلاً چاند، انفاق، انفال وغیرہ کے بارے

میں پوچھتے تھے: ''یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ'' (وہ آپ سے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں) سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۹' 'یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ'' (آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق کریں) سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۵ ''یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ'' (آپ سے انفال کے بارے میں پوچھتے ہیں) سورۂ انفال، آیت ۱، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اس اہم ترین مسئلہ کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے کیوں نہ پوچھا؟ یا اگر پوچھا تو کیا بعد میں مفاد پرستوں کے ہاتھوں ان پر پردہ ڈال دیا گیا اور حقائق ہم سے مخفی ہو گئے؟ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسا مسئلہ ہی نہیں جسے لوگوں کی اکثریت پسند نہ کرتی تھی لہٰذا انہوں نے اس پر پردہ ڈالا، ایسا ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص اس منصب کا خواہاں تھا، تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لوگ اس میں دلچسپی نہ رکھتے تھے لہٰذا اُنہوں نے اس سلسلہ میں کوئی توجہ نہ دی بلکہ اسے کلی طور پر چھوڑ دیا تا کہ اس کی یاد ہی باقی نہ رہے، ایسا ہرگز نہیں۔

اور اگر حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ ﷺ سے اس سلسلہ میں نہ پوچھا گیا تو ضروری تھا کہ آپ ﷺ کی رحلت کے بعد لحظہ بہ لحظہ جو واقعات رونما ہوئے اور فتنوں و اختلافات کی آگ شعلہ ور ہوتی رہی ان میں اس سلسلہ میں بحثیں اور استدلالات سامنے آتے، جبکہ صحابہ کرام کے درمیان ہونے والی بحثوں اور مناظروں میں اس موضوع کی بابت کوئی نشان نہیں ملتا، حالانکہ اُن بحثوں اور مناظروں کا تذکرہ لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف اہل قلم حضرات نے اپنی تحریروں میں کیا لیکن نہ تو کسی خطاب میں اور نہ ہی کسی کتاب میں، اس کی بابت کوئی مطلب موجود و مذکور نہیں، اور نہ ہی قدیم مفسرین حضرات نے کہ جن میں صحابہ و تابعین بھی شامل ہیں اس سلسلہ میں کچھ بیان کیا، البتہ چند متاخرین نے کہ جن میں فخر الدین رازی اور بعض دیگر اہل علم حضرات شامل ہیں اس حوالہ سے بعض مطالب ذکر کئے ہیں۔ البتہ فخر الدین رازی نے ہمارے مذکورہ بالا اعتراض کو ذکر کرتے ہوئے اس پر خود ہی اعتراض کیا کہ یہ بات ''اجماعِ مرکب'' سے مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ ''اولوا الامر'' سے کون مراد ہیں اس سلسلہ میں چار اقوال سے زیادہ کوئی قول نہیں: (۱) خلفائے راشدین (۲) سردارانِ لشکر (۳) علماء اسلام (۴) آئمہ معصومینؑ، لہٰذا پانچواں قول کہ جس میں ہیئت حاکمہ مراد لی گئی ہے وہ اجماع شکنی ہے، رازی نے پانچویں قول کے بارے میں خود ہی جواب دیا کہ اس کی برگشت تیسرے قول کی طرف ہے، یعنی وہ پانچواں قول قرار نہیں پاتا، رازی نے اس جواب سے اپنے ہی پیش کردہ مطلب کی بیخ کنی کر دی، تو ان تمام مطالب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر سادہ و آسان نہ تھا کہ اسے معصوم ہونے کو اہل حل وعقد اور ارباب اقتدار کے لئے مخصوص قرار دیا جائے اور نہ ہی اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک عطیۂ الٰہی اور خدائی عنایت و معجزاتِ اسلام اور مسلمانوں کے اہل حل وعقد کے لئے مخصوص کرامت و امتیازی صفت ہے۔

یا پھر یہ کہا جائے کہ اس صفت یعنی عصمت کا کسی خارق العادت وغیر معمولی قوت سے کوئی تعلق و ربط ہی نہیں بلکہ اسلام نے اپنا تربیتی نظام ہی اس طرح قرار دیا ہے کہ اس کے نہایت مضبوط اصول افراد کو اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں کہ امت کے اہلِ حل وعقد حضرات جس چیز پر اتفاق کر لیں اس میں غلطی نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے فیصلوں و آراء میں خطاء راہ پا سکتی ہے۔ لیکن یہ

قول وخیال بالکل غلط و باطل اور اس عمومی حقیقت کے منافی ہے جو اس بات سے عبارت ہے کہ کُل کا ادراک درحقیقت تمام اجزاء وابعاض کے ادراکات کے مجموعہ کا نام ہے۔ لہٰذا اگر ان میں سے ہر ایک فرد کو جائز الخطا مانیں تو گویا مجموعی طور پر سب کو جائز الخطا قرار دیا گیا، تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس معنٰی میں اولوا الامر کی رائے وفیصلہ کہ جس کی درستی وعصمت کی بُنیاد وہ قوت ہو جو قابل تسخیر نہیں تو اس کی اثر گزاری بھی ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ ہوگی لیکن اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ عالم اسلام میں رونما ہونے والے ناخوشگوار واقعات اور باطل عقائد وفسادات کے سلسلے کہاں منتہی ہوں گے اور ان کا ربط کس نے جوڑا جاسکے گا؟ اور کس قدر شورائی مجالس واسلامی اجتماعات ایسے ہیں جو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد منعقد ہوئے کہ جن میں مسلمان اہل حل وعقد اور ارباب اقتدار شریک وشامل تھے اور متفقہ طور پر بعض فیصلے بھی کئے اگر چہ ان فیصلوں میں ان کی آراء ہی اصل محور و بنیاد تھی لہٰذا انہیں گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اور وہ مسلمانوں کو سعادت مند بنانے کی بجائے شقاوت و بدبختی سے ہمکنار کر گئے چنانچہ آنحضرتؐ کی رحلت کو زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دینی معاشرتی نظام کو ظالمانہ وآمرانہ سلطنتی وملوکانہ نظام میں تبدیل کر دیا گیا، تو ضروری ہے کہ جو محقق واہل نظر اس سلسلہ میں حقائق سے آگاہی حاصل کرنا چاہے وہ ان فتنوں کے پس منظر و پیش منظر پر غور کرے جو حضرت رسولِ خداؐ کی رحلت کے وقت سے شروع ہوئے اور پھر ان کا سلسلہ اس قدر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا جس کے نتیجہ میں کتنے بے گناہ خون بہائے گئے، عزتیں لوٹی گئیں، اموال غارت کئے گئے، احکامِ الٰہی پامال کئے گئے، حدود سے تجاوز کیا گیا، تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس سب کچھ کے عوامل کیا تھے اور اس کے سلسلے کہاں سے ملتے ہیں اور کہاں تک پہنچتے ہیں، کیا ان کے عوامل میں امت کے اہلِ حلّ وعقد کی آراء وفیصلوں کے علاوہ کچھ تھا کہ اُنہوں نے اپنے فیصلے وآراء امت پر مسلط کر دیں؟

تو یہ حال ہے اس بنیادی اصول کا کہ جس پر دین کی عمارت کھڑی ہے یعنی ان اہلِ حلّ وعقد کی آراء وفیصلے کہ جنہیں ان حضرات کے بقول اولی الامر قرار دیا گیا اور وہ عصمت کے حامل ہیں!

اگر آیت میں ''اولی الامر'' سے اہلِ حلّ وعقد اور ارباب اقتدار مراد لیں تو پھر اس بات کے قائل ہونے میں بھی کوئی چارہ باقی نہ ہوگا کہ اولی الامر بھی دیگر لوگوں کی طرح جائز الخطاء ہیں اور وہ عام لوگوں کی مانند کبھی صحیح کرتے ہیں اور کبھی غلطی کرتے ہیں، ان میں اور دیگر عام لوگوں میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنے تجربات اور امور سے زیادہ آگاہی رکھنے کی وجہ سے بہت کم غلطیاں کرتے ہیں اور ان کے جائز الخطاء ہونے کے باوجود انہیں واجب الاطاعت قرار دینے میں ان کی خطاؤں وغلطیوں کو نظر انداز کر کے ایک اہم مقصد کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جو ان تمام امور پر غالب و بالاتر ہے۔ لہٰذا اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو کتاب وسنت سے قطعی مختلف ہو لیکن امت کی بہتری کے لئے ان کی صوابدید اور ذاتی تشخیص کے عین مطابق ہو کہ جس میں اُنہوں نے کسی دینی حکم کی تفسیر اس طرح نہ کی ہو جو پہلے کی جاتی تھی یا یہ کہ اُنہوں نے کسی حکم کو زمانہ کے تقاضوں یا امت کی بہتری وبھلائی

کی غرض سے تبدیل کیا ہو تو ان کا حکم واجب الاتباع ہوگا، اور دین اسلام بھی اسے ہی پسند کرتا ہے کیونکہ وہ معاشرہ کی سعادت و ترقی کے سوا کچھ نہیں چاہتا جیسا کہ صدرِ اسلام میں قائم ہونے والی حکومتوں اور اس کے بعد وجود میں آنے والی سلطنتوں میں ہوتا رہا ہے کہ اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جو احکام جاری و نافذ ہو چکے تھے ان میں سے کسی حکم کی ممانعت نہیں کی بلکہ اگر کسی حکم کی ممانعت کی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت وسنت پر عمل نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس حکم سے امت کے بعض حقوق پامال ہوتے تھے لہٰذا امت کی بہتری اس میں ہے کہ نئے حکم کا اتباع کیا جائے کہ جو امت کی بھلائی کا ضامن ہے، یا یہ کہتے تھے کہ نیا حکم زندگی کی سعادت مندی میں لوگوں کی آرزوؤں وتمناؤں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے، چنانچہ بعض اہلِ بحث نے واضح وصریح الفاظ میں لکھا ہے کہ خلیفہ کو حق حاصل ہے کہ وہ امت کی بہتری کے لئے اس طرح عمل کرے اور ایسے احکام جاری کرے جو دین کے واضح وصریح احکام کے خلاف ہوں (بحوالہ کتاب فجر الاسلام)

اگر یہ سب قرینِ صحت ہو تو ملتِ اسلامیہ اور دیگر ترقی یافتہ معاشروں کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور وہ سب اس حوالہ سے یکساں ہو جائیں گے کہ ان میں ایک گروہ منتخب ہو کر معاشرتی قوانین کو اپنی مرضی وصوابدید اور حالات و تقاضائے وقت کے مطابق بنانے کے عنوان پر اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور پھر جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا نظریہ انہی لوگوں کا ہے جو دین کو ایک معاشرتی طرزِ عمل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرزِ عمل کو دین کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے اور نتیجتاً وہ بھی دیگر معاشرتی طرز ہائے زندگی کی طرح تغیر وتبدل کی زد میں رہتا ہے کہ ہمیشہ اور ہر لحہ معاشرتی نشیب وفراز کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتیں ہیں، جس طرح معاشرہ اپنے حالات کی بناء پر ترقی وکمال کے مراحل کو تدریجی صورت میں طے کرتا ہے دین بھی اسی طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے چنانچہ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ اسلام صرف اسی انسان کی زندگی پر منطبق ہوتا ہے جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس سے قریبی زمانہ میں رہتا تھا، تو اسلام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو انسانی معاشرہ کے نام سے موسوم ہے لہٰذا اس کے بارے میں اسی طرح بحث کرنی چاہیے جس طرح علم زمین شناسی (جیولوجی) کے ماہرین آج زمین کے طبقات سے نکالی جانے والی اشیاء کے بارے میں بحث کرتے رہتے ہیں، گویا دین کے بارے میں بحث کرنا اس طرح ہے جیسے قدیم اشیاء کے وجود میں آنے اور ان کے ترقی پانے کے مراحل کی بابت بحث کی جاتی ہے کہ جس کا فائدہ صرف معلومات کی حد تک محدود ہوتا ہے اور بس،

تو جو شخص دین کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ رکھتا ہو تو اس کے ساتھ آیہ مبارکہ "یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللَّهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ" کے معنی ومراد کے حوالہ سے بحث کرنا بے مقصد و بے معنی ہے۔ یہ عقیدہ ونظریہ دراصل دین کے تمام اصول وفروع اور حقائق ومعارف کے ساتھ ساتھ اخلاقی ومعاشرتی احکام پر اثر انداز ہونے والے امور پر مبنی ہے کہ جن کی بناء پر دین کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور نہ ہی اس کا نام ونشان باقی رہے گا، اور اگر اسلام کی تاریخ میں رونما ہونے

والے واقعات کو اُس کی روشنی میں دیکھا جائے تو پھر جو نتیجہ سامنے آئے گا وہ نہایت وحشت ناک ہوگا کیونکہ ان واقعات میں عہد نبوی ﷺ اور حضور ﷺ کی وفات کے وقت صحابہ کرام کے درمیان رونما ہونے والے حوادث و سنگین اختلافات، اور بعض خلفاء کی طرف سے بعض احکام اور حضور ﷺ کی عملی سیرت کی بیبا کانہ خلاف ورزی اور پھر معاویہ اور دیگر اموی حکام و عباسی خلفاء اور ان کے بعد آنے والے حکمرانوں کی کارگزاریاں سب شامل ہیں، تو ان کے تناظر میں دین کا جو حشر ہوگا وہ بیان سے باہر ہے۔

ایک عجیب و مضحکہ خیز نظریہ

آیہ مُبارکہ ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' کی بحث میں بعض مؤلفین نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ نہایت عجیب و مضحکہ خیز ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں مفسرین نے جو مختلف اقوال ذکر کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس آیت سے درست ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

(۱) اولوا الامر خواہ کوئی بھی ہوں، ان کی اطاعت کا واجب قرار دیا جانا ان کی دوسروں پر کسی فضیلت و برتری کا موجب ہرگز نہیں بنتا، بلکہ یہ اسی طرح ہے جیسے مجبوری اضطراری حالت میں جابر و ظالم حکمرانوں کی اطاعت اس لئے ہم پر واجب ہوئی ہے کہ ان کے شر سے محفوظ رہیں، لہٰذا وہ اس بناء پر اللہ کے نزدیک ہم پر برتری نہیں رکھتے۔

(۲) اس آیت میں جو حکم مذکور ہے وہ بعینہ دیگر شرعی احکام کی مانند ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان کی عملداری ان کے موضوعات سے مربوط اور ان کے ساتھ وابستہ و موقوف ہوتی ہے، مثلاً فقیر و نادار پر انفاق کا واجب ہونا، اور ظالم کی مدد کرنے کا حرام ہونا، تو یہ احکام اس وقت لاگو ہوتے ہیں جب فقیر اور ظالم موجود ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم فقیر و ظالم پیدا کریں تاکہ اس پر انفاق کریں یا ظالم تلاش کریں اور اس کی مدد کرنے سے اجتناب کریں۔

ان دونوں وجوہات کا غلط و نادرست ہونا واضح و روشن ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ان وجوہات کے نادرست ہونے کو تقویت دیتی ہے کہ وہ مؤلف خود یہ نظریہ رکھتا ہے کہ آیت میں ''اُولِی الْاَمْرِ'' سے مراد حکام و سلاطین ہیں، جبکہ اس نظریہ کا بطلان پہلے واضح ہو چکا ہے۔

اور جہاں تک پہلی وجہ کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں وہ آیات کثرت سے موجود ہیں جن میں ظالموں، اسراف و زیادتی کرنے والوں اور کافروں کی اطاعت سے نہی کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ بات محال و ناممکن ہے کہ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کی اطاعت کا حکم دے اور پھر اس پر مزید یہ کہ ان کی اطاعت کو اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت سے ساتھ ملا

دے، اور اگر بالفرض کہ یہ اطاعت تقیہ کی بناء پر ہو تو ضروری تھا کہ اسے لفظ ''اذن'' اور اس جیسے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا، جیسا کہ درج ذیل آیت میں ارشاد ہوا:

○ سورۂ آل عمران، آیت: ۲۸

''اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً''

(مگر یہ کہ تم ان سے ڈرتے ہو، ان سے خوفزدہ ہو)

جبکہ آیت میں اولی الامر کی اطاعت کا حکم صریح ہے، اگر ان کی اطاعت میں حالتِ مجبوری میں ظالم و فاجر کی اطاعت بھی شامل ہوتی تو اس طرح صریح حکم نہ ہوتا کہ جس سے ہر برائی کا جواز پیدا ہو جاتا۔

اور جہاں تک دوسری وجہ کا تعلق ہے تو اس کی بُنیاد بھی پہلی وجہ ہے، لیکن اگر ان کا واجب الاطاعت ہونا ان کی دینی قدرومنزلت کی بناء پر ہو تو وہ معصوم ہوں گے جیسا کہ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اور یہ بات ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی اطاعت کا حکم دے جو وجود ہی نہ رکھتا ہو، یعنی اس کا کوئی مصداق پایا ہی نہ جائے، یا اس کا مصداق اتفاقی طور پر مل جائے کہ جو اس آیت کے ضمن میں قابل تصور ہے جس میں دینی مقاصد کی بنیادیں مذکور ہیں اور ایسا حکم ہو جس کے بغیر اسلامی معاشرہ قائم رہ ہی نہیں سکتا۔ جبکہ قارئین کرام! آپ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اولی الامر کی ضرورت بعینہٖ اسی طرح سے ہے جیسے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت ہے کہ جو امت کے امور کے نگران کی ضرورت سے عبارت ہے۔ کہ اس حوالہ سے ہم محکم اور متشابہ کی بحث میں مربوطہ مطالب بیان کر چکے ہیں۔

بہر حال اب ہم آیت کی بابت اپنی اصل بحث کی طرف واپس آتے ہیں:

اب تک جو مطالب ذکر کئے جا چکے ہیں ان کی روشنی میں آپ پر واضح ہو چکا ہے کہ جملہ ''وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' سے اہل حل وعقد اور اربابِ اقتدار مراد لینا درست نہیں، اہل حل وعقد سے مراد معاشرہ کا مخصوص گروہ ہے خواہ اسے جس معنی میں قرار دیں، اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں کہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اطاعت کے واجب ہونے کا حکم دے۔ لہٰذا اولی الامر سے مراد صرف اور صرف وہ ہستیاں ہیں جو اپنی گفتار و کردار میں معصوم ہوں تو وہ واجب الاطاعت ہیں۔ ان کی معرفت و پہچان کہ وہ کون ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نص اور واضح بیان پر موقوف ہے خواہ وہ اپنے کلام میں اسے بیان فرمائے یا اپنے نبی کی زبانی بتائے، لہٰذا آیہ مُبارکہ انہی ہستیوں پر منطبق ہوتی ہے جن کے اسماء گرامی قدر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث وارشادات میں بحوالہ آئمہ اہل بیتؑ ذکر ہوئے ہیں کہ وہی اس سے مراد نہیں ہیں۔

خلاصہ بحث یہ کہ آیت مُبارکہ میں ''اُولِی الْاَمْرِ'' سے مراد حکام وسلاطین اور اہل حل وعقد ہیں۔

اب دیگر تین اقوال کہ جن میں اس سے خلفائے راشدین، سربراہانِ لشکر اور وہ علماء مراد لئے گئے ہیں جن کے

اقوال و آراء کا اتباع کیا جاتا ہے تو وہ اس طرح نادرست قرار پاتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت مُبارکہ ان کے معصوم ہونے کو ثابت کرتی ہے جبکہ یقیناً مذکورہ طبقات معصوم نہیں سوائے اس کے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ حضرت علیؑ کے معصوم ہونے کا قائل ہے، (جو کہ حق ہے) دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ تینوں اقوال کی صحت پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

اولوالامر اور آئمہ اہل بیتؑ؟

اولواالامر سے آئمہ اہل بیتؑ مراد لینے پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کی تفصیل اور جوابات کچھ اس طرح سے ہیں:

پہلا اعتراض:

اولواالامر سے آئمہ اہل بیتؑ مراد ہونا اللہ تعالیٰ اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صریح بیان پر موقوف ہے، اگر اس سے وہ ہستیاں مراد ہوتیں تو خداوند عالم اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور اپنے ارشادات و بیانات میں ضرور ذکر کرتے کہ جس کے بعد کوئی شخص بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس پر اعتراض نہ کرتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات قرآن میں بھی ہے اور سنت میں بھی ہے، جہاں تک قرآنِ مجید کا تعلق ہے تو آیۂ ولایت (اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا) اور آیۂ تطہیر (اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا) اور دیگر آیات میں یہ مطلب مذکور ہے کہ ان آیات کی تفسیر میں تفصیلی مطالب ذکر کئے جائیں گے اور جہاں تک احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ہے تو وہ بہت زیادہ ہیں مثلاً: حدیث سفینہ (مثل اهل بیتی کسفینة نوح من رکبها نجی ومن تخلف عنها غرق) میرے اہل بیت نوح کی کشتی کی طرح ہیں، جو اس پر سوار ہوا وہ نجات پا گیا اور جس نے اس سے روگردانی کی وہ غرق ہوگیا، اور حدیث ثقلین (انی تارك فیكم الثقلین كتاب الله وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلّوا بعدی ابداً) میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی عترت اہل بیت، اگر تم ان سے وابستہ رہے تو میرے بعد ہرگز کبھی گمراہ نہ ہوگے، ان احادیث کی تشریح المیزان جلد ۳ میں محکم ومتشابہ کی بحث میں ذکر ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث کہ جو آیۂ اولی الامر کی تفسیر میں شیعہ وسنی دونوں کے اسناد سے روایت ہوئی ہیں ان میں اس حوالہ سے واضح بیانات موجود ہیں۔ ان میں سے بعض روایات ''روایات پر ایک نظر'' میں ذکر کی جائیں گی۔

دوسرا اعتراض:

اولوالامر کی اطاعت ان کی معرفت سے مشروط ہے کیونکہ ان کی معرفت و پہچان کے بغیر ان کی اطاعت کا حکم ایسے ہے جیسے کسی غیر مقدور چیز کا حکم دیا جائے، یعنی ایسی چیز کا حکم دیا جائے جس کے انجام دینے کی طاقت ہی نہ ہو، اور مشروط ہونے کی صورت میں آیت سے تطبیق ممکن نہ رہے گی جبکہ آیت مطلق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض، خود اعتراض کرنے والے پر پلٹتا ہے کیونکہ آیت میں اطاعت کا حکم مطلق ہے جو کہ معرفت کے ساتھ مشروط ہے، تو معرفت بھی مطلق ہے، لہٰذا اعتراض باقی نہیں رہتا، البتہ ہمارے اور اس کے بیان و مؤقف میں یہ فرق ہے کہ اس کا موقف یہ ہے کہ اولوالامر سے مراد اہل حل وعقد ہیں کہ جن کی پہچان ہم خود کرتے ہیں اور ان کے مصداق کی معرفت حاصل کرتے ہیں اللہ و رسول اللہ کے بیان کی احتیاج نہیں۔ جبکہ ہم کہتے ہیں کہ امام معصوم کی پہچان کروانا اللہ اور اس کے رسول کا کام ہے۔ اب اگر وہ یہ کہے کہ اطاعت معرفت سے مشروط ہے جبکہ آیت مطلق ہے تو اس کی یہ بات صرف ہم پر اعتراض قرار نہیں پاتی بلکہ اس حوالہ سے ہم دونوں برابر ہیں۔ ہم بھی شرط کے قائل اور وہ بھی شرط کا قائل ہے، وہ اس شرط کا پورا ہونا لوگوں سے اور ہم اللہ و رسول ﷺ سے مربوط سمجھتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ معرفت اگرچہ شرط ہے لیکن وہ دیگر شرائط کی طرح نہیں کیونکہ اس کی برگشت حکم کے یقینی طور پر پہنچ جانے کی طرف ہے نہ کہ اصل حکم اور مکلف بہ کی طرف! تو جب حکم اور اس کے موضوع و متعلقات کی معرفت ہی نہ ہو تو حکم کیسا؟ اس کی مثال حج کے واجب ہونے میں استطاعت کا شرط ہونا اور وضو کرنے میں پانی کا ہونا، تو اگر معرفت بھی اسی طرح کی شرط ہوتی تو مطلق حکم کبھی وجود میں ہی نہ آتا، کیونکہ وہ حکم ہی کیا کہ جس میں مکلف کا اس سے آگاہ ہونا یا نہ ہونا برابر ہو، اس صورت میں تو حکم کا کسی پر لاگو قرار دیا جانا ہی بے معنی ہے۔

تیسرا اعتراض:۔

اس دور میں ہم امام معصوم تک پہنچنے سے قاصر ہیں اور ان سے علم دین حاصل نہیں کر سکتے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس تک رسائی ہی ممکن نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کی اطاعت اپنی مخلوق پر واجب قرار دے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام معصوم تک عدم رسائی کی ذمہ دار خود امت ہے کیونکہ امت ہی کے غلط کردار اور اپنے اوپر خیانت کے عملی ارتکاب کے نتیجہ میں یہ صورتحال پیدا ہوئی ہے، اس کا اللہ و رسول پر کوئی ذمہ عائد نہیں ہوتا، لہٰذا اصل حکم اپنے

مقام پر باقی ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کوئی امت اپنے نبی کو قتل کردے اور پھر اس کی اطاعت نہ کرسکنے میں اس تک عدم رسائی کا عذر پیش کرے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ یہی صورتحال اُمّت اسلامیہ کی ہے کہ ہم میں وحدت ویکجہتی کا فقدان ہے اور ہم اب اُمت واحدہ نہیں رہے کہ جس میں اس کے اہل حل وعقد کا صوابدیدی فیصلہ وحکم نافذ العمل ہو، بنابرایں معترض کا اصل اعتراض، خود اسی کی طرف لوٹتا ہے۔

چوتھا اعتراض:۔

اس آیۂ مُبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ'' (پس اگر تم کسی چیز کے بارے میں آپس میں نزاع کرو تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ) اگر اس میں اولی الامر سے مراد امام معصوم ہوتا تو یوں کہا جاتا: ''فان تنازعتم فی شیئ فردوه الی الامام'' (اگر تم کسی چیز کے بارے میں نزاع کرو تو اسے امام کے پاس لے جاؤ)۔

اس کا جواب سابق الذکر مطالب میں دیا جاچکا ہے کہ یہاں اللہ ورسول کے پاس لے جانے سے مراد امام کی طرف لے جانا ہی ہے۔

پانچواں اعتراض:۔

جو حضرات امام کے معصوم ہونے اور اولی الامر سے امام معصوم مراد ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ امام معصوم کے اتباع وپیروی کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ امت کو اختلافات کی ظلمت اور تنازعات وتفرقہ کے نقصانات سے بچاتا ہے، جبکہ آیۂ مُبارکہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولی الامر کے موجود ہونے کے باوجود نزاع رونما ہوتا ہے کہ جس کا حکم بیان کیا گیا ہے اور وہ اختلافات وتفرقہ کو ختم نہیں کرسکتا حالانکہ جو حضرات امام معصوم کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے ہاں امام معصوم کے ہوتے ہوئے نزاع وجھگڑا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ امام معصوم کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا سمجھتے ہیں، تو اس صورت میں امام معصوم کے وجود سے کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب بھی سابق الذکر مطالب سے ظاہر وواضح ہوتا ہے کیونکہ آیت میں جس نزاع وجھگڑے اور اختلاف کا حوالہ ہے اس سے مؤمنین کا کتاب وسنت کے احکام میں تنازع مقصود وملحوظ ہے نہ یہ کہ اُن احکام میں نزاع واختلاف مقصود

ہے جو امام کی طرف سے وقائع و حوادث میں حاکم کے طور پر صادر ہوں، اور ہم یہ مطلب پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ و رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کو حکم و قانون گزاری کا حق و اختیار حاصل نہیں، لہٰذا اگر آپس میں نزاع کرنے والے دو فریق کتاب و سنت سے خدا کا حکم سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ان کا حق ہے کہ وہ ان دو سرچشموں سے استفادہ کریں اور ان سے حکم الٰہی کا استنباط کریں یا پھر یہ کہ امامؑ سے اس کے بارے میں پوچھیں کیونکہ وہ خدا کا حکم سمجھنے میں عصمت کی منزل پر فائز ہوتا ہے اور اگر وہ خود اللہ کا حکم کتاب و سنت سے استخراج و استنباط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو ان پر لازم و واجب ہے کہ وہ اس کے بارے میں امام معصوم سے دریافت کریں۔ یہ بعینہ وہی سلسلہ یا اس کی مانند عملی نمونہ ہے جو حضرت رسول خدا ﷺ کے عہد مُبارک میں ہوتا تھا کہ لوگ جہاں تک ان سے ممکن تھا کتاب و سنت سے احکامِ خداوندی سمجھ سکتے تھے تو اپنی توانائیاں بروئے کار لا کر ایسا کرتے تھے یا آنحضرت ﷺ سے پوچھ لیتے تھے اور اگر اپنی علمی و فکری توانائیوں کو بروئے لانے کے باوجود حکمِ خدا سمجھنے سے قاصر ہوتے تھے تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے اس کے بارے میں معلوم کرتے تھے۔

بنا بر ایں یہ بات ثابت ہوئی کہ اولی الامر کا حکم اطاعت کے حوالہ سے وہی درجہ رکھتا ہے جو حضرت رسول خدا ﷺ کا حکم رکھتا ہے کہ اسی پر آیت مُبارکہ بھی دلالت کرتی ہے اور جہاں تک اس تنازع کی بات ہے جو آیۂ مُبارکہ میں مذکور ہے تو اس میں عہد نبوی ﷺ اور اس کے بعد کا زمانہ دونوں میں کوئی فرق نہیں کہ نزاع کی صورت میں اللہ و رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے کہ حضور ﷺ کی موجودگی میں آپ ﷺ سے پوچھا جائے اور آپ ﷺ کے بعد اولی الامر سے دریافت کیا جائے۔ عہد نبوی ﷺ میں آپ ﷺ سے پوچھنے کا ثبوت بعد والی آیات میں اور آپ ﷺ کے بعد زمانہ کا ثبوت زیر نظر آیۂ مبارکہ کے اطلاق میں پایا جاتا ہے۔

ایک اہم نتیجہ سے آگاہی

آیۂ مبارکہ میں ارشاد ہوا: ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ'' (اگر تم آپس میں نزاع کرو) تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں صرف مومنین کا آپس میں نزاع کرنا مقصود ہے نہ کہ اولی الامر کا آپس میں نزاع کرنا، ورنہ یوں ارشاد ہوتا: ''فان تنازع اولوا الامر'' اور نہ ہی یوں فرمایا: ''فان تنازعوا'' بلکہ مؤمنین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تم نزاع کرو، تو اس سے اہم نتیجہ سے آگاہی ملتی ہے کہ نزاع کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنے اور معاملہ کو آنحضرت ﷺ کے پاس لے جانے سے مراد یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جا کر ان سے مسئلہ پوچھا جائے یا جو شخص کتاب و سنت سے مسئلہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ استنباط کر کے یعنی اپنی علمی و فکری قوت استعمال میں لا کر حکم الٰہی حاصل کرے۔ اور جب حضور ﷺ موجود نہ ہوں یعنی

آپ ﷺ کی رحلت کے بعد امام معصومؑ سے دریافت کریں یا جسے کتاب وسنت سے حکم خدا سمجھنے کی صلاحیت ہو وہ ایسا کرے، لہٰذا معترض کی یہ بات قطعاً درست نہیں کہ جملہ ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ'' زائد کلام ہے کہ جس کا کوئی فائدہ نہیں، ایسا ہرگز نہیں۔

بنا برایں مذکورہ بالا تمام مطالب سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ آیۂ مبارکہ ''اُولِی الْاَمْرِ'' سے مراد امت کے مخصوص افراد ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کا حکم عصمت و واجب الاطاعت ہونے کے حوالہ سے وہی درجہ رکھتا ہے جو حضرت رسول اللہ ﷺ کے حکم کا ہے۔ اور یہ بات لفظ ''اُولِی الْاَمْرِ'' کے لغوی معنی کی عمومیت سے بھی منافات نہیں رکھتی اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس لفظ سے اس کا خاص معنیٰ مراد لیا جائے کیونکہ کسی لفظ کے متعدد مفاہیم میں سے ایک مفہوم کا ارادہ کرنا اور ہے اور اس سے اس مصداق کو مراد لینا کہ جس پر وہ مفہوم منطبق ہوتا ہو اور ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ اور یہ اسی طرح سے ہے جیسے لفظ رسول کا معنیٰ وسیع ہے یعنی پیغام پہنچانے والا، اور آیت میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن اس میں اس کا مصداق صرف حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مفہوم و مصداق میں عمومیت و خصوصیت کے حوالوں کے باوجود کسی لفظ سے اس مصداق خاص کا ارادہ کرنا کہ جس پر مفہوم کا انطباق درست ہو بلا مانع ہے، اس طرح اولی الامر کے الفاظ سے اہل حل وعقد کی مفہومی وسعت مراد لے کر اس سے امام معصوم مراد لینا درست ہے جو کہ اس کا مصداق ہے۔

تنازع کی صورت میں مؤمنین کا فریضہ

○ ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ..............''

(اور اگر تم کسی چیز میں آپس میں نزاع کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو)

یہ جملہ اس حصر کی فرع اور مفہومی نتیجہ ہے جو ''اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' میں پایا جاتا ہے، کیونکہ اس میں اللہ و رسول کی اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ وجوبی ولزومی ہے اور اس کا تعلق دینی امور و مسائل سے ہے کہ ان میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنے سے مربوطہ اختلاف دور ہو سکتا ہے، بلکہ ہر وہ مورد جہاں لوگوں کو اللہ و رسول کے علاوہ کسی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے، لہٰذا آیت کا معنیٰ یوں ہوں گا: ''اطیعوا اللہ ولا تطیعوا الطاغوت'' اللہ کی اطاعت کرو، طاغوت کی اطاعت نہ کرو، اور حصر کا معنیٰ یہی ہے، یعنی صرف اور صرف اللہ و رسول کی طرف رجوع کرو اور متنازعہ مسئلہ کو اللہ و رسول کے علاوہ کسی کے پاس نہ لے جاؤ۔

اور آیت میں چونکہ مؤمنین کو مخاطب کیا گیا ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مؤمنین ہی کے درمیان رونما ہونے والا تنازع ہے۔ مؤمنین اور اولی الامر یا خود اولی الامر کے درمیان تنازع ملحوظ و مقصود نہیں کیونکہ مؤمنین اور اولی الامر

کے درمیان تنازع ملحوظ ہوتو اولوالامر کی اطاعت کا واجب قرار دیا جانا بے معنی ہو جائے گا۔ مؤمنین، اولی الامر سے تنازع کر ہی نہیں کرسکتے، ان پر اولی الامر کی اطاعت واجب کی گئی ہے، اسی طرح اولی الامر کے درمیان بھی تنازع قابل تصور نہیں کیونکہ واجب الاطاعت افراد کے درمیان تنازع ممکن ہوتو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے ایک حق پر اور دوسرا باطل پر ہو تو اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کی اطاعت کیونکر واجب قرار دے سکتا ہے جو خود باطل پر ہو، اور اگر اولی الامر کے درمیان تنازع ملحوظ ہوتا تو مؤمنین کو مخاطب کرنے کی کیا ضرورت تھی اور ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ.........'' نہ کہا جاتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں مؤمنین کے درمیان آپس میں نزاع ہونا ملحوظ ہے۔

اور لفظ شَیْءٍ ''فِیْ شَیْءٍ'' میں اگرچہ اللہ، رسول اور اولی الامر (خواہ جو بھی مراد لیں) کا ہر حکم شامل ہے لیکن اس کے بعد والا جملہ ''فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں اس سلسلہ میں نزاع ملحوظ ہے جہاں اولوالامر کو اپنی حکومت وولایت کے دائرہ میں استقلالی طور پر اور آمرانہ حکم صادر کرنے کا حق حاصل نہیں، مثلاً جنگ یا صلح وغیرہ کے لئے لوگوں کو باہر نکلنے کا حکم دینا، کہ اس طرح کے امور میں چونکہ لوگوں پر اولی الامر کی اطاعت واجب ہوتی ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ان امور میں اس سے نزاع کریں اور پھر خدا حکم دے کہ جب ان امور میں اس سے نزاع کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔

بنابرایں آیۂ مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ان امور میں نزاع ملحوظ ہے اور ان میں معاملہ کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لے جانے کا حکم دیا گیا جو خالصۃً دینی احکام ہیں کہ جن کا نفاذ اور منسوخ کرنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں۔ گویا آیت مبارکہ صریح طور پر بیان کرتی ہے کہ کسی کو اس دینی حکم میں تصرف کرنے کا حق واختیار حاصل نہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے صادر فرمایا، اس حوالہ سے اولوالامر اور دیگر افراد برابر ہیں۔

اور جملہ ''اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ......'' میں مزید تاکید مطلوب ہے اور اس مطلب کا اشارہ مقصود ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی دراصل ایمان کی کمزوری وخرابی کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس حکم کا ایمان کے ساتھ گہرا تعلق ہے لہٰذا جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ وہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو مؤمن کہلاتا ہے اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان کا دعویدار ہے جبکہ باطن میں کفر چھپائے ہوئے ہے جو کہ نفاق سے عبارت ہے کہ جس کے بارے میں بعد میں ذکر کی جانے والی آیاتِ مبارکہ سے واضح ثبوت ملتے ہیں۔

اور جملہ ''ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا'' میں اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ تنازع میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنا بہتر اور نہایت اچھا عمل ہے کہ جس کا نتیجہ بہت عمدہ ہے۔ یا یہ کہ اللہ ورسول اور اولی الامر کی اطاعت اچھا عمل اور بہتر نتیجہ بخش ہے۔ یہاں لفظ ''تأویل'' سے مراد وہ حقیقی مصلحت الٰہیہ ہے جو اس حکم کا سرچشمہ ہے جس کا اثر عمل پر مترتب ہوتا ہے، سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷ ''وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ........'' کی تفسیر میں

تاویل کے معنی کی بابت جلد ۳ میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

ظاہری مدعیانِ ایمان اور ان کا کردار

○ ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ''

(کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس پر جو تیری طرف نازل کیا گیا ہے...)

لفظ ''زعم'' کا معنیٰ کسی چیز کا عقیدہ رکھنا ہے خواہ واقع الامر کے مطابق ہو یا نہ ہو، جبکہ لفظ ''علم'' اس کے برعکس اس عقیدہ کو کہتے ہیں جو واقع الامر کے مطابق ہو، اور چونکہ لفظ ''زعم'' عام طور پر ان اعتقادی موارد میں استعمال ہوتا ہے جہاں واقع الامر سے مطابقت نہ پائی جائے لہٰذا یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ شاید واقع الامر سے عدم مطابقت اس کے مفہوم میں داخل ہے جبکہ ایسا نہیں۔

لفظ ''طاغوت'' مصدر ہے جس کا معنیٰ طغیان وسرکشی ہے، جیسے رھبوت (بمعنی رھبت وخوف) جبروت (بمعنی جبر) اور ملکوت (بمعنی ملک) ہے، البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسے استعمال تو کیا جاتا ہے لیکن اس سے مبالغہ کے طور پر اسم فاعل کا معنیٰ مراد لیا جاتا ہے، مثلاً یوں کہا جاتا ہے: طغی الماء، پانی میں طغیانی آ گئی، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب پانی کھول رہا ہو اور اس قدر زیادہ ہو کہ اپنے برتن سے باہر آنے لگے، اور جہاں تک انسان کے بارے میں اس کے استعمال کا تعلق ہے تو پہلے اس کے لئے اس کا استعمال استعارۃً ہوا، پھر کثرتِ استعمال کی وجہ سے حقیقت کا روپ ڈھال گیا، اور اس سے یہ مراد لیا جانے لگا کہ وہ شخص اس دائرہ سے باہر نکل گیا جو عقل اور شریعت نے اس کے لئے معین کیا ہے۔ بنا برایں طاغوت سے مراد ظالم اور تکبر و بڑائی کی بناء پر اللہ کی بندگی کے فرائض سے تمرد وسرکشی کرنے والا ہے، اور جو کہتے ہیں کہ طاغوت سے مراد ہر وہ معبود ہے کہ خدا کے علاوہ جس کی عبادت کی جائے، ان کے قول کی بازگشت بھی اسی معنیٰ کی طرف ہوتی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

اور جملہ ''بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ'' (اس چیز پر ایمان کہ جو آپ کی طرف نازل کی گئی اور جو آپ سے پہلے نازل کی گئی) تو اس کا مطلب گویا اس طرح ہے: ''بما انزل اللہ علی رسلہ'' (اس چیز پر ایمان جو اللہ نے اپنے رسولوں پر نازل کی) یہاں اس طرح نہیں فرمایا: ''امنوا بك وبالذین من قبلك'' (ایمان لائے آپ پر اور ان لوگوں پر جو آپ سے پہلے تھے) کیونکہ یہاں ایمان والوں کو باہمی نزاع کی صورت میں کتاب اللہ (قرآن مجید) اور اس حکم الٰہی کی طرف رجوع کرنے کا وجوبی حکم دیا گیا ہے، اسی بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ'' میں امر سے مراد وہی کچھ ہے جو کتب آسمانی اور انبیاء یعنی حضرت محمد ﷺ اور ان سے پہلے آنے والے نبیوں پر نازل ہوا۔

ایک علمی وادبی نکتہ:

یہاں جملہ ''اَلَمْ تَرَ'' (کیا تو نے نہیں دیکھا) دراصل متوقع سوال کے جواب کے طور پر ہے اور وہ یہ کہ گویا یوں کہا گیا کہ خداوند عالم نے یہ کیوں فرمایا کہ تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی؟ تو اس کے جواب میں یوں کہا گیا کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ انہوں نے اطاعت الٰہی سے کس طرح منہ موڑا کہ وہ اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے جانے کے خواہاں ہیں؟ تو یہاں اس طرح کا سوال اور پوچھنا (اَلَمْ تَرَ۔ کیا تو نے نہیں دیکھا) دراصل افسوس کے اظہار کے لئے ہے، لہٰذا اس کا معنٰی یہ ہے کہ افسوس ہے کہ آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر اور آپ سے پہلے نازل کیا گیا اس پر ایمان لائے ہیں اور دیگر تمام انبیاء اور کتب آسمانی پر ایمان لائے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ نازل ہوا وہ اس لئے ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے بارے میں فیصلہ کریں جس میں آپس میں اختلاف رکھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مطلب سے واضح طور پر آگاہ کر دیا ہے اور فرمایا ہے: ''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ'' سورہ بقرہ، آیت ۲۱۳ (لوگ امت واحدہ تھے پھر اللہ نے نبیوں کو خوشخبری دینے والے اور انذار کرنے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب کو برحق نازل فرمایا تا کہ لوگوں کے درمیان اس چیز کے بارے میں فیصلہ کرے جس میں وہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں)۔

اس کے باوجود وہ تنازع کے وقت طاغوت سے فیصلہ کرواتے ہیں جبکہ طاغوت سرکش اور نافرمان ہیں اور دین سے منحرف اور حق پر تعدّی وزیادتی کرنے والے ہیں حالانکہ انہیں ان کتب میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کو نہ مانیں اور طاغوت کے پاس اپنے فیصلے لے جانے کی ممانعت کی بابت یہی بات کافی ہے کہ ایسا کرنے میں ان آسمانی کتب الٰہیہ کو بے وقعت اور اللہ کے قوانین واحکام کو باطل و بے اثر قرار دینا ہے۔

اور جملہ ''وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا'' سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا طاغوت سے اپنے فیصلے کروانا درحقیقت شیطانی اِلقاء واغواء اور فریب دینا ہے کہ اس میں اس کا مقصد انہیں گمراہی کے گہرے کھڈ میں گرا دینا ہے۔

منافقین کی کارستانیوں کا تذکرہ

○ ''وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ..........''

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا.......)

جملہ ”تَعَالَوْا“ (آؤ) لغت میں ”تعالیٰ“ بمعنی بلندی سے امر کا صیغہ ہے۔

اور ”صدّ“ کہ جس سے فعل ”یصدّون“ بنا ہے اس کا معنی روگردانی ہے۔ اس سے فعل ماضی ”صدّ“ اور فعل مضارع ”یصدّ“ ہے کہ جب وہ حرف ”عن“ کے ساتھ مذکور ہوں تو اعراض اور منہ پھیرنے کے معنی میں آتے ہیں۔ اور جملہ ”اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ“ (آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی اور رسول کی طرف) گویا اس طرح ہے جیسے یوں کہا گیا ہو ”الی حکم اللہ والی من یحکم بہ“ یعنی آؤ اللہ کے حکم کی طرف اور اس کی طرف جو اللہ کے حکم کے مطابق حکم دیتا ہے۔

اور جملہ ”یصدّون عنك......“ (وہ لوگوں کو آپ سے روکتے ہیں) میں طاغوت کی پیروی کرنے والوں کی طرف سے لوگوں کو حضرت رسول ﷺ سے روکنے کے بارے میں بیان ہے جبکہ انہیں کتاب اللہ اور رسول ﷺ دونوں کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی گئی تھی صرف رسول ﷺ کی طرف آنے کی دعوت نہیں دی گئی تھی، تو یہاں صرف رسول ﷺ کا نام لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ان لوگوں پر افسوس کا اظہار کیا گیا جو اپنے آپ کو مؤمن کہلاتے اور گمان کرتے ہیں کہ وہ مؤمن ہیں اور وہ کافر ہیں کیونکہ اگر وہ کافر ہوتے تو ان کے کئے پر افسوس کا اظہار نہ کیا جاتا اور کافر کتاب اللہ سے روگردانی کے مرتکب نہیں بلکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے روگردانی کے مرتکب ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنے آپ کو مؤمن سمجھتے اور کہلاتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ منافق ہیں اور ظاہری طور پر ایمان کے مدعی ہیں اور کہتے ہیں کہ اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو اللہ نے نازل کی لیکن وہ اپنے عمل میں اللہ کے رسول سے روگردانی کرتے ہیں۔

اس بیان سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں فرق کرتے ہوئے اللہ کے حکم کو تسلیم کرنا اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بابت تردد کا شکار ہونا عین منافقت ہے۔

حکم خدا سے روگردانی کا نتیجہ

○ ”فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ“

(تو اس وقت کیا ہوگا جب ان پر مصیبت آئے گی.......)

اس جملے میں اس مطلب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے روگردانی اور اس کے علاوہ کسی اور کے حکم کی طرف رخ کرنا جو کہ طاغوت کا حکم ہے بہت جلد ایسا کرنے والوں کو ایک عذاب میں مبتلا کر دے گا کہ جس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے منہ موڑ کر طاغوت کے حکم کو اپنایا۔

اور جملہ ”ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ........“ (پھر وہ آپ کے پاس آ کر اللہ کی قسم کھاتے ہیں) میں ان لوگوں کی

معذرت خواہی کا تذکرہ ہوا ہے کہ وہ اپنے کئے پر ندامت کا اظہار خدا کی قسم کھا کر اس طرح کہتے ہوئے کرتے ہیں کہ وہ طاغوت کی طرف رجوع کرنے میں کوئی برا ارادہ نہیں رکھتے تھے، بنا بر ایں آیت کا معنیٰ، واللہ اعلم، یہ ہوگا کہ جب ان کی حالت ایسی ہے تو جب ان پر ان کے کئے کے نتیجہ میں سخت مصیبت آپڑے گی تو ان کا کیا حال ہوگا، پھر وہ آپ کے پاس آکر کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر طاغوت کو فیصل بنایا تو اس میں ہمارا مقصد نیک ہے اور وہ یہ کہ ہم چاہتے کہ لوگوں میں باہم اتفاق ہو اور ہم تنازعات کے خاتمہ کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

منافقین کی تکذیب

○ ''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ''

(یہی ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے.......)

اس جملے میں ان کی طرف سے پیش کئے گئے عذر کی تکذیب کی گئی ہے، اس میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ ان کے دل میں کیا ہے بلکہ اسی پر اکتفاء کی گئی ہے کہ خدا جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، اس جملہ پر اکتفاء کی وجہ یہ ہے کہ بعد والے جملہ ''فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ'' (ان سے منہ موڑ لو اور انہیں نصیحت کرو) میں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے وہ صحیح نہیں بلکہ باطل و ناجائز ہے کیونکہ اگر ان کے دلوں میں صحیح و حق بات ہوتی تو ان سے منہ پھیرنے کا حکم نہ دیا جاتا کیونکہ حق و سچ کہنے والے سے منہ پھیرنے کا حکم نہیں دیا جا سکتا بلکہ ناحق و نادرست بات کرنے والے سے منہ پھیرنے کا حکم دیا جاتا ہے جو کہ واضح لفظوں میں خداوند عالم نے دیا ہے۔

اور جملہ ''وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا'' (اور ان سے ان کے دلوں میں جگہ کرنے والی پختہ بات کہو) سے مراد یہ ہے کہ ان سے ایسی بات کریں جسے ان کے دل بخوبی سمجھ لیں اور انہیں آپ کا مقصد و مقصود معلوم ہو جائے کہ آپ انہیں ان کے برے عمل کے نتائج سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ نفاق ان پر اللہ کا عذاب نازل ہونے کا سبب بن سکتا ہے اور وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

رسالت کا مقصد: اطاعت الٰہی

○ ''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ''

(اور ہم نے جو رسول بھیجا وہ صرف اس لئے کہ اس کی اطاعت اللہ کے اذن کے ساتھ کی جائے)

اس جملے میں منافقین کے سابق الذکر تمام مطالب واعمال کا جامع جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ہم نے رسول کو صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم واذن کے ساتھ اس کی اطاعت کی جائے لہٰذا اس کے احکام کی خلاف ورزی خواہ کسی بھی صورت میں ہو صحیح نہیں، خواہ طاغوت کو اپنا فیصل بنانے کی صورت میں ہو، خواہ رسول اللہ ﷺ سے منہ موڑنے کی صورت میں ہو، خواہ اپنے کئے کو درست قرار دینے اور قسم کھا کر یہ کہنے کی صورت میں ہو کہ وہ نیکی کے علاوہ کوئی غرض ومقصود نہیں رکھتے اور وہ لوگوں میں باہمی اتفاق کی غرض سے ایسا کرتے ہیں، تو یہ سب رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور ان کے احکام کی خلاف ورزی کی مختلف صورتیں ہیں خواہ ان کے ساتھ وہ کوئی عذر و بہانہ پیش کریں یا نہ کریں بات ایک ہے، اور اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی اطاعت ہر طرح کی قید وشرط سے ماوراء قرار دی ہے اور بعثت ورسالت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے اذن سے ان کی اطاعت کی جائے، لہٰذا یہ خیال باطل ہے کہ اطاعت کا حکم صرف اطاعت الٰہی سے مختص ہے کہ رسول ﷺ چونکہ ایک عام انسان ہیں لہٰذا ان کی اطاعت صرف اُنہی امور میں واجب ہے جن میں لوگوں کا فائدہ ہو کہ اگر وہ فائدہ ان کی اطاعت کے بغیر حاصل ہو سکتا ہو تو ان کی اطاعت کیوں کی جائے؟ بلکہ انہیں چھوڑ کر اپنی صوابدید کے مطابق عمل کیا جانا چاہیے ورنہ اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب لازم آئے گا یعنی اللہ کے ساتھ رسول ﷺ کی عبادت ہو جائے گی، چنانچہ اس کا ثبوت صدرِ اسلام میں اصحاب کے عمل سے ملتا ہے کہ جب حضور ﷺ کسی اہم مسئلہ میں کوئی حکم دیتے تو کچھ لوگ پوچھتے تھے کہ کیا یہ اللہ کا حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ حقیقت الامر کو بیان فرمائے اور اس نے اس جملہ "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" میں واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا واجب و لازم ہونا مطلق اور ہر طرح کی قید وشرط سے خالی ہے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت عین اطاعت خدا ہے کیونکہ وہ خدا کے اذن سے ہے جیسا کہ یہ مطلب درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی ثابت ہوتا ہے:

○ سورۂ نساء، آیت: ۸۰

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ"

(جو شخص رسول کی اطاعت کرے گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی)

توبہ واستغفار کی گنجائش

○ "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ"

(اور اگر وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے کے بعد آپ کے پاس آئیں اور اللہ سے معافی طلب کریں......)

اس جملے میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور رسول اللہ ﷺ سے منہ موڑنے والوں کو توبہ واستغفار کرنے کی ضمنی دعوت دی ہے کہ اگر وہ پلٹ آئیں اور رسول ﷺ سے روگردانی کے مرتکب ہونے کے بعد توبہ کر کے اللہ ورسول ﷺ سے معافی و بخشش طلب کریں تو ایسا کرنا ان کے قسمیں کھانے سے بہتر ہے اور انہیں ایسے بہانے تراشنے کی ضرورت ہی نہ ہو کہ جو نہ تو ان کے لئے فائدہ مند ہیں اور نہ ہی رسول ﷺ اس سے راضی ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو حقیقت الامر سے باخبر رکھتا ہے اور اس نے حضور ﷺ کو آگاہ کر دیا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے کے بعد آپ کے پاس آکر معافی مانگیں: ''وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ........''

حقیقی ایمان کا عملی معیار

○ ''فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ''

(نہیں، تیرے رب کی قسم، وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ کو اپنے درمیان پیش آنے والے تنازع میں فیصل قرار نہ دیں)

''شَجْر'' جیم پر جزم کے ساتھ۔ اور ''شجور'' کا معنیٰ اختلاط ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: شَجَر شَجْرًا وشجوراً تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ فلاں چیز مخلوط ہوگئی، تشاجر اور مشاجرہ بھی اسی باب سے ہے کیونکہ نزاعات اور باہمی جھگڑوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ فریقین کی باتیں ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط ہو جاتی ہیں کہ سننے والا دونوں میں سے کسی کی بات واضح طور پر سمجھ نہیں سکتا، درخت کو بھی ''شجر'' اسی حوالہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کی شاخیں، ایک دوسرے کے ساتھ ملی وجڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

لفظ ''حرج'' کا معنیٰ تنگی ہے۔

آیت کے ظاہر السیاق سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت منافقین کے جواب میں ہے جو یہ گمان کرتے تھے کہ وہ نبی ﷺ پر ایمان لائے ہیں جبکہ انہوں نے طاغوت کو اپنا فیصل قرار دیا تھا، لہٰذا آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ ایسا نہیں ہے جیسا وہ کہتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں جبکہ وہ طاغوت کو اپنا فیصل قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اس وقت تک ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک آپ ﷺ کو اپنا فیصل قرار نہ دیں........

لیکن آیت مبارکہ میں مذکورہ مطلب ''حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ........'' منافقین اور غیر منافقین دونوں کے لئے ہے کہ وہ جب تک آپ ﷺ کو اپنا فیصل قرار نہ دیں مؤمن نہیں ہو سکتے، اسی طرح اس کے بعد والے جملہ ''وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ...... تا...... مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آیت میں جو جواب مذکور ہے وہ منافقین سے مختص نہیں بلکہ ان کے

علاوہ سب کے لئے عمومی ضابطہ و معیار بتایا گیا ہے کہ ظاہری طور پر یہ گمان کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو معارف و احکام نازل ہوئے ہیں ان کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کو مان لینا ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا ہے اور جو کچھ حضور ﷺ اپنے پروردگار کی طرف سے لائے ہیں وہ حق ہے اور بس، نہیں ایسا نہیں بلکہ ایمان ظاہراً اور باطناً دونوں طرح سے کامل طور پر سر تسلیم خم کردینے کا نام ہے، تو یہ کیونکر درست ہے کہ کسی مؤمن کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ رسول ﷺ کا کوئی حکم ظاہری طور پر تسلیم نہ کرے اور آنحضرت ﷺ سے روگردانی کرتے ہوئے ان کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو یا یہ کہ اپنے باطن میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بابت دل تنگی پیدا کرے کیونکہ ان کا حکم اس کی نفسانی خواہش سے متصادم ہے، اس صورت میں ایمان کامل نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: "لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرٰىكَ اللهُ" (تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھادی ہے) سورۂ نساء، آیت: ۱۰۵

بنابراین جو شخص نبی کریم ﷺ کے فیصلہ پر دل تنگی و ناراضیتی کرے تو اس نے اللہ کے حکم پر دل تنگی و ناراضیتی کی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو یہ شرف و عزت عطا فرمائی ہے کہ اس کے بندے آپ ﷺ کی اطاعت کریں اور آپ ﷺ کے فیصلہ و حکم کو نافذ العمل قرار دیں۔

لہٰذا اگر لوگ رسول خدا ﷺ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کردیں اور ان کے دلوں میں اس کی بابت کوئی ناراضیتی پیدا نہ ہو تو وہ حقیقت میں اللہ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے والے قرار پائیں گے خواہ وہ حکم تشریعی ہو یا تکوینی، دونوں کا ضابطہ و معیار یکساں ہے۔ تو یہ ایمان کا ایک مرحلہ ہے کہ جب کوئی مؤمن اس مرحلہ کو پالے تو اس میں متعدد فضیلتی صفات جنم لیتی ہیں کہ جن میں سے واضح ترین صفت اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو تسلیم کرنا ہے اور جب کوئی شخص اس صفت کا حامل ہو تو پھر نہ تو اس کی زبان پر اور نہ ہی اس کے دل میں اللہ کے کسی بھی حکم و فیصلہ کے بارے میں اعتراض یا عدم قبول کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے آیت مبارکہ میں لفظ "تسلیم" کو مطلق صورت میں ذکر کیا گیا ہے (وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا) یعنی ہر طرح سے تسلیم کرنا، اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ جملہ "فَلَا وَرَبِّكَ ......" اگرچہ لفظوں میں نبی ﷺ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے کے حکم پر مشتمل ہے کیونکہ آیات کا مورد لوگوں کا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کی طرف رجوع کرنے اور اسے (طاغوت کو) فیصل قرار دینے سے مربوط ہے جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی طرف رجوع کریں اور انہیں اپنا فیصل قرار دیں لیکن "فَلَا وَرَبِّكَ....." میں ایک عمومی حکم بیان کیا گیا ہے جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ دونوں کے حکم پر سر تسلیم خم کرنا ملحوظ ہے کہ جس میں تشریعی و تکوینی تمام احکام و فیصلے شامل ہیں۔ بلکہ اس سے بھی وسیع تر معنی کا حامل ہے کہ جس میں آنحضرت ﷺ کے تمام فیصلوں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا ہر پہلو شامل ہے کیونکہ نتیجہ ایک ہے اور جو چیز بھی اللہ اور رسول اللہ ﷺ سے نسبت رکھتی ہے اس میں کسی مؤمن کو انکار و اعتراض کا حق حاصل نہیں اور نہ اسے زیب دیتا ہے کہ وہ اس کی بابت دل تنگی و ناراضیتی کا

اظہار کرے کیونکہ اس طرح کرنا مشرک ہے کہ جس کی کئی صورتیں اور مختلف درجات ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ'' (اوران کے اکثر لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر یہ کہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں) سورۂ یوسف، آیت: ۱۰۶

ایمان والوں کی قلیل تعداد

''وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ.........مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ''

(اور اگر ہم ان پر لکھ دیتے (واجب قرار) دیتے.........وہ اسے انجام نہ دیتے سوائے ان میں سے چند لوگوں کے)

اس سے پہلے اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۴۶ ''وَلٰكِنْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ'' کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ آیت کی ترکیب ہی اس حقیقت کی دلیل ہے کہ اس میں جو حکم مذکور ہے وہ پورے معاشرہ یعنی مجموعۂ افراد کے لئے ہے اور حرف ''إِلَّا'' کے ساتھ جو استثناء وارد ہوا ہے وہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہے کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں تمام افراد ملحوظ و شامل ہیں، یہاں بھی ''إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ'' کے الفاظ سے جو استثناء ملحوظ ہے وہ بھی اسی غلط فہمی کو دور کرنے کی غرض سے ہے کہ کہیں ایسا نہ سمجھا جائے کہ تمام افراد اس میں ملحوظ ہیں اور کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، لہٰذا یہ استثناء متصل کی بجائے استثناء منفصل سے زیادہ مشابہ ہے یا یہ کہ استثناء متصل اور منفصل کے درمیان ایک برزخی صورت ہے کیونکہ اس میں دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

بنابر ایں جملہ ''مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ'' ایک طرح سے معاشرہ کے مجموعی افراد کی حالت کو بیان کرتا ہے کہ وہ ان سخت اور مشقت آمیز اعمال کو بجالانے والے نہیں جو ان کے دلوں پر گراں گزرتے ہیں اور ان کے ان پسندیدہ امور کے منافی ہیں جن سے ان کی قلبی و وطنی اور قومی وابستگی ہے اور جہاں تک استثناء کا تعلق ہے تو وہ غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہے۔

لہٰذا آیت مبارکہ کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر ہم ان پر لکھ دیں یعنی واجب کر دیں کہ وہ اپنے آپ کو قتل کر دیں اور اپنے خانہ وکاشانہ سے باہر نکل جائیں کہ جو انہیں عزیز و دلپسند ہیں تو وہ اس حکم پر عمل نہیں کریں گے، اور چونکہ ''وہ عمل نہیں کریں گے'' کے الفاظ سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو خدا کے حکم پر عمل کرے اور صحیح معنی میں مؤمن ہونے کا عملی ثبوت دے لہٰذا جملہ ''إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ'' (سوائے چند افراد کے) فرما کر معدودے چند افراد کو مستثنیٰ کیا گیا کیونکہ وہ حقیقتاً اس میں شامل ہی نہ تھے بلکہ عدم امتثال کی بات معاشرہ بحیثیت معاشرہ کے بارے میں تھی اور افراد چونکہ معاشرہ کی پہچان انہی سے وابستہ ہوتی ہے لہٰذا استثناء ضروری تھا۔

ان مطالب سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کرنے کا حکم مجموعی صورت میں ہے اور جلاء وطنی کا حکم بھی مجموعی صورت میں ہے

نہ یہ کہ ہر فرد کا اپنے آپ کو قتل کرنا اور ہر فرد کا اپنے گھر سے نکلنا مقصود وملحوظ ہے اور یہ بعنیہٖ اسی طرح ہے جیسے سورۂ بقرہ، آیت ۵۴ ''فَتُوبُوٓا اِلٰی بَارِئِکُمۡ فَاقۡتُلُوٓا اَنۡفُسَکُمۡ'' (پس تم اپنے خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو اور اپنے آپ کو قتل کردو) تو اس حکم میں افراد کی بجائے معاشرہ ملحوظ ہے۔

احکامِ الٰہی میں مخلوق کی بھلائی

○ ''وَلَوۡ اَنَّهُمۡ فَعَلُوۡا مَا یُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ لَکَانَ خَیۡرًا لَّهُمۡ وَاَشَدَّ تَثۡبِیۡتًا''

(اور اگر وہ اس پر عمل کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان کیلئے بہتر تھا اور ان کے استحکام میں قوت پیدا ہو جاتی)

اس جملے میں ''ولو کتبنا'' (اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے) کو نصیحت کے الفاظ میں تبدیل کر کے یوں کہا گیا: ''مَا یُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ'' (جس کی انہیں نصیحت کی گئی) تو اس میں اس مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگرچہ ان احکام کی ظاہری صورت فرمان و دستور کی ہے لیکن ان میں ان کی بہتری و بھلائی کی طرف اشارہ ہے اور وہ حقیقت میں ایسی نصیحتیں ہیں جن میں ان کی خیر وسعادت ملحوظ و مراد ہے۔

چنانچہ جملہ ''لَکَانَ خَیۡرًا لَّهُمۡ'' سے مراد یہ ہے کہ اس میں ان کی دنیاوی اور اُخروی دونوں سعادتیں اور بہتری ملحوظ ہے کیونکہ اخروی خیر و بھلائی دُنیاوی خیر و بھلائی سے جدا نہیں بلکہ اس کے پیچھے پیچھے آتی ہے۔

اور جملہ ''وَاَشَدَّ تَثۡبِیۡتًا'' سے مراد یہ ہے کہ ان کے نفوس وقلوب میں ایمان میں پختگی پیدا ہونے کی ضمانت ہے کیونکہ یہاں سلسلۂ گفتگو ایمان ہی سے مربوط ہے، اسی حوالہ سے درج ذیل آیۂ مبارکہ میں یوں ارشاد ہوا:

○ سورۂ ابراہیم، آیت: ۲۷

''یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ''

(خداوند عالم ان لوگوں کو مستحکم تر کرتا ہے جو ایمان لائے)

عظیم اجر کا عطیہ

○ ''وَّاِذًا لَّاٰتَیۡنٰهُمۡ مِّنۡ لَّدُنَّاۤ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۶۷﴾''

(اور پھر ہم انہیں اپنی طرف سے عظیم اجر سے نوازیں گے)

اس جملے میں ان لوگوں کو عظیم اجر عطا کئے جانے کا تذکرہ ووعدہ ہے جو ایمان کی پختگی کے حامل ہوں، یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ ایمان کی برکت سے اپنی طرف سے قوتِ قلب عطا فرمائے گا انہیں عظیم اجر سے بہرہ ور بھی کرے گا، اس میں عظیم اجر کی تفصیل مذکور نہیں بلکہ اس حوالہ سے ابہام ہے اور واضح نہیں کیا گیا کہ وہ اجر کیا ہوگا؟ تو یہ بعینہ اسی طرح سے ہے، جیسے جملہ "لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ" میں "خیر" کی وضاحت نہیں کی گئی بلکہ اسے مطلق صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

ہدایت کا وعدہ

○ "وَلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾"
(اور ہم ضرور انہیں سیدھی راہ کی ہدایت کریں گے)

اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مضبوط ایمان والوں کو صراطِ مستقیم کی ہدایت سے نوازے جانے کا وعدہ مذکور ہے، صراطِ مستقیم کے بارے میں تفصیلی تذکرہ سورۂ الحمد، آیت ۶ (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ) کی تفسیر میں ہو چکا ہے، ملاحظہ ہو: تفسیر المیزان جلد اول۔

خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت

○ "وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ....... تا....... وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا"
(اور جو شخص اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرے.......)

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کی اطاعت کا یکجا تذکرہ ہوا ہے جبکہ سابقہ آیات میں صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم و فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بات کی گئی تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ دو آیتوں کے درمیان "وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ......" کی آیت مبارکہ ذکر ہوئی لہٰذا ضروری تھا کہ اس امر کی وضاحت کی جائے کہ جو اطاعت واجب قرار دی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت دونوں سے عبارت ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ ابتدائے سخن ان الفاظ سے ہوئی: "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ........" (تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی......) لہٰذا بیان کے آخر میں بھی دونوں کی اطاعت مذکور ہے تا کہ ابتداء اور آخر میں کلامی و موضوعی ارتباط برقرار رہے۔

''منعم علیہم'' کے ساتھی ہونے کا اعزاز

○ ''فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ........''

(یہی ہیں ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ نے نعمتیں نازل کیں.......)

یہ آیت اس مطلب کا ثبوت دیتی ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرنے والے لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے نعمتیں نازل فرمائیں نہ یہ کہ وہ خود انہی میں سے ہیں، یعنی جن پر انعام ہوا وہ اور ہیں اور جو ان سے ملحق ہوں گے وہ اور ہیں، اور جن پر انعام نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے نوازا اور وہ صراطِ مستقیم والے حضرات ہیں کہ جن کے بارے میں خداوند عالم نے سورۂ حمد آیت ۷ میں یوں ارشاد فرمایا: ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ'' (ہمیں ہدایت فرما سیدھے راستہ کی کہ جو ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے نعمتیں نازل فرمائیں) صراطِ مستقیم کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ صرف انہی حضرات کی طرف دی ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے والوں کے ان چار گروہوں سے ملحق ہونے کا تذکرہ ہوا ہے (انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں اور ملحق ہونے والوں میں فرق ہے جیسا کہ جملہ ''وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا'' سے بھی اس مطلب کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ اور ''نعمت'' وانعام کے بارے میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس سے مراد نعمت ولایت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ چار گروہ کہ جن پر نعمت نازل ہوئی وہ کون ہیں؟ سب سے پہلا گروہ، انبیاءؑ ہیں، ان سے مُراد وہ ہستیاں ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے اور وہ غیبی خبروں سے آگاہی رکھتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں سوائے ان کے ان آثار کے کہ جو ان سے ہمیں معلوم ہوئے ہیں، اور شہداء سے ''اعمال پر گواہ ہستیاں'' مراد ہیں چنانچہ قرآنِ مجید میں جہاں بھی لفظ ''شھید'' استعمال ہوا ہے اس سے مراد یہی افراد ہیں نہ کہ وہ افراد جو میدانِ جنگ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوتے ہیں، یعنی قرآنِ مجید میں کسی بھی مقام پر شھید و شہداء سے میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے مراد نہیں بلکہ ''اعمال پر گواہ'' مراد ہیں۔ اس موضوع کی بابت تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔ ''صالحین'' سے مُراد وہ افراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی لیاقت رکھتے ہیں، اور ''صدیقین'' جو کہ لفظ ''صدق'' یعنی سچ سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ''زیادہ سچ بولنے والے'' ہے، ''صدق'' یعنی سچ عمل میں بھی ہوتا ہے، عمل میں سچ سے مراد یہ ہے کہ عمل، قول سے مطابقت رکھتا ہو۔ کیونکہ عمل باطنی نظریہ وعقیدہ کی ترجمانی کرتا ہے لہٰذا جب کسی شخص کا عمل صحیح طور پر اس کے باطن کا ترجمان ہو تو اس میں اور قول میں

یکسانیت پائی جاتی ہے کہ ظاہر و باطن ایک ہی صورت و قالب میں ڈھل جاتے ہیں اور عمل سے مافی الضمیر کا اظہار ہوتا ہے اور قول میں سچ سے مراد یہ ہے کہ وہ حقیقت اور واقع الامر سے عین مطابقت رکھتا ہو، اور قول یعنی بولنا اور کچھ کہنا بھی افعال سے ہے لہٰذا جو شخص اپنے فعل میں سچا ہو وہ کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا جس کا واقع الامر کے مطابق ہونا اسے معلوم نہ ہو بلکہ وہ صرف وہی کچھ کہے گا جسے وہ حقیقی معنیٰ میں صحیح اور سچ سمجھتا ہو گا اور اس کے حق ہونے کے متعلق اسے یقین ہو گا، بنا برایں ایسے شخص کی بات بھی سچ کہلائے گی اور وہ خود بھی سچا کہلائے گا، گویا اس کا قول، قول کے سچ ہونے اور خود اس کے سچا ہونے کا ثبوت فراہم کرے گا۔

تو ''صدیق'' کہ جو ہرگز ہرگز جھوٹ نہیں بولتا وہی ہے جو صرف وہی کچھ انجام دیتا ہے جسے وہ حق سمجھتا ہے کہ اس میں اس کی اپنی خواہش اور ذاتی ترجیح دخیل نہیں ہوتی، اور وہ صرف وہی بات کرتا ہے جو حق ہو اور وہ صرف وہی کچھ دیکھتا ہے جو حق ہو، یعنی وہ حقائق الاشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے کہ حق کہتا ہے اور حق عمل کرتا ہے۔

ان مطالب کی روشنی میں مذکورہ بالا چار گروہوں کا ترتیبی ذکر واضح ہو جاتا ہے لہٰذا انبیاء کو سرداری و سیادت حاصل ہے، ان کے بعد صدیقین ہیں جو حقائق و اعمال کے گواہ اور ان کا مشاہدہ کرنے والے ہیں، اور پھر ''شہداء'' ہیں جو اعمال پر گواہ ہیں اور ''صالحین'' ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عنایاتِ خاصہ سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت و آمادگی رکھتے ہیں۔

اور جملہ ''وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا'' کلام میں امتیازی معنی کا حامل ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے حضرات کی رفاقت اور ساتھ ہونا نہایت اچھا ہے، بعض اہل علم حضرات کا کہنا ہے کہ اس جملہ میں لفظ ''رَفِيْقًا'' کو جمع کے صیغہ (رفقاء) میں ذکر نہ کرنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اسے جمع کے صیغہ کے بجائے مفرد کے صیغہ میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیان کیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک کا ساتھ ہونا اچھا ہے، اس کی مثال درج ذیل آیت میں موجود ہے:

○ سورۂ حج، آیت: ۵

''ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا''

(پھر ہم تمہیں بچہ بنا کر ماؤں کے شکموں سے باہر نکالیں گے)

خدا کی عنایت کا تاکیدی حوالہ

○ ''ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا''

(وہ اللہ کی طرف سے خاص عنایت ہے، اور اللہ ہی بخوبی جاننے والا ہے)

اس جملہ میں حرف ''ذٰلِكَ'' سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور اسے ابتدائے بیان میں ذکر کرنا جو کہ دور کے اشارہ کے لئے ہے اور پھر لفظ ''فضل'' کو الف ولام کے ساتھ ذکر کرنا (اَلْفَضْلُ) اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں عظیم عنایت کا ذکر مقصود ہے گویا وہ سراسر فضل وعنایت اور ہر فضل وعنایت کا جامع ہے، اور بیان کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے علم کا تذکرہ بھی اس لئے ہوا ہے کہ ایمان کے درجات کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اور ان درجات کی تشخیص و پہچان اور ان سے آگاہی علم الٰہی کے علاوہ ممکن نہیں۔

چند اہم مطالب کا ضروری تذکرہ

قارئین کرام اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ کلامی و بیانی حوالہ سے مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں متعدد و مختلف اندازِ بیان اختیار کئے گئے ہیں کہ جو ایک دوسرے سے آمیختگی و پیوستگی رکھتے ہیں، چنانچہ ابتداء میں مؤمنین کو مخاطب قرار دے کر یوں ارشاد ہوا: ''يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوۤا'' (اے ایمان والو) اور پھر انہیں غائب کے صیغۂ بیان میں لا کر یوں ارشاد ہوا: ''وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ ......'' (اور اگر ہم ان پر واجب قرار دیں)، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آیات میں اپنے آپ کو غائب کے صیغۂ بیان میں ذکر فرمایا چنانچہ ارشاد ہوا: ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ ......'' (اللہ کی اطاعت کرو) پھر جمع متکلم کے صیغہ کے ساتھ یوں ارشاد فرمایا: ''وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ ......'' (اور ہم نے جو رسول بھیجا ......)، پھر اس میں تبدیلی لا کر یوں فرمایا: ''بِاِذْنِ اللّٰهِ'' (اللہ کے اذن کے ساتھ) پھر اسے جمع متکلم کے صیغہ میں بدل کر یوں فرمایا: ''وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا ......'' (اور اگر ہم ان پر واجب قرار دیں)، اور پھر صیغۂ غائب کے ساتھ یوں فرمایا: ''وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ......'' (اور جو شخص اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی ......) اسی طرح حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تذکرہ میں بھی صیغوں میں تبدیلی واقع ہوئی مثلاً ابتدائے آیات میں یوں فرمایا: ''وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ......'' پھر صیغۂ غائب میں یوں فرمایا: ''ذٰلِكَ خَيْرٌ'' پھر صیغۂ غائب میں یوں فرمایا: ''وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ ......'' (اور رسول ان کے لئے استغفار کرے) پھر صیغۂ مخاطب میں یوں فرمایا: ''فَلَا وَرَبِّكَ ......'' (اور قسم ہے تیرے پروردگار کی)، پھر صیغۂ غائب کے ساتھ یوں فرمایا: ''وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ'' (اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے)، پھر صیغۂ مخاطب کے ساتھ یوں فرمایا: ''وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا'' تو یہ دس موارد ایسے ہیں جن میں بیان کا انداز مرحلہ بہ مرحلہ تبدیل ہوا ہے لہٰذا ان میں سے ہر مورد میں اچھی طرح غور کرنے سے ان میں موجود مخصوص نکات سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔

روایات پر ایک نظر

اولوا الامر کے ناموں کا تعین

تفسیر "برہان" میں ابن بابویہ سے روایت مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے اسناد سے جابر بن عبداللہ انصاری کا بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

"لما انزل الله عزوجل علیٰ نبیّهٖ محمد (ص) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" قلت: یارسول الله (ص)، عرفنا الله ورسوله فمن اولوا الامر الذین قرن الله طاعتهم بطاعتك؟ فقال (ص): هم خلفائی یاجابر وائمة المسلمین من بعدی: اولهم علی بن ابی طالب، ثم الحسن، ثم الحسین، ثم علی بن الحسین، ثم محمد بن علی المعروف فی التوراة بالباقر ستدرکه یاجابر. فاذا لقیته فاقرأه منی السلام. ثم الصادق جعفر بن محمد، ثم موسیٰ بن جعفر، ثم علی بن موسیٰ، ثم محمد بن علی، ثم علی بن محمد، ثم الحسن بن علی، ثم سمیی محمد و کنیتیی حجة الله فی ارضهٖ و بقیته فی عبادهٖ ابن الحسن بن علی ذالك الذی یفتح الله تعالیٰ ذکرهٗ علی یدیهٖ مشارق الارض ومغاربها، ذالك الذی یغیب عن شیعتهٖ واولیائهٖ غیبة لا یثبت فیه علی القول بامامتهٖ الّا من امتحن الله قلبهٗ للایمان

قال جابر: فقلت لهٗ یارسول الله (ص)! هل یقع لشیعتهٖ الانتفاع بهٖ فی غیبتهٖ؟ فقال (ص): ای والذی بعثنی بالنبوة انهم یستضیئون بنورهٖ وینتفعون بولایتهٖ فی غیبتهٖ کانتفاع الناس بالشمس وان تجلاها سحاب. یاجابر، هٰذا من مکنون سرّ الله ومخزون علم الله فاکتمه الّا عن اهلهٖ

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ آیت نازل فرمائی: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" (اے ایمان والو، تم اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اولی الامر کی) تو میں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کو تو پہچانا، یہ اولی الامر کون ہیں جن کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت کے ساتھ ملا دیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ میرے خلفاء ہیں اے جابر! اور وہ میرے بعد مسلمانوں کے امام ہیں، ان میں سے پہلے علی بن ابی طالب ہیں، پھر حسن، پھر حسین، پھر علی بن

الحسین، پھر محمد بن علی کہ جو تورات میں باقر کے نام سے معروف ہیں۔ تم اے جابر ان سے ملو گے تو جب ان سے ملاقات کرو تو میرا اسلام انہیں پہنچا دینا، پھر صادق جعفر بن محمد ہیں، پھر موسیٰ بن جعفر، پھر علی بن موسیٰ، پھر محمد بن علی، پھر علی بن محمد، پھر حسن بن علی، پھر میرے ہمنام محمد ہیں، ان کی کنیت بھی میری کنیت جیسی ہے، وہ حسن بن علی کے فرزند ہیں، وہ روئے زمین پر اللہ کی حجت ہیں اور اللہ کی مخلوق میں اللہ کی یادگار نشانی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں اپنا ذکر پھیلائے گا اور مشرق و مغرب میں اس کے ذریعے خدا کا ذکر عام ہو جائے گا، وہی ہے جو اپنے شیعوں اور اپنے دوستوں و چاہنے والوں سے پردۂ غیب میں چلا جائے گا، اس کی غیبت کے دوران صرف وہی افراد اس کی امامت کے عقیدہ پر ثابت قدم رہیں گے جن کے دل کا امتحان اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ذریعے لے لیا ہو۔

جابر نے کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: اے اللہ کے رسول! ان کی غیبت کے دوران ان کے شیعوں کو ان سے کوئی فائدہ حاصل ہوگا؟ تو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، مجھے قسم ہے اس ذات کی کہ جس نے مجھے نبوت کا منصب عطا فرمایا ہے، وہ ان کے نور سے روشنی پائیں گے اور ان کی غیبت کے دوران ان کی ولایت سے اسی طرح، بہرہ ور ہوں گے جس طرح لوگ سورج سے فائدہ اٹھاتے ہیں اگرچہ اس پر بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اے جابر، یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے پوشیدہ رازوں میں سے ہیں اور اللہ کے خزانہ علم کا حصہ ہیں، انہیں اس کے اہل کے علاوہ کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا۔

(ملاحظہ ہو، تفسیر البرہان، جلد اول، صفحہ ۳۸۱)

اس کتاب (تفسیر برھان میں نعمانی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے اسناد سے سلیم بن قیس ھلالی کی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی قدر ذکر کیا جو مذکورہ بالا روایت کے ہم معنی ہے، اور اس سلسلہ میں متعدد روایات شیعہ و سنی اسناد سے موجود ہیں جن میں آئمہ اہل بیتؑ کی امامت کا تذکرہ ان کے اسماء گرامی قدر کے ساتھ ہوا ہے۔ جو شخص ان سے آگاہی حاصل کرنا چاہے وہ کتاب ''ینابیع المودت'' کتاب ''غایۃ المرام'' اور ان کے علاوہ دیگر کتب معتبرہ کا مطالعہ کر کے اپنا مقصود پا سکتا ہے۔

امام محمد باقرؑ کا فرمان

تفسیر العیاشی میں جابر جعفی سے روایت مذکور ہے انہوں نے کہا کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے متعلق پوچھا: ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' تو امامؑ نے فرمایا: اولی الامر سے مراد اوصیاء ہیں، (سألت

عن هٰذہ الآیۃ: "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" قال (ع): الاوصیاء)

(تفسیر العیاشی، جلد اول، صفحہ ۲۴۹)

اسی تفسیر میں عمر بن سعید کے حوالہ سے ابوالحسن علیہ السلام کا فرمان مذکور ہے جو مذکورہ بالا روایت کے مانند ہے اور اس میں یہ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں "علی بن ابی طالب والاوصیاء من بعدہ" (اولی الامر سے مراد علی بن ابی طالب اور ان کے بعد آنے والے اوصیاء ہیں)۔ (تفسیر العیاشی۔ ج ۱۔ ص ۲۵۳)

امام جعفر صادقؑ کے واضح ارشادات

ابن شہر آشوب نے اپنی کتاب المناقب میں لکھا ہے کہ حسن بن صالح نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اولی الامر کے بارے میں پوچھا تو امامؑ نے فرمایا: الائمۃ من اهل بیت رسول الله ﷺ کہ اس سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی نسل سے ہیں۔ (المناقب، جلد ۴، صفحہ ۲۴۹)

اسی کے مانند شیخ صدوقؒ نے ابوبصیر کے حوالہ سے حضرت امام محمد باقرؑ کا فرمان ذکر کیا ہے کہ جس میں یہ الفاظ مذکور ہیں: الائمۃ من ولد علی وفاطمۃ الی ان تقوم الساعۃ، اولی الامر سے مراد حضرت علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد سے آئمہ مراد ہیں جو قیامت تک ہوں گے۔ (کتاب کمال الدین، جلد اول، صفحہ ۲۲۲)

ابن مسروق کے سوالات اور امامؑ کے جوابات

اصول کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابن مسروق کا بیان ذکر کیا ہے انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالہ سے کہا کہ:

قلت لہ: انا نکلّم اهل الکلام فنحتج علیهم بقول الله عزوجل "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" فیقولون: نزلت فی المؤمنین، فنحتج علیهم بقول الله عزوجل: "قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی" فیقولون: نزلت فی قربی المسلمین، قال: فلم ادع شیئاً فما حضرنی ذکرہ من هٰذہ وشبهه الّا ذکرته، فقال (ع) لی: اذا کان ذٰلك فادعهم الی المباهلة، قلت: وکیف اصنع؟ فقال (ع): اصلح نفسك ثلاثاً واطبه، قال: وصم واغتسل وابرز انت وهو الی الجبال فتشبك

اصابعك من يدك اليمنیٰ فی اصابعه ثم انصفه، وابداء بنفسك، وقل: اللهم رب السماوات السبع ورب الارضين السبع عالم الغيب والشهادة الرحمٰن الرحيم، ان كان ابو مسروق جحد حقاً وادعیٰ باطلاً فانزل عليه حسباناً من السماء وعذاباً اليماً، ثم رد الدعوة عليه فقل: وان جحد حقاً وادعیٰ باطلاً فانزل عليه حسباناً من السماء وعذاباً اليماً، ثم قال لی: فانك لا تلبث ان ترى ذٰلك فيه، فوالله ما وجدت خلقاً يجيبنی اليه.

میں نے حضرت امام ابو عبداللہ جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کہ ہم اہل کلام (علم عقائد کے ماہرین و محققین) سے جب اپنے مذہب کی حقانیت کے بارے میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں: ''اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' (اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اپنے اولی الامر کی) تو وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت مؤمنین کے بارے میں نازل ہوئی ہے (یعنی مؤمن حکمرانوں کی اطاعت کرو)۔ اور جب ہم اس آیت کو اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى (کہہ دیجئے کہ میں دین کی تبلیغ پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا سوائے قرابتداروں کی مودت کے)، تو وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت مسلمان قرابتداروں سے محبت کرنے کے بارے میں اتری ہے۔

ابو مسروق نے کہا کہ میں نے ان آیات و مطالب کے علاوہ جو کچھ بھی میرے ذہن میں آیا میں نے امامؑ سے پوچھا اور کوئی بات باقی نہ چھوڑی، میری تمام باتیں سن کر امامؑ نے فرمایا: اگر صورتحال یہی ہے تو انہیں مباہلہ کے لئے بلاؤ، میں نے عرض کی: وہ کس طرح؟ امامؑ نے فرمایا: تین دن تک اپنی اصلاحِ نفس کا اقدام کر اور اپنے دل کو پاکیزہ رکھ، اور روزہ رکھ، غسل انجام دے اور اپنے مدمقابل کو ساتھ لے کر پہاڑ پر چڑھ جا، اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دے، پھر ازراہِ عدل و انصاف تو خود مباہلہ کا آغاز کر اور یہ الفاظ زبان پر لا: اے اللہ: اے سات آسمانوں اور سات زمینوں کے پروردگار، اے ظاہر و باطن کو جاننے والے، اے رحمان و رحیم، اگر ابو مسروق نے حق کا انکار کیا ہے اور باطل کا دعویدار رہا ہے تو اس پر آسمان سے آفت اور دردناک عذاب نازل فرما، پھر یہی دعا اس کی طرف پھیر کر یہ الفاظ کہہ: اور اگر اس نے حق کا انکار کیا ہے اور باطل کا دعویدار رہا ہے تو اس پر آسمانی آفت اور دردناک عذاب نازل فرما۔

پھر امامؑ نے مجھ سے فرمایا: اگر تو نے ایسا کر لیا تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ آسمانی آفت اور دردناک عذاب میں مبتلا ہو جائے گا، مجھے اللہ کی قسم، کسی نے آج تک میری دعوتِ مباہلہ کو قبول کر کے مجھ سے مباہلہ کرنے پر حاضر نہیں ہوا۔

(اصولِ کافی، جلد ۲، ص ۵۱۳)

انبیاءؑ کے قائم مقام

تفسیر العیاشی میں عبداللہ بن عجلان سے روایت مذکور ہے کہ امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: ھی فی علی وفی الائمة جعلھم الله مواقع الانبیاء غیر انھم لا یحلون شیئًا ولا یحرمونہ۔ یہ آیت امام علیؑ اور آئمہؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں انبیاء کا قائم مقام بنایا ہے لیکن وہ کسی چیز کو حلال وحرام کرنے کا حق نہیں رکھتے، (کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کر سکتے)

(تفسیر العیاشی۔ جلد اول، صفحہ ۲۵۲)

اس روایت میں حلال وحرام کے حوالہ سے جو استثناء ذکر کیا گیا ہے اس کی بابت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ تشریع اور قانون گزاری کا حق صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے ان کے علاوہ کوئی بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔

روضۃ الکافی کی ایک روایت

برید بن معاویہ سے مروی ہے کہ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" اور جملہ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ" کی بابت فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر تمہیں کسی چیز کے بارے میں نزاع کا اندیشہ ہو تو اسے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے اولوالامر کے پاس لے جاؤ اور ان سے اس کا حل اور مسئلہ دریافت کرو۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف تو ان کی اطاعت کا حکم دے اور دوسری طرف ان کے بارے میں نزاع کی گنجائش قرار دے، یہ ممکن ہی نہیں، اصل میں یہاں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی ولایت الٰہیہ کا انکار کرتے ہیں (مارقین)۔ ان سے کہا گیا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو۔ یعنی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے ان کی فرمانبرداری کرو۔

(ملاحظہ ہو کتاب روضۃ الکافی، جلد ۸، صفحہ ۱۶۰)

اس روایت سے اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ امام علیہ السلام نے جملہ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ" کی تفسیر و توضیح میں ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اولوالامر کے بارے میں اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی اطاعت کرو، لہٰذا اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ امامؑ نے آیت کے الفاظ کی بابت کسی تبدیلی کا تذکرہ کیا ہو۔ امامؑ کا بیان آیت کی تفسیر کے سوا کچھ نہیں۔

چنانچہ اس کا تائیدی ثبوت یہ ہے کہ روایات میں اس حوالہ سے الفاظ وعبارات مختلف ہیں جیسا کہ تفسیر قمی میں حریز کی روایت مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ آیت یوں نازل ہوئی: ''فان تنازعتم فی شیئ فارجعوہ الیٰ اللہ والی الرسول والیٰ اولی الامر منکم '' تو یہ الفاظ دراصل آیت مبارکہ کی تفسیر اور اس کے مرادی معنٰی کی وضاحت کے طور پر ہیں۔ (تفسیر قمی، جلد ۱۔ ص ۱۴۱)

اور تفسیر العیاشی میں مذکور برید بن معاویہ کی جو روایت امام محمد باقر علیہ السلام کے بیان پر مشتمل ہے وہ کافی ہی کی سابق الذکر روایت ہے، اس میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس کے بعد امامؑ نے لوگوں سے فرمایا: اللہ نے ''یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے الفاظ سے قیامت تک آنے والے مؤمنین کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کریں، تو اس میں اللہ نے اولی الامر سے ہمیں ہی مراد لیا ہے، اور آیت کا مقصود یہی ہے کہ اگر تم کسی چیز میں تنازع کا شکار ہونے کا اندیشہ رکھو تو اللہ اور رسول اور اپنے اولی الامر کی طرف رجوع کرو، لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ اولی الامر کی اطاعت کا حکم دے اور پھر انہیں تنازع کی اجازت بھی دے، دراصل اس میں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جنہیں اللہ و رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

آئمہ اہل بیتؑ کے ناموں کی تصریح؟

تفسیر العیاشی میں ابو بصیر کی روایت مذکور ہے کہ حضرت امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یہ آیت ''اَطِیْعُوا اللہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علی بن ابی طالب کی اطاعت کے حکم پر مشتمل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں علی و آئمہ اہل بیتؑ کے ناموں کی تصریح کیوں نہیں فرمائی؟ امام محمد باقرؑ نے ارشاد فرمایا: ان سے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول گرامی قدر پر نماز کا حکم نازل فرمایا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ تین رکعت پڑھیں یا چار رکعت، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کی تفسیر لوگوں کو بتائی اور تفصیلات سے آگاہ فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حج کا حکم نازل فرمایا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ سات مرتبہ خانۂ کعبہ کا طواف کرو، یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی بتائی، اور لوگوں کو حج کی تفصیلات سے آگاہ فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''اَطِیْعُوا اللہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' اور اسے حضرت علیؑ اور حسنؑ و حسینؑ کے بارے میں نازل فرمایا، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ (جس جس کا میں مولا ہوں اس اس کا علی مولا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اوصیکم بکتاب اللہ واھل بیتی، انی سالت اللہ ان لا یفرق بینھما حتی

یوردھما علی الحوض فاعطانی ذٰلك ''(میں تمہیں اللہ کی کتاب اور اپنے اہل بیت کی پیروی کی وصیت و تاکید کرتا ہوں، میں نے اللہ کی بارگاہ میں درخواست کی کہ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کرے یہاں تک کہ وہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر آ جائیں، تو اللہ نے میرا مطلوب و مقصود مجھے عطا فرما دیا، اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فلا تعلموھم فانھم اعلم منکم، انھم لن یخرجو کم من باب ھدی، ولن یدخلو کم فی باب ضلال ''(اے مسلمانو، تم میرے اہل بیت کو کچھ نہ بتاؤ کیونکہ وہ تم سے زیادہ علم رکھتے ہیں، وہ کبھی تمہیں ہدایت کے دروازے سے باہر نہیں نکالیں گے اور تمہیں کبھی بھی گمراہی کے دروازے میں داخل نہیں کریں گے) اگر رسول اللہ ﷺ خاموش رہتے اور اپنے اہل بیتؑ کا تعارف نہ کرواتے تو بنی عباس اور بنی عقیل وغیرہ اس کے مدعی ہو جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ''تو سب کو معلوم ہو گیا کہ اس سے مراد علی و حسن و حسین اور فاطمہ علیہم السلام ہیں، چنانچہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے علیؑ و فاطمہ اور حسن و حسین علیہم السلام کو اپنے دست مبارک سے ام سلمہ کے گھر میں کساء کے نیچے جمع فرمایا اور یوں کہا: ''اللھم ان لکل نبی ثقلاً واھلاً فھؤلاء ثقلی واھلی '' پروردگارا! ہر نبی کی آل و اھل ہیں تو میری آل و اہل یہ ہیں، تو حضرت ام سلمہ نے پوچھا: الست من اھلك کیا میں آپ کے اہل سے نہیں تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ انك علی خیر ولکن ھٰؤلاء ثقلی واھلی تو خیر پر ہے، لیکن یہ میری آل و اہل ہیں۔

تفسیر البرہان کی دو روایتیں

(۱) ابن شہر آشوب نے تفسیر مجاہد کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت (اَطِیْعُوا اللّٰہَ .... الخ) حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب آنحضرت ﷺ نے انہیں مدینہ میں اپنا نائب بنایا اور خود سفر پر روانہ ہوئے، تو حضرت علیؑ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں پر اپنا نائب بنا کر جا رہے ہیں؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: یاامیر المؤمنین، اما ترضٰی ان تکون منی بمنزلة ھارون من موسٰی؟ حین قال لہٗ: ''اخلفنی فی قومی واصلح '' اے امیر المؤمنین! کیا تو اس پر خوش نہیں کہ تو مجھ سے اسی طرح ہو جو ہارون، موسیٰ سے تھے، کہ جب انہوں نے ان سے کہا: مجھے اپنی قوم میں جانشین و نائب بنائیں اور ان کی اصلاح کریں)، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو) مجاہد نے کہا: اللہ نے علی بن ابی طالبؑ کو حضرت محمد ﷺ کے بعد ولایت عطا فرمائی اور جب حضور ﷺ نے انہیں مدینہ میں اپنا نائب بنایا تو اللہ نے حکم دیا کہ ان کی اطاعت کریں اور ان کی نافرمانی نہ کریں۔

(۲) مجاہد کے حوالہ سے ابانہ فلکی کا بیان مذکور ہے کہ یہ آیت اس دن نازل ہوئی جب ابو بریدہ نے حضور ﷺ سے علیؑ کی شکایت کی۔ (تفسیر برہان، جلد اوّل، صفحہ ۳۸۶)

گمراہ شخص کی نشانی

کتاب عبقات الانوار میں کتاب ینابیع المودۃ تالیف شیخ سلیمان بن ابراہیم بلخی کے حوالہ سے کتاب المناقب سے منقول سلیم بن قیس ہلالی کی روایت مذکور ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا: واما ادنیٰ ما یکون بہ العبد ضالاً ان لا یعرف حجۃ اللہ تبارک و تعالیٰ و شاھدہ علی عبادہٖ الذی امر اللہ عبادہ بطاعتہٖ و فرض ولایتہٖ. کسی شخص کے گمراہ ہونے کی سب سے چھوٹی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حجت اور اس کے بندوں پر اس کے گواہ کی معرفت نہ رکھتا ہو کہ جس کی اطاعت اللہ نے اپنے بندوں پر واجب کی ہے اور اس کی ولایت کا دم بھرنے کو لازمی قرار دیا ہے۔

سلیم نے کہا کہ میں نے عرض کی: یاامیر المؤمنین، صفھم لی، اے امیر المومنین، اولوا الامر اور حجۃ اللہ کی توصیف فرمائیے، تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: الذین قرنھم اللہ بنفسہٖ ونبیّہٖ فقال: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اور اپنے نبی کے ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور اپنے اولی الامر کی، میں نے عرض کی کہ ذرا مزید وضاحت فرمائیں، تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: الذین قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فی مواضع وفی آخر خطبتہٖ یوم قبضہ اللہ عزّوجلّ الیہ: انی ترکت فیکم امرین لن تضلّوا بعدی ان تمسکتم بھما کتاب اللہ عزوجل وعترتی اھل بیتی، فان اللطیف الخبیر قد عھد الیّ انھما لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض کھاتین ــــــ وجمع بین مسجتیہ ــــــ ولا اقول کھاتین ــــــ وجمع مسجتہ والوسطی ــــــ فتمسکوا بھما ولا تقدموھم فتضلّوا. (ان کے بارے میں حضرت رسول خدا ﷺ نے کئی مقامات پر ان کا تعارف کروایا اور اپنے آخری خطبہ میں کہ جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا یوں ارشاد فرمایا: میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم ان سے متمسک و وابستہ رہے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت اہل بیتؑ ہے، مجھے خدائے مہربان و آگاہ نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ دو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر اکٹھے آئیں گے، اس وقت آنحضرت ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (انگوٹھا اور شہادت والی انگلی) کو اکٹھا کر کے اشارہ فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ

اس طرح نہیں جیسے یہ ہیں تو آپ ﷺ نے اپنا انگوٹھا اور درمیانی انگلی کو اکٹھا ملا کر اشارہ فرمایا کہ اس طرح نہیں (گویا ان کے درمیان ذرہ بھر فاصلہ وجدائی نہیں ہوگی) تو تم ان دونوں سے تمسک اختیار کرنا اور کبھی ان پر تقدم نہ کرنا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

مذکورہ بالا مطالب پر مبنی کثیر روایات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے حوالوں سے وارد ہوئی ہیں کہ ہم نے جن میں سے چند نمونہ کے طور پر ذکر کرنے پر اکتفاء کی ہے، جو شخص ان سے مفصل آگاہی کا خواہاں ہو وہ کتب حدیث کا مطالعہ کر کے مقصود حاصل کر سکتا ہے۔

البتہ قدیم مفسرین نے اس حوالہ سے جو کچھ بیان کیا ہے وہ مجموعی طور پر تین اقوال ہیں: (۱) خلفاء راشدین (۲) فوج کے سربراہان (۳) علماء، اور ضحاک کے حوالہ سے منقول ہے کہ ان سے مراد اصحابِ رسول ﷺ ہیں۔ تو یہ قول دراصل تیسرے قول ہی سے ملتا ہے کیونکہ ضحاک سے جو عبارت منقول ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: "انھم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ھم الدعاۃ والرواۃ" وہ اصحاب رسولِ خدا ﷺ ہیں کہ جو اسلام کے داعی اور احادیث کے راوی ہیں، اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ صاحبان علم ہیں لہٰذا ضحاک کے قول کی بازگشت تیسرے قول ہی کی طرف ہوتی ہے۔

یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ ان آیات مبارکہ کے شان نزول میں کثیر امور ذکر کئے گئے ہیں اور مختلف واقعات بیان کئے گئے ہیں لیکن ان کے بارے میں بخوبی غور و فکر کرنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے اور اس میں کسی طرح کا شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ وہ سب کے سب راویوں کی طرف سے نظریاتی تطبیق کی مثالیں و موارد ہیں، اسی وجہ سے ہم نے ان کا ذکر ترک کر دیا کیونکہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، اگر قارئین کرام مزید تصدیق چاہیں تو تفسیر "درمنثور" اور تفسیر طبری وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

تسلیم ورضا

کتاب محاسن (برقی) میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ابوالجارود کی روایت ذکر کی ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے آیۂ مبارکہ "فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ........" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ یہاں ایمان سے مراد تسلیم و رضا اور حضور ﷺ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کرنا و مطمئن ہو جانا مراد ہے۔ (المحاسن، برقی صفحہ ۲۷۱)

چون وچرا کی سخت ممانعت

کتاب اصول کافی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے عبداللہ کاہلی کی روایت ذکر کی ہے جس میں انہوں نے بیان کیا

کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا:

لو كان قوماً عبدوا الله وحدهٗ لا شريك لهٗ، واقاموا الصلاة، واٰتوا الزكاة، وحجوا البيت، وصاموا شهر رمضان ثم قالوا الشئ صنعه الله وصنع رسولهٗ: لم صنع هٰكذا و كذا، ولو صنع خلاف الذى صنع اووجدوا ذٰلك فى قلوبهم لكانوا بذٰلك مشركين، ثم تلا هٰذه الآية: "فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا"

اگر لوگ خدائے واحد کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں، اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، حج بیت اللہ انجام دیں، پورا ماہِ رمضان روزے رکھیں، اور پھر اس کام کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا یہ کہیں کہ کیوں اور کیسے کیا (چوں و چرا کریں) کہ اگر اس کے علاوہ یوں کرتے تو بہتر تھا، یہاں تک کہ اگر اس طرح کے چوں و چرا کو زبان پر بھی نہ لائیں بلکہ اپنے دلوں میں ایسا خیال پیدا کریں تو ایسا کرنے سے وہ مشرک قرار پائیں گے۔ اس کے بعد امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "**فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ۔۔۔ الخ**" اس کے بعد امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: **علیکم بالتسلیم**، تم پر سر تسلیم خم کرنا واجب ہے۔

(اصول کافی، جلد ۲، ص ۳۹۸)

اسی کے مانند ایک روایت تفسیر العیاشی میں عبداللہ بن یحییٰ کاہلی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: مجھے اللہ کی قسم، اگر لوگ اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیتے ہوئے اس کی عبادت کریں، اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں۔ بیت اللہ کا حج کریں، ماہِ رمضان کے روزے رکھیں اور اس سب کچھ کے باوجود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی کام پر چوں و چراں کریں اور کہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور اپنے دلوں میں اس طرح کا سوال لائیں تو وہ مشرک ہو جائیں گے، اس پر امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "**فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا ــــ مما قضى محمد وآل محمد ــــ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا**" کہ تمہارے پروردگار کی قسم، وہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ کو اپنے تنازعات میں فیصل قرار نہ دیں، پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دلوں میں تنگی پیدا نہ کریں۔ جو فیصلہ محمد و آلِ محمد کریں اس کے بارے میں دل تنگی اور نارضایتی نہ کریں۔ اور اس پر اس طرح سر تسلیم خم کر دیں جس طرح سر تسلیم خم کرنے کا حق ہے۔ (تفسیر العیاشی، جلد اول، ص ۲۵۵)

مذکورہ بالا دو روایتوں کے ہم معنیٰ دیگر روایات بھی ہیں، امامؑ نے آیۂ مبارکہ میں مذکور حکم کو ملاک و معیار کے حوالہ سے دو جہتوں سے عمومیت کا حامل قرار دیا ہے: (۱) حکم کی جہت سے (۲) حاکم کے حوالہ سے (۱) حکم کے حوالہ سے عمومیت اس طرح ہے کہ اس میں تشریعی اور تکوینی حکم میں کوئی فرق نہیں (۲) حاکم کے حوالہ سے عمومیت اس طرح ہے کہ اس میں اللہ

اور رسول ﷺ میں فرق نہیں کہ حکم دینے والا ان دو میں سے کون ہے؟ (جبکہ یہ حقیقت واضح ہے کہ حضور ﷺ کا حکم حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے۔م)

یہاں یہ نکتہ بھی معلوم رہے کہ اس آیت کے حوالہ سے بعض روایات ایسی بھی ہیں جن میں اس کی تطبیق امام علیؑ کی ولایت یا آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام کی ولایت پر کی گئی ہے تو وہ مصداق کی تطبیقی صورت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اور حضرت رسول خدا ﷺ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام ان آیات کے مصادیق ہیں کہ ان کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنا واجب و لازم ہے۔

حضرت رسول اللہ ﷺ کی بشارت

کتاب امالی، شیخ طوسی میں مؤلف نے اپنے اسناد سے ایک روایت ذکر کی ہے جس میں مذکور ہے کہ امام علی بن ابی طالب علیہ السلام نے بیان کیا:

جاء رجل من الانصار الی النبی (ص) فقال: یارسول الله، ما استطیع فراقك، وانی لا دخل منزلی فاذکرك فاترك ضیعتی واقبل حتی انظر الیك حباً لك، فذکرت اذا کان یوم القیامة فادخلت الجنة فرفعت فی اعلی علیین فکیف لی بك یا نبی الله؟ فنزل: ''وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا'' فدعا النبی (ص) الرجل فقرأها علیه وبشره بذٰلك۔

انصار میں سے ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا، میں جوں ہی اپنے گھر میں داخل ہوتا ہوں تو آپ ﷺ کی یاد آجاتی ہے تو میں ہر کام چھوڑ دیتا ہوں اور پھر میں آپ ﷺ کے حضور حاضر ہوجاتا ہوں اور آپ ﷺ کی زیارت کرکے دل خوش ہوجاتا ہے کیونکہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ جب آپ بہشت میں داخل ہوں گے اور اعلیٰ علییّن میں بلند مقام پر فائز ہوں گے تو میرا کیا حال ہوگا اے اللہ کے نبی؟ اس شخص کے جواب میں یہ آیت اتری: جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے نعمتیں نازل کیں، انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین اور یہ کس قدر اچھی رفاقت اور ساتھ ہونا ہے، تو حضور ﷺ نے اس شخص کو بلوایا اور اس آیت کی تلاوت فرمائی اور اپنے ساتھ ہونے کی خوشخبری دی۔ (امالی، شیخ طوسی، جلد دوم، صفحہ ۲۳۴)

مذکورہ بالا مطلب اہل سنت کی کتب میں ذکر ہوا ہے، چنانچہ تفسیر ''درمنثور'' میں طبرانی کے حوالہ سے، اور ابن مردویہ اور ابی نعیم نے حلیۃ میں، ضیاء مقدسی نے صفۃ الجنۃ میں کہ انہوں نے اس حدیث کو ''حسن'' قرار دیا ہے، اور دیگر اسناد سے طبرانی اور ابن مردویہ کے حوالہ سے شعبی سے ابن عباس کا بیان، اور سعید بن منصور اور ابن منذر کے اسناد سے شعبی کے حوالہ سے اور ابن جریر کے اسناد سے سعید بن جبیر کے حوالہ سے روایات ذکر کی گئی ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ ص ۱۸۲)

ابن عباس کا صریح بیان

تفسیر برہان میں ابن شہر آشوب کے حوالہ سے انس بن مالک کی روایت ذکر کی گئی ہے جس میں انس نے ابی صالح کے حوالہ سے ابن عباس کا بیان ذکر کیا ہے کہ اُنہوں نے آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں یوں کہا: ''وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ'' یعنی محمداً والصدیقین یعنی علیاً وکان اول من صدق، والشهداء یعنی علیاً وجعفراً وحمزة والحسن والحسین علیهم السلام (اور جو شخص اطاعت کرے اللہ کی اور رسول کی، وہی لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام نازل کیا، انبیاء یعنی محمد ﷺ، صدیقین یعنی علیؑ کہ وہ سب سے پہلے فرد ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کی تصدیق کی، شہداء یعنی علیؑ وجعفرؑ اور حمزہؑ و حسنؑ اور حسین علیہم السلام۔ (تفسیر برہان، جلد اول، صفحہ ۳۹۳)

اس معنی و مطلب پر دیگر روایات بھی موجود ہیں۔

تقویٰ کے ذریعے ہماری مدد کرو

کتاب کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت مذکور ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

اعینونا بالورع، فانه من لقی الله بالورع کان له عندالله فرحاً، فان الله عزّوجلّ یقول: ومع یطع الله والرسول...... الخ، ثم قال(ع): فمنا النبی(ص) ومنا الصدیق ومنا الشهداء والصالحون.

تقویٰ کے ذریعے ہماری مدد کرو، کہ جو شخص تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعے اللہ کے حضور حاضر ہوگا تو اللہ کے پاس اس کے لئے فرح و سرور ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے لوگ انبیاء، سچوں، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے، (پھر امامؑ نے فرمایا:) تو ہم ہی سے ہیں نبی، اور ہم ہی سے صدیق ہیں، ہم ہی سے شہداء اور صالحین ہیں۔ (اصول کافی، جلد دوم، ص ۷۸)

مؤمنین کی دو قسمیں

حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

المؤمن مؤمنان، مؤمن وفی الله بشروطہ التی اشترطها علیه فذٰلك مع النبیّین والصدیقین والشهداء والصالحین و حسن اولئك رفیقاً، وذلك ممن یشفع ولا یشفع له، وذلك ممن لا یصیبه اهوال الدنیا ولا اهوال الآخرة، ومؤمن زلّت به قدم فذٰلك کخامة الزرع کیفما کفاته الریح انکفاء، وذٰلك ممن یصیبه اهوال الدنیا واهوال الآخرة ویشفع له وهو علی خیر

مؤمن کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ مؤمن کہ جو اللہ تعالیٰ کی ان شروط کو پورا کرتا ہے جو اللہ نے اس کے ساتھ قرار دی ہیں تو وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین، شہدء اور صالحین کے ساتھ ہوگا، اور یہ بہت اچھی رفاقت و ساتھ ہونا ہے۔ اور وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو دوسروں کی شفاعت کریں گے۔ انہیں کسی کی شفاعت کی ضرورت نہ ہوگی، اور وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جنہیں دنیا کی ہولناکیاں اپنا شکار کریں گی اور نہ ہی آخرت کی ہولناکیاں اس پر چھائیں گی، اور ایک وہ مؤمن ہے جس کے قدم ڈگمگاتے ہیں (ایمان پر ثابت قدم نہیں رہتا) تو وہ اس ٹہنی کی طرح سے ہے جو ہوا کے جھونکے سے گر جاتی ہے، ایسا شخص دنیا و آخرت دونوں کی ہولناکیوں کا شکار ہوگا، وہ اپنے لئے شفاعت کا محتاج ہوگا اور اسے شفاعت کی ضرورت ہوگی، اس کی شفاعت کی جائے گی اور بہر حال اس کا انجام بہ خیر ہوگا۔ (کتاب اصول کافی، جلد دوم، صفحہ ۲۴۸)

کتاب صحاح اللغہ میں لفظ "خامہ" کا معنیٰ تازہ گھاس کی ٹہنی کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب یوں کہا جاتا ہے: "کفأت فلاناً فانکفاء" تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں نے اسے پھیر دیا تو وہ پھر گیا اور پلٹ گیا۔ اور امام علیہ السلام نے اپنے بیان میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے جو آیہ مبارکہ "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ" سورۂ فاتحہ، آیت ۷ کی تفسیر میں ذکر ہو چکا ہے کہ نعمت سے مراد، ولایت ہے، لہٰذا اس کی تطبیق درج ذیل آیت مبارکہ پر ہوتی ہے:

○ سورۂ یونس، آیت: ۶۳

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ"

(یاد رکھو کہ اولیائے الٰہی پر کوئی خوف طاری نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے، وہ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا)

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو کوئی خوف اور ہولنا کی اپنا شکار نہ کر سکے گی جس کے دلوں میں اللہ کی محبت و ولایت ہے کیونکہ اللہ کے سوا ان کا کوئی بھی نہیں۔

آیات ۷۱ تا ۷۶

O يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انْفِرُوا جَمِيعًا ﴿۷۱﴾

O وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَيُبَطِّئَنَّ ۚ فَإِنْ أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُنْ مَعَهُمْ شَهِيدًا ﴿۷۲﴾

O وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِنَ اللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَنْ لَمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿۷۳﴾

O فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۷۴﴾

O وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿۷۵﴾

O الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿۷۶﴾

ترجمہ

○ ''اے ایمان والو، اپنی ڈھال و ہتھیار لے لو، پھر دستہ دستہ ہو کر یا اکٹھے ہو کر۔ دشمن کے مقابلے کو نکل پڑو''

(۷۱)

○ ''اور تم میں سے ایسا بھی ہے جو سستی کا مظاہرہ کرتا ہے، اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو کہتا ہے کہ خدا نے مجھ پر رحم کیا کہ میں ان کے ساتھ حاضر نہ تھا۔''

(۷۲)

○ ''اور اگر تم پر خدا کی عنایت و کرم ہو تو یقیناً کہے گا گویا کہ تمہارے اور اس کے درمیان کوئی رشتہ محبت و تعلق ہی نہیں کہ اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا اور فوز عظیم پالیتا۔''

(۷۳)

○ ''تو جو لوگ دنیا کی زندگی بیچ کر آخرت کی زندگی خریدتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں قتال کریں، اور جو شخص اللہ کی راہ میں قتال کرے پھر یا قتل کیا جائے یا غالب آئے تو ہم بہت جلد اسے عظیم اجر عطا کریں گے۔''

(۷۴)

○ ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قتال نہیں کرتے اور کمزور و بے بس کو دیئے گئے مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر میدان میں کیوں نہیں نکلتے کہ جو یہ ندائیں دیتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہمیں اس بستی سے باہر نکال کہ اس کے مکین ظالم ہیں، اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی سرپرست مقرر فرما اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی مددگار قرار دے۔''

(۷۵)

○ ''جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، اور جو لوگ کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں قتال کرتے ہیں، تو تم شیطان کے ساتھیوں سے قتال کرو، یقیناً شیطان کی چال بہت کمزور ہے۔''

(۷۶)

تفسیر و بیان

یہ آیات مبارکہ، اپنی ماقبل آیات سے وہی نسبت رکھتی ہیں جو ذوالمقدمہ، اپنے مقدمہ سے رکھتا ہے، ان آیات میں مؤمنین کو اللہ کی راہ میں قتال و جہاد کرنے کی ترغیب و آمادگی دلائی گئی ہے، ان آیات کے نزول کا زمانہ ایسا تھا جب مؤمنین سخت ترین حالات اور نہایت دشوار صورتحال کا شکار تھے، وہ زمانہ حضور ﷺ کے مدینہ میں قیام کی دوسری چوتھائی کا تھا کہ جب عربوں نے مؤمنین پر ہر طرف سے حملوں پر حملے شروع کر رکھے تھے تاکہ خدا کے نور کو بجھا دیں اور دین مقدس کی بلند عمارت کو منہدم و زمین بوس کر دیں، اس دوران حضور ﷺ مکہ کے مشرکوں اور قریش کے ظالم و سرکشوں سے نبرد آزما تھے اور جزیرۃ العرب کے گوشہ گوشہ میں اپنے سپاہی و وفود بھیج رہے تھے، اس طرح آپ ﷺ مؤمنین کے درمیان دین کی بنیادیں مضبوط کرنے میں سرگرم عمل تھے جبکہ مؤمنین کے درمیان طاقتور اور مالدار منافقوں کی کثیر تعداد موجود تھی اور وہ سب یکجا ہو کر حضور ﷺ کے خلاف متحرک تھے چنانچہ احد کے دن معلوم ہو گیا کہ ان منافقوں کی تعداد مؤمنوں کی تعداد سے نصف سے زیادہ کم نہ تھی، جیسا کہ جنگ احد سے مربوط احادیث میں بیان ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ احد کے دن ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ میدان کو نکلے، پھر ان میں سے تین سو منافقین عبداللہ بن ابی کی سربراہی میں واپس لوٹ گئے، اور حضور ﷺ کے ساتھ سات سو افراد بچ گئے، وہ منافقین لحہ بہ لحہ حضور ﷺ کے ساتھ دھوکہ و فریب میں مصروف رہتے تھے اور غلط افواہیں اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے رہتے تھے، وہ ہمیشہ حضور ﷺ پر کسی بلاء و مصیبت میں مبتلا ہونے کے منتظر رہتے تھے اور مؤمنوں کو کہ جن میں بیمار دل لوگ اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے افراد بھی تھے حضور ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری نہ کرنے پر اکساتے رہتے تھے۔ دوسری طرف یہ صورتحال تھی کہ مسلمانوں کے اردگرد یہودی رہتے تھے جو مؤمنوں کو ورغلانے اور انہیں مشکلات سے دوچار کرنے میں مصروف رہتے تھے اور ان کے ساتھ جنگ وجدال کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتے تھے جبکہ مدینہ کے عرب انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے اور قدیم دور سے ان کے ساتھ عزت سے پیش آتے تھے

بلکہ ان کے طرزِ معاشرت سے بہت متاثر تھے لیکن وہ مسلمانوں کو باطل و نادرست باتیں اور گمراہ کن حدیثیں سنا سنا کر ان کے سچے ارادوں کو متزلزل کرنے اور ان کی پختہ مساعی کو بے نتیجہ و بے اثر کرنے میں سرگرم عمل رہتے تھے، اور دوسری جانب وہ مشرکوں کو ان کے خلاف کھڑے ہونے کی ترغیب دلاتے ہوئے ان کی بہادری و جوان مردی کی تعریفیں کرتے تھے اور انہیں اپنے کفر و باطل عقیدہ پر قائم و باقی رہنے پر ثابت قدم ہونے کی تاکید کرتے تھے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ، مؤمنین کے مقابلے میں قیام کریں اور انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔

بنابرایں سابقہ آیاتِ مبارکہ اس طرح سے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف ہونے والی یہودیوں کی سازشوں و چالوں کو ناکام بنائیں اور ان آثار کو مٹادیں جو وہ مؤمنین کے دلوں میں غلط باتیں کر کے ڈالتے رہتے ہیں اور زیرِ نظر آیاتِ مبارکہ میں منافقین کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ مؤمنین کو ان کی چالوں سے باخبر رہنے اور موجودہ صورتحال سے بھرپور آگاہی دلانے کی غرض سے تکمیلی بیان کے طور پر ہے۔ اور انہیں اس بیماری کے خطرناک اثرات سے بچنے کی راہ اختیار کرنے کی نصیحت کی صورت میں ہے کہ جو ان کے دلوں میں گھر کر چکی ہے اور ان کی اجتماعی قوت پر غالب آگئی ہے، یہ آگاہانہ و ناصحانہ بیان اس غرض سے ہے کہ اس طرح مسلمانوں کے دشمنوں کی چالیں ناکام ہوں اور جو لوگ ان میں گھسے ہوئے ہیں ان کی سازشیں بے نتیجہ ہو جائیں، کہ جس سے مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈک ملے اور ان کی سانسیں ان کے سینوں میں لوٹ آئیں اور خدا کے نور کی چمک پورے عالم انسانیت پر چھا جائے۔ اللہ اپنے نور کو ہر طور پر مکمل کرتا ہے خواہ مشرکوں و کافروں کو ناپسند کیوں نہ ہو۔

مؤمنین کو آمادہ باش

○ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَکُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا''

(اے ایمان والو، اپنے ہتھیار اٹھالو، پھر گروہ گروہ بن کر یا اکٹھے مل کر نکل پڑو)

لفظ ''حذر'' (ح کے نیچے زیر اور ذال پر جزم کے ساتھ) کا معنیٰ وہ آلہ ہے جو حفاظت کے لئے یا حملہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے (اسلحہ)، یا ڈھال، بعض اہل فن کا کہنا ہے کہ وہ مصدر ہے جیسے ''حَذَر'' دونوں یعنی حَ اور ذَ پر زبر کے ساتھ

''فَانْفِرُوْا'' میں ''نفر'' کا معنیٰ کسی مخصوص سمت کی طرف جانا ہے، یہ اصل میں فزع کے معنی میں آتا ہے لہٰذا کسی جگہ سے کوچ کرنا اس سے فزع کرنے اور جس جگہ جانا ہو اس کی طرف فزع کرنے کے معنیٰ میں ہے۔

لفظ ''ثُبَاتٍ'' جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ''ثبۃ'' ہے جس کا معنیٰ گروہ و دستہ ہے، (متفرق افراد کا مجموعہ) لہٰذا لفظ ''ثُبَاتٍ'' سے مراد دستہ اور گروہ گروہ ہے جو یکے بعد دیگرے نکلتے ہیں مثلاً پہلا دستہ، پھر دوسرا دستہ، پھر تیسرا دستہ، کہ ان میں سے ہر دستہ دوسرے دستہ سے کچھ فاصلے پر ہو، اس معنیٰ کا ثبوت یہ ہے کہ اسے لفظ ''جمع'' کے مقابل میں ذکر کیا گیا ہے:
''فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِانْفِرُوْا جَمِیْعًا'' (تم دستہ دستہ نکلو یا اکٹھے نکلو)۔

یہاں جملہ ''فَانْفِرُوْا'' پر حرف فَ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ''خُذُوْا حِذْرَكُمْ......'' کی فرع ہے لہٰذا اس سے بظاہر اس مطلب کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں ''حذر'' سے مراد ہتھیار و اسلحہ ہے اور یہ جہاد کے لئے مکمل تیار ہونے سے کنایہ کے طور پر ہے، لہٰذا آیت کا معنیٰ یوں ہوگا: **خذوا اسلحتکم ای اعدوا للخروج واخرجوا الیٰ عدو کم فرقة فرقة (سرایا) اواخرجوا الیھم جمیعاً (عسکراً)** تم اپنے ہتھیار اٹھالو یعنی میدان میں جانے کی تیاری کرلو اور اپنے دشمن کی طرف نکل پکڑو دستہ دستہ بن کر، یا ان کی طرف سب کے سب اکٹھے ہو کر جاؤ (پورے لشکر کی صورت میں)۔

واضح ہے کہ جنگ کی تیاری کرنا اور اپنے آپ کو دشمن کے مقابلے میں آمادہ کرنا دشمن کی تعداد اور طاقت کے مطابق ہوتا ہے، لہٰذا آیت میں حرف ''او'' یعنی ''یا'' نکلنے کی کیفیت میں دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے لئے نہیں ذکر ہوا بلکہ دشمن کی تعداد و قوت کے مطابق اپنے آپ کو تیار کر کے اس کے مقابلے میں نکلنے کا اقدام کرنے کی غرض سے ہے کہ اگر دشمن کی تعداد و قوت کم ہو تو دستہ دستہ ہو کر نکلو اور اگر اس کی تعداد و قوت زیادہ ہو تو سب مل کر لشکر کی صورت میں نکلو۔

بنا برایں آیت کے معنی کی برگشت اس مطلب کی طرف ہوگی خاص طور پر بعد والی آیت ''وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ......'' کے تناظر میں کہ انہیں اس سے منع کیا گیا ہے کہ اپنے ہتھیار زمین پر رکھیں اور جہاد کی بابت کوشش کرنے اور اپنی قوت و توانائی کو بروئے کار لانے میں سستی و کوتاہی سے کام لیں، کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو ان کے عزم و ارادہ کی پختگی مر جائے گی اور پرچم حق بلند کرنے میں ان کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے، یا یوں کہیں کہ ان کے جذبے مر جائیں گے، لہٰذا انہیں اس حوالہ سے سستی کرنے اور کوتاہی و بے رغبتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمنانِ خدا سے نہ لڑنے اور زمین کو ان کے نجس وجود سے پاک کرنے میں بھرپور تیار نہ ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی وہ اس سلسلہ میں ہرگز سستی و کوتاہی سے کام نہ لیں کہ دشمن کو شکست دیں اور اس کے ناپاک وجود سے روئے زمین کو پاک کریں۔

سستی و بے رغبتی کا مظاہرہ کرنے والوں کا تذکرہ

○ ''وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ......''

(اور تم میں سے بعض ایسے ہیں جو سستی کرتے ہیں......)

اس جملہ میں ''لَمَنۡ'' پر حرف لام کے بارے میں بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ یہ ابتداء کے معنی میں ہے کیونکہ یہ حرف ''اِنَّ'' کے اسم پر آیا ہے، اور جملہ ''لَّیُبَطِّئَنَّ'' میں حرف لام قسم کا معنی دیتا ہے کیونکہ وہ خبر پر آیا ہے (حرف ''اِنَّ'' کا اسم ''من'' ہے جس پر لام آیا ہے، لمَنۡ، اور اس کی خبر جملہ ''لَّیُبَطِّئَنَّ'' ہے) اور یہ خبر جملہ فعلیہ ہے کہ جو نون ثقیلہ (شدہ والی نون) کے ساتھ تاکید کے لئے ہے اور ''تبطئہ'' (باب تفعیل سے ''یبطئن'' کا مصدر ہے) اور ''ابطاء'' (بابِ افعال سے اس کا مصدر ہے) کا معنیٰ کسی کام میں تاخیر و سستی سے کام لینا ہے۔

اور جملہ ''وَ اِنَّ مِنۡكُمۡ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں وہی مؤمنین مخاطب قرار پائے ہیں جو ابتدائے بیان میں جملہ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا'' میں مخاطب وملحوظ ہیں جیسا کہ لفظ ''مِنۡكُمۡ'' سے ظاہر ہے، اور اسی طرح بعد والی آیت کے جملہ ''اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِیۡنَ قِیۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَیۡدِیَكُمۡ...... '' سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اس میں بھی مؤمنین ہی مخاطب قرار پائے ہیں، اسی طرح بعد والے تمام جملوں سے اسی مطلب کے تائیدی ثبوت پائے جاتے ہیں مثلاً:

- ''فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیۡهِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ یَخۡشَوۡنَ النَّاسَ'' (پھر جب ان پر قتال واجب کیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو لوگوں سے ڈرتے تھے)
- ''وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ'' (اور اگر انہیں کوئی حسنہ حاصل ہو)
- ''فَلۡیُقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ الَّذِیۡنَ'' (پس اللہ کی راہ میں قتال کریں وہ لوگ)
- ''وَ مَا لَكُمۡ لَا تُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ'' (اور تمہیں کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قتال نہیں کرتے؟)
- ''اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ'' (وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں)

تو ان تمام جملوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں مؤمنین کو اعداء اسلام سے قتال کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور انہیں ان سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ انہی میں وہ افراد بھی ہیں جو اس حوالہ سے سستی سے کام لیتے ہیں، اور جیسا کہ آیاتِ مبارکہ کے باہمی اتصال و پیوستگی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں وہی مؤمنین مراد ہیں جو جملہ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا'' میں ملحوظ ومخاطب تھے۔

یہاں ایک اہم مطلب کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ آیات مبارکہ میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ یہاں سستی کرنے والوں سے وہ منافقین مراد ہوں جو صرف ظاہر بظاہر ایمان لائے، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ بعض آیات میں ان کے فی الجملہ ایمان لانے کا تذکرہ وحوالہ بھی مذکور ہے مثلاً: ''فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِیۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ'' (اگر تم پر کوئی مصیبت آپڑے تو وہ کہتا ہے کہ مجھ پر اللہ نے احسان کیا ہے) ''رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَیۡنَا الۡقِتَالَ'' (پروردگارا، تو نے ہم پر قتال واجب کیوں نہیں کیا) ان آیات سے ان کے فی الجملہ مؤمن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

البتہ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ جملہ ''وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ'' سے مراد منافقین ہیں اور اگر یہ کہا گیا ہے کہ وہ ''تم میں سے ہیں'' (وَاِنَّ مِنْكُمْ) تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تم میں شمار کرتے ہیں، یا یہ کہ ان کا شمار تم میں ہوتا ہے یا یہ کہ وہ نسب ورشتہ میں تمہارے شریک ہیں، یا یہ کہ وہ مؤمنین کے ساتھ ظاہری شرعی نسبت سے شریک ہیں کہ وہ ظاہری طور پر کلمۂ شہادتین زبان پر لانے کی وجہ سے جان و مال کے محفوظ ہونے اور وراثت وغیرہ میں مؤمنین کی طرح ہیں، تو اس طرح کا خیال ظاہر القرآن میں تصرف کرنے اور بلاوجہ اس کے بارے میں اس طرح کے نظریات قائم کرنے کی ایک صورت کے سوا کچھ نہیں، اس طرح کا خیال ونظریہ کا سبب دراصل یہ ہے کہ وہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کے بارے میں حُسنِ ظن رکھتے ہیں (یعنی جو شخص حضور ﷺ کی زیارت سے شرف یاب ہوا اور آپ ﷺ پر ایمان لایا اس کے بارے میں اچھا گمان ہی کیا جاتا ہے) لیکن اگر تجزیہ وتحلیل کے ساتھ اس سلسلہ میں بحث وتحقیق کی جائے اور ان کی سیرت وحیات کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے کہ جس میں وہ حضرت نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہے اور آنحضرت ﷺ کے بعد کے دور میں ان کی زندگی کے طرزِ عمل کو دیکھا جائے تو مذکورہ خیال وحسن ظن کمزور پڑ جاتا ہے، اور وہ قرآنی بیانات کہ جن میں نہایت سخت لہجہ وانداز میں ان کے بارے میں تذکرہ ہوا ہے وہ اس طرح کے تصورات کی نفی کرتے ہیں۔

اور یہ ایک میدانی حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم وملت پیدا نہیں ہوئی جس کے تمام افراد پاک ہوں کہ جن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو کہ جس سے کوئی غلطی وخطا سرزد نہ ہوئی ہو سوائے ان پاکدل افراد کے کہ جنہوں نے میدانِ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ اسلام دشمنوں سے جہاد کیا بلکہ صدر اسلام کے مؤمنین دیگر انسانی معاشرہ کی طرح تھے کہ جن میں سچے مؤمنوں کے ساتھ ساتھ منافقین، بیماردل، نفسانی خواہشوں کے اسیر اور پراسرار لوگ شامل تھے۔

اور جہاں تک صدرِ اسلام کے مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کا امتیازی مقام یہ تھا کہ وہ ایک ایسے معاشرہ کے افراد تھے جو حضرت رسول اللہ ﷺ کی زیر پرسرپرستی تھا اور آنحضرت ﷺ اس کے سربراہ تھے، ان لوگوں پر ایمان کا نور چھایا ہوا تھا اور اس پر دین کی حاکمیت تھی، تو یہ بات اور امتیازی فضیلت ان کے معاشرہ کو بحیثیت معاشرہ حاصل تھی اگرچہ اس معاشرہ میں اچھے اور برے دونوں طرح کے لوگ موجود تھے اور ایسے افراد بھی پائے جاتے تھے جو پاکیزہ صفات کے مالک تھے جبکہ کچھ ایسے افراد بھی تھے جو ناپاک صفات رکھتے تھے، گویا اخلاق وصفات کے حوالہ پر رنگ وروپ کے افراد موجود تھے، چنانچہ معاشرہ کی امتیازی فضیلت وصفت کا تذکرہ قرآنِ مجید میں ان الفاظ میں ہوا:

○ سورۂ فتح، آیت: ۲۹

''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ............وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً

وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا''

(محمد، اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں، آپ انہیں رکوع و سجدے کرتا ہوئے دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کا فضل و کرم اور رضا چاہتے ہیں، ان کی شناخت سجدوں کے نشانات کی وجہ سے ان کے چہروں ہی سے ہوتی ہے....... اللہ نے ان میں سے ایمان لانے والوں اور اعمال صالحہ انجام دینے والوں سے بہشت اور عظیم اجر عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے)۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کی معاشرتی صفات وفضائل کا عمومی تذکرہ فرمایا اور آخر میں ان کے افراد کے ساتھ کئے گئے اپنے مشروط وعدہ کو بیان کیا (شروط: ایمان اور عمل صالح)

اور جملہ ''فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ قتال فی سبیل اللہ میں سستی سے کام لینے والے لوگ جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں ''قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا'' مجھ پر اللہ نے انعام کیا ہے کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا، ورنہ میں بھی اسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا جس میں وہ مبتلا ہوئے ہیں۔

اور جملہ ''وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ.........'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر تم پر اللہ کی طرف سے فضل و کرم ہو اور تم دشمن پر غالب آجاؤ اور تمہیں مال غنیمت مل جائے فضل و کرم سے مراد یہاں جنگ میں کامیابی اور مالِ غنیمت کا حاصل ہونا ہے تو وہ اس طرح بات کرتے ہیں جیسے ان کے اور تمہارے درمیان کوئی محبت کا رشتہ وتعلق ہی نہیں۔ وہ تمہیں جانتے ہی نہیں اور کہتے ہیں کہ اے کاش ہم بھی اُن کے ساتھ ہوتے، (لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ) تو یہاں ان کی حالت تشبیہ وتمثیل کی صورت میں بیان ہوئی ہے کہ وہ تو مؤمن ہے اور مسلمان تو ید واحدہ کی طرح ہیں کہ ایک دوسرے سے مضبوط ترین ربط وتعلق رکھتے ہیں جو کہ اللہ اور اس کی آیات مبارکہ پر ایمان کا رشتہ ہے کہ وہ رشتہ ہر دوسرے رشتہ وتعلق سے بالاتر اور مافوق ہے مثلاً نسبی رشتہ، حاکمیت و بیعت کا رشتہ یا دوستی و محبت کا رشتہ، لیکن وہ اپنے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمنین کے ساتھ کسی بھی حوالہ سے وابستہ نہیں سمجھتے لہٰذا ان کے ساتھ ہونے کی آرزو اور ان کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کی تمنا کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی بیگانہ شخص کسی دوسرے بیگانہ شخص کو حاصل ہونے والی فضیلت و برتری کے بارے میں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا اور بہت بڑی کامیابی حاصل کر لیتا (يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا) ان کے ایمان کی کمزوری کی دلیل یہ ہے کہ وہ مال غنیمت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسے ہی فضیلت وامتیاز اور برتری وفوز عظیم قرار دیتے ہیں جبکہ ہر وہ مصیبت جو مؤمنین کو اللہ کی راہ میں آئے مثلاً قتل ہونا، زخمی ہو جانا وغیرہ تو اسے عذاب قرار دیتے ہیں۔

قتال فی سبیل اللہ کا صریح حکم

○ "فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ"
(پس اللہ کی راہ میں قتال کریں وہ لوگ جو بیچتے ہیں.......)

تفسیر "مجمع البیان" میں ہے کہ "شریت" کا معنی "بعت" (میں نے بیچا) ہے اور "اشتریت" کا معنی "ابتعت" (میں نے خریدا) ہے، لہٰذا جملہ "يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ" سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی دُنیاوی زندگی کو بیچتے ہیں اور اس کے بدلے میں آخرت کی زندگی خریدتے ہیں۔

بنا برایں یہ آیت، اپنی اس ماقبل آیت کی فرع کے طور پر ہے جس میں جہاد کی ترغیب دلائی گئی اور اس شخص کی مذمت کی گئی جو میدانِ جنگ کو جانے میں سستی و بے رغبتی کا مظاہرہ کرے، لہٰذا اس آیت مبارکہ میں ایک بار پھر قتال فی سبیل اللہ کی ترغیب اس طرح دلائی گئی ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا اور یاددہانی کروائی گئی کہ وہ سب مؤمنین ہیں کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اور اس کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر کے اپنی دُنیاوی زندگی کو آخرت کی زندگی کے بدلے میں بیچ دیا ہے، جیسا کہ درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا:

○ سورۂ توبہ، آیت: ۱۱۱
"اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ"
(بے شک اللہ نے مؤمنین سے ان کی جانوں اور ان کے اموال کو خرید لیا ہے کہ ان کے لئے بہشت ہے)۔

اس کے بعد صریح و واضح الفاظ میں بیان کیا کہ قتال فی سبیل اللہ کا کس قدر نیک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ انہیں ہر حال میں عظیم اجر عطا ہوگا۔ (وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ..........)

تو واضح طور پر بیان فرمایا کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والے کا انجام دو پسندیدہ حالتوں میں سے ایک ہے: یا وہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے گا، یا اللہ کے دشمن پر غلبہ پائے گا، دونوں صورتوں میں اس کے لئے اجر عظیم ہے، البتہ تیسری حالت بیان نہیں کی گئی یعنی فرار کرنا اور میدان سے بھاگ جانا، شاید اس لئے کہ اشارہ ہو جائے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا میدان سے نہیں بھاگتا۔

قتل کئے جانے کو غالب آنے پر مقدم کر کے اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا اجر و ثواب زیادہ اور پائیدار ہے کیونکہ جو شخص خدا کے دشمن پر غلبہ پائے، اگرچہ اس کے لئے اجر عظیم لکھا جاتا ہے لیکن وہ ہر لحظہ اس خطرہ سے دوچار رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے بعض ان اعمال کی وجہ سے جو اعمالِ صالحہ کی بربادی کا سبب بنتے ہیں اس کے قتال کا ثواب بھی جاتا رہے اور

تفسیر المیزان جلد ۴

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے وجود میں ایک ایسی قوت موجود ہے جو اسے اس چیز کے دفاع کی طرف کھینچتی ہے جس کا وہ احترام و تعظیم کرتا ہے اور اسے عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھتا ہے مثلاً اولاد و بچے اور عورتیں وجاہ و جلال وغیرہ، تو درحقیقت انسانی فطرت اسے اس راہ پر لاتی ہے اور اس کے دل میں اس طرح کا جذبہ بیدار کرتی ہے، لیکن یہ دفاعی عمل کبھی پسندیدہ و لائق ستائش ہوتا ہے کہ جب برحق اور حق کی خاطر ہو اور کبھی ناپسندیدہ و مذموم ہوتا ہے اور امورِ زندگی کے درہم برہم ہونے کا باعث بنتا ہے کہ جب باطل و ناحق اور حق کے خلاف ہو۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس نے اس کی اصل و اساس کو محفوظ رکھا ہے اور وہ وہی ہے جو تقاضائے فطرت ہے، لیکن اس کی تفاصیل و جزئیات کی بعض جہتوں کو نادرست قرار دیا ہے، پھر اسلام نے اسی مقتضائے فطرت کا رُخ ہر جانب سے اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ کر اس کے اصل موارد کی طرف کر دیا اور پھر تمام موارد کو ایک ہی توحیدی قالب میں ڈھال دیا یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ، اور پھر انسان کو دعوت دی کہ وہ اپنے مردوں، عورتوں، بچوں اور ہر حق کے لئے اس طرح تعصب (فطری جذبات) سے کام لے کہ سب کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف کر دے، گویا اسلام فطرت کے فیصلہ و تقاضوں کی تائید کرتا ہے اور اسے فاسد و غلط آرزوؤں و تمناؤں سے پاک و منزہ کر کے تمام امور میں اس کا سلسلہ درست کرتا ہے اور ان سب کو ایک ہی لڑی میں پرو کر انسانیت کی راہ پر لے آتا ہے کہ جس پر چل کر انسان فطری تقاضوں کی تکمیل کر سکتا ہے اور اسے تناقضات و تضادات کی ظلمت سے دور رکھ کر یکجہتی و مسالمت کی نورانیت تک لے جاتا ہے، بنابرایں اسلام جس چیز کی طرف بلاتا ہے اور جس چیز کا حکم دیتا ہے اس کے کسی بھی اجزاء اور جہتوں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں پایا جاتا بلکہ ان سب کی قدر مشترک توحید ہے اور سب کا جامع اصول حق کی پیروی کرنا ہے، لہٰذا اس صورت میں تمام احکام کی برگشت کلی، دائم اور پائدار ہونے کی طرف ہے جن میں کسی بھی حوالہ سے خامی و اختلاف نہیں پایا جاتا۔

قتال کرنے والوں کا تقابلی تذکرہ

○ ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا............''

(جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں اور جو لوگ کافر ہوئے ......)

اس آیت میں مؤمنوں (اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) اور کافروں (اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا) کے قتال کا موازنہ کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دونوں گروہوں کی اپنے قتال میں نیت کا تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ مؤمنین، کفار پر اپنے طرزِ عمل

کی بناء پر شرف و برتری رکھتے ہیں اور یہ کہ مؤمنین کا راستہ اللہ تعالیٰ کی طرف منتہی ہوتا ہے جبکہ کافروں کا راستہ اللہ کی طرف نہیں جاتا، اس موازنہ پر مبنی بیان میں ایک غرض یہ بھی ہے کہ ایک بار پھر مؤمنین کو قتال کی ترغیب دلائی جائے۔

اولیائے شیطان سے قتال کا حکم

○ ''فَقَاتِلُوٓا اَوۡلِيَآءَ الشَّيۡطٰنِ ۚ اِنَّ كَيۡدَ الشَّيۡطٰنِ كَانَ ضَعِيۡفًا''

(تو اولیائے شیطان سے قتال کرو، یقیناً شیطان کی چال کمزور ہے)

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ طاغوت کی راہ پر چل پڑے وہ اللہ کی ولایت کے دائرہ سے باہر نکل گئے لہٰذا ان کا مولیٰ کوئی نہیں سوائے شرک اور غیر اللہ کی عبادت و پرستش کرنے کے، جو کہ شیطان ہے، تو کافروں کا ولی شیطان ہے اور وہ اس کے اولیاء (ساتھی) ہیں۔

آیت مبارکہ میں شیطان کی چال کو کمزور قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ طاغوت کا راستہ ہے جو کہ اللہ کے راستہ کے مدمقابل ہے، جبکہ ساری طاقت اللہ کے پاس ہے لہٰذا طاغوت کے راستہ کے لئے جو کہ شیطانی چال کے سوا کچھ نہیں ضعف و کمزوری کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو کافروں کے مقابلے میں قتال کرنے کی ترغیب دلائی اس مقصد کے لئے کافروں کے راستہ کی کمزوری بیان کر کے اور مؤمنوں کو قتال کی ترغیب دلا کر قتال کے حکم کی اہمیت اُجاگر کردی، اور یہ بات واضح رہے کہ شیطان کی چال کا اللہ کے راستہ سے موازنہ کے حوالہ سے کمزور ہونا، خود شیطان کے ان لوگوں پر قوی ہونے سے منافات نہیں رکھتا جو اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں، اور یہ ایک واضح حقیقت ہے۔

روایات پر ایک نظر

حذر کی وجہ تسمیہ

تفسیر مجمع البیان میں آیۂ مبارکہ ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا خُذُوۡا حِذۡرَكُمۡ ....'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ اس میں اسلحہ کو ''حذر'' سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلحہ اس آلہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعے حفاظت و بچاؤ کا کام لیا جاتا ہے، اور

یہی معنیٰ حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی و منقول ہے، اور انہی حضرتؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ان المراد بالثبات السرایا، وبالجمیع العسکر، کہ آیت میں لفظ "ثُبَاتٍ" سے مراد دستے اور لفظ "جمیع" سے مراد لشکر ہے۔
(تفسیر مجمع البیان جلد دوم، ص ۱۵۴)

تفسیر العیاشی میں سلیمان بن خالد کی روایت مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو) تو اس میں انہیں مؤمنین کے نام سے موسوم کیا جبکہ وہ حقیقی مؤمنین نہیں اور نہ ہی کوئی فضیلت رکھتے ہیں، تو خداوند عالم نے انہیں مخاطب کر کے یوں فرمایا: "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا......... تا.........فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا" اگر اہل آسمان و زمین یہی بات کرتے ہیں کہ "قد انعم الله علی اذلم اکن مع رسول الله لکانوا بذلك مشرکین، واذا اصابهم فضل من الله قال: یالیتنی کنت معهم فاقاتل فی سبیل الله" (اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ تھے) یہ اس وقت کہتے تھے جب ان پر کوئی مصیبت آتی تھی تو وہ اس طرح کہنے کی وجہ سے مشرک ہوجاتے، اور جب مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل و کرم آتا تو وہ کہتے تھے کہ اے کاش، ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے اور اللہ کی راہ میں قتال کرتے (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۲۵۷)

اسی معنی و مضمون پر مشتمل روایت تفسیر مجمع البیان (جلد اول، صفحہ ۱۵۷) اور تفسیر قمی (جلد اول۔ص ۱۴۳) میں بھی حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے، امامؑ کے بیان میں شرک سے مراد معنوی شرک ہے نہ کہ وہ کفر کہ جسے اختیار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے اور اس پر اسلام کے ظاہری احکام لاگو نہیں ہوتے، اس موضوع کی بابت تفصیلی تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

تفسیر العیاشی ہی میں حمران کے حوالہ سے ایک روایت مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے "وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: نحن اولئك وہ ہم ہی ہیں۔

اسی کی مانند ایک روایت سماعہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: فاما قوله: والمستضعفین......فاولئك نحن، تو جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا تعلق ہے "وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ" تو وہ ہم ہی ہیں (تفسیر العیاشی بحوالہ مذکورہ بالا)

یہ دو روایتیں درحقیقت آیۂ مبارکہ کی آئمہؑ پر تطبیق کے طور پر ہیں اس کی تفسیر کے طور پر نہیں، اور امامؑ نے اس میں آئمہ اہل بیتؑ کو مستضعفین قرار دے کر دراصل امت کے باغیوں اور ظالموں کی طرف سے آئمہؑ کے ساتھ ناروا سلوک اور ظلم و ستم کے شکوہ و شکایت کے طور پر اس طرح فرمایا ہے۔

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابوداؤد نے اپنی کتاب ''ناسخ'' میں اور ابن منذر، ابن ابی حاتم، اور بیہقی نے اپنی کتاب ''سنن'' میں عطآ کے حوالہ سے ابن عباس کا بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: سورۂ نساء کی آیت ''خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِانْفِرُوْا جَمِیْعًا'' سورۂ توبہ کی آیت ''وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا كَآفَّةً'' (مؤمنین کے لئے روا نہیں کہ وہ اکٹھے ہی نکل پڑیں) کے ذریعے منسوخ ہوگئی ہے (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲۔ص ۱۸۳)

یہ دو آیتیں (نساء ۷۱ اور توبہ ۱۲۲) ایک دوسری سے متنافی نہیں (ایک میں دوسری کی نفی نہیں پائی جاتی) کہ جس کی وجہ سے دوسری کو پہلی کی ناسخ قرار دیا جائے، یہ تو ظاہر ہے، اگر ان کے درمیان تنافی پائی بھی جائے تب بھی ناسخ و منسوخ نہیں بلکہ ان کے درمیان عام و خاص اور مطلق و مقید کی نسبت پائی جاتی ہے۔

والحمدللہ

تمام شد ترجمہ: جلد ۴، بوقت ۴۵: ۱۲ شب

خدایا اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما، اس کا ثواب میرے والدین مرحومین اعلی اللہ مقامہما کی ارواح طیبہ کو پہنچا، اور مجھے المیزان فی تفسیر القرآن کی تمام جلدوں کے تراجم کی توفیق عطا فرما۔

العبد
حسن رضا غدیری
۱۱، ۲، ۲۰۱۳ء
لندن

کی بناء پر شرف و برتری رکھتے ہیں اور یہ کہ مؤمنین کا راستہ اللہ تعالیٰ کی طرف منتہی ہوتا ہے جبکہ کافروں کا راستہ اللہ کی طرف نہیں جاتا، اس موازنہ پر مبنی بیان میں ایک غرض یہ بھی ہے کہ ایک بار پھر مؤمنین کو قتال کی ترغیب دلائی جائے۔

اولیائے شیطان سے قتال کا حکم

○ ''فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا''
(تو اولیائے شیطان سے قتال کرو، یقیناً شیطان کی چال کمزور ہے)

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ طاغوت کی راہ پر چل پڑے وہ اللہ کی ولایت کے دائرہ سے باہر نکل گئے لہٰذا ان کا مولیٰ کوئی نہیں سوائے شرک اور غیر اللہ کی عبادت و پرستش کرنے کے، جو کہ شیطان ہے، تو کافروں کا ولی شیطان ہے اور وہ اس کے اولیاء (ساتھی) ہیں۔

آیت مبارکہ میں شیطان کی چال کو کمزور قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ طاغوت کا راستہ ہے جو کہ اللہ کے راستہ کے مدمقابل ہے، جبکہ ساری طاقت اللہ کے پاس ہے لہٰذا طاغوت کے راستہ کے لئے جو کہ شیطانی چال کے سوا کچھ نہیں ضعف و کمزوری کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو کافروں کے مقابلے میں قتال کرنے کی ترغیب دلائی اس مقصد کے لئے کافروں کے راستہ کی کمزوری بیان کر کے اور مؤمنوں کو قتال کی ترغیب دلا کر قتال کے حکم کی اہمیت اُجاگر کردی، اور یہ بات واضح رہے کہ شیطان کی چال کا اللہ کے راستہ سے موازنہ کے حوالہ سے کمزور ہونا، خود شیطان کے ان لوگوں پر قوی ہونے سے منافات نہیں رکھتا جو اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں، اور یہ ایک واضح حقیقت ہے۔

روایات پر ایک نظر

حذر کی وجہ تسمیہ

تفسیر مجمع البیان میں آیۂ مبارکہ ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ........'' کی تفسیر میں مذکور ہے کہ اس میں اسلحہ کو ''حذر'' سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلحہ اس آلہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعے حفاظت و بچاؤ کا کام لیا جاتا ہے، اور

یہی معنیٰ حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ومنقول ہے، اور انہی حضرتؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ان المراد بالثبات السرایا، وبالجمیع العسکر، کہ آیت میں لفظ ''ثُبَاتٍ'' سے مراد دستے اور لفظ ''جمیع'' سے مراد لشکر ہے۔

(تفسیر مجمع البیان جلد دوم، ص ۱۵۴)

تفسیر العیاشی میں سلیمان بن خالد کی روایت مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو) تو اس میں انہیں مؤمنین کے نام سے موسوم کیا جبکہ وہ حقیقی مؤمنین نہیں اور نہ ہی کوئی فضیلت رکھتے ہیں، تو خداوند عالم نے انہیں مخاطب کر کے یوں فرمایا: ''يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا.......... تا.......... فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا'' اگر اہل آسمان و زمین یہی بات کرتے ہیں کہ ''قد انعم الله علی اذلم ا کن مع رسول الله لکانوا بذلك مشرکین، واذا اصابهم فضل من الله قال: یالیتنی کنت معهم فاقاتل فی سبیل الله '' (اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ تھے) یہ اس وقت کہتے تھے جب ان پر کوئی مصیبت آتی تھی تو وہ اس طرح کہنے کی وجہ سے مشرک ہوجاتے، اور جب مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل وکرم آتا تو وہ کہتے تھے کہ اے کاش، ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے اور اللہ کی راہ میں قتال کرتے (تفسیر العیاشی، جلد اوّل، صفحہ ۲۵۷)

اسی معنی ومضمون پر مشتمل روایت تفسیر مجمع البیان (جلد اول، صفحہ ۱۵۷) اور تفسیر قمی (جلد اول۔ص ۱۴۳) میں بھی حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے، امامؑ کے بیان میں شرک سے مراد معنوی شرک ہے نہ کہ وہ کفر کہ جسے اختیار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے اور اس پر اسلام کے ظاہری احکام لاگو نہیں ہوتے، اس موضوع کی بابت تفصیلی تذکرہ پہلے ہوچکا ہے۔

تفسیر العیاشی ہی میں حمران کے حوالہ سے ایک روایت مذکور ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ''وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: نحن اولئك وہ ہم ہی ہیں۔

اسی کی مانند ایک روایت سماعہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: فاما قولهٗ: والمستضعفین......فاولئك نحن، تو جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا تعلق ہے ''وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ'' تو وہ ہم ہی ہیں (تفسیر العیاشی بحوالہ مذکورہ بالا)

یہ دو روایتیں درحقیقت آیۂ مبارکہ کی آئمہؑ پر تطبیق کے طور پر ہیں اس کی تفسیر کے طور پر نہیں، اور امامؑ نے اس میں آئمہ اہل بیتؑ کو مستضعفین قرار دے کر دراصل امت کے باغیوں اور ظالموں کی طرف سے آئمہؑ کے ساتھ ناروا سلوک اور ظلم وستم کے شکوہ وشکایت کے طور پر اس طرح فرمایا ہے۔

تفسیر ''درمنثور'' میں مذکور ہے کہ ابوداؤد نے اپنی کتاب ''ناسخ'' میں اور ابن منذر، ابن ابی حاتم، اور بیہقی نے اپنی کتاب ''سنن'' میں عطا کے حوالہ سے ابن عباس کا بیان ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: سورۂ نساء کی آیت ''خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا'' سورۂ توبہ کی آیت ''وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً'' (مؤمنین کے لئے روا نہیں کہ وہ اکٹھے ہی نکل پڑیں) کے ذریعے منسوخ ہوگئی ہے (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲۔ص ۱۸۳)

یہ دو آیتیں (نساء ۷۱ اور توبہ ۱۲۲) ایک دوسری سے متنافی نہیں (ایک میں دوسری کی نفی نہیں پائی جاتی) کہ جس کی وجہ سے دوسری کو پہلی کی ناسخ قرار دیا جائے، یہ تو ظاہر ہے، اگر ان کے درمیان تنافی پائی بھی جائے تب بھی ناسخ و منسوخ نہیں بلکہ ان کے درمیان عام و خاص اور مطلق و مقید کی نسبت پائی جاتی ہے۔

والحمد للہ

تمام شد ترجمہ: جلد ۴، بوقت ۱۲:۴۵ شب

خدایا اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما، اس کا ثواب میرے والدین مرحومین اعلیٰ اللہ مقامہما کی ارواح طیبہ کو پہنچا، اور مجھے المیزان فی تفسیر القرآن کی تمام جلدوں کے تراجم کی توفیق عطا فرما۔

العبد
حسن رضا غدیری
۱۱، ۲، ۲۰۱۳ء
لندن